شعرائے اردو کے تذکرے

نکات الشعرا سے گلشنِ بے خار تک

حنیف نقوی

اتر پردیش اردو اکادمی
لکھنؤ

سلسلۂ مطبوعات : ۳۹۱

شعرائے اردو کے تذکرے

نکات الشعرا سے گلشنِ بے خار تک

۱۱۶۵ھ / ۱۷۵۲ء تا ۱۲۵۰ھ / ۱۸۳۵ء

وکرم یونیورسٹی اُجّین کی ڈاکٹر آف فلاسفی (اردو) کی ڈگری کے لیے منظور شدہ
تحقیقی مقالہ

حنیف نقوی

صدر شعبۂ اردو۔ بنارس ہندو یونیورسٹی۔ وارانسی

اتر پردیش اردو اکادمی
لکھنؤ

© اتر پردیش اردو اکادمی

شعرائے اردو کے تذکرے (طبع دوم)

حنیف نقوی

اکادمی سے پہلی بار: ۱۹۹۸
تعداد: ایک ہزار
قیمت: ایک سو پینسٹھ روپے ۱۶۵

SHOARA-E-URDU KE TAZKIRE
by HANEEF NAQVI
PRICE : RS. 165/=

شاہد مشتاق صدیقی سکریٹری اتر پردیش اردو اکادمی نے یونائٹڈ بلاک پرنٹرس، گوتم بدھ مارگ، لکھنؤ سے چھپوا کر وبھوتی کھنڈ، گومتی نگر، لکھنؤ سے شائع کیا۔

میں اپنی تحقیقی کاوشوں کے اس ماحصل کو انتہائی عقیدت اور احترام کے ساتھ

اپنے مرحوم نانا

منشی شاکر حسین صاحب نکہت سہسوانی

کے نام

جن کے فیضانِ تربیت سے مجھے خدمتِ لوح و قلم کی توفیق حاصل ہوئی

استادِ محترم **پروفیسر گیان چند جین** کے نام

جنھوں نے میرے اندر تحقیق کا ذوق پیدا کیا

اور

شفیق رہنما **پروفیسر ابو محمد سحر** کے نام

جن کا علمی شغف اور تحقیقی بصیرت آج بھی میرے لیے چراغِ راہ ہے

معنون کرتا ہوں

پیش لفظ

اگر اردو میں تذکرہ نگاری کا رواج نہ ہوا ہوتا تو آج ہم اپنی ادبی روایت سے بڑی حد تک ناواقف ہوتے اور سینہ بہ سینہ چلنے والے واقعات اور حافظے کی مدد سے نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہونے والے فن پاروں پر ہی اردو نظم کی تاریخ کی اساس رکھنا پڑتی۔ اس طرح کے زبانی مآخذ اول تو صحت کے اعتبار سے ضعیف روایتوں کے زمرے میں شمار ہوتے، دوسرے ہمارے تخلیقی سفر کی داستان ادھوری بھی رہ جاتی۔

بھلا ہو بیاضوں اور کشکولوں کا جو ذاتی شغف کی بنا پر تیار کیے گئے اور مرور ایام کا سامنا کرتے ہوئے صحیح سلامت ہم تک پہنچ گئے، اور تذکروں کا جنھوں نے نہ صرف ماضی کی تاریکیوں میں نہاں کوائف کو اپنے دامنِ عافیت میں لے کر ہم تک پہنچایا بلکہ فنِ نقد و تبصرہ کے ابتدائی نقوش بھی فراہم کیے۔

تذکروں نے ذوقِ تجسّس کو بیدار کرنے میں بھی بہت اہم رول ادا کیا اور قصرِ تحقیق کی تعمیر کے لیے استوار بنیادیں تیار کر دیں۔ تذکرے نہ ہوتے تو تحقیق کی صورت آج کچھ اور ہی ہوتی۔

تذکروں نے جہاں ایک طرف کاروانِ تحقیق کو آگے بڑھانے کے لیے راہ ہموار کی وہیں دوسری طرف خود بھی موضوعِ تحقیق بن گئے۔ تذکرہ نگاروں سے بھی کہیں کہیں لغزشیں ہوئی ہیں۔ کاتبوں سے سہوِ قلم بھی ہوا ہے۔ ایک ہی واقعے کے سلسلے میں راویوں میں اختلافِ بیان بھی نظر آجاتا ہے۔ اس لیے یہ بھی ضروری ہو گیا تھا کہ خود تذکروں کا باریک بینی کے ساتھ جائزہ لیا جائے اور اختلافات کی صورت میں استصواب کی راہ

نکالی جائے۔

اس مشکل کام کا بیڑا ڈاکٹر حنیف نقوی (صدر شعبۂ اردو بنارس ہندو یونیورسٹی) نے اٹھایا اور شعرائے اردو کے تذکروں کے تحقیقی و تجزیاتی مطالعے کو اپنا موضوع تحقیق قرار دیا۔ یہ کام جس بالغ نظری، وسعت مطالعہ، تجزیاتی ذہن، دراکی طبع اور سب سے بڑھ کر منزلِ صبر کو سر کرنے کے حوصلے کا متقاضی تھا، ان صفات سے ڈاکٹر نقوی پوری طرح متصف ہیں۔ انھوں نے اپنے مقالے پر وکرم یونیورسٹی، اُجّین سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی اس کے بعد یہ 'شعرائے اردو کے تذکرے' کے نام سے ۱۹۷۶ء میں پہلی مرتبہ کتابی شکل میں سامنے آیا اور ادبی حلقوں میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔

اکادمی ڈاکٹر حنیف نقوی کی شکر گزار ہے کہ انھوں نے 'شعرائے اردو کے تذکرے' کا اضافہ مطالب کے ساتھ نظر ثانی شدہ ایڈیشن اکادمی کو اشاعت کے لیے عنایت فرمایا۔ امید ہے اس نقش ثانی کو، جو بہر حال نقشِ اوّل سے بہتر ہوتا ہے، تشنگانِ تحقیق ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔

(ڈاکٹر شمیم رضوی)
چیرپرسن

اتر پردیش اردو اکادمی
لکھنؤ: ۲ر فروری ۱۹۹۸ء

فہرست

مقدمہ طبع دوم	۹
مقدمہ طبع اول	۱۱
تذکرہ نگاری بہ حیثیت فن	۱۹
عربی و فارسی میں تذکرہ نگاری کی روایت	۴۷
اردو تذکرہ نگاری (آغاز سے شیفتہ تک)	۸۳
ماحول اور ترقی کی منزلیں	۱۲۶
تذکرہ نگاری کے مختلف مراکز (الف)	۱۲۸
تذکرہ نگاری کے مختلف مراکز (ب)	۱۴۷
نکات الشعرا اور دوسرے ابتدائی تذکرے	۱۷۹
گلشن گفتار	۲۰۸
گلشن راز یا تذکرۂ ریختہ گویاں	۲۱۶
ریاض حسنی	۲۲۳
مخزن نکات	۲۴۸
چمنستان شعرا سے گلشن سخن تک	۲۶۹
چمنستان شعرا	۲۷۱
طبقات الشعرا	۲۹۴
تذکرہ شعرائے اردو	۳۲۱

رموز الشعرا یا تذکرہ شورش ۳۴۱
مسرت افزا ۳۶۹
گل عجائب ۳۹۲
گلزار ابراہیم ۴۰۲
گلشن سخن ۴۲۰
تذکرہ ہندی، ریاض الفصحا اور معاصر تذکرے ۴۳۷
ریاض الفصحا ۴۷۲
گلشن ہند ۴۹۲
تذکرہ عشقی ۵۰۹
طبقات سخن ۵۲۹
تذکرہ بے جگر ۵۵۶
طویل اور جامع تذکرے ۵۷۹
عیار الشعرا ۵۸۰
عمدۂ منتخبہ ۶۱۰
مجموعۂ نغز ۶۴۵
گلشن بے خار ۶۷۹
حاصل کلام ۷۱۰
فہرست مآخذ ۷۲۸

مقدمہ طبع دوم

زیرِ نظر کتاب کا پہلا ایڈیشن جون ۱۹۷۶ء میں نسیم بک ڈپو، لکھنؤ سے شائع ہوا تھا۔ ہندوستان اور پاکستان کے علمی حلقوں میں اس کی جو پذیرائی ہوئی وہ بجا طور پر مصنف کے لیے ایک بڑا سرمایۂ افتخار کہی جا سکتی ہے۔ مولانا امتیاز علی عرشی اور مشفق خواجہ جیسے مقتدر محققین نے اسے اردو تحقیق میں گراں قدر اضافے سے تعبیر کیا۔ بہت سی یونیورسٹیوں نے اسے اپنے اعلیٰ نصابات میں جگہ دی اور متعدد تحقیقی مقالات میں بار بار اس کے حوالے دیے گئے۔ کتاب کی اس مقبولیت کو دیکھتے ہوئے بعض احباب اور مخلصین کا اصرار تھا کہ اس کا دوسرا ایڈیشن نسبتاً بہتر کتابت وطباعت کے ساتھ جلد از جلد شائع کیا جائے چنانچہ ۱۹۸۳ء میں اس غرض سے اتر پردیش اردو اکادمی میں سلسلہ جنبانی شروع کی گئی لیکن ضابطے کی ابتدائی کارروائیوں کے بعد اکادمی، مصنف اور ناشر کے درمیان حق اشاعت کی قانونی بحث کی وجہ سے یہ معاملہ کئی برس تک اٹکا رہا۔ خدا خدا کر کے جولائی ۱۹۹۱ء میں یہ مسئلہ طے ہوا تو بعض دوسرے موانع اور دفتری پیچیدگیوں کے باعث مسلسل تاخیر ہوتی رہی تا آں کہ ۱۹۹۵ء کے اوائل میں کتابت کا آغاز ہوا اور اب اس کی تکمیل کے بعد طباعت کی منزل درپیش ہے۔

اس اشاعت میں زیرِ تبصرہ تذکروں کی فہرست میں کوئی نیا اضافہ نہیں، البتہ کتاب کو جدید تر تحقیق سے ہم آہنگ رکھنے کے لیے اس میں وسیع پیمانے پر ترمیم و تنسیخ اور ردوبدل کیا گیا ہے۔ حتّٰی کہ بعض تذکروں کے زمانۂ تالیف کی بحث سے متعلق حصّے از سرِ نو لکھے گئے ہیں۔ مئی ۱۹۶۷ء تک جو اس کتاب کی تسوید و تکمیل کا اصل زمانہ ہے، بہت سے تذکرے غیر مطبوعہ تھے، اس لیے ان کا مطالعہ مختلف کتب خانوں میں موجود ان کے قلمی نسخوں کی بنیاد پر کیا گیا

تھا اور ان کے اقتباسات انھی مخطوطات کے حوالے سے نقل کیے گئے تھے۔ اب ان میں سے جو تذکرے شائع ہو چکے ہیں، پیشِ نظر ایڈیشن میں ان سے متعلق تمام اندراجات میں ان مطبوعہ نسخوں کے مطابق تبدیلیاں کر دی گئی ہیں تاکہ قارئین اگر بذاتِ خود کسی حوالے کی تصدیق کرنا چاہیں تو انھیں کوئی دشواری نہ ہو۔ اس عرصے میں بعض تذکروں کے نو دریافت نسخوں پر مبنی نئے ایڈیشن بھی منظرِ عام پر آئے ہیں، ہم نے ان کے مطالعے میں موقع بہ موقع ان تازہ اشاعتوں سے بھی مدد لی ہے۔

اتر پردیش اردو اکادمی کی طرف سے کتاب کی طباعت کا خیال اور اس پر نظرثانی کا یہ کام محب گرامی پروفیسر حکم چند نیر کی تحریک کا رہینِ منت ہے، افسوس ہے کہ وہ اب اس دنیا میں موجود نہیں۔ اگر یہ کتاب ان کی زندگی میں چھپ گئی ہوتی تو وہ اسے دیکھ کر یقیناً بے حد خوش ہوتے، کیونکہ اپنے رفقائے کار کے علمی کاموں سے دل چسپی اور ان کی کامیابیوں پر اظہارِ فخر و مسرت ان کے مزاج کا خاصہ اور ان کی زندگی کے معمولات میں شامل تھا۔ اردو اکادمی کے چیرمین کی حیثیت سے پروفیسر محمود الٰہی صاحب کی ذاتی دل چسپی اور عزیزی ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی کے تعاون سے بھی اس سلسلے کے بہت سے مراحل سر کرنے میں کافی مدد ملی ہے۔ مصنف اپنے ان تمام کرم فرماؤں کا ممنون و متشکر ہے۔

حنیف نقوی

بنارس

۲۷ ستمبر ۱۹۹۵ء

مقدمہ بطبعِ اوّل

زبان و ادب کا مطالعہ تاریخ ادب کے مطالعے کے بغیر مکمل نہیں ہوتا اور مطالعے کی اس تکمیل کے لیے آثارِ ادبیہ کا تحفظ اور فن کاروں کے صحائف حیات کی شیرازہ بندی ایک ناگزیر امر ہے۔ مشرق میں لوح و قلم کے خدمت گذاروں کو جب اس حقیقت کا احساس ہوا تو اس کے نتائج تذکرہ نویسی کے آغاز اور اس کے فروغ کی صورت میں رونما ہوئے۔ عربی و فارسی میں شعرا کے تذکروں کی کثرت تاریخی حس کی اسی بیداری کی رہین منت ہے۔ اردو میں یہ صنف دوسری متعدد اصنافِ ادب کی طرح فارسی کے واسطے سے داخل ہوئی۔ یہاں اس میدان میں اربابِ قلم کی کاوشوں کے ابتدائی نمونے ۱۱۶۵ھ (۱۷۵۲ء) کے قریب منظر عام پر آئے۔ اس زمانے سے ۱۲۹۷ھ (۱۸۸۰ء) میں اردو کی پہلی ادبی تاریخ 'آب حیات' کے اشاعت کے زمانے تک تذکروں کا ایک طویل سلسلہ ملتا ہے جس کی بنا پر یہ دور بلاشبہ تذکرہ نگاری کا عہدِ زریں کہے جانے کا مستحق ہے۔ اس زمانے کے تذکروں میں اردو زبان و ادب اور اس کے زیرِ سایہ پروان چڑھنے والی تہذیب کے بارے میں معلومات کا جو متنوع اور وافر سرمایہ محفوظ ہے اس کی قدر و قیمت کا اندازہ کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں جنھیں ادبِ قدیم سے متعلق موضوعات پر تحقیقی و تنقیدی زاویۂ نظر سے کام کرنے کا اتفاق ہوا ہے۔ تذکروں کی اس اہمیت کا تقاضہ یہ ہے کہ ان کے محتویات و مشتملات پر سیر حاصل بحث کے ذریعے ان کی خوبیوں اور خامیوں کو اس طرح اُجاگر کیا جائے کہ ایک عام قاری کے ذہن میں بھی ان میں سے کسی تذکرے کے انفرادی معیار اور افادی حیثیت کے بارے میں کوئی خلطِ مبحث باقی نہ رہے۔

اردو میں اس موضوع پر اب تک جو کچھ کام ہوا ہے وہ کسی طرح درخورِ اعتنا نہیں، کیونکہ کام کرنے والوں میں اگر ایک طرف وہ حضرات ہیں جو تذکروں کو ایک متاعِ کاسد سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے تو دوسری طرف وہ لوگ ہیں جن کی رائیں مطالعے کی سطحیت غور و فکر کے فقدان اور دوسروں کے تاثرات سے اثر پذیری کی غماز ہیں۔ بعض ناقدین نے اپنی پسند یا رسائی کے مطابق صرف دو چار تذکروں کو سامنے رکھ کر پوری صنف کے بارے میں ایسے حتمی اور قطعی فیصلے صادر کر دیے ہیں جن سے متاثر ہو کر حقیقتِ حال سے بے خبر قارئین تذکروں کے متعلق کوئی اچھی رائے قایم نہ کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ پیشِ نظر مقالہ اسی افراط و تفریط کے درمیان اعتدال و توازن کی جستجو کو منتہائے مقصود بنا کر سپردِ قلم کیا گیا ہے۔

چونکہ ایک متعین وقت اور محدود گنجائش کے اندر سارے تذکروں کے بارے میں کوئی کارآمد اور تسلی بخش کام نہیں کیا جا سکتا اس لیے ہم نے اپنا دائرۂ کار صرف ان تذکروں کے جائزے تک محدود رکھا ہے جو ۱۱۶۵ھ (۱۷۵۲ء) اور ۱۲۵۰ھ (۱۸۳۴-۳۵ء) کے درمیان مرتب ہوئے ہیں۔ اس زمانے کے تقریباً وہ تمام ہی تذکرے جو شائع ہو چکے ہیں یا جن کے مخطوطات ہندوستان اور یورپ کے کتب خانوں میں محفوظ ہیں، اس دائرے میں آ گئے ہیں۔ البتہ چند تذکروں کو جن کا ذکر موقع کی مناسبت سے آئندہ سطور میں کر دیا جائے گا، بعض ناگزیر وجوہات کے تحت نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

یہ مقالہ آٹھ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں تذکرہ نویسی کے فن اور اس کے متعلقات و مناسبات سے بحث کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں جہاں مثالوں کی ضرورت پیش آئی ہے وہاں حتی الامکان انھی تذکروں کے حوالے دیے گئے ہیں جو ہمارے مطالعے میں شامل ہیں تاہم کہیں کہیں موضوعِ گفتگو کی وضاحت کے لیے ان تذکروں کو بھی شاملِ بحث کر لیا گیا ہے جو بعد کے زمانے سے یا پھر شعرائے فارسی سے تعلق رکھتے ہیں لیکن اربابِ ذوق عام طور پر ان سے ناواقف نہیں۔

اردو میں تذکرہ نویسی کا آغاز فارسی کے زیرِ اثر ہوا اور فارسی تذکرہ نویسوں نے براہِ راست عربی تذکرہ نگاروں سے اثرات قبول کیے۔ روایات کے اس مربوط سلسلے کی

نشان دہی کے لیے دوسرے باب میں عربی و فارسی تذکرہ نویسی کے متعلق مختصر معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ سلسلۂ کلام کو زیادہ طول نہ دیتے ہوئے یہاں عربی کے صرف ان ہی تذکروں کے ذکر سے سروکار رکھا گیا ہے جو فارسی میں تذکرہ نویسی کی ترویج و ترقی کے لیے سامان ترغیب ثابت ہوئے۔ اسی طرح چونکہ فارسی کا اوّلین تذکرہ ہندوستان میں لکھا گیا اور اس کے بعد بھی اس صنف نے ترقی کے بیشتر مراحل نہیں طے کیے، اس لیے یہاں بھی اختصار کی گنجائش نکال کر ہم نے اردو تذکرہ نویسی کے آغاز سے قبل ہندوستان میں ترتیب پائے ہوئے تذکروں کے تعارف پر ہی اکتفا کیا ہے۔ اس اختصار پسندی کی وجہ سے یہ بحث کسی قدر تشنہ رہ گئی ہے لیکن اس سے ہمارے موضوعِ بیان کے تسلسل اور افادیت میں یقیناً کوئی فرق واقع نہیں ہوا ہے۔

تیسرے باب میں اولاً اجمال و اختصار کے ساتھ اردو شاعری کی عہد بعہد ترقی و مقبولیت کے "قصۂ پارینہ" کو دوہرایا گیا ہے تاکہ قارئین کے ذہن میں اس ماحول اور پس منظر کا ایک نقش تازہ ہو جائے جس سے اردو تذکرہ نویسی کے محرکات اور ترغیبی عوامل وابستہ ہیں۔ اس کے بعد اردو تذکرہ نگاری کی ابتدا اور اس میدان میں شرفِ اوّلیت کے متعلق مختلف تذکرہ نگاروں کے دعووں اور ناقدین کے بیانات کا تفصیلی جائزہ لے کر یہ ثابت کیا گیا ہے کہ ہمارے یہاں حقیقتاً اس صنف کا آغاز کب ہوا اور اس کی بنیاد گذاری میں شرف اولیت کا اصل مستحق کون ہے۔ یہ حصہ خالص تحقیقی نقطۂ نظر سے لکھا گیا ہے جس کی اہمیت کا اندازہ اس کے مطالعہ کے بعد ہی کیا جا سکتا ہے۔ آخر میں ملک کے مختلف ادبی مراکز میں وہاں کی تہذیبی سرگرمیوں اور علمی و ادبی ترقیوں کے دوش بدوش تذکرہ نگاری کے فروغ اور ترقی کی رفتار کا ایک اجمالی خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ اس حصے میں ہم نے ان تذکروں کے متعلق تمام دستیاب معلومات کا احاطہ بھی کر لیا ہے جو دستبردِ زمانہ کی نذر ہو چکے ہیں یا جنھیں خاص وجوہات کے تحت زیرِ بحث تذکروں میں شامل نہیں کیا جا سکا ہے

مقالے کے اگلے چار ابواب ہماری تمام تر تحقیقی و تنقیدی کاوشوں کا ماحصل ہیں۔ ان ابواب کے تحت فرداً فرداً تیئس ۲۳ تذکروں کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ تذکرے زیرِ تبصرہ

دور کا کل سرمایہ تو نہیں لیکن اس سرمائے کا جزوِ اعظم ضرور ہیں۔ دوسرے ہم زمانہ تذکروں میں سے جو تذکرے دسترس سے بعید نہ ہونے کے باوجود ہماری بحث کے دائرے میں نہیں آسکے ان میں "گلشنِ ہند" مؤلفہ حیدر بخش حیدری، "مجمع الانتخاب" مؤلفہ شاہ کمال مانکپوری، "دیوان جہاں" مؤلفہ رائے بینی نرائن اور تذکرۂ صدر الدین آزردہ شامل ہیں۔ حیدری کے "گلشنِ ہند" کو نظر انداز کر دینے کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے نزدیک فنی نقطۂ نظر سے یہ تذکرہ کے بجائے بیاضِ اشعار کہے جانے کا مستحق ہے کیونکہ اس میں مظہر علی خاں ولا کے علاوہ کسی شاعر کو بھی نہایت مختصر قسم کے ایک دو جملوں سے زیادہ میں متعارف نہیں کرایا گیا ہے۔ بینی نرائن کے "دیوان جہاں" کی بھی کم و بیش یہی کیفیت ہے۔ "مجمع الانتخاب" کے دو مکمل نسخے سر سالار جنگ میوزیم کے کتب خانے میں محفوظ ہیں لیکن بعض مجبوریوں کے تحت حیدر آباد کے سفر سے قبل از وقت واپسی کی بنا پر ان سے استفادہ نہ کیا جا سکا اور انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ کے کتب خانے میں اس تذکرے کا جو نسخہ ہے وہ ردیف سین پر ختم ہو جاتا ہے، اس لیے اس کو سامنے رکھ کر کوئی صحیح رائے قائم نہیں کی جا سکتی۔ کارپس کرسٹی کالج کیمبرج کی لائبریری میں دریافت شدہ تذکرۂ آزردہ کا قلمی نسخہ بھی "مجمع الانتخاب" کے نسخۂ علی گڑھ ہی کی طرح ناقص ہے اور ردیفِ قاف کے وسط میں ختم ہو جاتا ہے۔ قطع نظر اس نسخے کی عکسی نقل بھی جس کے دیکھنے کا ہمیں موقع ملا، زیادہ صاف اور واضح نہیں۔ ان کے علاوہ اس زمانے کے جن تذکروں کا ذکر تذکروں یا دوسری کتابوں میں ملتا ہے وہ یا تو ضائع ہو چکے ہیں یا اگر ان میں سے کسی تذکرے کا کوئی نسخہ موجود ہے تو وہ ہنوز اہل نظر کی رسائی سے دور گوشۂ گمنامی میں پڑا ہوا ہے۔

یکتا لکھنوی کی "دستور الفصاحت" اور بہادر سنگھ دہلوی کی "یادگار بہادری" کے شعراء سے متعلق ابواب بھی چونکہ اصلاً ان کتابوں سے علاحدہ کوئی حیثیت نہیں رکھتے اور یہ کتابیں تذکروں کی تعریف میں نہیں آتیں۔ اس لیے تذکرہ نویسی کے فروغ و ارتقا کی بحث کے ضمن میں ان کا ذکر کر دینے کے باوجود انھیں تفصیلی بحث کے لیے منتخب نہیں کیا گیا ہے۔

مقالے کے مختلف ابواب میں تذکروں کے متعلق موجودہ معلومات سے پوری طرح کام

لینے کے باوجود تنقیح مباحث اور استخراجِ نتائج میں ہم نے اپنے اندازِ نظر کی انفرادیت کو بہر صورت برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے۔ اپنے پیش رو محققین و ناقدین سے استفادے کا ہمیں اعتراف ہے لیکن فیصلہ کن مقامات میں حتی الامکان نہ تو ہم نے ان کے خیالات و بیانات سے متاثر ہو کر کوئی رائے قایم کی ہے اور نہ ثانوی ذرائع سے حاصل شدہ معلومات پر اکتفا کیا ہے۔ البتہ عربی سے سرسری واقفیت اور فارسی کے تمام تذکروں کے براہ راست مطالعے کی دشواریوں کے باعث بعض اوقات اس موضوع پر کام کرنے والے مشہور و معتبر مصنفین اور صاحبِ نظر کرم فرماؤں کی اعانت کا سہارا لینا پڑا ہے۔

تحقیقی مقالات کے آخری باب میں بطور خلاصہ بالعموم وہی تمام باتیں دوہرا دی جاتی ہیں جو سابقہ ابواب میں بالتفصیل بیان کی جا چکی ہوتی ہیں لیکن اس مقالے کے مباحث کی نوعیت کے پیش نظر یہ طریقۂ کار ہمیں نہ تو سود مند معلوم ہوا اور نہ دل چسپ۔ چنانچہ ہم نے اس کے آخری باب کو گذشتہ ابواب کی معمولی تلخیص تک محدود رکھنے کے بجائے ان ادبی و تہذیبی مقاصد کی نشان دہی کے لیے مخصوص کیا ہے جن کے مطالعے میں تذکرے مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ باب پچھلے تمام ابواب کے اہم تحقیقی و تنقیدی نتائج کا ایک ایسا نچوڑ یا ماحصل ہے جس سے تذکروں کی حقیقی اور زیادہ نمایاں قدر و قیمت واضح ہوتی ہے۔

شعرائے اردو کے تذکروں میں سے جو تذکرے ہنوز غیر مطبوعہ ہیں، ان میں سے ہم نے "گلزارِ ابراہیم" کو چھوڑ کر باقی تمام تذکروں کے سارے ہی دستیاب مخطوطات کو سامنے رکھنے کی کوشش کی ہے، تاکہ شعرا کی تعداد کے فرق، متن کے اختلاف، زمانۂ ترتیب کے تعین اور اسی قسم کے کسی اور معاملے میں کوئی شک و شبہ باقی نہ رہے۔ جو تذکرے شائع ہو چکے ہیں، ان پر تبصرہ و تنقید کے لیے عام حالات میں مطبوعہ نسخوں ہی کا انتخاب کیا گیا ہے اور کئی اشاعتوں کی صورت میں مستند ترین ایڈیشن کو ترجیح دی گئی ہے، لیکن اس تخصیص کو بھی جامد کلیہ نہ بنا کر ہم نے حسب موقع ان تذکروں کے بعض اہم قلمی نسخوں اور دوسرے مطبوعہ ایڈیشنوں سے بھی استفادہ کیا ہے۔ مختلف نسخوں کے اس تقابلی

مطالعے کی بنیاد پر اگر کسی جگہ مطبوعہ متن میں تصرف کی ضرورت محسوس ہوئی ہے تو مکمل جملوں کے اختلاف یا تین چار لفظوں کے واضح فرق کی صورت میں اضافی یا اختلافی عبارات کو قوسین میں لکھ کر حاشیے پر اس کی وضاحت کر دی گئی ہے۔ لیکن اگر یہ اختلاف ایک یا دو الفاظ کے معمولی فرق یا کتابت کی صریح غلطی تک محدود رہا ہے تو کسی توضیح کے بغیر قابلِ ترجیح الفاظ شاملِ عبارت کر لیے گئے ہیں۔

عیسوی و ہجری سنین و تواریخ کی مطابقت کے موقعوں پر قارئین کو اس مقالے میں بہ لحاظِ ترتیب ایک قسم کا عدم توافق نظر آئے گا۔ یہ فرق جو بظاہر معیوب معلوم ہوتا ہے، اتفاقی نہیں ارادی ہے۔ ہم نے اپنی تحریر میں بالالتزام ان تواریخ و سنین کو جو اصل ماخذ سے معلوم ہوئے ہیں یا جن کی دریافت کے ذرائع زیادہ معتبر ہیں، اولیت دی ہے اور تقویمی حساب کے ذریعہ حاصل شدہ مطابقات کا اندراج ان کے بعد کیا ہے۔ اس ضمن میں صرف تقویم نگاروں کے حسابات پر اکتفا نہ کرتے ہوئے ہم نے ذاتی طور پر بھی تاریخوں کی صحت کا اطمینان کر لیا ہے۔ بالخصوص جن مقامات پر ہجری تاریخ کے ساتھ دن بھی مذکور ہے وہاں دن کو بنیاد بنا کر صحیح تاریخ عیسوی کے تعین کی کوشش کی گئی ہے جس کے نتائج اکثر تقویمات کے تخمینی حساب سے مختلف ثابت ہوئے ہیں۔

یہ مقالہ ڈاکٹر ابو محمد صاحب سحر پروفیسر و صدر شعبۂ اردو گورنمنٹ حمیدیہ کالج بھوپال کی نگرانی میں لکھا گیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے مواد کی فراہمی سے اس کی ترتیب تک سارے ہی مراحل میں جس انہماک اور توجہ کے ساتھ میری رہنمائی فرمائی ہے، میں اس کے لیے ان کا بے حد ممنون ہوں۔ یہ موصوف کے علمی شغف اور ناقدانہ و محققانہ بصیرت ہی کا فیضان تھا کہ خدمتِ لوح و قلم کے اس صبر طلب مرحلے میں تمنا کی بیتابی کسی حال میں بھی احتیاط کے تقاضوں پر غالب نہ آسکی اور راقم السطور کو ایک ایسے موضوع پر جس کی وقت طلبی کسی شرح و بیان کی محتاج نہیں، ایک مبسوط تحقیقی و تنقیدی مقالہ اہل نظر کی بارگاہ میں پیش کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔

اس مقالے کی ابتدا ۱۹۶۳ء کے اوائل اور تکمیل یکم مئی ۱۹۶۷ء کو ہوئی۔ چار سال

کی اس مدت میں زیادہ تر وقت مواد کی فراہمی پر صرف ہوا۔ بالخصوص غیر مطبوعہ تذکروں کے ملک کے مختلف گوشوں میں بکھرے ہوئے مخطوطات اور یورپ کے کتب خانوں میں محفوظ فلمی نسخوں کی مائیکرو فلمز اور فوٹو اسٹیٹس کے حصول میں کافی دشواریاں پیش آئیں۔ ان دشواریوں سے نبٹنے کے لیے راقم السطور نے مختلف اوقات میں علی گڑھ، رام پور، دہلی، لکھنؤ، شاہجہانپور، گورکھپور، پٹنہ اور حیدرآباد کے سفر کیے اور مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، کتب خانہ انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ، رضا لائبریری رام پور، دہلی یونیورسٹی لائبریری دہلی، لکھنؤ یونیورسٹی لائبریری لکھنؤ، کتب خانہ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ، گاندھی فیض عام کالج لائبریری شاہجہانپور، گھورکھپور یونیورسٹی لائبریری گورکھپور، خدا بخش اورنٹیل پبلک لائبریری پٹنہ، پٹنہ یونیورسٹی لائبریری پٹنہ، کتب خانہ آصفیہ (اسٹیٹ لائبریری) حیدرآباد، سینٹرل ریکارڈز آفس لائبریری حیدرآباد اور دوسری متعدد لائبریریوں اور ذاتی کتب خانوں سے استفادہ کیا۔ ان سفروں کے دوران جن بزرگوں اور کرم فرماؤں کی عنایات میرے شامل حال رہیں ان میں سے ڈاکٹر مختارالدین احمد صاحب آرزو (علی گڑھ) مولانا امتیاز علی خاں صاحب عرشی (رامپور) پروفیسر سید مسعود حسن صاحب رضوی (لکھنؤ) قاضی عبدالودود صاحب (پٹنہ) جناب مالک رام صاحب (دہلی) ڈاکٹر محمود الٰہی صاحب (گورکھپور) چودھری وصی محمد صاحب (پرنسپل جی ایف کالج شاہجہاں پور) اور جناب مسعود عالم صاحب (لیکچرر شعبۂ اردو جی ایف کالج شاہجہانپور) کا میں خاص طور پر ممنون ہوں۔ آرزو صاحب نے یورپ کے کتب خانوں کے کئی نادر مخطوطات کے روٹو گرافس اور دستی نقلوں سے استفادے کی سہولتیں مہیا فرمائیں۔ جناب مالک رام نے "تذکرۂ بے جگر" کے نسخہ انڈیا آفس لائبریری کا فوٹو اسٹیٹ تقریباً دو ہفتے کے لیے مستعار دیا اور محمود الٰہی صاحب کی وساطت سے تذکرۂ شورش کے نسخۂ جون پور کے مطالعہ کا موقع حاصل ہوا۔ آرزو صاحب، عرشی صاحب، مسعود حسن رضوی صاحب، قاضی عبدالودود صاحب اور ڈاکٹر محمود الٰہی صاحب نے وقتاً فوقتاً خطوط کے ذریعے بھی مجھے مطلوبہ معلومات مرحمت فرمائیں۔ ان حضرات کی یہ مخلصانہ اور مشفقانہ کرم گستریاں سپاس گزاری کے تمام رسمی الفاظ کی گرفت سے بالاتر ہیں۔

بھوپال میں مجھے استادِ محترم ڈاکٹر گیان چند جین، علامہ محوی صدیقی لکھنوی اور جناب کوثر چاند پوری کے ذاتی کتب خانوں اور مولانا آزاد سینٹرل لائبریری، گورنمنٹ حمیدیہ کالج لائبریری اور کتب خانۂ شعبۂ اردو سیفیہ ڈگری کالج سے بھی بہت سی مفید کتابیں حاصل ہوئیں۔ ڈاکٹر جین صاحب کی محققانہ فہمائشوں اور استاذی ڈاکٹر سلیم حامد صاحب رضوی مرحوم کی مشفقانہ باز پرسوں نے سمندِ شوق کے لیے تازیانے کا کام دیا۔ مقامی اور غیر مقامی احباب میں ڈاکٹر یونس حسنی، پروفیسر عبدالقوی دسنوی، ڈاکٹر فدا عباس رضوی، ڈاکٹر نورالحسن نقوی، جناب اکبر علی خاں عرشی زادہ، جناب نثار احمد فاروقی، جناب نسیم عباسی (دہلی یونیورسٹی لائبریری دہلی) ایم۔ حبیب خاں صاحب (کتب خانہ انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ) اور محمد ہارون صدیقی صاحب (اسلامیہ کالج لائبریری، بریلی) کے دوستانہ تعاون اور مخلصانہ مشوروں سے بھی مجھے اس کام میں بہت مدد ملی۔ جناب شرقی عثمانی مالک مکتبۂ شرقیہ بھوپال مقالے کی تصنیف کے دوران بڑے خلوص اور لگن کے ساتھ میری مطلوبہ کتابوں کی فراہمی کا بندوبست کرتے رہے۔ میں اپنے ان تمام بزرگوں، دوستوں اور متذکرہ کتب خانوں کے منتظمین کا بھی شکر گزار ہوں۔

میں یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کا بھی احسان مند ہوں جس نے مجھے اس موضوع پر کام کرنے کی غرض سے تین سال کے لیے تین سو روپے ماہوار کی جونیر فیلوشپ عطا کر کے ان مشکلات کا سدباب کر دیا جن کا بصورت دیگر اس کام میں حائل ہونا ایک لازمی امر تھا۔

عزیز دوست اور رفیقِ کار ڈاکٹر سید سلیمان حسین اور نسیم بک ڈپو کے مالک جناب نسیم انہونوی بھی دوسروں سے کسی طرح کم میرے شکریے کے مستحق نہیں۔ سلیمان صاحب کے پیہم اصرار نے مجھے ان اوراق پر نظرِ ثانی کے لیے آمادہ کیا اور نسیم صاحب کی علم دوستی کی بدولت اس کی اشاعت عمل میں آ رہی ہے۔

حنیف نقوی

بنارس ۱۵ر دسمبر ۱۹۷۲ء

تذکرہ نگاری بحیثیت فن

تذکرہ کا لغوی و اصطلاحی مفہوم

تذکرہ ایک عربی لفظ ہے جسے اہلِ زبان یادداشت (میمورنڈم) دستاویز یا سرٹیفکٹ، ریل یا جہاز کے ٹکٹ اور پروانۂ راہداری یا پاسپورٹ کے معنی میں استعمال کرتے ہیں[1]۔ قرآنِ کریم میں اس سے بالعموم نصیحت اور تفہیم کے معنی مراد لیے گئے ہیں[2]۔ لیکن فی زمانہ فارسی و اردو میں اصطلاحاً اس لفظ کا اطلاق اس کتاب پر ہوتا ہے جس میں شعراء کے مختصر حالات اور ان کا منتخب کلام درج کیا گیا ہو۔ "تذکرہ" کو اس کی مجرد حیثیت میں یہ اصطلاحی مفہوم گیارھویں صدی ہجری کے عجمی ادیبوں نے عطا کیا ہے ورنہ اس سے قبل ان کے یہاں اس لفظ کا استعمال "یادداشت و یادآوردن و پنددادن" کے معانی میں محدود تھا۔ اور "یادداشت و یادآوردن" کی رعایت سے اسے کسی بھی ایسی کتاب کے نام کا جز بنایا جا سکتا تھا جس میں مختلف اشخاص کے حالات بیان کیے گئے ہوں جیسا کہ لفظ تذکرہ سے شروع ہونے

---

[1] المنجد فی اللغہ طبع جدید ص ۲۳۶۔ علامہ شبلی نے اپنی مشہور اردو تصنیف "سفرنامۂ مصر و روم و شام" میں لفظ "تذکرہ" کو دو جگہ پاسپورٹ کے معنی میں استعمال کیا ہے (صفحات ۱۴ و ۲۲) اور کتاب کے آخر میں زمانہ حال کے عربی الفاظ کی فرہنگ کے تحت اس کے معنی پروانہ، ٹکٹ اور سند تحریر کیے ہیں (ص ۱۵۵)

[2] سورہ "طٰہٰ" آیت نمبر ۳، سورہ "الحاقہ" آیت نمبر ۴۷، سورہ "المزمل" آیت نمبر ۱۹، سورہ "المدثر" آیات نمبر ۴۹ و ۵۴، سورہ "الدھر" آیت نمبر ۲۹ و سورہ "عبس" آیت نمبر ۱۱

[3] فرہنگِ انند راج جلد اوّل ص ۷۰، ۶۵ و غیاث اللغات ص ۹۵

والی فارسی کی قدیم ترین تصنیف "تذکرۃ الاولیا" (مرتبہ اوائلِ قرنِ ہفتم) کے مولف شیخ فریدالدین عطار کی اس وضاحت سے ظاہر ہے :

"چوں می بینم کہ روزگارے پدید آمدہ است کہ ..... اشرار الناس اخیار الناس را فراموش کردہ اند، تذکرہ ساختم اولیا را و ایں کتاب را "تذکرۃ الاولیا" نام نہادم تا اہلِ خسرانِ روزگار اہلِ دولت را فراموش نکنند و گوشہ نشینان و خلوت گزیدگان را طلب کنند و بہ ایشان رغبت نمایند"۔ [1]

دولت شاہ سمرقندی کا "تذکرۃ الشعراء" (مرتبہ ۸۹۲ھ مطابق ۱۴۸۷ء) شعرائے فارسی کا وہ پہلا دستیاب تذکرہ ہے جس کے نام میں یہ لفظ اوّلین جز کی حیثیت سے شامل ہے لیکن جہاں تک اس کے مفہوم کا تعلق ہے، سمرقندی کے بیانات سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے بھی اسے "یادگار و یادآوری" کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ لکھتا ہے کہ :

"علمائے دین دادِ آثار و اخبار دادہ اند و ابوابِ قصصِ انبیاء بر رخ خلق کشادہ اند شیخ عطار ..... در "تذکرۃ الاولیا" یدِ بیضا نمودہ و مورخان دانا در تواریخ و مقاماتِ سلاطینِ توانا مجلّدہا پرداختہ اند و کتابہا ساختہ و ہم چنیں در معرفتِ بلاد و مصلحتِ عباد آنچہ بایستنی است، فضلاء دران کار جہد نمودہ اند و یادگارے گزاشتہ اند۔ بیت

آنچہ مجہول ماندہ در عالم ذکرِ تاریخ و قصۂ شعر است

جہت آنکہ علماء باوجودِ فضل و کمال بدیں افسانۂ محقر قلم رنجہ نکردہ اند و سرِ ہمت فرد نیاوردہ اند و دیگران را اوقات مساعدت نہ کرد حالاتِ ایں طائفہ را، ہیچ آفریدہ از فضلا ضبط نہ نمودہ ..... (لہٰذا) از تواریخِ معتبرہ و از دواوینِ استادانِ ماضی و اشعارِ متقدمین و متاخرین و از رسائل متفرقہ و کتب سیر و غیر ذٰلک تاریخ و مقامات و حالات شعرائے بزرگ کہ ذکر دواوین و اشعار ایشان در اقالیم مشہور و مذکور است، جمع نمودم و از عہدِ اسلام الیٰ یومنا ہذا بہ تقریب شمۂ از تواریخِ سلاطینِ بزرگ کہ شعرائے نامدار

---

[1] تذکرۃ الاولیاء، مطبوعہ لندن ص ۶

بروزگارِ آن طائفہ بودہ اند، بدیں تذکرہ بقلم آوردم واز منشاتِ اکابر و لطائفِ اعاظم باتحقیقِ معرفتِ بلدان آنچہ توانستم، بقدرِ الوسع والامکان دریں تذکرہ بایراد رسانیدم۔"[۵۱]

اس اقتباس میں لفظ "تذکرہ" جس معنوی تناظر میں استعمال ہوا ہے، اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ سمرقندی اس کتاب کو اپنی زبان کے سخنوروں کی یاد تازہ رکھنے کی غرض سے ایک یادگار تحفے کے طور پر ناظرین کے سامنے پیش کر رہا ہے اور اس لفظ کا وہ اصطلاحی مفہوم جس نے عرفِ عام میں اس کے استعمال کو محض شعرا کے حالات و اشعار پر مشتمل تصنیف کے لیے مختص کر دیا، اس کے پیشِ نظر نہیں۔ مفہوم کی اس جدت آمیز تحدید کا سہرا دراصل، طاہر نصرآبادی کے سر ہے جس نے نہ صرف اپنے تذکرۂ شعرائے فارسی (مرتبہ مابین ۱۰۸۰ھ/۱۶۶۹ء و ۱۰۹۲ھ/۱۶۸۱ء) کو کسی خاص نام سے موسوم کرنے کے بجائے مطلقاً تذکرہ کہا، بلکہ دوسرے مقامات پر بھی اس روایت کو برقرار رکھ کر اپنے تصور کی پوری وضاحت کر دی۔ مقدمے کے تحت لکھتا ہے:

"سخن سنجان مثلِ محمد عوفی مولفِ "جامع الحکایات" بہ تسویدِ تذکرہ موسوم بہ لب الالباب (لباب الالباب) پرداختہ مشتمل بر اشعارِ سلاطین و شعرائے متقدمین و مرحوم میر علی شیر "در مجالس النفائس" و نواب شاہزادگی سام مرزا در "تذکر سامی" و دولت شاہ سمرقندی در "تذکرۃ الشعرا" و ملا صوفی در تذکرہ موسوم بہ "بت خانہ" آنچہ لازم سنجیدگی و حقوقِ برگزیدگی است، در تحقیق حالاتِ اہلِ نظم بہ ظہور رسانیدہ اند و بعد ایشان میر تقی کاشی بہ نگارشِ تذکرہ پرداختہ والحق دادِ سعی دادہ کہ بران مزیدے متصور نیست۔"[۵۲]

تذکرہ نصرآبادی کی تدوین کے بعد سے ایران کے بیشتر مصنفین نے "تذکرہ" سے یہی اصطلاحی معنی مراد لیے ہیں حتیٰ کہ اب اصولی طور پر فارسی میں اس لفظ کی معنویت

---

۵۱ تذکرۃ الشعرا مطبوعہ لیڈن ص ۱۳

۵۲ تذکرہ نصرآبادی مطبوعہ تہران ص ۵

کا دائرہ "کتابے کہ مقصودِ اصلیِ مولفِ آن ترجمۂ احوالِ شعرا باشد"[1] تک ہی محدود ہو گیا ہے۔ ہندوستان اور بالخصوص اردو زبان میں صورتِ حال اس سے قدرے مختلف ہے۔ یہاں یہ لفظ آج بھی مفرد و مرکب دونوں ہی صورتوں میں شرحِ حال رجال سے متعلق کسی بھی کتاب کے ساتھ بلا تامل وابستہ کیا جا سکتا ہے۔ مولوی عبدالجبار خاں ملکاپوری کی تصانیف "تذکرۂ سلاطینِ دکن" اور "تذکرۂ اولیاے دکن"، پنڈت کشن پرشاد کول کا مجموعۂ مضامین "ادبی اور قومی تذکرے" اور مولانا ابوالکلام آزاد کی خود نوشت "تذکرہ" اس کی روشن مثال ہیں، البتہ اہلِ زبان کے نزدیک یہاں بھی "تذکرہ" کے ساتھ اس کے اصطلاحی مفہوم کا رشتہ اس قدر استوار ہو چکا ہے کہ جب بھی تحریر و تقریر میں کسی تخصیص کے بغیر اس کا استعمال ہوتا ہے تو ہم اس سے تذکرۂ شعرا ہی مراد لیتے ہیں۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ عرب مصنفین نے اپنے شعرا، علما، فقہا اور دیگر ماہرینِ فنون کے جس قدر تذکرے ترتیب دیے ہیں ان میں سے اکثر کسی خاص نام سے موسوم نہ ہونے کی صورت میں "طبقات" کے زیرِ عنوان منظرِ عام پر آئے ہیں۔ مثال کے طور پر ابنِ سلام، ابن قتیبہ اور ابن المعتز کی تالیفات "طبقات الشعرا" کے ناموں سے موسوم ہیں "طبقات الادبا" مولفہ کمال الدین ابوالبرکات عبدالرحمٰن (متوفی ۵۷۷ھ/۸۲-۱۱۸۱ء) "طبقات الاولیا" مرتبہ شیخ سراج الدین عمر (متوفی ۸۰۳ھ/۱۴۰۰ء) اور علامہ جلال الدین عبدالرحمٰن ابنِ کمال السیوطی (۸۴۹ھ/۱۴۴۶ء تا ۹۱۱ھ/۱۵۰۵ء) کے مرتب کیے ہوئے مختلف الموضوع تذکرے "طبقات الحفاظ"، "طبقات المفسرین" اور "طبقات النحویین واللغویین" بھی اس ضمن میں آتے ہیں۔ ان میں سے اوّل الذکر تین ہم نام تذکروں کے علاوہ باقی تمام کتابوں کے نام کسی جامد اصول کے بجائے متقدمین کی قائم کردہ روایت کے اتباع پر مبنی ہیں کیونکہ ان کی ترتیب کے زمانے تک اس موضوع کی وسعتوں کو "تذکرہ" کے دامن میں سمیٹ لینے کی اختراع فارسی کی طرح عربی ادب کے وسیع دائرۂ اثر میں بھی کسی تعریف و تشریح کی

---

[1] مقدمہ لباب الالباب جلد اوّل از علامہ محمد بن عبدالوہاب قزوینی ص ۱۵

محتاج نہیں رہی تھی۔ عراق کے مشہور شیعہ فقیہ علامہ جلال الدین ابوالمنصور حسن بن یوسف (۶۴۸ھ/۱۲۵۰ء تا ۷۲۶ھ/۱۳۲۶ء) کا "تذکرۃ الفقہا لاہل الشیعہ" اور شمس الدین محمد بن احمد الذہبی دمشقی (۶۷۳ھ/۱۲۷۴ء تا ۷۴۸ھ/۱۳۴۸ء) کا "تذکرۃ الحفاظ" لفظ "تذکرہ" کے ابتدائی دور میں مستعمل مفہوم سے عربی ادیبوں کی واقفیت کا پتا دیتا ہے۔ لغوی معنی سے اہلِ زبان کا یہ انحراف روز افزوں علمی و ثقافتی روابط کے نتیجے میں عجمیوں کے لسانی تصرفات سے اثر پذیری کا غماز ہے۔

دورِ جدید میں عربی زبان کے مشہور لغت "المنجد" کے مرتب لوئس معلوف نے محمد عوفی کے "لباب الالباب" کو "اوّل تذکرۂ فارسیہ"[1] کہہ کر یہ بات بھی صاف کر دی ہے کہ موجودہ عرب دنیا اس لفظ کے معروف اصطلاحی مفہوم سے بھی بے خبر نہیں ہے۔

غرض یہ کہ مروجہ اصطلاحی معنی کی روشنی میں صرف وہی کتابیں "تذکرہ" کی تعریف میں آتی ہیں جن میں شعرا کے حالات اور ان کے کلام کے نمونے پیش کیے گئے ہوں۔ دوسرے الفاظ میں یہ دونوں عناصر (مختصر حالات اور منتخب کلام) اس صنفِ ادب کے وہ بنیادی اجزائے ترکیبی ہیں جن کی مربوط اور متوازن آمیزش کے بغیر کسی تصنیف کو تذکروں کی فہرست میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔ حالات کے تحت تذکرہ نگار شعرا کے نام اور تخلص، وطن اور جائے قیام، علمی و فنی استعداد، شاگردی و استادی کے روابط، مزاج و طبیعت کی افتاد، تصنیفی و تالیفی کارناموں کی نوعیت اور کلام کے مذاق و معیار کے متعلق ابتدائی قسم کی ضروری معلومات فراہم کرتا ہے۔ نمونہ کلام کے ذیل میں عام طور پر متفرق غزلوں کے منتخب اشعار اور کبھی کبھی دوسری اصنافِ سخن کے اقتباسات بھی پیش کیے جاتے ہیں۔ ترتیب کے اس بنیادی اصول کو برقرار نہ رکھتے ہوئے اگر کسی کتاب میں محض ہر شاعر کے نام اور تخلص کے ساتھ مختلف شاعروں کا کلام یکجا کر دیا جائے تو اسے "تذکرہ" کے بجائے "بیاض" کہا جائے گا، جب کہ زندگی اور شخصیت کے تفصیلی مطالعے اور کلام کے متعلق

---

[1] المنجد فی الادب والعلوم ص ۳۱۱

مفصل بحث کی صورت میں ایسی کتاب "تاریخِ ادب" کی تعریف میں آئے گی۔

تذکرے اور بیاض کا فرق

"بیاض" اصطلاحاً اس کتاب یا یادداشت کو کہتے ہیں جس میں اس کا مرتب وقتاً فوقتاً اپنی ضرورت اور ذوق کے مطابق معلومات اور مطالب کا اندراج کرتا رہتا ہے۔ اس کے لیے نہ وحدت موضوع درکار ہے اور نہ کسی خاص نظم و ترتیب کی پاسداری۔ مگر عین ممکن ہے کہ کوئی بیاض موضوعی وحدت اور باقاعدہ ترتیب دونوں کی پابند ہو۔ اشعار کی بیاضیں اسی ضمن میں آتی ہیں، کیونکہ ان میں صرف پسندیدہ اور منتخب کلام ہی یکجا کیا جاتا ہے۔ ان بیاضوں میں علی العموم ہر شاعر کے نام و تخلص اور کبھی کبھی اس کے وطن اور سلسلۂ تلمذ کی بھی وضاحت کر دی جاتی ہے لیکن تذکرہ نگار کی طرح بیاض نویس پر تمام شاعروں کے مختصر مگر جامع تعارف کی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ یہی وہ بنیادی فرق ہے جو تذکرے اور بیاض میں حدِ فاصل قائم کرتا ہے۔ لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی نے اس فرق کو ان الفاظ میں واضح کیا ہے:

> "فرق درمیانِ بیاض و تذکرہ ایں است کہ بیاض تنہا مشتمل بر اشعار بقیدِ نام شاعر و بلا قیدی باشد و تذکر محتوی ہم بر احوال شاعر باشد و ہم بر اشعار او۔"[1]

علامہ غلام علی آزاد بلگرامی کا بھی یہی خیال ہے کہ:

> "فرق درمیانِ بیاض و تذکرہ ہمیں باشد کہ بیاض تنہا اشعارِ شاعر دارد و تذکرہ احوال و اشعار ہر دو دارد۔"[2]

مختصر یہ کہ تذکرے کے مقابلے میں بیاض کا دائرہ بہت محدود ہے۔ لیکن اس کے باوجود بیاض اپنی ایک علٰحدہ اور مستقل حیثیت رکھتی ہے، چنانچہ بعض بیاضیں اپنے مرتبین

---

[1] گلِ رعنا مخطوطہ کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد ص ۵

[2] خزانۂ عامرہ ص ۱۱۸

کے حسنِ انتخاب کی بدولت غیر معمولی شہرت و اہمیت حاصل کر چکی ہیں اور بعض اس بنا پر اہم ہیں کہ ان کے ذریعے ایسے بے شمار شاعروں کے نتائج افکار ہم تک پہنچتے ہیں جن کی شہرت امتدادِ زمانہ کی تاب نہ لا سکی اور رفتہ رفتہ ان کے نام اور کارنامے صفحۂ ہستی سے معدوم ہو گئے۔ اس کے علاوہ اکثر تذکرہ نگاروں کو اس قسم کی بیاضوں سے اپنے تذکروں کے لیے خام مواد کی فراہمی میں کافی مدد ملی ہے۔ میر نے "نکات الشعرا" میں جا بجا سید عبد الولی عزلت سورتی کی بیاض سے استفادے کا اعتراف کیا ہے۔ خان آرزو کے تذکرے "مجمع النفائس" کا آغاز بھی ایک بیاضِ اشعار ہی کی شکل میں ہوا تھا۔ شعرائے فارسی کا ایک اور مشہور تذکرہ "خلاصۃ الشعرا" مولفہ عباس گجراتی بھی ملا محمد صوفی مازندرانی کے مرتب کیے ہوئے اس قسم کے ایک مجموعہ اشعار پر حالات کے اضافے کے بعد معرضِ وجود میں آیا ہے۔

تذکرے اور تاریخ ادب کا فرق

تذکروں کی طرح تاریخ ادب میں بھی (نثر نگاروں کے پہلو بہ پہلو) شعرا کے احوال و آثار سے بحث کی جاتی ہے لیکن دونوں میں نمایاں فرق یہ ہے کہ تذکرہ نگار شعرا کے تعارف میں تفصیل سے سروکار نہ رکھتے ہوئے محض ابتدائی قسم کی ضروری معلومات فراہم کرتے ہیں، اس کے برخلاف مورخ ہر فنکار کے حالاتِ زندگی کو متوازن شرح و بسط کے ساتھ قلمبند کرنے اور اس کی سرگذشت حیات کے منتشر سلسلوں کو ایک تنظیم و ترتیب کے تحت لانے کا فریضہ انجام دیتا ہے۔ اس کے علاوہ تاریخِ ادب صرف نمائندہ اور منتخب اربابِ فن کے ذکر پر مشتمل ہوتی ہے جب کہ تذکرے میں کسی شاعر کو محض اس کے کلام کی پست معیاری کی بنا پر نظر انداز کر دینا غیر مناسب خیال کیا جاتا ہے۔ خوب چند ذکا کے بقول:

"در تذکرہ اشعارِ رطب و یابس ہر کس نوشتن لازم آمدہ" و "ازیں خیال درگزشتن شعارِ تذکرہ نویسی نیست[1]"

---

[1] عیار الشعرا مخطوطہ علی گڑھ ورق ۱۴۴ الف و ۱۶۶ الف

مورخ کا شعار یا طریقۂ کار اس سے بڑی حد تک مختلف ہوتا ہے۔ اس کے نزدیک ان افراد کی کوئی وقعت نہیں ہوتی جو اپنے تخلیقی عمل کے ذریعے متقدمین کے چھوڑے ہوئے سرمائے پر کوئی قابلِ قدر اضافہ نہ کر پائے ہوں یا جن کی فکری و فنی کاوشیں زبان و ادب کے ارتقا میں کسی پیش رفت کی نشان دہی سے قاصر رہی ہوں۔ ان انفرادی خصوصیات کے ساتھ ہی تذکرے اور تاریخ کے حدود میں امتیاز کرتے وقت ان دونوں کے باہم مختلف اندازِ ترتیب کو پیشِ نظر رکھنا بھی ضروری ہے۔ تذکروں میں شعرا کو عام طور پر حروفِ تہجی کی رعایت سے ایک متعین مقام پر جگہ ملتی ہے، چنانچہ وہاں غالب کو میر سے اور میر کو ولی سے قبل متعارف کرانے میں کسی تامل یا اعتراض کی گنجائش نہیں لیکن ترتیب کا یہ طرز تاریخ کے مزاج سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا۔ مورخ کی نظر میں زمانے کی سب سے زیادہ اہمیت ہوتی ہے۔ وہ ہر فن کار کی شخصیت اور کارناموں کا مطالعہ اس کے عہد اور ماحول کے پس منظر میں کرنے کے بعد اس سے ضروری نتائج اخذ کرتا ہے۔ اس طرح اس کی دنیا بے پناہ وسعتوں سے ہم کنار ہو جاتی ہے اور اس کے بیانات کی دھوپ چھاؤں میں ہر دور کے اہلِ فن ایک مسلسل و مربوط کہانی کے مختلف کرداروں کی طرح متحرک اور سرگرمِ عمل نظر آتے ہیں۔

تاریخ ادب کے یہ امتیازات اسے تذکروں کے مقابلے میں جو غیر معمولی برتری عطا کرتے ہیں، اگر ایک طرف اس کا اعتراف ضروری ہے تو دوسری طرف تذکروں کی تقابلی فروماگی کے باوجود ان کی اہمیت بھی ناقابلِ انکار نظر آتی ہے۔ تذکرے تاریخ ادب کا ایک جز بھی ہیں اور اس کی بنیاد بھی۔ انھوں نے بلا استثنا تمام مورخین ادب کے لیے تحقیق و تلاش کی ظلمتوں میں چراغِ راہ کا کام دیا ہے۔ ان کے متفق علیہ بیانات سے حقائق کے عرفان اور واقعات کی تعبیر میں مدد ملتی ہے اور اختلافی مباحث نے ارباب نظر کے ذوقِ تجسس کو بیدار کر کے تحقیقی شعور کی پرورش اور نشو و نما کے موقعے فراہم کیے ہیں۔ چنانچہ آج بھی کوئی مورخ ان ماخذ کی جانب رجوع کیے بغیر اپنی تاریخ کے مکمل اور مستند ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ تذکروں کا یہی وہ بنیادی کردار ہے جو ہر صائب الرائے شخص کو ان کی

غیر معمولی اہمیت کے تسلیم کرنے پر مجبور کرتا ہے۔

تذکرہ نگاری کے تقاضے

اوپر کی سطور میں تذکرہ نگار، بیاض نویس اور مورخ کے فرائض و مراتب کا فرق واضح کرنے کی غرض سے جو تفصیلی بحث کی گئی ہے، اس سے تذکرہ نگاری کے فن کی نزاکتوں کا اظہار مقصود ہے۔

تذکرہ نگار کو بیاض نویس کی مختصر بیانی اور مورخ کی مفصل نگاری کے درمیان اعتدال و توازن کی راہ اختیار کرنا پڑتی ہے۔ اس مرحلے میں وہ دقتِ نظر اور قوتِ فیصلہ کی پے بہ پے آزمائشوں سے دوچار ہوتا ہے۔ ایک طرف تو اس کے لیے ہر شاعر کی زندگی کے ان تمام پہلوؤں کا احاطہ ناگزیر ہوتا ہے جن کی رنگ آمیزی کے بغیر اس کی شخصیت کی تصویر کشی ممکن نہ ہو اور دوسری طرف ان تمام واقعات کا نظر انداز کر دینا ضروری ہو جاتا ہے جنھوں نے اس کی شخصیت کی تہذیب اور فن کی تعمیر میں کوئی اہم کردار نہ ادا کیا ہو۔ اخذ و ترک کے اس مرحلے سے عہدہ برآ ہونے اور تفصیل و اختصار کو ایک دوسرے سے ہم آہنگ رکھنے کا یہ کام تلوار کی دھار پر چلنے کے مترادف ہے۔ لہٰذا ایک تذکرہ نگار کے لیے چند خاص اوصاف سے متصف ہونا اور اپنی بعض اہم ذمہ داریوں کو پوری طرح مدِ نظر رکھنا لازمی ہے ورنہ وہ اپنے موضوع کے ساتھ انصاف نہ کر سکے گا۔ مثال کے طور پر:

(الف) ایک عام مصنف کی طرح ہر تذکرہ نگار کا فطرت کے عطا کیے ہوئے ادبی ذوق اور ریاض کے شعلوں میں تپی ہوئی علمی استعداد سے بہرہ مند ہونا ضروری ہے۔ مطالعے سطحیت، شعور کی بے مائگی، قوتِ فیصلہ کی کمی اور اظہار و ابلاغ کے اسالیب پر قدرت کاملہ سے محرومی کی صورت میں محض دوسروں کی نقالی اسے منزلِ مراد تک نہیں پہنچا سکتی۔

(ب) تذکرہ نگار کے روابط اپنے دور کی فکری و ادبی تحریکات، علمی و ثقافتی مجالس اور شعر و ادب کی تخلیق میں سرگرم افراد سے پوری طرح استوار ہونا چاہئیں۔ کم آمیز، مردم بیزار اور خلوت پسند انسان چوں کہ شخصیات کے قریبی مطالعے اور دروں بینی کی نعمت سے محروم

رہتا ہے اس لیے وہ صحیح معنی میں تذکرہ نگاری کا حق ادا نہیں کر سکتا۔

(ج) تذکرے کی ترتیب کسی جامع اصول اور نظم و ضبط کی پابند ہونا چاہیے۔ اس غرض سے شعرا کو ان کے عہد یا مراتب کے بموجب مختلف طبقات میں بھی تقسیم کیا جا سکتا ہے اور تخلص کے حرفِ اوّل کی رعایت سے حروفِ تہجی کی ترتیب کے مطابق ہر حرف کے تحت آنے والے شاعروں کی علٰیحدہ علٰیحدہ ردیفیں بھی قائم کی جا سکتی ہیں۔ اس قسم کے کسی التزام سے صرفِ نظر کی صورت میں کسی خاص شاعر کے حالات تلاش کرنے کے لیے قاری کو اِدھر اُدھر بھٹکنا پڑتا ہے۔

(د) متقدمین اور دور دراز کے شہروں اور قصبوں سے تعلق رکھنے والے شعرا کے حالات مستند اور قابلِ اعتبار ذرائع سے اخذ کیے جائیں جب کہ معاصرین کے معاملے میں مناسب ترین طریقِ کار یہ ہو سکتا ہے کہ تذکرہ نگار حتی المقدور ہر شخص سے براہِ راست اس کی زندگی کے متعلق ضروری معلومات حاصل کرے اور اسے اپنے طور پر ترتیب دے۔ متعلقہ شعرا کے اعزہ احباب اور تلامذہ سے بھی اس سلسلے میں کافی مدد مل سکتی ہے۔

(ہ) تذکرہ نگار کا وسیع النظر منصف مزاج اور غیر جانب دار ہونا بھی بہت ضروری ہے۔ شعرا کے اخلاق و عادات پر تبصرے اور کلام کے متعلق اظہارِ رائے کے وقت اسے ذاتی تعلقات اور مروت و مخاصمت کے جذبات سے بالاتر ہو کر محض حقائق کی ترجمانی کا فریضہ انجام دینا چاہیے۔ علی ابراہیم خلیل کے بقول اس کے لیے یہ لازم ہے کہ "از غائلۂ جانبداری و فرض نااندیشی زشت را بخوبی و خوب را بزشتی وا ننماید"[1]۔

(و) کسی شخص کو محض اس لیے تذکرے میں جگہ دینے سے احتراز نہ کرنا چاہیے کہ اس کا کلام معیار یا مقدار کے لحاظ سے قابلِ اعتنا نہیں۔ البتہ ایسے شعرا کے تعارف میں اختصار کو مدِ نظر رکھنا ضروری ہے۔

(ز) تذکرہ نگار کا اسلوبِ تحریر واضح اور دل کش ہونا چاہیے۔ سادگی و پرکاری کے

---

[1] دیباچہ خلاصۃ الکلام بحوالہ تاریخ تذکرہ ہائے فارسی از احمد گلچین معانی جلد اوّل ص ۵۹۸

اس امتزاج کا خیال رکھنا اس لیے ضروری ہے کہ جس طرح انشا پردازی کا مظاہرہ اور غیر ضروری رنگین نگاری و عبارت آرائی اس موضوع کی سنجیدگی کو مجروح کر دیتی ہے، اسی طرح وقائع نویسی کا خشک اور بے کیف انداز بھی قارئین کی دل چسپیاں برقرار رکھنے میں ناکام رہتا ہے۔

(ح) تذکرہ نگار کو حتی الامکان تمام شاعروں کے کلام کا انتخاب ان کے دواوین کے معتبر و مستند نسخوں کو پیش نظر رکھ کر کرنا چاہیے۔ اس طریقۂ کار کی بدولت ہر شخص کے شاعرانہ کمالات کے متعلق اظہارِ خیال کی منزل بھی آسان ہو جاتی ہے اور اشعار کے متن میں لفظی تغیر و تبدل کا احتمال بھی باقی نہیں رہتا۔ جب کہ دوسرے تذکرہ نگاروں کے پسند کیے ہوئے کلام پر انحصار و اعتماد کی صورت میں یہ مقاصد پوری طرح حاصل نہیں ہو سکتے۔

(ط) ہر شاعر کا کلام اس طرح انتخاب کیا جائے کہ اس کے مطالعے سے اس کے فن کی تمام خوبیاں اور خامیاں پوری طرح آشکار ہو جائیں۔ معائب کی پردہ پوشی کے لیے محض بہترین شعروں کا انتخاب یا محاسن کو نظر انداز کرنے کی غرض سے پست اور غیر معیاری اشعار کی تلاش کسی طرح تذکرہ نگار کے منصب کو زیب نہیں دیتی۔

ان شرائط کے ساتھ ساتھ ایک تذکرہ نگار کی کامیابی بڑی حد تک بقدرِ ضرورت فرصت کی بہم رسی، سازگار ماحول کی موجودگی اور حالات کی مساعدت پر منحصر ہے۔ مولف کی ذہنی طمانیت جو کم و بیش ہر دور میں معاشی آسودگی سے وابستہ رہی ہے، ادبی صلاحیتوں کے ارتکاز کے اس بصیرت آزما مرحلے میں کافی اہم کردار ادا کرتی ہے۔

تذکرہ نگاری کے محرکات

ہر تخلیق اپنے وجود کے لیے کسی جذبے یا تحریک کی رہینِ منت ہوتی ہے چنانچہ تذکرہ نویسی کی طرف اہلِ قلم کے رجحان اور اس فن کے عہد بعہد ارتقا کے بھی کچھ مخصوص محرکات تھے۔ تذکروں کے مطالعے سے حاصل شدہ نتائج اور بعض تذکرہ نویس کے بیانات کی روشنی میں ان کی تفصیل یہ ہے:

(الف) **بقائے نام کی آرزو:** ہر ذی شعور انسان کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ

اپنے پیچھے ایسا کوئی کارنامہ چھوڑ جائے جس سے اس کے نام کو حیاتِ جاوید حاصل ہو اور اس کے بعد آنے والی نسلیں اس کا ذکرِ خیر کرتی رہیں۔ تذکرہ نگار بھی اس خواہش کے اثر و نفوذ سے مستثنیٰ نہیں۔ چنانچہ بعض لوگوں نے اپنے باکمال اسلاف و احباب کی یاد محض اس لیے تازہ کی ہے کہ شاید اس طرح ان کا نام بھی زندہ رہے۔ مثال کے طور پر عبداللطیف عباسی "خلاصۃ الشعرا" کے دیباچے میں اس توقع کا اظہار کرتے ہیں:

"بطفیل ایں بزرگان نامِ گم نام (ایں) کمترین نیز ..... مذکورِ السنہ و افواہِ اربابِ فضل و کمال گردد۔"[1]

نواب اعظم الدولہ میر محمد خاں سرور نے اپنے تذکرے کے دیباچے میں یہی بات اس انداز میں کہی ہے:

"امید از جنابِ باری است کہ مقبولِ اربابِ ایں فنِ شریف گردد و مطالعہ کنندگان محظوظ شوند و مولف را بدعائے خیر یاد دارند۔"[2]

(ب) اربابِ کمال کی قدر شناسی: فن کاروں کی قدر دانی کا حق ادا کرنے کی غرض سے ان کے حالاتِ زندگی اور کارناموں کو محفوظ کرنے کا خیال بھی تذکرہ نگاری کا ایک اہم محرک ہے۔ اس فن کا آغاز بالخصوص اسی خیال کے زیرِ اثر ہوا ہے۔ شیخ علی حزیں "تذکرۃ المعاصرین" کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

"یاد آوریِ دوستانِ یک دل و حقیقت پژوہی (پژوہانِ) کامل و پاسِ نیک صحبتِ یارانِ خلیل و اصدقائے جلیل (و) قدر شناسیِ ہنرِ ہر وضیع و نبیل بر آں داشت کہ ..... بذکرِ بعضے از یارانِ معاصر و ابیاتِ برخے از صاحب دلانِ صافی ..... پردازد تا بہ ادائے حق و داد و ہم احیائے نام و اثباتِ کلام و ابدائے مقام ہر یک نمودہ باشد۔"[3]

---

[1] بحوالہ "میخانہ" حاشیہ ص ۲۷۹

[2] عمدۂ منتخبہ ص ۲

[3] بحوالہ "تذکرہ نویس فارسی در ہند و پاکستان" ص ۳۶۷

مولوی قدرت اللہ شوق نے بھی "طبقات الشعرا" کی تالیف میں اسی قسم کے عوامل کی کارفرمائی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ :

"اشعارِ استادانِ ایں فن از دواوینِ مولفہ و ابیاضِ متفرقہ تلاش و جستجو نمودہ۔ .... بطریقِ تذکرہ ..... در سلکِ تحریر درآوردم تا چندے موجبِ اشتہار و باعث یادگاری چندیں بزرگوار بر صفحۂ روزگار گردد۔"[1]

(ج) ادبی و تحقیقی ذوق کی تسکین : بعض اہلِ علم محض طبعی مناسبت کی بنا پر تنقید و تحقیق کے مسائل سے خصوصی شغف رکھتے ہیں۔ گذشتہ صدی کے نصفِ اوّل کے اختتام تک ایسے لوگوں کے لیے اپنے ذوق کی تسکین اور ذہانت و فطانت کے اظہار کا تذکرہ نگاری سے بہتر کوئی اور ذریعہ موجود نہ تھا۔ اس لیے بھی اس فن کو اردو اور فارسی کے ادبی حلقوں میں کافی فروغ حاصل ہوا۔

(د) تاریخی شعور : شعری و لسانی روایات کی عہد بعہد ترقیوں کو ایک تاریخی دستاویز کی صورت میں منضبط کرنے اور اس طرح ادب کے ماضی و حال کا رشتہ اس کے مستقبل سے مربوط رکھنے کا خیال بھی تذکرہ نگاری کی ترویج و اشاعت کے محرکات میں شامل رہا ہے۔ مولوی عبدالحئی صفا بدایونی "شمیم سخن" کے آغاز میں لکھتے ہیں :

"خیال آتا ہے کہ کوئی سامان ایسا کیا جائے کہ جس کی بدولت ہماری زبان ترقی پائے۔ ہماری زبان کے موجودہ شاعروں کا نام باقی رہے اور زمانۂ حال کے حالات دیکھ کر آئندہ نسلوں میں بھی شوق تصنیف و تالیف پیدا ہو۔"[2]

(ہ) رقابت اور معاصرانہ چشمکیں : اربابِ فن کے باہمی اختلافات بھی تذکروں کی ترتیب میں بڑی حد تک ممد و معاون ثابت ہوئے ہیں۔ میر صاحب کا تذکرہ "نکات الشعرا" جب منظرِ عام پر آیا تو بہت سے ادیب و شاعر اس کی زہرہ گداز

---

[1] طبقات الشعرا مخطوطہ کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد ورق ۳۔ الف

[2] شمیم سخن حصہ اوّل ص ۸

تنقیدوں کی تاب نہ لاسکے۔ چنانچہ جوابی کارروائیوں کا آغاز ہوا جس کے نتیجے میں میر محمد یار خاکسار اور سید فتح علی گردیزی کے تذکرے معرضِ وجود میں آئے۔ اسی طرح قطب الدین باطن اکبر آبادی نے نظیر کی شاعری کے متعلق شیفتہ کی رائے سے برافروختہ ہو کر ان کے تذکرے "گلشنِ بے خار" کے جواب میں "گلستانِ بے خزاں" مرتب کیا اور ان کے بیانات کی تردید میں دل کھول کر قلم کے جوہر دکھائے۔

(و) ادبی گروہ بندی: بعض تذکرے اپنے استاد بھائیوں یا شاگردوں کی کثرتِ تعداد کو نمایاں کرنے یا اپنے ہم خیال اور ہم مسلک و ہم مشرب شاعروں کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کی غرض سے بھی مرتب کیے گئے ہیں۔ فارسی میں مرزا فاخر مکین کے شاگرد موہن لال انیس نے "انیس الاحبا" کے نام سے مکین اور ان کے تلامذہ کے حالات و کلام کی شیرازہ بندی کی ہے۔ اردو تذکروں میں مصحفی کا "ریاض الفصحا" اگرچہ بظاہر اس قسم کی کسی گروہ بندی یا تخصیص کا پابند نہیں لیکن درحقیقت اس کی تالیف کے پسِ پشت بھی یہی جذبہ کارفرما ہے کیونکہ شعرا کی فہرست میں مولف کے احباب اور تلامذہ کی بہ نسبت عام شاعروں کی تعداد بہت کم ہے۔

(ز) احباب و اعزہ کی فرمائشیں: دوستوں اور ساتھیوں کی فرمائشیں بھی تذکروں کی ترتیب میں ایک با اثر محرک کے طور پر کارفرما رہی ہیں۔ مصحفی "تذکرۂ ہندی" کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ:

"ایں فقیر..... بتکلیفِ میر مستحسن خلیق ..... قدم دریں بادیہ پرخار گزاشت۔"[1]

خوب چند ذکا مولف "عیار الشعرا" کا بیان ہے کہ میں یہ تذکرہ اپنے استاد شاہ نصیر دہلوی کے ایما پر مرتب کر رہا ہوں[2]۔ شیفتہ کا تذکرہ "گلشنِ بے خار" بھی "حسب دل خواہ" اور "یار عزیز" کے "امتثالِ امر" کی یادگار ہے[3]۔ مرزا علی لطف نے بھی "گلشن ہند" ڈاکٹر

---

[1] تذکرۂ ہندی ص ۳ [2] عیار الشعرا، مخطوطہ لندن ص ۲۷۵

[3] گلشنِ بے خار طبع اوّل ص ۵ و ۶

گلگرسٹ کی خواہش کے مطابق یورپین افسروں کے نصاب تعلیم میں شامل کرنے کی غرض سے مرتب کیا تھا۔

(ح) سرپرستوں کی خوشنودی: سلاطین وامرا سے وابستہ اہلِ قلم ان کی خوشنودی مزاج حاصل کرنے کی غرض سے بھی تذکرے ترتیب دیتے رہے ہیں۔ شعرائے فارسی کے کتنے ہی تذکرے اپنے وجود کے لیے اسی قسم کی ترغیبات کے رہینِ منت ہیں۔ مصحفی نے "تذکرۂ ہندی" اس امید کے ساتھ اپنے محسن ومربی مرشدزادہ آفاق مرزا سلیمان شکوہ کی خدمت میں پیش کیا تھا کہ "بنظرِ قبولِ آن والا جناب درآمدہ مقبولِ دل باگردد"[1] امیر مینائی کا تذکرہ "انتخاب یادگار" بھی جو انھوں نے نواب کلب علی خاں فرماں روائے رام پور کی ملازمت کے زمانے میں مرتب کیا ہے، اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

(ط) مشاعروں کی گرم بازاری: تذکرہ نگاری کے لیے سازگار ماحول تیار کرنے میں مشاعروں کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کا بھی بڑا حصہ ہے۔ میر تقی میر، میر غلام حسین شورش، مولوی قدرت اللہ شوق اور مصحفی شعرائے اردو کے ان تذکرہ نگاروں میں ہیں جن کے یہاں باقاعدگی کے ساتھ مشاعرے منعقد ہوا کرتے تھے۔ ان کے تذکروں میں ہم طرح اشعار کی فراوانی انھی محفلوں کے اثرات کی نشان دہی کرتی ہے۔

(ی) پسندیدہ کلام کو باقاعدہ نظم وترتیب کے ساتھ جمع کرنے کا شوق: فرصت کے لمحات میں لطف اندوزی کی خاطر یا محض حاصلِ مطالعہ کے طور پر منتخب اور بہترین اشعار یکجا کرنے کا شوق بھی تذکرہ نگاری کو فروغ دینے میں دوسرے عوامل سے کم اہمیت کا حامل نہیں۔ مرزا کاظم بتلا لکھنوی "گلشنِ سخن" کے دیباچے میں رقم طراز ہیں:

> "اکنوں چناں بخاطر رسید کہ از کلام ریختہ گویانِ سابق وحال ..... کہ دریں زمانہ کمالِ اشتہار در قلمروِ ہندوستان دارند، صحیفۂ جمع نمایم تا از مطالعہ آں شیفتگانِ محبوبانِ

---

[1] تذکرۂ ہندی ص ۲۸۲

معنی حظے وافر بردارند۔"[1]

مولوی عبدالحیٔ صفا بدایونی "شمیمِ سخن" کی تالیف کا پس منظر اس طرح بیان کرتے ہیں:

"شوقِ تصنیف و تالیف میں میں نے سیکڑوں شعرائے ماضی و حال اردو فارسی کے دیوان، بسیوں تذکرے، صدہا بیاضیں الٹ ڈالیں، کتبِ تواریخ و رسائلِ صنائع و بدائعِ شعری کی بھی اوراق گردانی کی۔ مختلف جلسے دیکھے، بڑے بڑے شعرائے باکمال کی صحبتوں سے مستفید ہوا۔ جس کا کلام دل کو بھلا معلوم ہوا اپنی بیاض میں درج کرلیا آخر کو اس انتخاب نے کچھ اور ہی رنگ پیدا کیا۔"[2]

ان محرکات کی روشنی میں یہ حقیقت بروے کار آتی ہے کہ تذکرہ نگاری کا فن وقت اور حالات کے تقاضوں کا ردِ عمل ہے۔ انسان کی ارتقا پذیر قوتِ فکر کی کرشمہ سازیاں ماحول اور زمانے کی تبدیلیوں کے ساتھ ان تقاضوں کی نوعیت اور ان کے نتائج کو ہر لحظہ نئے آب و رنگ سے آشنا کرتی رہتی ہیں۔ اس کے باوجود ہر نسل کے فن کار اپنی راہ کے تعین اور کوششوں کی کامیابی کے لیے بڑی حد تک اسلاف کے نقوشِ قدم ہی سے رہنمائی حاصل کرتے ہیں اس لیے ان کے کارناموں کی اہمیت کبھی زائل نہیں ہوتی۔ تذکروں کا بھی یہی حال ہے۔ آج عملاً تاریخِ ادب ان کی جگہ لے چکی ہے اور ان اغراض و مقاصد کی صورت گری کے لیے جن کی تکمیل کے ساتھ ان کی افادیت و مقبولیت کا دامن وابستہ تھا، علم و تحقیق کی وسیع تر شاہراہیں کھل گئی ہیں۔ تاہم کوئی انصاف پسند اور ذمہ دار مورخ یہ جرأت نہیں کرسکتا کہ ماضی کے اس عظیم ورثے کو پائے حقارت سے ٹھکرا کر آگے بڑھ جائے۔

تذکروں کی اہمیت

ایک عام قاری کے نقطۂ نظر سے تذکروں کو میرزا کاظم مبتلا اور لالہ خوب چند ذکا کے

---

[1] گلشنِ سخن مخطوطہ رام پور۔ ورق ۲۔ الف

[2] شمیمِ سخن حصہ اوّل ص ۸

بیان کردہ اسبابِ تالیف کے مطابق لطف اندوزی اور تفریحِ طبع کا ایک ذریعہ کہا جا سکتا ہے لیکن کسی زبان اور اس کے ادب کے ارتقا اور تاریخ کے مطالعے سے دل چسپی رکھنے والوں کے لیے ان کی اہمیت اور افادیت کا دائرہ کس قدر وسیع ہے، اس کا اندازہ ذیل کی تفصیلات سے کیا جا سکتا ہے۔

(الف) تذکروں نے ایسے بے شمار فن کاروں کو بے نام و نشان ہونے سے بچا لیا ہے جن کے کارنامے یا تو کسی وجہ سے مدون نہ ہو سکے یا مدون ہونے کے بعد ضائع ہو گئے۔ فن کاروں کے اس زمرے میں ان سخنوروں کے پہلو بہ پہلو جن کے کلام کی فنی سطح زیادہ بلند نہیں، بعض ایسے اساتذہ بھی شامل ہیں جنھوں نے انتہائی نازک مرحلوں میں کاروانِ شعر و سخن کی قیادت کی ہے اور اپنی کوششوں سے ایک نئے عہد کا سنگِ بنیاد رکھا ہے۔ اردو ادب کی تاریخ سے یہاں بطورِ مثال مصطفیٰ خاں یکرنگ، خان آرزو اور مرزا مظہر جانجاناں کے نام پیش کیے جا سکتے ہیں۔ ان اساتذہ کے کلام کے جو معدودے چند نمونے دستبردِ زمانہ سے محفوظ رہ کر ہم تک پہنچے ہیں وہ تذکروں ہی کے واسطے سے حاصل ہوئے ہیں۔

(ب) اس عام خامی کے باوجود تذکرہ نویسوں نے شعرا کے تعارف میں اکثر حد درجہ اختصار سے کام لیا ہے، تذکرے عام شاعروں کے حالاتِ زندگی، سیرت و شخصیت اور تخلیقی کاوشوں کے متعلق حصوں کی معلومات کا اہم ترین ذریعہ ہیں۔

(ج) بعض تذکروں میں ان کے مولفین نے زمانی و مکانی قرب سے پوری طرح فائدہ اٹھا کر ہم عصر شاعروں کے بارے میں انتہائی اہم اور کارآمد معلومات کا وہ بیش قیمت سرمایہ فراہم کر دیا ہے جو کسی دوسرے ذریعے سے حاصل نہیں ہو سکتا۔

(د) بعض تذکرہ نگار بذاتِ خود بڑے شاعر ہیں۔ انھوں نے دوسرے شعرا کے کلام میں جن خوبیوں اور خامیوں کی نشان دہی کی ہے یا بعض اوقات اشعار میں لفظی ترمیم و تغیر کے متعلق جو مشورے دیے ہیں ان کا مطالعہ خود ان کے رجحانِ طبع اور نظریۂ فن کو سمجھنے اور اس کی روشنی میں ان کے کلام کو زیادہ بہتر طور پر پرکھنے کے مواقع فراہم کرتا ہے۔

(ہ) کچھ تذکرہ نویسوں نے نہایت تندہی اور سلیقہ مندی کے ساتھ زیادہ سے زیادہ شاعروں کے بہترین اور منتخب اشعار یکجا کر دیے ہیں۔ ان انتخابات کا مطالعہ عام حالات میں دواوین کی تلاش و جستجو اور ورق گردانی کی زحمت سے بے نیاز کر دیتا ہے۔

(و) تذکروں میں کبھی کبھی ایسی کتابوں کے حوالے اور اقتباسات بھی مل جاتے ہیں جو یقینی طور پر فنا ہو چکی ہیں یا جن کے بارے میں معلومات کا کوئی اور ذریعہ موجود نہیں بطور مثال میر حسن نے انعام اللہ خاں یقین کے ذکر میں "نکات الشعرا" کا ایک ایسا اقتباس نقل کیا ہے جو اس کے گم شدہ ایڈیشن سے تعلق رکھتا ہے، یا مولوی کریم الدین نے "طبقات شعرائے ہند" میں فضلی کی "کربل کتھا" کی ایک طویل عبارت بطور نمونہ پیش کی ہے۔ یہ کتاب جو شمالی ہند کی اردو نثر کا بالکل ابتدائی نمونہ ہے اور حال ہی میں دستیاب ہوئی ہے، اب سے کچھ پہلے تک گم شدہ شاہکاروں میں شمار کی جاتی تھی۔ اس کی تلاش و دریافت بڑی حد تک کریم الدین کے اسی حوالے کی رہین منت ہے۔

(ز) کبھی کبھی تذکروں کے مطالعے سے کسی خاص شعر یا مکمل نظم کی تخلیق کا پس منظر بھی معلوم ہو جاتا ہے۔ مثلاً دہلی میں انشا اور مرزا عظیم بیگ کے درمیان جو زبردست معرکہ ہوا اور اس کے نتیجے میں ان شاعروں نے ایک دوسرے کی ہجو میں جو نظمیں کہیں، حکیم قدرت اللہ قاسم اور اعظم الدولہ سرور نے اپنے تذکروں میں ان کی تمام تفصیلات محفوظ کر دی ہیں۔

(ح) مختلف العہد تذکروں کے تقابلی مطالعے سے زمانے کے ساتھ ساتھ بدلتے ہوئے ادبی رجحانات، فن کی منزل بہ منزل ترقی اور زبان کے عہد بعہد ارتقا کی رفتار اور کیفیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

(ط) تذکروں میں نقل کیے گئے اشعار اور دواوین کی صورت میں مرتب شدہ کلام کے باہمی مقابلے سے متن کے ان اختلافات کی نشان دہی میں بھی مدد ملتی ہے جو بالعموم خوب سے خوب تر کی تلاش پر مبنی شعرا کے خود اصلاحی و خود تنقیدی عمل کا نتیجہ ہوتے ہیں۔

(ی) تذکروں میں اکثر ایسے اشعار بھی مل جاتے ہیں، جنھیں یا تو شاعر بست از

معیار قرار دے کر خود ہی اپنے کلام سے خارج کر دیتا ہے یا کسی اور وجہ سے وہ اس کے مجموعۂ کلام میں شامل نہیں ہو پاتے۔ غالبؔ کے منسوخ کلام کا ایک اچھا خاصہ حصہ اسی طرح دستیاب ہوا ہے۔

(ک) تذکروں سے متنازع فیہ کلام کی ملکیت کے تعین میں بھی مدد ملتی ہے۔ مثلاً قائمؔ چاندپوری کے بعض مشہور اشعار جو بالعموم سوداؔ سے منسوب کیے جاتے ہیں، خود ان کے تذکرے میں ان کے اپنے نام سے منقول ہیں۔ اس طرح ان شعروں پر سوداؔ کی بہ نسبت قائمؔ کا دعویٰ زیادہ قرینِ صحت معلوم ہوتا ہے۔ یا میرؔ نے "نکات الشعرا" میں حسنؔ شاگرد سوداؔ کے نام سے جو اشعار نقل کیے ہیں ان کے متعلق یہ فیصلہ کہ وہ میر حسنؔ مصنفِ "سحرالبیان" کی تصنیف نہیں، محض اس بنا پر کیا جا سکتا ہے کہ میر حسنؔ نے اپنے تذکرے میں ابوالحسن وحشتؔ کو ان کا مصنف قرار دیا ہے۔

(ل) تذکروں کے انتخابات کی بنیاد پر کسی حد تک ایک ہی شاعر کی مختلف غزلوں یا نظموں کے درمیان تاریخی تقدیم و تاخیر کے حدود بھی متعین کیے جا سکتے ہیں۔ بہ الفاظ دیگر کسی شاعر کے کلام کو تاریخی اعتبار سے مرتب کرنے میں بھی تذکروں سے خاص مدد ملتی ہے۔

(م) بعض تذکرہ نگاروں نے اپنے حالات کافی تفصیل کے ساتھ لکھے ہیں۔ اس کے علاوہ دوسرے شعرا کے ذکر میں بھی کہیں کہیں ان کے قلم سے ایسی باتیں نکل گئی ہیں جن سے ان کی اپنی زندگی اور شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ اردو میں میر حسنؔ اور مصحفیؔ کے تذکرے اس لحاظ سے خاص اہمیت کے حامل ہیں۔

(ن) بعض تذکروں کے ذریعہ شعرا کے بارے میں تذکرہ نگار کے علاوہ دوسرے اہل الرائے اور صاحب نظر اساتذہ کے خیالات کا بھی علم ہوتا ہے۔ قاسمؔ کے تذکرے میں جرأتؔ کے کلام کے متعلق میرؔ کی رائے اور "گلشنِ بے خار" میں میرؔ کی شاعری کی نسبت مفتی صدرالدین آزردہؔ کا مشہور قول اس کی مثال ہے۔

(س) بعض تذکرہ نگاروں نے مختلف شاعروں کے انتخابِ کلام کے تحت ان کی مشہور غزلوں کی زمین میں اپنی اور دوسرے شعرا کی غزلیں یا ان کے منتخب اشعار

بھی بطور نمونہ پیش کر دیے ہیں۔ ایسی صورتوں میں ایک ہی طرح اور ایک ہی قافیے میں مختلف اربابِ سخن کی طبع آزمائی کے نتائج کو سامنے رکھ کر ان کی پروازِ خیال، رسائیِ ذہن، اندازِ نظر اور معیارِ فکر کے مراتب سے بحث کی جا سکتی ہے۔

(ع) بعض تذکروں میں مختلف صاحبِ حال بزرگوں کے یہاں عرس اور سماع کی محفلوں کے انعقاد اور اربابِ ذوق کی قیام گاہوں پر مشاعروں کے مستقل اہتمام کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔ اسی طرح سیاسی خلفشار اور بدامنی کے نتیجے میں شعرا کی آشفتہ حالی، نئی پناہ گاہوں کی تلاش میں سرگردانی اور ترکِ وطن کے واقعات کا بھی جابجا ذکر آیا ہے۔ یہ بیانات مختلف زمانوں کے سیاسی و اقتصادی مسائل، تہذیب و معاشرت اور رسوم و رواج کے مطالعے سے شغف رکھنے والوں کے لیے دل چسپی کا سامان فراہم کرتے ہیں۔ گویا تذکروں کی ایک عمرانی اور تاریخی اہمیت بھی ہے۔

ترتیب کے مختلف انداز

ظاہری ترتیب کے لحاظ سے تذکروں کے درمیان خاصا فرق نظر آتا ہے۔ اس سلسلے میں جن اصولوں پر تذکرہ نگاروں کی ایک بڑی تعداد نے عمل کیا ہے یا جو طریقے عام طور پر مروج رہے ہیں ان کی تفصیل یہ ہے:

(الف) **جغرافیائی طرزِ ترتیب**: عربی و فارسی کے بعض مشہور تذکروں مثلاً "یتیمۃ الدہر" (ثعالبی)، "دمیۃ القصر" (باخرزی)، "لباب الالباب" (عوفی) اور "ہفت اقلیم" (امین رازی) وغیرہ میں مختلف ممالک یا علاقوں کے شعرا کے لیے علٰحدہ علٰحدہ ابواب مخصوص کیے گئے ہیں۔ چوں کہ یہ تفریق یا تخصیص جغرافیائی بنیادوں پر عمل میں آئی ہے اس لیے ترتیب کے اس خاص طرز کو جغرافیائی طرزِ ترتیب سے موسوم کیا جا سکتا ہے۔ اردو میں ایسا کوئی تذکرہ موجود نہیں جس میں اس طرز کو اپنایا گیا ہو۔

(ب) **تاریخی طرزِ ترتیب**: بعض تذکرہ نگاروں نے تاریخی اعتبار سے شعرا کی تقدیم و تاخیر یا شعری و لسانی روایات کے تدریجی ارتقا کو مدِنظر رکھتے ہوئے

متقدمین، متوسطین اور متاخرین کے علیٰحدہ علیٰحدہ طبقات قائم کیے ہیں۔ اس قسم کے تذکروں میں تاریخی شعور کی جھلک کافی نمایاں ہے۔ اردو میں قائم چاندپوری اور مولوی قدرت اللہ شوق نے اپنے تذکروں کے لیے یہی طرزِ ترتیب پسند کیا ہے۔

(ج) قاموسی طرزِ ترتیب: اس طرزِ ترتیب کی عملی شکل وہ تذکرے پیش کرتے ہیں جن میں لغت یا قاموس الاعلام (بیوگرفیکل ڈکشنری) کی ترتیب کے اصول پر شعرا کے حالات ان کے نام یا تخلص کے حرفِ اوّل کی رعایت سے حروفِ تہجی کی ابتشی یا ابجدی ترتیب کے مطابق مختلف ردیفوں کے تحت لکھے گئے ہیں۔ عربی میں اس قسم کے تذکروں کو اصطلاحاً "معجم" کہا جاتا ہے، لیکن یہ طرز عربی سے زیادہ فارسی اور اردو میں مقبول رہا ہے۔ شعرائے اردو کے بیشتر مشہور اور اہم تذکروں مثلاً "تذکرۂ ریختہ گویاں" (گردیزی)، "چمنستانِ شعرا" (شفیق اورنگ آبادی)، "تذکرۂ شعرائے اردو" (میر حسن)، "گلزارِ ابراہیم" (خلیل)، "تذکرۂ ہندی" و "ریاض الفصحا" (مصحفی)، "عیار الشعرا" (خوب چند ذکا)، "گلشنِ بے خار" (شیفتہ) اور "خمخانۂ جاوید" (لالہ سری رام) کی ترتیب اسی اصول پر ہوئی ہے۔

(د) غیر منظم طرزِ ترتیب: بعض تذکرے ایسے بھی ملتے ہیں جو ترتیب کے لحاظ سے کسی خاص نظم و ضبط کے پابند نہیں۔ ان تذکروں میں شعرا کے درمیان تقدیم و تاخیر کا فیصلہ مولف کی ذاتی پسند یا حالات و کلام کی دستیابی کے مواقع پر منحصر رہا ہے۔ اردو میں میر کے "نکات الشعرا" حمید اورنگ آبادی کے "گلشن گفتار" اور سعادت خاں ناصر لکھنوی کے "خوش معرکہ زیبا" کی یہی کیفیت ہے۔

تذکروں کی گروہی تقسیم

مشرقی زبانوں بالخصوص فارسی و اردو میں وقتاً فوقتاً شعرا کے جو تذکرے لکھے گئے ہیں ان میں معیارِ فن اور اندازِ ترتیب کے لحاظ سے کوئی بہت بڑا فرق نظر نہیں آتا۔ اس کے باوجود ہم انھیں بھی ضمنی مگر مابہ الامتیاز خصوصیات کی بنا پر مختلف گروہوں میں

تقسیم کر سکتے ہیں۔ اس وقت اردو کی مثال ہمارے پیش نظر ہے۔ یہاں میر، گردیزی اور قائم نے تذکرہ نویسی کے بالکل ابتدائی دور میں جن روایات کی بنیاد رکھی ہے ان میں ضرورت اور وقت کے تقاضوں کے مطابق برابر ردّ و بدل ہوتا رہا۔ کسی تذکرہ نگار نے اپنے دائرۂ کار کو وسعت دے کر حسب مقدور تمام معلوم الاسم شاعروں کے حالات و اشعار جمع کرنے کی کوشش کی، کسی کی توجہ صرف بہترین اشعار کے فراہم کرنے پر مرکوز رہی، کسی کا زورِ قلم خصوصیت کے ساتھ نامور اور مسلم الثبوت اساتذہ کے تعارف پر صرف ہوا اور کسی کو معلومات کے ذرائع و وسائل کی کمی اور اسی قسم کے دوسرے عوامل کی بنا پر یا خصوصی دل چسپی کے باعث اپنی کوششیں ایک خاص دبستان، علاقے یا عہد سے تعلق رکھنے والے شعرا کی ترجمانی تک محدود رکھنا پڑیں۔ اغراض و مقاصد کی ان تبدیلیوں کے ساتھ تذکروں میں تنوع کا عنصر داخل ہوا جس کی بدولت ایک جانب تو ایک ہی قسم کے مطالب کی تکرار سے پیدا ہونے والی بے کیفی کے امکانات تقریباً ختم ہو گئے اور دوسری طرف قارئین کو ہر دور، ہر علاقے اور ہر درجے کے شعرا سے واقفیت کے مواقع حاصل ہوئے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ نے اردو تذکروں کی انھیں مختلف النوع خصوصیات کو مدنظر رکھتے ہوئے انھیں مندرجہ ذیل خانوں میں تقسیم کیا ہے[1]

اوّل: وہ تذکرے جن میں صرف اعلیٰ شاعروں کے مستند حالات جمع کیے گئے ہیں اور ضمناً کلام کا انتخاب بھی دیا ہے۔

دوئم: وہ تذکرے جن میں تمام قابلِ ذکر شعرا کو جگہ دی گئی ہے اور مصنف کا مقصد جامعیت اور استیعاب ہے۔

سوئم: وہ تذکرے جن کا مقصد تمام شعرا کے کلام کا عمدہ اور مفصل انتخاب پیش کرنا ہے اور حالات کے جمع کرنے کی طرف زیادہ اعتنا نہیں۔ بیاض اور مجموعے اس صنف میں شامل ہیں۔

---

[1] شعرائے اردو کے تذکرے ص ۱۰

چہارم: وہ تذکرے جن میں اردو شاعری کو مختلف طبقات میں تقسیم کیا گیا ہے اور تذکرے کا مقصد شاعری کا ارتقا دکھانا ہے۔

پنجم: وہ تذکرے جو شاعری کے ایک مخصوص دور سے بحث کرتے ہیں۔

ششم: وہ تذکرے جو کسی وقتی یا ادبی گروہ کے نمائندے ہیں۔

ہفتم: وہ تذکرے جن کا مقصد محض تنقید سخن اور اصلاح سخن ہے۔

ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ نے مطالب کی نوعیت کے بجائے مولفین کی حیثیت کے لحاظ سے تذکروں کے تین درجات قائم کیے ہیں[1]:

۱۔ وہ تذکرے "جو کسی بڑے شاعر کے نتیجۂ قلم ہیں"۔

۲۔ وہ تذکرے "جن کے مصنف خود بڑے شاعر نہیں لیکن کسی بڑے شاعر کے گرویدہ شاگرد تھے"۔

۳۔ وہ تذکرے "جن کے مصنفوں کو سخن گو نہیں بلکہ سخن فہم کہا جا سکتا ہے۔

"قسم اوّل کے (تذکروں کے) مصنف چونکہ خود بڑے شاعر ہیں اس لیے ان میں زیادہ تر مشہور شاعروں ہی کا تذکرہ کیا گیا ہے معمولی شاعر بالکل نظرانداز کر دیے گئے ہیں ..... (اور) .... حالات کی طرف توجہ کرنے کی جگہ صرف .... شعر شاعری پر تنقید کرنے کی کوشش کی (گئی) ہے۔

دوسری قسم کے تذکرے چھوٹے بڑے سب شاعروں کو فراخ دلی سے پیش کرتے ہیں لیکن .... ان کی تحریر کا سب سے اہم مقصد یہ ہوتا ہے کہ اپنے استاد اور ان کے دوستوں یا اپنے استاد بھائیوں یا دوست شاعروں کو روشنی میں لایا جائے...

تیسری قسم کے تذکروں سے .... شاعروں کے اصلی مرتبے اور ان کی شاعری کی نوعیت کا پتہ چلتا ہے ..... کیونکہ ان کا مقصدِ تحریر ادبی تنقید کے سوا اور کوئی نہیں ہوتا"

---

[1] مقدمہ گلزارِ ابراہیم ص ۳۱ و ۳۲

بعض ناقدین نے "خاص" اور "عام" یا "مرکزی" اور "جوابی" تالیفات کے زیرِعنوان بھی تذکروں کے مختلف فیہ حدودِ عمل کا تعین کیا ہے۔ لیکن ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے خیال میں یہ ساری تقسیمیں بنیادی طور پر دو خاص گروہوں میں ضم ہو جاتی ہیں۔

۱۔ بیاضی تذکرے جن کا اصل مقصود انتخاب اشعار ہے۔

۲۔ سوانحی تذکرے جن میں شعرا کے حالات جمع کرنے اور ان کے کلام پر تنقیدی نظر ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے[1]

اگر تذکروں کی داخلی خصوصیات کا بنظرِ غایر مطالعہ کیا جائے تو ان میں سے کسی بھی معیارِ تقسیم کو مکمل اور جامع و مانع نہیں کہا جا سکتا۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کی مجوزہ گروہ بندی اس لحاظ سے ترمیم طلب ہے کہ ان کے بیان کے برخلاف اردو میں اور شاید فارسی میں بھی ایسا کوئی تذکرہ موجود نہیں جس میں انتخابِ کلام کو ضمنی حیثیت دی گئی ہو[2] اس کے علاوہ انھوں نے کسی مخصوص دور یا ادبی و وطنی گروہ سے تعلق رکھنے والے تذکروں کو علاحدہ علاحدہ جگہ دی ہے، لیکن ان تذکروں کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے جن کا بنیادی مقصد کسی خاص صنفِ سخن، مذہبی گروہ یا سماجی طبقے کی نمایندگی کرنا ہے۔ اسی طرح تنقیدِ کلام اور اصلاحِ سخن کا عنصر اگرچہ بعض تذکروں میں کافی نمایاں ہے پھر بھی اسے کسی تذکرہ نگار کے یہاں اساسی حیثیت حاصل نہیں۔

ڈاکٹر زور کے مقرر کردہ معیار بھی اپنی تشریحات کی روشنی میں حقائق سے زیادہ مفروضات پر انحصار کی نشاں دہی کرتے ہیں۔ ان کی تقسیم کے مطابق میر، قائم، میر حسن، مصحفی اور شیفتہ کے تذکرے قسمِ اوّل کے تحت آئیں گے حالانکہ نہ تو ان میں غیر معروف اور کم پایہ شاعروں کے ذکر سے احتراز کیا گیا ہے اور نہ حالات کو کم تر اہمیت دے کر صرف

---

[1] نگار پاکستان۔ تذکروں کا تذکرہ نمبر ص ۲۹

[2] آبِ حیات (محمد حسین آزاد) اور گلِ رعنا (عبدالحئی) وغیرہ میں یہ خصوصیت پائی جاتی ہے مگر ہمارے نزدیک ان کتابوں کو تذکروں کی فہرست میں شامل کرنا مناسب نہیں۔

شاعری پر تنقید کی کوشش کی گئی ہے۔ علاوہ ازیں دوسری اور تیسری قسم کے تذکروں کے درمیان حدِ فاصل کا تعین بھی عملاً دشوار ہے کیونکہ اکثر و بیشتر تذکرہ نگار نہ تو خود بڑے شاعر ہیں اور نہ کسی بڑے شاعر کے گرویدہ شاگرد، لیکن ان کو محض سخن فہم قرار دینا اور ان کی سخن گوئی میں کلام کرنا کسی طرح مناسب نہیں۔ بحث کا ایک دلچسپ پہلو یہ بھی ہے کہ ڈاکٹر زور نے فرقِ مراتب کی اس وضاحت کے بعد اپنے اصل موضوع یعنی "گلزارِ ابراہیم" کے تعارف کی طرف آتے ہوئے اسے تیسری قسم کے تذکروں میں شمار کیا ہے جن کا مقصد ان کے بیان کے مطابق ادبی تنقید کے سوا اور کوئی نہیں ہوتا جب کہ یہ تذکرہ صرف مولف کے ذوقِ تحقیق یا بالفاظِ دیگر اپنے سوانحی عنصر کی وجہ سے ممتاز ہے اور ادبی تنقید سے اسے دور کا بھی واسطہ نہیں۔

دوسرے ناقدین کی تقسیموں کا نقص یہ ہے کہ انھوں نے اختصار یا جامعیت کی کوشش میں ابہام کی مطلق پروا نہیں کی ہے اور بعض ایسے پہلوؤں کو یکسر نظر انداز کر دیا ہے جو مستقل حیثیت یا نمایاں اہمیت کے حامل ہیں۔ اس لیے ہمارے نزدیک تمام اردو تذکروں کو ان کے اغراض و مقاصد یا معنوی امتیازات کے اعتبار سے مندرجہ ذیل خانوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے

۱۔ تعارفی تذکرے۔ وہ تذکرے جن کے مولفین نے علمی و ادبی ذوق یا جذبۂ قدر شناسی کے تحت شعرا کے حالات و اشعار کو ضبطِ تحریر میں لانے کی کوشش کی ہے اور علی العموم بے جا تنقیص و تعریض سے دامن بچائے رکھا ہے۔ اس قسم کے تذکروں کی مثالیں بکثرت موجود ہیں۔

۲۔ جوابی تذکرے۔ وہ تذکرے جن کے مولفین نے دوسرے تذکرہ نگاروں کی ضد میں قلم اٹھایا ہے اور اپنی تمام تر صلاحیتیں حریف تذکرہ نگار کے بیانات کی تردید یا اپنے احباب کی تعریف و تحسین اور مخالفین کی تشہیر و تضحیک پر صرف کر دی ہیں۔ قطب الدین باطنؔ اکبر آبادی کا تذکرہ "گلستان بے خزاں" اسی ضمن میں آتا ہے۔

۳۔ انتخابی تذکرے۔ وہ تذکرے جن میں انتخابِ کلام اور ترتیبِ اشعار کو حالات کی تلاش و تحریر سے زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ اس قسم کے تذکروں کی مثال میں حیدر بخش حیدری کے "گلشنِ ہند"، بینی نرائن کے "دیوانِ جہاں" اور شاہ کمال کے "مجمع الانتخاب" کو پیش کیا جا سکتا ہے۔

جوابی اور انتخابی تذکروں کو دوسرے ضمنی یا ذیلی گروہوں میں منقسم کرنے کی گنجائش نہیں، البتہ تعارفی تذکرے اپنے حدودِ عمل کے لحاظ سے دو گروہوں میں تقسیم کیے جا سکتے ہیں۔

۱۔ عام تذکرے۔ جن تذکروں میں بلا تخصیص تمام قابلِ ذکر اور معلوم الاحوال شاعروں کو جگہ دی گئی ہے۔ ان تذکروں کی تین قسمیں ہو سکتی ہیں:

(الف) مرکزی تذکرے۔ وہ تذکرے جن کے مرتبین نے شعرا کے تعارف میں حتی الامکان ذاتی واقفیت اور تحقیق و تلاش سے کام لیا ہے۔ مثلاً مخزنِ نکات، مسرت افزا، گلزارِ ابراہیم، تذکرۂ ہندی، ریاض الفصحا اور شمیم سخن وغیرہ۔

(ب) متوسط تذکرے۔ وہ تذکرے جن میں ذاتی تلاش و جستجو اور پیشرو تذکرہ نویسوں کی فراہم کردہ معلومات سے استفادے کا تناسب کم و بیش برابر ہے اور بالارادہ دیانت کے اُصول پامال نہیں کیے گئے ہیں۔ مثلاً چمنستانِ شعرا، تذکرہ میر حسن، تذکرہ بے جگر اور گلشن بے خار وغیرہ۔

(ج) طفیلی تذکرے۔ وہ تذکرے جن کے مؤلفین نے صرف دوسرے تذکرہ نگاروں کے بیانات کی تلخیص اور ان کے پسند کیے ہوئے کلام کے انتخاب پر قناعت کی ہے اور اکثر اپنے مآخذ کا حوالہ دینے سے پہلو تہی کی ہے مثلاً تذکرہ ریختہ گویان اور ریاض حسنی وغیرہ۔

۲۔ خاص تذکرے۔ وہ تذکرے جن میں تمام شعرا کے درمیان کسی مخصوص وحدت کو لازمی قرار دیا گیا ہے۔ اس طرح کے تذکرے زیادہ تر درج ذیل اقسام کے تحت آتے ہیں۔

(الف) **مخصوص بالعہد تذکرے** ۔ وہ تذکرے جن کا دائرۂ کار کسی خاص عہد تک محدود رہا ہے ۔ مثلاً غلام محی الدین مبتلا کا تذکرہ "طبقاتِ سخن" محمد شاہ کے عہد کے آغاز (۱۱۳۱ھ/۱۷۱۹ء) سے اکبر شاہ ثانی کے پہلے سالِ جلوس (۱۲۲۱-۲۲ھ/ ۱۸۰۶-۷ء) تک کے شاعروں کے ذکر پر مشتمل ہے ۔

(ب) **مخصوص بالمقام تذکرے** ۔ وہ تذکرے جن میں کسی خاص علاقے یا شہر کے شعرا کو متعارف کرایا گیا ہے مثلاً مخزن شعرا (تذکرۂ شعرائے گجرات) مرتبہ قاضی نورالدین فائق گجراتی، انتخابِ یادگار (تذکرۂ شعرائے رام پور) مولفہ امیر مینائی اور محبوب الزمن (تذکرۂ شعرائے دکن) از مولوی عبدالجبار ملکاپوری ۔

(ج) **مخصوص بالمذہب تذکرے** ۔ وہ تذکرے جو کسی خاص مذہبی گروہ کی نمایندگی کرتے ہیں ۔ مثلاً "آثارالشعرائے ہنود" از منشی دیبی پرشاد بشاش و "تذکرۂ ہندو شعرا" موسوم بہ "بہارِ سخن" از شیام سندر لال برق سیتاپوری ۔

(د) **مخصوص بالجنس تذکرے** ۔ وہ تذکرے جن میں جنسی تفریق کی بنا پر کسی ایک ہی طبقے کے سخنوروں کو جگہ دی گئی ہے ۔ مثلاً "بہارستان ناز" مولفہ رنج میرٹھی اور "چمن انداز" مرتبہ درگا پرشاد نادر دہلوی صرف خواتین کے حالات و کلام پر مشتمل ہیں ۔

(ہ) **مخصوص بالصنف تذکرے** ۔ وہ تذکرے جن میں بطور خاص کسی ایک صنف یا موضوعِ سخن پر طبع آزمائی کے نمونے پیش کیے گئے ہیں ۔ مثلاً عبدالغفار نساخ کا تذکرہ "قطعۂ منتخب" صرف قطعہ گو شاعروں کا تذکرہ ہے اور "سراپا سخن" مولفہ محسن لکھنوی صرف ان شعرا کے ذکر پر مشتمل ہے جنھوں نے اپنی بعض غزلوں یا اشعار میں اعضائے جسمانی کے نام بطورِ ردیف یا جزوِ ردیف استعمال کیے ہیں ۔

ان سطور میں ہم نے تذکروں کی گروہی تقسیم کے لیے جو بنیادیں قائم کی ہیں ان کے دائرہ اطلاق سے شاید ہی کوئی تذکرہ خارج رہے تاہم ایسے کچھ تذکرے ضرور ملیں گے جنھیں ان کی متنوع خصوصیات کے پیشِ نظر قطعی طور پر کسی ایک

گروہ کے تحت لانا ممکن نہ ہوگا۔ مثال کے طور پر گردیزی کے بلند بانگ دعوے یہ ظاہر کرتے ہیں کہ "تذکرۂ ریختہ گویان" ایک جوابی تذکرہ ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس تذکرے میں جواب نویسی کی کوئی خصوصیت موجود نہیں اور اس کا بیشتر مواد میر کے "نکات الشعرا" سے ماخوذ ہے۔ اسی طرح شیفتہ نے "گلشنِ بے خار" میں "اشعار دلارا" کی گردآوری کو اپنا مطمحِ نظر قرار دیا ہے اور صرف غزلوں کے اشعار انتخاب کیے ہیں مگر ان کی وسیع جولان گاہِ عمل میں یہ شعوری التزام تعارف نگاری کی گردِ راہ بن کر رہ گیا ہے۔ ایسی صورت میں صحیح طریقۂ کار یہی ہو سکتا ہے کہ مولفین کے بیان کردہ اغراض و مقاصد یا اسباب کی بجائے اصل موضوعات اور نمایاں خصوصیتوں کو معیارِ تفریق بنایا جائے۔ یہاں ہم نے اسی اصول کے پیشِ نظر "تذکرۂ ریختہ گویان" کو قسمِ سوئم کے اور "گلشنِ بے خار" کو قسمِ دوئم کے عام تعارفی تذکروں میں شمار کیا ہے۔

عربی و فارسی میں تذکرہ نگاری کی روایت

تذکرہ نگاری کا آغاز

مشرق کے ادبی قلمرو میں تذکرہ نگاری کا ارتقائی سفر سرزمینِ عرب سے شروع ہوتا ہے۔ طلوعِ اسلام سے قبل یہ خطہ اگرچہ تہذیب و شائستگی اور علم و یقین کی دولت سے محروم تھا لیکن اس کے فرزندوں کی بے پناہ قدرت کلام اور شاعری و خطابت کے میدان میں ان کے لازوال کارنامے ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر چکے تھے۔ اس زمانے میں تحریری صورت میں فنی شاہکاروں کے تحفظ کی کوئی روایت موجود نہیں تھی۔ عرب اپنی بے مثال قوت حافظہ پر مکمل اعتماد و انحصار کے باعث نہ صرف فنِ تحریر سے ناآشنا تھے بلکہ تخلیق و تحریر کی پیوند کاری کو باعثِ ننگ اور اس خداداد صلاحیت کی توہین تصور کرتے تھے۔ دورِ اموی کے مشہور محدث محمد بن مسلم بن شہاب الزہری (متوفی ۱۲۴ھ مطابق ۷۴۲ء) کا یہ قول کہ "ہم لوگ علم کو تحریر میں لانا پسند نہیں کرتے مگر امرا نے ہم کو مجبور کیا"[1] اسی تصور کی ہمہ گیری پر دلالت کرتا ہے۔ شعرا کے سرمایۂ افکار کی حفاظت و اشاعت کے لیے اس وقت یہ طریقہ کار رائج تھا کہ ہر شاعر کے ساتھ ایک راوی ہمہ وقت موجود رہتا جو اس کے کلام کو ازبر رکھنے اور شائقین نیز دوسرے راویوں تک منتقل کرنے کا ذمہ دار ہوتا تھا۔ اسی عالم میں نبی کریم حضرت محمد صلعم کی بعثت اور نزولِ قرآن کے واقعات رونما ہوئے۔ وحیِ مرسل

---

[1] ادب العرب ص ۲۴۳

کے دل نشیں طرزِ خطاب اور موثر اسلوبِ بیان نے عربوں کی فصاحت و بلاغت کے چراغ گل کر دیے۔ فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّن مِّثْلِهِ[1] کی بلند بانگ تحدّی زباں دانی و قادر الکلامی کے تمام دعووں پر پانی پھیر گئی اور شعر و شاعری کے بازار سرد ہو گئے۔ بدلے ہوئے ماحول کے تقاضوں اور نئی نئی ضروریات کے پیشِ نظر حلقہ بگوشانِ اسلام نے تحریر سے بے اعتنائی کے روایتی تصوّر کو خیر باد کہا اور آیات و احادیث، احکامِ شرعی، خطوط و فرامین اور جنگی معاہدوں اور صلح ناموں کی کتابت کے ساتھ خطابت کی جہانگیری کے پہلو بہ پہلو قلم کی فرماں روائی کا دور شروع ہوا۔ البتہ خلافتِ عباسیہ کے زمانۂ قیام (تاریخ آغاز ۲۸ ذی الحجہ ۱۳۲ھ مطابق ۶ اگست ۷۵۰ء) تک مسلمان تسخیری مہمات اور خانہ جنگیوں میں مصروفیت کے باعث اپنے سرمایہ علم و فن کی تدوین پر حسبِ ضرورت توجہ صرف نہ کر سکے۔ اس میدان میں ان کے باقاعدہ ورود کی تاریخ عباسیوں کے دورِ حکومت ہی سے شروع ہوتی ہے۔ مورخین نے اس خاندان کے طویل دورِ اقتدار کی پہلی صدی کو عربی ادب کے عہدِ زرّیں سے تعبیر کیا ہے[2]۔ اس صدی میں جہاں مختلف موضوعات پر نثر کی بے شمار کتابیں تصنیف ہوئیں، وہیں ماضی کی ادبی یادگاروں کے تحفظ اور روزمرہ تحریر و تقریر میں الفاظ کے محلِ استعمال، معنی و مفہوم اور فصاحت و غرابت پر استناد کی خاطر سلطنت کے مختلف گوشوں میں بکھرے ہوئے راویوں کی مدد سے اسلاف کے شعری سرمائے کی تدوین و ترتیب کا سلسلہ بھی قائم ہوا۔ اسی مقصد کے تحت شعرا کے حالاتِ زندگی اور کارناموں کی تفصیلات جاننے اور انھیں محفوظ کر کے آئندہ نسلوں تک پہنچانے کی اہمیت محسوس کی گئی، جس کی بدولت تذکرہ نگاری کے لیے فضا ہموار ہوئی چنانچہ شعرائے عرب کا پہلا تذکرہ نگار ابو عبداللہ بن سلّام الجمحی اسی صدی سے تعلق رکھتا ہے۔

---

[1] سورہ البقرہ آیت نمبر ۲۳

[2] عربی ادب ص ۱۸۵

عربی تذکرہ نگاری کی روایت

محققین کے اتفاق رائے کے مطابق ابن سلاّم (متوفی ۲۳۲ھ مطابق ۸۴۵ء) وہ پہلا صاحبِ قلم ہے جس نے عربی میں تذکرہ نگاری کا سنگِ بنیاد رکھا[۱]۔ وہ بصرے کا رہنے والا تھا اور نقدِ شعر پر بڑی دسترس رکھتا تھا۔ اس نے شعرائے جاہلیت و اسلام کے علیٰحدہ علیٰحدہ طبقات قایم کر کے "طبقات الشعرا" کے نام سے ان کے حالات اور کلام کے نمونے کتابی صورت میں مرتب کیے۔ یہ تذکرہ دو[۲] حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصے میں "طبقات الشعراء الجاہلین" کے عنوان سے دس طبقات میں جاہلیت کے شعرا کا ذکر کیا گیا ہے۔ دسویں طبقے کے اختتام پر چند مرثیہ گویوں کا ذکر ہے اس کے بعد مدینے، مکے، طائف اور بحرین کے شاعروں اور پھر مدینے کے یہودی شعرا کو علیٰحدہ علیٰحدہ متعارف کرایا گیا ہے۔ دوسرا حصہ "طبقات الشعراء الاسلامیین" بھی دس طبقات پر مشتمل ہے۔ ان میں اسلامی دور کے شاعروں کے حالات و اشعار منقول ہیں[۲]۔

ابن سلاّم کے بعد تیسری صدی ہجری کے تذکرہ نگاروں میں محمد بن حبیب النحوی (متوفی ۲۴۵ھ مطابق ۸۵۹ء)، ابو زید عمر بن شعبہ البصری (متوفی ۲۶۲ھ مطابق ۸۷۶ء)، ابو محمد عبداللہ بن مسلم بن قتیبہ (متوفی ۲۷۶ھ مطابق ۸۸۹ء)، ابو عبداللہ ہارون بن علی بن یحییٰ بن ابی منصور المنجم البغدادی (متوفی ۲۸۸ھ مطابق ۹۰۱ء) اور ابو العباس عبداللہ ابن المعتز (متوفی ۲۹۶ھ مطابق ۹۰۸ء) کے نام آتے ہیں۔ محمد بن حبیب النحوی اور ابو زید عمر بن شعبہ البصری کے تذکروں کا حوالہ "کشف الظنون" میں "طبقات الشعرا" کے نام سے لکھی جانے والی کتابوں کی فہرست میں ملتا ہے[۳]۔ اس کے علاوہ ان کے متعلق

---

[۱] کشف الظنون جلد چہارم ص ۱۴۴ و فرہنگ نامۂ پارس جلد اوّل ص ۶۱۹

[۲] بحوالہ "طبقات الشعرا" مرتبہ جوزف ہیل

[۳] کشف الظنون جلد چہارم ص ۱۴۴

مزید معلومات حاصل نہیں ہوتیں۔ ابنِ قتیبہ، ابنِ سلام کے بعد اس دور کا سب سے مشہور اور ممتاز تذکرہ نگار ہے۔ اس کا خاندان مرو (ایران) کا رہنے والا تھا لیکن وہ ۲۱۳ ہجری (۸۲۸ء) میں کوفے میں پیدا ہوا اور غالباً وہیں وفات پائی۔ کچھ عرصے تک وہ دِینَوَر میں عہدۂ قضا پر بھی معمور رہا تھا، جس کی نسبت اسے بالعموم "دِینَوَری" کہا جاتا ہے۔ مورخین ابنِ قتیبہ کو ادبی تنقید، لغت اور نحو کا بلند پایہ عالم اور مفکر قرار دیتے ہیں۔ تنقیدِ ادب سے متعلق اس کی تصانیف میں "ادب الکاتب" اور "الشعر والشعرا" کو غیر معمولی شہرت و اہمیت حاصل ہے۔ "ادب الکاتب" میں نثر نگاری اور اس کے اصول و آداب سے بحث کی گئی ہے اور ابتدا سے تیسری صدی ہجری کے اوائل تک کے شعرا کے ذکر پر مشتمل ہے۔ تذکرہ نگاروں نے اسے "الشعر والشعرا" اور "اخبار الشعر" "طبقات الشعرا"، "کتاب الشعرا"، "دیوان الشعر والشعرا" اور "اخبار الشعرا" کے ناموں سے بھی موسوم کیا ہے[۵۱]۔ دیباچے کے ذیل میں ابنِ قتیبہ کا بیان ہے:

"شاید تمھارا یہ خیال ہو کہ ہماری اس کتاب میں تمام شعرائے عرب کا تذکرہ درج ہو گا اور یہ کہ شعرا کا گروہ بھی مثلِ راویانِ حدیث و ناقلانِ اخبار و آثار یا علما و امرا اور ملوک و سلاطین کی طرح محدود و متناہی ہو گا اور ان کے حالات نام بنام قلمبند ہو سکتے ہیں۔ مگر یاد رہے کہ یہ خیال محال ہے۔ شعرائے عرب کا احاطہ بشر کی قدرت سے خارج ہے۔ اگر کوئی طویل العمر شخص اپنی تمام عمر اس کوشش میں صرف کر دے تو بھی صرف ایک قبیلے کے شعرا کا استقصا نہیں کر سکتا نہ ان کا کلام جمع کر سکتا ہے[۵۲]"

انھیں مجبوریوں کے پیشِ نظر اس نے یہ وضاحت کی ہے کہ:

"میرا مقصد زیادہ تر ان شعرا کے تذکرے سے ہے جنھیں بڑے بڑے ادیب جانتے اور مانتے ہیں اور جن کے اشعار سے نوادر و غرائب، نحو، قرآن مجید،

---

۵۱ اورنٹیل کالج میگزین لاہور شمارہ فروری ۱۹۳۳ء، مضمون بعنوان "ابن قتیبہ"

۵۲ شعر العرب (قلمی) کے حوالے سے

حدیث نبوی وغیرہ کے حل کرنے کے لیے استشہاد کیا جاتا ہے۔ ایسے شخصوں کا ذکر بہت کم کیا ہے جن کے اسما و حالات وغیرہ کچھ بھی معلوم نہ ہوں۔ ساتھ ہی ان کے اشعار کم پایہ بھی ہوں اور سوائے خاص خاص آدمیوں کے انھیں کوئی نہ جانتا ہو۔ میں نے اس کتاب میں ایسے لوگوں کا ذکر نہیں کیا جن پر شعر کے ماورا کوئی اور شے غالب تھی کیونکہ ہم نے اس فن کے بعض مولفین کو دیکھا ہے کہ وہ شعرا کے تذکروں میں ایسے لوگوں کا ذکر کر دیتے ہیں جن کو اشعار کی بنا پر کوئی جانتا بھی نہیں اور جنھوں نے شاذ و نادر ہی کوئی شعر کہا ہوتا ہے۔

میں نے متقدمین کو ان کے پہلے ہونے کی وجہ سے بزرگی کی نگاہ سے نہیں دیکھا اور نہ ہی متاخرین کو ان کے بعد میں ہونے کے سبب بنظرِ استحقار دیکھا ہے۔ بلکہ فریقین پر عدل و انصاف کی نگاہ ڈالی ہے اور ہر ایک کو اس کا حق دیا اور اس کا پورا پورا اعتراف کیا ہے۔" [1]

یہ بیانات تذکرہ نگاری کے راستے کی دشواریوں اور اس فن کے متعلق ابنِ قتیبہ کے تصورات کی نشان دہی کرتے ہیں۔ ساتھ ہی اس بات کا بھی پتا دیتے ہیں کہ استناد و استشہاد کی ضرورت عربی تذکروں کی ترتیب کے بنیادی محرکات میں شامل ہے۔

ابن المنجم کو فنِ تذکرہ سے متعلق ایک ضخیم کتاب کا مولف کہا جاتا ہے۔ اس نے "کتاب البارع فی اخبار الشعرار المولّدین" کے نام سے اس کتاب کی ایک تلخیص بھی مرتب کی تھی۔ یہ دونوں کتابیں اب نایاب ہیں۔ ابن خلکان نے اپنی تصنیف "وفیات الاعیان وانبار ابنار الزمان" میں "کتاب البارع" سے استفادے کا اعتراف کیا ہے۔[2] ابن الندیم مرتب "الفہرست" کی نظر سے بھی یہ کتاب گزر چکی تھی۔[3] تذکرہ نگاروں میں

---

[1] بحوالہ اورنٹیل کالج میگزین لاہور شمارہ فروری ۱۹۳۲ء

[2] وفیات الاعیان جلد دوم ص ۱۹۴

[3] الفہرست ص ۲۰۶

ابوالمنصور الثعلبی اس کتاب سے اثر پذیری اور اس کے نتیجے میں تذکرہ نویسی کی طرف میلان کا اقرار کرتا ہے[1]۔ ابن خلکان نے اسے کتب نفیسہ میں شمار کرتے ہوئے بعد کے کتنے ہی تذکروں کو اس کی فروعات قرار دیا ہے[2]۔ اس طرح اس تذکرے کے بارے میں یہ بات معلوم ہو جاتی ہے کہ اسے اپنے دور کی تالیفات میں ایک اہم مقام حاصل تھا۔

ابن المعتز خاندانِ عباسیہ کا چشم وچراغ تھا۔ وہ ۲۴۹ھ/۸۶۳ء میں پیدا ہوا اور ۲۹۶ھ/۹۰۸ء میں خلیفہ المقتدر کے خلاف ایک سازش کے تحت مسندِ خلافت پر متمکن ہونے کے چوبیس گھنٹے کے بعد ہی قتل کر دیا گیا۔ مورخین نے اسے شعروادب اور موسیقی وسپہگری کے فنون میں یگانۂ روزگار قرار دیا ہے۔ اس کے اشعار حسن کی عظمت کے افسانوں سے معمور اور رومانی طرزِ فکر کے آئینہ دار ہیں۔ شاعری کے موضوع پر اس کی نثری تصانیف میں "البدیع"، "اشعار الملوک"، "الزہر والریاض" اور "طبقات الشعراء المحدثین" کا پایہ کافی بلند ہے۔ طبقات الشعراء میں ایک سو ستائیس شعرائے متاخرین کے حالات و اشعار شامل ہیں۔ ابن سلام اور ابن قتیبہ کی طرح ابن المعتز نے بھی اس کتاب میں معیارِ کلام اور زمانے کے اعتبار سے شاعروں کی درجہ بندی کی ہے۔ بعد کے اکثر تذکرہ نگار اس کتاب سے مستفید ہوئے ہیں۔

تذکرہ نگاری کے میدان میں اگلا قابلِ رشک قدم ابوالفرج الاصفہانی (متوفی ۳۵۶ھ مطابق ۹۶۷ء) نے اٹھایا۔ وہ ۲۸۴ھ/۸۹۷ء کے قریب اصفہان میں پیدا ہوا اور بغداد میں تعلیم وتربیت پائی۔ "کتاب الاغانی" اس کی شہرۂ آفاق تصنیف ہے جس میں صدہا شاعروں، نغمہ نگاروں، ادیبوں، راویوں اور ان کے سرپرست خلفاء واعیانِ سلطنت کے تذکرے شامل ہیں۔ موضوع کی اس وسعت کی بنا پر ہم اسے خالصتہً تذکرۂ شعرا نہیں کہہ سکتے لیکن چونکہ اس کا بڑا حصہ شاعروں کے حالاتِ زندگی اور ان کی تخلیقات کی

---

[1] یتیمۃ الدہر جلد اوّل ص ۱۶ و ۱۷

[2] وفیات الاعیان جلد دوئم ص ۱۹۴

تحقیق و ترتیب سے متعلق ہے اس لیے اسے شعرا کے تذکروں کی فہرست سے خارج بھی نہیں کیا جا سکتا۔ یہ کتاب اکیس[۲۱] جلدوں پر مشتمل ہے اور پچاس سال کی مسلسل محنت و کوشش کے بعد تیار ہوئی ہے۔ ابوالفرج نے اس ادبی انسائیکلوپیڈیا میں ان نغموں کی تدوین پر خاص توجہ صرف کی ہے، جو مغنیوں نے خلفاء اور بالخصوص ہارون الرشید (متوفی ۱۹۳ھ/۸۰۹ء) کی تفریحِ طبع کے لیے انتخاب کیے تھے۔ ساتھ ہی وہ قدیم و جدید غنائیے بھی یکجا کر دیے ہیں جن کی تدوین اس کے امکان سے باہر نہ تھی۔ ہر نغمے کو اس نے بیک وقت اس کے تخلیق کار اور لحن ساز دونوں سے منسوب کیا ہے۔ اس کے بعد ان کے سوانح حیات سپردِ قلم کیے ہیں اور عہدِ جاہلیت و اسلام کی ان رزمیہ ہنگاموں اور نشاطیہ مجلسوں کی بھی منظر کشی کی ہے، جن کے زیرِ اثر ان نغمات کی تخلیق و تشکیل عمل میں آئی تھی[۱]۔ مشہور مورخ ابنِ خلدون نے اس کتاب کو "عربوں کے رجسٹر" سے تعبیر کیا ہے۔ اس کے نزدیک "کتاب الاغانی طلبائے ادب کے لیے عربوں کے فنونِ لطیفہ اور علمِ تاریخ کے متعلق معلومات کا آخری منبع ہے۔ اس کے بعد انھیں کسی دوسری کتاب کی ضرورت باقی نہیں رہتی"[۲]۔

صاحب بن عباد (متوفی ۳۸۵ھ/۹۹۵ء) کے اس قول سے بھی اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ "مجھے سفر کے دوران بیسیوں اونٹوں پر کتابیں لدوا کر ساتھ رکھنا پڑتی تھیں، "کتاب الاغانی" کے بعد میں ان سب سے بے نیاز ہو گیا"[۳]۔ ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا کے بقول اصفہانی اپنے اس کارنامے کی بدولت ان لوگوں کی صف میں شامل ہو گیا ہے، جو اسلامی تمدن کی تاریخ میں لازوال اہمیت کے حامل ہیں[۴]۔

---

[۱] المنجد فی الادب والعلوم ص ۲۶ و کتاب الاغانی جلد اوّل (مقدمہ مرتب) ص ۲

[۲] بحوالہ "عربی ادب" ص ۴۶

[۳] بحوالہ "تاریخ ادبیاتِ عربی" ص ۱۵، و کتاب الاغانی جلد اوّل (ترجمہ مولف) ص ۱

[۴] تاریخ ادبیات در ایران جلد دوئم ص ۶۴۲

اصفہانی کے انتقال سے چند سال قبل چوتھی صدی ہجری کے عین وسط میں ایک اور مشہور تذکرہ نگار ابو المنصور عبدالملک بن محمد اسماعیل الثعالبی (متوفی ۴۲۹ھ/۱۰۳۷ء) پیدا ہوا۔ وہ نیشاپور سے وطنی تعلق رکھتا تھا اور لومڑیوں (ثعالب) کی کھال کی تجارت کرنے کی وجہ سے ثعالبی کے لقب سے مشہور ہے۔ تنقید، تاریخِ ادب، انتخابِ اشعار اور موازنۂ کلام پر غیر معمولی دسترس کے باعث اسے اپنے دور کے عظیم ترین ادیبوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس نے کئی درجن تصانیف اپنی یادگار چھوڑی ہیں جن میں سب سے زیادہ شہرت و مقبولیت "یتیمۃ الدہر فی محاسن اہل العصر" کے حصے میں آئی ہے۔ یہ کتاب جس میں ثعالبی نے اپنے عہد کے تقریباً چار سو شاعروں کے حالات و اشعار قلمبند کیے ہیں، چار جلدوں میں منقسم ہے اور ابن المنجم کی "کتاب البارع" اور ابن المعتز کے "طبقات الشعراء المحدثین" سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے[1]۔ اس کا نقش اول ۳۸۴ھ/۹۹۴ء میں تیار ہوا تھا جو نسبتاً بہت مختصر تھا۔ اس کے بعد متواتر تلاش و جستجو کے نتیجے میں جب ثعالبی کو مختلف راویوں کی مدد سے اس سلسلے کا کافی مواد دستیاب ہو گیا تو اس نے از سرِ نو مرتب کیا[2]۔ ثعالبی کی جامع اور ہمہ گیر شخصیت کی طرح اس کے اس مہتم بالشان علمی کارنامے کو بھی تعارفِ شعرا، تدوینِ کلام اور نقدِ شعر کی تاریخ میں ایک نمایاں اور بلند مقام حاصل ہے۔ عربی ادب کے علاوہ فارسی ادب کی تاریخ میں بھی اسے کافی اہم خیال کیا جاتا ہے کیونکہ اس کے اوراق چوتھی صدی ہجری میں ایران کی ادبی فضا کے بارے میں مکمل معلومات کے حامل ہیں[3]۔ کتاب کی ترتیب جدید کے بعد ثعالبی نے "تتمۃ الیتیمہ" کے نام سے اس کا ایک تتمہ بھی مرتب کیا تھا۔

"یتیمۃ الدہر" سے اگلے زمانے کے تقریباً تمام ہی تذکرہ نگار متاثر ہوئے۔ چنانچہ

---

[1] یتیمۃ الدہر جلد اول ص ۱۶ و ۱۷

[2] یتیمۃ الدہر جلد اول ص ۱۷

[3] لٹریری ہسٹری آف پرشیا جلد چہارم ص ۴۴۶

اس کے طرز پر کتنی ہی کتابیں لکھی گئیں۔ ان میں زمانۂ ترتیب اور اہمیت کے لحاظ سے علی ابن الحسن الباخرزی (متوفی ۴۶۷ھ/۱۰۷۴ء) کی "دُمیۃ القصر وعصرۃ اہل العصر" سرِفہرست ہے۔ اس کتاب کے مطبوعہ نسخے میں جو راغب الطباخ نے ۱۹۳۰ء میں حلب سے شائع کیا ہے، دوسو ترانوے (۲۹۳) شاعروں کے حالات واشعار درج ہیں۔ لیکن اس کے بعد جو قلمی نسخے دستیاب ہوئے ہیں، ان میں پانچ سو سینتیس (۵۳۷) شعرا کے تراجم ملتے ہیں[1]۔ کتاب سات ابواب پر مشتمل ہے جن میں مختلف علاقے کے شعرا کا علٰحدہ علٰحدہ ذکر کیا گیا ہے۔ آخری باب ان اربابِ سخن سے متعلق ہے جو بنیادی طور پر شاعر نہ تھے۔ "دُمیۃ القصر" کی اہمیت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ یہ "یتیمۃ الدہر" کا تکملہ ہے یعنی اس میں خصوصیت کے ساتھ ان شاعروں کے حالات وکلام سے بحث کی گئی ہے جو "یتیمۃ الدہر" میں شمولیت سے محروم رہ گئے تھے۔

چھٹی صدی ہجری میں "جنان الجنان وریاض الاذہان" کے نام سے "دُمیۃ القصر" کا ایک تتمہ منظرِ عام پر آیا جو قاضی رشید احمد بن علی بن الزبیر الاسوانی المصری (مقتول ۵۶۲ھ/۱۱۶۷ء) کی تالیف تھا لیکن اب تک اس کا کوئی نسخہ دستیاب نہیں ہو سکا ہے۔ اسی سلسلے کی ایک اور کتاب ابوالحسن علی بن زید البیہقی (متوفی ۵۶۵ھ/۱۱۷۰ء) کی "وشاح الدمیہ" ہے۔ اس کتاب کا ایک تتمہ "درۃ الوشاح" خود اسی کے مولف نے مرتب کیا تھا۔ یہ دونوں کتابیں بھی نایاب ہیں البتہ "وشاح" کا ایک ٹکڑا جو ساتویں صدی ہجری کا لکھا ہوا ہے، ترکیہ میں دستیاب ہوا ہے۔ یاقوت الحموی الرومی (متوفی ۶۲۶ھ/۱۲۲۹ء) نے "معجم الادبا" میں اس کی عبارتیں جابجا نقل کی ہیں[2]۔

قاضی رشید اور البیہقی کے علاوہ ثعالبی سے براہ راست یا باخرزی کے واسطے سے اثر قبول کرنے والوں میں شمس الدین محمود اندخودی (متوفی ۵۷۷ھ/۱۱۸۲ء)

---

[1] بحوالہ مکتوب ڈاکٹر مختار الدین احمد بنام راقم مورخہ ۱۲ر دسمبر ۱۹۶۵ء

[2] ایضاً بحوالہ مکتوب ڈاکٹر مختار الدین احمد بنام راقم

ابوالمعالی سعد بن علی الخظیری (متوفی ۵۶۸ھ/۱۱۷۳ء) اور مشہور مورخ عماد الدین کاتب الاصفہانی (متوفی ۵۹۷ھ/۱۲۰۱ء) کے نام شامل ہیں۔ محمود اندخودی کا تذکرہ "زینۃ الزمان" کے نام سے موسوم تھا۔ عوفی نے "لباب الالباب" کے دیباچے میں اس کا حوالہ دیا ہے[۱]۔ پروفیسر براؤن "یتیمۃ الدہر" کے تتموں کے ذیل میں اس کا ذکر کرتے ہیں[۲] لیکن اس کے کسی نسخے کی موجودگی کے بارے میں کوئی پتہ نہیں چلتا۔

ابی المعالی سعد بن علی الخظیری جو کتب فروشی کا پیشہ اختیار کرنے کی بنا پر تاریخِ ادب میں بالعموم "دلال الکتب" کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے، "زینۃ الدہر فی لطائف شعراء العصر" کا مولف ہے۔ حاجی خلیفہ اور ابن خلکان نے اس کتاب کو "دمیۃ القصر" کا تتمہ قرار دیا ہے[۳]۔ یہ کتاب بھی کتبِ نایاب میں سے ہے اور دوسرے ذرائع سے بھی اس کے متعلق مزید معلومات حاصل نہیں ہوتیں۔

عماد الدین الکاتب ۵۱۹ھ/۱۱۲۵ء میں اصفہان میں پیدا ہوا لیکن اس نے تعلیم و تربیت بغداد میں حاصل کی اور عمر کا بیشتر حصہ دمشق میں گزارا۔ وہیں ۵۹۷ھ/۱۲۰۱ء میں اس کی وفات ہوئی[۴]۔ "یتیمۃ الدہر" کے مرتب محی الدین عبدالحمید نے اس کی تالیف "خریدۃ القصر و جریدۃ اہل العصر" کو "یتیمۃ الدہر" کے تکملوں میں "دمیۃ القصر" کے بعد دوسرا نمبر دیا ہے[۵]۔ ابن خلکان کے بیان کے مطابق یہ کتاب دس جلدوں میں منقسم ہے اور ۵۹۲ھ/۱۱۹۶ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچی ہے نیز اس میں ان شاعروں کا ذکر ہے جو ۵ھ ہجری کے بعد کے زمانے سے تعلق رکھتے ہیں[۶]۔

۱۔ لباب الالباب، مرتبہ سعید نفیسی ص ۹ و ۱۰

۲۔ لٹریری ہسٹری آف پرشیا جلد چہارم ص ۴۴۸

۳۔ کشف الظنون جلد چہارم ص ۱۴۵ و "وفیات الاعیان جلد دوئم ص ۷۵

۴۔ المنجد فی الادب والعلوم ص ۳۵۷

۵۔ یتیمۃ الدہر جلد اوّل مقدمہ مرتب ص ۱۲

۶۔ وفیات الاعیان جلد دویم ص ۷۵

عماد نے خود ہی "کتاب السیل" کے نام سے تین جلدوں میں اس کا تتمہ بھی لکھا تھا جو ضائع ہو چکا ہے[۱]۔ اصل کتاب کی دو جلدیں جو شعرائے مصر سے متعلق ہیں، قاہرہ سے استاد احمد امین نے شائع کر دی ہیں[۲]۔ تین جلدیں جن میں شعرائے شام کا ذکر ہے دمشق سے اور دو جلدیں جو شعرائے عراق کے تعارف پر مشتمل ہیں بغداد سے شائع ہوئی ہیں۔ باقی جلدوں کی طباعت کا سلسلہ ابھی جاری ہے[۳]۔

یہاں ہم نے جن تذکرہ نگاروں کا ذکر کیا ہے وہ ان لوگوں میں سب سے نمایاں اور ممتاز حیثیت کے حامل ہیں جن کی بدولت عربی میں تذکرہ نگاری کے فن کو فروغ حاصل ہوا۔ ان میں سے باستثنائے چند تقریباً تمام ہی تذکرہ نگار عجمی النسل ہیں اور کسی نہ کسی صورت میں سرزمین ایران سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایران کے ادب شناسوں نے اپنے ملک کی ادبی تاریخ اور علمی کارناموں کا جائزہ لیتے ہوئے انھیں بڑی اہمیت کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ ان کے تذکروں میں بھی فارسی نژاد شاعروں کی خاصی تعداد نظر آتی ہے[۴]۔ یہ صورتِ حال اس حقیقت کا پتا دیتی ہے کہ اہلِ ایران مشرف بہ اسلام ہونے کے بعد نہایت سرگرمی کے ساتھ زبان و ادب اور علوم و فنون کے میدان میں عربوں سے بازی لے جانے کی کوشش میں مصروف تھے اور ایران و عرب کی ادبیات میں ایک ناقابلِ تنسیخ رشتہ اور ربط قائم ہو گیا تھا۔ ابتدائی چند صدیوں کے یہی ادبی و ثقافتی روابط فارسی میں تذکرہ نگاری کے آغاز کا سبب بنے اور ایران کے تذکرہ نویسوں نے سب سے زیادہ انھی تذکرہ نگاروں کا اثر قبول کیا۔ اس بحث کو زیادہ طول نہ دیتے ہوئے ہم فارسی میں تذکروں

---

[۱] وفیات الاعیان جلد دویم ص ۷۵

[۲] یتیمۃ الدہر جلد اول مقدمہ مرتب حاشیہ ص ۱۳

[۳] بحوالہ مکتوب ڈاکٹر مختار الدین احمد بنام راقم

[۴] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تاریخ ادبیاتِ ایران جلد اول ص ۶۴۱ و ۶۴۲ و جلد دویم میں ص ۱۰۳۸ و تاریخ ادبیاتِ ایران برائے دبیرستانہا ص ۳۴، ۵۴ و ۱۰۱

کی ترتیب و تدوین کے جائزے کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

فارسی میں تذکرہ نگاری کی ابتدا

اربابِ تحقیق نے سدید الدین محمد بن عوفی کے "لباب الالباب" کو بالاتفاق شعرائے فارسی کا پہلا موجودہ تذکرہ تسلیم کیا ہے۔ اس تذکرے کی ترتیب ۶۱۸ھ/۱۲۲۱ء کے قریب عمل میں آئی ہے۔ اس سے قبل اگرچہ عجمی ادیب ایسی کئی کتابیں تصنیف کر چکے تھے جن سے قدیم شاعروں کے متعلق حصولِ معلومات میں مدد ملتی ہے لیکن ان میں سے کوئی کتاب بھی تذکرے کی تعریف میں نہیں آتی۔ ابوبکر نجم الدین محمد بن علی الراوندی مولف "راحۃ الصدور وآیۃ السرور" (مرتبہ قریب ۶۰۳ھ/۱۲۰۶ء) کے ایک بیان سے پتہ چلتا ہے کہ ۵۸۰ھ/۱۱۸۴ء میں طغرل بن ارسلان کی خواہش پر ایک مصور مجموعہ اشعار کی ترتیب کا کام شروع ہوا تھا جس کے لیے پہلے ہر شاعر کی تصویر تیار کی جاتی تھی اس کے بعد اس کی پشت پر اس کے منتخب اشعار اور کچھ لطیفے درج کیے جاتے تھے[1]۔ اس مجموعے میں بھی اگر شعرا کے حالات کے سلسلے میں کچھ لکھ دیا گیا ہو گا تو وہ ایک ایک دو دو جملوں سے زیادہ نہ ہو گا۔ راوندی نے جو کچھ لکھا ہے اس کے مطابق اس کی حیثیت ایک مصور بیاض سے زیادہ نہیں معلوم ہوتی۔ اس کے علاوہ اس کی تکمیل اور اس کے کسی نسخے کے وجود کے بارے میں بھی اہلِ تحقیق بالکل لاعلم ہیں۔ خود "راحۃ الصدور" میں بھی شاعرانِ مدّاحِ آلِ سلجوق اور ان کے کلام کے حوالے بکثرت موجود ہیں لیکن یہ کتاب دراصل سلجوقی حکمرانوں کی تاریخ ہے اور اس کے صفحات میں شعرا سے متعلق معلومات کی موجودگی محض ضمنی حیثیت رکھتی ہے، اس لیے اس کو بھی تذکروں کی فہرست میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔ ان موجود و غیر موجود تصانیف کے ساتھ اسی ضمن میں ابوطاہر خاتونی (متوفی اوائل قرنِ ششم) کی تصنیف "مناقب الشعرا" کا نام بھی لیا جاتا ہے[2] جس کا ذکر دولت شاہ سمرقندی

---

[1] راحۃ الصدور مطبوعہ تہران ص ۵۷

[2] مقدمہ "لباب الالباب" جلد دوئم (مرتبہ براؤن)، مطبوعہ لیڈن ص د

نے اپنے تذکرے میں کیا ہے اور جس پر بظاہر تذکرۂ شعرا کا گمان ہوتا ہے لیکن یہ کتاب بھی بالیقین اس موضوع سے متعلق نہ تھی کیونکہ سمرقندی بذاتِ خود تذکرہ نگاری میں اولیت کا مدعی ہے اور اس صنفِ ادب سے فارسی کے ادیبوں کی بے اعتنائی کا شکوہ کرتا ہے[1]۔ اگر یہ کتاب واقعی تذکرہ ہوتی تو وہ اس قسم کا دعویٰ ہرگز نہ کرتا۔ اس کے علاوہ خاتونی کے تمام ہم عصر مورخ جنھوں نے اس کا ذکر کیا ہے، اس کتاب کے وجود سے قطعاً بے خبر ہیں۔ علامہ محمد بن عبدالوہاب قزوینی کے نزدیک یہ بے خبری اس امر کی دلیل ہے کہ دولت شاہ سے اس کتاب کو خاتونی سے منسوب کرنے میں غلطی ہوئی ہے[2]۔ غرض کہ ان حقائق کی روشنی میں تذکرہ نگار کی حیثیت سے عوفی کی اوّلیت میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا۔

تذکرہ نگاری سے عربی کے ادیبوں کے شغف اور فارسی ادب کی تہی دامنی کا ذکر کرتے ہوئے عوفی لکھتا ہے:

> "شک نیست کہ دریں شیوہ در طبقاتِ شعرائے عرب چند تالیف ساختہ اند و چند تصنیف پرداختہ چوں طبقاتِ ابن سلام و طبقات ابن قتیبہ و طبقاتِ ابن المعتز و "دمیۃ القصر" کہ ابو منصور ثعالبی ساختہ و "دمیۃ القصر" کہ تاج الرؤسا علی بن الحسین الباخرزی پرداختہ و "زینت الزماں" کہ شمس الدین محمود اندخودی تالیف کردہ و لکن در طبقات شعرائے عجم، ہیچ تالیف مشاہدہ نیفتادہ است و ہیچ مجموعہ در نظر نیامدہ[3]۔"

اس بیان سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ عوفی کا مطالعہ کافی وسیع تھا اور شعرائے عربی کے جس قدر تذکرے اس وقت تک لکھے جا چکے تھے ان میں سے اکثر اس کی نظر سے گزر چکے تھے، لہٰذا فارسی میں اس صنف کے کسی نمونے کی غیر موجودگی کے متعلق

---

[1] تذکرۃ الشعرا مطبوعہ لیڈن ص ۱۳

[2] مقدمہ "لباب الالباب" جلد اوّل (مطبوعہ لیڈن)

[3] لباب الالباب نسخۂ نفیسی ص ۹ و ۱۰

اس کی معلومات پر عدم اعتماد کی کوئی معقول وجہ نظر نہیں آتی۔

عوفی کے حالاتِ زندگی کے متعلق ہماری معلومات بہت محدود ہیں حتیٰ کہ ابھی تک اس کی ولادت و وفات کے سنین اور مولد و مدفن کا بھی تعین نہیں کیا جا سکا ہے۔ گمان غالب یہ ہے کہ وہ چھٹی صدی ہجری کے ربعِ آخر میں اپنے آبائی وطن بخارا میں پیدا ہوا اور وہیں تعلیم و تربیت کے ابتدائی مراحل طے کیے۔ بعدازاں علماء و مشائخ کی صحبتوں سے استفادے اور تکمیل علم کی خاطر ایران اور اطراف و جوانب کے علمی مراکز کی سیر کرتا ہوا ہندوستان پہنچا۔ سوءِ اتفاق سے اس ورود کا سنہ بھی متعین نہیں۔ لیکن اس کے بعض بیانات سے اندازہ ہوتا ہے کہ ۶۰۷ھ (۱۱-۱۲۱۰ء) کے بعد تک وہ بلادِ خراسان میں مقیم تھا اور ۶۱۷ھ/۱۲۲۰ء میں چنگیز خاں کے ہاتھوں ماوراء النہر اور خراسان کی تباہی سے قبل اسے سندھ کے گورنر ناصر الدین قباچہ (مقتول ۶۲۵ھ/۱۲۲۸ء) کے دربار میں رسائی حاصل ہو چکی تھی۔ اس طرح ہندوستان میں اس کی آمد ۶۰۷ھ/۱۲۱۰ء اور ۶۱۷ھ/۱۲۲۰ء کے درمیانی عرصے کا واقعہ قرار پاتی ہے۔ ۶۲۵ھ (اپریل ۱۲۲۸ء) میں جب سلطان شمس الدین نے سندھ پر لشکر کشی کی تو وہ اپنے مربی قباچہ کے ساتھ صوبے کے دارالسلطنت اچھ (مضافات بھاول پور) سے دور قلعہ بھکر میں حصار بند تھا۔ اس جنگ کے نتیجے میں قباچہ کو حکومت اور زندگی دونوں سے ہاتھ دھونا پڑے اور اس کے وزیر عین الملک اشعری اور مشہور مورخ منہاج سراج کے ساتھ عوفی نے بھی التمش کی ملازمت قبول کر لی۔ اس کے بعد ۶۲۸ھ/۱۲۳۱ء تک دہلی میں اس کی موجودگی کا پتا چلتا ہے اور ایک شعر سے جس میں اس نے عباسی خلیفہ المستنصر باللہ کی وفات اور عبداللہ المستعصم کی جانشینی کا ذکر کیا ہے، یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کم از کم ۶۴۰ھ/۴۳-۱۲۴۲ء میں ان واقعات کے رونما ہونے تک وہ بقید حیات تھا۔[1]

---

[1] تفصیلی حالات کے لیے ملاحظہ ہو مقدمۂ "لباب الالباب" از علامہ قزوینی، مقدمہ "جوامع الحکایات" از اختر شیرانی، "سبک شناسی" جلد سوم ص ۳۶ تا ۳۸ و تذکرہ نویسی فارسی در ہند و پاکستان ص ۵۹ تا ۶۹

لباب الالباب میں عوفی نے کسی جگہ اس کے زمانۂ ترتیب کی صراحت نہیں کی ہے لیکن بہاء الدولہ والدین علی بن احمد جاجی کے حالات میں دو جگہ ۶۱۷ھ کے حوالے دیے ہیں[1] اور امیر ناصر الدین عثمانی کے ذکر میں اس کے بھائی ملک معین الدین بہرام شاہ کو جس نے ۶۱۲ھ/۱۲۱۵ء سے ۶۱۸ھ/۱۲۲۱ء تک حکومت کی[2]، سجستان کے تخت سلطنت پر متمکن ظاہر کیا ہے[3]۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ یہ تذکرہ ۶۱۰ھ/۱۲۲۰ء کے بعد اور ۶۱۸ھ/۱۲۲۱ء میں بہرام شاہ کی وفات سے قبل مکمل ہوا ہے۔ تکمیل کے بعد عوفی نے تذکرے کو عین الملک اشعری کی خدمت میں بطورِ نذر پیش کیا۔ اس وقت عین الملک اور عوفی دونوں اچھ میں مقیم تھے۔ بہ الفاظِ دیگر یہ تذکرہ مولف کی قباچہ کے دربار سے وابستگی اور سندھ میں قیام کے زمانے کی یادگار ہے۔

"لباب الالباب" تین سو شاعروں کے ذکر پر مشتمل اور دو جلدوں میں منقسم ہے۔ دونوں جلدوں میں بارہ ابواب ہیں جن میں سے شروع کے چار ابواب فنِ شعر کے بارے میں علمی و تاریخی مباحث سے متعلق ہیں۔ بعد کے ابواب میں شعرا کو ان کی سماجی حیثیت، شعر و شاعری سے شغف کی نوعیت اور زمانی و مکانی اختلاف کی بنیادوں پر مختلف عنوانات اور فصلوں کے تحت الگ الگ جگہ دی گئی ہے۔

عوفی کے آثارِ ادبیہ میں قاضی ابوالحسن بن علی التنوخی (متوفی ۳۸۴ھ/۹۹۴ء) کی تصنیف "الفرج بعد الشدہ" کے فارسی ترجمے اور "جوامع الحکایات ولوامع الروایات" کو بھی ان کی قدامت اور لسانی و بیانی خصوصیات کی وجہ سے کافی اہم خیال کیا جاتا ہے لیکن فارسی ادب کی تاریخ میں اس کا وقار دراصل "لباب الالباب" ہی کی بدولت قائم ہے۔ یہ تذکرہ بہت سی خامیوں کے باوجود فارسی میں تذکرہ نویسی کی روایت کا سنگِ بنیاد

---

[1] لباب الالباب مرتبہ سعید نفیسی ص ۱۰۴

[2] لباب الالباب (تعلیقات علامہ قزوینی) مرتبہ سعید نفیسی ص ۵۷۲

[3] لباب الالباب مرتبہ سعید نفیسی ص ۵۰

ہے اور اس راہ کے اکثر جادہ نوردوں نے بالواسطہ یا بلاواسطہ اس سے استفادہ کیا ہے۔ آقائے مظاہر مُصفّا کے بقول:

"ایں کتاب (لباب الالباب) ترجمۂ تمام شاعران پس از اسلام تا زمانِ مؤلف دربردارد واز دیرباز ماخذ ومسند معتبر تذکرہ نویسان وسخن سنجان ونویسندگانِ تاریخ ادبی ایران بودہ است۔ می توان گفت کہ تمام تذکرہ نویسانِ مستقیم ومستقیم ازیں کتاب استفادہ کردہ اند ومورد توجہ محققانِ سدۂ اخیر نیز قرار گرفتہ۔"[1]

علامہ غلام علی آزاد بلگرامی نے بھی عوفی کا ذکر کرتے ہوئے یہی بات کہی ہے کہ

"جمیع تذکرہ نویسان متاخر در تحریرِ احوال شعرائے اقدم القدما عیالِ او یند۔"[2]

"لباب الالباب" کی ترتیب کے تقریباً پونے تین سو سال بعد تک فارسی کے وسیع دائرہ اثر میں تذکرہ نگاری کے افق پر کوئی نیا ستارہ طلوع نہیں ہوا اور اگر ہوا بھی تو اس کی روشنی تاریخ کے ظلمت کدے سے باہر نہ آسکی اس لیے مورخین دولت شاہ سمرقندی کے "تذکرۃ الشعرا" کو جو ۸۹۲ھ/۱۴۸۷ء کے قریب مکمل ہوا ہے، اس سلسلے کی دوسری کڑی قرار دیتے ہیں۔ دولت شاہ "لباب الالباب" کے وجود سے باخبر نہ تھا[3]، چنانچہ عوفی کی طرح اس نے بھی شعرائے فارسی کے احوال وآثار کی ترتیب سے علمائے ادب کی بے اعتنائی کا شکوہ کرتے ہوئے اس میدان میں اپنی اوّلیت کا دعویٰ کیا ہے[4]۔ یہ تذکرہ دیباچے اور خاتمے کے علاوہ سات طبقات پر مشتمل ہے۔ دیباچے میں تذکرے کے اسبابِ تالیف اور

---

[1] مقدمہ مجمع الفصحا رضا قلی ہدایت ص ج۔ چ

[2] خزانۂ عامرہ ص ۶

[3] اس بے خبری کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ شاید اس وقت تک "لباب الالباب" کی شہرت ہندوستان سے باہر نہ پہنچی ہو کیونکہ اب تک اس تذکرے کے جتنے بھی نسخے دستیاب ہوئے ہیں وہ سب کسی نہ کسی طرح ہندوستان ہی سے تعلق رکھتے ہیں۔

[4] تذکرۃ الشعرا مطبوعہ لیڈن ص ۱۳

فنِ شاعری سے متعلق کچھ مسائل پر گفتگو کے بعد بطور مقدمہ عربی کے دس شاعروں کے حالات لکھے گئے ہیں اس کے بعد ہر طبقے کے ذیل میں کم و بیش بیس بیس شاعروں اور ان کے سرپرست امرا و سلاطین کا ذکر ہے۔ خاتمے کے تحت مولف نے اپنے زمانے کے چھ "اکابر و افاضل" کو متعارف کرایا ہے۔ اس طرح شرکائے تذکرہ کی مجموعی تعداد ایک سو اکیاون (۱۵۱) ہو جاتی ہے۔ تذکرے کی خصوصیات پر بحث کرتے ہوئے ڈاکٹر سید عبداللہ نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ:

"دولت شاہ ۔ شاعر کی شخصیت اور اس کے فن کا جائزہ کچھ اس طریق پر لیتا ہے گویا اس کے نزدیک فن اور سیرت کے درمیان ایک قسم کا .... گہرا رابطہ ہے۔ شعرا کے حالات بیان کرتے وقت وہ زندگی کے واقعات اور سنین اور تاریخوں کا ذکر زیادہ نہیں کرتا۔ اس تفصیل کی بجائے وہ ہر شخص کی سیرت کے داخلی پہلوؤں کو نمایاں کرتا ہے ..... اس کی عام وضعِ زندگی، اس کی ذہنیت، علمی استعداد اور دوسرے نمایاں رجحانات کا تذکرہ کرتا ہے۔ چنانچہ اس کے بیانات کو پڑھ کر تمام بڑے بڑے شعرا کی شخصیت اور زندگی کا رنگ الگ الگ ہمارے سامنے آجاتا ہے اور ہم ہر شخص کے ذہن اور زندگی کو اس کی انفرادی خصوصیات کے ساتھ جاننے کے قابل ہو جاتے ہیں[1]۔"

پروفیسر براؤن کی رائے اس سے کسی قدر مختلف ہے۔ ان کے نزدیک:

"یہ (تذکرہ) ایک دلچسپ مگر صحت واقعات کے لحاظ سے ساقط المعیار تالیف ہے جس میں اشعار کے بہترین انتخاب کے ساتھ ایسی بے شمار تاریخی غلطیاں یکجا ہو گئی ہیں جنھوں نے بعض معاملات میں ریو (RIEU) جیسے لائق اور محتاط مصنفین کو بھی گمراہی کی لپیٹ میں لے لیا ہے[2]۔"

---

[1] مباحث ص ۴۶۴

[2] لٹریری ہسٹری آف پرشیا جلد سوئم ص ۴۳۸

عوفی کی موجودگی میں دولت شاہ کو تذکرہ نگاری کا میرِ کارواں تو نہیں کہا جا سکتا لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ فارسی میں تذکرہ نگاری کی روایت کو "تذکرۃ الشعرا" کے منظرِ عام پر آنے کے بعد ہی استحکام حاصل ہوا۔ چنانچہ ۱۱۶۵ھ/۱۷۵۲ء میں شعرائے اردو کے پہلے تذکرے کی ترتیب سے قبل تک تقریباً پونے تین سو سال کی درمیانی مدت میں شعرائے فارسی کے تقریباً چالیس تذکرے معرضِ وجود میں آ چکے تھے۔ ان میں غالب تعداد ان تذکروں کی ہے جو ہندوستان میں لکھے گئے۔ اس لیے جہاں برصغیر ہند و پاک کو یہ فخر حاصل ہے کہ فارسی زبان کے شاعروں کا پہلا تذکرہ اس سرزمین پر مرتب ہوا، وہیں یہ امتیاز بھی اس کے حصے میں آیا ہے کہ تذکرہ نویسی کی ترقی میں یہاں کے اہلِ قلم کی کوششیں ہر دور میں ایرانی ادیبوں کی کاوشوں سے برتر و بالا رہی ہیں۔ ایران کے منصف مزاج اور وسیع النظر دانشوروں نے خود بھی اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے کہ لغت نویسی کی طرح اس فن میں بھی ان کی زبان اور اہلِ وطن ہندوستانیوں کے احسانات سے گرانبار ہیں۔ دانش کدۂ ادبیات تہران کے استاد اور ایران کے سابق وزیر برائے ثقافتی امور ڈاکٹر پرویز ناتل خانلری ایک جگہ لکھتے ہیں:

> "نویسندگانِ فارسی زبان ہند و پاکستان در دو زمینہ بر ادبیان ایران برتری یافتہ اند۔ یکے در تدوینِ فرہنگ نامہ ولغت وقواعدِ زبانِ فارسی و دیگرے در ثبتِ احوال واخبارِ شاعرانِ فارسی زبان۔ ایرانیان خود بایں دو امر توجہِ شایانی نداشتہ در بارۂ آن کار چندانی نہ کردہ اند وحتیٰ می تواں گفت کہ تا ایں اواخر ازکوششہائے برادرانِ ہندی و پاکستانیٔ خود دریں دو رشتہ آگاہی کافی نہ داشتہ اند۔"[1]

اہلِ ہند کے اس مسلمہ تفوق کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ہم یہاں مختصراً انھی فارسی تذکروں کا ذکر کریں گے جو ہندوستان میں مرتب ہوئے اور جن سے اردو تذکرہ نویسی کے آغاز و ارتقا کی داستان براہِ راست وابستہ ہے، تاکہ وہ پس منظر پوری طرح سامنے آ جائے

---

[1] تقریظ "تذکرہ نویسی فارسی در ہند و پاکستان" ص ۱۵-۱۶

جس میں ہمارے اہلِ قلم اپنے اسلاف اور معاصرین کے حالاتِ زندگی اور کلام کے نمونوں کی تلاش و جستجو اور جمع و ترتیب کی طرف مائل ہوئے۔ اس سے یہ مطلب نہ لینا چاہیے کہ شعرائے فارسی کے جن تذکروں نے ہندوستان سے باہر ترتیب و تکمیل کے مراحل طے کیے ہیں، اردو کے تذکرہ نگاران کے اثرات سے آزاد ہیں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ نقل و حمل اور کتابت و اشاعت کی دقتوں کے باعث ان تذکروں کا دائرۂ اثر نسبتاً محدود رہا ہے۔

ہندوستان کے فارسی تذکرے

ہندوستان میں عمومیت اور تسلسل کے ساتھ تذکرہ نگاری کی ابتدا اکبر کے عہد (تاریخ جلوس ۲ ربیع الثانی ۹۶۳ھ مطابق ۱۴ فروری ۱۵۵۶ء) سے ہوتی ہے۔ اس سے پہلے کا صرف ایک تذکرہ "روضۃ السلاطین" دستیاب ہوا ہے جو مولانا سلطان محمد فخرؔی ہروی کی تالیف ہے۔ فخرؔی شاہ طہماسپ صفوی کے عہد (۹۳۰ھ/۱۵۲۴ء تا ۹۸۴ھ/۱۵۷۶ء) میں زیارتِ حرمین شریفین کے ارادے سے اپنے وطن کو خیرباد کہہ کر کچھ عرصے تک ابوالفتح شاہ حسین ارغون حاکمِ سندھ و ٹھٹھہ کے دربار سے متوسل رہے تھے۔ اس تذکرے کو انھوں نے اسی کے نام سے معنون کیا ہے "روضۃ السلاطین" کا سال ترتیب معلوم نہیں لیکن یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اس کی تکمیل شاہ حسین کے دورِ حکومت یعنی ۹۳۵ھ/۱۵۲۹ء اور ۹۶۱ھ/۱۵۵۴ء کے درمیان ہوئی ہے۔ یہ تذکرہ ان سلاطین کے ذکر پر مشتمل ہے جنھوں نے شاعری کے میدان میں اپنی طباعی کے جوہر دکھائے ہیں۔

"روضۃ السلاطین" کی آخری حد تالیف (۹۶۱ھ/۱۵۵۴ء) کے تھوڑے دن بعد ہی تاریخ اکبرِ اعظم کے نیرِ اقبال کی تابانیوں سے ہم کنار ہوئی۔ اکبر کا ایوانِ سلطنت ایک عظیم المرتبت شہنشاہ کے رعب و جلال کا مظہر بھی تھا اور تہذیب و ثقافت، شعر و ادب اور علم و فن کے ایک پرستار کا معبد بھی۔ حسن اتفاق سے علم دوستی و معارف پروری کی یہی صفات اس کے اولوالعزم اور فراخ حوصلہ سپہ سالار عبدالرحیم خان خاناں

میں بھی جمع ہوگئی تھیں۔ قدردانی و قدرشناسی کے اس ماحول نے ملک اور بیرونِ ملک کے اربابِ کمال کے دلوں میں اکبر کی ذات کو اپنا مرکزِ عقیدت اور کعبۂ مقصود بنانے اور اس کے درباری امرا اور اعیانِ سلطنت کا تقرب حاصل کرنے کی اُمنگ پیدا کی۔ چنانچہ مغل دربار جلد ہی علم و فن کی دنیا میں ایک گوہرِ شبِ چراغ کی طرح جگمگا اٹھا۔ پوری نصف صدی کو اپنے آغوش میں سمیٹے ہوئے اس طویل عہدِ حکمرانی کو بجا طور پر ہندوستان میں فارسی زبان و ادب کی مقبولیت اور فروغ کا عہدِ زریں کہا جا سکتا ہے۔

اکبر کے جلوس کے وقت مولانا فخری ہروی جن کا ذکر اوپر کی سطور میں آچکا ہے، سندھ میں مقیم تھے۔ تخت نشینی کی خبر سن کر ان کی یہ خواہش ہوئی کہ کوئی مناسب تحفہ لے کر بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوں۔ اسی اثنا میں ایک رات کو جب کہ وہ اپنے مرتب کیے ہوئے مجموعہ غزلیات "تحفۃ الجلیب" کا مطالعہ کر رہے تھے، ایک شاعرہ کی غزل نظر سے گزرنے پر معًا یہ تجویز ان کے ذہن میں آئی کہ سخن گو خواتین کا ایک تذکرہ ترتیب دے کر کم سن بادشاہ کی دایہ ماہم کے لیے "انبساطِ خاطر" کا سامان فراہم کیا جائے۔ اسی خیال کے تحت انھوں نے غالبًا اکبر کے پہلے سالِ جلوس کے دوران "جواہر العجائب" کے نام سے ایک مختصر تذکرہ تالیف کیا جو صرف ۲۳ خواتین کے حالات و کلام پر مشتمل ہے۔ یہ تذکرہ متذکرہ شاعرات کے حالاتِ زندگی کے سلسلے میں کوئی قابلِ اعتنا معلومات فراہم نہیں کرتا۔ ساتھ ہی اشعار کا انتخاب بھی زیادہ اچھا نہیں۔

اکبر کے عہد کا دوسرا تذکرہ "نفائس المآثر" ہے اس کے مولف میر علاؤالدولہ قزوینی اکبر کے اتالیق میر عبداللطیف قزوینی کے حقیقی بھائی تھے اور ۹۶۳ھ/۱۵۵۶ء میں آذربائیجان سے ترکِ وطن کر کے ہندوستان پہنچے تھے۔ یہ تذکرہ اس دور کے شاعروں کے بارے میں معتبر ترین ماخذ کی حیثیت رکھتا ہے۔ "نفائس المآثر" اس کا تاریخی نام ہے جس سے آغازِ ترتیب کا سنہ ۹۷۳ھ (۶۶-۱۵۶۵ء) برآمد ہوتا ہے۔ سالِ اختتام ۹۷۹ھ (۷۲-۱۵۷۱ء) ہے۔

"نفائس المآثر" کے بعد محمد عارف بقائی نے "مجمع الفضلا" مرتب کیا۔ عارف

بھی اکبر ہی کے عہد میں بخارا سے ہندوستان آئے تھے اور کچھ عرصے تک عبدالرحیم خان خاناں سے متوسل رہے تھے۔ یہ تذکرہ جس کی ترتیب کا کام انھوں نے ۹۹۶ھ/۱۵۸۸ء میں اندجان (نواح سمرقند) میں شروع کیا تھا ۱۰۰۰ھ/۱۵۹۲ء میں بمقام وزیر پور (مضافاتِ آگرہ) پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ اس میں چار سو سے زائد شاعروں کا ذکر ہے۔ مولف نے ان شعرا کو بہ اعتبارِ زمانہ تین "فرقوں" میں تقسیم کیا ہے۔ آخر میں بعنوانِ "خاتمہ" ان لوگوں کے حالات لکھے ہیں جو شاعری کے مدعی ضرور تھے لیکن درحقیقت انھیں اس فن سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔

خانِ خاناں کے متوسلین میں دوسرا تذکرہ نگار سید علی بن محمود الحسینی ہے، جس نے ۱۰۰۰ھ/۱۵۹۲ء میں "بزم آرائی" کے نام سے ایک تذکرہ مرتب کر کے اپنے مربی کی خدمت میں پیش کیا۔ اس تذکرے میں حسینی نے فارسی شاعری کی ابتدا سے اپنے زمانے تک کے شعرا کا ذکر کیا ہے لیکن اس کے بیشتر مطالب حتیٰ کہ دیباچہ و مقدمہ بھی بے کم و کاست "لباب الالباب" سے منقول ہیں مگر ماخذ کی فہرست میں صرف تذکرہ دولت شاہ اور تذکرہ سامی کا حوالہ دیا گیا ہے۔

عہدِ اکبری کا آخری تذکرہ امین احمد رازی کا "ہفت اقلیم" ہے۔ رازی اکبر کے دورِ حکومت میں اپنے وطن رے سے ہندوستان آیا۔ وہ نورجہاں کے والد اور جہاں گیر کے وزیر اعتماد الدولہ غیاث بیگ کا قریبی عزیز تھا۔ "ہفت اقلیم" کی ترتیب پر اس نے چھ سال صرف کیے اور ۱۰۰۲ھ/۱۵۹۴ء میں اسے پایۂ تکمیل کو پہنچایا۔ مولف نے اس تذکرے میں ربعِ مسکون کو ہفت اقلیم میں تقسیم کر کے اولاً ہر اقلیم کے تاریخی و جغرافیائی حالات بیان کیے ہیں، اس کے بعد وہاں کے شعرا کا ذکر کیا ہے۔

اکبر کے بعد زمامِ سلطنت نورالدین محمد جہانگیر کے ہاتھ میں آئی (۱۰۱۴ھ/ ۱۶۰۵ء)۔ عہد میں ہندوستان کی سرزمین کوئی فیضی یا ابوالفضل تو پیدا نہ کر سکی لیکن ہمسایہ ملکوں سے فنکاروں اور دانشوروں کی آمد کا سلسلہ بدستور قائم رہا۔ ایران میں یہ دور شعر و ادب کی ناقدری کا دور تھا جب کہ اس کے برخلاف ہندوستان میں اربابِ علم و

فن کو سر آنکھوں پر جگہ دی جا رہی تھی[1] چنانچہ اس زمانے میں بھی یہاں فارسی زبان و ادب کے بہت سے شاہکار معرضِ وجود میں آئے۔ اسی سلسلے میں تذکرہ نویسی کی روایت بھی کسی قدر آگے بڑھی اور کئی تذکرے مرتب ہوئے جن کی تفصیل یہ ہے:

خلاصۃ الشعرا

ملا محمد صوفی مازندرانی (متوفی ۱۰۳۵ھ/۲۶-۱۶۲۵ء) نے جو اکبر کے عہد میں ہندوستان آئے تھے، ۱۰۱۰ھ/۲-۱۶۰۱ء میں احمد آباد گجرات میں قیام کے دوران "بت خانہ" کے نام سے ساٹھ ہزار متفرق اشعار کا ایک مجموعہ مرتب کیا تھا۔ ۱۰۲۱ھ/۱۶۱۲ء میں عبداللطیف عباسی گجراتی نے جو مرتب کا ہم نشیں اور ارادت مند تھا، اس انتخاب میں بعض شاعروں کے کلام کا اضافہ کیا اور تاریخی ترتیب سے تمام شعرا کے حالات قلمبند کر کے اسے ایک تذکرے کی شکل دے دی۔ ہیئت کی اس تبدیلی کے بعد یہ کتاب "خلاصۃ الشعرا" کے نام سے موسوم ہوئی۔ یہ جہاں گیر کے عہد کا پہلا تذکرہ ہے۔ عباسی نے اس کی ترتیب میں دولت شاہ کے "تذکرۃ الشعرا"، میر علاؤ الدولہ قزوینی کے "نفائس المآثر" اور دوسری معتبر تاریخی کتابوں اور تذکروں سے مدد لی ہے، اور اپنی دانست میں لوازمِ تحقیق و تفتیش میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا ہے[2]۔

عرفات العاشقین

یہ تذکرہ تقی الدین محمد تقی اوحدی اصفہانی کی تالیف ہے۔ تقی رجب ۱۰۱۵ھ/نومبر ۱۶۰۶ء

---

[1] اس دور (عہد صفوی) کے مشہور ایرانی شاعر علی قلی سلیم نے درج ذیل شعر میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ اس صورتِ حال کی تصویر کشی کی ہے ؎

نیست ایران زمیں سامان تحصیلِ کمال　　تا نیامد سوے ہندوستاں، حنا رنگیں نشد

[2] مقدمہ خلاصۃ الشعرا بحوالہ میخانہ حاشیہ صفحہ ۴۷۹

میں دوستوں کی ایک جمعیت کے ساتھ عازمِ ہندوستان ہوئے۔ یہاں پہنچ کر انھوں نے اولاً ڈیڑھ سال تک لاہور میں قیام کیا۔ اس کے بعد جہانگیر کے ساتھ آگرہ گئے اور ایک سال سے کچھ زیادہ وہاں مقیم رہ کر سفرِ حج کے ارادے سے گجرات کی طرف روانہ ہوئے لیکن یہ ارادہ پورا نہ ہو سکا ۱۰۲۲ھ/۱۶۱۳ء کے قریب وہ پھر آگرہ چلے آئے۔ اصفہان سے ہندوستان آتے ہوئے اثنائے راہ میں اوحدی سے ان کے ایک دوست اور رفیقِ سفر حیدر ہمدانی نے اپنے لیے بطور یادگار شعرائے متقدمین و متاخرین کے منتخب کلام کا ایک مجموعہ ترتیب دینے کی فرمائش کی تھی جسے انھوں نے شیراز سے گجرات تک کی مسافت کے دوران میں "فردوسِ خیالِ اوحدی" کے تاریخی نام سے ۱۰۲۰ھ/۱۶۱۱ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچایا۔ ۱۰۲۲ھ/۱۶۱۳ء میں جب کہ وہ دارالسلطنت آگرہ میں قیام پذیر تھے، ایک دوسرے دوست کے ایما سے اس مجموعۂ اشعار پر شعرا کے حالات کے اضافے کا سلسلہ شروع ہوا اور ۱۰۲۴ھ/۱۶۱۵ء تک جتنے شعرا کے حالات و اشعار دستیاب ہو سکے، انھیں حروفِ تہجی کی ترتیب کے مطابق یکجا کر کے اس نئی کتاب کو "عرفات العاشقین" کا نام دے دیا گیا۔ یہ تذکرہ تین ہزار ایک سو پچانوے شعرا کے ذکر پر مشتمل ہے۔

۱۰۳۶ھ/۲۷-۱۶۲۶ء میں مولف نے خود ہی "کعبۂ عرفاں" کے نام سے اس کا ایک خلاصہ مرتب کیا اور اس کے کچھ دن بعد جہانگیر کی فرمائش پر "انتخاب کعبہ عرفاں" کے نام سے اس خلاصے کا انتخاب کیا۔ اس طرح اشعار کی وہ بیاض جو ۱۰۲۰ھ/۱۶۱۱ء میں مکمل ہوئی تھی وقتاً فوقتاً مختلف شکلیں اختیار کرتی رہی۔

خرابات

پروفیسر محمد شفیع اڈیٹر اورنٹیل کالج میگزین، لاہور اپنے ایک مضمون میں برٹش میوزیم کے نسخہ کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ تذکرہ حسن بن لطف اللہ طہرانی نے حسن بیگ شاملو کی تحریک پر مرتب کیا ہے اور بظاہر اس کی تکمیل ۱۰۴۰ھ (۳۱-۱۶۳۰ء) میں ہوئی ہے[1] لیکن

[1] اورنٹیل کالج میگزین لاہور شمارہ فروری ۱۹۲۷ء ص ۴۳

کتاب خانۂ ملی تہران کا نامکمل نسخہ جس سے "تذکرہ نویسی فارسی در ہند و پاکستان" کے مصنف ڈاکٹر سید علی رضا نقوی نے استفادہ کیا ہے، تذکرہ نگار کے نام، اسباب تالیف اور زمانہ ترتیب کے متعلق کوئی معلومات فراہم نہیں کرتا۔ البتہ بعض بیانات سے یہ بات واضح طور پر معلوم ہو جاتی ہے کہ مولف ۱۰۱۰ھ/۲-۱۶۰۱ء سے ۱۰۲۵ھ/۱۶۱۶ء تک ہندوستان میں مقیم اور تذکرے کی ترتیب میں مصروف رہا ہے[1]۔ اس لیے اسے عہدِ جہانگیر کے ہندوستانی تذکروں میں شامل کرنا غلط نہ ہوگا۔ ہمارے خیال میں برٹش میوزیم اور کتاب خانہ ملی تہران کے مذکورہ نسخے "خرابات" کی دو علیحدہ علیحدہ جلدیں یا ایک ہی جلد کے منتشر اجزا ہیں۔ کیونکہ اول الذکر نسخہ رودکی سے شروع ہو کر خواجہ یوسف جامی کے ذکر پر ختم ہوتا ہے[2]۔ جب کہ دوسرے نسخے کی ابتدا تتمۂ غزلیاتِ جامی سے ہوئی ہے[3]۔

میخانہ

فارسی تذکروں کی تاریخ میں یہ اپنی نوعیت کا پہلا تذکرہ ہے جس میں نوّے شاعروں کے ساقی نامے اور حالات درج کیے گئے ہیں اس کے مولف عبدالنبی خاں فخرالزماں غرقی ۱۰۱۷ھ/۱۶۰۸ء کے اواخر میں قزوین سے لاہور پہنچے اور چار مہینے وہاں قیام کرنے کے بعد ۱۰۱۸ھ/۱۶۰۹ء میں دارالخلافہ آگرہ میں وارد ہوئے۔ ۱۰۲۲ھ/۱۶۱۳ء میں انھوں نے جہانگیر کے ساتھ اجمیر کا سفر کیا اور وہیں اس تذکرے کی ترتیب و تدوین کی داغ بیل ڈالی۔ ۱۰۲۸ھ/۱۶۱۹ء میں جب کہ وہ بہار کے دیوان میرزا نظامی کے ساتھ پٹنہ میں مقیم تھے، یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچا اور ۱۰۲۹ھ/۱۶۲۰ء میں نظر ثانی کے بعد کتاب کو طلائی جدولوں سے آراستہ کر کے جہانگیر کی خدمت میں پیش کیا گیا[4]۔ حالات کی تلاش و ترتیب

---

[1] تذکرہ نویسی فارسی در ہند و پاکستان ص ۱۶۳ [2] اورنٹیل کالج میگزین۔ شمارہ فروری ۱۹۲۷ء ص ۴۳

[3] تذکرہ نویسی فارسی در ہند و پاکستان ص ۱۶۳

[4] رضا لائبریری رام پور کے مخطوطے کے سرورق پر جہانگیر کی خدمت میں تذکرے کی پیش کش کا سنہ ۱۰۳۹ھ درج ہے لیکن یہ کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے کیونکہ جہانگیر کا انتقال ۱۰۳۷ھ میں ہوا ہے۔

کے سلسلے میں مولف کے تحقیقی اندازِ نظر نے اس تذکرے کی اہمیت کو دوبالا کر دیا ہے۔

تاریخ جہانگیری

مولف کا نام معلوم نہیں لیکن اس کا تخلص مطربی اور وطن سمرقند ہے۔ اس تذکرے کی ابتدا اس نے رجب ۱۰۲۵ھ/جولائی ۱۶۱۶ء میں کی، جمادی الثانیہ ۱۰۳۶ھ/فروری ۱۶۲۷ء میں خاتمے کا آغاز کیا اور ۱۰۳۷ھ/۱۶۲۸ء میں بلخ جانے سے قبل پایۂ تکمیل کو پہنچایا۔ یہ تذکرہ ان شعرا کے ذکر پر مشتمل ہے جو اکبر اور جہانگیر کے عہد میں ان کے درباروں سے یا سلاطینِ ازبک اور چنگیز خاں کے اسلاف سے وابستہ رہے اور جن سے مطربی ۱۰۳۴ھ/۱۶۲۵ء تک شرف ملاقات حاصل کر چکا تھا۔

مجمع الشعرائے جہانگیری

یہ تذکرہ ایک مجہول الاحوال صاحبِ قلم قاطعی کی تالیف اور کسی بڑی کتاب یا ضخیم تر تذکرے کا دفتر ثالث معلوم ہوتا ہے۔ شعرا کی مجموعی تعداد ایک سو اکیاون (۱۵۱) ہے اور یہ تمام تر وہ لوگ ہیں جنھوں نے جہانگیر کی مدح سرائی کی ہے۔ تذکرے کے مندرجات زمانہ ترتیب کے سلسلے میں کوئی رہبری نہیں کرتے، اس لیے محض موضوع کی مناسبت اور ظاہری اندازے کی بنا پر اسے جہانگیر کے عہد کی تالیفات میں شامل کر لیا گیا ہے۔

جہانگیر نے صفر ۱۰۳۷ھ/اکتوبر ۱۶۲۷ء میں وفات پائی۔ اس کے چند دنوں کے بعد شاہجہاں اور رنگِ جہانبانی پر رونق افروز ہوا۔ اس جمال پرست شہنشاہ کا دور مغل فن تعمیر کی ترقی یا نشاۃ ثانیہ کا دور سمجھا جاتا ہے لیکن ڈاکٹر سید عبداللہ کے بقول تعلیمی ترقی اور علمی احیا و ترویج میں بھی وہ اپنے کسی پیش رو سے کم نہیں تھا[1]۔ اس کے زمانے میں ہندوستان کے ذی علم فارسی دانوں میں اہلِ زبان سے مسابقت کا جذبہ پیدا

---

[1] ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ ص ۴۷

ہوا اور رفتہ رفتہ فیضی اور ابوالفضل کی وراثت عام ہونے لگی۔ البتہ تذکرہ نگاری کے فن میں کوئی قابلِ ذکر پیش رفت نہ ہوئی اور تیس سال (۱۰۳۷ھ/۱۶۲۸ء تا ۱۰۶۸ھ/۱۶۵۸ء) کے عرصے میں صرف دو تذکرے "طبقاتِ شاہجہانی" اور "خزینۂ گنجِ الٰہی" منظرِ عام پر آئے۔

طبقات شاہجہانی

یہ تذکرہ محمد صادق نے ترتیب دیا ہے جو علوم متداولہ میں فیضی کا شاگرد تھا اور ہندوستان میں پیدائش کے لحاظ سے عبداللطیف عباسی کے بعد دوسرا ملکی تذکرہ نگار ہے۔ مولف نے تیمور سے شاہجہاں تک ہر بادشاہ کے متوسل اور ہم عصر اربابِ کمال کو علیحدہ علیحدہ روشناس کرانے کی غرض سے دس طبقات قائم کیے ہیں اور ہر طبقے کو "ذکر سادات و عرفا"، "ذکر علماء و حکماء و فضلاء" اور "ذکرِ شعرا" کے زیرِ عنوان تین ابواب پر تقسیم کیا ہے۔ تذکرے میں کسی جگہ زمانۂ تالیف کے متعلق کوئی صراحت موجود نہیں البتہ طبقۂ ثانی کے تحت ایک جگہ ۱۰۴۶ھ (۳۷-۱۶۳۶ء) کو سالِ رواں قرار دیا ہے۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی ترتیب شاہجہاں کے نویں یا دسویں سالِ جلوس میں ہوئی ہے۔

خزینۂ گنج الٰہی

اس تذکرے کا مولف میر عماد الدین محمود حسینی متخلص بہ الٰہی جہانگیر کے عہد میں ولایتِ ہمدان سے ہندوستان آیا۔ ۱۰۴۲ھ/۳۳-۱۶۳۲ء میں بزمانہ قیام کشمیر اس نے تذکرے کی تالیف کی ابتدا کی اور زندگی کے آخری ایام (مابین ۱۰۵۲ھ/۱۶۴۲ء و ۱۰۶۴ھ/۱۶۵۴ء) تک ترتیب کا سلسلہ جاری رکھنے کے باوجود اسے ناتمام چھوڑ کر ہی دنیا سے رخصت ہوگیا۔ چنانچہ یہ تذکرہ ہمایوں (متوفی ۹۶۳ھ/۱۵۵۶ء) کے ذکر پر ختم ہوجاتا ہے اور بعد کے شاعروں کے بارے میں اس سے کوئی معلومات حاصل نہیں ہوتی۔

۱۰۶۸ھ کے اواخر میں اورنگ زیب نے شاہجہاں کو عزلت نشینی کی زندگی گذارنے پر مجبور کر دیا اور ملک کی تقدیر براہِ راست اس کی ذات سے وابستہ ہوگئی (غرہ ذی قعدہ ۱۰۶۸ھ

مطابق ۲۱ جولائی ۱۶۵۸ء)۔ اورنگ زیب کی ساری زندگی حرب وضرب اور جدال و قتال میں بسر ہوئی۔ اس کے علاوہ افتادِ طبع کے اعتبار سے بھی وہ حد درجہ سادگی پسند، نام ونمود سے محترز اور مدح وستائش سے بے نیاز قسم کا انسان تھا۔ اس لیے اس کے دورِ اقتدار (۱۰۶۸ھ/۱۶۵۸ء تا ۱۱۱۹ھ/۱۷۰۷ء) میں شعروادب کو دربارِ شاہی سے کوئی سہارا نہ مل سکا۔ ماحول کی اس تبدیلی سے جہاں ملک کے اربابِ فن متاثر ہوئے وہیں باہر سے اہلِ کمال کی آمد کا سلسلہ بھی تقریباً منقطع ہوگیا لیکن اس زمانے تک فارسی زبان عوام و خواص دونوں کے دلوں میں اس طرح اپنا اثر ورسوخ قائم کرچکی تھی کہ وہ ادبی روایات جنھیں اکبر، جہانگیر اور شاہجہاں کی سرپرستی نے استحکام عطا کیا تھا، زوال وانحطاط سے بڑی حد تک محفوظ رہیں اور اہلِ علم وفن حسبِ مقدور خدمتِ لوح وقلم میں مصروف رہے۔ مگر شاہجہاں کے دَور کی طرح اس دَور میں بھی تذکرہ نگاری کی طرف بہت کم توجہ دی گئی کیونکہ اس زمانے کے جو تذکرے ہمارے علم میں آسکے ہیں، ان کی تعداد صرف چار ہے۔ ان تذکروں کی تفصیلات حسب ذیل ہیں۔

لطائف الخیال

یہ تذکرہ شیخ مفید معروف بہ شاہ محمد شیرازی کی تالیف جو شاہجہاں کے عہد میں ہندوستان آئے اور چند سال دولت آباد، احمد آباد اور سورت میں قیام کرکے ۱۰۶۷ھ/ ۱۶۵۷ء میں ایران واپس چلے گئے۔ لیکن اس سرزمین کی کشش انھیں زیادہ عرصے تک اپنے دامن سے دور نہ رکھ سکی، چنانچہ تھوڑے ہی دن میں وہ دوبارہ ہندوستان چلے آئے۔ مراجعت کے بعد ۱۰۷۶ھ/۶۶-۱۶۶۵ء میں انھوں نے "لطائف الخیال" کا آغاز کیا اور بظاہر ۱۰۷۸ھ/۶۸-۱۶۶۷ء تک اس کی تالیف میں منہمک رہے لیکن بعض نامعلوم اسباب کی بنا پر کتاب کی تکمیل نہ ہوسکی۔ ناتمام ہونے کے باوجود اس تذکرے کو مولف کے ہم عصر شاعروں کے حالات کا ایک معتبر ماخذ خیال کیا جاتا ہے۔

کلمات الشعرا

یہ تذکرہ محمد افضل سرخوش کشمیری کی تالیف ہے جسے خان آرزو نے غنی کشمیری اور ناصر علی کے ساتھ ہندوستان کے تین بڑے فارسی گو شعرا میں شمار کیا ہے۔ تذکرے کے نام سے اس کا سالِ ترتیب ۱۰۹۳ھ (۱۶۸۲ء) برآمد ہوتا ہے۔ سرخوش نے اس میں اپنے زمانے کے ایک سو اٹھتر (۱۶۹) شاعروں کا ذکر کیا ہے۔ مرتبِ تذکرہ علامہ محوی صدیقی کے بقول "یہ تذکرہ نہایت دل چسپ مفید اور تاریخی معلومات کا ذخیرۂ بے بہا ہے۔ سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں ان شعرا کا ذکر ہے جو خود مولف کے ہم عصر تھے۔ ... یا جن کے حالات سے وہ ذاتی طور پر واقف تھے"[1] اس لیے عالمگیری عہد کے ادب کا مطالعہ کرتے وقت ہم اس تذکرے کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔

تذکرۂ بقا

ریو (RIEU) کی فہرست سے معلوم ہوتا ہے ۱۰۹۴ھ/۱۶۸۳ء سے قبل محمد بقا سہارن پوری نے بھی شعرائے فارسی کا ایک تذکرہ مرتب کیا تھا، لیکن کسی دوسری جگہ اس کا حوالہ نہیں ملتا۔

مرآۃ الخیال

یہ تذکرہ شیر خاں لودی نے اپنے باپ امجد علی لودی (متوسل شہزادہ شجاع حاکم بنگال) کی وفات (۱۰۸۴ھ/۱۶۷۳ء) اور اپنے بھائی عبداللہ خاں کی شہادت (۱۰۸۷ھ/۱۶۷۶ء) کا غم غلط کرنے کی غرض سے کئی سال کی کوشش و محنت کے بعد ۱۱۰۲ھ/۹۱-۱۶۹۰ء میں مکمل کیا ہے۔ شعرا کی مجموعی تعداد ایک سو تیس (۱۳۰) ہے

---

[1] کلمات الشعرا مقدمہ مرتب ص ۳۵

جن میں پندرہ (۱۵) خواتین بھی شامل ہیں۔ مولف نے تمام شاعروں کے حالات عصری تقدیم و تاخیر کے لحاظ سے سپردِ قلم کیے ہیں۔

"مرآۃ الخیال" اورنگ زیب کے چونتیسویں (۳۴) سالِ جلوس کی تالیف ہے۔ اس کی تکمیل کے بعد سے محمد شاہ کے چوتھے سالِ جلوس (تاریخِ جلوس ذی قعدہ ۱۱۳۱ھ مطابق ستمبر/اکتوبر ۱۷۱۹ء) کے اختتام تک تذکرہ نگاری کی تاریخ میں ایک طویل خلا نظر آتا ہے۔ جمود و تعطل کی یہ کیفیت اس سیاسی و سماجی انتشار اور ذہنی و فکری ناآسودگی کا نتیجہ کہی جا سکتی ہے جس کا دائرۂ اثر دکن کی مہموں میں اورنگ زیب کے مسلسل انہماک اور اس کی وفات کے بعد اس کے جانشینوں کی نااہلی و ناپختہ کاری کے باعث روز بروز وسیع تر ہوتا جا رہا تھا۔ اورنگ زیب کے بعد محمد شاہ پہلا فرماں روا تھا جسے تقریباً تینتیس (۳۳) سال (۱۱۳۱ھ/۱۷۱۹ء تا ۱۱۶۱ھ/۱۷۴۸ء) تک تخت سلطنت پر اپنا تسلط برقرار رکھنے کا موقع ملا لیکن اس کے عہد میں بھی نظام حکومت کی ابتری برابر بڑھتی رہی۔ یہاں تک کہ ۱۱۵۱ھ (مارچ ۱۷۳۹ء) میں دارالحکومت پر نادر شاہ کے حملے کے بعد ملک کی اقتصادی حالت بے حد سقیم ہو گئی۔ ابھی اس ہزیمت کے زخم مندمل بھی نہ ہونے پائے تھے کہ محرم ۱۱۶۱ھ (جنوری ۱۷۴۸ء) میں احمد شاہ ابدالی کی فوجیں سلطنتِ مغلیہ کے حدود میں داخل ہوئیں اور دو (۲) ماہ تک پنجاب کی سرزمین قتل و غارت اور تباہی و بربادی کے ہولناک مناظر پیش کرتی رہی لیکن آخر کار قسمت کی یاوری یا "فتحِ خداساز" کی بدولت یہ معرکہ مغلوں ہی کے ہاتھ رہا۔ چند دن کے بعد ۲۷ ربیع الثانی ۱۱۶۱ھ (۲۶ اپریل ۱۷۴۸ء) کو محمد شاہ کا انتقال ہو گیا اور احمد شاہ تخت کا وارث قرار پایا۔ اس کے زمانے میں ایک طرف خراج کی وصولی کے لیے ابدالی کی پیہم یورشوں اور دھمکیوں نے ملک کے سیاسی و اقتصادی نظام پر ضرب کاری لگائی اور دوسری طرف اعیانِ سلطنت کی تخریب کاریاں اس حد تک پہنچ گئیں کہ ۱۰ شعبان ۱۱۶۷ھ (۲۱ مئی ۱۷۵۴ء) کو بادشاہ کی آنکھوں میں سلائیاں پھیر کر اسے تخت و تاج سے محروم کر دیا گیا۔ یہ واقعہ مغلوں کی رہی سہی سطوت و شوکت پر آخری ضرب کی

حیثیت رکھتا ہے جس کے بعد انھیں پھر کبھی اپنی عظمتِ رفتہ کی شیرازہ بندی کا موقع نصیب نہ ہوا۔ ہر آن ایک تازہ قیامت اور ہر لحظہ ایک نئے انقلاب کے اس دور سے گزرتے ہوئے متوسط طبقے کے باشعور افراد زندگی کے اس موڑ تک آ گئے تھے جہاں انسان ہر تیرہ بختی کو اپنا مقدر اور ہر افتاد کو اپنی میراث سمجھ کر ناگزیر و نامساعد حالات سے مفاہمت میں امن و عافیت کی راہیں تلاش کرنے لگتا ہے۔ اربابِ علم کو ایسے ماحول میں شعر و ادب اور تصنیف و تالیف کی دنیا سے بہتر کوئی پناہ گاہ نہیں ملتی۔ یہاں بھی ایسا ہی ہوا۔ چنانچہ انتشار و ابتلا کے اس زمانے میں ہندوستان کے ادیبوں اور شاعروں نے جس غیر معمولی اور حیرت ناک انہماک کے ساتھ فارسی زبان و ادب کی خدمت کی ہے، اس کا اندازہ اس طرح کیا جا سکتا ہے کہ محمد شاہ کے پانچویں سالِ جلوس (۱۱۳۶ھ/ ۲۴-۱۷۲۳ء) سے احمد شاہ کی معزولی (۱۱۶۷ھ/ ۱۷۵۴ء) تک تیس (۳۰) سال کی مدت میں شعرائے فارسی کے سولہ، سترہ تذکرے مرتب ہوئے جن میں سے بیشتر ہندی الاصل مولفین کے نتائجِ قلم ہیں اور ان میں ہندوستانی شاعروں کی تعداد نہ صرف نمایاں بلکہ بعض اوقات غالب رہی ہے۔ ہم یہاں اپنے موضوع کی مناسبت سے ان میں سے صرف انھی تذکروں کا ذکر کریں گے جو ۱۱۶۵ھ/ ۱۷۵۲ء میں شعرائے اردو کے پہلے تذکرے کی تالیف سے قبل مکمل ہو چکے تھے۔

ہمیشہ بہار مولفہ کشن چند اخلاص

یہ تذکرہ جس میں مولف کی توجہات خصوصیت کے ساتھ جہانگیر کے عہد سے محمد شاہ کی تخت نشینی سے قبل تک کے شاعروں پر مرکوز رہی ہیں، ۱۱۳۶ھ/ ۲۴-۱۷۲۳ء میں مرتب ہوا ہے۔ سالِ ترتیب "ہمیشہ بہار" کے اعداد کو دو سے ضرب کرنے پر حاصل ہوتا ہے۔ اس میں تین سو سات (۳۰۷) شعرا کا ذکر ہے جن کے بارے میں مولف نے خاصی مفید معلومات فراہم کی ہیں۔

سفینۂ بے خبر مولفہ عظمت اللہ بے خبر بلگرامی

مولف نے یہ تذکرہ بعض احباب کے اصرار پر ۱۱۴۱ھ/۲۹-۱۷۲۸ء میں بزمانۂ قیام دہلی ترتیب دیا ہے اور طوالت سے بچنے کی خاطر صرف جہانگیر اور شاہ عباس صفوی کے عہد سے محمد شاہ اور محمود شاہ کے زمانے تک کے ہندی و ایرانی شاعروں کے حالات و اشعار قلمبند کیے ہیں۔ تعارف میں غیر معمولی اختصار اس تذکرے کا نمایاں نقص ہے۔

سفینۂ خوش گو از بندرابن داس خوش گو متھراوی

خوش گو "کلمات الشعرا" کے مولف سرخوش کشمیری کا شاگرد تھا۔ ساتھ ہی اس نے خان آرزو سے بھی اپنے فارسی کلام پر اصلاح لی تھی اور زندگی کے پچیس (۲۵) سال ان کے "مصاحب دائمی" کی حیثیت سے گزارے تھے۔ "سفینہ خوش گو" اس تذکرے کا تاریخی نام ہے جس سے سالِ آغاز ۱۱۳۷ھ (۲۵-۱۷۲۴ء) برآمد ہوتا ہے۔ اتمام کی تاریخ (۱۱۴۷ھ ۳۵-۱۷۳۴ء) سفینۂ خوش گوئی سے نکلتی ہے لیکن اسے تاریخ تکمیل نہ سمجھنا چاہیے کیونکہ کتاب کو آخری شکل ۱۱۵۵ھ/۱۷۴۲ء میں خان آرزو کے قلم سے چند شعرا کے حالات اور ایک مقدمے کے اضافے نیز ضروری ترمیم و اصلاح کے بعد حاصل ہوئی۔ یہ تذکرہ تین دفتروں پر مشتمل ہے جن میں علی الترتیب تین سو بائیس (۳۲۲) شعرائے متقدمین، آٹھ سو گیارہ (۸۱۱) متوسطین و متاخرین اور دو سو پینتالیس (۲۴۵) معاصرین کے حالات درج ہیں۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کے الفاظ میں "یہ تذکرہ بہت مشرح و مفصل ہے ..... مصنف کی تنقیدی حیثیت بہت اچھی ہے اور ترتیب سنین کے لحاظ سے ہے۔ معاصرین کا جو حال لکھا ہے وہ بہت مستند ہے اس لیے کہ مصنف کو .... ہندوستان کے اکثر بڑے شہروں میں رہنے کا اتفاق ہوا۔ وہاں اس نے اکثر شعرا سے ملاقاتیں کیں چنانچہ وہ بار بار ان ملاقاتوں کا ذکر کرتا ہے"[1]

---

[1] ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ ص ۱۱۵

یدِ بیضا مولفہ میر غلام علی آزاد بلگرامی

مولف کا بیان ہے کہ مجھے ۱۱۴۳ھ/۳۱-۱۷۳۰ء میں اپنے وطن (بلگرام) سے صوبۂ سندھ کی طرف جانے اور کئی سال سیوستان میں قیام کرنے کا اتفاق ہوا۔ وہاں فرصت کے لمحات کو غنیمت جان کر ۱۱۴۵ھ کے وسط (اواخر ۱۷۳۳ء) میں اس تذکرے کا آغاز کیا اور تقریباً ایک سال کے بعد اس کی ترتیب سے فراغت پائی۔ "یدِ بیضا" کے عام نسخوں میں پانچ سو پینتیس (۵۳۵) شاعروں کا ذکر ملتا ہے لیکن جناب محمد ابراہیم ساکن گڑھی یاسین (پاکستان) کے ذاتی کتب خانے کا نسخہ نسبتاً بہت ضخیم اور تیرہ سو انسٹھ (۱۳۵۹) شعرا کے حالات پر مشتمل ہے[1]۔ آزاد کی تصانیف میں اس تذکرے کے علاوہ شعرائے فارسی کے دو اور تذکرے "سرو آزاد" (مرتبہ ۱۱۶۶ھ/۱۷۵۳ء) اور "خزانۂ عامرہ (مرتبہ ۱۱۷۶ھ/۶۳-۱۷۶۲ء) بھی شامل ہیں۔

تذکرہ ندرت

یہ تذکرہ ایک گم نام اور مجہول الاحوال صاحب قلم علی فطرت عطاء اللہ ملقب بہ دانشور خاں و متخلص بہ ندرت کی تالیف ہے اور ۱۱۴۹ھ/۱۷۳۶ء میں لکھا گیا ہے۔ مولف نے ہر صدی کے شاعروں کے حالات علٰحدہ علٰحدہ تحریر کیے ہیں۔

گلدستہ مرتبہ عبدالوہاب خاں عالمگیری

یہ تذکرہ تقی اوحدی کے "انتخابِ کعبہ عرفاں" کا خلاصہ ہے اور ۱۱۵۵ھ/۱۷۴۲ء میں مرتب ہوا ہے۔ آخر میں مولف نے عمر خیام کے مختصر حالات اور چند رباعیات اپنی طرف سے اضافہ کی ہیں۔ اس کے بعد مختلف موضوعات و عنوانات کے تحت اشعار نقل کر دیے ہیں۔

---

[1] بحوالہ "تذکرہ نویسی فارسی در ہند و پاکستان" ص ۲۷۱

ریاض الشعراء از علی قلی خاں والہ داغستانی

والہ ۱۱۴۴ھ/۱۷۳۰ء میں نادر شاہ کے تختِ ایران پر قابض ہونے کے کچھ دن بعد ہندوستان آیا' اور لاہور میں مقیم ہوا۔ ۱۱۴۷ھ/۳۵-۱۷۳۴ء میں وہ لاہور سے دہلی پہنچا جہاں اسے دربار شاہی میں کافی عزت حاصل ہوئی۔ احمد شاہ نے اپنے دورِ حکومت (۱۱۶۱ھ ۱۷۴۸ء تا ۱۱۶۷ھ/۱۷۵۴ء) میں اسے شش ہزاری منصب اور خان زماں بہادر ظفر جنگ کے خطاب سے سرفراز کیا۔ نواب غازی الدین خاں عماد الملک کی بیوی اور اردو کی مشہور شاعرہ گنا بیگم منت اس کی بیٹی تھی۔ "ریاض الشعراء" اس نے دہلی کے زمانۂ قیام میں ۱۱۶۰ھ/۱۷۴۷ء اور ۱۱۶۱ھ/۱۷۴۸ء کے درمیان مرتب کیا ہے۔ یہ تذکرہ عربی حروف تہجی کی تعداد کے مطابق ۲۸ روضوں پر منقسم ہے اور تقریباً ستائیس سو (۲۷۰۰) شاعروں کے حالات کا احاطہ کرتا ہے۔ مولف نے شعرا کے حالات زندگی کی دریافت و تحقیق پر بالعموم زیادہ توجہ نہیں دی ہے' لیکن اچھے اشعار کو بہت کم نظر انداز کیا ہے۔ فنونِ شاعری مثلاً عروض و قافیہ اور صنائع بدائع سے متعلق مباحث اس تذکرے کی امتیازی خصوصیت ہیں۔ اس کے علاوہ اپنے حالات کے ضمن میں والہ نے اپنے زمانے کے تاریخی واقعات پر بھی کافی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

منتخب الاشعار[1] از مرزا کاظم مبتلا لکھنوی

اس تذکرے کا سالِ ترتیب ۱۱۶۱ھ/۱۷۴۸ء "نظمِ معانی" سے برآمد ہوتا ہے۔ مولف نے اس میں حروف تہجی کی ترتیب کے متعلق سات سو گیارہ (۷۱۱) شاعروں کے حالات و اشعار

---

[1] پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور میں اس تذکرے کا جو قلمی نسخہ محفوظ ہے وہ اسی نام سے موسوم ہے (بحوالہ گلشن سخن مرتبہ مسعود حسن رضوی ص ۳۸) لیکن گلشنِ سخن کے دیباچے (نسخہ مطبوعہ ص ۵۰) میں مبتلا نے اس کا نام "گلدستۂ معانی" تحریر کیا ہے۔

نقل کیے ہیں۔ "ریاض الشعرا" کی طرح یہ تذکرہ بھی حالات کے بیان میں اختصار کی بنا پر ایک اوسط درجے کی تالیف سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا لیکن حسنِ انتخاب کے لحاظ سے شعرائے فارسی کے بہترین تذکروں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ شعرائے اردو کا مشہور تذکرہ "گلشنِ سخن" بھی انھی مبتلا کی تالیف ہے۔

منتخب حاکم از عبدالحکیم حاکم لاہوری

یہ شعرائے فارسی کا مختصر ترین تذکرہ ہے جس میں صرف چھ شاعروں کا ذکر ہے۔ ان شعرا سے ۱۱۶۱ھ/۱۷۴۸ء میں تذکرے کی ترتیب سے قبل مولف کی ملاقات ہو چکی تھی۔ دراصل اس تذکرے کو حاکم کے دوسرے تذکرے "مردمِ دیدہ" کا مقدمہ یا حرفِ آغاز سمجھنا چاہیے۔ "مردمِ دیدہ" انھوں نے ۱۱۷۵ھ/۶۲-۱۷۶۱ء میں قیام اورنگ آباد کے دوران خان آرزو کے تذکرے "مجمع النفائس" کو دیکھنے کے بعد "تحفۃ المجالس" کے نام سے مرتب کیا ہے۔ چونکہ اس تذکرے میں بھی مولف نے صرف دیدہ و شنیدہ شعرا کے تعارف کو اپنا مطمحِ نظر قرار دیا تھا اس لیے بعد میں علامہ آزاد بلگرامی کی تجویز کے مطابق انھوں نے اپنے پسند کیے ہوئے نام "تحفۃ المجالس" کو "مردمِ دیدہ" سے بدل دیا۔

تذکرہ حسینی مولفہ میر حسین دوست سنبھلی

مولف کے مستخرجہ مادہ تاریخ "خجستہ انجام" کے بموجب اس تذکرے کی ترتیب ۱۱۶۱ھ (۱۷۴۸ء) میں عمل میں آئی ہے۔ شعرا کی مجموعی تعداد چار سو پینتالیس (۴۴۵) ہے جس میں وہ صلحا و عرفا اور ملوک و سلاطین بھی شامل ہیں جنھیں شاعری سے محض برائے نام واسطہ رہا ہے۔ شعرا کے حالات بالعموم بہت مختصر اور ناکافی ہیں، البتہ بعض جگہ قارئین کی دلچسپیاں برقرار رکھنے کے لیے لطائف و ظرائف کا بھی اضافہ کر دیا گیا ہے۔

مجمع النفائس از سراج الدین علی خاں آرزو

آرزو نے اپنے ایک دوست کی فرمائش پر مختلف شعرا کے کلام سے ان کے بہترین

اشعار انتخاب کر کے ایک بیاض کی صورت میں جمع کرنا شروع کیے تھے لیکن متوسط اور متاخر شعرا کے سو[1] دیوانوں کا انتخاب مکمل کر لینے کے بعد ان کی توجہ حالات کے اضافے کی طرف منعطف ہوئی اور اشعار کے اس مجموعے نے بڑھتے بڑھتے ایک ضخیم تذکرے کی صورت اختیار کر لی۔ بعض بیانات سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس تشکیلِ جدید کی ابتدا ۱۱۵۹ھ/۱۷۴۶ء سے قبل ہو چکی تھی[2]۔ اختتام مولف کے ایک شاگرد بیدار کے مصرعۂ تاریخ

"گلزار خیال اہلِ معنی جہاں"

کی رو سے ۱۱۶۴ھ/۱۷۵۱ء میں ہوا۔ خدا بخش لائبریری پٹنہ کی فہرست کے مطابق "مجمع النفائس" میں ایک ہزار سات سو پینتیس (۱۷۳۵) شاعروں کے حالات و اشعار شامل ہیں۔ حالاتِ زندگی کے بیان کی حد تک یہ تذکرہ عام تذکروں سے بہت زیادہ مختلف یا ممتاز نہیں، البتہ شعرا کی ادبی حیثیت کے تعین، ان کے کلام کے بارے میں اظہارِ خیال، اشعار کے نقائص کی استادانہ گرفت اور ان کی اصلاح اور اسی قسم کے دوسرے علمی و فنی مسائل پر بحث نیز انتخابِ کلام کے لحاظ سے اس کا پایہ بہت بلند ہے۔ ڈاکٹر منوہر سہائے انور کے الفاظ میں:

> "اس تصنیف میں خان آرزو کے علم کی وسعت اور ہمہ گیری (پوری طرح) بروے کار رہی ہے اور انھوں نے اس کے ذریعے اپنے لیے ایک ممتاز مقام حاصل کر لیا ہے"[3]

یہ تھے شعرائے فارسی کے وہ تذکرے جو اردو تذکرہ نویسی کے آغاز سے قبل معرضِ وجود میں آ چکے تھے۔ شعرائے اردو کے تذکرہ نگاروں نے انھی کو اپنے لیے

---

[1] لطف اللہ خاں شاکر نے اس کے متعلق لکھا ہے کہ "در سنہ ہزار و یک صد و پنجاہ و نہ ہجری (۱۱۵۹ھ) است دو ماہ پیش ازیں بہ رحمتِ ایزدی پیوست" (مخطوطہ رام پور ورق ۴۹۵ ب)

[2] دلی کالج میگزین (لاہور) ص ۱۷

چراغِ راہ بنایا۔ انھوں نے انھی تذکروں سے ترتیب کے اصول و آداب اور نقد و نظر کے معیار مستعار لیے اور بعض حالات میں ان کے اوراق پر بکھری ہوئی معلومات سے بھی استفادہ کیا۔ چنانچہ وہ تمام خوبیاں اور خامیاں جو فارسی تذکرہ نگاروں کے یہاں موجود تھیں، اردو تذکروں میں بھی داخل ہوگئیں۔ فارسی تذکرہ نویسوں نے انتخابِ کلام کی جامعیت و نفاست کا بطورِ خاص اہتمام کیا ہے، حالات زندگی کے انضباط کو وہ ثانوی حیثیت دیتے ہیں لیکن نہ تو ان کے ہاں عام طور پر کسی محققانہ طریقِ کار کا کوئی تصور ملتا ہے اور نہ تواریخ و سنین کا التزام ان کے معمولات میں شامل ہے۔ اردو کے تذکرہ نویس بھی اسی روش پر کاربند اور انھی رجحانات و میلانات سے متاثر ہیں، اس لیے شعرائے اردو کے تذکروں کا مطالعہ کرنے سے قبل ان تمام باتوں کا ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔

اُردو تذکرہ نگاری
(آغاز سے شیفتہ تک)

پس منظر اور محرکات

تذکرہ نگاری کا آغاز اور اس کے فروغ کے امکانات شاعری کی ترقی سے اس طرح وابستہ ہیں کہ انھیں کسی نہج پر بھی ایک دوسرے سے علٰحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ شاعری عالمِ طفولیت میں ہو تو تذکرہ نگاری کا تصور بھی محال ہے۔ شعری سرمائے کی وافر مقدار میں موجودگی کے بغیر تذکرہ نگار ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتا۔ اس کی تگ و تاز اسی جہانِ معنی کی جادہ نوردی و خاک بیزی سے عبارت ہے۔ وہ اسی سمندر کا غواص ہوتا ہے۔ اس کے فن کے شاہکار اسی سرمایے سے سامانِ وجود حاصل کرتے ہیں اور اس کی دنیا اسی آب و گل سے تعمیر ہوتی ہے۔ عربی و فارسی تذکرہ نگاری کی تاریخ اس کلیے کی صداقت پر شاہد ہے۔ عربی شعرا کا پہلا تذکرہ تیسری صدی ہجری کے اوائل میں لکھا گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ عربی شاعری دورِ شباب سے بھی آگے بڑھ چکی تھی۔ اس کا خزانہ امرؤالقیس، زہیر بن سلمٰی، عبید بن ربیعہ، عمرو بن کلثوم، نابغہ ذبیانی، کعب بن زہیر، حسان بن ثابت، اخطل، جریر اور فرزدق جیسے شہرۂ آفاق فن کاروں کے جواہرِ افکار اور دوسرے بے شمار معروف و غیر معروف شاعروں کی تخلیقات سے معمور تھا۔ زبان نے اعتبار و استناد کے تمام مراحل طے کر لیے تھے اور فن بڑی حد تک اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ چکا تھا۔ اسی طرح ساتویں صدی ہجری کی ابتدا میں شعرائے فارسی کے پہلے تذکرے کی ترتیب کے زمانے تک فارسی زبان

بھی مشرق کی ادبی دنیا میں ایک ممتاز مقام حاصل کر چکی تھی۔ غزنویوں اور سلجوقیوں کی فتوحات کے نتیجے میں خراسان، عراق اور آذربائیجان اس کے اہم مراکز بن گئے تھے اور دجلہ کے ساحل سے دریائے سندھ کی وادی تک اس کا سکہ چل رہا تھا۔ شاعری کے میدان میں رودکی، دقیقی، عنصری، فردوسی، فرخی، منوچہری، قطران، ازرقی، محمود سعد، مغربی نیشاپوری، سنائی غزنوی، انوری اوحدی، ظہیر فاریابی، خاقانی شروانی، نظامی گنجوی، اور شیخ فریدالدین عطار وغیرہ کے گراں قدر کارنامے جوہر شناس نگاہوں سے خراج تحسین حاصل کر چکے تھے۔ اردو تذکرہ نویسی کا آغاز بھی ایسے ہی حالات میں ہوا۔ اٹھارویں صدی کے وسط تک جب کہ زمانے کے تھوڑے سے فرق کے ساتھ ہمارے کئی اہلِ علم اس صنف کی طرف راغب ہوئے، اردو شاعری کی بنیادیں کافی مستحکم ہو چکی تھیں۔ فارسی کی بزم سخن کے چراغ صبح کے سیماب پاستاروں کی طرح ٹمٹما رہے تھے اور شعر و ادب کی فضائے بسیط ایک آفتابِ تازہ کی روشنی سے جگمگاتی جا رہی تھی۔ ستاروں کی شکست سے طلوعِ آفتاب تک کی یہ منزل کس طرح طے ہوئی، یہ داستان ناشنیدہ نہیں لیکن یہاں ایک بار پھر اسے [illegible] ضروری معلوم ہوتا ہے۔

اردو شمالی یا شمال مغربی ہندوستان میں پیدا ہوئی لیکن خود شناسی اور خود نمائی کے مواقع اسے سب سے پہلے سرزمین دکن میں حاصل ہوئے۔ یہی سرزمین اس کی پرکشش شاعری اور باوقار ادب کا اولین گہوارہ بنی اور اسی افق سے اس کے عروج و اقبال کا آفتاب طلوع ہوا۔ اس علاقے میں وسیع پیمانے پر اردو کے اثر و نفوذ کی داستان ۷۲۷ھ/۱۳۲۷ء میں ہندوستان کا دارالخلافہ دہلی سے دیوگیر یا دولت آباد منتقل کرنے کے متعلق محمد تغلق کے تاریخی فیصلے کے ساتھ شروع ہوتی ہے۔ اگرچہ یہ نوخیز زبان اس سے قبل ہی شمالی ہند سے پہنچنے والے صوفیا و صلحا اور مبلغینِ اسلام کے ذریعے اس علاقے کے رہنے والوں سے روشناس ہو چکی تھی لیکن سیاسی سطح پر اس اہم تبدیلی کے بعد دولت آباد میں دہلی اور اس کے قرب و جوار سے ہجرت کر کے آنے والے عام شہریوں، عمائدینِ سلطنت، علما و فضلا، سرکاری ملازمین، تاجروں اور

صناعوں کی آباد کاری کے نتیجے میں اس کے دائرۂ عمل میں جو وسعت حاصل ہوئی، اس نے اس کے ارتقا کی رفتار کو حیرت انگیز طور پر تیز کر دیا۔ اس زمانے میں دکن کے مختلف حصوں میں تلگو، کنڑ، مرہٹی اور ان کی ذیلی بولیاں عوام کے وسیلۂ اظہار کے طور پر رائج تھیں لیکن یہ زبانیں نو وارد حاکموں اور مقامی [illegible] کے درمیان ربط وضبط بڑھانے اور مودت ومواسات کے رشتے استوار کرنے کی اہل نہیں تھیں۔ تاریخ کے اس نازک موڑ پر اردو کی تسخیری صلاحیتیں بروے کار آئیں اور اس نے نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ اظہار وابلاغ کی دشواریوں پر قابو پانے اور مختلف لسانی وحدتوں کو ایک مضبوط ومستحکم رشتے میں منسلک کرنے کا اہم فریضہ انجام دیا۔

اردو کا یہ سیلِ رواں جو شمالی ہند کے مہاجر عوام اور فوجیوں کے ساتھ دکن کے حدود میں داخل ہوا تھا، ملک کی سرکاری زبان یعنی فارسی کے خلاف ایک منظم انقلاب کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ تغلق کی رعایا اور فوج نے نئے دارالسلطنت کے قیام اور ترکِ وطن کا فیصلہ خوشی کے ساتھ قبول نہیں کیا تھا۔ وہ اپنے آقا کی اس حکمتِ عملی سے مطمئن نہیں تھے چنانچہ اس کو جلد ہی اپنے فیصلے پر نظرِ ثانی کرنا پڑی (۱۳۳۵ء)۔ اس کے باوجود اس بددلی کا جو حالات کی ان تبدیلیوں سے پیدا ہوئی تھی، سدِّ باب نہ ہو سکا۔ جاں باز اور تجربہ کار سردار جنھوں نے اپنا لہو بہا کر فتحِ دکن کی مہم سر کی تھی، سلطان کی سخت گیری اور خود رائی سے تنگ آ چکے تھے اور اس کی طرف سے طرح طرح کے خدشات میں مبتلا تھے۔ چنانچہ جب بعض افسروں کو سلطان کے اس ارادے کا علم ہوا کہ وہ ان کو قتل کرا کے ان سے نجات حاصل کر لینا چاہتا ہے تو وہ اس کے خلاف بغاوت پر آمادہ ہو گئے۔ ان کی یہ تحریک کامیاب ہوئی۔ کافی جدال وقتال کے بعد شاہی فوجیں دولت آباد سے پسپا ہو گئیں اور باغی گروہ کے ایک سردار حسن خاں مخاطب بہ ظفر خاں نے جو خود کو اسفندیار کے بیٹے بہمن شاہ کی اولاد کہا کرتا تھا[1] ۲۴ ربیع الثانی ۷۴۸ھ (۳ اگست ۱۳۴۷ء) کو ابوالمظفر علاء الدین بہمن شاہ کا لقب اختیار کر کے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ اس

---

[1] تاریخ فرشتہ (اردو ترجمہ) جلد اوّل ص ۴۲۱ تا ۴۲۵

طرح بہمنی سلطنت وجود میں آئی جس کا ستارۂ اقبال ۱۴۹۰ء تک جگمگاتا رہا[۱]۔ اس خاندان کے فرماں رواؤں نے مرکز سے مکمل قطع تعلق کی پالیسی اور دوسری سیاسی مصلحتوں کے تحت دفتری کاروبار کے لیے فارسی کے بجائے اردو کا انتخاب کر کے اسے شاہی سرپرستی کا شرف عطا کیا[۲]۔ یہ اردو کے جمہوری کردار کی دوسری عظیم الشان فتح تھی جس کی بدولت وہ عوام اور خواص دونوں کے لیے قابلِ احترام ہوگئی۔

سرکاری دفاتر میں اردو کی باریابی کے بعد اہلِ علم زیادہ تندہی کے ساتھ اس کی تہذیب و ترقی کی جانب متوجہ ہوئے اور وہ احساسِ کمتری جو اسے تصنیف و تالیف کی زبان بنانے سے روکتا رہا تھا، ختم ہوگیا۔ صوفیائے کرام نے مسائلِ تصوف اور رموزِ معرفت کی تفہیم و تشریح کے لیے تقریر کے ساتھ تحریر میں بھی اس زبان کو اظہارِ خیال کا ذریعہ بنا کر علمی و ادبی سطح پر تصنیف و تالیف کے لیے اس کے استعمال کے امکانات روشن کر دیے۔ اردو کے اس قدیم ترین سرمائے کی کچھ یادگاریں صوفیائے کرام کے ملفوظات اور بعض رسائل کی صورت میں اب بھی محفوظ ہیں۔ شاعری کے میدان میں نظامی بیدری کی مثنوی "کدم راؤ پدم راؤ" بہمنی عہد کا سب سے بڑا کارنامہ خیال کی جاتی ہے۔ یہ مثنوی اردو کی سب سے پہلی مستقل منظوم تصنیف ہے۔ بعض اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ نظامی سلطان احمد شاہ ثالث عرف نظام شاہ (۸۶۵ھ/۱۴۶۱ء تا ۸۶۷ھ/۱۴۶۳ء) کا درباری شاعر تھا اور یہ مثنوی اسی کے عہدِ حکومت میں لکھی گئی ہے[۳]۔

۸۹۵ھ/۱۴۹۰ء میں سلطنت بہمنیہ زبردست انتشار و اختلال سے دوچار ہوئی۔ سلطان محمود شاہ (۸۸۷ھ/۱۴۸۲ء تا ۹۲۴ھ/۱۵۱۸ء) کی کم عمری و ناتجربہ کاری سے فائدہ اٹھا کر ایک سازش کے تحت بیک وقت اس کے تین صوبے داروں نے اطاعت کا

---

[۱] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو کیمبرج ہسٹری آف انڈیا جلد سویم ص ۱۴۰ تا ۱۷۰

[۲] دکن میں اردو ص ۲۵ و اردوئے قدیم ص ۷۸

[۳] دکن میں اردو ص ۳۸ و دکنی ادب کی تاریخ ص ۱۴

طوق اتار پھینکا۔ ملک احمد بحری ملقب بہ نظام الملک نے احمد نگر میں، یوسف عادل خاں نے بیجاپور میں اور فتح اللہ عماد الملک نے برار میں آزاد حکومتیں قائم کرلیں[1]۔ یہ حکومتیں بعد میں اپنے بانیوں سے منسوب ہو کر نظام شاہی، عادل شاہی اور عماد شاہی سلطنتوں کے نام سے مشہور ہوئیں۔ ۹۱۸ھ/۱۵۱۲ء میں تلنگانہ (گول کنڈہ) کے صوبے دار قطب الملک سلطان قلی نے خود مختاری کا اعلان کر کے قطب شاہی سلطنت کی بنیاد رکھی[2] اور ۹۳۴ھ/۱۵۲۷ء میں محمود شاہ کے وزیر برید الملک قاسم کے بیٹے اور جانشین امیر علی برید نے آخری بہمنی تاجدار سلطان کلیم اللہ کو بیدر سے فرار پر مجبور کر کے ان علاقوں کے ساتھ جن پر وہ عملاً پہلے ہی سے قابض تھا، دار السلطنت پر بھی تسلط حاصل کر لیا اور یہ تمام علاقے برید شاہی سلطنت میں تبدیل ہو گئے[3]۔ اس طرح بہمنی خاندان کا چراغ گل ہوتے ہوتے اس کی خاکستر سے پانچ آزاد ریاستیں وجود میں آچکی تھیں۔ ۹۸۲ھ/۱۵۷۴ء میں برار پر احمد نگر کے سلطان مرتضیٰ نظام شاہ کا قبضہ ہو گیا[4] اور ۱۰۲۸ھ/۱۹-۱۶۱۸ء بیدر کی برید شاہی سلطنت بیجاپور کی عادل شاہی مملکت میں ضم ہو گئی[5]۔ اردو زبان و ادب کی ترقی میں تاریخی نقطۂ نظر سے ان سلطنتوں میں سے احمد نگر کی خدمات زیادہ نمایاں اور اہم تھیں لیکن عادل شاہی اور قطب شاہی سلاطین اور ان کے علاقوں کے عوام نے اس سلسلے میں جو عہد ساز کارنامے انجام دیے ہیں، وہ ہماری ادبی تاریخ کا ایک درخشاں باب ہیں۔

عادل شاہی خاندان کے پہلے دو فرماں روا یوسف عادل شاہ (۸۹۵ھ/۱۴۹۰ء

---

[1] تاریخ فرشتہ جلد اوّل ص ۵۷۰

[2] تاریخ فرشتہ جلد دوم ص ۲۴۷

[3] تاریخ فرشتہ جلد اوّل ص ۵۸۲ و ۵۸۴

[4] تاریخ فرشتہ جلد دوئم ص ۳۶۱

[5] کیمبرج ہسٹری آف انڈیا جلد سوئم ص ۷۰۹

تا ۹۱۶ھ/۱۵۱۰ء) اور اسمٰعیل عادل شاہ (۹۱۶ھ/۱۵۱۰ء تا ۹۴۱ھ/۱۵۳۴ء) فارسی زبان اور اس کی شاعری کے دلدادہ اور ایرانی تہذیب و تمدن کے پرستار تھے، اس لیے ان کے عہدِ اقتدار میں فارسی نے دوبارہ اپنا کھویا ہوا منصب پالیا اور اردو عوام کے دامن میں پناہ لینے پر مجبور ہوگئی۔ تقریباً پچاس سال کے بعد فارسی کے اقتدار کا یہ دور ختم ہوا اور ابراہیم عادل شاہ اوّل (۹۴۱ھ/۱۵۳۵ء تا ۹۶۵ھ/۱۵۵۸ء) کے عہد میں اس کے حکم سے تمام دفاتر از سرِ نو اردو میں منتقل کر دیے گئے۔[1] ابراہیم کے بعد اس کا بیٹا علی عادل شاہ تخت نشیں ہوا۔ یوسف عادل شاہ اور اسمٰعیل عادل شاہ کی طرح اس کے عہدِ حکومت (۹۶۵ھ/۱۵۵۸ء تا ۹۸۸ھ/۱۵۸۰ء) میں بھی عجمی اثرات کا دور دورہ رہا اور اردو ایک بار پھر کاروبارِ سلطنت میں اقتدارِ اعلیٰ سے محروم ہوگئی۔ لیکن ابھی پورے پچیس برس بھی نہ گزرے تھے کہ ابراہیم عادل شاہ ثانی (۹۸۸ھ/۱۵۸۰ء تا ۱۰۳۷ھ/۲۸-۱۶۲۷ء) نے زمامِ کار اپنے ہاتھ میں لیتے ہی سابقہ احکام منسوخ کر دیے۔ اس خوش آئند اقدام کے بعد سے گیارھویں صدی ہجری کے اواخر میں انتزاعِ سلطنت کے زمانے تک شاہی دفتروں میں بدستور اُردو کا سکہ چلتا رہا۔ لسانی کش مکش کے اس دو سو سالہ دَور میں اردو نے ہر محاذ پر نمایاں کامیابیاں حاصل کیں۔ اس نے خود کو رموزِ مملکت اور مسائلِ حیات دونوں کی ترجمانی کا اہل ثابت کر دکھایا۔ عوام میں اسے غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی اور اس کے ادبی سرمائے میں گراں قدر اضافہ ہوا۔

اس طبقے سے تعلق رکھنے والے شعرا میں شاہ میران جی شمس العشاق، شاہ برہان الدین جانم، عبدل، صنعتی، ملک خوشنود، رستمی، حسن شوقی، شاہی، ملک الشعرا نصرتی اور شاہ میران ہاشمی کے نام کافی نمایاں ہیں۔ ان لوگوں کی کوششوں سے اردو شاعری کو فارسی شاعری کے مقابلے میں قدم جمانے کے مواقع حاصل ہوئے اور اس کے فروغ و ارتقا کی راہیں ہموار ہوئیں۔ شاہ میران جی شمس العشاق سے جنھیں بعض

---

[1] منتخب الالباب جلد سویم ص ۳۰۷

محققین کے خیال کے مطابق گجرات سے وطنی نسبت تھی[1]، تین مختصر منظوم تصانیف "خوش نامہ"، "خوش نغز" اور "شہادت الحقیقت" منسوب ہیں۔ شاہ برہان الدین جانم شاہ شمس العشاق کے فرزند تھے۔ اپنے والد کی طرح انھوں نے بھی اردو نثر و نظم سے اخلاقی اقدار اور رموزِ معرفت کی تبلیغ و اشاعت کا کام لیا۔ ارشاد نامہ، حجت البقاء، وصیت الہادی، سکھ سہیلا، منفعت الایمان اور نکتۂ واحدان کی مشہور نظمیں ہیں۔

عبدل کی مثنوی "ابراہیم نامہ" جس میں اس نے اپنے ممدوح ابراہیم عادل شاہ ثانی کی مجلسی اور معاشرتی زندگی کا نقشہ کھینچا ہے، ڈاکٹر نذیر احمد کے الفاظ میں ایک وقیع کارنامہ ہے[2]۔ یہ مثنوی ۱۰۱۲ھ/۱۶۰۴ء میں مکمل ہوئی ہے۔ صنعتی "قصہ بے نظیر" یا "قصہ تمیم انصاری" کی وجہ سے شہرت رکھتا ہے۔ یہ مثنوی ۱۰۵۵ھ/۱۶۴۵ء یعنی محمد عادل شاہ کے عہد کی تصنیف ہے۔ ملک خوشنود محمد عادل شاہ کا درباری شاعر تھا۔ اپنے ولی نعمت کی فرمائش پر اس نے امیر خسرو کی مثنوی "ہشت بہشت" کا اردو میں ترجمہ کیا۔ اس مثنوی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ خوشنود نے حضرت یوسفؑ اور زلیخا کے قصے کو بھی اردو میں نظم کیا تھا۔ ۱۰۴۲ھ/۳۳-۱۶۳۲ء میں بیجاپور آنے سے قبل اس نے گول کنڈہ کے زمانۂ قیام میں بھی ایک مثنوی جسے ڈاکٹر زور "بازارِ حسن" سے موسوم کرتے ہیں، لکھنا شروع کی تھی جو کسی وجہ سے پایۂ تکمیل تک نہ پہنچ سکی[3]۔ اس کے علاوہ بعض مورخین اس کی قصیدہ گوئی کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ رستمی اپنی تصنیف "خاور نامہ" کی بدولت دکنی اردو کی تاریخ میں ممتاز حیثیت کا مالک ہے۔ یہ مثنوی جس کے اشعار کی تعداد بائیس ہزار سات سو پینتیس (۲۲۷۳۵) بتائی جاتی ہے، محمد عادل شاہ کی ملکہ خدیجہ سلطان کے حسب فرمائش ۱۰۵۹ھ/۱۶۴۹ء

---

[1] علی گڑھ تاریخ ادب اردو جلد اوّل ص ۲۰۹

[2] " " " " " " " ص ۲۵۸

[3] " " " " " " " ص ۲۸۴

میں محمد بن حسام الدین الخوافی کے "خاور نامہ" سے ترجمہ کی گئی ہے۔ شوقی دو مثنویوں "میزبانی نامہ" اور "فتح نامہ" کا مصنف ہے۔ اوّل الذکر مثنوی میں وزیر سلطنت مصطفیٰ خاں کی لڑکی سے محمد عادل شاہ کی شادی کا حال بیان کیا گیا ہے۔ دوسری مثنوی وجیانگر کی حکومت کے خلاف نظام شاہی، عادل شاہی، قطب شاہی اور برید شاہی فوجوں کی متحدہ یلغار (جنوری ۱۵۶۵ء/جمادی الثانیہ ۹۷۲ھ) کے واقعات پر مشتمل ہے۔ مثنوی کے علاوہ شوقی نے غزل میں بھی اپنی طباعی کے جوہر دکھائے ہیں۔ اس کی جو غزلیں دستیاب ہوئی ہیں وہ بڑی بلند پایہ ہیں۔ شاہی خاندان عادل شاہیہ کے آٹھویں فرماں روا علی عادل شاہ ثانی (۱۰۶۷ھ/۱۶۵۶ء تا ۱۰۸۳ھ/۷۳-۱۶۷۲ء) کا تخلص ہے۔ اس نے غزل، قصیدہ، مثنوی، مرثیہ اور دوسری اصنافِ سخن میں بڑی کامیابی کے ساتھ طبع آزمائی کی ہے۔ تخیل کی بلند پروازی اور طرزِ ادا کی ندرت اس کے کلام کی خاص خصوصیات ہیں۔ نصرتی (متوفی ۱۰۸۵ھ/۱۶۷۴ء) عادل شاہی دور کا سب سے بڑا شاعر ہے۔ علی عادل شاہ ثانی نے اسے ملک الشعرا کا خطاب عطا کیا تھا۔ "مثنوی گلشن عشق" (منظومہ ۱۰۶۸ھ/۵۸-۱۶۵۷ء) میں جو کم و بیش چار ہزار اشعار پر مشتمل ہے، اس نے مناظرِ قدرت کی بڑی کامیاب عکاسی کی ہے۔ دوسری مثنوی "علی نامہ" (۱۰۷۶ھ/۶۶-۱۶۶۵ء) سے بھی جو علی عادل شاہ کی سوانح عمری اور اس کے عہد کی سیاسی و مجلسی تاریخ ہے، اس کی مہارتِ فن اور قدرتِ کلام کا پتا چلتا ہے۔ نصرتی کی تیسری مثنوی "تاریخِ اسکندری" (۱۰۸۳ھ/۷۳-۱۶۷۲ء) ہے جو سکندر عادل شاہ کے دور (۱۰۸۳ھ/۷۳-۱۶۷۲ء تا ۱۰۹۷ھ/۱۶۸۶ء) میں لکھی گئی ہے۔ اس مثنوی میں ایک جنگ کے دوران عادل شاہی افواج کی معرکہ آرائی کا حال نظم کیا گیا ہے۔ مثنوی نگاری کے پہلو بہ پہلو نصرتی کو قصیدہ گوئی میں بھی زبردست ملکہ حاصل تھا۔ اس صنف میں دکن کے دورِ قدیم کا کوئی شاعر اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ ہاشمی (متوفی ۱۱۰۹ھ/۹۸-۱۶۹۷ء) اردو غزل میں صنف نازک کی جانب سے اظہارِ عشق کا موسس کہا جاتا ہے۔ اس کا کلام معنوی لحاظ سے ریختی کا ہم رنگ

ہے لیکن اس میں وہ ابتذال اور چھچھورا پن نہیں جو بعد کے ریختی گو شعرا کے ہاں پایا جاتا ہے۔ ہاشمی کی زندگی ہی میں عادل شاہی سلطنت پر زوال آیا اور وہ عالمگیر کی وسیع مملکت کا ایک جز بن گئی (۱۰۹۷ھ/۱۶۸۶ء)[1]۔ سقوطِ بیجاپور کے بعد وہ ارکاٹ کی طرف چلا گیا جہاں ۱۰۹۹ھ/۱۶۸۸ء میں اس نے "مثنوی یوسفؑ زلیخا" نظم کی۔ اس مثنوی کا قصہ براہِ راست قرآن مجید اور اس کی تفاسیر سے ماخوذ ہے۔

عادل شاہیوں کی طرح قطب شاہی سلاطین نے بھی اردو زبان اور شاعری کے فروغ میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔ ان کے عہد کی ایک سو پچہتر (۱۷۵) سالہ (۱۵۱۲ء تا ۱۶۸۷ء) تاریخ میں دفتری سطح پر لسانی اثر و اقتدار کی کسی کش مکش کا کوئی سراغ نہیں ملتا ہے جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ سلطنتِ بہمنیہ کے زوال کے بعد بھی اس علاقے میں اردو کو ابتدا ہی سے حکومت کی سرپرستی کا شرف حاصل رہا اور لسانی ارتقا کی راہ پر اپنی پیش قدمی جاری رکھنے کے لیے بہترین مواقع اور سازگار ماحول نصیب ہوا لیکن اس خاندان کے پہلے دو فرماں رواؤں یعنی سلطان قلی قطب شاہ (۹۱۸ھ/۱۵۱۲ء تا ۹۵۰ھ/۱۵۴۳ء) اور جمشید قلی قطب شاہ (۹۵۰ھ/۱۵۴۳ء تا ۹۵۷ھ/۱۵۵۰ء) کے زمانۂ حکومت میں اردو شاعری کی کیا کیفیت رہی، یہ بتانا محال ہے۔ تیسرے فرماں روا ابراہیم قطب شاہ کے عہد (۹۵۷ھ/۱۵۵۰ء تا ۹۸۹ھ/۱۵۸۱ء) میں بھی وثوق کے ساتھ صرف قطب الدین فیروز بیدری کا نام لیا جا سکتا ہے جس کی ایک مثنوی "پرت نامہ" اردو میں اس کی طبع آزمائی کی یادگار ہے۔ یہ مثنوی ایک سو اکیس (۱۲۱) اشعار پر مشتمل ہے اور ۹۷۲ھ/۱۵۶۴-۶۵ء سے قبل لکھی گئی ہے۔ موضوعِ سخن حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کے حالات اور منقبت ہے۔ ڈاکٹر زورؔ نے فیروز کو گول کنڈہ کے مسلم الثبوت شعرا میں شمار کیا ہے۔ ان کے قول کے مطابق "اس کے کلام کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو زبان اور ادب اس وقت تک ارتقا کی جملہ ابتدائی

---

[1] دی سلطنت آف دہلی ص ۲۷۷

منزلوں سے گزر چکے تھے اور یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ فیروز سے پہلے بھی اچھے اچھے اور بلند پایہ شاعر گزرے ہوں گے۔"[1] ابراہیم قطب شاہ کی وفات کے بعد اس کا نامور فرزند محمد قلی قطب شاہ تخت نشیں ہوا[2] اور ۱۰۲۰ھ/۱۶۱۱ء تک سریر سلطنت پر رونق افروز رہا۔ محمد قلی ایک نئی تہذیب کا بانی اور ایک نئے دور کا معمار کہا جاتا ہے۔ اس کی زندہ جاوید یادگار شہر حیدر آباد ہے جس کی تعمیر کا سلسلہ اس نے اپنے جلوس کے سولھویں سال میں شروع کیا تھا[3]۔ وہ اردو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر ہے۔ تقریباً پچاس ہزار اشعار پر مشتمل اس کے ضخیم مجموعہ کلام میں اردو غزلوں، قصیدوں، مرثیوں اور رباعیوں کے علاوہ عوامی موضوعات پر مسلسل نظمیں بھی خاصی تعداد میں موجود ہیں۔ پروفیسر عبدالقادر سروری کے بقول "اردو غزل محمد قلی کے یہاں سب سے پہلے اپنے خط و خال کے ساتھ ابھری[4]" چنانچہ اس کی غزلوں میں پہلی بار اس صنف کی فنی تکمیل کا احساس ہوتا ہے۔ اسی طرح اس کی دوسری نظمیں بھی فن کے کمال اور زبان کی پختگی کے نمونے پیش کرتی ہیں۔

مختلف اصنافِ سخن اور بالخصوص غزل کی صنف میں محمد قلی کی باقاعدہ طبع آزمائی سے جہاں اردو شاعری کی تاریخ میں ایک نئے باب کا آغاز ہوتا ہے، وہیں اس کی سخن شناسی اور شعر و ادب کی قدر افزائی نے بھی علم و فن کے سرپرست سلاطین کی

---

[1] علی گڑھ تاریخ ادب اردو جلد اوّل ص ۳۵۷

[2] ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ نے تاریخِ جلوس ۲۱ ربیع الثانی ۹۸۸ھ (۱۵۸۰ء) بتائی ہے۔ (علی گڑھ تاریخ ادب اردو جلد اوّل ص ۳۶۲) لیکن تاریخ فرشتہ (جلد دوم ص ۲۵۴) میں مذکور ہے کہ ۹۸۹ھ میں ابراہیم قطب شاہ نے وفات پائی اس کے بعد محمد قلی تخت نشین ہوا۔ فرشتہ ہم عصر مورخ ہے اس لیے ہمارے نزدیک اس کا بیان قابلِ ترجیح ہے۔

[3] علی گڑھ تاریخ ادب اردو ص ۳۶۲

[4] اردو کی ادبی تاریخ ص ۱۰۲

صفِ اوّل میں اس کے لیے ایک ممتاز حیثیت مخصوص کر دی ہے۔ اس کے دربار کا مشہور شاعر ملا وجہی جسے اس نے ملک الشعرا کے اعزاز سے نوازا، اردو کا ایک بلند پایہ اور ممتاز ادیب ہے۔ وجہی کی شاعرانہ صلاحیتیں مثنوی "قطب مشتری" (مصنفہ ۱۰۱۸ھ/۱۶۰۹ء) سے آشکار ہیں۔ اس مثنوی میں اس نے مشتری کے فرضی نام کے تحت بھاگ متی سے بادشاہ کے معاشقے کی واردات و کیفیات نظم کی ہیں۔ ابتدا میں "در شرح شعر" کے عنوان سے اس نے شاعری کے بارے میں اپنے کچھ تصورات پیش کیے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے عہد میں اردو شاعری کا ایک معیار متعین ہو چکا تھا۔ مثنوی کے علاوہ وجہی نے غزلیں، رباعیاں، مرثیے اور نوحے بھی کہے ہیں۔ "قطب مشتری" کی طرح یہ تمام تخلیقات بھی اس کی استادانہ مہارت و مشاقی کا ثبوت فراہم کرتی ہیں۔ وجہی قلی قطب شاہ کے بعد محمد قطب شاہ (۱۰۲۰ھ/۱۶۱۱ء تا ۱۰۳۵ھ/۲۶-۱۶۲۵ء) اور عبداللہ قطب شاہ (متوفی ۱۰۸۳ھ/۱۶۷۲ء) کے عہد میں بھی سرگرم عمل رہا لیکن اس زمانے میں غواصی کے سامنے اس کا چراغ نہ جل سکا۔ غواصی نے قطب شاہ کے دورِ حکومت میں مثنوی "سیف الملوک اور بدیع الجمال" تصنیف کر کے خاص شہرت حاصل کی۔ یہ مثنوی ایک روایت کے بموجب ۱۰۲۵ھ/۱۶۱۶ء میں[1] اور دوسری روایت کے مطابق ۱۰۲۷ھ/۱۶۱۸ء میں لکھی گئی ہے[2]۔ محمد قطب شاہ کے عہد میں غواصی کی اس مثنوی کے علاوہ کوئی اور قابلِ ذکر شاہکار نظر نہیں آتا۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس نے شاعروں کی سرپرستی میں کسی خاص گرم جوشی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ اس کی توجہات شعر و ادب سے زیادہ فلسفے اور مذہبی علوم کی جانب مبذول رہیں تاہم ۱۰۲۵ھ/۱۶۱۶ء میں اس نے اپنے چچا اور پیش رو قلی قطب شاہ کا دیوان مرتب کر کے ایک اہم علمی کارنامہ انجام دیا ہے۔ اس دیوان پر اس نے ایک منظوم دیباچہ بھی لکھا ہے جو فکرِ شعر سے اس کی طبعی مناسبت کا شاہد ہے۔

---

[1] برس ایک ہزار ہور پنج بیس میں کیا ختم یو نظم دن تیس میں (نسخہ برٹش میوزیم)

[2] برس ایک ہزار ہور ستاویس میں کیا ختم یو نظم دن تیس میں (نسخہ مطبوعہ)

محمد قطب شاہ کے برخلاف عبداللہ قطب شاہ کا طویل دورِ حکومت (۱۰۳۵ھ/ ۱۶۲۶ء تا ۱۰۸۳ھ/۱۶۷۲ء) شعرا کے لیے کافی سازگار رہا۔ قائم چاند پوری نے لکھا ہے کہ سلطان اربابِ سخن کے ساتھ بڑی محبت اور خلوص سے پیش آتا تھا[1]۔ اس حسنِ سلوک نے وجہی، غواصی اور دوسرے بہت سے شاعروں کو جو کس مپرسی اور گوشہ نشینی کی زندگی بسر کر رہے تھے، دوبارہ سرگرم عمل ہونے کے مواقع فراہم کیے۔ غواصی نے اس کے پہلے ہی سالِ جلوس میں "سیف الملوک اور بدیع الجمال" پر نظر ثانی کی اور ان اشعار کو جن میں محض رسمی طور پر محمد قطب شاہ کی تعریف کی تھی، عبداللہ کی مدح سے بدل دیا۔ ان مدحیہ اشعار میں اس نے سلطان کی ادب نوازی اور جوہر شناسی کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا ہے، ڈاکٹر زورؔ کے الفاظ میں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ جو شاعر کنجِ عزلت کے گوشہ نشیں ہو کر نیم مردہ ہو گئے تھے وہ تیرے دور میں پھر زندہ ہو گئے اور بحرِ گمنامی میں ڈوبے ہوئے صاحبانِ فضل و کمال تیر کر پھر ساحلِ شہرت پر نکل آئے۔ سب لوگ سمجھنے لگے کہ گویا شاعروں کا قدرداں اور دلدادہ محمد قلی پھر دنیا میں آگیا[2]۔ غالباً اس پہلی ادبی نذر ہی کی بدولت غواصی کو عبداللہ کی خدمت میں تقرب اور رسوخ حاصل ہوا اور وجہی کے بالمقابل دربار کی ملک الشعرائی کا منصب اس کے حصے میں آیا۔ سلطان کی فرمائش پر اسی دور میں وجہی نے "سب رس" تصنیف کی (۱۰۴۵ھ/۱۶۳۵ء)، جو اردو نثر کا پہلا مثالی شاہکار اور لازوال اہمیت کا کارنامہ ہے۔ ۱۰۴۹ھ/۱۶۳۹ء میں غواصی نے ملا ضیاء الدین بخشی کے فارسی "طوطی نامہ" کا اردو نظم میں ترجمہ کیا۔ یہ مثنوی تقریباً چار ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ "سیف الملوک اور بدیع الجمال" اور "طوطی نامہ" کے علاوہ غواصی کے کلیات کا ایک نامکمل نسخہ اور ایک اور مثنوی "چندا اور لورک" بھی دستیاب ہوئی ہے۔ کلیات میں ردیف وار مسلسل اور غیر مسلسل غزلیں، قطعات

---

[1] مخزنِ نکات مرتبہ مولوی عبدالحق ص ۳

[2] علی گڑھ تاریخ ادب اردو جلد اوّل ص ۳۸۶

قصیدے اور متعدد دوسری نظمیں شامل ہیں۔ قصائد میں غواصی نے بڑی کامیابی کے ساتھ فارسی قصیدہ نگاروں کا تتبع کیا ہے۔ سلطان عبداللہ قطب شاہ کو خود بھی شعر گوئی سے خاصی دل چسپی تھی، چنانچہ اس کا دیوان بھی جو مختلف اصنافِ سخن کے نمونوں سے مملو ہے، منظرِ عام پر آچکا ہے۔

عبداللہ قطب شاہ کے عہد کے دوسرے قابلِ ذکر شعرا میں قطبی، ابن نشاطی، جنیدی، افضل اور طبعی کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ قطبی نے ۴۵-۱۰۴۶ھ/۳۶-۱۶۳۵ء میں شیخ یوسف دہلوی کی قصیدہ نما نظم "تحفۃ النصائح" کو جس کے اشعار کی تعداد سات سو چھیاسی (۷۸۶) ہے شعر بہ شعر ترجمے کی صورت میں اردو میں منتقل کیا ہے۔ ابنِ نشاطی غواصی کے بعد اس دور کا ممتاز ترین فنکار ہے۔ وجہی کی طرح وہ ایک اچھا نثر نگار اور انشا پرداز بھی تھا۔ ۱۰۶۶ھ/۱۶۵۶ء میں اس نے ایک عشقیہ مثنوی "پھول بن" فارسی قصے کی بنیاد پر اردو میں نظم کی ہے۔ اس مثنوی کے بعض اشعار سے مترشح ہوتا ہے کہ وہ دربار کی بہ نسبت عوام میں زیادہ مقبول رہا۔ جنیدی مثنوی "ماہ پیکر" کا مصنف ہے جو ۱۰۶۴ھ/۱۶۵۴ء میں لکھی گئی ہے۔ افضل مثنوی نگاری کے علاوہ قصیدہ گوئی میں بھی مہارت رکھتا تھا۔ اس کی مثنوی "محی الدین نامہ" کے نسخے ہند اور بیرونِ ہند کے کئی کتب خانوں میں موجود ہیں۔ طبعی نے ۱۰۸۱ھ/۷۱-۱۶۷۰ء میں مثنوی "بہرام و گل اندام" تصنیف کی ہے جو اردو کی بہترین عشقیہ مثنویوں میں شمار کی جاتی ہے۔

عبداللہ قطب شاہ کے کوئی اولاد نرینہ نہ تھی اس لیے اس کی وفات کے بعد اس کا داماد ابوالحسن تانا شاہ جو ایک دوسرے خاندان سے تعلق رکھتا تھا، تخت نشیں ہوا۔ تانا شاہ کے ایامِ حکمرانی میں اگرچہ مغل فوجوں کی بڑھتی ہوئی طاقت اور فاتحانہ عزائم کے باعث عام طور پر بے چینی اور بے اطمینانی کا دور دورہ رہا، پھر بھی شاعری اور فنونِ لطیفہ سے اس کے تعلق خاطر کی بنا پر تخلیقِ ادب کی رفتار متاثر نہ ہوئی۔ سلطان کے کلام کا کوئی مجموعہ تو محفوظ نہیں لیکن مختلف تذکروں میں اس کے جو اشعار منقول ہیں وہ اس کی خوش گوئی اور قادر الکلامی کا پتا دیتے ہیں۔ طبعی جو گذشتہ دور میں "بہرام و گل اندام"

لکھ کر نام پیدا کر چکا تھا، اس عہد کا سب سے ممتاز سخنور ہے۔ وہ تاناشاہ کے مرشد شاہ [illegible] مرید تھا۔ تاناشاہ کی تخت نشینی کے بعد طبعی نے اس کی شان میں کچھ تازہ اشعار کہہ کر اس مثنوی میں شامل کیے۔ تاناشاہ کے مقربین میں ایک اور قابل ذکر شاعر غلام علی تھا۔ اس نے ۱۰۹۱ھ/۱۶۸۰ء میں ملک محمد جائسی کی "پدماوت" کا اردو نظم میں ترجمہ کیا ہے۔ اس ترجمے کی خوبی یہ ہے کہ اس میں ایک طبع زاد تصنیف کی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ قائم چاندپوری جنھوں نے اپنے تذکرے میں دکنی شاعروں کے تعارف کا خاص اہتمام کیا ہے، مرزا ابوالقاسم، سید شجاع الدین نوری اور شاہ قلی خاں شاہی کو بھی تاناشاہ کے مخصوص درباریوں کی حیثیت سے یاد کرتے ہیں[۱]۔ نوری کا کلام بہت کم دستیاب ہوا ہے لیکن مرزا اور شاہی کے متعدد مرثیے محفوظ ہیں۔ شاہی کے بارے میں قائم نے لکھا ہے کہ "سابق بریں پنجاہ سال ابیاتِ مرثیہ اش در بلاد ہندوستان دست بدست گردیدہ اند"[۲]۔ دربار کے ان معزز شعرا کے ساتھ ہی انھوں نے افضل الدین خاں فضلی، محمد غوث غوثی، پیرزادہ روحی اور محمد عبدالقادر کا بھی ذکر کیا ہے جو غالباً اسی دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ "مخزن نکات" میں ان شاعروں کا تذکرہ اس بات کی علامت ہے کہ ان کی شہرت نصرتی، غواصی اور ابن نشاطی کا شہرہ عام ہونے سے بہت پہلے شمالی ہند تک پہنچ چکی تھی۔

ڈاکٹر محی الدین قادری زور کے مطابق تاناشاہ کے عہد کی آخری بڑی تصنیف فائز کی مثنوی "رضوان شاہ و روح افزا" ہے[۳]۔ یہ مثنوی ۱۰۹۴ھ/۱۶۸۲ء میں لکھی گئی ہے۔ اس کی تصنیف کے پانچ سال بعد ایک طویل معرکہ آرائی کے نتیجے میں ذی قعدہ ۱۰۹۹ھ ستمبر ۱۶۸۷ء میں عالمگیر کی فوجیں فتح گول کنڈہ کی مہم میں کامیاب ہوگئیں[۴] اور عادل شاہیوں

---

[۱] مخزنِ نکات ص ۴ و ۶

[۲] مخزن نکات ص ۶

[۳] علی گڑھ تاریخ ادب اردو جلد اوّل ص ۴۰۵

[۴] اردوے قدیم ص ۹۳ و اردو کی ادبی تاریخ ص ۱۱۴

کی طرح قطب شاہی سلاطین کی سطوت و حشمت کا چراغ بھی ہمیشہ کے لیے گل ہو گیا۔ دکن کے اس آخری اور پُر آشوب دَور سے تعلق رکھنے والے جن شاعروں کے متعلق ابھی تحقیقات مکمل نہیں ہوئی ہیں یا جن کے بارے میں محققین کے درمیان اختلاف رائے پایا جاتا ہے، ان میں مشہور مثنوی نگار مقیمی کا نام سب سے نمایاں ہے۔ اس نے ۱۰۹۸ھ/۱۶۸۷ء "چندر بدن و مہیار" کا قصہ نظم کیا ہے۔

گیارھویں صدی ہجری کے ختم ہوتے ہوتے اگرچہ بیجاپور اور گول کنڈہ کے علاقے اپنی آزادی اور انفرادیت کھو چکے تھے لیکن ان سلطنتوں کے زیر سایہ تحصیل کمال اور تخلیق فن کی منزلیں سر کرنے والے فن کاروں کا تابناک سلسلہ دراصل بحری اور ولی پر ختم ہوا، جو زوالِ دکن کے بعد عرصہ دراز تک زندہ رہے۔ قاضی محمود بحری ضلع گلبرگہ کے ایک صاحبِ طریقت بزرگ تھے۔ بیجاپور کا آخری فرماں روا سکندر عادل شاہ ان سے خاص عقیدت رکھتا تھا۔ اس کی حکومت کے آخری ایام میں وہ کچھ دن تک بیجاپور میں مقیم رہے۔ وہاں سے حیدر آباد چلے گئے۔ سقوطِ حیدر آباد کے بعد انھوں نے اپنے وطن ضلع گلبرگہ کے قصبہ گوگی میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ وہیں ۱۱۳۰ھ/ ۱۷۱۸ء میں ان کا انتقال ہوا[1]۔ بحری کا بیشتر فارسی و اردو کلام جو تقریباً پچاس ہزار اشعار پر مشتمل تھا، ایک سفر کے دوران رہزنوں کی دستِ برد کے نتیجے میں تلف ہو گیا۔ پھر بھی ایک کلیات اور دو مثنویاں "من لگن" اور "بھنگ نامہ" ان سے یادگار ہیں۔ "من لگن" ۱۱۱۲ھ/ ۱۷۰۰ء کی تصنیف ہے۔ یہ مثنوی ان کی تصانیف میں خاص اہمیت رکھتی ہے۔ کلیات میں جو غزلیں شامل ہیں ان سے بھی فنی پختگی کا اظہار ہوتا ہے۔ مرثیوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں اس صنف میں بھی کمال حاصل تھا۔

ولی کا کلام دکنی شاعری کا نقطۂ عروج ہے۔ وہ اپنے دور کا ایک پیغمبر سخن تھا جس کے تخیل کی معجز نمائی اردو شاعری کو معراج کمال تک لے گئی۔ اس کے وطن کے

---

[1] علی گڑھ تاریخ ادب اردو جلد اوّل ص ۳۰۹

بارے میں محققین کے درمیان اختلاف رائے پایا جاتا ہے لیکن سرزمین دکن سے اس کے تعلق میں کوئی شبہ نہیں۔ احمد آباد (گجرات) کو اس کا وطن قرار دینے والے بھی یہ بات بہرحال مانتے ہیں کہ اس کی شاعری کا ارتقا بیجاپور اور اورنگ آباد میں ہوا اور اس نے بیجاپوری اور قطب شاہی شعرا کے اثرات بھی قبول کیے[1]۔

ولی نے ۱۱۱۹ھ/۱۷۰۷ء میں وفات پائی[2]۔ دکن اس وقت تک پوری طرح مغلوں کے زیرِ اقتدار آچکا تھا اور سیاسی و معاشی نظام کی وحدت نے شمال و جنوب کے درمیان تہذیبی لین دین اور ثقافتی ربط و ضبط کے راستے کافی حد تک ہموار کر دیے تھے۔ قائم چاند پوری کا بیان ہے کہ "ولی عالمگیر کے چوالیسویں سالِ جلوس یعنی ۱۱۱۲ھ/۱۷۰۰ء میں سید ابوالمعالی کے ساتھ دہلی آئے۔ یہاں انھوں نے شیخ سعداللہ گلشن سے شرفِ نیاز حاصل کیا جنھوں نے ان کو ریختہ میں فکرِ شعر کی ترغیب دلائی اور ایک مطلع بھی نظم کر کے دیا جس کی برکت سے ان کے کلام کو حسنِ قبول حاصل ہوا[3]۔" میر صاحب نے اس واقعے کو اس طرح بیان کیا ہے کہ گلشن نے ولی کا کلام سن کر انھیں یہ رائے دی کہ "ایں ہمہ مضامینِ فارسی کہ بیکار افتادہ اند، در ریختہ خود بکار ببر از تو کہ محاسبہ خواہد گرفت[4]۔" روایت کے اس جزوی اختلاف سے قطعِ نظر دہلی میں ولی کا ورود اردو شاعری کے لیے فالِ نیک ثابت ہوا۔ ایک طرف تو خود انھوں نے اپنے کلام کو دہلی کے روزمرہ کے معیار پر لانے کی کوشش کی اور دوسری طرف اردو میں ان کی کامیاب طبع آزمائی سے ان لوگوں کو حوصلہ ملا جو فارسی کی سرولاش کو زیادہ عرصے تک اپنے سینے سے لگائے رکھنے کے لیے تیار نہ تھے اور

---

[1] علی گڑھ تاریخ ادب اردو جلد اول (مقالہ ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی) ص ۴۳۲

[2] تاریخ وفات "بادِ پناہِ ولی، ساقیِ کوثر علی" کے اعداد (۱۱۱۸) میں ایک کے اضافے سے نکلتی ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے "تاریخ ادب اردو" (جلد اوّل) میں اس روایت سے اختلاف کیا ہے لیکن ہمارے نزدیک ان کے دلائل بہت کمزور ہیں

[3] مخزن نکات ص ۱۰

[4] نکات الشعرا طبع ثانی ص ۸۹

اپنی بات اپنی زبان میں دوسروں تک پہنچانے کے امکانات کا جائزہ لے رہے تھے۔ کچھ زمانے کے بعد محمد شاہ کے دوسرے سال جلوس (۳۳-۱۱۳۲ھ/۲۱-۱۷۲۰ء) میں ولی کا دیوان دہلی آیا[۱]۔ اور شاہ حاتم کے بیان کے مطابق آتے آتے اس کے اشعار ہر خورد و بزرگ کی زبان پر جاری ہو گئے[۲]۔ ولی کے کلام کی اس مقبولیت نے شمالی ہند میں اردو شاعری کے ارتقا کی رفتار پر بڑے خوش آیند اثرات مرتب کیے۔ فارسی کا اعتبار اٹھنا شروع ہوا اور اردو ایک طاقتور حریف کی حیثیت سے اس کے مقابل آ کھڑی ہوئی۔ حال کے آئینے میں مستقبل کو بے نقاب دیکھ لینے والوں کے لیے افق پر آفتاب تازہ کی اس نمود کے بعد ایک بجھتے ہوئے چراغ کی پرستش ممکن نہ رہی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ محمد شاکر ناجی، شیخ شرف الدین مضمون، مصطفیٰ خاں یک رنگ، شاہ مبارک آبرو، مرزا مظہر جان جاناں، شاہ حاتم، صدر الدین فائز اور دوسرے کئی شعرا جن میں سے بعض لوگ یقینی طور پر اس سے پہلے ہی فکرِ شعر کی اس نئی جولان گاہ میں قدم رکھ چکے تھے، قدر شناس نگاہوں کا مرکز قرار پائے۔ فارسی کی جگہ اردو کو مسندِ اقتدار تک لے آنے کا یہ رجحان جس تیزی کے ساتھ عوام و خواص میں مقبول ہوا تاریخ ادب میں اس کی مثالیں کم ملتی ہیں[۳]۔ پرفیسر عبدالقادر سروری کے بقول دارالسلطنت میں پچھلے چار سو برس میں فارسی نے جس شعری ذوق کو ابھارا تھا اور اس کی تربیت کی تھی، وہ سب اردو شاعری کے اُٹھان کے کام آگیا[۴]۔ ادبی و لسانی اقتدار کی اس تبدیلی کی بدولت دہلی کو جس کی خاک سے ولی کی آمد سے قبل کوئی وجہی، کوئی نصرتی یا کوئی غواصی پیدا نہ ہوا تھا، جلد ہی اردو شاعری کے مرکز کی حیثیت حاصل ہو گئی۔

شمالی ہند میں اردو شاعری کی بنیادیں مستحکم ہونے کے ساتھ دکن کی مرکزیت کا

---

[۱] و [۲] تذکرہ ہندی ص ۸۰

[۳] محمد شاکر ناجی ایک غزل کے مقطعے میں اس صورت حال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

بلندی سن کے ناجی ریختہ کی ہوا ہے پست شہرہ فارسی کا

[۴] اردو کی ادبی تاریخ ص ۱۲۹

زوال شروع ہوگیا۔ یہاں تک کہ ولی کے بعد اس علاقے سے سراج اورنگ آبادی (۱۱۲۸ھ/ ۱۷۱۶ء ــ ۱۱۷۷ھ/۱۷۶۴ء) کے علاوہ کوئی ایسا شاعر پیدا نہ ہوا جسے اپنے اسلاف کا صحیح جانشیں کہا جا سکے۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ ولی نے غزل کی صنف کو اپنی تمام تر توجہات کا مرکز بنا کر جس صاحب نظری اور دیدہ وری کا ثبوت دیا تھا، اس کا اندازہ دکن والوں کی بہ نسبت شمالی ہند کے لوگوں نے زیادہ بہتر طور پر کیا۔ شمال کی اردو شاعری کی تاریخ در اصل غزل کے ارتقا کی تاریخ ہے اور تذکرہ نگاری کے فن نے جو ہمارا اصل موضوعِ بحث ہے، تاریخ کے اسی وسیع سلسلے کی ایک کڑی کی حیثیت سے ترقی کی ہے۔

شمالی ہند کے قدیم اردو شاعروں میں استادانہ اہمیت کے لحاظ سے خان آرزو اور مرزا مظہر جان جاناں دوسرے تمام شعرا پر فوقیت رکھتے ہیں۔ آرزو اور مظہر دونوں ہی بنیادی طور پر فارسی کے شاعر تھے ان کا اردو کلام بھی زیادہ مقدار میں دستیاب نہیں ہوتا۔ اس کے باوجود ریختہ گوئی کے میلان کو عام کرنے، لسانی خود مختاری کی تحریک کو مقبول و کامیاب بنانے اور اُبھرتے ہوئے اردو شاعروں کی تربیت و حوصلہ افزائی میں ان اساتذہ کا جو حصہ رہا ہے وہ ان کی عظمت کے اعتراف کے لیے کافی ہے۔ اس دور کے اکثر بڑے بڑے شاعر یا تو براہِ راست انھی دونوں اساتذہ کے شاگرد ہیں یا پھر انھوں نے بالواسطہ ان کی تربیت کے اثرات قبول کیے ہیں۔ جہاں تک خان آرزو کا تعلق ہے، ڈاکٹر محمد حسن کے بقول "ان کی حیثیت اس دور میں گویا ہندوستانیوں کی خوش مذاقی اور ادبی استعداد کے نمایندے کی ہوگئی تھی ..... ان کے سایۂ عاطفت میں اردو زبان کے جتنے مشاہیر ملتے ہیں، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں اس بات کا احساس تھا کہ کسی غیر ملکی زبان میں صاحبِ طرز ہونا اور اس کی ادبیات میں ممتاز مقام پانے سے کہیں بہتر ہوگا کہ اپنی زبان میں دوسری اعلیٰ زبانوں کی سی شیرینی، لطافت اور حسن پیدا کیا جائے ..... (چنانچہ) ..... ان کی تربیت ریختہ گوئی کی طرف میلان پیدا کرنے میں خاص طور پر معاون ہوئی"[1] آرزو کا اردو کلام تقریباً

---

[1] دہلی میں اردو شاعری کا تہذیبی و فکری پس منظر ص ۲۵۰ و ۲۵۱

نایاب ہے۔ صرف تذکروں میں چند متفرق اشعار مل جاتے ہیں۔ اس کمی کی وجہ ان کی کم گوئی معلوم ہوتی ہے جس کی جانب تقریباً سبھی تذکرہ نگاروں نے اشارہ کیا ہے۔

مرزا مظہر کا کلام کیفیت اور کمیت دونوں کے لحاظ سے خان آرزو کے کلام پر فائق ہے۔ انھوں نے اردو میں غالباً باقاعدہ دیوان بھی مرتب کیا تھا[1] لیکن ابھی تک اس کے کسی مکمل نسخے کا سراغ نہیں ملا ہے۔ تاریخی نقطہ نظر سے مرزا صاحب کے کلام کی اہمیت یہ ہے کہ اسے فارسی شاعری کے معیار، طرزِ فکر اور میلانات کے کامیاب اتباع کے ایک مثالی نمونے کے طور پر کار آزمودہ اور جواں سال فن کاروں کی اس ملی جلی نسل کے سامنے پیش کیا گیا تھا جس کی کوششوں سے شمالی ہند میں اردو شاعری کے اس ابتدائی دور میں اس کی ترقی کے امکانات وابستہ تھے اور جو بڑی تیزی سے ایہام گوئی کے دھارے میں بہی جا رہی تھی۔ مظہر کے اس اجتہاد سے فن کاروں، بالخصوص نوجوان شاعروں کی ایک پوری نسل متاثر ہوئی۔ الفاظ کے اُلٹ پھیر اور صنعتوں کی طلسم بندی میں اُلجھے رہنے کے بجائے خیالات کی ندرت وجدت، اسلوب کی لطافت و تازگی اور زبان کی سادگی وصفائی کی اہمیت محسوس کی گئی اور بحیثیت مجموعی ان تمام روایات کو جو نیم اسلامی و نیم عجمی تہذیب اور ہندوستانی تمدن کے اختلاط وارتباط سے معرضِ وجود میں آئی تھیں، اردو زبان اور اس کی شاعری کے دامن میں سمو دیا گیا۔ زبان وادب کی یہی تہذیب اردو کو مرزا مظہر کی سب سے بڑی دین ہے۔

خان آرزو اور مرزا مظہر کی رہنمائی میں کامیابی کی منزلیں طے کرنے والی اس ادبی و لسانی تحریک کے ابتدائی دور میں جن شعرا نے زیادہ جوش وخروش کے ساتھ وقت کے بدلتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ دیا اور حالات کی نبض پہچانی، ان میں شاہ مبارک آبرو، شرف الدین مضمون، مصطفیٰ خاں یک رنگ، محمد شاکر ناجی، صدرالدین فائز اور شاہ حاتم کی خدمات خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ آبرو (متوفی ۱۱۴۶ھ/۱۷۳۳ء) گوالیار کے رہنے والے تھے لیکن ابتدائے جوانی ہی سے انھوں نے دہلی میں سکونت اختیار کر لی

---

[1] تذکرہ ہندی ص ۲۰۲

تھی[1]۔ وہ عمر میں آرزو سے بڑے تھے لیکن جب دہلی میں اردو شاعری کی تحریک شروع ہوئی اور وہ بھی اس کی جانب متوجہ ہوئے تو سن و سال کے تفاوت کا خیال کیے بغیر انھوں نے اپنا کلام خان آرزو کے سامنے اصلاح کے لیے پیش کیا۔ ایہام گو شعرا میں ان کا نام سرِفہرست ہے۔ اب تک ان کے دیوان کے چھ قلمی نسخے دستیاب ہو چکے ہیں جن میں قدیم ترین نسخہ (مخزونہ کتب خانہ انجمن ترقی اردو، کراچی پاکستان) بست و نہم صفر ۱۱۴۴ھ/۲۲ اگست ۱۷۳۱ء کا مکتوبہ ہے۔ دریافت شدہ نسخوں میں سے نسخۂ پٹیالہ ڈاکٹر محمد حسن ۱۹۶۴ء میں ادارۂ تصنیف علی گڑھ کی طرف سے شائع کر چکے ہیں۔ اس نسخے کا تازہ ترین ایڈیشن ۱۹۹۰ء میں ترقی اردو بیورو نئی دہلی نے شائع کیا ہے۔

میاں شرف الدین مضمون کو قصبہ جاجو (مضافات آگرہ) سے وطنی نسبت تھی لیکن آغازِ جوانی ہی میں دہلی چلے آئے تھے۔ وہیں ۱۱۴۷ھ/۳۵-۱۷۳۴ء میں وفات پائی۔ میر اور میر حسن نے انھیں خان آرزو کے تلامذہ میں شمار کیا ہے[2]۔ لیکن گردیزی آرزو اور مظہر دونوں سے استفادے کا ذکر کرتے ہیں[3]۔ میر کے بیان کے مطابق ان کا اردو دیوان تقریباً دو سو اشعار پر مشتمل تھا[4]۔ میر صاحب کے اس اعتراف کے علاوہ کہ مضمون اگرچہ کم گو تھے لیکن بڑے خوش فکر شاعر تھے، ان کی عظمت سودا کے اس شعر سے بھی ظاہر ہے جو انھوں نے ان کی وفات کے حادثے سے متاثر ہو کر کہا تھا

بنائیں اُٹھ گئیں یار و غزل کے خوب کہنے کی
گیا مضمون دنیا سے رہا سودا سو مستانہ

مصطفیٰ خاں یک رنگ بھی شاہ آبرو کے معاصر اور خان آرزو کے شاگرد تھے۔ صحفی نے ایک قول کے مطابق آبرو سے مشورۂ سخن کا ذکر بھی کیا ہے لیکن ان کی ذاتی رائے اس

---

[1] نکات الشعرا طبع ثانی ص ۹

[2] نکات الشعرا طبع ثانی ص ۱۵ و تذکرۂ شعرائے اردو طبع ثانی ص ۱۲۶

[3] تذکرہ ریختہ گویاں ص ۷ و ۱۳۵

[4] نکات الشعرا طبع ثانی ص ۱۵

سے مختلف ہے۔ ان کے بقول "از فحوائے کلامش می تراود کہ شاگردِ مرزا مظہر خواہد بود"[1] قائم، یک رنگ کے اردو دیوان کی ترتیب اور اس کے براہِ راست مطالعے کا حوالہ دیتے ہوئے ان کے اشعار کی تعداد پانچ سو کے قریب بتاتے ہیں[2]۔

محمد شاکر ناجی کو بھی تذکرہ نگاروں نے آبرو کے معاصرین ہی میں شمار کیا ہے۔ میر صاحب نے لکھا ہے کہ ان کی طبیعت کا میلان زیادہ تر ظریفانہ شاعری کی طرف تھا[3]۔ تاہم ایہام گوئی کی بندشوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان کے یہاں اچھے اشعار کی بھی کمی نہیں مصحفی ۱۲۰۱ھ/۸۷-۱۷۸۶ء اور ۱۲۰۹ھ/۹۵-۱۷۹۴ء کے درمیان لکھتے ہیں کہ "دیوان او ہنوز در دہلی بر صفحہ روزگار یادگار است"[4]۔ مرزا کاظم مبتلا لکھنوی نے ان کے اشعار کی تعداد ڈیڑھ ہزار کے قریب بتائی ہے[5]۔ ڈاکٹر فضل الحق استاد شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی کے شائع کردہ "دیوانِ شاکر ناجی" مطبوعہ ۱۹۶۸ء سے اس کی تائید ہوتی ہے[6]۔ ناجی کا ایک مخمس بھی کافی مشہور ہے جس میں انھوں نے نادر شاہ کے حملے (۱۱۵۱ھ/۱۷۳۹ء) کے وقت دہلی کے شاہی دربار اور لشکر کا حالِ زار نظم کیا ہے۔ یہ مخمس دیوانِ مطبوعہ میں شامل نہیں۔

فائز دہلوی (متوفی ۱۱۵۱ھ/۱۷۳۸ء) نام و نمود سے بیزاری یا شعر و سخن کی عام محفلوں سے اجتناب کے باعث اپنے زمانے میں شہرت و مقبولیت حاصل نہ کر سکے۔ ان کا نام اور کلام ان کے دیوان کی اشاعت کے بعد روشنی میں آیا ہے۔ اس دیوان میں ولی دکنی کی زمینوں میں متعدد غزلیں ملتی ہیں جن سے دہلی میں اردو کے اس عظیم اور عہد ساز شاعر کی مقبولیت اور اس کے اثرات کا پتا چلتا ہے۔ مرتبِ دیوان پروفیسر

---

[1] تذکرہ ہندی ص ۲۷۸ — [2] مخزنِ نکات ص ۱۷

[3] نکات الشعرا ص ۲۳ — [4] تذکرہ ہندی ص ۳۵۸

[5] گلشنِ سخن مرتبہ پروفیسر مسعود حسن رضوی ص ۲۲۲

[6] دیوانِ ناجی کا ایک اور ایڈیشن ۱۹۸۹ء میں انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی نے شائع کیا ہے۔ یہ افتخار بیگم صدیقی صاحبہ کا مرتبہ ہے۔

مسعود حسن رضوی کا خیال ہے کہ فائز شمالی ہند کے پہلے صاحبِ دیوان شاعر ہیں جنھوں نے ولی کے دیوان کی آمد سے قبل ۱۱۲۷ھ/۱۷۱۵ء میں اپنا کلام مدون کر لیا تھا۔[1] لیکن قاضی عبدالودود اس رائے سے متفق نہیں۔ ان کے خیال میں اردو کلام ۱۱۴۲ھ/۳۰-۱۷۲۹ء میں کلیات پر نظرِ ثانی کے وقت شامل کیا گیا ہے۔[2] حقیقتِ حال کچھ بھی ہو، فائز کے کلام کی تاریخی اہمیت مسلم ہے۔ وہ ان گنے چنے شعرا میں شامل ہیں جنھوں نے اپنی کوششوں سے شمالی ہند کی اردو شاعری کو اس کے ارتقا کے ابتدائی مراحل ہی میں اربابِ نظر کے لیے درخورِ اعتنا بنا دیا تھا۔

شاہ حاتم ۱۱۱۱ھ/۱۷۰۰، ۱۶۹۹ء میں پیدا ہوئے اور ۱۱۹۷ھ/۱۷۸۳ء تک زندہ رہے۔[3] عمر کے اس طویل دور میں انھوں نے ایہام گوئی کی تحریک کی قیادت بھی کی اور مرزا مظہر کی اصلاحی کوششوں کے اثرات بھی قبول کیے۔ ۱۱۴۳ھ/۱۷۳۰ء کے قریب انھوں نے اپنا پہلا اردو دیوان مرتب کیا۔ اس کے بعد عزیز الدین عالمگیر ثانی کے پہلے سالِ جلوس (۱۱۶۸ھ/۱۷۵۵ء) میں جب کہ انھیں ایہام گوئی کی روش اور فارسی کے حروفِ جار (در، بر اور از وغیرہ) اور دوسرے افعال و الفاظ سے کنارہ کش ہوئے تقریباً بارہ برس گزر چکے تھے، "دیوان زادہ" کے نام سے ایک اور مجموعہ ترتیب دیا۔ اس مجموعے میں انھوں نے اپنے پرانے کلام سے وہ اشعار انتخاب کر کے شامل کیے جن پر رنگِ قدیم کے اثرات غالب نہ تھے یا جن میں پچھلے دس بارہ سال کے دوران شعوری طور پر نئے اندازِ سخن کی تقلید کی گئی تھی۔ ایہام گوئی کے خلاف ردِ عمل اور زبان کی اصلاح کا یہ رجحان جس نے انھیں اردو زبان اور شاعری کے محسنوں میں شامل کر دیا ہے، ان کے لیے بقائے نام کی سب سے بڑی ضمانت ہے۔ غزلوں کے علاوہ حاتم نے کچھ قصیدے اور رباعیاں بھی کہی ہیں۔

---

[1] فائز دہلوی اور دیوان فائز ص ۷۷ و ۷۸

[2] عیارستان ص ۵ و ۶

[3] عقدِ ثریا ص ۳۳ و ۳۴

آبرو، مضمون، یک رنگ اور ان کے ہم نواؤں کی فکری کاوشوں سے مالا مال ہو کر بارھویں صدی ہجری کے وسط میں اردو شاعری کی روایت حاتم اور مرزا مظہر کے جن جواں سال اور جواں فکر معاصرین تک پہنچی ان میں مرزا رفیع سوداؔ (متوفی ۱۱۹۵ھ/۱۷۸۱ء) خواجہ میر دردؔ (متوفی ۱۱۹۹ھ/۱۷۸۴ء) میر تقی میرؔ (متوفی ۱۲۲۵ھ/۱۸۱۰ء) اور میر سوزؔ (متوفی ۱۲۱۳ھ/۹۹-۱۷۹۸ء) سرِ فہرست ہیں۔ سوداؔ کو شاہ حاتم نے "دیوان زادہ" میں اپنے شاگردوں کے زمرے میں شمار کیا ہے وہ اپنی اس خوش قسمتی پر نازاں بھی تھے کہ انھیں ایسا استاد زمانہ شاگرد ملا۔[1] لیکن خیراتی لال بےؔ جگر نے "نشترِ عشق" مولفہ حسین قلی خاں عاشقیؔ عظیم آبادی کے حوالے سے یہ روایت نقل کی ہے کہ سوداؔ خان آرزو کے مشورے سے جو ابتدا میں ان کے فارسی کلام پر اصلاح دیتے تھے، ریختہ گوئی کی طرف مائل ہوئے۔[2] قاسم نے بھی انھیں آرزو کے خرمنِ فیض کا خوشہ چیں قرار دیا ہے۔[3] بہر صورت سوداؔ کی کوششوں سے اردو شاعری کو فکر و فن کی جو دولت ملی وہ اپنی انفرادیت، تنوع اور ہمہ گیری کے لحاظ سے اردو کا بیش قیمت سرمایہ ہے۔ انھوں نے غزل، قصیدہ، مثنوی، مرثیہ، رباعی غرض کہ ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے اور ہر میدان میں اپنی قادر الکلامی اور ندرتِ فکر کا بھرپور ثبوت دیا ہے۔ بالخصوص قصیدہ نگاری اور ہجو گوئی میں انھوں نے جس کمالِ فن کا مظاہرہ کیا ہے، وہ اپنی مثال آپ ہے لیکن نواب مصطفیٰ خاں شیفتہؔ کے بقول ان کی غزلیں بھی کسی طرح قصائد سے کم پایہ نہیں۔[4] میرؔ نے تمام اصنافِ سخن میں ان کے کمال کا اعتراف کرتے ہوئے بجا طور پر لکھا ہے کہ "سرآمدِ شعرائے ہندی اوست ..... و .... ملک الشعرائی ریختہ اورا شاید۔"[5]

---

[1] مجموعہ نغز جلد اوّل ص ۱۸۰

[2] تذکرۂ بےؔ جگر مخطوطہ انڈیا آفس لائبریری لندن ورق ۵۴

[3] مجموعہ نغز جلد اوّل ص ۲۴

[4] گلستانِ بے خار طبع اوّل ص ۱۳۳

[5] نکات الشعرا طبع ثانی ص ۳۱

دردؔ نے اگرچہ بہت مختصر مجموعۂ کلام یادگار چھوڑا ہے لیکن میر حسنؔ کے بقول ان کا کلام حافظؔ کے کلام کی طرح سراپا انتخاب ہے[1] اردو شاعری کو مقبول عام بنانے میں ان کی غزلوں کی سادگی، سوز و گداز اور کیف و مستی کا بڑا حصہ ہے۔ اردو شاعری سے ان کا شغف اس اعتبار سے بھی سود مند ثابت ہوا کہ وہ ایک ایسے گھرانے سے تعلق رکھتے تھے جو عرصے سے رشد و ہدایت اور دینی و دنیوی علوم کا مرکز تھا۔ ان جیسے ثقہ اور صاحبِ طریقت بزرگ کو ریختہ گوئی کی جانب ملتفت پاکر ان لوگوں کے لیے اعتراض کا کوئی موقع نہ رہا جو اردو میں طبع آزمائی کو علمی مرتبے اور وقار کے منافی سمجھتے تھے۔

میرؔ ان خوش نصیب شاعروں میں سے ہیں جنھیں اپنے زمانے میں بھی غیر معمولی شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی اور آج بھی اس وصف میں غالبؔ اور اقبالؔ کے علاوہ کوئی ان کا ہم سر نہیں۔ ان کی یہ مقبولیت ان کی طبیعت اور غزل کے مزاج کی ہم آہنگی کا نتیجہ ہے۔ ان کی طبیعت کے سوز و گداز اور الفاظ کے تخلیقی استعمال کی بے پناہ صلاحیت نے اردو غزل کو اور اردو غزل نے ان کی شخصیت کو حیاتِ دوام عطا کر دی ہے۔ ان کی مثنویاں بھی سوداؔ کی مثنویوں سے بلند پایہ ہیں لیکن قصیدے کے میدان میں سوداؔ کو ان پر فوقیت حاصل ہے انھوں نے تقریباً نوّے سال کی عمر پاکر ۱۲۲۵ھ/۱۸۱۰ء میں انتقال کیا۔ اس اعتبار سے وہ اردو کے ان معدودے چند شاعروں میں سے ایک ہیں جنھوں نے ایک نسل کے جلائے ہوئے چراغوں کی روشنی میں اپنی منزل کا سراغ پایا، دوسری نسل کے درمیان ایک استادِ فن کی حیثیت حاصل کی اور تیسری نسل کی رہنمائی کے فرائض انجام دیے۔

میر سوزؔ کا پایہ ادبی حیثیت سے سوداؔ، دردؔ اور میرؔ سے کم تر ہے لیکن اپنے مخصوص "طرزِ ادائیہ" کی بدولت جو انھیں کا ایجاد تھا، وہ اس زمانے میں کافی مقبول ہوئے اور انھوں نے اپنے ہم عصر شعرا کو بھی کسی حد تک متاثر کیا۔ اس لیے اردو کے صاحبِ طرز

---

[1] تذکرہ شعرائے اردو طبع ثانی ص ۶۶

شعرا اور عہد ساز شخصیتوں کی فہرست میں ان کا بھی ایک اہم مقام ہے۔ اس دور کے دوسرے خوش فکر اور خوش سلیقہ شعرا میں اشرف علی خاں فغاںؔ، عبدالحئی تاباںؔ، انعام اللہ خاں یقینؔ، میر محمد باقر حزیںؔ، محمد فقیہ دردمندؔ، احسن الدین خاں بیانؔ، میر محمد حسن کلیمؔ، میر ضیاؔ، شاہ محمدی بیدارؔ اور قائمؔ چاندپوری کے نام آتے ہیں۔ فغاںؔ ۱۱۴۱ھ/ ۱۷۲۸ء کے قریب پیدا ہوئے۔ انھوں نے شاعری کی ابتدائی منزلیں دہلی میں طے کیں اور اپنی طباعی کی بدولت جلد ہی ہم عصر شعرا میں ایک نمایاں مقام حاصل کر لیا۔ احمد شاہ درّانی کے حملوں میں دہلی کی تباہی کے بعد سے ۱۱۸۶ھ/ ۱۷۷۲ء (سالِ وفات) تک انھوں نے اپنی زندگی کے بیش قیمت ایام مرشد آباد اور پٹنہ میں گذارے جہاں ان کے دم سے اُردو شاعری کا چراغ روشن ہوا۔ ان کے دیوان میں غزلوں کے علاوہ کچھ ہجویہ اور بیانیہ نظمیں بھی شامل ہیں۔ تاباںؔ حاتمؔ کے شاگرد تھے۔ انھوں نے ۱۱۶۱ھ/ ۱۷۴۸ء اور ۱۱۶۵ھ/ ۱۷۵۲ء کے درمیان عین عالمِ شباب میں وفات پائی۔ اپنی فکرِ سخن کے مختصر دور میں انھوں نے جس خوش اسلوبی کے ساتھ عروسِ غزل کے گیسو سنوارے، وہ اس سے ظاہر ہے کہ خود ان کے استاد شاہ حاتمؔ نے ان کی زمینوں میں غزلیں کہیں۔ بعض تذکرہ نگار راوی ہیں کہ ان کے مکان پر ہمیشہ شعرا کا مجمع رہا کرتا تھا۔[1]

یقینؔ، حزیںؔ، دردمندؔ اور بیانؔ مرزا مظہرؔ کے تلامذہ ہیں۔ تذکرہ نگاروں کا بیان ہے کہ مظہرؔ اپنے شاگردوں کی اصلاح و تربیت ہی کے لیے اردو میں فکرِ سخن کیا کرتے تھے۔[2] یقینؔ ۱۱۶۹ھ/ ۱۷۵۶ء میں تیس سال کی عمر میں اپنے باپ کے ہاتھوں قتل ہوئے۔ زندگی کی اس مختصر سی مدّت میں وہ اردو کلام کا اچھا خاصہ سرمایہ جمع کر چکے تھے۔ مصحفیؔ نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ "در دورۂ ایہام گویاں اول کسے کہ ریختہ را آشستہ و رفتہ گفتہ، ایں جواں بود۔ بعد ازاں تتبعش بدیگراں رسیدہ"۔[3] بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے

---

[1] تذکرہ شعرائے اردو طبع ثانی ص ۳۵

[2] مخزن نکات نسخہ لندن ذکر مظہرؔ و تذکرہ ہندی ص ۲۰۳

[3] تذکرہ ہندی ص ۱۷۵

کہ اس دور کے سخن شناسوں کے ایک خاص طبقے میں یقینؔ کو کافی مقبولیت حاصل تھی۔ حتیٰ کہ بعض لوگ انھیں سوداؔ سے بھی افضل و برتر خیال کرتے تھے[۱]۔ جب کہ بعض لوگ معاصرانہ رقابت کی بنا پر ان کی موزوں طبعی سے ہی یکسر منکر تھے۔ حزیںؔ، تذکرہ گردیزی کی تکمیل (۵/محرم ۱۱۶۶ھ/۱۳/نومبر ۱۷۵۲ء) سے قبل وفات پا چکے تھے[۲]۔ ان کا اصل وطن عظیم آباد تھا۔ لیکن ان کی شاعری دہلی کی ادبی فضا میں پروان چڑھی اور وہیں انھوں نے اردو کے دو دیوان بھی مرتب کیے۔ دوسرا دیوان جو نسبتاً مختصر تھا، دیوانِ یقینؔ کے جواب میں نظم کیا تھا[۳]۔ نادر شاہ کے حملے کے بعد سے انھوں نے اپنی زندگی کے بیشتر ایام مرشد آباد اور عظیم آباد میں گزارے[۴]۔ فغاںؔ کی طرح ان کا کارنامہ بھی یہی ہے کہ ان کی کوششیں ان دونوں مقامات پر اردو شاعری کی ترقی کے امکانات کو وسیع تر کرنے میں معاون ثابت ہوئیں۔

دردمندؔ کی ولادت اودگیر (علاقہ بیدر) میں ہوئی تھی۔ وہاں سے ۱۱۳۶ھ/۲۴-۱۷۲۳ء میں وہ اپنے والد کی معیت میں دہلی آئے[۵]۔ دہلی میں ۱۱۴۷ھ/۱۷۳۴ء میں یا اس سے کچھ قبل انھوں نے اپنی مشہور مثنوی "ساقی نامہ" نظم کی۔ اس کے بعد ۱۱۶۶ھ/۱۷۵۳ء کے قریب وہ مرشد آباد چلے گئے[۶]۔ جہاں ۱۱۷۶ھ/۶۳-۱۷۶۲ء میں ان کا انتقال ہو گیا[۷]۔ تذکروں میں ان کی غزلوں کے کچھ اشعار بھی ملتے ہیں لیکن ان کی شہرت کا اصل سبب ان کا "ساقی نامہ" ہے جس کے متعدد اشعار محمد شاہ کے عہد (۱۱۳۱ھ/۱۷۱۹ء تا ۱۱۶۱ھ/۱۷۴۸ء) میں اور اس کے بعد بھی عرصۂ دراز تک زبان زدِ خاص و عام رہے[۸]۔ یہ مثنوی قدرتِ کلام

---

۱ چمنستان شعرا ص ۱۶ و ۱۶۳

۲ تذکرہ ریختہ گویاں ص ۳۷

۳ و ۴ تذکرہ شورش۔ دو تذکرے جلد اوّل ص ۲۲۱، ۲۲۲

۵ و ۶ ماہنامہ نیا دور۔ لکھنؤ، شمارہ ماہ جولائی ۱۹۶۲ء ص ۲۲

۷ گلشنِ ہند طبع ثانی ص ۱۳۰

۸ گلشنِ سخن مطبوعہ ص ۱۳۰

اور نفاستِ زبان کا جو نمونہ پیش کرتی ہے اس کے پیشِ نظر ہم دردؔ مند کو اس دَور کے نمایندہ شاعروں کے زمرے سے خارج نہیں کر سکتے۔

خواجہ احسن الدین خاں بیانؔ کے بارے میں بعض لوگوں کا بیان ہے کہ وہ آگرے میں پیدا ہوئے[1] جب کہ بعض تذکرہ نگار دہلی کو ان کا مولد قرار دیتے ہیں[2]۔ لیکن یہ بات بہرحال مسلم ہے کہ ان کی شاعری کی نشو و نما دہلی میں ہوئی۔ دہلی کے ادبی حلقوں میں ان کا کلام نہایت مقبول تھا[3]۔ تمام ہم عصر ریختہ گو ان کی غزل سرائی کے معترف تھے[4] اور انھیں "مربوط گو" اور "صاحبِ زبان" شعرا میں شمار کرتے تھے[5]۔ عمر کا آخری حصہ انھوں نے حیدر آباد دکن میں بسر کیا۔ وہیں ۱۲۱۳ھ/۹۹-۱۷۹۸ء میں ان کی وفات ہوئی۔

محمد حسین کلیمؔ، خان آرزوؔ اور میر تقی میرؔ سے "قرابتِ قریبہ" رکھتے تھے[6]۔ میر حسنؔ نے انھیں "شاعرِ زبردست و مشاق قدیم" اور "فنِ شعر و شاعری" میں "استادِ سخن" کہا ہے[7]۔ قایمؔ کا بیان ہے کہ انھوں نے علمِ عروض و قوافی میں کئی رسالے تصنیف کیے تھے[8]۔ "نصوص الحکم" کے ترجمے اور "دہ مجلس ہندی" کے علاوہ "نثرِ ہندی" کی ایک نامعلوم الاسم کتاب بھی ان سے منسوب ہے۔

میر ضیاؔ دہلوی میرؔ کے شاگرد اور میر حسنؔ کے استاد تھے۔ میر صاحب کے علاوہ

---

[1] تذکرہ ریختہ گویاں ص ۲۷ و تذکرۂ شورشؔ، دو تذکرے جلد اوّل ص ۸۳ و گلشنِ سخن ص ۶۸

[2] تذکرہ شعرائے اردو طبع ثانی ص ۲۷

[3] دستور الفصاحت مرتبہ عرشی ص ۸۳

[4] دو تذکرے (تذکرہ عشقی) جلد اوّل ص ۸۴

[5] تذکرہ ہندی ص ۳۶

[6] تذکرہ شعرائے اردو طبع ثانی ص ۱۳۸

[7] تذکرہ شعرائے اردو طبع ثانی ص ۱۳۸

[8] مخزنِ نکات ص ۴۳

انھوں نے مدتوں مرزا سودا اور خواجہ میر درد کی صحبت اٹھائی تھی اور ان کی ہم مجلسی کے فیض سے فنِ شاعری میں کمال حاصل کیا تھا۔[1] سنگلاخ زمینوں میں طبع آزمائی میں انھیں خاص مہارت تھی۔ دہلی کی مسلسل تباہی و بربادی کے نتیجے میں انھوں نے جوان العمری ہی میں وہاں سے ترک وطن کر کے عظیم آباد میں سکونت اختیار کر لی تھی۔[2] عظیم آباد میں انھوں نے چالیس سال سے زیادہ مدت تک شعر و ادب کی خدمت کی[3] اور بہت سے شاعروں کو اپنی اصلاح و تربیت سے فیض پہنچایا۔[4]

شاہ محمدی بیدار (متوفی ۱۲۱۰ھ/۱۷۹۷ء) بڑے خوش فکر غزل گو ہیں۔ ان کا اصل وطن بدایوں تھا لیکن ان کی عمر کا بڑا حصہ دہلی میں اور آخری ایام آگرے میں بسر ہوئے۔ انھوں نے خواجہ میر درد سے استفادۂ سخن کیا تھا۔[5] اردو میں ایک مکمل دیوان ان سے یادگار ہے جس کے دو ایڈیشن جو دو مختلف قلمی نسخوں پر مبنی ہیں، علامہ محوی صدیقی لکھنوی اور جناب جلیل قدوائی کے مقدمات کے ساتھ شائع ہو چکے ہیں۔ محوی صاحب کا مرتبہ ایڈیشن مدراس یونیورسٹی کے سلسلۂ مطبوعات کے تحت شائع ہوا تھا۔ جلیل قدوائی صاحب کا مرتبہ نسخہ ہندوستانی اکیڈمی الٰہ آباد نے شائع کیا ہے۔ آگرے کے قیام کے زمانے میں بیدار کے گرد معتقدین اور تلامذہ کا ایک حلقہ قائم ہو گیا تھا۔ اس طرح ان کی ادبی و لسانی خدمات اور فیضانِ سخن کا دائرہ دہلی سے آگرے تک پھیلا ہوا ہے۔

قائم چاندپوری میر درد اور میرزا سودا کے شاگرد ہیں۔ وہ "بدوِ شعور" ہی سے دہلی میں مقیم اور توپ خانۂ شاہی سے متوسل تھے۔ اپنے اس دعوے کے عین مطابق کہ ؎

---

[1] تذکرہ عشقی۔ دو تذکرے جلد دوم ص ۴۱

[2] تذکرہ شورش۔ دو تذکرے جلد دوم ص ۴۰

[3] تذکرہ عشقی۔ دو تذکرے جلد دوم ص ۴۱

[4] تذکرہ شعرائے اردو طبع ثانی ص ۱۰۰

[5] مجموعۂ نغز جلد اوّل ص ۱۱۸

قائم میں غزل طور کیا ریختہ ورنہ　　اک بات لچر سی بزبانِ دکنی تھی

زبان کی شستگی اور صفائی میں ان کا بڑا حصّہ ہے۔ انھوں نے تقریباً تمام ہی اہم اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ لیکن کمالِ فن کے شاہکار دراصل ان کی غزلوں اور مثنویوں میں ملتے ہیں۔ ہجو یہ شاعری میں بھی سوداؔ کے بعد ان کا دوسرا درجہ ہے۔ احمد شاہ کی معزولی (۱۱۶۷ھ/۱۷۵۴ء) کے غالباً تین چار سال کے اندر قائم دہلی سے ترکِ سکونت کر کے چاند پور چلے گئے تھے۔ اس کے بعد وہ ٹانڈہ اور رام پور کے درباروں سے وابستہ رہے۔ ۱۲۰۸ھ/۹۴-۱۷۹۳ء میں رام پور میں ان کا انتقال ہوا۔

یہاں ہم نے شعرا کی جس نژادِ نو کا ذکر کیا ہے، وہ بنیادی طور پر محمد شاہ کے عہد سے تعلق رکھتی ہے۔ اس نسل کا دورِ شباب گویا اردو شاعری کا عہدِ شباب ہے۔ اردو ادب کی تاریخ میں اس دور کی مثال مجنوں گورکھپوری کے بقول انگریزی ادبیات میں دورِ ایلزبیتھ کی سی ہے، جو شعر و موسیقی کا دور تھا[1]۔ دہلی میں اس زمانے میں جتنے خوش گو اور باکمال شاعر یکجا ہو گئے تھے آئندہ کسی زمانے میں بیک وقت کسی ایک جگہ جمع نہ ہو سکے اور نہ کسی دور میں اردو زبان اور شاعری کو اس حیرت انگیز رفتار سے ارتقا کی منزلیں طے کرنے کے مواقع حاصل ہوئے۔ سوداؔ، دردؔ اور میرؔ جن میں سے ہر شخص بجائے خود ایک عہد کی حیثیت رکھتا ہے، اسی دور کی دین ہیں۔ ان کے علاوہ جتنے شعرا زیادہ سرگرم اور نمایاں نظر آتے ہیں، وہ بھی آئندہ ادوار کے اساتذہ سے کسی طرح کم پایہ نہیں۔ اس دور کے شعرا کی اہمیت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ آنے والے چند برسوں میں ان میں سے اکثر لوگ مغل سلطنت کے زوال و انحطاط اور بیرونی حملہ آوروں کی تاخت و تاراج کے نتیجے میں غریب الوطنی کو گلے لگانے اور نئی پناہ گاہیں تلاش کرنے پر مجبور ہوئے اور ان کی یہ مجبوری اردو کے نئے مراکز کے لیے سامانِ وجود بن گئی۔ چنانچہ فرخ آباد، ٹانڈہ (ضلع رام پور)، رام پور، اکبر آباد، فیض آباد، لکھنؤ، عظیم آباد

---

[1] نقوش و افکار ص ۱۹۶

اور مرشد آباد میں انھی لوگوں کے طفیل اہلِ نظر کی تازہ بستیاں آباد ہوئیں۔ مختصر یہ کہ اس دور کے شعرا کی پیہم جدوجہد اور روایت شکنی اور روایت سازی کے مسلسل عمل ہی کا نتیجہ تھا کہ محمد شاہ کے عہد کے ختم ہوتے ہوتے اردو دہلی کی ادبی فضا میں نہ صرف یہ کہ اجنبی نہیں رہی تھی بلکہ اس کی رونق اور زیب و زینت کا سامان بن چکی تھی۔ شعر و ادب کی محفلوں میں فارسی کے ساتھ اردو کے اشعار بھی اعتماد کے ساتھ پڑھے اور دل چسپی کے ساتھ سُنے جانے لگے تھے۔ "یارانِ ریختہ گو" نے "مراختہ" کے نام سے اپنی علٰحدہ مجلسیں بھی منعقد کرنا شروع کر دی تھیں۔ میر نے اپنے اور خواجہ میر درد کے علاوہ سجاد اکبر آبادی، جعفر علی خاں ذکی، میر علی نقی کافر اور حافظ حلیم کے یہاں مختلف اوقات میں اس قسم کی محفلوں کے انعقاد کا ذکر کیا ہے۔ قائم چاند پوری کے بعض بیانات بھی ان محفلوں میں شعرا اور عوام کی غیر معمولی دل چسپی اور پابندی کے ساتھ شرکت کا پتا دیتے ہیں۔ مشاعروں سے اس عام دل چسپی کے پہلو بہ پہلو کلام کی باقاعدہ ترتیب و تدوین اور بیاضوں کی صورت میں دوسرے شعرا کے منتخب اشعار یکجا کرنے کا شوق بھی عام ہو چلا تھا۔ ذوق و شوق کا یہی سلسلہ دراز تر ہو کر تذکرہ نویسی کا محرک بنا اور فارسی تذکروں کے نمونے پر شعرائے اردو کے حالات و اشعار بھی کتابی صورت میں مدوّن کیے جانے لگے۔

یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ اردو شاعری کی اس عام مقبولیت اور فروغ کے باوجود اس زمانے تک اربابِ علم کے ذہنوں سے فارسی کی عظمت و برتری کے نقوش پوری طرح محو نہیں ہوئے تھے بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ اردو کا دائرۂ اثر صرف روزمرہ گفتگو اور شاعری تک محدود تھا اور زندگی کے دوسرے تمام شعبے بدستور فارسی کے زیرِ اقتدار تھے۔ دفتری اور کاروباری امور میں پچھلی کئی صدیوں کی طرح وہ اب بھی اختیاراتِ کلّی کی حامل تھی۔ خطوط، دستاویزات، معاہدے، سرکاری احکام، شرعی فتوے اور عدالتی فیصلے سب فارسی ہی میں لکھے جاتے تھے۔ حتّٰی کہ وہ لوگ بھی جو اردو کی تحریک کے علم بردار اور نئی شعری روایت کے نقیب تھے، جب نثر میں کسی موضوع پر اظہارِ خیال کے لیے قلم اٹھاتے تو فارسی ہی کا سہارا لیتے تھے۔ گویا فارسی ابھی تک بزرگوں کی ایک

متبرک میراث، علمی استعداد کے ایک پیمانے، ثقاہت کی ایک علامت، تہذیب کی ایک یادگار اور شاہی سرپرستی کے ایک نشان کے طور پر زندہ تھی اور اردو اپنے اندر اتنی توانائی پیدا نہیں کر پائی تھی کہ ہر میدان میں اسے شکست دے کر اس پر اپنا تفوق قائم کر سکے۔ وہ ابھی صرف متوسط طبقے اور عوام الناس کے درمیان تہذیبی و ثقافتی روابط کا ایک ذریعہ تھی، عوام اور طبقۂ اعلیٰ کے نمائندے اس کے واسطے سے ایک رشتے میں منسلک نہیں ہو سکے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک ایک مختصر دیوان کے علاوہ فائز دہلوی اور خواجہ میر درد کی تمام تصانیف فارسی زبان میں ہیں۔ میر نے اپنی خود نوشت "ذکرِ میر" فارسی ہی میں لکھی ہے اور ان سب سے بڑھ کر شاہ حاتم نے "دیوان زادہ" پر فارسی ہی میں دیباچہ تحریر کیا ہے۔ شمالی ہند کی طرح دکن میں بھی مغلوں کے تسلط کے بعد سے برابر فارسی ہی کا سکہ چل رہا تھا۔ انھی حالات میں جب اس زمانے کے کچھ اہلِ قلم اپنے شعرا کے تذکروں کی ترتیب کی طرف راغب ہوئے تو انھیں ذریعۂ اظہار کے طور پر فارسی کو اپنانے کے سوا چارہ کار نظر نہ آیا۔ چنانچہ اردو تذکرہ نویسی کی تاریخ میں اکثریت ایسے ہی تذکروں کی ہے جو فارسی میں لکھے گئے ہیں۔

شعرائے اردو کا اوّلین تذکرہ

شعرائے اردو کے جس قدر تذکرے اب تک دستیاب ہو چکے ہیں، ان میں بہ اعتبارِ قدامت میر تقی میر کے "نکات الشعرا" سید فتح علی گردیزی کے "تذکرۂ ریختہ گویاں" حمید اورنگ آبادی کے "گلشنِ گفتار" قائم چاند پوری کے "مخزنِ نکات" اور عنایت اللہ فتوت کے "ریاض حسنی" کو سرِ فہرست رکھا جاتا ہے "تذکرۂ ریختہ گویاں" کے علاوہ ان تمام تذکروں کے مولفین نے کسی نہ کسی صورت میں یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ وہ اردو میں اس فن کے موسّس ہیں اور ان کا تذکرہ ریختہ گویوں کا پہلا تذکرہ ہے۔ چنانچہ میر صاحب لکھتے ہیں کہ:

"در فنِ ریختہ کہ شعر یست بطور شعرِ فارسی بزبان اردوے معلّٰی (معلآے)

شاہجہاں آباد دہلی، کتابے تاحال تصنیف نہ شدہ کہ احوالِ شاعرانِ ایں فن بصفحۂ روزگار بماند، بنارً علیہ ایں تذکرہ کہ مسمّٰی بہ نکات الشعراست، نگاشتہ می شود۔"[1]

قائم چاندپوری نے یہی بات ان الفاظ میں کہی ہے:

"بر ضمیرِ مہر تنویرِ سخن طرازانِ ہندوستان ..... مخفی و محجب ماند کالی الآن در ذکر بیانِ اشعار و احوال شعرائے ریختہ کتابے تصنیف نہ گردیدہ و تا ایں زماں ہیچ انسانے از ماجرائے شوق افزائے سخنورانِ ایں فن سطرے بتالیف نرسانیدہ۔ بنا بریں فقیر مولف ..... بعدِ کوششِ تمام و سعیِ مالا کلام دواوینِ ایں اعزہ فراہم آوردہ پارۂ ابیات از ہر کدام بر سبیلِ یادگار در ذیلِ ایں بیاض کہ بہ "مخزنِ نکات" موسوم است، بہ قیدِ قلم در آوردہ۔"[2]

حمید نے واضح طور پر اوّلیت کا دعویٰ نہ کرتے ہوئے اپنے تذکرے کو "مضامینِ تازہ" کی پیش کش سے تعبیر کیا ہے۔ ان کا بیان ہے:

"خواستم کہ شغلے پیش گیرم و تذکرۃ الشعرا نویسم لیکن چوں عبارت آرایانِ معنی طراز اکثر تذکرۃ الشعرائے فارسیہ بحیطۂ تحریر آوردہ اند، تالیفِ آن تحصیلِ حاصل می انجامد۔ بنا بریں تذکرۃ الشعرائے ہندیہ ترتیب دادم و بہ مضامینِ تازہ دلہارا گلشن گلشن ساختم و نامش "گلشنِ گفتار نہادم۔"[3]

فتوت کو ان کے اپنے قول کے مطابق خان آرزو کے تذکرے "مجمع النفائس" کے مطالعے سے یہ تحریک ملی ہے کہ:

"ایجادِ تذکرۂ ہندی خالی از ندرت نیست۔"[4]

---

[1] نکات الشعرا طبع ثانی ص ۱

[2] مخزن نکات مرتبہ ڈاکٹر اقتدا حسن ص ۲

[3] گلشن گفتار مرتبہ سید محمد ایم اے ص ۴

[4] ریاض حسنی مخطوطہ سینٹرل رکارڈ آفس حیدرآباد ص ۲۲

سرسری اندازوں کے مطابق یہ بیانات ۱۱۶۵ھ/۱۷۵۲ء، ۱۱۶۸ھ/۱۷۵۵ء اور ۱۱۷۳ھ/۶۰-۱۷۵۹ء میں سپردِ قلم کیے گئے ہیں، اس لیے بیک وقت ان سب کا درست ہونا ظاہری طور پر ممکن نہیں۔ اس کے باوجود معلوم شدہ حقائق و واقعات کی روشنی میں فتوت کے علاوہ باقی تذکرہ نگاروں کی صداقت اور نیک نیتی پر شبہ کی گنجائش نظر نہیں آتی۔ میر صاحب نے اپنے تذکرے کے زمانۂ تالیف کی صراحت نہیں کی ہے لیکن ان کے یہاں ایسی شہادتیں بکثرت موجود ہیں، جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ۱۱۶۵ھ کے ربیعِ ثالث (۱۷۵۲ء) میں اس کی ترتیب سے فراغت پا چکے تھے[1] "گلشنِ گفتار" بھی مولف کے قطعۂ تاریخ کے بموجب اسی سال کی تالیف ہے۔

قائم کے تذکرے کا سالِ ترتیب بالعموم اس کے نام کے اعداد کی بنیاد پر ۱۱۶۸ھ (۱۷۵۵ء) قرار دیا جاتا ہے جب کہ مولف کے بعض بیانات سے بالواسطہ طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس کی تالیف کا کام ۱۱۵۷ھ/۱۷۴۴ء کے آس پاس شروع ہو چکا تھا اور یہ نام اختتامِ کار کے قریب خواجہ اکرم کے قطعۂ تاریخ سے اخذ کیا گیا ہے۔ "ریاضِ حسنی" اس تذکرے کے بھی کئی برس بعد ۱۱۷۳ھ/۶۰-۱۷۵۹ء میں مرتب ہوا ہے۔ ایسی صورت میں احتیاط کے تمام تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنی تحقیق کی روشنی میں ہم ان نتائج پر پہنچے ہیں کہ:

(الف) شمالی ہند میں میر صاحب کو اور دکن میں حمید اورنگ آبادی کو پہلی بار شعرائے اردو کے تذکرے کی ترتیب کا فخر حاصل ہے۔

(ب) "ایجادِ تذکرۂ ہندی" سے متعلق فتوت کا دعویٰ ایک بے بنیاد اور گمراہ کن تعلّی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔

(ج) قائم کا یہ قول کہ اب تک سخنورانِ ریختہ کے احوال و اشعار کے بارے

---

[1] اس قسم کے موضوعات پر مفصل بحث آئندہ ابواب میں متعلقہ تذکروں کے تفصیلی جائزے کے تحت ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔

میں کوئی کتاب مرتب نہیں ہوئی ہے، اس لحاظ سے اپنی جگہ درست ہے کہ ۱۱۵۷ھ/۱۷۴۴ء تک جب کہ مخزنِ نکات کا آغاز ہوا تھا، شعرائے اردو کے کسی تذکرے کی تالیف کا سراغ نہیں ملتا۔

ان حقائق کو نظر انداز کرتے ہوئے مولوی عبدالحق، ڈاکٹر سید عبداللہ اور بعض دوسرے اہلِ قلم نے میر کو تذکرہ نگاری میں شرفِ اوّلیت کا واحد حق دار ٹھہرایا ہے۔ ان کی نظر میں حمید اورنگ آبادی اس لیے کسی اہمیت کے مستحق نہیں کہ ان کا تذکرہ دکن سے تعلق رکھتا ہے اور میر اس کے وجود سے باخبر نہیں تھے[۱]۔ اسی طرح بعض مصنفین "نکات الشعرا" اور "مخزنِ نکات" کے درمیان تقدمِ زمانی کی بحث کے سلسلے میں بھی افراط و تفریط کے شکار ہوئے ہیں۔ گارسین دی تاسی قائم کے دعوے کی صداقت پر شک کے اظہار کو اپنا حق تصور کرتا ہے۔ اس کے خیال کے مطابق انھوں نے سرقے کے الزام سے بچنے کے لیے سخن سازی کی راہ اختیار کی ہے[۲]۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی انھیں میر کا نقال یا خوشہ چیں قرار دیتے ہیں[۳]۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کے نزدیک انھوں نے تذکرہ نویسی میں صرف میر کے اسلوب ہی کا تتبع نہیں کیا ہے، ان کی ترکیبیں اور عبارتیں تک اڑالی ہیں[۴]۔ نیاز فتح پوری کے الفاظ میں قائم کا تذکرہ بالکل "نکات الشعرا" کا چربہ ہے[۵]۔ ڈاکٹر مسیح الزماں کے بموجب "مخزن کے اوراق سے صاف طور پر میر کے تذکرے کے اثرات مترشح ہوتے ہیں[۶]"۔ اس کے برعکس نثار احمد فاروقی کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ "میر دہلی میں

---

[۱] مقدمہ "نکات الشعرا" از مولوی عبدالحق ص الف و ج، "شعرائے اردو کے تذکرے" از ڈاکٹر سید عبداللہ ص ۱۵ و "اردو تنقید کی تاریخ" از مسیح الزماں ص ۸۱

[۲] گارسین دی تاسی کے تمہیدی خطبے ص ۵۶ و ۶۸

[۳] گارسین دی تاسی کے تمہیدی خطبے حاشیہ مرتب ص ۵۸

[۴] "شعرائے اردو کے تذکرے" ص ۳۴، ۴۱، ۴۲ و ۴۳

[۵] ماہنامہ "نگار" لکھنؤ شمارہ ماہ جون ۱۹۵۶ء ص ۱۴ [۶] اردو تنقید کی تاریخ ص ۹۶

قائم کے ہمسایہ تھے اس لیے انھیں "مخزنِ نکات" کی تالیف کا علم ہو گا، لیکن انھوں نے عمداً اس سے چشم پوشی کی ہے اور تقدم کا شرف خود حاصل کرنا چاہا ہے۔[1] اس قسم کی تمام رائیں یا تو ناواقفیت کا نتیجہ ہیں یا محض مفروضہ دلائل پر مبنی ہیں۔ قائم چوں کہ "نکات الشعرا" کے منظرِ عام پر آنے سے پہلے اپنے تذکرے کا آغاز کر چکے تھے، اس لیے ان کے معاملے میں دروغ بیانی یا میر صاحب کے تذکرے سے ناجائز طور پر استفادے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ البتہ اس اصول کے پیشِ نظر کہ مختلف کتابوں کے درمیان ان کے اختتام کے سنین کی بنیاد پر ہی تاریخی ترتیب قائم کی جا سکتی ہے، "نکات الشعرا" اور "گلشنِ گفتار" کو "مخزنِ نکات" اور دوسرے تمام تذکروں پر تقدم حاصل ہے۔

بعض ناقدین نے یہ خیال بھی ظاہر کیا ہے کہ "نکات الشعرا" اور "گلشنِ گفتار" کی تالیف کے زمانے میں یا اس سے قبل شعرائے اردو کے کچھ اور تذکرے بھی مرتب ہوئے تھے جو امتدادِ زمانہ کی نذر ہو گئے۔ اس خیال کا اوّلین محرک گردیزی کا یہ بیان ہے کہ

> "از ملاحظۂ تذکرہ ہائے اخوانِ زماں کہ مشتمل بر اسامی ریختہ گویانِ ہند محرر ساختہ اند و علتِ غائی تالیفِ شاں خوردہ گیریِ ہمسران و ستم ظریفی با معاصرانست، بخاطرِ فاطر ریخت کہ تذکرۂ مرقوم سازم بے رودیدگی از روے انصاف، خالیاً عن الاعتسافات۔"[2]

نہیں کہا جا سکتا کہ یہ تحریر کس حد تک صداقت پر مبنی ہے کیوں کہ تذکرے کا لب و لہجہ اور اکثر اندراجات یہ باور کرنے پر مجبور کرتے ہیں کہ مولف کی نظر صرف "نکات الشعرا" کے مطالعے تک محدود ہے اور "اخوان زماں" کی تنقیص کے پردے میں انھوں نے بالواسطہ میر صاحب ہی کو ہدفِ ملامت بنایا ہے۔ ایک احتمال یہ بھی ہے کہ اس وقت تک خاکسار کا تذکرہ بھی جو "نکات الشعرا" کے "علی الرغم" لکھا

---

[1] دلی کالج میگزین، میر نمبر ص ۲۹۶

[2] تذکرہ ریختہ گویاں ص ۳

گیا تھا، مرتب ہو چکا ہو اور گردیزی نے اخفائے حال کی خاطر تذکروں کے لیے صیغۂ جمع کے استعمال میں کوئی قباحت محسوس نہ کی ہو۔ بہر نوع اس بیان سے گارسین دی تاسی نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ "تذکرۂ ریختہ گویاں" کے زمانۂ ترتیب یعنی ۱۷۵۱ء (۱۱۶۵ھ) میں شعرائے اردو کے متعدد تذکرے موجود تھے جن میں سے کچھ میر کے تذکرے سے بھی پہلے مدوّن ہو چکے تھے[1]۔ دی تاسی کے بعد جن مصنفین نے اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے ان میں سے بعض کی تحقیق یا قیاسات کے نتائج حسب ذیل ہیں:

(الف) "جہاں تک تحقیق سے ہمیں معلوم ہوا ہے (تذکرہ) گردیزی کے زمانے میں یا اس سے کچھ قبل یہ چند تذکرے لکھے گئے تھے:

۱۔ تذکرۂ سید امام الدین خاں بعہدِ محمد شاہ

۲۔ تذکرۂ خان آرزو

۳۔ تذکرۂ میر، نکات الشعرا۔ ۱۱۶۵ھ

۴۔ تذکرۂ سودا

۵۔ معشوقِ چہل سالۂ خود نوشتۂ خاکسار۔ ۱۱۶۵ھ

۶۔ تحفۃ الشعرا مولفہ افضل بیگ قاقشال اورنگ آبادی ۱۱۶۵ھ

۷۔ گلشنِ گفتار مولفہ خواجہ خان حمید اورنگ آبادی۔ ۱۱۶۵ھ

ممکن ہے دو ایک اور بھی تذکرے ہوں جن کا پتا اب تک نہیں لگا۔ سید امام الدین خاں، خان آرزو، سودا اور خاکسار کے تذکرے اب تک دستیاب نہیں ہوئے، البتہ بعض کتابوں اور تذکروں میں ان کا حوالہ ملتا ہے۔"

(مولوی عبدالحق۔ مقدمۂ تذکرۂ ریختہ گویاں مطبوعہ ۱۹۳۳ء ص ۱۰ و ۱۱)

(ب) "چند تذکرے میر صاحب سے پہلے بھی لکھے گئے مثلاً تذکرۂ سید امام الدین خاں بعہد محمد شاہ جس کا حوالہ میر حسن نے اپنے تذکرے میں دیا ہے۔

---

[1] گارسین دی تاسی کے تمہیدی خطبے ص ۵۵ و ۵۶

تذکرۂ خان آرزو مگر یہ تذکرہ فارسی شعرا کا ہے۔ تذکرۂ سودا، اس کا حوالہ دو جگہ قدرت اللہ قاسم نے اپنے تذکرے "مجموعۂ نغز" میں دیا ہے لیکن اسے کچھ غلط فہمی ہوئی ہے۔ غالباً وہ قایم کے تذکرے کو سودا کا سمجھا ہے۔ بہرحال میر صاحب کے سامنے ان میں سے کوئی تذکرہ نہ تھا اور نہ اب تک یہ دستیاب ہوئے ہیں۔"

(مولوی عبدالحق مقدمہ نکات الشعرا مطبوعہ ۱۹۳۵ء ص ۳ و ۴)

(ج) "کچھ تذکرے میر اور قایم کے تذکروں سے بھی پہلے لکھے جا چکے تھے۔ وہ تذکرے جو ۱۱۶۵ھ میں یا اس سے پہلے تصنیف ہوئے ان کے نام یہ ہیں:

۱۔ تذکرۂ سید امام الدین (عہد محمد شاہ)

۲۔ تذکرۂ خان آرزو

۳۔ تذکرۂ سودا

۴۔ معشوقِ چہل سالۂ خود نوشتۂ خاکسار

۵۔ تحفۃ الشعرا مولفہ افضل بیگ قاقشال اورنگ آبادی (۱۱۶۵ھ)

۶۔ گلشنِ گفتار مولفہ خواجہ خان حمید اورنگ آبادی (۱۱۶۵ھ)

مذکورہ بالا تذکروں میں سے پہلے سے چار تذکرے ناپید ہیں اور موخر الذکر دو تذکرے دکن سے متعلق ہیں..... ان حالات میں تذکرۂ میر کو اردو شاعروں کا پہلا "موجود" تذکرہ قرار دیا جا سکتا ہے۔"

(ڈاکٹر سید عبداللہ۔ شعرائے اردو کے تذکرے ص ۱۵ و ۱۶)

(د) "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ۱۱۶۵ھ میں یا اس سے قبل (نکات الشعرا کے علاوہ) اردو شاعروں کے کچھ تذکرے ضرور لکھے گئے۔ (۱) تذکرۂ امام الدین (۲) تذکرۂ خان آرزو (۳) تذکرۂ سودا (۴) معشوقِ چہل سالۂ خود نوشتہ خاکسار۔ ۱۱۶۵ھ (۵) تحفۃ الشعرا، افضل بیگ ۱۱۶۵ھ (۶) گلشنِ گفتار حمید۔ ۱۱۶۵ھ۔ ان میں سے پہلے چار نایاب ہیں۔ پانچواں اور چھٹا دکن

کے متعلق ہے، اس لیے نکات الشعرا کو پہلا موجودہ تذکرہ قرار دینا صحت اور واقعے کے مطابق ہے۔"

(ڈاکٹر مسیح الزماں۔ اردو تنقید کی تاریخ حاشیہ ص ۸۱)

(ک) "یہ خیال درست نہیں کہ میر تذکرہ نگاری کے موجد ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انیسویں صدی میں تذکرہ نویسی کے فن کو بہت فروغ حاصل ہو گیا تھا[1]۔ تذکرۂ امام الدین، تذکرۂ خان آرزو، تذکرۂ سودا، معشوقِ چہل سالۂ خاکسار وغیرہ تو بالیقین میر کے تذکرے سے پہلے لکھے گئے۔ یہ تذکرے موجود نہیں ہیں اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس وقت جتنے تذکرے موجود ہیں، ان میں نکات الشعرا کو تقدم حاصل ہے۔"

(ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی۔ میر تقی میر ص ۵۲۰ و ۵۲۱)

(ل) "میر کے تذکرے سے پہلے کئی تذکرے موجود تھے۔ محمد شاہ اور احمد شاہ کے عہد کے چند تذکروں کا ذکر کتابوں میں پایا جاتا ہے مثلاً تذکرۂ امام الدین جو عہد محمد شاہ میں لکھا گیا۔ دوسرا تذکرہ خان آرزو کا اور تیسرا سودا کا۔ ..... لیکن ..... یہ تذکرے ناپید ہیں۔"

(نیاز فتحپوری۔ ماہنامہ نگار، لکھنؤ شمارہ جون ۱۹۵۶ء، ص ۱۳)

(م) "اردو میں تذکرہ نگاری کا رواج میر و درد کے عہد ہی سے ہو گیا تھا اور بعض معاصرین مثلاً محمد یار خاں خاکسار، رفیع الدین سودا، سراج الدین علی خاں آرزو اور سید امام الدین وغیرہ نے اردو شعرا کے تذکرے بھی مرتب کیے تھے لیکن وہ دستِ بردِ زمانہ سے محفوظ نہ رہ سکے۔"

(ڈاکٹر فرمان فتحپوری۔ نگارِ پاکستان، تذکروں کا تذکرہ نمبر ص ۱۴)

---

[1] انیسویں صدی غالباً مصنف کا سہوِ قلم ہے۔ میر کا تذکرہ اٹھارویں صدی عیسوی کے وسط میں مرتب ہوا ہے۔

ان تمام بیانات کی نوعیت تقریباً یکساں ہے، اس لیے ان پر فرداً فرداً تبصرہ کرنے کی بجائے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ زیرِ بحث تذکروں کے متعلق تمام ضروری تفصیلات پیش کر دی جائیں، جن کی روشنی میں اصل صورتِ حال کا اندازہ لگایا جا سکے اور اس سلسلے میں جو شکوک و شبہات پائے جاتے ہیں ان کا ازالہ ہو جائے۔

(الف) تذکرۂ امام الدین

اس تذکرے کا ذکر سب سے پہلے میر حسن نے کیا ہے۔ ان کا بیان ہے کہ

"سید امام الدین خاں ولد سید معین خاں سرچوکی رسالۂ والاشاہی بود در وقتِ محمد شاہ غفر اللہ لہٗ۔ او ہم تذکرۂ مختصرِ معاصرینِ خود نوشتہ است احوالش معلوم نیست[1]"

میر حسن کے بعد غالباً انھی کے تذکرے کے واسطے سے یہی تمام باتیں عشقی عظیم آبادی نے ان الفاظ میں دوہرا دی ہیں:

"سید امام الدین خاں خلفِ سید معین الدین خاں در عہد سلطنت محمد شاہ بادشاہِ غازی سرچوکیٔ رسالۂ والاشاہی بود۔ می گویند کہ تذکرۂ مختصر مشتمل بر احوال و اشعارِ ریختہ گویانِ معاصرِ خود مرتب ساختہ[2]"

ان بیانات سے کسی طرح یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ امام الدین محمد شاہ کے عہد (۱۱۳۱ھ/۱۷۱۹ء تا ۱۱۶۱ھ/۱۷۴۸ء) میں فوت ہو چکے تھے یا ان کا تذکرہ اس زمانے میں مرتب ہو گیا تھا۔ عین ممکن ہے کہ وہ محمد شاہ کی وفات کے بعد "رسالۂ والاشاہی" سے وابستہ نہ رہے ہوں اور فراغت کے انھی ایام میں تذکرہ ترتیب دیا ہو، یا میر حسن کو جیسا کہ ان کے آخری جملے سے مترشح ہوتا ہے، اس زمانے کے حالات معلوم

---

[1] تذکرہ شعرائے اردو طبع ثانی ص ۱۴۹

[2] تذکرۂ عشقی۔ دو تذکرے جلد دوم ص ۲۶۴

نہ ہوں۔ اس قیاس سے قطع نظر "گلزارِ ابراہیم" کی روایت کے مطابق امام الدین خاں ملازمِ سرکار نہ تھے بلکہ "پدرش سید معین الدین سرچوکی رسالہ والا شاہی بود"[1] واقعات کا یہ اختلاف تذکرۂ میر حسن کی عبارت میں "معین الدین خاں" اور "سرچوکی" کے درمیان سے کافِ بیانیہ (کہ) کے سقوط کی نشان دہی کرتا ہے اور کاتب یا خود مولف کے قلم سے اس قسم کا معمولی سہو بعید از امکان نہیں۔ اس لیے اس دعوے کی صحت کا کوئی جواز باقی نہیں رہتا کہ امام الدین میر سے پہلے محمد شاہ کے عہد میں اپنا تذکرہ ترتیب دے چکے تھے۔

(ب) تذکرۂ خان آرزو

اس تذکرے کے متعلق ضروری معلومات گذشتہ اوراق میں ہندوستان کے فارسی تذکروں پر بحث کے ضمن میں پیش کی جا چکی ہے۔ مولوی عبدالحق نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ فارسی شعرا کا تذکرہ ہے نہ معلوم کیوں اسے شعرائے اردو کے تذکروں کی فہرست میں شامل کر لیا ہے۔ اس سے عجیب تر بات یہ ہے کہ ڈاکٹر سید عبداللہ اور دوسرے مصنفین نے بھی اس سلسلے میں بلا پس و پیش مولوی صاحب کے ارشاد پر صاد کر دیا ہے۔ حتیٰ کہ اس قول کی تائید میں بھی کسی نے تامل نہیں کیا کہ یہ تذکرہ اب نایاب ہے، جب کہ انڈیا آفس لائبریری لندن اور دوسرے غیر ملکی کتب خانوں کے علاوہ اس کے نسخے رضا لائبریری، رام پور، خدا بخش لائبریری پٹنہ اور پنجاب یونیورسٹی لاہور کے کتب خانے میں بھی موجود ہیں۔

(ج) تذکرۂ سودا

اس تذکرے کے نکات الشعرا سے قبل مرتب ہونے کے بارے میں عام غلط فہمی

---

[1] گلزار ابراہیم مطبوعہ ص ۲۳۷

کی بنیاد غالباً شیخ چاند کا یہ استدلال ہے کہ سودا نے قاسم کے بیان کے مطابق اپنے تذکرے میں سعدی دکنی کے اشعار سعدی شیرازی سے منسوب کیے تھے اور میر نے "نکات الشعرا" میں یہ لکھ کر کہ "آنچہ بعض ایں را شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ گمان بردہ اند، خطاست" گویا سودا کے اس بیان ہی کی تردید کی ہے، اس لیے سودا کا تذکرہ یقیناً میر کے تذکرے سے پہلے مرتب ہوا ہوگا۔[1] اس استدلال کی حیثیت اس سے ظاہر ہے کہ میر نے "نکات الشعرا" کے دیباچے میں واضح طور پر شعرائے اردو کے کسی تذکرے کے وجود سے انکار کیا ہے۔ اگر تذکرۂ سودا ان کے پیشِ نظر ہوتا تو وہ ہرگز اس قسم کی بات نہ کہتے۔ قاسم کا تذکرہ بھی جو ۱۲۲۱ھ/۱۸۰۶ء میں لکھا گیا ہے اور اس تذکرے کے متعلق ہماری معلومات کا اصل ماخذ ہے، زمانہ تالیف کے تعین کا کوئی قرینہ فراہم نہیں کرتا۔ اس کے علاوہ قاسم سے پہلے کے تذکرہ نگار اس کے وجود سے قطعاً ناآشنا ہیں۔ یہاں تک کہ میر حسن بھی جنھوں نے اپنا تذکرہ ۱۱۹۲ھ/۱۷۷۸ء میں مکمل کیا ہے، سودا کے حالاتِ زندگی اور مشاغلِ علمی سے قریبی واقفیت کے باوجود کسی جگہ اس کا ذکر نہیں کرتے۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ سودا نے یہ تذکرہ میر حسن کے تذکرے کی تکمیل اور اپنی وفات (۱۱۹۵ھ/۱۷۸۱ء) کی درمیانی مدت میں مرتب کیا ہوگا۔ مولوی عبدالحق کا یہ قیاس بھی کہ قاسم نے بربنائے سہو قائم کے تذکرے کو سودا کی تالیف سمجھ لیا ہے، اس بنا پر محلِ نظر ہے کہ انھوں نے جن اشعار کے انتساب یا تصحیحِ متن کے سلسلے میں تذکرۂ سودا کے حوالے دیے ہیں، ان میں سے قائم کے یہاں صرف ایک شعر ملتا ہے اور وہ بھی لفظی اعتبار سے قاسم کے نقل کیے ہوئے شعر سے کافی مختلف ہے۔

(د) تذکرۂ خاکسار

خاکسار کے ذکر میں میر نے لکھا ہے کہ

"علی الرغم ایں تذکرہ تذکرہ نوشتہ است بنامِ معشوقِ چہل سالۂ خود۔

---

[1] سودا ص ۹۴-۹۳

احوالِ خود را..... اوّل از ہمہ نگاشتہ و خطابِ خود سید الشعرا پیشِ خود قرار دادہ[1]"

بظاہر کسی کتاب کی اشاعت سے قبل اس کے علی الرغم کسی کتاب کا لکھا جانا عملاً ناممکن ہے، اس لیے خاکسار کا یہ تذکرہ لازماً "نکات الشعرا" کے منظرِ عام پر آنے کے بعد ہی مرتب ہوا ہوگا اور چونکہ میر صاحب کے اندازِ بیان سے صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے یہ عبارت نظرِ ثانی کے وقت اضافہ کی ہے جس کا زمانہ متعین نہیں، لہٰذا اس تذکرے کو ۱۱۶۵ھ کی تالیفات میں شامل کرنا کسی طرح درست نہیں۔ اس نقطۂ نظر کی تائید میں یہ دلیل بھی پیش کی جاسکتی ہے کہ گردیزی جو میر کے بعد خاکسار کے قریب ترین معاصر ہیں، ان کی خودسری اور برخود غلطی کے بارے میں میر کی رائے سے اتفاق رکھتے ہیں[2]، لیکن تذکرے کے متعلق ہمارے نقل کیے ہوئے اقوال کی تائید یا تردید نہیں کرتے۔ گویا انھوں نے نکات الشعرا کے جس نسخے سے ۵ر محرم ۱۱۶۶ھ/۱۳ر نومبر ۱۷۵۲ء سے قبل استفادہ کیا ہے، اس میں یہ جملے موجود نہ تھے۔

مولوی عبدالحق اور ان کے مقلدین سے اس تذکرے کے سلسلے میں دوسری غلطی یہ ہوئی ہے کہ انھوں نے اس کا نام "معشوقِ چہل سالۂ خود" قرار دیا ہے۔ یہ دراصل میر کی عبارت کے سخن گسترانہ پہلو کو نظر انداز کر دینے کا نتیجہ ہے۔ کسی تذکرے کا نام "معشوقِ چہل سالہ" تو ہو سکتا ہے، "معشوقِ چہل سالۂ خود" نہیں ہو سکتا، ایسی صورت میں اور بھی کہ یہ نام تاریخی بھی نہیں ہے۔ واقعہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ خاکسار نے میر کے تذکرے کے جواب میں یہ تذکرہ کسی ایسے شخص کے نام سے مرتب کیا تھا، جس پر کبھی ان کی نگاہِ توجہ رہی تھی، اور جو اس وقت عنفوانِ شباب کی منزل سے آگے بڑھ چکا تھا۔ میر نے اسی پر "معشوقِ چہل سالہ" کی پھبتی کہی ہے[3]۔ تذکرے میں خاکسار کا ذکر سب سے پہلے تھا اور ان کے نام کے ساتھ

---

[1] نکات الشعرا طبع ثانی ص ۱۱۴ [2] تذکرہ ریختہ گویاں ص ۵۲

[3] فارسی میں چہل سال سے واقعی چالیس سال کے بجائے عموماً مدتِ مدید مراد لی جاتی ہے مثلاً سعدی کے اس شعر میں ؎

چہل سال عمرِ عزیزت گذشت — مزاجِ تو از حالِ طفلی نگشت

سید الشعرا لکھا گیا تھا۔ چوں کہ میر اس حقیقت سے واقف تھے کہ یہ تذکرہ در اصل خاکسار ہی کی تالیف ہے، اس لیے وہ ان پر مزید چوٹ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "احوالِ خود اوّل از ہمہ نگاشتہ و خطابِ خود سید الشعرا پیشِ خود قرار دادہ"۔ اپنے نام سے یہ تذکرہ لکھنے کی صورت میں خاکسار کے لیے نہ تو عام اصولِ تذکرہ نگاری کے برخلاف سب سے پہلے اپنا ذکر کرنا ممکن تھا اور نہ وہ اپنے قلم سے خود کو سید الشعرا لکھنے کی جسارت ہی کر سکتے تھے۔

(۷) تحفۃ الشعرا

یہ تذکرہ آزاد بلگرامی اور عارف الدین خاں عاجز کے قطعاتِ تاریخ کی رو سے ۱۱۶۵ھ/۱۷۵۲ء میں مرتب ہوا ہے اور باسٹھ شاعروں کے ذکر پر مشتمل ہے جنھیں شعرائے فارسی کی حیثیت سے متعارف کرایا گیا ہے۔ ان میں سے دس شاعروں کے ذکر میں مولف نے ضمناً ان کے اردو اشعار بھی شامل کر لیے ہیں۔ غالباً اسی وجہ سے مولوی عبدالحق اور ان کے ہم نوا اسے بھی شعرائے اردو کے تذکروں میں شمار کرتے ہیں۔ ہمارے نزدیک اُصولاً یہ فیصلہ درست نہیں کیونکہ "تحفۃ الشعرا" کی اصل حیثیت فارسی تذکرے کی ہے اور اسے اسی نظر سے دیکھنا مناسب ہوگا۔ قاقشال نے خود بھی ایسا کوئی دعویٰ نہیں کیا ہے کہ وہ خصوصیت کے ساتھ بعض اردو شعرا کا بھی ذکر کر رہے ہیں۔

مختصر یہ کہ امام الدین اور سودا کے تذکروں کے "نکات الشعرا" سے قدیم تر ہونے کا کوئی ثبوت موجود نہیں۔ خان آرزو اور افضل بیگ قاقشال کے تذکرے شعرائے فارسی سے متعلق ہیں اور خاکسار کا تذکرہ بالیقین میر کے تذکرے کے بعد مرتب ہوا تھا، لہٰذا نہ تو بہ اعتبارِ زمانہ میر صاحب یا حمید اورنگ آبادی پر کسی تذکرہ نگار کی فوقیت کا سوال پیدا ہوتا ہے اور نہ اس دعوے کے لیے کوئی گنجائش نکلتی ہے کہ ان کے شرفِ اوّلیت میں شمالی ہند یا دکن کے کچھ اور تذکرہ نگار بھی شریک ہیں۔

ماحول اور ترقی کی منزلیں

ابتدائی تذکرے

اردو تذکرہ نگاری کی تاریخ جیسا کہ پچھلے صفحات میں پیش کردہ تفصیلات سے واضح ہے، ۱۱۶۵ھ/۱۷۵۲ء سے شروع ہوتی ہے۔ اس سال اور اس کے بعد اگلے سات آٹھ برسوں میں اس موضوع پر جو تالیفات معرضِ وجود میں آئیں، ان میں سے میر تقی میرؔ، حمیدؔ اورنگ آبادی، فتح علی گردیزی، قائمؔ چاندپوری اور عنایت اللہ فتوتؔ کے تذکرے دستیاب ہو چکے ہیں۔ صرف خاکسارؔ کا تذکرہ اب تک نایاب ہے۔ میرؔ نے اپنے تذکرے میں شعرا کی ترتیب بالعموم ان کے مرتبے اور منزلت کے مطابق قائم کی ہے۔ حمیدؔ کے یہاں ایک غیر واضح زمانی ترتیب کا عمل کارفرما نظر آتا ہے۔ گردیزی اور فتوتؔ کے تذکرے حروفِ تہجی کی ترتیب کے مطابق مرتب ہوئے ہیں۔ قائمؔ کے تذکرے کا انداز ان تمام تذکروں سے مختلف ہے۔ انھوں نے متقدمین، متوسطین اور متاخرین کے علٰحدہ علٰحدہ طبقات قائم کیے ہیں۔ یہ طبقات تین مختلف ادوار کی نمائندگی کرتے ہیں جن کی حدیں لسانی ارتقا کی بنیادوں پر بعض سلاطین کے عہد کو مدِ نظر رکھ کر متعین کی گئی ہیں۔

ان تذکروں کی حیثیت اگرچہ اردو میں اس فن کے ابتدائی نمونوں کی ہے لیکن چونکہ ہمارے اہلِ قلم کو یہ فن فارسی سے وراثت میں ملا تھا اور وہاں اس قسم کی تالیفات کی کوئی کمی نہ تھی جنھیں وہ اپنے لیے چراغِ راہ بنا سکیں، اس لیے فنی نقطۂ نظر سے ان کے تذکروں میں ایسی کوئی خامی نظر نہیں آتی جو انھیں فارسی کے تذکروں کے برابر رکھنے میں مانع ہو۔ ان تذکروں کا معیارِ نقد و نظر وہی ہے جو فارسی کے عام تذکروں کا ہے۔ البتہ چوں کہ اس زمانے میں معلومات کے ذرائع محدود اور وسیع پیمانے پر اشاعتِ کلام کے امکانات تقریباً مفقود تھے، ایک جگہ کے شاعروں سے دوسری جگہ کے اربابِ علم عام طور پر کم ہی واقف ہو پاتے تھے، صرف مشاہیر شعرا کا کلام ہی خوش ذوق مسافروں

اور تجارت پیشہ لوگوں کے ذریعے ارمغانِ سفر کے بطور ادھر سے ادھر پہنچتا رہتا تھا' اس بنا پر ان تذکروں میں کسی حد تک سوانحی عنصر کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ یہ کمی اکثر فارسی تذکروں میں بھی موجود ہے اور حالات کی نامساعدت کے پیشِ نظر ہم اسے چنداں اہمیت بھی نہیں دے سکتے۔ جانے پہچانے شعرا کے تعارف میں سنین و تواریخ کے التزام سے پہلوتہی بھی ایسے ہی اسباب و علل کا نتیجہ ہے۔ اس زمانے میں نہ تو ولادت و وفات اور دوسرے واقعات کی تاریخیں محفوظ رکھنے کی کوئی روایت موجود تھی اور نہ ہر شخص کے بارے میں اس قسم کی معلومات فراہم کرنا عملاً ممکن تھا' اس لیے تذکرہ نگار ایک زمانے تک اس طرح کے حوالوں کو غیر ضروری خیال کرتے رہے۔ انتہا یہ ہے کہ میر نے اپنی سوانح عمری "ذکرِ میر" میں کسی جگہ سنہ کا حوالہ نہیں دیا ہے۔ اس کتاب کو پڑھ کر ہم ان کی ولادت آگرے سے ترکِ وطن کے بعد دہلی میں ورود اور دہلی سے لکھنؤ کی طرف مہاجرت جیسے اہم واقعات کے بارے میں تواریخ و سنین کے تعین کے ساتھ کوئی قطعی معلومات حاصل نہیں کر سکتے۔ جس دور میں خود نوشت کا فن ارتقا کی اس ابتدائی منزل میں، اُس زمانے میں کسی تذکرہ نویس سے اس کے سوا اور کیا توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ بہ حدِ امکان ہر شاعر کے بارے میں یہ معلومات فراہم کر دے کہ اس کا نام اور تخلص کیا ہے' وہ کہاں کا رہنے والا ہے' گذرِ اوقات کے کیا ذرائع ہیں' کلام پر کس سے اصلاح لی ہے اور طبیعت کا میلان کس صنفِ سخن کی جانب ہے۔ دورِ اول کے ان تذکروں میں مولفین کی توجہات بالعموم انھی امور تک محدود رہی ہیں۔

تذکرہ نگاری کے مختلف مراکز

(الف)

۱۱۷۵ھ/۱۷۶۱ء سے ۱۲۰۰ھ/۱۷۸۶ء تک

دہلی

اوپر کی سطور میں ہم نے خصوصیت کے ساتھ جن پانچ تذکروں کا ذکر کیا ہے، ان میں سے "ریاض حسنی" اور "مخزن نکات" کے علاوہ باقی تین تذکرے احمد شاہ کے عہد (۱۱۶۱ھ/ ۱۷۴۸ء تا ۱۱۶۷ھ/۱۷۵۴ء) میں مرتب و مکمل ہوئے ہیں۔ احمد شاہ اپنے باپ محمد شاہ کے انتقال پر ایک ایسی سلطنت کا وارث قرار پایا تھا جس میں ہر طرف رنگ رلیاں تھیں، تعیش تھا اور عیشِ امروز کی خاطر فکرِ فردا کو اندیشۂ غلط کی طرح ذہن سے محو کر دیا گیا تھا۔ نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کی یورشوں اور مرہٹوں کی مسلسل تاخت و تاراج کے نتیجے میں ملک کا اقتصادی نظام دم توڑ چکا تھا۔ بنگال اور بہار کے صوبے مہابت جنگ کے تصرف میں تھے۔ دکن میں نظام الملک نے ایک خود مختار سلطنت کی بنیاد ڈال دی تھی۔ اودھ صفدر جنگ کے زیرِ اقتدار تھا۔ روہیل کھنڈ پر روہیلہ سردار قابض تھے اور فرخ آباد میں بنگش خاندان کی حکومت قائم ہو گئی تھی۔ احمد شاہ کے عہد میں زوال کا یہ سیلِ رواں کچھ اور تیزی سے آگے بڑھا۔ بادشاہ نے فارغ البالی اور بے فکری کے ساتھ عیش و عشرت کی داد دینے کے لیے کاروبارِ سلطنت کی تمام تر ذمہ داریاں اپنی کم ذات ماں اودھم بائی اور جاوید خاں خواجہ سرا کو سونپ دیں جنھوں نے دل کھول کر اپنے نااہل اعزہ اور لواحقین کی قدر افزائی کی۔ احمد شاہ ابدالی جب ایک بار پھر

حملہ آور ہوا (۱۱۶۵ھ/۱۷۵۱ء) تو نواب بہادر جاوید خاں نے اپنی عافیت خواہی کے خیال سے لاہور اور ملتان کے صوبے مصالحت کی قیمت کے طور پر اس کی نذر کر دیے۔[1] کچھ دن کے بعد شوال ۱۱۶۵ھ/اگست ۱۷۵۲ء میں صفدر جنگ کی سازش سے جاوید خاں قتل کر دیا گیا۔ اس کے بعد زمامِ اختیار وزیرِ سلطنت انتظام الدولہ اور میر بخشی عماد الملک کے ہاتھ میں آئی (رجب ۱۱۶۶ھ/مئی ۱۷۵۳ء) عماد الملک نے اپنے خلاف جاٹوں سے سازباز کی پاداش میں ۱۰ر شعبان ۱۱۶۷ھ/۲ر جون ۱۷۵۴ء کو بادشاہ کو معزول اور نابینا کر کے مسندِ حکومت جہاں دار شاہ کے عمر رسیدہ فرزند عزیز الدین عالم گیر ثانی کے حوالے کر دی۔ سلطنتِ مغلیہ کا یہ نیا وارث بھی پیرانہ سالی کے باوجود تعیش پرستی میں مشغول رہا اور امرا و اعیانِ سلطنت کی باہمی سازشیں درّانی کی یورش (۱۱۷۰ھ/۱۷۵۷ء) اور مرہٹوں کی لوٹ مار (۱۱۷۰ھ/۱۷۵۷ء) کی صورت میں دلّی کا سہاگ لوٹتی رہیں۔ بالآخر ۸ر ربیع الثانی ۱۱۷۳ھ/۲۹ر نومبر ۱۷۵۹ء کو عماد الملک ہی کے ہاتھوں اس کا بھی خاتمہ ہو گیا۔

عالم گیر کے قتل کی اطلاع پا کر اس کے بیٹے عالی گوہر نے جو اس وقت حوالیِ عظیم آباد میں تسخیرِ بنگال کی تیاریوں میں مصروف تھا، شاہ عالم ثانی کے لقب سے اپنی فرماں روائی کا اعلان کر دیا۔ دہلی اور اس کے قرب و جوار میں انھی ایام میں عماد الملک اور مشہور روہیلہ سردار نجیب الدولہ کی باہمی چپقلش کی بنا پر اس خوں ریز معرکہ آرائی کا آغاز ہوا جو تاریخ میں اپنی جائے اختتام کی مناسبت سے پانی پت کی تیسری جنگ کے نام سے مشہور ہے۔ اس جنگ میں مرہٹے عماد الملک کے حلیف تھے اور احمد شاہ ابدالی نجیب الدولہ کی مدد کے لیے افغانستان سے اپنی فوج لے کر آیا تھا۔ عماد الملک اور مرہٹوں کے خلاف ابدالی اور روہیلہ سرداروں کی اس مشترک فوجی مہم کے نتیجے میں وقتی طور پر مرہٹوں کی طاقت منتشر ہو گئی اور مارچ ۱۷۶۱ء/شعبان ۱۱۷۴ھ میں احمد شاہ نے اپنی فوج کے اصرار پر افغانستان کی طرف واپس جاتے ہوئے شاہ عالم کو فرماں روا، شہزادہ جواں بخت کو

---

[1] تاریخ ہندوستان جلد نہم ص ۲۸۸ و ۲۸۹

ولی عہد اور نجیب الدولہ کو مدار المہام مقرر کر دیا۔[1] لیکن تاریخی اعتبار سے شاہ عالم کے عہد کا سب سے اہم واقعہ بکسر کی فیصلہ کن جنگ (۲۶ ربیع الثانی ۱۱۷۸ھ/ ۲۳ اکتوبر ۱۷۶۴ء) ہے، جس نے ملک کی آئندہ تاریخ کا رخ متعین کیا۔ اس جنگ میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوجیں شاہی فوج پر غالب آئیں اور ایک عہد نامے کے تحت چھبیس[۲۶] لاکھ روپے سالانہ پنشن کے عوض بنگال، بہار اور اڑیسہ کے صوبوں پر انگریزوں کی بالادستی قائم ہو گئی۔[2] (۱۲ اگست ۱۷۶۵ء/ ۲۴ صفر ۱۱۷۹ھ) اس طرح انگریز جنھوں نے بغرض تجارت ہندوستان میں بود و باش اختیار کی تھی، شریکِ سلطنت کی حیثیت سے ملک کی سیاست اور نظم و نسق میں داخل ہوئے اور تھوڑے ہی دن میں اپنی حکمتِ عملی اور سیاسی بصیرت کی بنا پر اقتدارِ اعلیٰ کے مالک بن گئے۔

مغل سلطنت کے زوال کی یہ داستان جو شاہ عالم کے بعد ابو النصر معین الدین اکبر شاہ ثانی (۱۲۲۱ھ/ ۱۸۰۶ء تا ۱۲۵۳ھ/ ۱۸۳۷ء) اور ابو ظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ (۱۲۵۳ھ/ ۱۸۳۷ء تا ۱۲۷۳ھ/ ۱۸۵۷ء) کی پامال تمناؤں اور مجروح ولولوں کے خون سے رنگین ہو کر ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگِ آزادی کی صورت میں اپنے نقطۂ عروج تک پہنچی، درحقیقت پورے ملک کی سیاست و معیشت کے زوال کی داستان ہے۔ لیکن علوم و فنون اور تہذیب و معاشرت کے نقطۂ نظر سے اسے صرف دہلی کی تباہی کا المیہ کہا جا سکتا ہے۔ اس المیہ کا آغاز اگرچہ اورنگ زیب کی وفات (۱۱۱۸ھ/ ۱۷۰۷ء) کے فوراً بعد ہو چکا تھا لیکن محمد شاہ کے عہد تک اس نے اربابِ کمال کے لیے زیادہ مایوس کن صورت اختیار نہیں کی تھی۔ نو دس سال کے فرق سے نادر شاہ اور احمد شاہ کے تباہ کن حملوں کے باوجود تاریکیوں میں روشنی کی ایک جھلک باقی تھی۔ ملک کے خزانے خالی ہوتے ہوئے بھی اتنے خالی نہ تھے کہ اہلِ کمال نانِ شبینہ کے محتاج ہو جائیں اور کوئی

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیے "میر کی آپ بیتی" ص ۱۲۴ تا ۱۴۰

[2] نادراتِ شاہی۔ دیباچۂ مرتب ص ۱۶ و ۱۷

ان کی بات پوچھنے والا نہ ہو۔ محمد شاہ واقعی رنگیلا، شوقین مزاج اور آزاد طبیعت انسان تھا۔ اس نے اپنے جیتے جی فنونِ لطیفہ کی سرپرستی میں کوئی فرق نہ آنے دیا۔ شہر اُجڑا اُجڑا کر بستا رہا، دربار کی رونق کچھ دنوں کے لیے کم ہوتی، پھر بڑھ جاتی لیکن اس کے بعد یہ کیفیت قائم نہ رہ سکی۔ احمد شاہ کے دور میں ایک طرف تو اودھم بائی اور جاوید خاں خواجہ سرا کا عروج شریف اور معزز شہریوں کے لیے حد درجہ حوصلہ شکن اور صبر آزما ثابت ہوا اور دوسری طرف اقتدار سے محروم امرا کے باہمی اختلافات نے رفتہ رفتہ ایک مستقل دردِ سر کی صورت اختیار کر لی۔ بادشاہ کی دنیا و مافیہا سے بے خبری کا یہ عالم تھا کہ وہ دنوں حرم سرا سے جو تقریباً ایک میل تک پھیلی ہوئی تھی، باہر نہ نکلتا اور ہفتوں کسی مرد کی شکل اس کے سامنے نہ پڑتی تھی۔ حالات کی اس خرابی سے برداشتہ خاطر ہو کر بہت سے باکمال دہلی کو خیرباد کہہ گئے۔ اس کے بعد عالم گیر ثانی کے مختصر دورِ حکومت اور شاہ عالم کی فرمانروائی کے ابتدائی زمانے میں عماد الملک اور اس کے حلیفوں کے خلاف احمد شاہ ابدالی کی مکرر فوج کشی اہالیانِ شہر کی تباہی اور اہلِ ہنر کے نقلِ وطن کا سبب بنی۔

شاہ عالم نے اپنی بادشاہت کے ابتدائی چھ برس تسخیرِ بنگال کی کوشش میں مشرقی ہندوستان میں گذارے اور اس مہم میں ناکامی کے بعد تقریباً اتنے ہی عرصے شجاع الدولہ اور انگریزوں کی صواب دید کے مطابق وہ الٰہ آباد میں مقیم رہا۔ اس عرصے میں دہلی میں نجیب الدولہ نے بڑی جواں مردی اور بیدار مغزی کے ساتھ مدار المہامی کے فرائض انجام دیے۔ رجب ۱۱۸۴ھ/اکتوبر ۱۷۷۰ء میں نجیب الدولہ کا انتقال ہو گیا۔ اس کے سوا سال کے بعد ۲۹ رمضان ۱۱۸۵ھ/۲ جنوری ۱۷۷۲ء کو شاہ عالم پہلی مرتبہ سربراہِ مملکت کی حیثیت سے دہلی میں داخل ہوا[1] لیکن یہاں آتے ہی وہ طرح طرح کے مصائب اور پریشانیوں میں مبتلا ہو گیا۔ امرا کی جنگ زرگری کے نتیجے میں نجیب الدولہ کا بیٹا ضابطہ خاں جس نے اپنے باپ کی وفات کے بعد کاروبارِ سلطنت سنبھال لیا

---

[1] وقائع عالم شاہی ص ۷

تھا، پہلی فرصت میں برطرف کر دیا گیا۔ اس طرح روہیلوں میں جو سلطنتِ مغلیہ کے بہترین اور جاں باز محافظ ثابت ہوئے تھے، بددلی پھیل گئی اور وہ بادشاہ کے دشمن ہو گئے۔ یہ دشمنی سکرتال، بریلی و پیلی بھیت اور غوث گڑھ (ضلع سہارن پور) کے علاقوں میں یکے بعد دیگرے ۱۱۸۵ھ/۱۷۷۲ء، ۱۱۸۸ھ/۱۷۷۴ء اور ۱۱۹۱ھ/۱۷۷۷ء میں تین خون آشام اور خوفناک جنگوں کی صورت میں رونما ہوئی، جن میں میدانِ کارزار دراصل مرہٹوں اور شجاع الدولہ کے ہاتھ رہا اور شاہ عالم کو اپنی مفروضہ فتح یابی کی موہوم مسرت کے سوا اور کچھ نہ ملا۔ بلکہ بیرونی حملہ آوروں کی دستِ بُرد اور الٰہ آباد سے ترک قیام کی پاداش میں ۱۷۷۲ء/۱۱۸۶ھ میں کمپنی کی طرف سے سالانہ پنشن کی منسوخی کے بعد اس داخلی خلفشار کے باعث اقتصادی نظام کا شیرازہ کچھ اور بھی برہم ہو گیا اور ہر طرف قحط و افلاس کے مہیب سائے منڈلانے لگے۔ جنگی اخراجات کے مسلسل بوجھ، امرا کی بے دریغ لوٹ کھسوٹ اور زراعت و تجارت کے لیے حالات کی ناسازگاری کی وجہ سے شاہی خزانے کی رفتہ رفتہ یہ کیفیت ہوئی کہ ۱۷۷۹ء/۱۱۹۳ھ میں جب بادشاہ کی ماں لال کنور کا انتقال ہوا تو اس کے پاس اتنا سرمایہ بھی نہ تھا کہ اس کے لیے ایک نیا مقبرہ تعمیر کرا سکے۔ دہلی میں متعین مرہٹہ سفیر جولائی ۱۷۸۲ء/رجب، شعبان ۱۱۹۶ھ میں اس مفلوک الحالی کی روداد قلم بند کرتے ہوئے لکھتا ہے:

> "مرکزی حکومت میں بڑی ابتری ہے۔ خزانۂ عامرہ خالی ہے اور سپاہیوں کے پاس اشیائے خورد و نوش کی خریداری کے لیے روپیہ نہیں ہے۔ وزیر اعظم نجیب خاں کا ذاتی محافظ دستۂ فوج بھی بھوکوں مر رہا ہے اور گھوڑے ہاتھی چارہ نہ ملنے کی وجہ سے دم توڑ رہے ہیں۔"[1]

ظاہر ہے کہ یہ حالات علم و فن اور شعر و ادب کی سرپرستی کے لیے سازگار نہ تھے

---

[1] سید الطاف علی بریلوی کے مضمون "غلام قادر روہیلہ شہید" مشمولہ "بہادر شاہ ظفر" از امیر احمد علوی (ص ۲۸۲) کے حوالے سے

چنانچہ دہلی سے شرفا اور اہلِ علم کی مہاجرت کا جو سلسلہ محمد شاہ کی وفات کے بعد شروع ہوا تھا وہ شاہ عالم کے دور میں بھی جاری رہا اور آہستہ آہستہ مرزا مظہر، شاہ حاتم اور خواجہ میر درد جیسے چند قناعت پسند اور توکل شعار بزرگوں کے علاوہ جنھیں نہ دربار کے اعزاز واکرام سے سروکار تھا اور نہ دلی کی مفارقت ہی گوارا تھی، تقریباً تمام ہی بڑے ادیب اور شاعر دلی کے اُجڑے ہوئے بام و در پر حسرت سے نظر کرتے ہوئے اِدھر اُدھر منتشر ہو گئے۔ اس زمانے تک سلطنت کے روز افزوں انحطاط، امرا کی خستہ حالی اور اربابِ اختیار کی نااہلی و ناعاقبت اندیشی کے باعث دانشوروں اور فن کاروں کے ایک طبقے میں یہ احساس پیدا ہو چلا تھا کہ کس مپرسی اور ناقدری کے اس دور میں زندگی کا سفر جاری رکھنے کے لیے درباروں اور ڈیوڑھیوں کی طرف دیکھنے کی بجائے اپنی قوتِ بازو پر اعتماد کی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ پڑھے لکھے عوام بھی اپنا غم غلط کرنے اور ان حادثات کے اثرات جو ان کی زندگی کا معمول بن گئے تھے، ذہن سے محو کرتے رہنے کے لیے ایک قسم کی ہنگامہ آرائی اور اس کے نتیجے میں یک گونہ بے خودی کے متلاشی تھے۔ اس لیے شعر و سخن کی محفلیں زیادہ عرصے تک سوگوار نہ رہ سکیں۔ جنگِ سکرتال میں ضابطہ خاں کی شکست (یکم شوال ۱۱۸۵ھ/۷ جنوری ۱۷۷۲ء) کے تقریباً ایک سال کے بعد مصحفی دہلی آئے تو انھوں نے تجارت کو ذریعۂ معاش بنایا[1] اور اپنے مکان پر ایک مشاعرے کی طرح ڈالی جس کے انتظام و اہتمام میں وہ بقولِ خود اکثر لوگوں سے سبقت لے گئے۔[2] اس مشاعرے میں فارسی و اردو کے سبھی شاعر نہایت ذوق و شوق کے ساتھ شرکت کرتے تھے لیکن فارسی کی قدر کم ہو چلی تھی اس لیے مصحفی اپنے الفاظ میں "باوجود مہارتِ کلی در زبانِ فارسی بہ مقتضائے رواج زمانہ خود را در سلکِ ریختہ گویان کشیدہ صرفِ اوقاتِ عزیز در ریختہ گوئی می کردند۔"[3] اس طرح بارہ تیرہ سال تک وہ بڑی

---

[1] تذکرہ شعرائے اردو طبع ثانی ص ۱۶۸

[2] و [3] عقدِ ثریا ص ۲

سرگرمی اور تن دہی کے ساتھ شعر و ادب کی خدمت کرتے رہے۔ ۱۱۹۴ھ/۱۷۸۰ء میں انشا بھی اپنے والد میر ماشاء اللہ خاں مصدر کے ہمراہ دہلی آ گئے تھے[1]۔ ان کا اصل ذریعۂ معاش طبابت تھا۔ اس لیے انھیں بھی وہاں گذرِ اوقات کے لیے کسی صاحبِ دولت کا منھ نہ دیکھنا پڑا۔ انشا کی آمد سے دہلی کی ادبی محفلوں میں جان پڑ گئی۔ وہ اپنی ذات سے ایک انجمن تھے۔ ہنگامہ پسندی اور معرکہ آرائی ان کی طبیعت کا خاصہ تھی۔ چنانچہ اسی زمانے میں نواب امین الدولہ، معین الملک، مرزا مینڈو امیر کے مشاعرے میں وہ مشہورِ معرکہ پیش آیا جس میں انھوں نے تنِ تنہا مرزا عظیم بیگ عظیم، نثار اللہ خاں فراق اور قدرت اللہ قاسم کے اعتراضات و ہجویات کے جواب دیے اور اپنی قادر الکلامی اور ہمہ دانی کا لوہا منوا لیا۔ مختصر یہ کہ بارھویں صدی ہجری کے آخری چند برسوں میں عام سیاسی اور معاشی ابتری کے باوجود دلّی کے ادبی و شعری ماحول میں ایک بار پھر زندگی کے آثار پیدا ہو چلے تھے لیکن افسردگی و پژمردگی کے وسیع تر پس منظر میں نیم بیداری کی یہ کیفیت نہ تو عام ہوئی تھی اور نہ کسی سنجیدہ کام کی متحمل ہو سکتی تھی۔ اس لیے ۱۱۷۶ھ/۶۳-۱۷۶۲ء میں "مخزنِ نکات" کی تکمیل کے بعد سے آئندہ صدی کے چند ابتدائی برسوں تک دہلی میں شعرائے اردو کے تذکروں کی ترتیب کی طرف کوئی توجہ نہ دی جا سکی اور اگر سید امام الدین خاں مظلوم کے "تذکرۂ مختصرِ معاصرین" کی طرح کا کوئی تذکرہ معرضِ وجود میں آیا بھی تو وہ عام اہلِ علم کی نگاہوں سے پوشیدہ یا ان کی توجہ سے محروم رہا۔ تیس بتیس سال کی اس طویل خاموشی کے بعد تیرھویں صدی ہجری کے اوائل میں پھر کچھ لوگ اس صنف کی طرف مائل ہوئے لیکن اس سے پہلے کہ ہم تذکرہ نگاروں کی اس نژادِ نو کے کارناموں پر نظر ڈالیں، ان تذکروں کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے جو اس درمیانی مدت میں دہلی سے دور دوسرے ادبی مراکز کی سرگرمیوں کے نتیجے میں منظرِ عام پر آ چکے تھے۔

---

[1] مسرت افزا ص ۲۱۲

دیگر مراکز

دہلی کا سنگھار لٹنے کے بعد جو نئے سیاسی و تہذیبی مراکز قائم ہوئے ان میں تذکرہ نگاری کے فروغ کے نقطۂ نظر سے دکن میں اورنگ آباد اور حیدرآباد، اودھ میں فیض آباد اور لکھنؤ اور مشرقی ہندوستان میں عظیم آباد کا خاص مقام ہے۔ اورنگ آباد فتح اورنگ زیب کے بعد سے دکن کی علمی و ادبی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا تھا۔ محمد شاہ کے عہد میں جب نظام الملک آصف جاہ ۱۱۳۶ھ/۱۷۲۴ء میں دوبارہ دکن کے صوبے دار مقرر ہوئے تو دہلی سے بہت سے اربابِ کمال کو اپنے ساتھ لیتے گئے۔ اس کے بعد بھی مہاجرت کا یہ سلسلہ ایک عرصے تک قائم رہا[1]۔ رفتہ رفتہ نظام الملک نے ایک خود مختار حکمراں کی حیثیت حاصل کر لی اور اورنگ آباد کی سیاسی و تہذیبی مرکزیت مستحکم ہو گئی۔ ۱۱۷۳ھ/۱۷۵۹-۶۰ء میں آصف جاہِ ثانی برسرِ اقتدار آئے تو انھوں نے اورنگ آباد کے بجائے حیدرآباد کو پایۂ تخت بنا لیا۔ اس تبدیلی کے زیرِ اثر اورنگ آباد، برہان پور اور سلطنت کے دوسرے حصّوں سے بہت سے ادیب اور شاعر ترکِ وطن کر کے حیدرآباد چلے آئے۔ دکن کی تہذیب اور سیاست کے اس نئے مرکز نے بعد کے زمانے میں ادبی و لسانی خدمات کی جو شان دار مثال قائم کی، اس کے اعتراف کے طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اپنے دورِ اقبال میں دہلی و لکھنؤ کے بعد اردو کا اگر کوئی گھر تھا تو وہ حیدرآباد تھا۔

سلطنت اودھ کے بانی اگرچہ سعادت خاں برہان الملک کہے جاتے ہیں جو ۱۱۳۴ھ/۱۷۲۲ء میں محمد شاہ کی طرف سے صوبہ دار مقرر ہوئے تھے۔ لیکن اس علاقے میں ایک آزاد اور خود مختار حکومت کے قیام کی تاریخ دراصل نواب وزیر شجاع الدّولہ کے عہد (۱۱۶۷ھ/۱۷۵۴ء تا ۱۱۸۸ھ/۱۷۷۵ء) سے شروع ہوتی ہے جب کہ ملکی سیاست میں انگریزوں کے اثر و رسوخ میں روز افزوں اضافے اور مغل اقتدار کے

---

[1] دکن میں اردو ص ۲۴۳

مسلسل انحطاط کی وجہ سے مرکز سے ریاست کا تعلق محض برائے نام رہ گیا تھا۔ شجاع الدولہ علم وفن کے قدر شناس اور حد درجہ فیاض اور کشادہ دست تھے۔ ریاست میں روپے کی بھی کمی نہ تھی۔ اس لیے فیض آباد میں ان کا دربار فنونِ لطیفہ کے ماہرین اور ادیبوں اور شاعروں کا ملجا وماوٰی بنا رہا۔ ان کے دور میں تباہ حال دہلی سے اربابِ فضل وکمال جوق در جوق فیض آباد اور لکھنؤ پہنچے اور عمر بھر کے لیے وہیں کے ہو رہے۔ خان آرزو، میر غلام حسین ضاحک، میر حسن، میرزا محمد رفیع سودا اور میر سوز کے اودھ میں وُرود کا بھی یہی زمانہ ہے۔ قلندر بخش جرأت بھی غالباً اسی زمانے میں اپنے والدین کے ہمراہ یہاں نقلِ سکونت کر آئے تھے۔

شجاع الدولہ کے بعد آصف الدولہ مسند آرائے وزارت ہوئے۔ ان کے عہد میں لکھنؤ مستقرِ حکومت بن گیا (۱۱۸۹ھ/۱۷۷۶ء) آصف الدولہ نے فنونِ لطیفہ اور علم وادب سے دل چسپی کی سابقہ روایات کو نہ صرف برقرار رکھا بلکہ ان کے دور میں انھیں اور زیادہ فروغ حاصل ہوا۔ وہ صرف ادب وشعر کے قدرداں ہی نہ تھے، سخن گو اور سخن شناس بھی تھے۔ سودا کی وفات کے بعد ۱۱۹۶ھ/۱۷۸۲ء کے اوائل میں انھوں نے میر کو دہلی سے طلب کیا[1] اور جب وہ لکھنؤ پہنچے تو ان کی قدر ومنزلت میں کوئی کسر باقی نہ چھوڑی۔ میر کی آمد کے چند دنوں بعد ۱۱۹۸ھ/۱۷۸۴ء میں مصحفی بھی مستقلاً لکھنؤ چلے آئے[2]۔ اس زمانے تک اگرچہ خان آرزو، میرزا سودا اور میر غلام حسین ضاحک دنیا سے رخصت ہو چکے تھے اور ان کے ساتھ وہ ہنگامے بھی سرد ہو گئے تھے جن کا مرکز ومحور میرزا سودا اور میر ضاحک کی شخصیات تھیں، لیکن سوز اور جرأت کی موجودگی اور یکے بعد دیگرے میر اور مصحفی کی آمد نے اس بزم کو سونا نہ ہونے دیا۔ ان شعرا کی بدولت لکھنؤ میں اردو شاعری کا ذوق اتنا عام ہوا کہ پروفیسر عبدالقادر سروری

---

[1] دلی کالج میگزین میر نمبر ص ۳۹

[2] عقد ثریا ص ۱۴

کے الفاظ میں "رسیلی اودھی بولی کی اس سرزمین سے کتنے ہی اچھے اچھے سخنور اٹھے اور رفتہ رفتہ اردو شاعری اور ادب کے مرکزوں میں لکھنؤ کا مقام متعین ہوگیا"[1]

آصف الدولہ کے درِ دولت کے علاوہ اس دور کے لکھنؤ میں اربابِ کمال کی کچھ اور پناہ گاہیں بھی تھیں جہاں انھیں کمال فن کی داد بھی ملتی اور ان کے سرمایۂ فکر پر زر و جواہر بھی نثار کیے جاتے۔ میر حسن نے نواب سالار جنگ کے بیٹے میرزا نوازش علی خاں سے اپنی وابستگی اور اس کے نتیجے میں فکرِ معاش سے بے نیازی کا ذکر کیا ہے[2]۔ ۱۱۹۸ھ/۱۷۸۴ء میں صاحبِ عالم میرزا جہاں دار شاہ جواں بخت امیر الامرا افراسیاب خاں کی سخت گیریوں سے تنگ آکر وارن ہسٹنگز سے ملاقات کے لیے چھپتے چھپاتے لکھنؤ پہنچے۔ (۱۸ جمادی الثانیہ ۱۱۹۸ھ[3]/۹ مئی ۱۷۸۴ء) اور عشرۂ دوم ماہ ذی الحجہ ۱۲۰۰ھ/اکتوبر ۱۷۸۶ء تک وہاں مقیم رہے[4]، تو ان کی بارگاہ میں بھی شاعروں کو عزِ قبول اور قدر و منزلت کا شرف حاصل رہا۔ میرزا علی لطف کے بیان کے مطابق "اس شہزادۂ عالی تبار کی طبیعت شعر کی طرف اس قدر آئی تھی کہ مہینے میں دو مرتبہ بنا مشاعرے کی اپنے دولت خانے میں ٹھہرائی تھی۔ شعرائے باوقار کو اپنے چوبدار بھیج کر مشاعرے کے دن بلواتے اور ہر ایک شخص سے نہایت الطاف اور عنایت کے ساتھ گرم جوشی فرماتے"[5]

عظیم آباد پایۂ تخت سے دوری کی بنا پر اس دورِ ابتلا میں آفات ارضی و سماوی سے نسبتاً محفوظ رہا۔ دکن اور اودھ کی طرح یہاں بھی شعر و سخن کے کئی قدر شناس موجود تھے، اس لیے دہلی سے اجڑنے والے اربابِ کمال معاشی آسودگی اور ذہنی سکون کی

---

[1] اردو کی ادبی تاریخ ص ۱۹۹

[2] تذکرہ شعرائے اردو طبع ثانی ص ۵۴

[3] وقائع عالم شاہی ص ۵۴

[4] تاریخِ اودھ از نجم الغنی جلد سوم ص ۲۶۵

[5] گلشن ہند طبع ثانی ص ۸۹

تلاش میں برابر ادھر کا رخ کرتے اور اس سرزمین پر فکر و خیال کی نئی بستیاں بساتے رہے۔ میر محمد باقر حزیں، محمد فقیہ دردمند، میرزا گھسیٹا عشق، محمد علی عرف میرزا بھجو فدوی، اشرف علی خاں فغاں اور میر ضیاء الدین ضیا نے دہلی کی تباہی کے بعد یکے بعد دیگرے اسی گوشۂ عافیت میں پناہ لی اور ساری عمر یہیں گذار دی۔ خود صوبۂ عظیم آباد کی خاک سے اس زمانے میں میر محمد رضا جرأت، میر غلام حسین شورش، علی ابراہیم خلیل، ہیبت قلی خاں حسرت، خواجہ امین الدین امین، محمد عابد دل، محمد روشن جوشش اور شیخ غلام علی راسخ جیسے باصلاحیت فن کار پیدا ہوئے جنھوں نے دہلی سے آئے ہوئے اساتذہ کے فیضانِ صحبت و تربیت سے نام پیدا کیا اور ناقابلِ فراموش کارنامے اپنی یادگار چھوڑے۔ میر غلام حسین شورش اپنے تذکرے میں اس دور کے عظیم آباد کی سرگرمیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"بعد نادر شاہی میر باقر (حزیں) از شاہجہان آباد تشریف بہ عظیم آباد آوردہ۔ گفتگو و شعر و شاعری بطورِ میرزا موصوف رواج یافتہ .... (بعد ازاں) ..... خمسۂ میرزا محمد رفیع سودا اسلمہ اللہ تعالیٰ کہ ایں مصرعِ یقیں غفرلہٗ "کیا کام کیا دل نے دیوانے کو کیا کہیے" مصرعِ پنجم او بودہ، شہرت دریں شہر یافتہ۔ بعدہ غزلِ میرزا و اشعارِ حضرت خواجہ میر درد وغیرہ از دہلی رسیدہ و شہرت یافتہ و طرزِ سخن بطورِ دیگر گردیدہ۔

حسب اتفاق در صوبہ داری محمد کاظم خاں بہادر احترام الدولہ بصلاحِ دوستان و آشنایان محفلِ مشاعرہ بروز جمعہ قرار یافت۔ میر غلام علی اظہر گفت کہ شاہ رکن الدین عرف حضرت میرزا گھسیٹا صاحب مدظلہ العالی از مرشد آباد ترکِ روزگار نمودہ نیز بہ عظیم آباد تشریف آوردہ اند، اگر در محفلِ مشاعرہ تشریف آرند، احسن است۔ احقر.... ہمراہ میر مذکور رفتہ ملازمت نمودہ متصدیِ خدمتِ گرامی شد از راہِ نوازش قبول فرمودند و تا محفل مشاعرہ کہ کم از یک سال نماندہ، تشریف مع میر محمد امین صاحب دیوانہ غفرلہٗ ارزانی می فرمودند۔" (تذکرۂ شورش مرتبہ ڈاکٹر محمود الٰہی ص ۵۴ و ۵۵)

جنگِ بکسر کے بعد شاہ عالم اور انگریزوں کے درمیان ۱۶ر اگست ۱۷۶۵ء/۲۸ر صفر ۱۱۷۹ھ کے معاہدے کی رو سے عظیم آباد سلطنتِ مغلیہ کے حدودِ اختیار سے نکل کر ایسٹ انڈیا کمپنی کے مقبوضات میں شامل ہوگیا۔ اس سیاسی و انتظامی تبدیلی کے روبہ عمل آتے ہی امن و عافیت کی بنیادیں کچھ اور مستحکم ہوگئیں۔ صاحبانِ علم کو ان کی لیاقت اور استعداد کے بموجب عدالتی اور دفتری ملازمتیں ملنے لگیں اور تصنیف و تالیف کے کام سے دل چسپی رکھنے والوں کو خدمتِ لوح و قلم کے لیے زیادہ سازگار فضا میسر آگئی۔ عظیم آباد کی ادبی مرکزیت دراصل بعد کے اس دور کے اکتسابات ہی کی رہینِ منت ہے۔

یہاں ہم نے دکن، اودھ اور عظیم آباد کے جس ادبی ماحول کی تصویر پیش کی ہے، بارھویں صدی ہجری کے ربعِ آخر میں تذکرہ نگاری کا فروغ کلیتہً اسی سے وابستہ ہے۔ ابتدائی دور کے تذکروں کے بعد جو تھوڑے بہت فرق کے ساتھ تقریباً ایک ہی زمانے میں لکھے گئے، جس پہلے تذکرے تک ہماری رسائی ہوئی ہے، وہ لالہ لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی کا "چمنستانِ شعرا" ہے۔ یہ تذکرہ ۱۱۷۵ھ/۶۲-۱۷۶۱ء میں اورنگ آباد میں مرتب ہوا ہے۔ اس زمانے میں میرؔ اور گردیزی کے تذکرے اورنگ آباد تک پہنچ چکے تھے اور اقصائے دکن میں ان کی شہرت عام ہوتی جارہی تھی[1]۔ شفیقؔ نے انھی تذکروں کی مقبولیت سے متاثر ہوکر تذکرہ نگاری کے لیے قلم اٹھایا۔ ان کے نزدیک ان تذکروں میں کئی خامیاں تھیں، اس لیے انھوں نے اپنے فرائض کو زیادہ تندہی کے ساتھ انجام دینے کی کوشش کی اور وہ اس میں بقدرِ استطاعت کامیاب بھی ہوئے۔ انھوں نے میرؔ اور گردیزی کے نقل کیے ہوئے حالات اور اشعار کے علاوہ دوسرے ذرائع سے بھی مختلف شاعروں کا کلام اور بہت سے ایسے شعرا کے حالات جمع کیے جن کا ان تذکروں میں ذکر نہیں یا جن کے بارے میں انتہائی مختصر معلومات فراہم کی گئی ہے۔ شفیقؔ کو فنِ تاریخ گوئی سے بھی کافی دل چسپی تھی، اس لیے انھیں جن شاعروں کے سنینِ وفات کا علم ہو سکا،

---

[1] "چمنستانِ شعرا" ص ۳

ان کے انتقال پر اپنی اور دوسرے شعرا کی کہی ہوئی تاریخیں بھی تذکرے میں درج کرتے رہے۔ اس کے علاوہ بھی موقع بموقع دوسرے اہم واقعات کے سنین اور تاریخوں کا تعین کر کے انھوں نے اردو تذکرہ نویسی کے فن کو ایک ایسے عنصر سے روشناس کرایا جس کی طرف اس سے پہلے کوئی خاص توجہ نہیں دی گئی تھی۔

"چمنستانِ شعرا" کے بعد اس دور کے دکنی تذکروں میں "بہار و خزاں" اور "گل عجائب" کے نام آتے ہیں۔ "بہار و خزاں" کے مولف بہاء الدین حسین خاں عروج بھی اورنگ آباد ہی کے رہنے والے تھے۔ یہ تذکرہ "گل عجائب" سے قبل مرتب ہو چکا تھا۔ چند سال پہلے تک اس کا ایک ناقص و بوسیدہ و کرم خوردہ نسخہ کتب خانۂ آصفیہ، حیدر آباد (دکن) میں محفوظ تھا لیکن ایک اطلاع کے مطابق اب ضائع ہو چکا ہے[1]۔ پروفیسر یوسف سرمست کی مرتب کی ہوئی فہرست سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولف نے اس تذکرے میں کم از کم اکیاسی (۸۱) شاعروں کے حالات و اشعار درج کیے تھے[2]۔ "گلِ عجائب" اسد علی خاں تمنا اورنگ آبادی کی تالیف ہے۔ یہ تذکرہ ۱۱۸۳ھ/۱۷۶۹ء اور ۱۲۰۰ھ/۱۷۸۶ء کے درمیان مرتب ہوا ہے لیکن مولف کے ایک قطعۂ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا نقشِ اوّل ۱۱۹۲ھ/۱۷۷۸ء میں تیار ہو چکا تھا۔ شفیق کی طرح تمنا نے بھی جا بجا سنین کے حوالے دیے ہیں اور زیادہ سے زیادہ واقعاتِ زندگی کے انضباط کی کوشش کی ہے۔ اس طرح اُس معیار کو قائم رکھنے میں ان کا نمایاں حصہ ہے جو "چمنستانِ شعرا" کی ترتیب کے بعد پہلی مرتبہ سامنے آیا تھا۔

جس زمانے میں لچھمی نرائن شفیق اورنگ آباد میں "چمنستان شعرا" کی تالیف میں مصروف تھے، اسی زمانے میں میر غلام حسین شورش، میرزا گھسیٹا عشق کے

---

[1] بحوالہ "کتابیاتِ تحقیق" از ڈاکٹر گیان چند مشمولہ دو ماہی "اکادمی" لکھنؤ شمارہ جولائی تا اکتوبر ۱۹۹۰ء ص ۱۵

[2] نگارِ پاکستان "تذکروں کا تذکرہ نمبر" ص ۳۲۹

ایما پر عظیم آباد میں شعرائے اردو کا ایک تذکرہ ترتیب دے رہے تھے۔ عشقؔ میرؔ کا تذکرہ دیکھ چکے تھے اور شفیقؔ کی طرح انھیں بھی اس میں بہت سی خامیاں اور فروگذاشتیں نظر آئی تھیں، اس لیے انھوں نے ایک زیادہ جامع اور بہتر تذکرے کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے شورشؔ کو اس کام کے لیے آمادہ کیا تھا۔ شورشؔ نے اس تذکرے کی ترتیب پر تقریباً ۱۵-۱۶ سال صرف کیے۔ امراللہ آبادی کے بیان کے مطابق انھیں ۱۱۹۱ھ/ (۱۷۷۷ء) میں اس کام سے فراغت ہوگئی تھی[1]، لیکن تذکرے کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ۱۱۹۵ھ/ ۱۷۸۱ء میں اپنی وفات کے وقت تک اس میں برابر اضافے اور ترمیمیں کرتے رہے۔ معیار اور قدر و قیمت کے لحاظ سے یہ تذکرہ "چمنستانِ شعرا" کے پائے تک نہیں پہنچتا تاہم "نکات الشعرا" اور "تذکرۂ گردیزی" سے جو اس کی تالیف کے دوران مولف کے پیشِ نظر رہے ہیں، بہرحال بہتر ہے۔ جو خصوصیت اسے ان دونوں تذکروں سے ممتاز کرتی ہے وہ اس کے انتخاب کی جامعیت ہے۔ شورشؔ نے بیشتر معروف اور ممتاز شعرا کے زیادہ سے زیادہ منتخب اور بہترین اشعار تذکرے کے اوراق میں محفوظ کر دینے کی کوشش کی ہے۔ بعض اوقات حالاتِ زندگی کے بیان میں بھی انھوں نے کافی تفصیل سے کام لیا ہے۔ کہیں کہیں عام واقعات کے سلسلے میں سنین کے حوالے اور وفات کی تاریخیں بھی مل جاتی ہیں اور یہ سب فنّی نقطۂ نظر سے تذکرہ نگاری کے ارتقا کی علامات ہیں۔

تذکرۂ شورشؔ کی تالیف کے بعد ۱۱۹۳ھ/ ۱۷۷۹ء میں ابوالحسن امراللہ آبادی نے اپنے وطن سے کلکتے کی طرف سفر کرتے ہوئے عظیم آباد کے مختصر وقفۂ قیام کے دوران وہاں کی فضائے شعری سے متاثر ہو کر اپنے ذہن میں "مسرت افزا" کا خاکہ تیار کیا اور منزلِ مقصود (کلکتہ) تک پہنچنے کا انتظار کیے بغیر اثنائے سفر ہی میں اس کی ترتیب شروع کر دی۔ اس طرح یہ تذکرہ اگرچہ مؤلف کے عظیم آباد سے چلے جانے کے بعد مرتب ہوا تاہم اس کی ترتیب میں وہاں کی ادبی فضا کا جو دخل ہے، اس کی بنا پر ہم اسے شعر و ادب کے

---

[1] مسرت افزا ص ۱۱۲

اس مرکز سے متعلق تالیفات کے زمرے سے علٰحدہ نہیں کر سکتے۔ اس تذکرے میں مولّف کا اندازِ تعارف بڑی حد تک مورّخانہ رہا ہے۔ انھوں نے نہایت کثرت سے اہم واقعات کے سنین اور تاریخوں کے حوالے دیے ہیں چنانچہ ان کے بیانات سے خاص خاص شعرا کے حالاتِ زندگی کی تحقیق و دریافت میں جس قدر مدد ملتی ہے، اتنی اس دور کے کسی دوسرے تذکرے سے نہیں ملتی۔

عظیم آباد سے متعلق اس زمانے کا تیسرا اور آخری تذکرہ علی ابراہیم خاں خلیل کا "گلزارِ ابراہیم" ہے۔ یہ تذکرہ ۱۱۹۰ھ/۱۷۷۶ء اور ۱۱۹۹ھ/۱۷۸۵ء کے درمیانی عرصے کی تالیف ہے۔ خلیل موضع شیخ پور نواحِ عظیم آباد میں پیدا ہوئے[1] لیکن ان کی عمر کا بیشتر حصہ وطن سے دور مرشد آباد اور بنارس میں بسر ہوا۔ تذکرے کے آغاز کے وقت وہ مرشد آباد میں مقیم تھے اور بے روزگاری کے سبب خانہ نشینی کی زندگی گذار رہے تھے، لیکن اختتام سے چار برس قبل ۱۱۹۵ھ/۱۷۸۱ء میں انھیں گورنر جنرل وارن ہسٹنگز کی عنایت سے بنارس کی مجسٹریٹی مل گئی تھی[2] طبعًا ان کا رجحان تاریخ نویسی کی طرف تھا۔ اس موضوع سے متعلق انھوں نے راجہ چیت سنگھ والیِ بنارس کی بغاوت کے حالات اور "وقائعِ جنگِ مرہٹہ" پر مشتمل دو مستقل کتابیں بھی تصنیف کی ہیں۔ "گلزارِ ابراہیم" میں یہی تاریخی رجحان اکثر شعرا کے حالات کی تحریر کے زمانے اور اس زمانے میں ان کی جائے قیام، طرزِ بود و باش اور سلسلۂ ملازمت کے بیان کی صورت میں نمایاں ہوا ہے۔ ایک مختصر اور مخصوص دائرے میں محدود ہونے کے باوجود تاریخِ ادب میں اس قسم کے اندراجات کی بھی بڑی اہمیت ہے۔ غرض کہ اس پچیس سالہ دور میں دکن کی طرح عظیم آباد کے ادبی ماحول اور اس کے دائرہ اثر میں بھی تذکرہ نگاری کا فن تاریخی شعور سے آشنا ہوا اور اس کی ترقی کے راستے ہموار ہوتے رہے۔

حدودِ اودھ میں سب سے پہلا تذکرہ میر حسن نے لکھا ہے جس کے نقشِ اوّل کا سالِ تکمیل ۱۱۸۹ھ/۱۷۷۵ء ہے۔ اس تذکرے کی ترتیب میں انھوں نے میر اور قائم کے

---

[1] و [2] مسرت افزا ص ۷۲ و ۷۳

تذکروں سے مدد لی ہے۔ قائم نے اپنے تذکرے میں تمام شعرا کو بہ اختیارِ زمانہ متقدمین، متوسطین اور متاخرین کے علٰحدہ علٰحدہ طبقات میں تقسیم کر کے جس تاریخی طرزِ ترتیب کی بنیاد رکھی تھی، میر حسن نے اس پر یہ اضافہ کیا کہ تمام شاعروں کو ان کے تخلص کے حروفِ اوّل کی رعایت سے متعلقہ ردیف کے تحت جگہ دے کر ہر ردیف کے ذیل میں تین طبقات قائم کر دیے تاکہ قارئین کو کسی شخص کے حالات و کلام کی تلاش میں دقت پیش نہ آئے۔ لیکن جہاں تک شفیق، امراللہ یا خلیل کے طرزِ پر مورّخانہ زاویۂ نگاہ سے حالات نویسی کا تعلق ہے، وہ تذکرہ نگاری کے فن کو کوئی خاص ترقی نہ دے پائے۔ البتہ شاعر کے ماحول اور سیرت و شخصیت کی تصویر کشی میں میر کے بعد ان کا پایہ سب سے بلند ہے۔ کلام کے محاسن و معائب اور زبان و بیان کے رموز و نکات پر بعض تبصرے بھی ان کی سخن شناسی اور ناقدانہ بصیرت کے اعتراف پر مجبور کرتے ہیں۔ اس میدان میں کوئی ہم عصر تذکرہ نگار ان کا حریف نہیں۔ اس کے علاوہ غیر جانب داری، صاف گوئی، خلوص رائے اور اعترافِ کمال کے معاملے میں وہ میر پر بھی سبقت لے گئے ہیں۔

اودھ کا دوسرا تذکرہ میرزا کاظم مبتلا کا "گلشنِ سخن" ہے۔ مولف کے کہے ہوئے قطعۂ تاریخ کی رو سے اس کا سالِ ترتیب ۱۱۹۴ھ/۱۷۸۰ء قرار پاتا ہے متن کے درمیان میں بھی جا بجا سالِ رواں کے طور پر اسی سنہ کے حوالے دیے گئے ہیں لیکن چونکہ اس تذکرے کے بیشتر بیانات "گلزارِ ابراہیم" مرتبہ ۱۱۹۸ھ/۱۷۸۴ء پر مبنی یا اس سے مستفاد معلوم ہوتے ہیں اس لیے بہ گمانِ غالب یہ ۱۱۹۸ھ/۱۷۸۴ء میں "گلزارِ ابراہیم" کے منظرِ عام پر آنے کے بعد مرتب ہوا ہوگا۔ بیانِ واقعات کے سلسلے میں بکثرت ۱۱۹۴ھ کے حوالے بظاہر اصل حقیقت کو چھپانے اور "گلزارِ ابراہیم" پر اپنے تذکرے کا تقدّم ثابت کرنے کے لیے دیے گئے ہیں۔ بحیثیت شاعر علی ابراہیم کے وجود سے مولف کی بے خبری بھی بظاہر اخفائے حال کی اسی شعوری کوشش کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے۔ اس کے باوجود مبتلا کی کوششیں اس لحاظ سے قابلِ قدر ہیں کہ انھوں نے عام طور پر انتخابِ کلام کے لیے اصل دواوین کے مطالعے پر کافی توجہ دی ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے

مجملاً شعرا کے نتائجِ افکار کی مجموعی کیفیت پر رائے زنی کے پہلو بہ پہلو تعداد اشعار کی صورت میں ان کی کمیت کا بھی تعین کر دیا ہے۔

میرزا محمد رفیع سوداؔ نے بھی ہمارے اندازے کے مطابق اپنا تذکرہ غالباً اسی زمانے میں مرتب کیا تھا، لیکن اس کی تفصیلات ہمارے علم سے باہر ہیں۔ ان تذکروں کے علاوہ ۱۱۷۵ھ/۱۷۶۱ء اور ۱۲۰۰ھ/۱۷۸۶ء کے درمیان لکھنؤ یا فیض آباد میں کسی اور تذکرے کی ترتیب کا پتا نہیں چلتا البتہ امراللہ الٰہ آبادی نے اپنے تذکرے میں مضافاتِ اودھ میں قصبہ زمانیہ ضلع غازی پور کے ایک شاعر شیخ احمد وارث احمدؔی کے "تذکرہ شعرائے ہندی ریختہ" کا ذکر کیا ہے[1]۔ یہ تذکرہ بھی نایاب ہے۔ اس لیے نہیں کہا جا سکتا کہ یہ کس سنہ میں مرتب ہوا اور اس کی نوعیت کیا تھی۔

رام پور

بارھویں صدی ہجری کے اس ربعِ آخر میں شمالی ہند میں ایک اور تذکرہ بھی لکھا گیا۔ یہ تذکرہ جس کا نام "طبقات الشعرا" ہے، مولوی قدرت اللہ شوقؔ ساکن موضع موی من توابعِ سنبھل، ضلع مراد آباد کی تالیف ہے اور ۱۱۸۸ھ/۱۷۷۴ء میں مرتب ہوا ہے۔ شوقؔ نے نواب فیض اللہ خاں کے دورِ حکومت (۱۱۸۸ھ/۱۷۷۴ء تا ۱۲۰۸ھ/۱۷۹۴ء) سے ۱۲۲۴ھ/۱۸۰۹ء میں انتقال کے وقت تک اپنی زندگی کا بڑا حصہ رام پور میں گذارا لیکن اس تذکرے کی ترتیب کے وقت وہ کس جگہ قیام پذیر تھے، یہ بات واضح طور پر ہمارے علم میں نہیں۔ مصحفی نے جنگِ سکرتال (۱۱۸۵ھ/۱۷۷۲ء) سے کچھ قبل ٹانڈہ (ضلع رام پور) میں قائم چاندپوری کے ہاں ایک مرتبہ ان سے اپنی ملاقات کا ذکر کیا ہے[2]۔ ٹانڈے میں نواب محمد یار خاں امیرؔ خلفِ نواب علی محمد خاں کی سرکار سے اس زمانے میں مصحفی، قائم چاندپوری،

---

[1] مسرت افزا ص ۲۷ و ۱۱۵

[2] تذکرہ ہندی ص ۱۷۵

فدوی لاہوری اور دوسرے کئی شاعر وابستہ تھے۔ خود شوق بھی ایک بار ان کی خدمت میں باریاب ہو کر ان کی شفقت و عنایت سے مستفیض اور کلام سے محظوظ ہو چکے تھے[1]

مصحفی کے بیان کے مطابق جنگِ سکرتال کے بعد جب یہ مجلس برہم ہوئی اور رام پور میں امیر کے برادرِ اکبر نواب فیض اللہ خاں کا ستارہ عروج پر آیا تو قائم رام پور چلے گئے[2] خیال ہے کہ شوق نے بھی ٹانڈہ میں مختصر قیام کے بعد اسی زمانے میں رام پور میں سکونت اختیار کر لی ہوگی۔ ہمارے اس قیاس کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ انھوں نے زیرِ بحث تذکرے کے طبقۂ چہارم میں رام پور کے شاہی خاندان سے تعلق رکھنے والے شعرا کے حالات "ذکر بعضے امرائے افغانانِ ایں دیار" کے عنوان سے تحریر کیے ہیں۔ اوّلین ترتیب کے بعد تیرھویں صدی ہجری کے عشرۂ اوّل میں شوق نے "طبقات الشعرا" پر نظرِ ثانی کی۔ اس زمانے میں وہ بہر حال ریاست رام پور سے توسل پیدا کر چکے تھے۔ رام پور جس نے نواب کلب علی خاں کے عہد (۱۲۸۱ھ/۱۸۶۵ء تا ۱۳۰۴ھ/۱۸۸۷ء) میں ہندوستان کے سب سے زیادہ مستحکم اور توانا ادبی مرکز کی حیثیت حاصل کر لی تھی، اِس زمانے میں اپنی تعمیر و تشکیل کے ابتدائی مرحلے میں تھا۔ اس لحاظ سے یہ تذکرہ رام پور کے دبستانِ شعر و ادب کا پہلا وقیع اور قابلِ ذکر کارنامہ ہے۔

شوق نے اس تذکرے میں شعرا کو ان کی تاریخی اہمیت، اندازِ کلام اور معیارِ فن کے لحاظ سے مختلف طبقات میں تقسیم کر کے ایک نئے طرزِ ترتیب کی بنیاد رکھی ہے، جس کی روشنی میں اردو شاعری کے عہد بہ عہد ارتقا، مختلف ادوار کی فنی و لسانی خصوصیات اور پست و بلند کے رائج الوقت معیاروں کا مطالعہ دوسرے تذکروں کی بہ نسبت زیادہ بہتر طور پر کیا جا سکتا ہے۔ حالات نویسی کے ضمن میں اگرچہ انھوں نے دو ایک مقامات کے علاوہ کسی جگہ واقعات کے سنین متعین نہیں کیے ہیں، پھر بھی تعارف کا انداز معلومات افزا

---

[1] طبقات الشعرا مخطوطہ کتب خانہ آصفیہ، حیدر آباد ــ ورق ۱۸۸ اب

[2] تذکرہ ہندی ص ۱۴ و ۱۷۹

ہے۔ بعض جگہ شوق نے میر کی طرح اشعار کے فنی معائب کی گرفت بھی کی ہے۔ اس کے علاوہ اشعار کے انتخاب میں بھی ان کے یہاں تنوع اور رنگا رنگی نمایاں ہے۔ انھوں نے اپنے دائرۂ کار کو صرف غزل کی نمائندگی تک محدود نہ رکھ کر پہلی مرتبہ افراط کے ساتھ دوسری اصناف سخن کے نمونے بھی پیش کیے ہیں۔

اس دور کے بعض تذکرہ نگار میاں فخرالدین ماہر شاگرد سودا کے والد علارالدولہ اشرف علی خاں اشرف اور ایک مجہول الاحوال شخص میر محمد علی کو بھی تذکرہ نویس کی حیثیت سے یاد کرتے ہیں[1]۔ اشرف کے تذکرے کا ایک قلمی نسخہ رضا لائبریری رام پور میں محفوظ ہے۔ یہ شعرائے فارسی کا تذکرہ ہے جو ۱۱۷۸ھ/۱۷۶۴ء کے قریب مرتب ہوا ہے[2]۔ میر محمد علی ہمارے خیال میں میر فتح علی (گردیزی) کی تصحیف ہے جس نے تذکرۂ ریختہ گویاں کے دیباچے اور خاتمے میں اپنے نام کو اس کی معروف شکل میں نہ لکھتے ہوئے "فتح المدعو بہ علی" لکھا ہے۔ "گلزارِ ابراہیم" میں جس مقام پر محمد علی مذکور کا حوالہ ملتا ہے، گردیزی کے قول سے اس کی مطابقت بھی اس قیاس کی تائید کرتی ہے۔

---

[1] گلزار ابراہیم مطبوعہ ص ۱۳۴ و ۱۹۰ و گلشن سخن مطبوعہ ص ۱۹۱

[2] دستور الفصاحت۔ مقدمہ مرتب ص ۶۳

تذکرہ نگاری کے مختلف مراکز

(ب)

۱۲۰۱ھ/۱۷۸۷ء سے ۱۲۵۰ھ/۱۸۳۵ء تک

تیرھویں صدی ہجری کا نصفِ اوّل جسے خوب چند ذکا اور مصحفی کا دور کہا جا سکتا ہے تذکرہ نگاری کا عہدِ شباب ہے۔ پچاس سال کے اس دور میں ۱۲۰۱ھ/۱۷۸۷ء سے ۱۲۳۶ھ/ ۱۸۲۱ء تک مصحفی اور ۱۲۰۸ھ/۹۴-۱۷۹۳ء سے ۱۲۴۷ھ/۱۸۳۱ء کے کچھ بعد تک ذکا اپنی تصنیفی سرگرمیوں کے لحاظ سے اس طرح ایک دوسرے کے ہم دوش و ہم عنان رہے ہیں کہ گذشتہ صدی کے پچیس ۲۵ برسوں کی طرح اس نسبتاً طویل تر مدت کو دو حصوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ اس زمانے میں سب سے زیادہ تذکرے دہلی اور اس کے آس پاس میرٹھ اور بلند شہر کے علاقوں میں تالیف ہوئے۔ یہ تذکرے جس ماحول میں لکھے گئے وہ ان سیاسی اور اقتصادی حالات کی دین تھا جن کے سلسلے گذشتہ صدی کے آخری دو برسوں سے ملتے ہیں۔ شاہ عالم نے ۲۱ محرم ۱۱۹۹ھ/۵ دسمبر ۱۷۸۴ء کو مرہٹوں کی آئے دن کی تاخت و تاراج سے مجبور ہو کر مادھوراؤ سندھیا کو "مختار الملک، وکیلِ مطلق، عمدۃ الامرا، فرزندِ عالی جاہ، مہا راجہ دھراج، سری مادھوراؤ سندھیا بہادر، منصورِ زماں" کے خطابات اور دوسرے حدود غیر معمولی اعزازات سے سرفراز کر کے امورِ شاہی کا مختار اور سلطنت کا آمرِ مطلق بنا دیا تھا۔ مرہٹوں کا یہ عروج جہاں دوسرے امرائے سلطنت کو ناگوار تھا وہیں انگریز بھی اس کی وجہ سے حد درجہ متفکر اور پریشان تھے چنانچہ تھوڑے ہی دنوں کے بعد سب سے پہلے نجیب الدولہ کے پوتے اور ضابطہ خاں کے بیٹے غلام قادر نے جس کے باپ دادا اور خاندان کی عورتوں

اور دوسرے افراد کے ساتھ جنگِ سکرتال (شعبان ۱۱۸۵ھ/فروری ۱۷۷۲ء) اور جنگِ غوث گڑھ (محرم ۱۱۹۱ھ/اپریل ۱۷۷۷ء) کے موقعوں پر شاہ عالم کے حسبِ ایما مرہٹہ اور مغل فوجوں نے حد درجہ ظالمانہ اور انسانیت سوز سلوک کیا تھا، مادھوراؤ سندھیا کو جے پور کے قریب راجپوتوں سے مصروفِ جنگ پاکر اپنے ساتھیوں کو منظم کیا اور اس معرکے میں سندھیا کی ہزیمت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دہلی پر چڑھائی کر دی (۵ر دسمبر ۱۷۸۷ء/۲۴ر صفر ۱۲۰۲ھ)[۱]۔ یہ دہلی کو مرہٹوں کے اثر سے آزاد کرانے کی آخری کوشش تھی جو مغلوں کی شومیٔ قسمت سے کامیاب نہ ہو سکی۔ شاہ عالم نے بدرجۂ مجبوری اس وقت غلام قادر کا ساتھ دیا لیکن اس کے دہلی سے چلے جانے کے بعد پھر مرہٹوں سے گفت و شنید شروع کر دی۔ بادشاہ کی اس احسان فراموشی سے برافروختہ ہو کر غلام قادر دوبارہ دہلی پر حملہ آور ہوا (۱۴ر جولائی ۱۷۸۸ء/۹ر شوال ۱۲۰۲ھ)[۲] اور جوشِ انتقام میں اس نے ان تمام زیادتیوں کا بدلہ لے ڈالا جو ماضی میں اس کے خاندان کے ساتھ روا رکھی گئی تھیں۔ بادشاہ کو معزول کر کے (۳۰ر جولائی مطابق ۲۵ر شوال)[۳] اس پر طرح طرح کے ظلم توڑے زمین پر گرا کر اس کی ایک آنکھ اپنے خنجر سے نکال لی اور دوسری اپنے ایک ساتھی سے نکلوا دی۔ (۱۰ر اگست مطابق ۷ر ذی قعدہ)[۴]۔ ہفتوں اہالیانِ قلعہ پر خورد و نوش کو بند رکھا، شہزادوں کو زدوکوب کیا، شہزادیوں کی توہین کی، نوکروں کو مرتے دم تک کوڑے لگوائے، محل کو تاراج کیا اور خزانے جو قلعے سے باہر دبے ہوئے تھے، کھدوا ڈالے۔ اس طرح پچیس (۲۵) کروڑ روپے نقد اور دوسرا قیمتی مال و اسباب اس کے ہاتھ آیا[۵]۔ لیکن چند مہینوں کے اندر ہی ۴ر مارچ ۱۷۸۹ء/۶ر جمادی الثانیہ ۱۲۰۳ھ

---

[۱] غلام قادر روہیلہ شہید از الطاف علی بریلوی مشمولہ بہادر شاہ ظفر ص ۲۷۷

[۲] ایضاً غلام قادر روہیلہ شہید مشمولہ بہادر شاہ ظفر ص ۲۷۹ و ۲۸۰

[۳] ایضاً غلام قادر روہیلہ شہید مشمولہ بہادر شاہ ظفر ص ۲۷۹ و ۲۸۰

[۴] بہادر شاہ ظفر ص ۳۱ و نادرات شاہی۔ دیباچہ مرتب ص ۲۹

[۵] غلام قادر روہیلہ مشمولہ بہادر شاہ ظفر ص ۲۸۳

کو مرہٹوں نے بڑی بے دردی کے ساتھ اس روہیلہ سردار کا خاتمہ کر دیا[1] اور بادشاہ کے برائے نام حقوقِ سلطنت بحال کر کے وہ حسبِ سابق دوبارہ دہلی پر قابض ہو گئے۔

۱۲ر فروری ۱۷۹۴ء/۱۱ر رجب ۱۲۰۸ھ کو مادھوراؤ سندھیا چل بسا[2]۔ اس کے بعد زمامِ وکالت و مختاری اس کے بھائی کے پوتے دولت راؤ کے ہاتھ میں آئی۔ دولت راؤ عیش پرست تھا اور اس میں مادھوراؤ جیسی فوجی و انتظامی صلاحیت بھی نہ تھی۔ ادھر روہیلوں کی طاقت کا شیرازہ منتشر ہو جانے کے بعد شمالی ہند میں ایسا کوئی منظم اور سرفروش گروہ باقی نہ رہا تھا جو سلطنتِ مغلیہ کا تحفظ کر سکے، اس لیے انگریزوں کو مرہٹوں اور مغلوں کے مقابلے میں اپنی قسمت آزمانے اور ایک تیر سے بیک وقت دو شکار کرنے کا بہترین موقع ہاتھ آگیا۔ اگست ۱۸۰۳ء/جمادی الاولیٰ ۱۲۱۸ھ میں جنرل لیک کی سرکردگی میں ان کی فوجیں مغربی یو، پی کے اہم فوجی مراکز کی طرف بڑھنا شروع ہوئیں اور ڈیڑھ دو مہینے کی مدت میں یکے بعد دیگرے انھوں نے علی گڑھ[3]، دہلی اور آگرے کی چھاؤنیوں پر اپنی فتح کے پرچم لہرا دیے[4]۔ دہلی ۱۱ر ستمبر کو فتح ہوئی[5]۔ ۱۵ر ستمبر ۱۸۰۳ء/۲۸ر جمادی الاولیٰ ۱۲۱۸ھ کو جنرل لیک قلعۂ معلیٰ کے اندر بادشاہ کی خدمت میں باریاب ہوا[6]، تو اس نے دیکھا کہ

> "وہ قدیم عزت و شان کا مصیبت زدہ مجسمہ ضعفِ پیری اور بے بصارتی، ناداری، زوالِ مرتبت کی مصیبتوں سے شکستہ حال اور شکستہ دل ایک چھوٹے سے بوسیدہ شامیانے

---

[1] غلام قادر روہیلہ شہید مشمولہ بہادر شاہ ظفر ص ۲۸۶

[2] مادھوجی سندھیا ص ۱۵۱

[3] علی گڑھ کا قلعہ ۴ر ستمبر ۱۸۰۳ء کو فتح ہوا۔ بحوالہ کتبۂ قلعہ بزبانِ انگریزی

[4] بھارت کا اتہاس (ہندی) جلد دوم ص ۲۳۲

[5] ٹوئیلائٹ آف دی مغلز (انگریزی) ص ۲۵

[6] یہ تاریخ جی، سی مارشمین مولفِ "تاریخ ہند۔ عہد برطانیہ" کی بیان کردہ ہے۔ اسپیر نے ٹوئیلائٹ آف دی مغلز (ص ۳۵) میں ۱۶ر ستمبر کو ملاقات کا ذکر کیا ہے۔

کے نیچے جو اس کی شان و شوکت کی تنہا یادگار اس کے پاس باقی رہ گیا تھا، بیٹھا ہوا تھا اور اندرونی و بیرونی مصائب کا ایک عبرتناک نظارہ پیش کر رہا تھا۔"[1]

مجبوری و بے بسی کے اس عالم میں شاہ عالم کے لیے حالات کے سامنے سپر ڈال دینے کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا چنانچہ اس نے اپنے آپ کو کلیتہً انگریزوں کے سپرد کر دیا اور "بادشاہ کے ملک" میں "خلقِ خدا" پر "کمپنی بہادر کا حکم" چلنے لگا۔ اس خود سپردگی کے صلے میں کمپنی کی جانب سے ساٹھ ہزار روپیے ماہوار بادشاہ کے صرفِ خاص کے لیے ساڑھے اٹھائیس ہزار ماہانہ بصورتِ نقد و جاگیر ولی عہد، خاندان کے دوسرے افراد اور ملازمینِ شاہی کے لیے اور دس ہزار سالانہ محرم، عیدین، نوروز اور دوسری تقریبات کے لیے مقرر ہو گئے۔[2] ساتھ ہی ادب و احترام کے سارے لوازم اور شاہی القابات و خطابات بھی برقرار رکھے گئے۔

۷ رمضان ۱۲۲۱ھ/۱۹ نومبر ۱۸۰۶ء کو شاہ عالم کی وفات ہو گئی[3] اور ابو النصر معین الدین اکبر شاہِ ثانی جانشیں نامزد ہوئے۔ ان کی درخواست اور مسٹر آرچیبولڈ اسٹین ریزیڈنٹ متعینہ دہلی کی سفارش پر ۱۸۰۹ء میں وظیفے کی مجموعی رقم ساڑھے اٹھانوے ہزار سے بڑھا کر ایک لاکھ روپیے ماہوار کر دی گئی۔[4] لیکن اکبر شاہ کو مسٹر اسٹین کی حمایت اور اس کے واسطے سے کمپنی کی ہمدردیاں زیادہ عرصے تک حاصل نہ رہ سکیں۔ فروری ۱۸۱۱ء میں ریزیڈنٹ کے عہدے پر سر چارلس مٹکاف کا تقرر عمل میں آیا۔ مسٹر اسٹین کے برخلاف مٹکاف کی نظر میں خاندانِ شاہی کسی تعظیم و تکریم کا مستحق نہ تھا۔ وہ اس کے رہے سہے احساسِ برتری اور سرمایۂ فخر کو بھی ہمیشہ کے لیے ختم کر دینا چاہتا تھا۔ چنانچہ چند سال کے عارضی سکون کے بعد اکبر و جہاں گیر کے جانشیں اور اس کے افرادِ خاندان کے سروں پر ایک بار پھر آفات و مصائب

---

[1] تاریخ ہند۔ عہد برطانیہ (اردو ترجمہ) ص ۲۴۰ و ۲۴۱

[2] بہادر شاہ ظفر ص ۳۷ و ۵۴

[3] نادرات شاہی۔ دیباچہ مرتب ص ۵۴

[4] بہادر شاہ ظفر ص ۵۵

کے سائے منڈلانا شروع ہو گئے۔ بادشاہ اور اس کی اولاد کے ساتھ ہر طرح کے ناروا اور توہین آمیز سلوک جائز قرار دے دیے گئے۔ شاہی متصدی جو ریزیڈنٹ کے دفتر میں جاگیرات کے حسابات کی جانچ پڑتال پر مامور تھے، برطرف ہوئے، قصاص اور طویل قید کے احکامات پر بادشاہ کی منظوری غیر ضروری قرار پائی، یورپین افسروں اور عام انگریزوں کو اثنائے راہ میں شاہی سواری کے آگے رسمی اور روایتی آداب کی بجاآوری سے مستثنیٰ کر دیا گیا، حتیٰ کہ ۱۸۳۲ء میں دہلی کو صوبۂ مغربی و شمالی میں ضم کر کے اس کی انفرادی و مرکزی حیثیت ختم کر دی گئی اور ۱۸۳۵ء سے تمام سکّے "بادشاہِ غازی" کی بجائے کمپنی بہادر کے نام سے منسوب ہونے لگے[1]۔ اس طرح نام نہاد مسند نشینی و جہاں بانی کی سال گرہوں کی صورت میں اپنی تباہی و بربادی کے بتیس (۳۲) جشن منا کر جب یہ مجبور و محکوم حکمراں دنیا سے رخصت ہوا (۲۷ جمادی الثانیہ ۱۲۵۳ھ/ ۲۸ ستمبر ۱۸۳۷ء) تو مغلوں کی قبائے تفاخر اور دہلی کے پیراہنِ یوسفی کا کوئی تار سلامت نہ رہا تھا۔

آفات و مصائب اور زوال و انحطاط کی ان ہر لحظہ بڑھتی ہوئی تاریکیوں میں زندگی کے تلخ اور سنگین حقائق سے فرار کا جو رجحان پیدا ہوا، اس نے شعر و ادب کو برگ و بار لانے اور تذکرہ نویسی کے فن کو ترقی کرنے کے مواقع فراہم کیے۔ ۱۱۹۹ھ/۱۷۸۴ء میں شاہ عالم مالی و ملکی انتظامات کی تمام ذمہ داریاں مادھو راؤ سندھیا کو سونپ کر اپنے فرائضِ منصبی کی انجام دہی سے آزاد ہو گیا تھا۔ اس کے بعد ۱۲۰۲ھ/۱۷۸۸ء میں غلام قادر کے مظالم نے اس ذوقِ تن آسانی کی تکمیل کر دی اور بادشاہ کے لیے خانہ نشینی و مجلس آرائی کے سوا کوئی کام باقی نہ رہ گیا۔ غالباً اسی زمانے میں شعر و شاعری سے اس کی دل چسپیوں میں اضافہ ہوا۔ قدرت اللہ قاسم نے اس کے دربار سے توسل رکھنے والے شعرا میں حسن علی آگاہ، عبدالرحمٰن احسان، حافظ بقار اللہ حیرآن، راجہ رام ذرّہ، نواب سیف الدولہ، سید رضی الدین خاں بہادر رضیؔ، برہان الدین خاں زارؔ، مرزا جان بیگ سامیؔ، لالہ دیوالی سنگھ سخنورؔ

---

[1] بہادر شاہ ظفر ص ۵۸ - ۶۲

سید الشعرا میر غالب علی خاں سعید، میرزا بڈھن مخاطب بہ مظہر علی خاں شفیق، میر صادق علی خاں صادق، اسد الدولہ بہادر بیگ خاں غالب، کنور گوپال ناتھ غلام، لالہ مکند سنگھ فارغ، میر فقیر اللہ فقیر، عبداللہ خاں مخاطب بہ مشتاق علی خاں مشتاق اور میر نظام الدین خاں ممنون کا ذکر کیا ہے۔ حسن علی آگاہ داستان سرائی کی خدمت پر مامور[1] اور بقار اللہ حیران مرشد زادوں کی تعلیم کے لیے متعین تھے[2]۔ راجہ رام ناتھ ذرہ "قربِ پیش گاہِ سلطنت و پیش کاریِ نظارت" سے سرفراز تھے[3]۔ زار، شفیق اور مشتاق کو "سلکِ خواصانِ حضور" میں منسلک ہونے کا فخر حاصل تھا[4]۔ ساقی کو شاہنامہ فردوسی کے انداز میں عہدِ عالم شاہی کے واقعات نظم کرنے کی خدمت سونپی گئی تھی[5]۔ لالہ دیوالی سنگھ سخنور "منشیِ حضورِ پرنور"[6] اور سید الشعرا غالب علی خاں سید میر منشی تھے[7]۔ صادق علی خاں صادق "دوائی خانہ" سے متعلق تھے[8]۔ گوپال ناتھ غلام "حضورِ پرنور" سے "تقربِ تمام" رکھتے تھے اور انھی کے "یمنِ صحبت" سے ریختہ گوئی کی طرف مائل ہوئے تھے[9]۔ فارغ توشک خانۂ شاہی میں متصدی گری کے عہدے پر فائز تھے[10]۔ احسان، رضی، غالب، فقیر اور ممنون بھی اسی طرح "شعرا پائے تختِ سلطانی" اور "سخن سنجان باریافتگانِ حضورِ پرنورِ خاقانی" میں شامل تھے[11]۔ ممنون کو ۱۲۱۸ھ میں فخر الشعرا کا خطاب بھی عنایت ہوا تھا[12]۔ ان

---

[1] مجموعہ نغز جلد اول ص ۴۱
[2] مجموعہ نغز جلد اول ۲۲۴
[3] مجموعہ نغز، جلد اول ص ۲۵۹
[4] مجموعہ نغز۔ زار، جلد اول ص ۲۸۳۔ شفیق جلد اول ص ۳۴۵۔ مشتاق جلد دوم ص ۱۸۷
[5] مجموعہ نغز جلد اول ص ۲۸۶ و ۲۸۷
[6] مجموعہ نغز جلد اول ص ۲۹۱
[7] مجموعہ نغز جلد اول ص ۳۲۸
[8] مجموعہ نغز جلد اول ص ۳۵۸
[9] مجموعہ نغز جلد دوم ص ۲۹
[10] مجموعہ نغز جلد دوم ص ۳۲
[11] مجموعہ نغز۔ احسان جلد اول ص ۵۴، رضی جلد اول ص ۲۷۹، غالب جلد دوم ص ۲۳، فقیر، جلد دوم ص ۸۷، و ممنون جلد دوم ص ۲۱۲
[12] بحوالہ تحریر سرورق کلیاتِ ممنون مخطوطہ مولانا آزاد سینٹرل لائبریری بھوپال

شعرا کے علاوہ شیفتہ نے میر غلام حسین شکیبا[1] کو اور عشقی نے میر فرزند علی موزوں[2] کو بھی انھی مقربینِ شاہی کے زمرے میں شمار کیا ہے۔ ایک اور ہزل گو شاعر شہوت کے بارے میں قاسم اور دوسرے تذکرہ نگاروں کا بیان ہے کہ اس نے بہ "آرزوے تمام" پیش گاہِ سلطنت سے "مسخرۃ الدولہ قسم ساق خاں بہادر، پھکڑ جنگ" کا خطاب حاصل کیا تھا[3]۔ اندازہ ہے کہ ان میں سے بیشتر شاعر بصارت سے محرومی کے زمانے ہی میں بادشاہ کی ہم مجلسی کے اعزاز اور ندیمتِ خاص کے شرف سے ممتاز ہوئے ہوں گے۔

کمپنی کے اقتدار سے قبل شاہ عالم کو اکثر مالی مشکلات کا سامنا رہا کرتا تھا۔ غلام قادر کی سرکوبی کے بعد مرہٹوں نے اس کے ذاتی مصارف کے لیے نو لاکھ سالانہ مقرر کر دیے تھے[4] لیکن اس رقم کی ادائیگی محصول اور ذاتی لگان کی وصولی پر منحصر تھی۔ روپیہ بروقت وصول نہ ہوتا تو بادشاہ کے وظیفے کی ادائیگی بھی التوا میں پڑ جاتی۔ میر کے بیان کے مطابق بینائی سے محرومی کے بعد مغل سلطنت کے اس بدنصیب وارث پر ایک ایسا وقت بھی گذر چکا تھا جب کہ اس کی آمدنی صرف سو روپیے یومیہ رہ گئی تھی[5]۔ ۱۲۱۸ھ/۱۸۰۳ء میں کمپنی کے زیرِ سایہ آجانے کے بعد یہ اقتصادی کش مکش ختم ہوگئی اور وظیفے کی مقررہ رقم پابندیٔ وقت کے ساتھ ماہ بماہ ملنے لگی۔ اس کے ساتھ ہی کاروبارِ سلطنت کا رہا سہا بوجھ بھی سر سے اتر گیا۔ نشاط و الم کے اس دوراہے پر گریز پا مسرتوں اور سیماب صفت رنگینیوں کے تعاقب میں بادشاہ کے رخشِ فکر کی رفتار نسبتاً تیز تر ہوگئی۔ اعیانِ سلطنت کے بجائے شاعر خلوت و جلوت میں ہم راز و دم ساز رہنے لگے۔ کچھ وقت عبادت و ریاضت میں گزرتا اور کچھ

---

[1] گلشنِ بے خار طبع اول ص ۱۷

[2] تذکرۂ عشقی ۔ دو تذکرے جلد دوم ص ۳۵۸

[3] مجموعۂ نغز جلد اول ص ۳۵۴ و عیار الشعرا، مخطوطہ علی گڑھ ورق ۱۴۴۔ الف

[4] نادراتِ شاہی۔ دیباچہ مرتب۔ ص ۳۰

[5] میر کی آپ بیتی (ترجمہ "ذکر میر") ص ۱۹۱

شاعروں کے ساتھ ان کے کلام سے لطف اندوزی میں صرف ہوتا۔ قاسم نے ۱۲۲۱ھ/۱۸۰۶ء میں آخری دور کی اس کیفیت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے :

"زبدۂ احیانِ ہمایونش برضاجوئیِ حضرتِ احدیت موصوف، خلاصۂ اوقاتِ مبارکش بہ پرستاریِ جنابِ صمدیت مصروف۔ برخے از آوانِ شبانروزیِ آں حضرت تفریحًا للطبعِ اللطیف بدیں شغلِ شریف کہ عبارت از ابتکارِ شعر و شاعری است، صرف می شود۔ دریں ہنگام عشرت آغازِ فرحت انجام شطرے از نکتہ سنجانِ شیریں زبان و برخے از سخن آرایانِ سحر بیان بشرفِ حضورِ فیض گنجور مشرف می گردند و بحکمِ ارفعِ اعلیِ اقدس بعضے ازان جادو طرازانِ ذوالاختصاص در دیوانِ خاصہ بوقتِ معینہ سعادت اندوزگشتہ بہ دُرِ غرر ہر گونہ اشعار آبدار سامعہ افروزِ آن خدیو ہفتِ کشور می شوند۔"[1]

شاہ عالم کو قسام ازل نے سخن شناسی کی توفیق کے ساتھ ہی شعر گوئی کا ملکہ بھی ودیعت کیا تھا۔ وہ آفتابؔ تخلص کرتے تھے اور اردو کے علاوہ فارسی، ہندی اور پنجابی میں بھی شعر کہتے تھے۔ مولانا محمد حسین آزاد کا بیان ہے کہ ان کے چار اردو دیوان تھے[2] ایک دیوان کا ذکر اسپرنگر نے بھی اپنی فہرست میں کیا ہے[3]۔ ان دواوین کے علاوہ شاہ عالم کی جو منظوم تصانیف ہمارے علم میں ہیں، ان میں ایک طویل مثنوی "منظوم اقدس"، فارسی کا ایک دیوان اور اردو، فارسی، ہندی اور پنجابی کے متفرق کلام کا ایک مجموعہ "نادراتِ شاہی" شامل ہے۔ "نادراتِ شاہی" کی نظموں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ شاہ عالم صرف برائے نام شاعر نہ تھے، انھیں شاعری کی تمام اصناف اور کئی زبانوں پر قدرت حاصل تھی اور وہ ان میں کامیابی کے ساتھ طبع آزمائی کی اہلیت رکھتے تھے۔

---

[1] مجموعہ نغز جلد اول ص ۱۸

[2] آب حیات حاشیہ ص ۸۷

[3] فہرست کتب خانۂ شاہانِ اودھ ص ۵۹۷

شاہ عالم کے جانشین اکبر شاہ ثانی بھی موزونیِ طبع سے بہرہ ور تھے۔ انھوں نے اپنے والد کے تخلص (آفتاب) کی مناسبت سے شعاعؔ تخلص اختیار کیا تھا لیکن ان کے زمانے میں قلعۂ معلیٰ کی ادبی سرگرمیاں ان سے زیادہ ان کے فرزند اکبر میرزا ابوظفر کی ذات سے وابستہ رہیں۔ یہی میرزا ابوظفر بعد میں "ابوالمظفر سراج الدین محمد بہادر شاہِ ثانی" کے لقب سے مشہور ہوئے اور ہندوستان کے آخری مغل تاجدار کہلائے۔ اکبر شاہِ ثانی تخت نشینی کے بعد اپنی چہیتی بیگم نواب ممتاز محل کے حسبِ خواہش ان کے فرزند مرزا جہاں گیر کو جو عمر میں ابوظفر سے چھوٹے تھے ولی عہد نامزد کرنا چاہتے تھے[1] اس خواہش کی تکمیل کے لیے انھیں ایک بار یہ جھوٹ بھی بولنا پڑا کہ ابوظفر میرا بیٹا ہی نہیں ہے[2]۔ ادھر میرزا ابوظفر مسٹر آرچیولڈ اسٹین ریزیڈنٹ کی وساطت سے اپنا حق منوانے کی فکر میں مصروف تھے۔ باپ اور بیٹے کے درمیان حق تلفی اور حق طلبی کی یہ کش مکش ایک عرصے تک جاری رہی، حتیٰ کہ میرزا جہاں گیر ریزیڈنٹ پر طمنچے سے وار کرنے کے جرم میں ماخوذ ہو کر الٰہ آباد میں نظر بند ہوئے اور وقت کی ایک کروٹ سے ولی عہدی کا قرعۂ فال میرزا ابوظفر کے نام نکل آیا۔ ظفرؔ کو چونکہ ابتدا میں اپنی جانشینی کے امکانات تاریک نظر آتے تھے اور اس محرومی کے احساس نے ان کے اندر ایک قسم کی شکستہ دلی اور مایوسی کی کیفیت پیدا کر دی تھی اس لیے وہ اپنا زیادہ تر وقت عبادت و ریاضت، حال و قال کی مجلسوں اور شعر و سخن کی محفلوں میں گزارتے۔ یہی وہ پناہ گاہیں تھیں جہاں کسی نہ کسی حد تک ان کی ذہنی یکسوئی اور آسودگیٔ خاطر کا سامان ہو جاتا تھا اور تفکرات سے گراں بار دل و دماغ یک گونہ طمانیت محسوس کرتے تھے۔ لیکن شاعری سے ان کی دل چسپی صرف ان ناسازگار حالات کی دین نہیں تھی، ولی عہدی کے قضیے سے قبل شاہ عالم کی زندگی میں بھی ان کا ذوقِ سخن گستری اشتہار و اعتبار کی منزل تک پہنچ چکا تھا جس کا ثبوت قاسم کے

---

[1] ٹوئیلائٹ آف دی مغلز (انگریزی)، ص ۱۴۱

[2] تلامذہ غالب (ذکر ظفر)، ص ۲۰۸

اس بیان سے ملتا ہے:

"شوقِ ایں فنِ شریف بسیار در سرداران و اکثرے از اوقاتِ ہمایوں بہ سخن سازی و نکتہ پردازی ہمت می گمارند"[1]

فکرِ شعر کے اس اولین دور میں ظفر نے اصلاحِ کلام کی باقاعدہ خدمت شاہ نصیر کے سپرد کر رکھی تھی لیکن خوب چند ذکا اور قاسم کی روایت کے مطابق ان کے علاوہ دوسرے "استادانِ وقت" اور "جوہریانِ جوہر شناس" سے بھی کبھی کبھی رسمی طور پر مشورۂ سخن اور تبادلۂ خیالات کرتے رہتے تھے[2]۔ قاسم نے اس سلسلے میں خصوصیت کے ساتھ اپنے صاحبزادے میر عزت عشق کا نام لیا ہے۔ انگریزی عملداری کے قیام (۱۸۰۳ء/۱۲۱۸ھ) کے بعد شاہ نصیر نے دکن کی راہ لی تو ان کے شاگرد میر کاظم حسین بیقرار شاہزادۂ ولی عہد کی غزل بنانے لگے[3]۔ ۱۲۲۲ھ/۱۸۰۷ء کے قریب شیخ محمد ابراہیم ذوق کو قلعۂ معلیٰ تک رسائی اور دربارِ ولی عہدی میں باریابی حاصل ہوئی[4] اور تھوڑے ہی دنوں کے بعد ۱۸۰۸ء/۱۲۲۳ھ میں بیقرار کے دہلی سے باہر چلے جانے کے باعث استادِ سخن کا منصب ان کے لیے خالی ہو گیا[5]۔ اس طرح ایام شاہزادگی سے ولی عہدی کے لیے جدوجہد کے زمانے تک ظفر دہلی کے کئی مشہور اساتذہ سے کسبِ فیض کر چکے تھے۔ زمانۂ ولی عہدی میں اور اس کے بعد بھی ذوق کی زندگی تک اگرچہ ان کے سامنے قلعۂ معلیٰ میں شہر کے کسی دوسرے استاد کا چراغ نہ جل سکا تاہم وہاں جو مشاعرے اور جشن منعقد ہوتے تھے ان میں تمام ممتاز شاعر شرکت کرتے اور اپنا کلام سناتے تھے۔ غرض کہ اکبر شاہ ثانی کے عہد میں ظفر کی ادب نوازی و شعر دوستی کی بدولت قلعۂ معلیٰ ادبی سرگرمیوں کا ایک اہم مرکز بن گیا تھا۔

---

[1] مجموعۂ نغز جلد اول ص ۲۷۳

[2] عیار الشعرا مخطوطہ انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی ورق ۵۲ اب و مجموعہ نغز جلد اول ص ۲۷۳

[3] آب حیات ص ۴۲۹

[4] ذوق سوانح اور انتقاد ص ۹۴ [5] تلامذہ غالب ص ۲۱۳

قلعے سے نکل کر جب ہم شہر کی طرف آتے ہیں تو وہاں بھی ہر طرف اردو کا جادو چلتا ہوا معلوم ہوتا ہے، بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ گذشتہ صدی کے اواخر میں مغلوں کے نظامِ سیاست ومعیشت کی ابتری کے نتیجے میں شہر میں شعروادب سے دل چسپی کی جو فضا پیدا ہوئی تھی، زیرِ تبصرہ دور کی ادبی تاریخ میں اس کے اثرات قلعۂ معلّٰی کی ادبی سرگرمیوں کے نتائج سے زیادہ ہمہ گیر، دیرپا اور دور رس نظر آتے ہیں۔ قلعے کے جلسوں میں درباری رسوم وآداب کے پیشِ نظر نقد ونظر کے مظاہرے اور آزادانہ اظہارِ رائے کی گنجائش نہ تھی، جب کہ شہر کے اکثر مشاعرے معرکوں میں تبدیل ہوجاتے، الفاظ کے محلِ استعمال پر اختلافِ رائے ہوتا، فصاحت و بلاغت کے رموز ونکات بیان کیے جاتے، اوزان وبحور کے اسقام زیرِ بحث آتے اور بات بات پر اساتذہ کے کلام سے سند طلب کی جاتی تھی۔ یہ مشاعرے ادبی ذوق کی تربیت کا وسیلہ بھی تھے اور تفریحِ طبع کا ذریعہ بھی۔ یہاں طبیعتوں کے جوہر بھی کھلتے، ذہنوں کو جلا بھی حاصل ہوتی، فکری وفنّی مہارت کا امتحان بھی ہوتا اور اِس کے ساتھ ہی تھوڑی دیر کے لیے بے مہریِ ایام کی دل خراشی وجگر کاوی کا احساس بھی مٹ جاتا۔ قاسم کے بیان کے مطابق حمید الرحمٰن انیسؔ کے مشاعرے کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ اگر کوئی شخص ایک مصرع بھی موزوں کرسکتا تھا تو وہ اس محفل میں ضرور شریک ہوتا[1]۔ مہدی علی خاں عاشقؔ جن کا انتقال "مجموعہ نغز" کی ترتیب (۱۲۲۱ھ/۱۸۰۶ء) سے چار سال قبل ہوا تھا، بارہ سال تک ہر جمعے کو نہایت پابندی کے ساتھ اپنے مکان پر مجلسِ مشاعرہ منعقد کرتے رہے تھے۔ حتیٰ کہ ایک بار انھوں نے اپنے مرحوم بیٹے کے سویم کے دن بھی فاتحہ وغیرہ سے فراغت پاکر حسبِ معمول دوپہر کے بعد اس مجلس کا اہتمام کیا تھا[2]۔ بہادر بیگ خاں غالبؔ اپنے مشاعرے میں انواع واقسام کے ماکولات ومشروبات سے حاضرین کی تواضع کرتے تھے۔ شعرخوانی سے فراغت کے بعد رقص وسرود کی محفل

---

[1] مجموعہ نغز جلد اول ص ۷۸

[2] مجموعہ نغز جلد اول ص ۳۷۹

جمتی اور اکثر اسی عالم میں صبح ہو جایا کرتی تھی[۵۱]۔ فرنگی نژاد شاعر مظفر الدولہ، ممتاز الملک نواب ظفر یاب خاں بہادر صاحبؔ کو بھی مشاعروں کے انعقاد سے دل چسپی تھی۔ چنانچہ دہلی کے زمانۂ قیام میں وہ بھی اکثر مصرع طرح تجویز کر کے شعرا کو طبع آزمائی کی دعوت دیتے رہتے تھے[۵۲]۔ فخر الشعرا میر نظام الدین ممنونؔ کے زیر اہتمام شاہ صاحب کے پرانے مدرسے میں ایک مشاعرہ ہوا کرتا تھا جس میں شہر کے تمام سربرآوردہ شاعر شریک ہوتے تھے[۵۳]۔ شاہ نصیرؔ اپنے یہاں ہر مہینے کی پندرھویں اور انتیسویں تاریخ کو طرحی مشاعرے ترتیب دیتے اور ان کے لیے خصوصیت کے ساتھ سنگلاخ زمینیں اختراع کرتے تھے[۵۴]۔ اجمیری گیٹ کے باہر دلّی کالج میں منشی فیاض پارسا کی طرف سے جو وہاں ریاضی کے استاد تھے، بڑے اہتمام کے ساتھ بزم مشاعرہ منعقد ہوتی تھی۔ قادر بخش صابرؔ دہلوی کی روایت کے مطابق اس بزم میں مشاہیر شعرائے شیریں سخن شاہ نصیرؔ (غفر اللہ لہٗ) اور مومنؔ خاں مرحوم اور شیخ ابراہیم ذوقؔ مغفور اور ان کملائے قادر سخن کے تلامیذ اور موزوں طبعانِ شہر جمع ہو کر ..... رنگینیٔ کلام سے مستمعانِ سخن فہم کے پردۂ گوش کو رشکِ گلستان کرتے تھے[۵۵]۔ مولانا محمد حسین آزادؔ نے لکھا ہے کہ "مشاعرۂ مذکور اس شان و شکوہ سے جاری ہوا تھا کہ پھر کوئی (ایسا) مشاعرہ دلی میں نہیں ہوا"[۵۶]۔ اسی مشاعرے میں ایک مرتبہ شاہ نصیرؔ نے شعرائے لکھنؤ کی فرمائش پر کہی ہوئی دو غزلیں، "قفس کی تیلیاں، مگس کی تیلیاں" اور "دہن پتھر کے، کفن پتھر کے" سنائی تھیں، جن کی بے پناہ مقبولیت ان کے حریفوں کے لیے باعثِ رشک ثابت ہوئی اور اس کے نتیجے میں عرصے تک جوابی غزلوں کا سلسلہ قائم رہا بالخصوص اول الذکر ردیف و قوافی میں اہل مجلس کے اس فیصلے کے تحت کہ ہر مشاعرے میں طرحی غزل کے ساتھ ایک غزل اس زمین میں بھی پڑھی جائے،

---

۵۱ مجموعہ نغز، جلد دوم ص ۲۴۳ و عمدہ منتخبہ ص ۲۴۶

۵۲ عیار الشعرا مخطوطہ کتب خانہ انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی ورق ۹ الف

۵۳ یادگار غالب ص ۵۷

۵۴ گلشن بے خار طبع اول ص ۳۲۲

۵۵ گلستان سخن ص ۱۶۳

۵۶ آبِ حیات ص ۲۵۴

مہینوں طبع آزمائی ہوتی رہی۔ آخر میں ذوق نے اس زمین میں ولی عہد سلطنت مرزا ابو ظفر کی مدح میں ایک مرصع قصیدہ تصنیف کیا۔ اس کے چند روز کے بعد یہ مجلس برہم ہوگئی[1]

اس قسم کی دل چسپ اور ہنگامہ خیز محفلوں کے پہلو بہ پہلو حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (۱۱۵۹ھ/۱۷۴۶ء تا ۱۲۳۹ھ/۲۴-۱۸۲۳ء) مولانا شاہ رفیع الدین (۱۱۶۳ھ/۱۷۵۰ء تا ۱۲۳۳ھ/۱۸۱۸ء) حضرت شاہ محمد اسمٰعیل شہید (متوفی ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۰ء) مولانا فضل امام خیرآبادی (متوفی ۱۲۴۴ھ/۲۹-۱۸۲۸ء) اور ان کے فرزند شمس العلما مولانا فضل حق آرزو خیرآبادی (۱۲۱۱ھ/۱۷۹۷ء تا ۱۲۷۸ھ/۱۸۶۱ء) نواب الٰہی بخش خاں معروف (متوفی ۱۲۴۲ھ/۲۷-۱۸۲۶ء) مفتی صدرالدین آزردہ (۱۲۰۴ھ/۹۰-۱۷۸۹ء تا ۲۴ ربیع الاول ۱۲۸۵ھ/۱۶ جولائی ۱۸۶۸ء) مولانا امام بخش صہبائی (شہید ۱۸۵۷ء/۱۲۷۳ھ) اور نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ (۱۲۲۳ھ/۱۸۰۸ء تا ۱۲۸۶ھ/۱۸۶۹ء) جیسے جلیل القدر اور ثقہ علما و ادبا کی سنجیدہ صحبتوں میں بھی ادبی مسائل پر تبادلۂ خیال کا سلسلہ اور شعر و شاعری کا دور چلتا رہتا تھا۔" مولانا فضل امام کے گھر پر عصر کی نماز کے بعد ہمیشہ ادبی محفلیں ہوتی تھیں۔ ان کی وفات کے بعد ان کے صاحبزادے مولانا فضلِ حق نے بھی ان روایات کو زندہ رکھا اور انتہائی پابندی سے یہ نشستیں منعقد کرتے رہے[2]۔

نواب الٰہی بخش خاں معروف "کہنہ مشق اور قادرالکلام سخنور" اور "صاحب حال و قال" بزرگ تھے[3]۔ مولانا محمد حسین آزاد کے بقول "لطفِ کلام کے عاشق تھے اور شعر کے دقائق و حقائق پر بڑی گہری نظر رکھتے تھے[4]۔" مفتی صدرالدین آزردہ کے علمی مرتبے اور ان کی صحبت و ہم نشینی کی برکات کا اندازہ شیفتہ کے اس قول سے کیا جا سکتا ہے کہ "بہ اعتقادِ من رونقے

---

[1] گلستان سخن ص ۱۶۲ و ۱۶۳ و آب حیات ص ۴۵۴

[2] ڈاکٹر خلیق انجم کے مضمون "امام بخش صہبائی" مشمولہ ماہنامہ پگڈنڈی امرتسر، سالنامہ ۱۹۵۹ء (ص ۳۸) کے حوالے سے

[3] ذکر غالب ص ۴۷

[4] آب حیات ص ۴۳۰ و ۴۳۱

کہ بے شرفِ مجالستِ ایشان بہ پایاں آید، داخلِ ایامِ عمر نیست[۵۱]۔" مولانا ابوالکلام آزاد اپنے والد کے حوالے سے تحریر فرماتے ہیں کہ

"مفتی صاحب کا دیوان خانہ دہلی کے تمام منتخب افراد کا مجمع و مرکز تھا۔ جاڑا، گرمی، برسات کوئی موسم ہو لیکن شب کی یہ مجلس کوئی قضا نہیں کرتا تھا۔ ہر فن کے اکابر کو وہاں ان کے بہترین وقتوں میں دیکھا جا سکتا تھا۔ اگر کوئی نووارد دہلی آتا اور چاہتا کہ دہلی کے سارے فضل و کمال کو بیک وقت و یک مجلس دیکھ لے تو وہ سیدھا مفتی صاحب کے دیوان خانے کا رخ کرتا۔"[۵۲]

امام بخش صہبائی کو "فنونِ متعارفۂ سخنوری" میں وہ کمال حاصل تھا جس کی نظیر بہت کم ملتی ہے[۵۳]۔ آزردہ نے دہلی کالج میں فارسی کی مدرسی کے لیے تجویز کردہ تین اساتذہ وقت کی فہرست میں آپ کو غالب اور مومن کے پہلو بہ پہلو جگہ دی تھی[۵۴]۔ کہا جاتا ہے کہ قادر بخش صابر سے منسوب تذکرہ "گلستانِ سخن" بھی انھی کی تالیف ہے[۵۵]۔ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ بھی اس زمانے کے اربابِ کمال میں ایک نمایاں حیثیت کے مالک ہیں۔ دہلی میں ان کی قیام گاہ مادۂ سخن کے متوالوں کے لیے درِ پیرِ مغاں کا حکم رکھتی تھی۔ بڑے بڑے باکمال سخنور ان کی دوستی اور ہم مجلسی پر ناز کرتے تھے۔ مولانا حالی کا بیان ہے کہ "لوگ ان کے مذاق کو شعر کے حسن و قبح کا معیار جانتے تھے۔ ان کے سکوت سے شاعر کا شعر خود اس کی نظر سے گر جاتا تھا اور ان کی تحسین سے اس کی قدر بڑھ جاتی تھی[۵۶]۔" غرض یہ کہ اس دور میں دہلی کے شعرا کے لیے اِن

---

۵۱ گلشنِ بے خار طبعِ اول ص ۱۵

۵۲ بحوالہ غالب از غلام رسول مہر ص ۲۸۹

۵۳ تذکرۂ اہلِ دہلی مرتبہ قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی ص ۱۳۸

۵۴ طبقات شعرائے ہند ص ۴۱۴ و ۴۱۵ و ذکرِ غالب ص ۱۰۴

۵۵ ماہنامہ پگڈنڈی، امرتسر سالنامہ ۱۹۵۹ء ص ۳۸ و مومن از کلب علی خاں فائق ص ۲۱۰

۵۶ یادگارِ غالب ص ۱۰۲

اکابرِ علم وادب کی موجودگی حالی کے بقول بعینہٖ ایسی تھی جیسا کہ عرفی و نظیری کے حق میں خانِ خاناں، ابوالفتح، فیضی اور ابوالفضل کا ان کے زمانے میں موجود ہونا۔[1]

فکرِ شعر سے دل چسپی کا یہ ماحول اور مشاعروں کی یہ گرم بازاری صرف پائے تخت تک محدود نہ تھی، اس کے اثرات مضافات میں بھی دور دور تک پہنچ گئے تھے۔ شیفتہ کے فیضانِ سخن اور یمنِ صحبت کا سلسلہ میرٹھ، بلند شہر اور دوسرے قریبی قصبات تک وسیع تھا۔ وہ اپنی جاگیر کے انتظام اور دیکھ بھال کی غرض سے زیادہ تر میرٹھ اور جہانگیر آباد (ضلع بلند شہر) میں مقیم رہتے تھے۔ دہلی کی طرح وہاں بھی ان کی مجلسیں اہلِ ذوق کے لیے تہذیب فکر و نظر کا سامان فراہم کرتی تھیں۔ میرٹھ میں غلام محی الدین عشق و مبتلا کا مکان بھی ادبی و شعری سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ ۱۲۲۱ھ/۱۸۰۶ء کے بعد ایک مرتبہ شاہ نصیر نے بھی جو میر صدر جہاں کی درگاہ کا زرِ سالانہ وصول کرنے کی غرض سے میرٹھ جاتے رہتے تھے، اپنی جانب سے ان کے یہاں دو مشاعرے منعقد کیے تھے جن میں اچھے خاصے ادبی معرکوں کی سی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔[2] سکندر آباد (ضلع بلند شہر) میں لالہ ہرگوپال خستہ اور خیراتی لال بے جگر شعر و شاعری سے خاص شغف رکھتے تھے۔ بے جگر سرکارِ انگریزی کے ملازم تھے۔ تبادلے پر جہاں کہیں جاتے، ان کے گرد شعرا کا ایک حلقہ قائم ہو جاتا تھا۔ اگر باہر سے کسی شاعر کی آمد کی اطلاع ملتی تو وہ بڑے اشتیاق کے ساتھ اس سے ملنے کے لیے پہنچتے اور اس کا کلام سنتے اور دوسروں کو سنوانے کا بندوبست کرتے تھے۔ اس زمانے میں دہلی میں جو تذکرے لکھے گئے ان میں "عیار الشعرا" سب سے قدیم ہے۔ اس تذکرے کے مولف لالہ خوب چند ذکا کے آبا و اجداد بھی اسی سکندر آباد کے رہنے والے تھے۔[3]

گذشتہ صفحات میں جن مشاعروں کا ذکر کیا گیا ہے، ان میں سے بعض کی تفصیلات

---

[1] یادگار غالب ص ۱۹۱

[2] تذکرہ بے جگر مخطوطہ لندن ورق ۱۹۳

[3] عیار الشعرا مخطوطہ لندن ص ۲۷۳

بطور خاص اس بات کا پتا دیتی ہیں کہ دہلی اور اس کے قرب و جوار میں اردو شاعری کے اس دور پر سب سے زیادہ شاہ نصیر کی شخصیت چھائی ہوئی تھی۔ ان کی ہر غزل حریف شاعروں کے لیے آزمائش اور وقار کا مسئلہ بن جاتی تھی اور پھر مدتوں اس کے جواب کا سلسلہ چلتا رہتا تھا۔ گویا وہ تمام شورشیں جن کے دم سے اس وقت کا شعری نظام تابندہ و پائندہ تھا مختصر ہو کر ایک ذات میں مجسم ہو گئی تھیں۔ نصیر کا حلقۂ تلامذہ اور اس کا دائرۂ اثر بھی بہت وسیع تھا۔ اردو کا وہ اہم تذکرہ نگار جس نے ایک طویل خلا کو عبور کر کے دہلی میں تذکرہ نگاری کے فن کو دوبارہ زندہ کیا، اسی حلقے سے تعلق رکھتا ہے۔ ہماری مراد لالہ خوب چند ذکا سے ہے جن کا ذکر ہم اوپر کی سطور میں بھی کر آئے ہیں۔ ذکا شاہ نصیر کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ "عیار الشعرا" انھوں نے اپنے استاد کی فرمائش ہی پر مرتب کیا تھا۔ یہ تذکرہ ۱۲۰۸ھ/۹۴-۱۷۹۳ء میں مکمل ہوا۔ اس کے بعد ۱۲۱۸ھ/۱۸۰۳ء میں انھوں نے اس پر نظرِ ثانی کی اور ۱۲۴۷ھ/۱۸۳۱ء کے قریب تک وقتاً فوقتاً اس میں ضرورت کے مطابق اضافے اور ترمیمیں کرتے رہے۔ "عیار الشعرا" کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس سے اردو تذکرہ نویسی کی تاریخ میں ہمہ گیری اور جامعیت کے رجحان کا آغاز ہوتا ہے۔ اس سے قبل جتنے تذکرے لکھے گئے ہیں، ان میں شعرا کی شمولیت ان کے کارناموں کی ادبی حیثیت یا پھر سہل الحصول معلومات کی پابند ہے۔ ذکا نے اس روش سے انحراف کر کے یہ اصول وضع کیا کہ ہر وہ شخص جو طبعِ موزوں رکھتا ہے، تذکرے میں شمولیت کا مستحق ہے، خواہ اس کے کلام کا معیار پست ہی کیوں نہ ہو۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے اس طرف بھی دھیان دیا کہ تذکرہ نگار کی ذمہ داریاں صرف ان شعرا کے ذکر پر ختم نہیں ہو جاتیں جن کے حالات و کلام کی دستیابی میں کوئی دشواری پیش نہ آئے، ان شاعروں کے بارے میں معلومات فراہم کرنا بھی اس کے فرائضِ منصبی میں داخل ہے، جن سے لوگ عام طور پر واقفیت نہ رکھتے ہوں یا جن کے کلام تک آسانی کے ساتھ دسترس ممکن نہ ہو۔ ذکا کے اس طریقہ کار سے ان کے معاصرین بھی متاثر ہوئے۔ چنانچہ ۱۲۱۵ھ/۱۸۰۰ء میں نواب اعظم الدولہ میر محمد خاں سرور نے انھی خصوصیات کے

ساتھ جو "عیار الشعرا" کا طرۂ امتیاز ہیں، "عمدۂ منتخبہ" مرتب کیا۔ اس تذکرے میں بھی کم از کم ۱۲۴۴ھ/۲۹-۱۸۲۸ء تک اضافے کیے جاتے رہے۔ ۱۲۲۱ھ/۱۸۰۶ء میں حکیم قدرت اللہ قاسم نے "مجموعہ نغز" کی تکمیل کی۔ یہ تذکرہ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ ذکا کے تذکرے کا نقشِ اول سنین کے التزام سے بالکل عاری تھا۔ نظرِ ثانی اور بعد کی اضافوں کے دوران وہ اس کمی کے ازالے کی طرف متوجہ ہوئے لیکن سابقہ معلومات پر کوئی قابلِ لحاظ اضافہ نہ کر سکے۔ سرور کے یہاں اگرچہ تاریخی حوالوں کی تعداد بہت زیادہ نہیں تاہم اس میدان میں ان کا قدم ذکا سے کچھ آگے بڑھا ہوا ہے۔ قاسم اس معاملے میں ذکا اور سرور دونوں سے پیچھے ہیں۔ ان کا تذکرہ "عیار الشعرا" اور "عمدۂ منتخبہ" کے بعد کی تالیف ہے مگر اس میں ایک دو مقامات کے علاوہ کسی واقعے کا زمانہ واضح طور پر مذکور نہیں۔ ان تذکروں کے اس مابہ الامتیاز فرق سے قطعِ نظر سرور نے ذکا کے بیانات پر اور قاسم نے سرور اور ذکا دونوں کی فراہم کردہ معلومات پر کچھ اضافے بھی کیے ہیں۔ سرور کے تذکرے کی روشنی میں دہلی کے ادبی و تہذیبی ماحول کا "عیار الشعرا" کی بہ نسبت کہیں زیادہ بہتر طور پر مطالعہ کیا جا سکتا ہے، جب کہ "مجموعہ نغز" اس وصف میں دوسرے تمام تذکروں سے ممتاز ہے۔ یہ تذکرہ طرزِ ترتیب کی ندرت اور باقاعدگی کے لحاظ سے بھی اپنی نظیر نہیں رکھتا۔ شعرا کی ردیف وار تقسیم کے ساتھ تخلص کے حرفِ اول و دوئم کی رعایت اور ہر ردیف کی ابتدا میں اس کے تحت ذکر کیے جانے والے شعرا اور ان کے اشعار کی مجموعی تعداد کا مفصل بیان اس تذکرے کی انفرادی خصوصیات ہیں۔

"مجموعہ نغز" کے بعد ۱۲۲۲ھ/۱۸۰۷ء میں غلام محی الدین عشق و مبتلا میرٹھی نے "طبقات سخن"، ۱۲۳۰ھ/۱۸۱۵ء کے قریب آزردہ نے تذکرۂ مختصر ریختہ گویان، ۱۲۳۷ھ/۱۸۲۱ء سے قبل شرف الدین مسرور نے تذکرہ شعرائے اردو بہ زبانِ اردو، ۱۲۳۷ھ/۱۸۲۱ء میں خیراتی لال بے جگر نے تذکرۂ بے جگر اور ۱۲۴۸ھ/۱۸۳۲ء اور ۱۲۵۰ھ/۱۸۳۴ء کے درمیان نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ نے "گلشنِ بے خار" تالیف کیا۔ "طبقاتِ سخن" اگرچہ ہماری معلومات میں بعض اہم اضافے کرتا ہے لیکن فنی اعتبار سے تذکرہ نگاری

کے ارتقا میں اسے کوئی خاص مقام نہیں دیا جا سکتا۔ مفتی صدرالدین آزردہ کے تذکرے کا کوئی مکمل نسخہ اب تک دستیاب نہیں ہو سکا ہے۔ کارپس کرسٹی کالج، کیمبرج کے کتب خانے میں ایک ناتمام نسخہ محفوظ ہے جو قائم چاندپوری کے ذکر پر ختم ہو جاتا ہے۔ اس تذکرے میں شعرا کے حالات بالعموم نہایت مختصر اور تواریخ و سنین کے التزام سے عاری ہیں۔ البتہ بعض شعرا کے کلام کے بارے میں مؤلف کی رائیں بڑی جامع اور مختتم معلوم ہوتی ہیں۔ میرؔ کے متعلق ان کا یہ مشہور قول کہ "پستش اگرچہ اندک پست است، اما بلندش بسیار بلند" جو شیفتہؔ کے واسطے سے ہم تک پہنچا ہے[1]، اسی ضمن میں آتا ہے۔ شرف الدین مسرورؔ، غلام محی الدین مبتلاؔ کے فرزند تھے۔ خیراتی لال بےؔ جگر، شیفتہؔ، مولوی کریم الدین اور لالہ سری رام کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنے والد کی طرح انھوں نے بھی شعرائے اردو کا ایک تذکرہ مرتب کیا تھا[2]۔ یہ تذکرہ اردو میں لکھا گیا تھا اور اس کی ضخامت اٹھارہ انیس جز کے قریب تھی[3]۔ مسرورؔ کے اس تذکرے کا ایک قلمی نسخہ لالہ سری رام کے کتب خانے میں موجود تھا لیکن اب اس کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ بےؔ جگر کے تذکرے کا ایک ناقص نسخہ انڈیا آفس لائبریری لندن میں دریافت ہوا ہے۔ خصوصیات کے لحاظ سے اس تذکرے کا سلسلہ "چمنستانِ شعرا"، "گلِ عجائب" اور "گلزارِ ابراہیم" سے ملتا ہے لیکن اس کا پایہ ان تمام تذکروں سے بلند تر ہے۔ بےؔ جگر نے جس کثرت کے ساتھ تواریخ و سنین کے حوالے دیے ہیں اور اس طرح ایک مخصوص دائرے میں فنی معیار کا جو اعلیٰ ترین نمونہ پیش کیا ہے، اردو تذکرہ نویسی کی تاریخ اس کی دوسری مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ تذکرے کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ بےؔ جگر تلاش و جستجو اور محنت

---

[1] گلشنِ بے خار طبعِ اوّل ص ۱۳۲

[2] تذکرۂ بےؔ جگر نسخہ لندن ورق ۱۸۲ الف، گلشنِ بے خار طبعِ اول ص ۶۴، طبقات شعرائے ہند ص ۴۸۲، خمخانۂ جاوید جلد سوم ص ۴۴۰ و ۴۴۲، جلد چہارم ص ۱۷۰

[3] تذکرۂ بےؔ جگر ورق ۱۸۲ الف

کے عادی ہیں اور انھوں نے بڑی سرگرمی کے ساتھ شعرا کے حالات کی چھان بین کی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اس راہ میں انھوں نے بعض جگہ ٹھوکریں بھی کھائی ہیں اور بعض اوقات حالات سے مجبور ہو کر انھیں اپنی اس روش کو بدلنا بھی پڑا ہے لیکن محض تن آسانی اور تساہل کی بنا پر وہ کسی جگہ بھی ہمت ہارتے اور سپر ڈالتے ہوئے نظر نہیں آتے۔

شیفتہ تعارف نگاری میں سرورؔ کے قدم بہ قدم ہیں۔ البتہ انھوں نے زیادہ سے زیادہ شعرا کے حالات جمع کرنے کی بجائے زیادہ سے زیادہ اچھے اشعار کی گردآوری کو اپنا مطمحِ نظر قرار دیا ہے۔ ترتیب میں تخلص کے حرفِ اوّل کے ساتھ حرفِ دوم کی بھی رعایت ملحوظ رکھ کر انھوں نے کسی حد تک قاسم کی پیروی کی ہے۔ بعض شعرا کے کلام کے بارے میں بھی ان کی رائیں خاص اہمیت رکھتی ہیں لیکن ان کی تعداد بہت کم ہے۔ بعض خامیوں کے باوجود مجموعی طور پر یہ تذکرہ اردو کے نمائندہ تذکروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ شیفتہ کی سخن فہمی اور سخن شناسی کی غیر معمولی شہرت کی وجہ سے اربابِ ذوق اور اہلِ علم کے حلقوں میں بھی وسیع پیمانے پر اس کی پذیرائی ہوئی اور بعد کے بعض تذکرہ نویسوں کے لیے بھی یہ سرچشمۂ تحریک ثابت ہوا۔

اودھ میں تذکرہ نگاری کا یہ دور مصحفی و انشا اور ان کے معاصرین کی ادبی سرگرمیوں سے وابستہ ہے۔ مصحفی جیسا کہ پہلے بھی بیان کیا جا چکا ہے، ۱۱۹۸ھ/۱۷۸۴ء میں لکھنؤ آ گئے تھے۔ انشا، غلام قادر روہیلہ اور مرہٹوں کی باہمی آویزش میں دہلی کی تباہی کے بعد غالباً ۱۲۰۳ھ/۱۷۸۹ء میں وارد ہوئے۔ اس کے بعد ۱۲۰۵ھ/۹۱-۱۷۹۰ء میں شاہ عالم کے فرزند مرشد زادۂ آفاق شہزادہ سلیمان شکوہ اپنی جانشینی کے لیے فضا ہموار کرنے کی غرض سے لکھنؤ پہنچے[1]۔ اس زمانے میں اگرچہ آصف الدولہ بقیدِ حیات تھے اور ان کے دربار میں شعرا کے لیے قدر و منزلت کی کوئی کمی نہ تھی پھر بھی شہزادۂ موصوف کے شہر میں ورود کے ساتھ ہی ادبی محفلوں کی تمام تر رونق ان کے گرد سمٹ آئی۔ سعادت یار خاں

---

[1] سوانحاتِ سلاطین اودھ (قیصر التواریخ) جلد اول ص ۲۸۰

رنگین اس سفر میں شہزادے کے ہم رکاب آئے تھے[1]۔ لکھنؤ میں موجود ممتاز شاعروں میں سے غالباً انشا کو سب سے پہلے آپ کی خدمت میں باریابی اور رسوخ کا شرف حاصل ہوا۔ بعدازاں جب شہزادۂ موصوف نے وسیع پیمانے پر مشاعروں کے انعقاد کا سلسلہ شروع کیا تو ایک دن مصحفی بھی جو اس قسم کی محفلوں کی ترتیب و تنظیم میں دوسرے شعرا کی بہ نسبت زیادہ تجربہ اور مہارت رکھتے تھے، انشا کی وساطت سے "حسب الطلب" حاضر خدمت ہوئے اور اسی تاریخ سے داخلِ ملازمت کر لیے گئے[2]۔ رنگین، انشا اور مصحفی کے علاوہ میر سوز، قلندر بخش جرأت، مرزا نعیم بیگ جوان اور شیخ ولی اللہ محب بھی اس مجلس کے اراکینِ خصوصی میں شامل تھے۔ ان تمام شعرا کو شاہزادے کی سرکار سے ماہوار تنخواہوں کے علاوہ وقتاً فوقتاً گراں قدر تحائف اور انعامات بھی ملتے رہتے تھے۔ چنانچہ مصحفی کا بیان ہے کہ:

> "بعد چندے (از انسلاک در سلکِ ملازمین) از کلام فقیر محظوظ شدہ در جائزۂ قصائدِ مدحیہ کہ مشتمل بر تہنیتِ عیدین بودند بہ انعامِ تبریک مکرر سرِ احقر را از حضیضِ خاک بہ اوجِ افلاک رسانیدند و ہم چنیں قلندر بخش جرأت ... بہ نوازشِ خسروانہ در آمدہ و نیز نوکر شدہ و میر سوز ..... در اوائلِ مشاعرہ بہ انعام یک دوشالہ و یک پٹو سرفرازی یافتہ و میر انشاء اللہ خاں ..... ہمیشہ مورد گوناگوں الطافِ خسروی باشد و چند بار بہ انعام لائقہ قبا و گوشوارہ سرِ مباہات برافراختہ اند"[3]

سلیمان شکوہ کی مصاحبت اور بزم آرائی کے اس زمانے میں کچھ دنوں کی دوستی اور رفاقت کے بعد مصحفی اور انشا کے درمیان اختلافات رونما ہوئے اور مہذب حریفانہ چشمک سے رفتہ رفتہ ایک دوسرے کی تحقیر و تذلیل اور کوبہ کو ہجو سرائی تک نوبت پہنچی۔

---

[1] مجمع الانتخاب مخطوطہ انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی

[2] تذکرہ ہندی ص ۶۶ و ۱۰۱ و ۱۲۱ و ۱۳۱ و عمدہ منتخبہ ص ۳۱۳ و مجموعۂ نغز ص ۲۳۱

[3] تذکرہ ہندی ص ۱۲۱

حتیٰ کہ امیر احمد علوی کے اندازے کے مطابق ۱۲۱۱ھ/۱۷۹۶ء کے قریب مصحفی شہزادے کی ملازمت سے علٰحدہ ہو گئے اور انشا کو ان کے ساتھ اہانت آمیز سلوک کی پاداش میں نواب آصف الدولہ کے حسب الحکم شہر بدر کر دیا گیا۔[1]

ربیع الاوّل ۱۲۱۲ھ/ستمبر ۱۷۹۷ء میں آصف الدولہ کا انتقال ہو گیا۔ ان کے بعد تین ساڑھے تین مہینے تک زمامِ اقتدار وزیر علی خاں کے ہاتھ میں رہی۔ پھر رجب ۱۲۱۲ھ/جنوری ۱۷۹۸ء میں انگریزوں کی تائید و حمایت سے سعادت علی خاں نواب وزیر مقرر ہوئے۔ وزیر علی خاں اور سعادت علی خاں کے درمیان وراثت کی اس کش مکش سے فائدہ اٹھا کر انشا دوبارہ لکھنؤ چلے آئے اور حسب سابق سلیمان شکوہ سے وابستہ ہو گئے۔ چنانچہ مرزا علی لطف اور شاہ کمال کے بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۲۱۵ھ/۱۸۰۰ء میں وہ لکھنؤ میں مقیم اور "مرشد زادۂ آفاق" سے متوسل تھے۔[2] مصحفی کچھ دن تک پریشان حال اور بے روزگار رہنے کے بعد ۱۲۱۷ھ/۱۸۰۲ء کے قریب مرزا محمد تقی ہوس کے یہاں ملازم ہوئے۔[3] ہوس کا تعلق اودھ کے برسرِ اقتدار خاندان سے تھا۔[4] وہ میر حسن کی وفات (محرم ۱۲۰۱ھ/نومبر ۱۷۸۶ء) کے بعد سے مصحفی کے حلقۂ تلامذہ میں داخل تھے[5] اور دوسرے امرا و رؤسا کی طرح اپنے یہاں مشاعرے منعقد کرتے رہتے تھے۔[6] "مخزن الغرائب" مؤلفہ شیخ احمد علی سندیلوی (مرتبہ ۱۲۱۸ھ/۱۸۰۳ء) کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس اثنا میں انشا کسی ناراضگی کے باعث سلیمان شکوہ کی ملازمت سے کنارہ کشی کے بعد کچھ دن

---

[1] ماہنامہ نگار مصحفی نمبر ص ۳۱ و ۳۲

[2] گلشنِ ہند طبعِ ثانی ص ۴۱ و مجمع الانتخاب مخطوطہ انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی ورق ۳۹ الف

[3] ریاض الفصحا ص ۲

[4] تعلیقات تذکرہ ابن طوفان ص ۷۸

[5] ریاض الفصحا ص ۳۶۷

[6] ریاض الفصحا ص ۲

الماس علی خاں خواجہ سرا کی رفاقت میں رہ کر نواب سعادت علی خاں کے مقربینِ خاص میں شامل ہو چکے تھے[1]

انشا اور مصحفی کے معرکوں کے علاوہ مصحفی اور جرأت اور جرأت اور نوا بدایونی کے معارضے بھی اس دور کی ادبی سرگرمیوں میں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ مصحفی اور جرأت کے درمیان چشمک کا آغاز غالباً ۱۲۰۹ھ/۱۷۹۴ء کے قریب ہوا۔ مصحفی اس زمانے کے ایک واقعے کا ذکر کرتے ہوئے ان کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "بہ ہم سرِ من می میرد و در باطن ہمیشہ تخمِ کینہ می کارد"[2] یکتا لکھنوی کا بیان ہے کہ جرأت کے شاگردوں کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ وہ جب مشاعرے میں آتے تو شرکائے محفل میں نصف بلکہ بعض اوقات اس سے بھی زیادہ تعداد ان کے تلامذہ کی ہوتی تھی[3]۔ ادھر مصحفی نے بھی رفتہ رفتہ اپنے گرد کافی شاگرد جمع کر لیے تھے۔ مشاعروں میں ان دونوں گروہوں کے درمیان خوب خوب معرکہ آرائیاں ہوتی رہتی تھیں۔

جرأت و نوا کے درمیان مطارحات و مہاجات کے واقعے تذکرۂ ہندی کی تکمیل (۱۲۰۹ھ/۹۵-۱۷۹۴ء) کے بعد اور ۱۲۲۱ھ/۱۸۰۶ء کے قریب نوا کی سفرِ حج پر روانگی سے قبل پیش آئے۔ نوا اگرچہ یکہ و تنہا تھے لیکن یکتا لکھنوی کے بقول ان معرکوں میں انھوں نے کئی مرتبہ جرأت اور ان کے شاگردوں کو شکستِ فاش دی تھی۔ حتیٰ کہ یہ لوگ ان کی جان کے دشمن ہو گئے۔ نوا بھی ہمیشہ "زبانِ سناں" اور "تیغِ زباں" دونوں سے آمادۂ جنگ رہتے تھے۔ باہمی کشیدگی کا یہ سلسلہ عرصہ تک قائم رہا۔ بالآخر محمد عاشق تصور کی کوششوں سے دونوں حریفوں میں مصالحت ہو گئی[4]

---

[1] بحوالہ دستور الفصاحت مرتبہ مولانا امتیاز علی عرشی حاشیہ ص ۱۰۵

[2] تذکرہ ہندی ص ۸۶

[3] دستور الفصاحت مرتبہ عرشی ص ۹۹

[4] دستور الفصاحت مرتبہ عرشی ص ۱۰۹

۱۲۲۴ھ/۱۸۰۹ء میں جرأت کا انتقال ہوگیا۔[۱] ایک سال کے بعد ۲۰ر شعبان ۱۲۲۵ھ/ ۳۱ر اگست ۱۸۱۰ء کو میر بھی چل بسے۔[۲] ۱۲۲۹ھ/۱۸۱۴ء میں سعادت علی خاں نے وفات پائی اور ان کی جگہ غازی الدین حیدر برسرِ اقتدار آئے۔ ان کے زمانے میں ۳ر جمادی الثانیہ ۱۲۳۲ھ/ ۲۱ر اپریل ۱۸۱۷ء کو انشا بھی جن پر کئی سال سے جنون کی کیفیت طاری تھی، راہیِ ملکِ بقا ہوئے۔[۳] جرأت، میر اور انشا کے اس طرح یکے بعد دیگرے دنیا سے اُٹھ جانے کے بعد میدانِ سخن تنہا مصحفی کے ہاتھ رہ گیا۔ اس زمانے تک مختلف طبقات سے تعلق رکھنے والے تقریباً سو شاعران کے حلقۂ تلمذ میں داخل ہو چکے تھے۔[۴] اس کے علاوہ بھی لکھنوی شعرا کی نوجوان نسل پر ان کے اثرات کافی گہرے تھے۔ نئے شعرا کی یہی نسل جس میں آتش و ناسخ جیسے اساتذۂ سخن بھی شامل ہیں، تیرھویں صدی ہجری کے ربع ثانی و ثالث میں لکھنؤ کے ادبی ماحول کی روحِ رواں بنی۔ ۱۲۴۰ھ/۲۶-۱۸۲۵ء میں مصحفی دنیا سے سدھارے۔[۵] اس کے چھ سال بعد ۱۲۴۶ھ/۳۱-۱۸۳۰ء میں ظہور اللہ خاں نوا کا بھی انتقال ہوگیا۔[۶] ان دونوں شعرا کے ساتھ ادبی معرکہ آرائیوں کا ایک عہد ختم ہوگیا۔

سیاسی سطح پر بھی اس اثنا میں ایک اہم واقعہ یہ رونما ہوا کہ ۱۸ر ذی الحجہ ۱۲۳۴ھ/ ۹ر اکتوبر ۱۸۱۹ء کو غازی الدین حیدر نے انگریزوں کے اشارے پر "ابو المظفر معز الدین شاہ زمن غازی الدین حیدر بادشاہِ غازی" لقب اختیار کر کے حکومتِ اودھ کی خود مختاری

---

[۱] دستور الفصاحت حاشیہ ص ۹۹

[۲] اندراجات سرورق۔ دیوانِ سوم مخزونہ بنارس ہندو یونیورسٹی لائبریری و دیوان چہارم مخزونہ کتب خانہ مہاراجہ محمود آباد

[۳] ماہی "تحریر" نئی دہلی، شمارہ اپریل تا جون ۱۹۷۳ء ص ۴۵

[۴] ریاض الفصحا ص ۲۸۷ [۵] نگار، لکھنؤ۔ مصحفی نمبر ص ۴۴

[۶] تاریخِ رحلت "نوا فخرِ بدایوں بود و زایر" سے نکلتی ہے۔ سہ ماہی نوائے ادب بمبئی، شمارہ اکتوبر ۱۹۶۸ء، ص ۴۰

اور مرکز سے بے تعلقی کا اعلان کر دیا۔[1] نظامِ حکومت کے اس تغیر کی زد سب سے زیادہ شہزادہ سلیمان شکوہ پر پڑی جنھیں اس وقت تک شاہ دہلی سے نسبتِ فرزندی کی بنا پر اقتدارِ اعلیٰ کا نمائندہ اور خصوصی تعظیم و تکریم کا مستحق سمجھا جاتا رہا تھا۔ غازی الدین حیدر اعلانِ بادشاہت کے بعد بندگی کے آبائی مراسم موقوف کر کے شہزادے سے مساویانہ سلوک کے خواستگار ہوئے۔ سلیمان شکوہ اگرچہ بدلے ہوئے حالات میں بظاہر اس خواہش کے احترام پر رضامند ہو گئے لیکن اندرونی طور پر راہ و رسم کی یہ تبدیلی دونوں خاندانوں کے درمیان ایک قسم کی کشیدگی اور منافرت کا بیج بو گئی۔ یہاں تک کہ ۱۲۴۳ھ/۱۸۲۷ء میں نصیر الدین حیدر کی تخت نشینی کے بعد سلیمان شکوہ نے لکھنؤ کی سکونت ترک کر کے آگرے میں بود و باش اختیار کر لی۔[2]

نصیر الدین حیدر ۱۲۵۳ھ/۱۸۳۷ء تک برسرِ حکومت رہے۔ ان کے مزاج پر مذہبیت غالب تھی، اس لیے ان چند شاعروں کے علاوہ جن کا موضوعِ سخن مرثیہ گوئی تھی، عام شاعر ان کے دربار میں بار نہ پا سکے۔ احمد حسین سحرؔ کاکوروی نے لکھا ہے کہ انھوں نے ظہور اللہ خاں نوّا کو شاہنامہ نظم کرنے کا حکم دیا تھا[3] لیکن نوّا ان کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد صرف تین سال زندہ رہے اور ان کی اس خواہش کی تکمیل نہ کر سکے۔ شعر و ادب سے نصیر الدین حیدر کی عدم دلچسپی اور سلیمان شکوہ کے لکھنؤ سے رخصت ہو جانے کے باعث درباری سطح پر شعرا کی پرورش اور سرپرستی میں کچھ کمی ضرور آئی لیکن بحیثیت مجموعی اردو شاعری کی ترقی اور مقبولیت پر حالات کی اس تبدیلی کا کوئی منفی اثر مرتب نہ ہوا۔ لکھنؤ میں یوں بھی ہر طرف تموّل اور خوش حالی کا دور دورہ تھا اور شعرا کی سرپرستی لازمۂ امارت سمجھی جاتی تھی۔ امرائے شہر میں ایسے لوگ خاصی تعداد میں موجود تھے جو

---

[1] تاریخ اودھ از نجم الغنی جلد چہارم ص ۱۴۴

[2] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو بہادر شاہ ظفر ص ۱۰۱ تا ۱۰۳

[3] بہارِ بے خزاں مخطوطہ دار العلوم، ندوۃ العلما لکھنؤ

اپنے یہاں مشاعرے منعقد کرتے اور شعرا کو نوازتے رہتے تھے۔ مصحفی کے ساتھ مرزا محمد تقی ہوسؔ کے حُسنِ سلوک اور شعر و ادب سے ان کی دل چسپی کا ذکر گذشتہ سطور میں کیا جا چکا ہے۔ میرزا سیف علی خاں شگفتہ، نواب کلب علی خاں، جلال الدولہ مہدی علی خان بہادر شجاعت جنگ متخلص بہ مہدی اور افتخار الدولہ معین الملک میرزا قمر الدین احمد خان بہادر صولت جنگ معروف بہ مرزا حاجی قمرؔ بھی ادب نوازوں کے اسی زمرے میں شامل ہیں۔ شگفتہ نواب شجاع الدولہ کے صاحبزادے تھے۔ مصحفی نے ان کے بارے میں لکھا ہے :

"بہ مقتضائے موزونیٔ طبع کہ از طفولیت بود، خود را ہمیشہ مصروفِ غزل گوئی داشتند۔ در سرکارِ ایشاں از موزونانِ شہر یعنی مرزا کاظم علی جوانؔ تخلص و منتظر و شاہ ملول الہامؔ آمد و شدمی کردند۔"[1]

کلب علی خاں اور مہدی علی خاں، نواب سعادت علی خاں کے فرزند تھے۔ کلب علی خاں کو بظاہر سخن گوئی سے تعلق خاطر نہ تھا لیکن سخن فہمی اور سخن نوازی انھیں وراثت میں ملی تھی۔ ۱۲۳۰ھ/۱۸۱۵ء کے قریب کچھ دن تک مصحفی ان کے دربار سے بھی وابستہ رہے تھے۔[2] مہدی علی خاں مہدیؔ کو دوسرے "فنونِ دانش مندی و دانائی" کے ساتھ فکرِ شعر میں بھی مہارت حاصل تھی۔ ۱۲۳۶ھ/۱۸۲۱ء میں مصحفی ان کے متعلق لکھتے ہیں :

"در سرکارِ دولت مدار ایشان بعضے از صاحبِ کمالانِ ایں فن بہ صیغۂ شاعری عزِ امتیاز دارند۔ دراں جملہ فقیر ہم داخل است و پیش ازیں در حینِ حیاتِ نواب مغفور (سعادت علی خاں) ہم با شعرائے چند ملازمِ ایشاں ماندہ۔"[3]

قمر الدین احمد قمرؔ اور ان کے والد مرزا فخر الدین احمد خاں عرف مرزا جعفر، غازی الدین حیدر کے معتمدینِ خاص میں سے تھے۔[4] جعفر فارسی میں اور قمرؔ اردو میں فکرِ شعر کرتے تھے۔

---

[1] ریاض الفصحا ص ۱۵۵

[2] ریاض الفصحا ص ۲۵۰ [3] ریاض الفصحا ص ۲۸۳

[4] تعلیقات تذکرہ ابن طوفان ص ۶۷ و ۶۸

مولوی عبدالقادر رام پوری نے اپنے روزنامچے میں ۱۲۲۹ھ/۱۸۱۴ء کے سفر لکھنؤ کی روداد بیان کرتے ہوئے مرزا جعفر کے یہاں مشاعرے کے انعقاد کا ذکر کیا ہے[1]۔ مصحفی اور یکتا لکھنوی کے بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مشاعرہ مرزا حاجی قمر کی ادب دوستی کا رہینِ منت تھا[2]۔ حسنِ اتفاق سے اس زمانے میں شاہ نصیر بھی اپنے بیٹے کی تلاش میں لکھنؤ آئے ہوئے تھے۔ مصحفی، قتیل اور ناسخ وغیرہ کے ساتھ وہ بھی اس مشاعرے میں شریک ہوتے اور اپنے کلام سے اہلِ محفل کو محظوظ کرتے تھے[3]۔ لکھنؤ میں مرثیہ نگاری کا رجحان بھی اسی دور میں عام ہوا، جس کے ساتھ اردو شاعری مشاعرے کی تفریحی محفلوں تک محدود نہ رہ کر عزاداری کی سنجیدہ مجلسوں میں بھی باریاب ہوئی۔ اس طرح اسے ایک نئے میدان میں اپنے امکانات کو بروے کار لانے اور اپنے دائرۂ اثر کو وسیع تر کرنے کے مواقع حاصل ہوئے۔

لکھنؤ کی یہ ادبی فضا جس کے زیرِ سایہ گروہ بندی اور معرکہ آرائی کے رجحانات خصوصیت کے ساتھ پروان چڑھے، تذکرہ نویسی کے لیے حد درجہ معاون اور سازگار ثابت ہوئی۔ مصحفی جو ۱۱۹۹ھ/۱۷۸۵ء میں "عقدِ ثریا" کے نام سے شعرائے فارسی کا ایک تذکرہ مرتب کر چکے تھے، اس دور کے اہلِ قلم میں اردو تذکرہ نویس کی حیثیت سے سب سے پہلے سامنے آئے۔ ۱۲۰۰ھ/۱۷۸۶ء کے قریب انھوں نے میر حسن کے صاحبزادے اور اپنے شاگرد رشید میر مستحسن خلیق کی فرمائش پر "تذکرۂ ہندی" کی ترتیب کا کام شروع کیا۔ یہ تذکرہ نظرِ ثانی اور بعض اضافوں اور ترمیموں کے بعد ۱۲۰۹ھ/۹۵، ۱۷۹۴ء میں مکمل ہوا۔ ۱۲۲۱ھ/۱۸۰۶ء میں لالہ چنی لال حریف کے حسبِ فرمائش انھوں نے ایک اور تذکرے "ریاض الفصحا" کی داغ بیل ڈالی تاکہ ان شاعروں کو جو کسی وجہ سے پچھلے تذکروں میں جگہ نہ پا سکے تھے یا گزری ہوئی درمیانی مدت میں منظرِ عام پر آئے تھے، اہلِ ذوق سے متعارف کرایا جا سکے۔ اس تذکرے کی تکمیل

---

[1] بحوالہ دستور الفصاحت حاشیہ ص ۹۳ و ۱۱۴

[2] ریاض الفصحا ص ۶۹۔ دستور الفصاحت مرتبہ عرشی ص ۱۱۴

[3] دستور الفصاحت مرتبہ عرشی ص ۱۱۴

۱۲۳۶ھ/۱۸۲۱ء میں ہوئی ہے اور اس میں اردو اور فارسی دونوں زبانوں کے شاعر شریک ہیں لیکن غالب تعداد شعرائے ریختہ ہی کی ہے[1]۔

مصحفی کے ان تذکروں کی نمایاں اور امتیازی خصوصیت سوانحی اور تنقیدی عناصر کا امتزاج ہے۔ تواریخ اور سنین کے حوالے ان کے یہاں کم ہی ملتے ہیں لیکن ہر شاعر کے حال میں حتی المقدور اس کی زندگی اور شخصیت کے مختلف گوشوں کے جائزے کی کوشش اور اس کی عمر کا تخمینی تعین ان کے معمولات میں داخل رہا ہے۔ جن شاعروں کے کلام کے تفصیلی مطالعے کا انھیں موقع ملا ہے، ان کے ذکر میں انھوں نے ان کے معیارِ سخن کے بارے میں اظہارِ رائے اور فنی کمالات کے اعتراف کا بھی پورا اہتمام کیا ہے۔ کلام کے متعلق ان کی رائے بالعموم بڑی جامع اور فیصلہ کن ہوتی ہے۔ زندگی، شخصیت اور فن تینوں کے اجتماعی مطالعے کا یہ رجحان اردو تذکرہ نویسی کو مصحفی کی دین ہے اور اس نے انھیں اس دور کے دوسرے تمام تذکرہ نگاروں سے سربلند کر دیا ہے۔

مصحفی کے علاوہ اس دور سے متعلق اودھ کے دوسرے تذکرہ نگار شیخ امام بخش کشمیری ہیں[2]۔ امام بخش کے سلسلے میں مصحفی کا بیان ہے کہ انھوں نے صرف تذکرہ نگار کہلائے

---

[1] جناب مشیر احمد علوی نے مزید دو تذکروں "یدِ بیضا" اور "نورِ ازل" کو مصحفی سے منسوب کرتے ہوئے "نگار" کے مصحفی نمبر میں "مصحفی کی دو گم شدہ بیاضیں" کے عنوان سے ایک تفصیلی مضمون سپردِ قلم کیا ہے لیکن ذاتی تلاش و تحقیق اور بعض باخبر حضرات سے تبادلۂ خیال کے بعد یہ ثابت ہوا کہ علوی صاحب کی یہ دریافت ایک جعل سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ متذکرہ مضمون میں جو اقتباسات بطور نمونہ پیش کیے گئے ہیں ان سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ اگر ان تذکروں کا کوئی خارجی وجود تھا بھی تو یہ "عقدِ ثریا"، "تذکرہ ہندی" اور "ریاض الفصحا" کے مختلف اجزا کو یکجا کر کے مرتب کر لیے گئے تھے۔

[2] جناب امیر احمد علوی نے پیر بخش مسرور کاکوروی شاگرد مصحفی سے بھی شعرائے اردو کا ایک تذکرہ منسوب کیا ہے جس کا نام "بیاضِ صبحِ ازل" اور تاریخ تکمیل ۱۲ ربیع الاول ۱۲۳۹ھ (۱۶ نومبر ۱۸۲۳ء) بتائی گئی ہے، اس تذکرے کے متعلق ان کی تمام تر معلومات جناب مشیر احمد علوی کے مرتب کیے ہوئے ایک قلمی نسخے پر مبنی ہے، اس لیے ہمیں مصحفی کی دو بیاضوں کی طرح اس کا وجود بھی مشکوک معلوم ہوتا ہے۔

جانے کے شوق میں ان (مصحفی) سے "تذکرہ ہندی" کے مسودات مستعار لے کر ان کی بنیاد پر اپنے ایک متوسل میر شاہ حسین حقیقت سے ایک تذکرہ مرتب کرایا تھا۔[1] بہ الفاظ دیگر اس تذکرے کی حیثیت "تذکرۂ ہندی" کے ایک چربے یا نقل سے زیادہ نہ تھی۔ مصحفی کے علاوہ سعادت خاں ناصر نے بھی ایک جگہ اپنے تذکرے کے مآخذ کے ذیل میں "تذکرۂ احبا" کے نام سے اس کا حوالہ دیا ہے[2] لیکن ابھی تک اس کا کوئی نسخہ دستیاب نہیں ہوا۔

تذکروں کے پہلو بہ پہلو یہاں دو ایسی کتابوں کا ذکر بھی ضروری ہے جو مخصوص اصطلاحی معنوں میں تذکروں کی تعریف میں نہیں آتیں لیکن ان کے بعض حصے شعرائے اردو کے تعارف کے لیے مخصوص ہیں اور اس اعتبار سے کافی اہمیت رکھتے ہیں۔ ان میں سے پہلی کتاب احد علی خاں یکتا لکھنوی کی "دستور الفصاحت" ہے جو ۱۲۳۰ھ/۱۸۱۵ء کے قریب تصنیف ہوئی اور ۱۲۴۹ھ/۳۴-۱۸۳۳ء میں نظر ثانی کے بعد از سر نو مرتب کی گئی۔ اس کتاب کا خاتمہ اردو کے پینتیس (۳۵) صاحب طرز اور ممتاز شعرا کے ذکر پر مشتمل ہے۔ کمیت کے اعتبار سے یہ حصہ بظاہر ناقابل اعتنا معلوم ہوتا ہے لیکن اپنے محدود دائرے میں یکتا نے جو مفید اور معتبر معلومات فراہم کی ہے اس کی وجہ سے اس کی افادیت کافی بڑھ گئی ہے۔ کتاب کا مقدمہ اردو زبان کی ساخت اور حروف تہجی سے متعلق ہے۔ جناب عرشی رام پوری نے ان دونوں ابتدائی اور آخری حصوں کو یکجا کر کے اسے ایک تذکرے کی صورت دے دی ہے۔

دوسری کتاب بہادر سنگھ دہلوی کی تالیف "یادگار بہادری" ہے۔ یہ کتاب جسے مختلف علوم و فنون کی انسائکلوپیڈیا کہا جا سکتا ہے، کئی سال کی مسلسل کوشش کے بعد ۱۲۵۰ھ/۱۸۳۴ء کے قریب لکھنؤ میں پایۂ تکمیل کو پہنچی ہے۔ مولف نے اس میں دوسرے علوم و فنون کے ماہرین کی طرح مختلف مشرقی زبانوں کے مشہور و ممتاز شعرا کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ ہر زبان کے شاعروں کے لیے انھوں نے ایک علٰحدہ فصل مخصوص کی ہے۔ شعرائے اردو سے متعلق فصل

---

[1] تذکرہ ہندی ص ۸۶ و ۸۷

[2] خوش معرکۂ زیبا۔ مخطوطۂ لکھنؤ یونیورسٹی لائبریری ورق ۳۱۴ ب

میں بانوے (۹۲) شاعروں کے حالات اور کلام کے مختلف نمونے شامل ہیں۔ ان میں سے بیشتر شعرا کے بارے میں بہادر سنگھ کے بیانات کا ماخذ تذکرۂ "نکات الشعرا" ہے لیکن بعض جگہ انھوں نے ذاتی واقفیت کی بنیاد پر میرؔ کی معلومات پر اضافے بھی کیے ہیں اور بعض شاعروں کے متعلق تمام تر معلومات خود ہی فراہم کی ہے۔ اس لیے تذکروں کی بنیاد پر تاریخ ادب کے مطالعے کے سلسلے میں "خاتمۂ دستور الفصاحت" کی طرح "یادگار بہادری" کے اس حصے کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

دکن میں پچاس سال کے اس عرصے میں شاہ کمال الدین حسینی عرف شاہ کمال کے "مجمع الانتخاب" کے علاوہ کسی اور تذکرے کی ترتیب کا پتا نہیں چلتا۔ شاہ کمال کڑہ مانک پور (ضلع باندہ، یو۔پی) کے رہنے والے تھے[۱] آصف الدولہ کے عہد میں انھوں نے لکھنؤ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ ۱۲۱۵ھ/۱۸۰۰ء میں وہ لکھنؤ سے حیدرآباد چلے گئے[۲]، جہاں ۱۲۱۸ھ/۱۸۰۳ء میں انھوں نے یہ تذکرہ مرتب کیا[۳] لیکن اس کے لیے تمام ضروری مواد وہ لکھنؤ کے زمانۂ قیام ہی میں جمع کر چکے تھے۔ اس لحاظ سے اس کی تالیف درحقیقت دکن کی فضائے شعری سے زیادہ اودھ کے ادبی ماحول کی رہینِ منت ہے۔ کمالؔ نے اس تذکرے میں شعرا کے حالاتِ زندگی سپردِ قلم کرنے سے زیادہ کلام کے انتخاب پر زور دیا ہے۔ حالات کے ضمن میں جو کچھ لکھا گیا ہے، وہ بالعموم میرؔ، قائمؔ اور مصحفیؔ کے تذکروں سے ماخوذ ہے، اس لیے اس تذکرے سے مختلف شاعروں کے منتخب اور متنوع سرمایۂ کلام کے علاوہ کوئی خاص معلومات حاصل نہیں ہوتی۔

دکن کی طرح عظیم آباد اور اس کے قرب و جوار میں بھی تیرھویں صدی ہجری کے نصف اول میں تذکرہ نگاری کے رجحان کو زیادہ مقبولیت حاصل نہیں ہوئی چنانچہ "تذکرۂ عشقیؔ" مولفہ شیخ وجیہ الدین عشقیؔ عظیم آبادی کے علاوہ اب تک اس دور سے متعلق کسی دوسرے اردو تذکرے

---

[۱] تذکرہ ہندی ص ۱۹۰

[۲] مجمع الانتخاب مخطوطہ انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی ورق ۴ ب

[۳] مجمع الانتخاب مخطوطہ انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی ورق ۶ ب

کا سراغ نہیں ملا ہے۔ یہ تذکرہ سرسری اندازے کے مطابق ۱۱۸۷ھ/۱۷۷۲ء اور ۱۲۳۰ھ/۱۸۱۵ء کے درمیانی عرصے کی تالیف ہے۔ لیکن اس کے بیشتر حصے تیرھویں صدی کی پہلی تین دہائیوں کے درمیان اور بالخصوص دوسرے عشرے میں لکھے گئے ہیں۔ عمومی اندازِ تعارف کے لحاظ سے اس تذکرے کا فنی معیار اوسط درجے کے عام تذکروں سے زیادہ مختلف نہیں لیکن خاص خاص شاعروں کے ذکر میں عشقی نے اجمال و اختصار کی عام روش ترک کر کے ان کی زندگی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے کہیں کہیں سنینِ وفات کے حوالے بھی دیے ہیں اور منظوم تاریخیں بھی نقل کی ہیں۔ شعرا کی مجموعی تعداد کو دیکھتے ہوئے اس قسم کے مستثنیات کا تناسب اگرچہ بہت کم ہے تاہم ان کی وجہ سے تذکرے کی اہمیت دوبالا ہو گئی ہے۔

دہلی، لکھنؤ، حیدرآباد اور پٹنہ کے پہلو بہ پہلو تذکرہ نگاری کے اس دور کی تاریخ میں سرزمینِ بنگال بھی ایک اہم حیثیت کی حامل ہے۔ یہاں جو تذکرے لکھے گئے، ان میں حیدر بخش حیدری کا "گلشنِ ہند" سرفہرست ہے۔ حیدری کے اپنے بیان کے مطابق انھیں اس کام کی ترغیب رجب ۱۲۱۴ھ/ دسمبر ۱۷۹۹ء میں بنارس سے مرشد آباد کے سفر کے دوران اپنے ایک رفیقِ سفر مرزا محمد علی دہلوی سے ملی تھی۔ شعرائے اردو کا یہ پہلا تذکرہ ہے جو اردو زبان میں مرتب ہوا ہے۔ اس لحاظ سے اس کی اہمیت مسلم ہے لیکن چونکہ صعوباتِ سفر اور تکالیفِ زمانہ سے پریشان طبعی کے زمانے میں اور نہایت رواروی کے عالم میں لکھا گیا ہے حتّٰی کہ مولوی غلام حسین شہید غازی پوری اور مظہر علی خاں ولا کے علاوہ کسی شاعر کے حالات بھی ایک دو جملوں سے متجاوز نہیں، اس لیے اسے اس دور کے تذکروں میں کوئی خاص مقام نہیں دیا جا سکتا۔ علاوہ بریں ڈاکٹر اقتدا حسن کی تحقیق کے مطابق یہ "تذکرہ" دراصل "گلزار ابراہیم" کا تلخیص شدہ ترجمہ ہے[1]۔

بنگال میں مرتب ہونے والا شعرائے اردو کا دوسرا تذکرہ مرزا علی لطف کا "گلشنِ ہند" ہے یہ تذکرہ فورٹ ولیم کالج کے ترجمہ و تالیف کے سلسلے کی ایک کڑی ہے اور حیدری کے

---

[1] حیدری کا تذکرہ گلشن ہند، مشمولہ سہ ماہی "اردو" کراچی شمارہ جولائی ۱۹۶۶ء، ص ۷۳

"گلشنِ ہند" کی طرح اردو ہی میں لکھا گیا ہے۔ جنگِ بکسر (۱۷۶۴ء/۱۱۷۸ھ) میں فتح یابی کے بعد انگریزوں نے ہندوستان میں اپنی سیاسی بالادستی کے استحکام اور نظم و نسق کی استواری کے لیے جن مختلف منصوبوں پر عمل کیا ان میں انگریز افسروں اور دوسرے ملازموں کے لیے مقامی زبانوں اور بالخصوص اردو کی تعلیم کا انتظام بھی شامل تھا۔ ۱۸۰۰ء/۱۲۱۵ھ میں کلکتے میں جو ایسٹ انڈیا کمپنی کا مستقر تھا، فورٹ ولیم کالج کا قیام اسی مقصد کے تحت عمل میں آیا۔ اس ادارے کے زیرِ انتظام آسان زبان میں درسی کتابوں کی ترتیب و تالیف کے فرائض کی انجام دہی کے لیے فارسی، اردو اور دوسری ہندوستانی زبانوں سے واقفیت رکھنے والے مستشرقین کی سربراہی میں ملک کے بہترین زبان داں اور اہلِ قلم ملازم رکھے گئے۔ چونکہ اس زمانے تک اردو میں نثر نگاری کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی گئی تھی اور ایسی کتابیں یکسر مفقود تھیں جن کی وساطت سے غیر ملکی طالب علم روزمرہ زبان سے صحیح طور پر واقفیت حاصل کر سکیں۔ اس لیے عربی، فارسی اور سنسکرت کی مشہور کتابیں اردو میں ترجمہ کی گئیں۔ اس کے ساتھ ہی مستند شاعروں کے کلام کے مجموعے بھی خاص اہتمام کے ساتھ مرتب کیے گئے۔ اس کام میں بعض ایسے اربابِ قلم نے بھی ہاتھ بٹایا جن کا کالج سے براہ راست کوئی تعلق نہ تھا۔ مرزا علی لطف غیر متعلق مصنفین کے اسی زمرے میں آتے ہیں۔ "گلشنِ ہند" انھوں نے کالج کے شعبۂ ہندوستانی کے سربراہ ڈاکٹر گلکرسٹ کی فرمائش پر علی ابراہیم خلیل کے تذکرے "گلزار ابراہیم" سے ۱۸۰۱ء/۱۲۱۵ھ میں ترجمہ کیا ہے۔ لیکن اس ترجمے کو صرف ترجمہ نہیں کہا جا سکتا کیونکہ مترجم نے خلیل کے بیانات پر اپنی طرف سے جو اضافے کیے ہیں، وہ کیفیت اور کمیت دونوں ہی کے لحاظ سے بہت اہم ہیں اور ان کے واسطے سے بہت سی نئی باتیں ہمارے علم میں آتی ہیں۔ اس لیے جہاں یہ تذکرہ اپنے وسیلۂ اظہار کی بنا پر اردو کے لسانی ارتقا اور اسالیبِ نثر کے مطالعے کے سلسلے میں غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے، وہیں مواد کی گراں مایگی کے اعتبار سے بھی اس کی حیثیت درجۂ اوّل کے دوسرے تذکروں سے کسی طرح کم نہیں۔

فروری ۱۸۰۴ء (ذی قعدہ ۱۲۱۸ھ) میں گلکرسٹ کے مستعفی ہو جانے کے باعث فورٹ ولیم کالج کے شعبۂ ہندوستانی کی تصنیفی و تالیفی سرگرمیاں تقریباً ختم ہو گئیں لیکن اس ادارے

کے زیرِ اثر سادہ و سلیس زبان میں نثر نگاری کی جو تحریک شروع ہوئی تھی، وہ رفتہ رفتہ ملک کے گوشے گوشے میں عام ہوگئی۔ خود کلکتے میں بعد کے زمانے میں جو کتابیں تصنیف ہوئیں، ان میں لالہ بینی نرائن دہلوی اور ان کے بڑے بھائی لالہ کھیم نرائن رنج کی کئی داستانیں کافی اہمیت رکھتی ہیں۔ بینی نرائن کی تصانیف میں شعرائے اردو کا ایک تذکرہ "دیوانِ جہاں" بھی شامل ہے۔ یہ تذکرہ ۱۲۲۹ھ/۱۸۱۴ء میں مرتب ہوا ہے[1]۔ حیدر بخش کے "گلشنِ ہند" کی طرح اس تذکرے میں بھی شعرا کے حالات حد درجہ اختصار کے ساتھ لکھے گئے ہیں لیکن کلام کے انتخاب میں خاصی وسعت اور باقاعدگی نظر آتی ہے۔ اس ضمن میں مولف نے ذاتی پسند اور انتخاب کے اصول کو نظر انداز کر کے بالالتزام ہر شاعر کے ذکر میں اس کی چند مکمل غزلیں نقل کر دی ہیں تاکہ کلام کے حسن و قبح اور پست و بلند کا کوئی پہلو قارئین کی نگاہ سے مخفی نہ رہے۔ بعض جگہ غزل کے علاوہ دوسری اصنافِ سخن کے نمونے بھی شاملِ انتخاب کیے گئے ہیں۔ آخر میں بینی نرائن نے کلکتے کے ایک مشاعرے کی چند طرحی غزلیں نقل کر دی ہیں۔ یہ مشاعرہ ۲۵ر جولائی ۱۸۱۲ء کو منعقد ہوا تھا۔ "دیوان جہاں" کے بعد ۱۲۵۰ھ/۱۸۳۵ء تک بنگال میں شعرائے اردو کا کوئی اور تذکرہ نہیں لکھا گیا۔

ان تذکروں کے ذکر کے ساتھ ۱۱۶۵ھ/۱۷۵۲ء اور ۱۲۵۰ھ/۱۸۳۵ء کے درمیان ہندوستان کے مختلف ادبی مراکز میں اردو تذکرہ نویسی کے فن کا یہ اجمالی جائزہ ختم ہو جاتا ہے۔ آئندہ اوراق اسی درمیانی مدت کے اندر مرتب ہونے والے تمام اہم اور دستیاب تذکروں کے تفصیلی مطالعے پر مشتمل ہیں۔

---

[1] دیوانِ جہاں مرتبہ کلیم الدین احمد کے ترقیمے کی رو سے یہ تذکرہ "سی ام ماہ ستمبر ۱۸۱۲ء" کو مکمل ہو چکا تھا۔ لیکن اس کی تکمیل کی یہ تاریخ بوجوہ قابلِ قبول نہیں۔

نکات الشعرا اور دوسرے ابتدائی تذکرے

زیرِ نظر باب کے تحت ہم تذکرہ نگاری کے میدان میں اردو کے ادیبوں کی ان ابتدائی کوششوں کا جائزہ لیں گے جو ۱۱۶۵ھ/۱۷۵۲ء اور اس کے بعد کے چند برسوں کی مختصر سی مدت میں روبہ عمل آئی ہیں۔ اس مقصد کے لیے میرؔ کے "نکات الشعرا"، حمیدؔ اورنگ آبادی کے "گلشنِ گفتار"، سید فتح علی گردیزی کے "گلشنِ راز" یا "تذکرہ ریختہ گویاں"، فتوتؔ کے "ریاضِ حسنی" اور قائمؔ کے "مخزن نکات" کا انتخاب کیا گیا ہے۔ "نکات الشعرا" اور "گلشنِ گفتار" دونوں ۱۱۶۵ھ/۱۷۵۲ء کی تالیف ہیں اور ان کے درمیان تقدیم و تاخیر کے تعین کی کوئی ٹھوس بنیاد موجود نہیں لیکن قطع نظر اس سے کہ میرؔ صاحب اردو ادب کی تاریخ میں ہر طرح حمیدؔ اورنگ آبادی پر فوقیت رکھتے ہیں، چونکہ ہمارے یہاں تذکرہ نگاری کے موضوع پر بیشتر کام شمالی ہند میں ہوا ہے اور میرؔ صاحب نے اپنے بعد آنے والے تذکرہ نگاروں کی زیادہ بہتر انداز میں رہنمائی کی ہے اس لیے بہ لحاظِ ترتیب ان کے تذکرے کو "گلشنِ گفتار" پر ترجیح دی گئی ہے۔ باقی تذکروں کے معاملے میں اس قسم کے کسی خلطِ مبحث کا امکان نہیں، اس لیے ان کے درمیان ترتیب کے سلسلے میں تحقیقی طور پر متعین کیے ہوئے سنینِ تکمیل کو معیار بنایا گیا ہے۔

نکات الشعرا

میر تقی میرؔ (متوفی ۱۲۲۵ھ/۱۸۱۰ء) نے فارسی نثر میں تین کتابیں "نکات الشعرا"، "ذکرِ میر" اور "فیضِ میر" اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ ان میں سے جو شہرت و مقبولیت "نکات الشعرا" کے حصے میں آئی ہے وہ کسی دوسری کتاب کو حاصل نہیں۔ شعرائے اردو کا یہ تذکرہ انجمن ترقی اردو ہند

اورنگ آباد دکن کی جانب سے دو مرتبہ شائع ہو چکا ہے۔ پہلا ایڈیشن ۱۹۲۲ء میں نواب صدر یار جنگ حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے مقدمے کے ساتھ نظامی پریس بدایوں سے چھپ کر شائع ہوا تھا۔ دوسرا ایڈیشن ۱۹۳۵ء میں بابائے اردو مولوی عبدالحق نے ترتیب دیا جس کی طباعت غالباً انجمن کے ذاتی پریس ہی میں عمل میں آئی۔ موخرالذکر ایڈیشن جس قلمی نسخے کی بنیاد پر مرتب کیا گیا ہے، ترقیمے کے مطابق اس کی کتابت سید عبدالولی عزلت سورتی کی فرمائش پر سید عبدالنبی ابن سید محمود نے ۱۷ رمضان المبارک ۱۱۷۲ھ (۱۴ مئی ۱۷۵۹ء) کو اورنگ آباد میں مکمل کی تھی[1]۔ یہ ترقیمہ اشاعتِ اوّل میں شامل نہیں اس کے باوجود بعض حضرات کا خیال ہے کہ انجمن ترقی اردو کی یہ دونوں اشاعتیں ایک ہی نسخے پر مبنی ہیں لیکن متعدد داخلی و خارجی شواہد کی بنا پر یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ نواب صدر یار جنگ اور مولوی عبدالحق دونوں نے دو علٰحدہ علٰحدہ نسخوں کو اپنے مرتب کردہ متن کی بنیاد بنایا ہے[2]۔ تذکرے کا تیسرا ایڈیشن جنوری ۱۹۷۲ء میں ڈاکٹر محمود الٰہی صدر شعبۂ اردو گورکھپور یونیورسٹی نے مرتب کر کے شائع کیا ہے۔ یہ ایڈیشن پیرس کے قومی کتب خانے کے خطی نسخے پر مبنی ہے جو "بندر سورت" میں نقل کیا گیا ہے اور چہار شنبہ ۱۷ ماہ شوال ۱۱۷۸ھ (۱۰ اپریل ۱۷۶۵ء) کو مکمل ہوا ہے۔ اس نسخے کے کاتب نے چوبیس[24] شعرا کے تراجم ان کے اشعار کو "پروپوچ لایعنی" قرار دیتے ہوئے قلم انداز کر دیے ہیں۔ اس کے علاوہ ورق نمبر ۲ بھی غائب ہے۔ ایسا ہی ایک ناقص قلمی نسخہ رضا لائبریری رام پور میں بھی موجود ہے۔ ان مطبوعہ اور غیر مطبوعہ نسخوں کے علاوہ بعض حضرات نے سر سلیمان کلیکشن، مولانا آزاد لائبریری، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں محفوظ ایک بیاض کے چند منتشر اوراق کو بھی اس تذکرے کے اجزائے پریشان قرار دے کر کچھ نتائج اخذ کیے ہیں لیکن یہ محض قیاسات ہیں اور حقیقت سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ یہ اوراق "نکات الشعرا"

---

[1] یہ نسخہ عام اطلاع کے برخلاف انجمن ترقی اردو ہند نئی دہلی کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔

[2] تفصیل کے لیے دیکھیے راقم السطور کا مضمون "نکات الشعرا کے مختلف خطی نسخے" مشمولہ مجلہ "نقوش" لاہور "میر نمبر" جلد سوم، بابت اگست ۱۹۸۳ء

کے بجائے کسی اور ہی تذکرے کے اجزا معلوم ہوتے ہیں[1]۔

میر صاحب نے یہ تذکرہ کس سنہ میں مرتب کیا، اس سلسلے میں ان کا کوئی واضح اور صریح بیان موجود نہیں لیکن بعض بیانات کی روشنی میں اس تحقیق طلب مسئلے کا حل تلاش کیا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر تذکرے کے بالکل ابتدائی صفحات میں رائے انند رام مخلص کے بارے میں کہا گیا ہے کہ:

"از مدتے آزارِ نفث الدم داشت، قریب یک سال است کہ درگذشت"[2]

رائے لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی کے مطابق مخلص کا انتقال ۱۱۶۴ھ/۱۷۵۱ء میں ہوا ہے[3]۔ لالہ بھگوان داس ہندی بھی اس حادثے کو احمد شاہ کے چوتھے سال جلوس یعنی ۲۷ ربیع الثانی ۱۱۶۴ھ/۱۴ مارچ ۱۷۵۱ء اور ۲۶ ربیع الثانی ۱۱۶۵ھ/۲ مارچ ۱۷۵۲ء کے درمیانی عرصے کا واقعہ قرار دیتے ہیں[4]۔ اس طرح یہ حقیقت پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ میر صاحب نے ان کا حال ۱۱۶۵ھ/۱۷۵۲ء میں سپردِ قلم کیا ہے اور یہی تذکرے کا سالِ ترتیب ہے۔

دوسرے کلیدی اشارات میں جن سے نکات الشعرا کے زمانۂ ترتیب کے تعین میں مدد ملتی ہے سید عبدالولی عزلت کے دہلی میں ورود و قیام سے متعلق بیان سرفہرست ہے۔ میر صاحب نے انھیں "تازہ واردِ ہندوستان" (کہ عبارت از شاہجہاں آباد است) قرار دیا ہے[5]، اور متعدد شاعروں کے تعارف میں ان کی بیاض اور زبانی گفتگو سے استفادے کے حوالے دیے ہیں۔ علامہ غلام علی آزاد بلگرامی کی تحریر کے مطابق عزلت ۲۰ جمادی الاولیٰ ۱۱۶۴ھ

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیے راقم السطور کا مضمون "نکات الشعرا کے مختلف خطی نسخے" مشمولہ مجلہ "نقوش" میر نمبر جلد سوم بابت اگست ۱۹۸۳ء

[2] "نکات الشعرا" طبع ثانی ص ۹

[3] "گل رعنا" ص ۱۲۴

[4] سفینہ ہندی ص ۱۹۶

[5] نکات الشعرا طبع ثانی ص ۹۲

(۵/اپریل ۱۷۵۱ء) کو دہلی میں وارد ہوئے تھے[1] اس لحاظ سے ان تمام شعرا کے حالات یقینی طور پر اس تاریخ کے بعد لکھے گئے ہوں گے۔ اس زمانے کو بوجوہ ۱۱۶۴ھ/۱۷۵۱ء کے نصفِ آخر اور ۱۱۶۵ھ/۱۷۵۲ء کے درمیان محدود کیا جا سکتا ہے۔

میر صاحب نے بیدل، گرامی اور مخلص کے حالات میں خان آرزو کے تذکرے (مجمع النفائس) کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس تذکرے کا سالِ تکمیل ۱۱۶۴ھ/۱۷۵۱ء ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ "نکات الشعرا" کے اوراق پر اس کے حوالے اس سنہ کے بعد ہی دیے گئے ہیں۔ ایک اور شہادت جو ہمارے قیاسات کی تائید کرتی ہے، گردیزی کے تذکرے "گلشنِ راز" کی تاریخِ تکمیل ہے۔ یہ تذکرہ ۵/محرم ۱۱۶۶ھ/۱۳/نومبر ۱۷۵۲ء کو مکمل ہوا ہے۔ ہماری تحقیق کے مطابق "نکات الشعرا" اس سے قبل تسوید و ترتیب کے مراحل طے کر کے منظرِ عام پر آ چکا تھا[2]۔

متذکرہ بالا حقائق و واقعات کی روشنی میں یہی نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ یہ تذکرہ ۱۱۶۵ھ/۱۷۵۲ء میں مکمل ہوا۔ اس سنہ کے بعد جو ترمیمیں یا اضافے کیے گئے ان میں سے محمد یار خاکسار کے متعلق ان جملوں کے علاوہ کہ "علی الرغم ایں تذکرہ تذکرہ نوشتہ است، بنام معشوقِ چہل سالۂ خود و احوال خود اول از ہمہ نگاشتہ و خطاب خود سید الشعرا پیشِ خود قرار دادہ[3]" کسی اور تحریر کی نشاں دہی نہیں کی جا سکتی۔

جناب عرشی صاحب کا خیال ہے کہ "نکات الشعرا" کا اختتام ۱۱۶۵ھ ہی میں ہوا ہے لیکن ترتیب کا کام اس سے کئی سال قبل ۱۱۶۱ھ کے قریب شروع ہو چکا تھا۔ اس ضمن میں موصوف کی اہم ترین دلیل جعفر علی خاں زکی سے متعلق میر کے اس بیان پر مبنی ہے کہ

"بادشاہ محمد شاہ بر او فرمائش مثنوی حقہ کردہ بود، دو سہ شعر موزوں کرد"

---

[1] سرو آزاد ص ۲۳۶

[2] اس موضوع پر مفصل گفتگو "گلشنِ راز" کے جائزے کے تحت کی جائے گی۔

[3] نکات الشعرا طبع ثانی ص ۱۱۴

دیگر سرانجام از و نیافت۔ اکنوں شیخ محمد حاتم ..... باتمام رسانید و آں مثنوی خالی از مزہ نیست[1]۔"

یہ اقتباس نقل کرنے کے بعد جناب عرشی تحریر فرماتے ہیں :

"حاتم نے "دیوان زادہ" میں اس مثنوی کے عنوان پر لکھا ہے کہ "حسب الحکم محمد شاہ بادشاہ معرفت جعفر علی خاں صادق" یہ مثنوی نظم کی گئی ہے (ورق ۱۸۹ الف) اگر لفظ "اکنوں" خود میر صاحب ہی کا لکھا ہوا ہے اور کاتبوں نے اپنی طرف سے اس کا اضافہ یا کسی دوسرے لفظ کی جگہ اس کی نشست کا ارتکاب نہیں کیا ہے تو اس کا یہ مطلب ہوگا کہ "نکات الشعرا" کی یہ عبارت محمد شاہ متوفی ۱۱۶۱ھ (۱۷۴۸ء) کی زندگی میں یا اس کے انتقال سے کچھ بعد لکھی گئی تھی چونکہ حاتم کے منتخب کلام میں میر صاحب نے صرف ایک ہی شعر اس غزل کا چنا ہے جو ۱۱۶۱ھ کے کسی مشاعرے کی طرح میں لکھی گئی تھی، اس بنا پر قرین قیاس یہ ہے کہ زکی اور حاتم کا حال اسی سنہ میں تحریر کیا ہے۔ اگر میر صاحب نے حاتم کا حال زیادہ بعید زمانے میں لکھا ہوتا تو ان کی بعد کی کہی ہوئی غزلوں کے شعر بھی چنے ہوتے جو دلی کے مشاعروں میں برابر پڑھی جاتی رہی تھیں[2]۔"

ہمارے خیال میں یہ قیاس زیادہ وقیع نہیں کیونکہ "اکنوں" اور اس قسم کے بعض دوسرے الفاظ کبھی کبھی عدم احتیاط کی بنا پر ایسے واقعات کے لیے بھی استعمال کر لیے گئے ہیں جو زمانۂ تحریر کے اعتبار سے ماضی بعید سے تعلق رکھتے ہیں۔ کاتب کی طرف سے اضافے کا احتمال اس پر مستزاد ہے۔ رہا حاتم کی ۱۱۶۱ھ کے بعد والی غزلیات سے انتخابِ اشعار کا سوال تو ہمیں اس سلسلے میں مولف کی اس صراحت کو نظر انداز نہ کرنا چاہیے کہ ترتیبِ تذکرہ کے وقت ان کے پیش نظر ان کا ایک غیر مکمل مجموعۂ کلام تھا جس میں ردیف میم تک کی غزلیں شامل

---

[1] نکات الشعرا طبع ثانی ص ۱۳۶

[2] دیباچہ دستور الفصاحت ص ۴۳ و ۴۴

تھیں[1]۔ اس کے علاوہ ظاہری طور پر اندازہ یہ ہوتا ہے کہ میر نے شاعروں کے حالات ابتدا ہی سے موجودہ ترتیب کے مطابق لکھنا شروع کیے تھے۔ ایسی صورت میں محتشم علی خاں حشمت متوفی ۱۱۶۳ھ/ ۱۷۵۰ء کے صیغۂ مرحومین کے تحت ذکر کے معاً بعد حاتم کے ترجمے کا اندراج عرشی صاحب کی رائے کے برخلاف ہمارے خیال کی تائید کرتا ہے۔ اس کے باوجود اگر بفرض محال عرشی صاحب کے استدلال کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو نکات الشعرا کا زمانۂ ترتیب ۱۱۶۱ھ/۱۷۴۸ء اور ۱۱۶۵ھ/ ۱۷۵۲ء کے درمیان قرار پائے گا اور چونکہ اس وقت تک شمالی ہند میں شعرائے اردو کا کوئی تذکرہ تکمیل کے مراحل سے گزر کر منظرِ عام پر نہیں آیا تھا، اس لیے میر اپنے اس دعوے میں حق بجانب ہیں کہ

> "در فن ریختہ کہ شعر ایست بطور شعرِ فارسی بزبانِ اردوے معلّٰی (معلّاے) شاہِ جہاں آباد دہلی، کتابے تاحال تصنیف نشدہ کہ احوال شاعرانِ ایں فن بصفحۂ روزگار بماند، بنائً علیہ ایں تذکرہ کہ مسمّٰی بہ نکات الشعراست، نگاشتہ می شود[2]"

طبعِ ثالث (مرتبہ ڈاکٹر محمود الٰہی) کے مطابق نکات الشعرا بشمولِ مولف ایک سو چار (۱۰۴) شاعروں کے ذکر پر مشتمل ہے[3]۔ اس کے برخلاف مولانا محمد حسین آزاد نے "آبِ حیات" میں میر سے یہ قول منسوب کیا ہے کہ "میں اس کتاب میں ایک ہزار شعرا کا حال لکھوں گا[4] لیکن اس انتساب کی صحت پر یقین نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ ۱۱۶۵ھ/۱۷۵۲ء تک شعرائے اردو کی تعداد کا ایک ہزار تک پہنچ جانا بعید از قیاس ہے۔ تاہم بعض قرائن و شواہد سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس تذکرے کا ایسا کوئی نسخہ ضرور موجود تھا جس میں شاعروں کی تعداد

---

[1] "دیوانش تا ردیف میم بدست آمدہ بود، پارہ اشعارِ آن نگاشتہ می شود"۔ نکات الشعرا طبعِ ثانی ص ۷۵

[2] نکات الشعرا طبع ثانی ص ۱

[3] ڈاکٹر محمود الٰہی کے مرتبہ نسخے میں ایک شاعر عطا بیگ ضیا کا اضافہ ہے جس کا ترجمہ کتب خانہ انجمن ترقی اردو کے خطی نسخے میں موجود نہیں۔

[4] آبِ حیات ص ۲۲۷

متداول نسخے کی بہ نسبت کسی قدر زیادہ تھی۔ مثال کے طور پر لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی نے خواجہ احسن اللہ خاں بیان کے حال میں[1] اور مرزا کاظم مبتلا لکھنوی نے جنون دہلوی کے ذکر میں[2] اس تذکرے سے استفادے کا اعتراف کیا ہے لیکن موجودہ نسخہ ان دونوں شاعروں کے ذکر سے خالی ہے۔ ولی کے متعلق میر سے منسوب یہ مشہور قول بھی کہ "وے شاعر یست از شیطان مشہور تر"[3] متداول نسخوں میں شامل نہیں حالانکہ میر سے اس کے انتساب پر شبہے کی کوئی معقول وجہ نظر نہیں آتی، کیونکہ قدرت اللہ قاسم کی معاصرانہ شہادت کے علاوہ پیر خاں کمترین کی ہجو کا یہ مصرع بھی کہ "ولی پر جو سخن لاوے اسے شیطان کہتے ہیں"[4] واقعے کی صداقت پر دلالت کرتا ہے[5]

تذکرے کا آغاز شمالی ہند کے شاعروں کے ذکر سے ہوتا ہے۔ میر صاحب نے دیباچے میں اس التزام کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

> "اگرچہ ریختہ در (از) دکن است چوں از آں جا یک شاعرِ مربوط بر نخاستہ لہٰذا شروع بنام آنہا کردہ وطبع ناقص مصروف ایں ہم نیست کہ (از) احوال اکثر آنہا ملال اندوز گردد، مگر بعضے از آنہا نوشتہ خواہد شد" (ص ۱ طبع ثانی)

اس صراحت کے فوراً بعد ہی ان الفاظ میں حضرت امیر خسرو کا حال لکھتے ہیں:

> "مجمع کمالات وصاحبِ حالات، فضائل او اظہر من الشمس است احوال

---

[1] چمنستان شعرا ص ۵۳

[2] گلشنِ سخن ص ۹۸ ۔ بظاہر حال مبتلا کا "نکات الشعرا" سے براہِ راست استفادہ کرنا مشکوک ہے، اس لیے اس حوالے کو بہت زیادہ اہمیت نہیں دی جا سکتی لیکن اصولی طور پر دوسرے حوالوں کے ساتھ اس کا ذکر ناگزیر ہے۔

[3] مجموعہ نغز جلد دوم ص ۴۳ و ۴۳۰ [4] مجموعہ نغز جلد دوم ص ۲۹۷

[5] اس سلسلے میں مصحفی کا یہ شعر بھی غور طلب ہے ؎

ہونا بہت آسان ہے شیطان سے مشہور — پر ہو تو لے اوّل کوئی دنیا میں ولی سا

امیرِ مذکور در تذکرہ ہا مسطور۔ نوشتنِ ایں احقر العباد فضول است۔ اشعارِ رنگینِ آں بزرگ بسیار دارد۔ دریں خود تردد نیست از آن جملہ یک قطعہ تیمناً نوشتہ آید۔" (ص ۲ طبع ثانی)

اس اقتباس کی روشنی میں تذکرہ نگاری کے متعلق میر صاحب کے زاویۂ نظر اور شعرا کے تعارف کی عمومی روش کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ نکات الشعرا سے قبل شعرائے فارسی کے جتنے اہم تذکرے منظرِ عام پر آ چکے تھے اور جن سے قریبی واقفیت کی جانب منقولہ بالا سطور میں ایک مبہم سا اشارہ بھی موجود ہے، اگر ان سب کو نظر انداز کر کے صرف "مجمع النفائس" کو جس سے استفادے کا میر صاحب نے واضح طور پر اعتراف کیا ہے، تقابل کی غرض سے پیشِ نظر رکھا جائے تو یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ "نکات الشعرا" میں اس صنف کی قدیم روایات کو برقرار رکھنے کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی گئی ہے۔ کسی شخص کے حالات کی تفصیل سے محض اس بنا پر صرفِ نظر کہ دوسرے تذکرہ نگار اس سلسلے میں بہت کچھ لکھ چکے ہیں، اصولی طور پر مناسب نہیں اور میر صاحب نے جا بجا یہی طریقِ کار اپنایا ہے۔ وہ اسے بالکل ضروری نہیں سمجھتے کہ تعارف کے ذیل میں کسی استثنا کے بغیر تمام شاعروں کے خاص خاص واقعاتِ زندگی لازماً بیان کر دیے جائیں تاکہ قارئین اس ماحول اور پس منظر سے آگاہ ہو جائیں جس میں ان کی شخصیت اور شاعری نے نشو و نما پائی ہے۔

معدودے چند مستثنیات سے قطع نظر اگر کہیں کہیں ان کے قلم سے ایسے کچھ جملے نکل بھی گئے ہیں جنھیں بیانِ واقعات کے زمرے میں رکھا جا سکتا ہے تو وہ بھی تسلی بخش نوعیت کے نہیں۔ یہاں اس قسم کے چند اقتباسات بطور نمونہ پیش کیے جاتے ہیں:

(۱) مرزا عبدالقادر بیدلؔ۔ "اوائل جوانی نوکر شاہزادہ محمد اعظم شاہ بود۔ بعد از چندے ترکِ روزگار گرفتہ فروکش گردید"۔ (ص ۲)

(۲) ولی اللہ اشتیاقؔ۔ "مولد او سرہند است۔ در کوٹلہ فیروز شاہ سکونت داشت۔" (ص ۲)

(۳) محمد شاکر ناجیؔ۔ "معاصرِ میاں آبروؔ ــــ وطنش شاہجہان آباد۔ جوان از جہاں رفت۔" (ص ۲۳)

(۴) محتشم علی خاں حشمت۔ "سپاہیِ عمدہ روزگار ــ از خاکِ پاکِ دہلی بود۔ در مغل پورہ سکونت داشت۔" (ص ۷۳)

(۵) ولی دکنی ــ "از خاکِ اورنگ آباد است می گویند کہ در شاہجہان آباد دہلی نیز آمدہ بود۔" (ص ۹۰)

(۶) عارف علی خاں عاجز ــ "دہ دوازدہ سال شدہ باشد کہ در شاہجہاں آباد سکونت داشت اکنوں ــ در برہان پور است۔" (ص ۹۷)

(۷) محمد علی حشمت ــ "از شاگردانِ غنی بیگ قبول است ــ ہمراہ قطب الدین خاں در جنگ روہیلہ کشتہ شد۔ استادِ عبدالحئ تاباں بود۔" (ص ۱۰۷)

(۸) محمد امان اللہ غریب ــ "قربِ دو سال است کہ بہ سمتِ بنگالہ رفت۔" (ص ۱۳۸)

(۹) محمد محسن محسن ــ "برادر زادۂ فقیر مولف است سنش نامِ خدا تا بہ بست سالگی رسیدہ باشد۔" (ص ۱۳۹)

اس میں شک نہیں کہ یہ بیانات بجائے خود اہم ہیں لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ دوسرے ذرائع سے مزید تلاش و تحقیق کے بغیر محض ان کی روشنی میں کسی فیصلہ کن مرحلے تک پہنچنا ممکن نہیں۔ مثلاً تذکرے کی ترتیب کا صحیح زمانہ متعین کرنے سے پہلے عاجز اور غریب کی ہجرت کے سنین اور محسن کے سالِ ولادت کی دریافت قطعاً ناممکن ہے۔ اسی طرح محمد علی حشمت کے سالِ وفات سے واقفیت کے لیے کتبِ تاریخ کے حوالے سے قطب الدین خاں اور روہیلوں کی معرکہ آرائی کے بارے میں ضروری تفصیلات کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ لیکن ہمیں میر صاحب سے صرف یہی شکوہ نہیں کہ انھوں نے حالاتِ زندگی کے انضباط پر بقدرِ ضرورت توجہ صرف نہیں کی، یہ شکایت بھی ہے کہ وہ تقریباً تیس شاعروں کے تراجم میں صرف ان کے نام یا تخلص کے ساتھ اشعار کی نقل پر اکتفا کر کے حد درجہ سہل پسندی اور سطحیت کے مرتکب ہوئے ہیں۔

میر صاحب کے کمالِ فن اور نکات الشعرا کی شہرت و مقبولیت کا راز دراصل سیرت و شخصیت کے ان مرقعوں کی جاذبیت و جامعیت میں پنہاں ہے جو اچھی خاصی

تعداد میں تذکرے کے اوراق پر جا بجا پھیلے ہوئے ہیں۔ الفاظ کے تار و پود سے بنائی ہوئی یہ تصویریں پر کشش بھی ہیں اور زندگی سے بھرپور بھی۔ حتیٰ کہ بعض جگہ ایجاز و اختصار کے باوجود ڈاکٹر سید عبداللہ کے بقول ہم ان نقوش میں وہ معنویت اور مصورانہ دقت نظر پاتے ہیں جو تفصیل میں نہیں مل سکتی[1]۔ اپنے استاد اور پیر و مرشد خان آرزو کے متعلق لکھتے ہیں:

"آب و رنگِ باغ نکتہ دانی، چمن آرائے گلزارِ معانی، متصرفِ ملکِ زور طلبِ بلاغت، پہلوان شاعرِ عرصۂ فصاحت، چراغِ دودمانِ صفائے گفتگو کہ چراغش روشن باد سراج الدین علی خاں آرزو سلمہ اللہ تعالیٰ ابدًا۔ شاعر زبردست قادرِ سخن عالم فاضل تاحال ہیچ ایشاں بہ ہندوستان جنت نشاں بہم نہ رسیدہ بلکہ بحث در ایران می رود۔ شہرۂ آفاق، در سخن فہمی طاق۔ صاحبِ تصنیفات دہ پانزدہ کتب و رسالہ و دیوان و مثنویات۔ حاصلِ کمالات اوشان از حیزۂ بیان بیرون ست۔ ہمہ استادانِ مضبوطِ فنِ ریختہ ہم شاگردانِ آں بزرگوار ند۔ گاہے برائے تفننِ طبع دو سہ شعر ریختہ فرمودہ ایں فن بے اعتبار را کہ ما اختیار کردہ ایم اعتبار دادہ اند۔" (ص ۳۱)

میر صاحب اپنی روزمرہ زندگی میں شاعر کی حیثیت سے کسی بڑے سے بڑے استاد کو خاطر میں لانے والے نہ تھے۔ کسی کو اپنا مدِ مقابل اور مخاطبِ صحیح سمجھنا ان کے لیے تقریباً ناممکن تھا۔ خود پرستی اور انانیت کی یہ حد سے بڑھی ہوئی لے ایک غزل کے مقطع میں اس دعوے پر ختم ہوتی ہے کہ

طرف ہونا مرا مشکل ہے میر اس شعر کے فن میں
یوں ہی سودا کبھو ہوتا ہے سو جاہل ہے کیا جانے

اگر ایک طرف سودا جیسے باکمال اور قادر الکلام شاعر کی ذات پر جہالت کا یہ اطلاق بحیثیت شاعر میر کی سیرت کے ایک خاص پہلو کی عکاسی کرتا ہے تو دوسری طرف نکات الشعرا کا درج ذیل اقتباس تذکرہ نگار کی حیثیت سے ان کے کردار کا آئینہ دار ہے:

---

[1] شعرائے اردو کے تذکرے ص ۳۰

"جوانیست خوش خلق، خوش خوے، گرم جوش، یارباش شگفتہ روے۔
.....غزل وقصیدہ ومثنوی وقطعہ ومخمس ورباعی ہمہ را خوب می گوید۔ سرآمدِ
شعرائے ہندی اوست ..... چنانچہ ملک الشعرائی ریختہ اورا شاید۔" (ص ۳۱)

خواجہ میر درد میر کے عہد کی ان گنی چنی محترم ہستیوں میں سے ایک ہیں جن کی عظمت و فضیلت کے اعتراف میں ان کے تمام معاصرین متفق الرائے تھے۔ یہ ہمہ گیر مقبولیت انھیں ان کے حسنِ اخلاق، وسعتِ مشرب اور بزرگی و بزرگ زادگی کے نتیجے میں حاصل ہوئی تھی میر بھی ان کے اوصاف کے مدّاح ہیں چنانچہ لکھتے ہیں:

"درکمال علاقگی وارستہ، خلیق، متواضع، آشنائے درست۔ گرمیٔ بازار وسعتِ مشربِ اوست۔ غرض از آشنائی مطلب اوست ..... بزرگ و بزرگ زادہ، جوان صالح۔ از درویشی بہرۂ وافی دارد۔ فقیر را بخدمت او بندگیِ خاص است اگرچہ حسنِ سلوک او عام، سرِ حسنِ سلوک بپائے خود گرفتہ اعتزاز را از گوشہ دل نہادہ۔" (ص ۵۰)

تاباںؔ کی زندگی کے آخری ایام میں میر صاحب ان سے کسی بات پر بد دل ہو گئے تھے اس کے باوجود انھوں نے نہ صرف ان کے محاسنِ ذات وصفات کی تعریف وتوصیف میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے بلکہ نہایت خوش دلی اور خلوص کے ساتھ اپنی غلطی اور کوتاہی کا اقرار بھی کر لیا ہے۔ چنانچہ اس سلسلے کے بیانات میں جہاں تاباںؔ کی شخصیت اپنی تمام تر دل کشی اور آب وتاب کے ساتھ جلوہ گر ہے، وہیں میر صاحب کی بلندی کردار بھی پوری طرح نمایاں ہے۔ ضمنی طور پر یہ تحریر ان کے مزاج کی رنگینی اور جمال پرستی کا بھی ثبوت فراہم کرتی ہے۔ لکھتے ہیں کہ

"نوجوانِ بامزہ بود ... ... بسیار خوش فکر وخوب صورت، خوش خلق۔ پاکیزہ سیرت، معشوقِ عاشق مزاج۔ تاحال در فرقۂ شعرا ہمچو او شاعرِ خوش ظاہر از ممکنِ بطونِ عدم بعرصۂ ظہور جلوہ گر نہ شدہ بود ... ... از دیدن رنگ وآبش بے اختیار از دہن من گل کمالش

سر می زد[1] ..... با فقیر یک صفائی داشت۔ از چندے بہ سببِ کم اختلاطیٔ ایں ہیچمداں کدورتے بمیاں آمدہ بود۔ اجلش مہلت نداد کہ تلافیش کردہ آید .....
آفتابِ تابانِ عمر او زود بہ لبِ بام رسید۔ معشوقِ عجیبے از دستِ روزگار رفت افسوس! افسوس! افسوس!" (صفحات ۱۰۸ و ۱۰۹)

اب تفصیل سے اجمال کی طرف آیئے اور مختصر الفاظ میں اظہارِ خیال کے کچھ نمونے ملاحظہ کیجیے:

(۱) قزل باش خاں امید۔ "عزیزِ دل ہا، یار باش، خوش اختلاط۔ ہمیشہ خنداں و شگفتہ رو بسر برد ..... در ہر سیر و تماشا می رفت و صحبت ہا می داشت۔" (ص ۷)

(۲) شرف الدین مضمون۔ "حریفِ ظریف، ہشاش بشاش ہنگامہ گرم کنِ مجلس ہا ..... بسیار گرم اختلاط۔" (ص ۱۴)

(۳) میاں صلاح الدین پاکباز۔ "شخصے است گوشہ نشین، بسیار کم اختلاط، گویا آشنا شدن را نمی داند۔ مزاجش خالی از وحشت نیست۔" (ص ۷۹ و ۸۰)

(۴) قائم چاند پوری۔ "جوانیست خیرہ وطیرہ، حسن پرست، نوکر پیشہ۔" (ص ۱۲۲)

(۵) میر عبدالرسول نثار۔ "جوانِ سعادت مند ــ بسیار آراستہ و پیراستہ، سنجیدہ و فہمیدہ۔" (ص ۱۳۵)

(۶) میاں ضیاء الدین ضیا۔ "جوانیست مودب، مہذب، متواضع۔" (ص ۱۴۲)

(۷) قدر۔ "شخصے است وارستہ، از قیدِ مذہب و ملت برجستہ، او باش وضع۔" (ص ۱۴۷)

(۸) حافظ حلیم۔ "مردیست بسیار گرم جوش و چسپان اختلاط۔" (ص ۱۴۹)

---

[1] مطبوعہ نسخوں میں انجمن اور پیرس کے خطی نسخوں کے عین مطابق اس جملے میں "رنگ و آبش" کی بجائے "رنگ آتش" لکھا ہوا ہے۔ یہاں عبارت کو بامعنی بنانے کی غرض سے اس کی قیاسی تصحیح کر دی گئی ہے۔

ان بیانات سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ میر صاحب خوش خلقی و خوش مزاجی، زندہ دلی، یار باشی اور شرافت و سادگی کو انسانیت کا جوہر اور کمال ظاہری کا معیار سمجھتے تھے اور جس شخص کی ذات میں انھیں یہ خوبیاں نظر آتی تھیں، اس کی تعریف و توصیف میں انھیں مطلق تامل نہ ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ بعض جگہ انھوں نے شاعرانہ مرتبے کی پستی اور ذاتی ناپسند کو بھی اس راہ میں حائل نہیں ہونے دیا ہے لیکن جو لوگ ان اوصاف سے عاری تھے، ان کے بارے میں ان کی رائے اچھی نہیں۔ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی کے بقول میر نے یہ طرزِ عمل اسٹیونسن اور عظیم بیگ چغتائی کی طرح اپنی کسی کمزوری یا محرومی کو چھپانے کی غرض سے اختیار نہیں کیا ہے[1] بلکہ وہ خود بھی ایک زندہ دل اور یار باش انسان تھے اور وہ تمام خوبیاں جنھیں وہ معیارِ انسانیت تصور کرتے تھے، ان کی شخصیت میں بھی بدرجۂ اتم موجود تھیں۔ یہ بات قرینِ قیاس ہے کہ زوالِ سن و سال اور حالات کی تبدیلیوں کے ساتھ یہ خوبیاں بھی رفتہ رفتہ زائل ہوتی گئی ہوں لیکن تقریباً تیس برس کی عمر یعنی تذکرے کے زمانۂ ترتیب تک ان کے وجود سے انکار ممکن نہیں۔ ہمارے اس دعوے کی تائید کے لیے یہ اقتباسات ملاحظہ طلب ہیں:

اشرف علی خاں فغاںؔ۔ "دریں ایام طبع اوائل لطیفہ بسیار است۔ چنانچہ ناگرمل را کہ دیوانِ تن و دخیل بادشاہی است، "گھی کی منڈی کا سانڈ" گفتہ۔ ہر کہ دیدہ، دیدہ باشد و فہمیدہ باشد۔ و حکیم معصوم را در دربارِ معلّٰی "گاوِ گجراتی" نام کردہ۔ ہر کہ حکیم صاحب را بیند، داند۔ بندہ بخدمت او بسیار مربوطم۔" (ص ۴۷)

فضل علی دانا۔ "اتفاقاً در موسمِ ہولی تاریخِ پانزدہم کہ (برائے) مجلسِ خانۂ فقیر مقرر است، واقع شد، میاں دانا نیز تشریف داشت لیکن

---

[1] میر تقی میر۔ حیات اور شاعری ص ۵۲۷

به لباسِ عجیبے۔ یک (نیم) تنیِ سیاہ به برکرده که دامنش تا بزانو بود۔
چوں رنگِ ذاتِ شریف وریش از حد زیادہ ہر دو سیاہ بود، مرزا
رفیع بمجرد مشاہدہ کردن او گفت کہ "یارو! ہولی کا ریچھ آیا" کہ
بزبانِ فارسی "خرس ہولی" می توان گفت ..... ایں لطیفہ
بسیار بموقع افتاد بلکہ صورت گرفت۔" (ص ۱۲۸ و ۱۲۹)

میاں نجم الدین سلام۔ "فقیر را به او از تہ دل اخلاص است چنانچہ اکثر اوقات
اتفاق باہم فکرِ شعر کردن وگپ زدن ومزاح نمودن
می افتد۔ جوانے خوبیست۔ خدا زندہ دارد۔" (ص ۱۳۲ و ۱۳۳)

محمد امان غریب۔ "یادش بخیر یک آشنائے بامزہ داشتم، بسیار خوش ظاہر بود۔
..... چوں اکثر در باغاتِ مغل پورہ می رفت بندہ او
را "رندِ باغاتی"[1] می گفتم۔" (ص ۱۳۸)

ظاہر ہے کہ اس قسم کے لطائف وظرائف اور بذلہ سنجیاں ایک خوش مزاج اور ہنگامہ پسند انسان ہی کے لیے تفریحِ طبع کا سامان مہیا کر سکتی ہیں اس لیے محض چند واقعات کی بنیاد پر یہ قیاس کر لینا کہ میر صاحب اپنی فطرت کے لحاظ سے حد درجہ کم آمیز، مردم بیزار، تنک مزاج اور بد دماغ قسم کے انسان تھے، صریح ناانصافی کے مترادف ہوگا، لیکن اسی کے ساتھ ہم نواب صدر یار جنگ کی اس رائے سے بھی اتفاق نہیں کر سکتے کہ "تمام تذکرے میں ایک لفظ بھی میر صاحب کے قلم سے ایسا نہیں نکلا جس سے ان کی

---

[1] طبعِ اول وثانی دونوں میں "رند باغاتی" کی جگہ "ارنڈ باغاتی" لکھا ہوا ہے لیکن جیسا کہ قاضی عبدالودود صاحب کا خیال ہے، یہ یقینی طور پر غلط ہے۔ میر صاحب نے یہ ترکیب اپنے اس شعر میں بھی نظم کی ہے ؎

ہے حزیں نالیدن اس کا نغمۂ طنبور سا
خوش نوا مرغِ گلستاں رندِ باغاتی ہے میاں

خود بینی و خود پسندی یا بد دماغی و تعلّی عیاں ہو[1]" کیونکہ وہ ذاتیات سے بلند تر ہو کر اظہارِ خیال کی روش پر ہر جگہ کاربند نہیں رہ سکے ہیں حتّٰی کہ بعض لوگوں کے ساتھ انھوں نے جذبات سے مغلوب ہو کر کھلی ہوئی زیادتیاں بھی کی ہیں اور اس رو میں عیب بینی و ہنر پوشی کی اس منزل تک پہنچ گئے ہیں جہاں انصاف اور دیانت داری کی تمام قدریں پامال ہوتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر شاہ حاتم کا ذکر ان کے معاصرین نے بڑے ادب اور احترام کے ساتھ کیا ہے۔ میر حسن انھیں "شاعرِ صاحبِ کمال و پسندیدہ افعال، عالی ہمت و بلند فطرت[2]" کہتے ہیں۔ قدرت اللہ شوق نے "مردِ فہمیدہ و سنجیدہ[3]" اور مرزا کاظم مبتلا نے "شاعرِ فصیح بیان و سرآمدِ ریختہ گویاں[4]" قرار دیا ہے۔ مصحفی ان کو "مردِ بزرگ و جہاں دیدہ[5]" اور "نغمہ سنجانِ وضیع و شریف" کو ان کی مسلم الثبوت استادانہ حیثیت کا معترف بتاتے ہیں[6]۔ لیکن میر صاحب نے ان کی شخصیت کا جو خاکہ پیش کیا ہے اس میں کوئی پہلو معائب سے مبرّا اور قابلِ تحسین نہیں۔ فرماتے ہیں:

> "مرد یست جاہل و متمکّن و مقطّع وضع، دیر آشنا۔ عنا ندارد و دریافتہ نمی شود کہ ایں رگِ کہن بہ سببِ شاعری است کہ ہمچو من دیگرے نیست یا وضعِ او ہمیں است۔" (ص ۷۵)

لہجے کی یہی تلخی و تندی جو صریحاً ذاتی مخاصمت و عناد کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے، محمد یار خاکسار کے متعلق اس بیان میں بھی موجود ہے:

---

[1] مقدمۂ نکات الشعرا طبعِ اول ص ۷

[2] تذکرہ شعرائے اردو طبع جدید ص ۶

[3] طبقات الشعرا، نسخۂ آصفیہ۔ ورق ۲۱ الف

[4] گلشنِ سخن ص

[5] عقد ثریا ص ۲۳

[6] تذکرہ ہندی ص ۸۰

"خود را دور می کشد و بسیار سفلگی می کند، بلکہ از تنک آبی بنائے ریختہ را بہ آب رسانیدہ۔ چنانچہ علی الرغم ایں تذکرہ تذکرۂ نوشتہ است ..... وخطاب خود سید الشعرا پیشِ خود قرار دادہ۔ آتشِ کینہ کہ بے سبب افروختہ است، چوں کباب بو می دہد۔ ایں قسم پے من ریسماں می تابد کہ گوئی پسر رسن تاب است۔ محمد معشوق کبنوہ ..... چوں شنید کہ خاکسار کلو ہم نام دارد، بداہتاً گفتہ: ع

کتا ہے درِ یار کا کلو اس کا نام

چوں کلو اکثر نام سگ ہا می گزارند، لطف بہم رسانید۔ ہر کہ دم لابہ او دیدہ است، می داند۔ فخرِ او ہمہ بر ریختہ است۔ طرفہ ایں کہ آں ہم نامربوط و خود او ہم نادرست۔" (ص ۱۱۴ و ۱۱۵)

میر حسن اس بیان کے بعض حصوں کو شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ:

"آنچہ میر تقی در تذکرہ خود نوشتہ است کہ خود را بسیار دور می کشد، غالب کہ ایں حرف راست نباشد ..... اگر ہمچنیں می بود خاکسار تخلص نمی نمود مگر در مزاج متانتے خواہد بود[1]۔"

اس سلسلے میں جب ہم مصحفی کی اس روایت کو کہ "میر در عالمِ شباب منظورِ نظرِ او بود[2]" کریم الدین کے اس بیان کے ساتھ کہ "میر تقی لڑکپن میں جب شعر کہتا تھا خاکسار اس کو اصلاح دیا کرتا تھا[3]" ملا کر دیکھتے ہیں تو یہ رائے قائم کرنا پڑتی ہے کہ میر صاحب کے عائد کردہ فردِ جرم میں اصلیت بہت کم ہے اور سفلگی و کینہ توزی کے یہ الزامات محض حقائق پر پردہ ڈالنے کی غرض سے وضع کیے گئے ہیں۔

انعام اللہ خاں یقین کی موزوں طبعی اور سخن فہمی سے انکار اور ان کے سرمایہ کلام کو

---

[1] تذکرہ شعرائے اردو، طبع ثانی ص ۶۱

[2] تذکرہ ہندی ص ۸۸

[3] طبقات شعرائے ہند ص ۸۹

میرزا مظہر کے نتائجِ فکر سے منسوب کرنے کی کوشش بھی حدود سے تجاوز اور حقائق کی شکست و ریخت کے اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ فرماتے ہیں:

"مردماں می گفتند کہ مرزا مظہرؔ اورا شعر گفتہ می دہد و وارثِ شعرہائے ریختۂ خود گردانیدہ۔ از قبول کردنِ ایں معنی بندہ را خندہ می آید کہ ہمہ چیز بوارث می رسد الا شعر۔ مثلاً کسے بر شعرِ پدرِ خود یا بر مضمون او متصرف شود، ہمہ کس اورا دزد خواہند گفت تا بشعر استاد چہ رسد۔ القصہ (بر) پرو پوجے چندے کہ بافتہ است کہ ما و شما نیز می توانیم بافت، ایں قدر بر خود چیدہ است کہ رعونتِ فرعون پیش او پشتِ دست بر زمیں می گزارد۔ بعد از ملاقات ایں قدر خود معلوم شد کہ ذائقۂ شعر فہمی مطلق ندارد۔ شاید از ہمیں راہ مردماں گمانِ ناموزونیت در حقِ او داشتہ باشند۔ جمعے برایں اتفاق دارند کہ شاعری او یقینی نیست چرا کہ شاعر ایں قسم کم فہم نمی باشد[1]" (ص ۸۱-۸۲)

اس عبارت کو بہ نظرِ غائر دیکھا جائے تو صرف "ذائقۂ شعر فہمی" سے محرومی کے متعلق ایک جملے کی روشنی میں بخوبی اس پس منظر کا تصور کیا جا سکتا ہے جس کے زیرِ اثر میر صاحب نے یقینؔ کی شخصیت کو ہدفِ تنقید بنایا ہے۔ مصحفی کے بقول یقینؔ ایک "میرزا مزاج" انسان تھے[2]۔ بعید از امکان نہیں کہ مرزا فرحت اللہ بیگ کے قیاس کے مطابق انھوں نے

---

[1] مطبوعہ نسخوں میں "شاعری او یقینی نیست" کی جگہ "شاعری او خالی از نقص نیست" لکھا ہوا ہے۔ جہاں تک دوسرے ایڈیشن کا تعلق ہے، اس میں "خالی از" مخطوطہ انجمن کی عبارت میں مرتبین کا اضافہ ہے اگرچہ اس نسخے میں "یقینی" کی کتابت واضح اور صاف نہیں لیکن تھوڑے سے غور و فکر کے بعد سیاق و سباق کی روشنی میں اس کی صحیح قرأت کی جا سکتی ہے۔ رضا لائبریری رام پور کے قلمی نسخے میں بھی "خالی از" موجود نہیں۔ لفظ "یقینی" اس نسخے میں زیادہ واضح ہے۔ پہلے ایڈیشن کی اصل موجود نہیں، اس لیے اس کے اندراج کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا ممکن ہے کہ یہ اضافہ اور اگلے لفظ کی تبدیلی پہلی بار اسی ایڈیشن میں کی گئی ہو اور بعد کے مرتبین نے اس کا اتباع کیا ہو۔ [2] تذکرہ ہندی ص ۲۷۵

کسی موقع پر خلاف توقع میر صاحب کے کلام کی داد نہ دی ہو اور یہی واقعہ باہمی رنجش و آزردگی کا سبب بن گیا ہو[1]۔ بہر صورت اس قسم کے معاندانہ اور مخاصمانہ اظہار رائے کو کسی طرح معقول اور سنجیدہ تنقید کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ میر کی زندگی ہی میں ان کی اس ناانصافی اور بے اعتدالی کے خلاف ردِ عمل کا آغاز ہو گیا تھا۔ گردیزی نے "تذکرہ ریختہ گویاں" میں، شفیق اورنگ آبادی نے "چمنستان شعرا" میں، ابوالحسن امراللہ الہ آبادی نے "مسرت افزا" میں، میر غلام حسین شورش عظیم آبادی نے "رموز الشعرا" معروف بہ "تذکرۂ شورش" میں اور حکیم قدرت اللہ قاسم نے "مجموعۂ نغز" میں اس سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے وہ سب اسی جوابی کارروائی کا ایک حصہ ہے۔

سیرت و شخصیت کے مختلف گوشوں پر اظہارِ خیال کے ساتھ ہی میر صاحب نے جابجا کلام کے معائب و محاسن کی طرف بھی اشارے کیے ہیں۔ اس معاملے میں اگرچہ ہمارے لیے ڈاکٹر سید عبداللہ کی اس رائے سے اتفاق ممکن نہیں کہ "نکات میں توقع کے خلاف تنقیدی مواد کافی سے زیادہ موجود ہے"[2] کیونکہ تقریباً چونسٹھ شاعروں کے حالات میں میر صاحب نے ان کی فکری کاوشوں کے حسن و قبح اور معیار و منہاج کے متعلق مطلقاً کسی رائے کا اظہار ہی نہیں کیا ہے۔ تاہم اتنا ضرور ہے کہ انھوں نے اس پہلو کو یکسر نظر انداز نہ کر کے تذکرہ نگاری کے ایک اہم اور بنیادی تقاضے کو حتی المقدور بالغ نظری اور سلیقہ مندی کے ساتھ پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی رائیں بالعموم نہایت جامع اور متوازن ہیں اور اپنے ارتسامی و تاثراتی انداز کے باوجود ان کی ناقدانہ بصیرت و ژرف نگاہی کا پتا دیتی ہیں۔ ان رایوں کی ایک قابلِ لحاظ خصوصیت یہ ہے کہ ان کے اظہار میں آزادیٔ مطلق سے کام نہ لیتے ہوئے بعض لسانی و فنی ضابطوں اور چند بنیادی اصولوں کی پابندی کی گئی ہے۔ تذکرے کے اختتام پر ریختہ کی اقسام اور ان کی تعریف بیان کرتے ہوئے میر صاحب نے لکھا ہے کہ

---

[1] مقدمہ دیوان یقین ص ۳۷

[2] شعرائے اردو کے تذکرے ص ۲۰

"ریختہ برچندیں قسم است، ازاں جملہ انچہ معلوم فقیر است، نوشتہ می آید۔
اوّل آں کہ یک مصرعش فارسی (باشد) ویک ہندی ..... دوم ایں کہ نصف
مصرعش ہندی (باشد) ونصف فارسی ..... سیوم آں کہ حرف وفعلِ فارسی
بکار می برند وایں قبیح است۔ چہارم آں کہ ترکیبات فارسی می آرند۔ اکثر
ترکیب کہ مناسبِ زبان ریختہ می افتد، جائز است وایں را غیر شاعر نمی داند
وترکیبے کہ نامانوسِ ریختہ می باشد، آں معیوب است ودانستنِ ایں نیز موقوف
(بر) سلیقۂ شاعری است۔ مختارِ فقیر ہم ہمیں است۔ اگر ترکیب فارسی موافقِ
گفتگوے ریختہ بود، مضائقہ ندارد۔ پنجم ایہام است کہ در شاعرانِ سلف دریں
فن رواج داشت۔ اکنوں طبع ہا مصروفِ ایں صنعتِ کم است مگر بسیار
بہ سستگی بستہ شود ..... ششم انداز است کہ ما اختیار کردہ ایم وآں محیطِ
ہمہ صنعت ہاست تجنیس، ترصیع، تشبیہ، صفاے گفتگو، فصاحت، بلاغت،
ادا بندیٔ خیال ایں ہمہ ہا در ضمنِ ہمیں است وفقیر ہم از ہمیں وتیرہ محظوظم۔
ہر کہ را دریں فن طرزِ خاصے است، ایں معنی را می فہمد۔ با عوام کار ندارم۔"

(ص ۱۷۹۔ ۱۸۰)

ان تفصیلات کا ماحصل یہ ہے کہ میر صاحب فارسی کی مانوس وشگفتہ تراکیب، صنعتوں کے بے تکلف استعمال، صفائیِ بیان وشستگیٔ بندش اور فصاحت وبلاغت کے اُصول وآداب کی پاسداری کو لوازماتِ شاعری تصور کرتے تھے۔ انھوں نے شاعری کے لیے ذوقِ سلیم کی اہمیت پر بھی زور دیا ہے۔ شاعری ان کے نزدیک اکتسابی فن نہیں، ایک فطری ملکہ اور وہبی عطیہ ہے۔ بغیر طبعی مناسبت کے محض مشق وممارست کی بنیاد پر کوئی شخص کامیاب شاعر نہیں بن سکتا۔ فارسی تراکیب کے استعمال کے سلسلے میں شاعر وغیر شاعر کی تفریق اسی طرف اشارہ کرتی ہے۔ علاوہ بریں وہ شاعری کو محض گل وبلبل کی داستان سرائی تک محدود رکھنا پسند نہیں کرتے لیکن جہاں تک زبان کا تعلق ہے، اسے اُن کے نزدیک برگِ گل کی طرح پاکیزہ ورنگین ہونا چاہیے۔ عبدالحئی تاباں کے

متعلق ان کی یہ رائے انھی تصورات پر مبنی ہے :

"زبانِ رنگینش پاکیزہ تر از برگِ گُل ..... سمند رنگینی فکرش باگلگونِ بادِ بہار طابق النعل بالنعل است ہر چند عرصۂ سخنِ او ہمیں در لفظ ہائے گل و بلبل است، اما بسیار برنگینی می گفت ..... نسبت بشعرِ او استادِ او را رتبۂ شاگردیٔ او نبود۔" (ص ۱۰۸)

محمد حسین کلیم کی فن کارانہ انفرادیت اور خصوصیات کلام پر ان الفاظ میں تبصرہ کرتے ہیں :

"طرزش بطرزِ کسے مانانیست ۔ اکثر بزبانِ بیدل حرف می زند۔ در فہم شعرِ تہ دارِ او فکرِ عاجز سخناں پشت دست، برزمیں می گزارد۔ طبعِ روانِ او مانندِ سیل روان است و فکر رسایش آں سوے آسماں۔ بازوے فکرتش زورین کشِ کمانِ معنی را، شعرِ پیچ دار پُر تاثیرِ او تیرِ کاکل رُبا۔ اگرچہ کلیم در فارسی گزشتہ است، اما کلیمِ ریختہ پیشِ فقیر این است۔" (ص ۴۲)

بلندیٔ فکر اور شعر کی اثر آفرینی و تہ داری کے علاوہ (جن کی طرف اوپر کے اقتباس میں اشارہ کیا گیا ہے) نو بنو خیالات تک رسائی اور تازہ بتازہ مضامین و معانی کی تلاش بھی میر صاحب کی نظر میں بڑی اہمیت رکھتی ہے لیکن الفاظِ تازہ کی تلاش جو شاعری کو محض گورکھ دھندا بنا دے ان کے نزدیک مستحسن نہیں۔ چنانچہ سجاد اکبر آبادی کے متعلق لکھتے ہیں :

"سخن او بپایۂ اوستادی رسیدہ۔ چنیں خوش گو و معنی یاب اگرچہ در بندِ لفظِ تازہ است لیکن بر زبانِ خامۂ او خیلِ معانی سپاہی می کند ..... فکرِ رنگینِ او چمن تلاش را سایۂ ابر بہارے، ہر مصرع بلندش را طرفِ لطف باچنارے[1]۔ ہر بیتِ بحرِ خفیفش بر جگر نشتر زن۔ زبان لطافت بیانش

---

[1] مطبوعہ نسخوں میں اس جملے میں "بلندش" کی جگہ "بندش" لکھا ہوا ہے۔ یہاں مخطوطۂ انجمن کے بموجب اس کی تصحیح کر دی گئی ہے۔

رگِ (جانِ) سخن[1]۔ بے انصافی امرِ علیحدہ است وگرنہ تہ داریٔ شعرِ او نمایاں است۔ ہر کہ واقفِ موشگافیٔ طبعِ اوست، می داند کہ شعرِ سوختہ پیچ دارش بموے آتش دیدہ می ماند۔" (ص ۶۰۔۶۱)

صحتِ الفاظ اور صحتِ محاورات کا خیال رکھنا بھی میرؔ صاحب کے نزدیک نہایت ضروری ہے۔ چنانچہ سجادؔ ہی کے ایک شعر میں "کانٹوں میں گھسیٹنا" کی بجائے "کانٹوں میں اینچنا" کے استعمال پر اعتراض کرتے ہوئے یہ اصول بیان کرتے ہیں کہ "در مثل تصرف جائز نیست۔" (ص ۶۹) محمد حسین کلیمؔ نے قصیدۂ "روضۃ الشعرا" میں مرزا مظہرؔ کا نام "جانجاں" کی بجائے "جانِ جاناں" موزوں کیا ہے۔ ان کی نظر میں یہ تصرف بھی نامناسب ہے۔ فرماتے ہیں:

"چوں اکثر عوام نامِ مرزا از غلطی جان جاناں می گویند، شاعرِ مذکور نظر بر شہرت ہم چنیں موزوں کردہ۔ اگرچہ نمی بایست کہ گفتگوے ما با خواص است۔" (ص ۸۳)

گویا شاعر کے مخاطب صحیح صرف خواص اور یارانِ نکتہ داں ہوتے ہیں اس لیے حتی الامکان غلط العوام کے استعمال سے احتراز کرنا چاہیے میرؔ صاحب کے خیال میں توارد ایک ایسی اصطلاح ہے جو شعرا نے اخفاے حال کے لیے وضع کرلی ہے، ورنہ متوارد شعرا دراصل سرقے ہی کے ذیل میں آتے ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ

"اکثر شاعرانِ ریختہ را مبتذل بندیافتہ ام۔ مبتذل می گویند و توارد می نامند۔ گویا ایں شعرِ اوستاد در حقِ ایشانست ؎

ہر چہ گویند بے محل گویند | در توارد غزل غزل گویند" (ص ۸۴)

---

[1] طبعِ اول و ثانی میں اس جملے میں "لطافت" کی جگہ "طاقت" اور "رگِ جانِ سخن" کی بجائے صرف "رگ سخن" مرقوم ہے۔ یہ غلطیاں مخطوطہ، انجمن میں بھی پائی جاتی ہیں۔ یہاں نسخۂ پیرس کے مطابق ان کی تصحیح کردی گئی ہے۔ "رگ" اور "سخن" کے درمیان لفظ "جان" رضا لائبریری کے قلمی نسخے میں بھی موجود ہے۔

یہی وہ فنی معیار اور تنقیدی اُصول ہیں جو کلام کے متعلق اظہارِ خیال کے مواقع پر اکثر و بیشتر میر صاحب کے پیشِ نظر رہے ہیں، اور جن کو ذہن میں رکھے بغیر ان کے مختصر و مجمل جملوں کی معنوی وسعت و جامعیت کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ بعض شاعروں کے کلام کے بارے میں ان کے درج ذیل بیانات کا مطالعہ اگر اسی روشنی میں کیا جائے تو ان میں اجمال کے باوجود زیادہ تشنگی محسوس نہ ہوگی۔

۱۔ احسن اللہ احسنؔ :۔ "طبعش بسیار مائل بہ ایہام بود۔ ازیں جہت شعرِ او بے رتبہ ماند" (ص ۲۷)

۲۔ اشرف علی فغاںؔ :۔ "شعر ریختہ را بخوبی می گوید"۔ (ص ۴۷)

۳۔ عبدالولی عزلتؔ :۔ "از اسالیبِ کلامِ شان واضح می گردد کہ بہرہ بسیارے از دردمندی دارند" (ص ۹۲)

۴۔ آزادؔ :۔ "بسیار بصفا حرف می زد" (ص ۹۴)

۵۔ عارف علی خاں عاجزؔ :۔ "زبانش (مانا) بزبان او باشان است" (ص ۹۷)

۶۔ محمد عارف عارفؔ :۔ "از بس کہ تلاشِ لفظِ تازہ می کند، بعد از سالے و ماہے بیتے از و موزوں می شود۔ شعرِ او خالی از لطف نیست" (ص ۱۳۰)

۷۔ ہدایتؔ :۔ "ریختہ را بطرز می گوید ..... کمیتِ خامہ او در عرصۂ میدانِ سخن بال بستہ راہ می رود" (ص ۱۳۰ و ۱۳۱)

۸۔ کمترینؔ :۔ "مزاجش میلانِ ہزل بسیار دارد۔ موافقِ استعدادِ خود می گوید۔ بندہ شعرِ معقولِ او نہ شنیدہ ام" (ص ۱۴۶)

نکات الشعرا کی یہ تنقیدیں خصوصیاتِ کلام کی ایک ہلکی سی جھلک پیش کرنے کے باوجود اپنے اندر ایک وزن اور وقار رکھتی ہیں اور صرف اسی اعتبار سے اہم نہیں کہ ان کے مطالعے سے متعلقہ شاعروں کے کلام کی ادبی حیثیت اور فنی محاسن و معائب کا سراغ ملتا ہے بلکہ اس لحاظ سے بھی قابلِ غور ہیں کہ ان کے ذریعے میر صاحب کی پسند و

ناپسند کے معیاروں سے بھی واقفیت حاصل ہوتی ہے، جن کی روشنی میں خود ان کے کلام کو زیادہ بہتر طور پر سمجھا اور پرکھا جا سکتا ہے۔

استادی و شاگردی اور اصلاح و استصلاح کی روایت اُردو زبان اور اس کی شاعری کے نوک پلک سنوارنے میں جس حد تک ممد و معاون رہی ہے، وہ محتاجِ بیان نہیں۔ فن کے لوازمات پر عبور اور زبان و بیان کی نزاکتوں اور لطافتوں کی رمز آشنائی کے لیے یہ ضروری سمجھا جاتا تھا کہ بساطِ سخن کے تازہ واردین کسی باکمال اور صاحبِ نظر استاد کے سامنے زانوے تلمذ تہ کریں۔ میر صاحب بھی اپنی مسلّم الثبوت زباں دانی اور استادانہ حیثیت کی بنا پر تہذیبِ فن کے ان پاسداروں میں ایک ممتاز مقام کے مالک ہیں جن کے یمنِ تربیت اور فیضانِ اصلاح سے بے شمار طبیعتوں کی جلا ہوئی اور بہت سے سخنوروں کو درجۂ کمال حاصل ہوا۔ "نکات الشعرا" اگرچہ ان کے کسی خاص شاگرد یا مختلف شاگردوں کے کلام کا مجموعہ نہیں، عام شاعروں کا تذکرہ ہے تاہم ان کی وہ تنقیدی حس جس کا دائرۂ عمل تلامذہ کے اشعار کی اصلاح اور ان کی تربیت تھا، یہاں بھی بیدار اور فعال نظر آتی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ یہاں انھوں نے اصلاح طلب اشعار میں ضروری ترمیم و تغیر کے متعلق اپنی رائے کا اظہار استادانہ فیصلے کے انداز میں نہیں، ذاتی پسند اور دوستانہ مشورے کے طور پر کیا ہے۔ خواجہ احمد فاروقی کے الفاظ میں "ان بلیغ اور استادانہ اصلاحوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ الفاظ کو بے جان اور بے روح چیز نہیں سمجھتے تھے، بلکہ یقین رکھتے تھے کہ ہر لفظ میں ایک جہانِ معنی پوشیدہ ہوتا ہے اور اس کا صحیح اور مناسب استعمال ہی شعر میں آب و رنگ پیدا کر سکتا ہے[1]" درج ذیل مثالیں اسی خصوصیت کو واضح کرتی ہیں۔

(الف) شاہ مبارک آبروؔ کی ایک غزل کا مطلع ہے:

نئیں یہ تارے بھرے ہیں شک کے نقط　　اس قدر نسخۂ فلک ہے غلط

میر صاحب کا خیال ہے کہ "اگر بجائے "اس قدر"، "کس قدر" می گفت، ایں

---

[1] میر تقی میر ــ حیات اور شاعری ص ۵۳۰

شعر بہ آسماں می رسید" (ص ۱۱)

(ب) مصطفیٰ خاں یکرنگ کا ایک شعر ہے ؎

سچ کہے جو کوئی سو مارا جائے　　راستی ہے گی دار کی صورت

میر صاحب فرماتے ہیں کہ " بہ اعتقاد فقیر بجائے "سچ" حرفِ "حق" اولیٰ است" (ص ۲۰)

(ج) یکرنگ ہی کا ایک اور شعر ہے ؎

اس کو مت بوجھو سجن اوروں کی طرح　　مصطفیٰ خاں آشنا یکرنگ ہے

میر صاحب کا اشارہ ہے کہ " اگر شعرِ من می بود، پیش مصرعہ این قسم موزوں می دادم:

مت تلون اس میں سمجھے آپ سا" (ص ۲۳)

(د) محمد شاکر ناجی کا شعر ہے ؎

دیکھ ہم صحبت کی دولت سے نہ رکھ چشمِ کرم　　لب صدف کے تر نہیں ہر چند ہے گوہر میں آب

میر صاحب کہتے ہیں کہ " بر متأمل پوشیدہ نیست کہ پیش مصرع این چنیں می باید:

مت رکھے چشمِ کرم دولت سے اپنے خورد کی" (ص ۲۳ و ۲۴)

(ہ) سجاد اکبر آبادی کا ایک شعر ہے ؎

کس طرح کوہ کن پہ گذریں گی　　ہجر کی یہ پہاڑ سی راتیں

میر صاحب کی نظر میں اس شعر کی بہتر صورت یہ ہو سکتی ہے:

ہجرِ شیریں میں کیونکہ کاٹے گا　　کوہ کن یہ پہاڑ سی راتیں" (ص ۶۸)

(و) سجاد ہی کی ایک اور غزل کا مقطع ہے ؎

بے تکلف ہو سبھوں سے وہ ملے ہے سجاد　　دخترِ رز بھی عجب طرح کی مستانی ہے

میر صاحب لکھتے ہیں کہ " اگر شعرِ من می بود، پیش مصرع این قسم می گفتم:

بے تکلف ہو نپٹ سر پہ چڑھے ہے سجاد" (ص ۷۱)

(ز) لالہ ٹیک چند بہار کا ایک شعر ہے ؎

تھی زلیخا مبتلا یوسفؑ کی اور لیلیٰ کا قیس　　یہ عجب مظہر ہے جس کے مبتلا ہیں مرد و زن

میر صاحب کے نزدیک " بجائے اشارتِ قریبہ و کلمۂ استعجاب کہ اوّلِ مصرعہ

دوم بکار بردہ است، اگر "حسن کیا" می گفت، ایں شعر واضح تر می شد۔" (ص ۱۳۳ و ۱۳۴)

ضروری نہیں کہ ان تمام اصلاحات یا مشوروں کو بغیر کسی چون وچرا اور پس و پیش کے قبول کر لیا جائے لیکن یہ بات بہر حال ماننا پڑتی ہے کہ میر کی نکتہ رس نگاہ شعر کے نازک ترین پہلوؤں تک پہنچنے میں اپنا جواب نہیں رکھتی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ انھوں نے بعض اشعار میں معمولی ترمیم و تغیر کے ذریعے وہ ظاہری و معنوی لطافت و بلاغت پیدا کر دی ہے جو اس سے قبل مفقود تھی یا پوری طرح بروے کار نہیں آسکتی تھی۔

"نکات الشعرا" سے ہمیں اس زمانے کی تہذیب و معاشرت، اہلِ علم کے باہمی روابط اور ادبی سرگرمیوں کے بارے میں بھی مفید معلومات حاصل ہوتی ہے۔ بعض بیانات سے پتا چلتا ہے کہ علوم مجلسی کے پہلو بہ پہلو شہسواری، شمشیر زنی اور دوسرے فنون سپہ گری کے حصول کو عوام اور خواص دونوں ہی اپنے لیے ذریعۂ عزت سمجھتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی مقتدر اساتذہ اور بزرگ شعرا کی صحبتوں میں حاضری اور اہل اللہ سے عقیدت و ارادت کو بھی عین سعادت خیال کیا جاتا تھا۔ چنانچہ میر صاحب ناقل ہیں کہ جب ولی دہلی میں وارد ہوئے تو انھوں نے شاہ سعد اللہ گلشن سے بھی شرفِ نیاز حاصل کیا اور اپنے کچھ اشعار سنائے، جن کو سن کر موصوف نے ارشاد فرمایا کہ:

"ایں ہمہ مضامینِ فارسی کہ بیکار افتادہ اند، در ریختۂ خود بکار ببر، از تو کہ محاسبہ خواہد گرفت۔" (ص ۹۰)

اس مشورے میں اردو شاعری کو نئے اطراف و جہات سے آشنا کرنے اور اس کے فکری و فنی سرمائے کو وسعت دینے کی جو خواہش پنہاں تھی، وہ اس کے روز افزوں اثر و نفوذ کی دلیل اور ہمہ گیر مقبولیت کی علامت ہے

میر صاحب خود بھی شہر کے ممتاز اور قابلِ احترام بزرگوں اور ادیبوں کی مجلسوں میں شرکت کیا کرتے تھے۔ یہ شرکت محبت و عقیدت کے جن رشتوں کے ساتھ مربوط تھی اس کا اندازہ خواجہ میر درد کے والد خواجہ ناصر عندلیب کے متعلق اس بیان سے کیا جا سکتا ہے:

"در ایامے کہ فقیر بخدمتِ آں بزرگوار شرف اندوز می شد از زبانِ مبارکش می فرمود کہ میر محمد تقی تو میرِ مجلس خواہی شد الحمد للہ والمنۃ کہ حرفِ آں سر سلسلۂ خدا پرستاں موثر افتاد (و) باطنِ آں خضر قافلۂ اہلِ عرفاں کہ از ظاہرش ظاہر تر است، زود کارکرد۔[1]" (ص ۵۰)

"نکات الشعرا" کے زمانۂ ترتیب سے قبل خواجہ میر دردؔ کے یہاں ہر مہینے کی پندرھویں تاریخ کو ایک "مجلسِ ریختہ گویاں" منعقد ہوا کرتی تھی۔ بعد میں جب کسی مجبوری کی بنا پر ان کے لیے اس سلسلے کو قائم رکھنا ممکن نہ رہا تو انھی کی خواہش پر میرؔ صاحب نے اس کی ذمہ داری سنبھال لی۔ تذکرے میں انھوں نے اس واقعے کو جس انداز سے بیان کیا ہے، اس سے اس دور میں معاشرتی اقدار کی پاسداری اور اربابِ فضل و کمال کے لیے جذبۂ احترام کی ایک اور مثال سامنے آتی ہے لکھتے ہیں کہ :

"مجلسِ ریختہ کہ بخانۂ بندہ تاریخِ پانزدہم ہر ماہ مقرر است، واللہ بذاتِ ہمیں بزرگ است۔ زیرا کہ پیش ازیں ایں مجلس بخانہ اش مقرر بود،

---

[1] نواب صدر یار جنگ نے اس عبارت کو خواجہ میر دردؔ سے متعلق قرار دیتے ہوئے میرؔ صاحب کے کمالِ شاعری کو ان کی دعاؤں کا مرہون منت ٹھہرایا ہے (مقدمہ نکات الشعرا طبعِ اوّل صفحات ۳ و ۴) قاضی عبدالودود بھی اس معاملے میں ان کے ہم خیال ہیں (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو دلّی کالج میگزین کا "میرؔ نمبر" ص ۳۵) لیکن حقیقتاً اس عبارت کا تعلق خواجہ ناصر عندلیبؔ سے ہے، جن کا ذکر اس سے قبل کے جملوں میں صراحت کے ساتھ آچکا ہے۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی نے اس موضوع پر کافی تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے (آبِ حیات کا تنقیدی مطالعہ، طبعِ ثانی ص ۱۲۰ تا ۱۲۷) ان کا خیال ہے اور یہ خیال بالکل درست ہے کہ "سر سلسلۂ خدا پرستان" اور "خضر قافلۂ اہلِ عرفاں" جیسے القاب اس وقت خواجہ ناصر ہی کے لیے استعمال کیے جا سکتے تھے، خواجہ میر دردؔ اپنے والد کی موجودگی میں اس غیر معمولی اکرام و احترام کے حق دار نہ تھے۔

ازگردش روزگارِ بے مدار برہم خورد۔ ازبس کہ باایں فقیر اخلاص دلی داشت،
گفت کہ ایں مجمع را اگر شما بخانۂ خود معین بکنید، بہتر است۔ نظر براخلاصِ
آں مشفق عمل کردہ آمد۔" (ص ۵۰۔۵۱)

ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی نے لکھا ہے کہ اس مجلس کے موسس اوّل خان آرزو تھے۔ ان کے بعد اس کا انتظام خواجہ میر درد نے سنبھالا اور پھر میر نے[1] اس دعوے کی تائید میں انھوں نے "چمنستانِ شعرا" اور "آبِ حیات" کے حوالے سے بعض واقعات بھی نقل کیے ہیں[2] لیکن لچھمی نرائن شفیق (مولفِ چمنستانِ شعرا) نے شاہ عبدالحکیم حاکم لاہوری کے واسطے سے اور مولانا محمد حسین آزاد نے قدرت اللہ قاسم (مولفِ مجموعۂ نغز) کے بیانات کی بنیاد پر خان آرزو کے یہاں مشاعرے کے انعقاد کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے، اس کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ اسی "مجلس ریختہ" کا ذکر ہے، جسے میر صاحب نے "نکات الشعرا" میں "مجلسِ خانۂ بندہ" سے تعبیر کیا ہے۔ شفیق، خواجہ صاحب کے حالات میں لکھتے ہیں:

"شاہ عبدالحکیم حاکم لاہوری می گوید کہ ایں عزیز بزرگِ عالی دودمان (میر درد) را فقیر مکرر بخانہ خان آرزو روزِ مراختہ یعنی صحبتِ ریختہ گویانِ ہندی کہ پانزدہم ہر ماہے مقرر بود، دیدہ ام[3]۔"

یہاں اگر اس حقیقت کو فراموش نہ کیا جائے کہ "نکات الشعرا" کی تالیف کے زمانے تک میر صاحب اور خان آرزو کے باہمی اختلافات نے زیادہ شدت اختیار نہیں کی تھی

---

[1] زیرِ بحث مجلسِ ریختہ سے متعلق پروفیسر مسعود حسن رضوی کا ایک وضاحتی فٹ نوٹ بھی فاروقی صاحب کے اس خیال کی تائید کرتا ہے (ملاحظہ ہو آبِ حیات کا تنقیدی مطالعہ طبعِ دویم حاشیہ ص ۱۲۳)

[2] تفصیل کے لیے دیکھیے۔ میر تقی میر۔ حیات اور شاعری ص ۵۵۲ و ۵۵۳

[3] چمنستان شعرا ص ۷۶

اور دونوں عرصۂ دراز سے ایک ہی مکان میں مقیم تھے[1]، تو میر صاحب نے "خانۂ بندہ" اور شاہ عبدالحکیم کے مبینہ "خانۂ آرزو" میں تفریق کی کوئی معقول وجہ باقی نہیں رہتی۔ مزید برآں اگر یہ کوئی علٰحدہ مجلس ہوتی تو میر صاحب سجّاد اکبرآبادی[2]، جعفر علی خاں زکی[3]، علی نقی کافر[4] اور حافظ حلیم[5] کے مشاعروں کی طرح کہیں نہ کہیں اس کا بھی ذکر ضرور کرتے۔

اس ضمنی بحث سے قطع نظر "نکات الشعرا میں مشاعرے کی بجائے "مجلسِ یارانِ ریختہ[6]"، "مجمعِ یارانِ ریختہ[7]"، "مجمع شاعران ریختہ[8]" اور "مجلسِ ریختہ[9]" جیسے مختلف ناموں سے اس قسم کی محفلوں کے ذکر اور میاں کمترین سے متعلق اس جملے سے کہ:

"گاہ گاہ در مجلسِ مراختہ کہ ایں لفظ بوزنِ مشاعرہ تراشیدہ اند، ملاقات می شود۔" (ص ۱۴۷)

یہ پتا چلتا ہے کہ میر کے عہد میں "یاران ریختہ" نے اپنی محفلوں کو شعرائے فارسی کے اجتماعات سے ممتاز رکھنے اور ان کی انفرادیت کو نمایاں کرنے کی غرض سے "مشاعرہ" کے وزن پر "مراختہ" کے نام سے ایک نئی اصطلاح وضع کر لی تھی اور یہ اصطلاح بڑی حد تک مقبول بھی ہو گئی تھی۔ چنانچہ میر اور شفیق کے تذکروں سے گذشتہ سطور میں نقل کی ہوئی عبارات کے علاوہ

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو میر کی آپ بیتی ص ۹۳ و ۱۰۷ و مقدمہ دستور الفصاحت ص ۴۶

[2] نکات الشعرا طبع ثانی ص ۶۱

[3] " " " ص ۱۳۷

[4] " " " ص ۱۴۸

[5] " " " ص ۱۴۸

[6] " " " ص ۶۱

[7] " " " ص ۱۳۷

[8] " " " ص ۷۹

[9] " " " ص ۱۴۸، ۵۰ و ۱۵۰

قائم چاند پوری کے تذکرے "مخزنِ نکات" میں بھی اس کا ذکر موجود ہے[1]۔

"نکات الشعرا" کی یہی متنوع اور گوناگوں خصوصیات اسے ابتدائی دور کے اردو تذکروں میں اور میرؔ کو اس کے مولف کی حیثیت سے معاصر تذکرہ نگاروں کی صف میں ایک نمایاں اور ممتاز مقام عطا کرتی ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ کہیں کہیں وہ جذبات کی رو میں جادۂ اعتدال سے ہٹ کر بعض لوگوں کے ساتھ زیادتی اور ناانصافی کے مرتکب ہوئے ہیں لیکن خواجہ احمد فاروقی کے بقول "انھوں نے اگر ایک کعبہ گرایا ہے تو دوسرا بنایا بھی ہے[2]" اور یہی تعمیری کوشش ان کے تذکرے کے لیے بقائے دوام کی ضامن ہے۔

---

[1] (الف) بندہ بخدمتش در مجلسِ مراختہ کہ بپا نزدہم ہر ماہ بخانۂ میاں خواجہ میر صاحب مقرر بود، دو سہ ملاقات کردہ ام (ذکر کرم اللہ خاں درد مطابق نسخہ انڈیا آفس لائبریری لندن مرتبہ ڈاکٹر اقتدا حسن ص ۱۱۶)

(ب) گاہ گاہ در مجلسِ مراختہ کہ اختراع ایں بر وزن مشاعرہ است، بہ نظر می آید۔ (ذکر فرحت مطابق نسخۂ مرتبہ مولوی عبدالحق ص ۶۲)

[2] میر تقی میرؔ ــ حیات اور شاعری ص ۵۳۱

گلشنِ گفتار

"گلشنِ گفتار" خواجہ خاں حمیدؔ اورنگ آبادی کی تالیف ہے اور پروفیسر سید محمد ایم اے کی ترتیب اور تحشیہ کے بعد حیدرآباد سے شائع ہو چکا ہے۔ اس تذکرے میں صرف تیس (۳۰) شاعروں کے مختصر حالات اور منتخب کلام جمع کیا گیا ہے۔ ان میں سے بیشتر شعرا دکن سے تعلق رکھتے ہیں۔ اختصار کے پیشِ نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس تذکرے نے آغاز سے اتمام تک کے مراحل تھوڑی ہی مدت میں طے کر لیے ہوں گے۔ قطعی سالِ ترتیب کی شہادت مولف ہی کے کہے ہوئے درج ذیل قطعۂ تاریخ سے ملتی ہے۔

لکھا ہم نے جب تذکرے کو حمیدؔ — ہوا خوش جسے فہم اشعار ہے
تلاش اس کی تاریخ کی کر کے دل — کہا "گلشنِ بزمِ گفتار" ہے

۱۱۶۵ھ

دیباچے کے تحت حمد و نعت کے بعد اسبابِ تالیف کی وضاحت ان الفاظ میں کی گئی ہے:

"من جرعہ جشنِ صہبائے سخنِ معنی سنجان خواجہ خان بن ترکتاز خاں بہادر قوی جنگ بن یکہ تاز خاں غفر اللہ لہما مسمّٰی بہ تخلص حمیدؔ بہ احیائے سننِ سلف مدام بہ جام سخنوری مست و سرشار بودہ و بہ افکارِ زمانۂ ناہنجار بیزار گردیدہ ذکرِ اشعارِ روشن فکرتانِ معانی آرایانِ نصیحت می دانم و فکرِ سخنانِ ہوش بخشِ مسرت افزا غنیمت می شمارم بس کہ از فیضِ سخن شوکت ہا یافتم چمنِ خاطر را نزہت بخشیدم، دل را از افکارِ علائق غنی ساختم و طبیعت را از کشاکشِ خلائق بے نیاز

گردانیدم۔ خواستم کہ شغلے پیش گیرم و تذکرۃ الشعرا نویسم لیکن چوں عبارت آرایانِ معنی طراز اکثر تذکرۃ الشعرائے فارسیہ بحیطۂ تحریر درآوردہ اند، تالیفِ آن تحصیلِ حاصل می انجامد۔ بنابریں تذکرۃ الشعرائے ہندیہ ترتیب دادم و بہ مضامینِ تازہ دل ہا را گلشن گلشن ساختم و نامش گلشن گفتار نہادم۔" (ص ۳ و ۴)

گویا میر اور قائم کی طرح حمید کو بھی یہ دعویٰ ہے کہ ان کا تذکرہ شعرائے اردو کا پہلا تذکرہ ہے اور اس میں کوئی شک بھی نہیں کہ جہاں تک دکن کا تعلق ہے وہاں ۱۱۶۵ھ/ ۱۷۵۲ء سے قبل اس موضوع پر کوئی کتاب معرضِ وجود میں نہیں آئی تھی۔ شمالی ہند کے تذکروں میں زمانۂ ترتیب و تکمیل کے لحاظ سے "نکات الشعرا" کو اوّلیت حاصل ہے لیکن وہ بھی اسی سال کی تالیف ہے اور ہمارے پاس ایسا کوئی دستاویزی ثبوت موجود نہیں جس کی بنیاد پر ان دونوں تذکروں کے زمانہ ہائے ترتیب کی تقدیم و تاخیر کا فیصلہ کیا جا سکے۔ عین ممکن ہے کہ میر کا تذکرہ "گلشنِ گفتار" کے بعد مکمل ہوا ہو یا اس کی شہرت اتنے کم عرصے میں دکن تک نہ پہنچ سکی ہو لیکن یہ بات حد درجہ تعجب خیز ہے کہ حمید صرف "نکات الشعرا" ہی سے نابلد نہیں، میر کے وجود سے بھی ناآشنا ہیں چنانچہ سودا اور شمالی ہند کے دوسرے کئی شاعروں کے برخلاف میر صاحب کا نام اور کلام ان کے تذکرے میں شامل نہیں۔ یہ ناواقفیت تذکرہ نویسی میں اولیت کا دعویٰ کرنے کے خیال سے دانستہ اغماض پر بھی مبنی ہو سکتی ہے۔

حمید نے زیادہ تر شعرا کا تعارف نہایت مختصر الفاظ میں کرایا ہے اور ترتیب میں حروفِ تہجی کے بجائے زمانے کی تقدیم و تاخیر پیشِ نظر رکھی ہے۔ تذکرے کی ابتدا ملک الشعرا نصرتی کے ذکر سے ہوتی ہے جس کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

"متوطنِ بیجاپور موسوم بہ تخلص نصرتی کہ نسخۂ مدمالت بہ زبان ہندوی بہ نزاکتِ تمام و مضامین پر سرانجام ترتیب دادہ۔ چنانچہ از پادشاہے خطابِ ملک الشعرائی یافتہ۔ در تعریفِ زلفِ دوستِ خود از ریختہ اوست:" (ص ۶ و ۷)

نصرتی کے بعد ولی کا نام آتا ہے جن کا ذکر نصرتی کے مقابلے میں کسی قدر مفصل ہے ملاحظہ ہو:

"ولی محمد احمد آبادی عجیب فکرِ رسا ے داشت و دیوانِ دل چسپ و رنگینے طرح نمودہ۔ اکثر اوقاتِ خود در طلبِ علم گذرانیدہ۔ در بلدۂ دار السرور برہان پور نیز مدتے سکونت داشت و بجانبِ میاں سید معالی کہ از مشائخ زادہ ہاے گجرات بودند میلِ تمام داشت۔ دیوان مشہور و معروف دارد۔ آخر عمر در گجرات وفات نمود۔" (ص ۱۸)

مضمون کے بارے میں صرف اس قدر لکھا ہے:

"عجب شاعرِ متوکل بودہ۔ متوطنِ احمد آباد۔ اوست موجد ایہام۔" (ص ۱۹)

شاہ حاتم کے ذکر میں لکھتے ہیں:

"محمد حاتم باشندۂ حضرتِ دہلی مردِ صاحبِ ہمت۔ طبعِ عالی دارد و بخل در دادنِ شعر ہرگز نہ کردہ و دریں امر کہ فی الحقیقت سخن دُرست بہ مشابہ دُر است گوے از حاتم بردہ، صرفہ نہ دارد۔" (ص ۲۵)

شاہ مبارک کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے:

"میر مبارک آبرو تخلص، در ایامِ محمد شاہ بادشاہ ترکِ منصب و دنیا کردہ بود۔ متوکل و صاحبِ دیوان است۔ اشعارش در تمام ممالکِ محروسہ مشہور و معروف۔ خصوص در دار الخلافہ شاہجہان آباد مستغنیِ وقت است۔" (ص ۲۹)

سودا کے بارے میں رقم طراز ہیں:

"مرزا محمد رفیع سودا تخلص منصب دار بودہ۔ متوطنِ شاہجہان آباد۔ مردِ سودا مزاج و کم سخن۔" (ص ۳۷)

ان اقتباسات سے حمید کے عمومی طرزِ تذکرہ نگاری کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے شعرا کے بارے میں اپنی معلومات و تاثرات کو عام طور پر اسی قسم کے مجمل و مختصر جملوں میں قلمبند کیا ہے۔ اس اختصار میں بظاہر مولف کی سہل پسندی و تن آسانی سے زیادہ ان کی بے خبری و لاعلمی دخیل معلوم ہوتی ہے جو اس زمانے کے حالات کے پیشِ نظر زیادہ تعجب خیز نہیں۔ تاہم اس تذکرے کے اوراق میں کہیں کہیں تفصیلات کی مثالیں بھی نظر آجاتی ہیں جن کی امتیازی کیفیت پڑھنے والوں کو چونکائے بغیر نہیں

رہتی ۔ ایک مزاح نگار شاعر عبدالرحیم کے بارے میں درج ذیل بیان اسی قسم کے مستثنیات میں سے ہے :

"محمد شاہ بادشاہ علیہ الرحمہ بادشاہ رحم دل، رنگین مزاج بودہ کہ احدے را در سلطنت اذیت بہ نوعے نہ رسیدہ واہلِ سماع را نہایت دوست می داشت. صاحب سخن بود و طبعش را غبِ مزاح نیز بود ۔ چنانچہ دراں ایام عبدالرحیم نامی از اہلِ کشمیر حاجی (ہاجی) بود و نام خود را اوٹکر لیس قرار دادہ ۔ ہر کسے کہ شعرے خواند، فی الحال در جوابش شعرِ موزوں بطور قبیح و ملیح بدیہہ می خواند ۔ روزے پادشاہ طلبیدہ بایکے از اہلِ محفل اشارتِ خواندنِ شعر نمودہ ۔ چنانچہ امیر خاں مرحوم ایں شعر را بر زبان راند ؎

آہ من العشق و حالاتہ　　احرق قلبی بحرارتہ
مانظر العین الیٰ غیرکم　　اقسم باللہ وآیاتہ

شعر مذکور کہ بہ اتمام رسید، اوٹکر لیس بدیہہ در جوابش خواند ؎

آہ من الآہ و پکاراتہ　　از کمرش گرد پچھاراتہ

سلطان متبسم شدہ انعامے بخشید ۔ او بتاریخ بست و ہفتم شہر ربیع الثانی در سنہ یک ہزار و یک صد و شصت ہجری از (در) دہلی انتقال نمود" (ص ۲۲)

سید محمد کامل برہان پوری کے حال میں رقم طراز ہیں :

"طبعِ عالی داشت و تمام عمر خود را در گفتنِ مدح و مرثیہ حضرات (ائمہ) صرف نمودہ، دیگر شعر اصلاً و مطلقاً گاہے قصداً و عمداً بر زبانش نرفتہ ۔ سبحان اللہ چہ سعادت مندی او بہ تحریرِ قلم آید چند مطلع مرثیہ ہایش نوشتہ می شود .....
یک مطلع دیگر از مرثیہ گفتہ اوست شاید ہیچ مضمون، ہیچ کس از شعرا نیافتہ باشد و نخواہد یافت ۔ ایں است :

قیامت انتقام آلِ احمد دیر کھینچا ہے　　فلک نے مضطرب ہو ماہ نو شمشیر کھینچا ہے

واکثر اعزہ کہ متصدیِ اوقاتِ میرِ مذکور برائے گفتنِ ریختہ می شدند، بحسبِ ضرورت

ریختہ گفتہ می داد ولیکن رسوخ و اعتقادے کہ داشت از ہر شعرش مظہر است ودر ہر مقطع قطع سخن کردہ۔" (ص ۵۳ و ۵۴)

داؤد اورنگ آبادی کا تعارف ان الفاظ میں سپردِ قلم کیا گیا ہے:

"مرزا داؤد بیگ مغل زا، باشندۂ خجستہ بنیاد اورنگ آباد۔ اگرچہ بر کتاب صرف ونحو وغیرہ عبورے نداشت لیکن در کلامِ او لغزشے ظاہر نیست۔ عزیزِ خوش طبع وخوش فکر۔ اکثر تازہ مضمون طرح نمودہ۔ معاصرِ شاہ سراج بود۔ در ایامِ خوردسالی پیشۂ کارچوبی اختیار نمودہ لیکن بعد ازاں بفکر رسا وحیدِ دہر گشتہ۔ بس کہ در محفل شمع دار داعیۂ سربلندی داشت و بہ شعلۂ فکر پروانۂ دل ہا می سوخت، سراج را مثالِ چراغِ بے نور می انگاشت۔ روزے یک بیت بہ خطابِ شاہ سراج از شبستانِ خاطرش سرزد، این است:

چوب زبانی نہ کر بزمِ سخن میں سراج — تیغ سین گل گیر کی ورنہ کٹے گا سراج

چوں شرارِ ایں بیت بہ پردۂ گوشِ شاہ سراج رسید، بے اختیار از سوختگی آہے کشید واز زبان برآورد:

نہ بھول کسبِ قدیمی کو اپنے اے مرزا — وگرنہ بچہ کہیں کارچوب ہووے گا

(ص ۵۷ و ۵۸)

عارف الدین خاں عاجز کے ترجمے میں بھی اسی قسم کی تفصیلات ملتی ہیں۔ ملاحظہ ہو:

"عارف الدین خاں عاجز تخلص، عرف میرزائی۔ اکثر اوقات خود اوائل بہ تجارت مصروف داشتند۔ مبلغے در سفر گجرات۔ بطریق قرض بہ فخر الدولہ، ناظمِ آن ملک معاونت نمودند، از ہنگامۂ اشقیا مقدمۂ دولتش برہم خوردہ زرِ ایشان نیز رائیگاں رفت۔ دست از وے، برداشتہ بہ خجستہ بنیاد آمدند۔ خیلے سریع الفکر و بدیہہ گو وہر سخن کہ از ایشاں سرزد می شود، مربوط و ذو معنی... ... و در گفتن تاریخ عدیم المثال۔ معہذا طبعِ ایشاں بہ اظہارِ سخن اصلا و مطلقاً (مائل) نہ بلکہ احدے را از اشعارِ خود مطلع نہ نمودند تا بہ نوشت و خواند

چہ رسد۔ از انجا کہ ایں احقر بہ ایشانِ محبتِ تمام وارد ہم سخن گوئی بہ برکتِ فیض ایشان (کذا) اکثر قصائدِ بے نقط وغیرہ معہ غزلیاتِ دیوانِ فارسی ترتیب دادہ واشعار متفرقۂ ہندی نیز بہ دستور معروف جمع نمودہ دیوانِ ہندی ایشان مرتب ساختہ۔ طرفہ دیوانے مرقوم گردانیدہ۔ اکثر ریختہ ہائے صنائع مثل دو بحرو سہ بحرو چہار بحرو لف ونشر مرتب از دیوانِ مذکور معلوم خواہد گردید"

(ص ۵۹ و ۶۰)

ان بیانات سے متعلقہ شاعروں کے بارے میں کسی نہ کسی حد تک ابتدائی قسم کی وہ معلومات حاصل ہو جاتی ہیں جن کی روشنی میں ان کی شخصیات اور شاعری کے متعلق رائے قائم کرنا زیادہ دشوار نہیں رہتا لیکن یہ استثنائی صورتِ حال محض اتفاقات یا خصوصی تعلق اور دل چسپی کی رہین منت ہے ورنہ جیسا کہ ابتدائی سطور میں پیش کیے گئے دیباچے کے اقتباس سے ظاہر ہے، "گلشنِ گفتار" کی ترتیب کسی سنجیدہ محرک کے بجائے محض تفریحِ طبع اور وقت گزاری کے خیال سے عمل میں آئی تھی۔ اس لیے عام حالات میں مولف سے اہم واقعات زندگی کے انضباط نیز شخصیت اور شاعری کی تنقید کے سلسلے میں کسی خاص تحقیق وتلاش اور غور وفکر کی توقع رکھنا مناسب بھی نہیں۔ درحقیقت یہ تذکرہ ایک ایسی بیاض کی ترقی یافتہ شکل ہے جس میں اربابِ ذوق اپنا منتخب اور پسندیدہ کلام یا مختلف شاعروں کی مشہور غزلیں یا نظمیں جمع کر لیتے ہیں۔ ہماری اس رائے کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ حمید نے بالعموم مکمل غزلیں یا ہم عصر شعرا کا ہم طرح کلام نقل کیا ہے۔

اس عمومی کیفیت سے قطع نظر "گلشن گفتار" ہماری معلومات میں چند اہم اور مفید اضافے کرتا ہے۔ مثلاً ولی کے سفر دہلی سے متعلق تاریخ ادب کے اندراجات اور تحقیقی مضامین میں اکثر مندرجہ ذیل شعر کا حوالہ دیا جاتا ہے:

دل ولی کا لے لیا دلی نے چھین جا کہو کوئی محمد شاہ سوں

"گلشن گفتار کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شعر ولی کا نہیں" (شرف الدین)

مضمون کا ہے۔ صفحہ ۱۹ پر اس زمین میں ان کی ایک غزل منقول ہے جو پانچ اشعار پر مشتمل ہے۔ اس غزل میں یہ شعر کسی قدر بدلی ہوئی صورت میں چوتھے نمبر پر درج ہے۔ دوسرے اشعار کو نظر انداز کرتے ہوئے یہاں یہی ایک شعر نقل کیا جاتا ہے تاکہ اختلافِ لفظی کی وضاحت ہو جائے ؎

اس گدا کا دل لیا دتی نے چھین　　جا کہو کوئی محمد شاہ سوں

محتشم علی خاں حشمت کے ذکر میں ان کے دو مخمس نقل کیے ہیں جن میں سے ایک حمد میں ہے اور دوسرا نعت میں۔ یہ دونوں مخمس کسی دوسرے تذکرہ نگار کے ہاں منقول نہیں۔ اسی طرح شاہ حاتم کے منتخب کلام کے تحت غزلیات کے علاوہ حقے سے متعلق ان کی مشہور مثنوی بھی شامل ہے جو کسی دوسرے تذکرے میں نہیں ملتی۔

عبدالحئی تاباں کے حال میں میرزا مظہر اور شاہ مبارک آبرو کے درمیان معاصرانہ چشمک کا ایک واقعہ نقل کیا ہے جو کسی اور تذکرے میں مذکور نہیں۔ لکھتے ہیں :

"روزے مصرعے از زبانِ میر مبارک آبرو بدیہہ طبع زاد گردید۔

مصرع ایں است :

دہلی کے شاعروں میں اک آبرو ہوا ہے

چنانچہ از اہلِ محفلِ تاباں در مجلسِ میرزا مظہر جانِ جاناں مصرعِ صدر برخواند۔ میرزا در جوابش فی الفور ایں مصرع رسانید۔ ع

جانے سے ایک چشم کے بے آبرو ہوا ہے

مردماں ایں مصرعِ ثانی را باز بہ سمعِ میر مبارک آبرو رسانیدند، میر فوراً بر زبان راند ؎

کیا ہوا حق کے کیے سے کور میری چشم ہے
آبرو جگ میں رہے تو جان جاناں پشم ہے
میرزا مظہر جان جاناں در جوابش فی الفور گفت

(ص ۴۲-۴۳)

مبارک باد تم کو آبرو صاحب سخنور ہو　　بھلے ہو یا برے ہو، خوب ہو، کانِ جواہر ہو ....."

ولی کا ذکر تقریباً تمام ہی قدیم تذکرہ نگاروں نے کیا ہے لیکن یہ بات پہلی بار اس تذکرے سے معلوم ہوتی ہے کہ انھوں نے ایک مدت تک برہان پور میں بھی قیام کیا تھا۔ ان کے نام اور وطن کے بارے میں بھی حمید کے بیانات اکثر مصنفین اور تذکرہ نگاروں کے اقوال سے مختلف ہیں اور بڑی حد تک تحقیقِ جدید کے نتائج سے مطابقت رکھتے ہیں۔

مختصر یہ کہ اگرچہ شمالی ہند کے شاعروں کے بارے میں حمید کے بیانات قابلِ اعتنا نہیں لیکن مرتبِ تذکرہ پروفیسر سید محمد کے بقول "شعرائے دکن کی نسبت تذکروں کی ناقص معلومات کے مدِ نظر "گلشنِ گفتار" کی اطلاعات اس لحاظ سے کہ اس کا مولف خود دکن کا باشندہ تھا اور اکثر دکنی شاعروں سے شخصی طور پر واقف تھا، زیادہ مستند و معتبر ہیں۔ اور جن دکنی شاعروں کا ذکر دوسرے تذکروں میں قطعاً مفقود ہے، ان کے متعلق اس تذکرے کے بیانات سے اہلِ تحقیق کو بڑی مدد مل سکتی ہے۔"[1]

---

[1] مقدمہ "گلشن گفتار"، ص ۸ و ۹

گلشنِ راز یا تذکرہ ریختہ گویان

یہ تذکرہ عرفِ عام میں "تذکرہ ریختہ گویان" کے نام سے مشہور ہے بعض مصنفین نے جن میں قدیم تذکرہ نگار اور جدید ناقدین دونوں ہی شامل ہیں، اسے اس کے مولف سید فتح علی حسینی الگردیزی (متوفی ۱۲۱۴ھ/ ۱۸۰۰-۱۷۹۹ء) سے نسبت دیتے ہوئے "تذکرۂ گردیزی" کے نام سے بھی یاد کیا ہے، لیکن جیسا کہ کتب خانۂ انجمن ترقیٔ اردو پاکستان کے ایک قلمی نسخے کی لوح اور ترقیمے کی عبارات سے ظاہر ہوتا ہے، اس کا اصلی نام "گلشن راز" ہے[1]۔ شعرائے اردو کے دوسرے متعدد تذکروں کی طرح اس تذکرے کی طباعت و اشاعت بھی مولوی عبدالحق صاحب کی تحقیق و تلاش اور ترتیب و تدوین کی رہینِ منت ہے۔ راقم السطور نے اس تذکرے کے مطالعے میں انجمن ترقی اردو (ہند) اورنگ آباد کے ۱۹۳۲ء میں شائع کیے ہوئے اس نسخے کے علاوہ بعض مقامات پر متن کی تصحیح و تصدیق

---

[1] اس نسخے کے صفحۂ اول پر کتاب کا نام "گلشنِ راز یعنی تذکرۂ بے بدلِ ہندی از تصنیفِ فتح علی خاں" تحریر ہے اور آخری صفحے پر یہ عبارت ملتی ہے:

"تمام شد کتاب گلشنِ راز بجہتِ خان عالی شان، بلند مکان قبلۂ دو جہاں عبدالغنی خاں فیض رساں سلمہ الرحمٰن نوشتہ شد۔ از دستِ فقیر حقیر مسکین دعاگو دولت جوے امیدوارِ فضل و کرم، بندۂ درگاہ محمد شریف عاجز۔"

(بحوالہ پندرہ روزہ "قومی زبان" کراچی جلد نمبر ۲۳ شمارہ نمبر ۹ و ۱۰ بابت یکم و ۱۶ مئی ۱۹۶۳ء ص ۵۸)

کی غرض سے کتب خانۂ آصفیہ حیدر آباد دکن کے ایک قلمی نسخے سے بھی مدد لی ہے۔ یہ نسخہ کتب خانے کی فہرستِ مخطوطات میں نمبر ۲۱۹ پر درج ہے اور اپنے کاتب اور زمانۂ کتابت کے متعلق کوئی معلومات فراہم نہیں کرتا۔

"گلشنِ راز" شمالی ہند کا پہلا تذکرہ ہے جو حروفِ تہجی کے اعتبار سے ترتیب دیا گیا ہے اور جس کی تالیف پر ہمارے اندازے کے مطابق بہت کم مدّت صرف ہوئی ہے۔ اگرچہ معاصر تذکرہ نگاروں کی طرح گردیزی نے بھی اس کے زمانۂ آغاز کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا ہے اور صرف تاریخِ اختتام ۵ر محرم الحرام ۱۱۶۶ھ (مطابق ۱۳ر نومبر ۱۷۵۲ء) بیان کر دی ہے[1]۔ تاہم بعض قرائن سے جن پر آئندہ سطور میں بالتفصیل بحث کی جائے گی، یہ حقیقت بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ اس تذکرے کی ابتدا ۱۱۶۵ھ/۱۷۵۲ء میں "نکات الشعرا" کے منظرِ عام پر آنے کے بعد ہوئی اور اس کی تکمیل میں چند ماہ سے زیادہ صرف نہیں ہوئے۔ اس کے برخلاف جناب عرشی رام پوری بعض داخلی شہادتوں کی بنیاد پر اس تذکرے کے آغاز کا زمانہ ۱۱۵۶ھ/۱۷۴۳ء کے قریب قرار دیتے ہیں۔ موصوف نے اپنے اس قیاس کی تائید میں مندرجہ ذیل دلائل پیش کیے ہیں:

> "میر ناصر سامانؔ، ولی اللہ اشتیاقؔ سرہندی اور اسد یار خاں انسانؔ کو لکھا ہے کہ ان کے انتقال کو چند سال ہوئے۔ "نشترِ عشق" میں سامانؔ کا سالِ وفات ۱۱۴۷ھ اور اشتیاقؔ کا ۱۱۵۰ھ اور "تاریخ محمدی" میں انسانؔ کا سنہ وفات ربیع الاوّل ۱۱۵۸ھ درج ہے۔ "چند" کا لفظ تین سے نو تک کے اعداد پر بولا جا سکتا ہے۔ اگر ہم تسلیم کر لیں کہ گردیزی نے ہر جگہ "چند" سے تین مراد لیے ہیں تو ان مرحومین کے سال ہائے وفات کے پیشِ نظر ان کا حال ۱۱۵۰ھ، ۱۱۵۳ھ اور ۱۱۶۱ھ میں لکھا جانا چاہیے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ گردیزی کی مراد ہر جگہ نو ہے تو پھر ان کا حال علی الترتیب ۱۱۵۶ھ، ۱۱۵۹ھ اور ۱۱۶۷ھ میں لکھا

---

[1] تذکرہ ریختہ گویاں مرتبہ مولوی عبدالحق ص ۱۶۸

گیا ہو گا اور اگر ۱۱۵۶ھ سے حساب کیا جائے تو پھر علی الترتیب "چند" کا اطلاق ۱۸، ۱۵ اور ۷ برس پر ہو گا۔ ان میں سے آخری استعمال تو صحیح رہتا ہے مگر دو پہلے قطعاً درست نہیں، حساب کی رو سے اور نہ ہمارے روزمرہ کے اعتبار سے۔ اس بنا پر میرا خیال یہ ہے کہ گردیزی نے چند سے نو سال مراد لیے ہیں اور اس کا آغاز ۱۱۵۶ھ کے قریب کیا ہے[۵۱]"

ممکن ہے کہ ایک عام قاری کے لیے بحث کے اس انداز اور ماحصل سے اتفاق میں کوئی قباحت نہ ہو لیکن جہاں تک تحقیق و تفحص کے ذریعے دریافتِ حقائق کا تعلق ہے، عرشی صاحب کا یہ قولِ فیصل کہ "چند" کا لفظ تین سے نو تک کے اعداد پر بولا جا سکتا ہے اور اس کے خلاف اس کا اطلاق حساب اور روزمرہ دونوں کے لحاظ سے صحیح نہ ہو گا، ناقابلِ قبول معلوم ہوتا ہے۔ خود "دستور الفصاحت" میں جس کے دیباچے سے منقولہ عبارت ماخوذ ہے، ایسی مثالیں بکثرت موجود ہیں جہاں لفظ "چند" کے التزام کے ساتھ پچاس اور ستوا کے درمیان اشعار بطورِ نمونہ نقل کیے گئے ہیں نیز مصحفی نے "تذکرۂ ہندی" میں جو ۱۲۰۱ھ/۱۷۸۶ء اور ۱۲۰۹ھ/۱۷۹۵ء کے درمیانی عرصے میں مرتب ہوا ہے، اشرف علی خاں فغاں متوفی ۱۱۸۶ھ/۱۷۷۲ء کی وفات کو چند سال قبل کا واقعہ قرار دیا ہے[۵۲]۔ ایسی صورت میں یہ تصور کر لینا کہ گردیزی اس مخصوص حسابی دائرے سے تجاوز کے مرتکب نہ ہوئے ہوں گے، کسی طرح درست نہیں۔ اس کے برخلاف بیشتر شواہد اسی خیال کی تائید کرتے ہیں کہ انھوں نے تذکرے کا آغاز "نکات الشعرا" کے بعد کیا ہے اور زیادہ تر میر کے خوانِ نعمت ہی سے ذلہ ربائی کی ہے جیسا کہ آئندہ صفحات میں پیش کردہ مثالوں سے اندازہ ہو گا۔ دیباچے کے تحت تذکرے کی تالیف کے اسباب و محرکات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"از آنجا کہ عشقِ سخن بہ آب و گلم سرشتہ اند و تخم معنی بہ مشتِ خاکم کشتہ،

---

۵۱ دیباچۂ "دستور الفصاحت" ص ۴۸ و ۴۹

۵۲ "تذکرہ ریختہ گویاں" دیباچہ مرتب ص ۱۱ و ۱۲

از ملاحظہ تذکرہ ہائے اخوان زماں کہ مشتمل بر اسامیٔ ریختہ گویانِ عہد محرر ساختہ اند و علت غائی تالیف شان خوردہ گیریٔ ہمسران و ستم ظریفی با معاصرانست، در اظہار ما فی نفس الامر بایجاز پرداختہ، بلکہ از جہتِ عدم اعتنا و قلتِ تتبع دکھ اکثر نازک خیالانِ رنگین نگار را از قلم انداختہ معہذا در تصحیح اخبار و تحقیقِ احوالِ اعزۂ اغلاطِ صریح بکار بردہ و خطاہائے نمایاں کردہ اند، بخاطر فاتر ریخت کہ تذکرۂ مرقوم سازد بے رودیدگی از روے انصاف خالیاً عن الاعتساف و اسامیٔ نامی شعرا را بہ ترتیب حروف تہجی بنویسد تا حاضران را تذکارے و غائبان را یادگارے بود۔" (ص ۳)

اس عبارت میں "تذکرہ ہائے اخوان زماں" کے متعلق جس وثوق کے ساتھ اظہارِ خیال کیا گیا ہے، اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس تذکرے کی ترتیب سے قبل شعرائے اردو کے کئی تذکرے گردیزی کی نظر سے گزر چکے تھے لیکن اصل میں یہ اندازِ گفتگو میر کے خلاف اس معاندانہ جذبے کی پردہ پوشی کے لیے اختیار کیا گیا ہے جس کے نمونے تذکرے کے صفحات پر جا بجا بکھرے ہوئے ہیں۔ مرتبِ تذکرہ مولوی عبدالحق کے بقول:

"اس نے اپنے سارے تذکرے میں کہیں کسی تذکرے کا حوالہ نہیں دیا بلکہ اشارہ تک نہیں کیا۔ البتہ قرائن سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ میر کا تذکرہ اس کی نظر سے ضرور گزرا ہے اور دیباچے میں اس نے تذکرہ نگاروں کے خلاف جو زہر اُگلا ہے اس کا ہدف نکات الشعرا ہی ہے۔"[1]

آگے چل کر مولوی صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ:

"ہمارے اس قیاس کی تائید میں ایک پُرلطف بات یہ ہے کہ میر صاحب کے حالات میں صرف دو تین سطریں لکھی ہیں جس سے صاف بے اعتنائی ٹپکتی ہے ..... سب سے بڑی ستم ظریفی یہ کی ہے کہ حالات کے

---

[1] "تذکرہ ریختہ گویان" مقدمۂ مرتب ص ۱۱ و ۱۲

بعد میر صاحب کے کلام میں سے صرف ایک شعر نقل کیا ہے اور وہ بھی بہت ہی معمولی حالانکہ معمولی سے معمولی اور گمنام شاعروں کے کلام سے بھی (جب مل گیا ہے تو) صفحے دو صفحے ضرور نقل کر دیے ہیں[۱]۔"

میر کے خلاف ناانصافی کے اس براہِ راست مظاہرے کے علاوہ مندرجہ ذیل مثالیں بھی گردیزی کے اسی مخالفانہ طرزِ عمل کی نشان دہی کرتی ہیں:

(الف) میر "نکات الشعرا" میں محمد یار خاکسار کے متعلق لکھتے ہیں:

"خود را دور می کشد و بسیار سفلگی می کند ..... علی الرغم ایں تذکرہ تذکرۂ نوشتہ است ..... احوال خود اول از ہمہ نگاشتہ و خطابِ خود سید الشعرا پیش خود دادہ۔ آتش کینہ کہ بے سبب افروختہ است، چوں کباب بو می دہد۔ ایں قسم پئے من ریسماں می تابد کہ گوئی پسرِ رسن تاب است.... فخرِ او ہمہ بر ریختہ است طرفہ ایں کہ آں ہم نامربوط و خود او ہم نادرست..... .... الغرض بسیار کم فرصت و بے تہ است[۲]۔"

اس کے بعد گردیزی کا یہ بیان ملاحظہ ہو:

"گویند بسیار بر (خود) می پیچد و خود را در زیِ شعرائے مسلم محسوب می کند۔ بہر حال شعرش از موزونیت خالی نیست و آنکہ بعض اعزہ سر بانکارِ موزونیتِ او برآوردہ، اورا از زمرۂ شعرا خارج می کنند، ناشی از ستم ظریفی و بے انصافی است۔" (ص ۵۲)

اس اقتباس کا ایک ایک لفظ اس حقیقت کی غمازی کر رہا ہے کہ مولف نے خاکسار کے دفاع میں جو کچھ لکھا ہے اس سے میر کے بیانات کا رد مقصود ہے۔ اس کے ساتھ ہی اگر آخری جملے کے الفاظ "بعض اعزہ" اور "ستم ظریفی و بے انصافی" کو ذہن

---

[۱] تذکرہ ریختہ گویان۔ مقدمہ مرتب ص ۱۳ و ۱۴

[۲] نکات الشعرا مرتبہ عبدالحق ص ۱۱۴ و ۱۱۵

میں رکھتے ہوئے اسبابِ تالیف کے سلسلے کی عبارت پر ایک بار پھر غور کیا جائے تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ "اخوانِ زماں" سے "نکات الشعرا" کا مولف ہی مراد ہے۔

(ب) میر صاحب کے نزدیک انعام اللہ خاں یقین کی موزوں طبعی اور سخن فہمی مشکوک ہے۔ وہ بالواسطہ طور پر عوام کے اس خیال کے موید ہیں کہ مرزا مظہر انھیں شعر کہہ کر دیا کرتے تھے۔ گردیزی نے اس بحث سے یکسر صرف نظر کرتے ہوئے بڑی فراخ دلی کے ساتھ ان کے فضل و کمال اور خوش بیانی و قادر الکلامی کی داد دی ہے۔ اس مبالغہ آمیز ستائش میں بھی میر صاحب کی تردید اور مخالفت کا جذبہ کارفرما معلوم ہوتا ہے۔

(ج) میر نے نکات الشعرا کے دیباچے میں ریختہ کو "شعرے بطور شعر فارسی بزبان اردوئے معلّٰی شاہجہاں آباد دہلی" قرار دیا ہے[1]۔ گردیزی بہ ادنیٰ تغیرِ الفاظ اسی مفہوم کو اس طرح ادا کرتے ہیں:

"آں شعریست بزبانِ اردوئے معلّٰی مملکت ہندوستان حرسہ اللہ تعالیٰ بطرزِ شعر فارسی در موزونیت۔" (ص ۴)

(د) میر نے تذکرے کے اختتام پر ریختہ کی مندرجہ ذیل قسمیں بیان کی ہیں:

"اول آں کہ یک مصرع ش فارسی و یک ہندی ..... دوم ایں کہ نصف مصرع ش ہندی و نصف فارسی ..... سوم آں کہ حرف و فعلِ پارسی بکار می برند و ایں قبیح است۔ چہارم آں کہ ترکیباتِ فارسی می آرند۔ اکثر ترکیب کہ مناسبِ زبانِ ریختہ می افتد آں جائز است و ایں را غیر شاعر نمی داند و ترکیبے کہ نامانوسِ ریختہ باشد آں معیوب است و دانستنِ ایں نیز موقوفِ سلیقۂ شاعری است ..... اگر ترکیب فارسی موافقِ گفتگوے ریختہ بود، مضایقہ ندارد۔ پنجم ایہام است کہ در شاعرانِ سلفِ دریں فن رواج داشت۔ اکنوں طبع ہا مصروفِ ایں صنعت کم است مگر بسیار بشستگی بستہ شود و معنی ایہام این است کہ لفظے

---

[1] نکات الشعرا طبع ثانی ص ۱

کہ بر و بنائے بیت بود، آں دو معنی داشتہ باشد، یکے قریب و یکے بعید و بعید منظورِ شاعر باشد و قریب متروکِ او۔ ششم انداز است کہ ما اختیار کردہ ایم و آں محیطِ ہمہ صنعت ہاست۔ تجنیس، ترصیع، تشبیہہ، صفائے گفتگو، فصاحت، بلاغت، ادا بندیِ خیال وغیرہ ایں ہمہ ہا در ضمن ہمیں است[1]۔"

گردیزی اپنے تذکرے میں معمولی سے ردّ و بدل اور اضافے کے ساتھ انھی خیالات کو ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں:

"(اوّل) قسمے است کہ مصرع اوّل فارسی و ثانی ہندی و دوم کہ نصف مصرع فارسی و نصف ہندی باشد۔ نزدیک تازہ گویان مستہجن و مستقبح است امّا ترکیباتِ فارسی کہ مناسب و مانوس بزبانِ ریختہ افتد، جائز و ترکیبِ غیر مانوس الاستعمال جائز نے۔ و فارق و ممیّز ایں امور جز صاحب سلیقۂ زباں داں کہ با فصاحت و بلاغت آشنا باشد، دیگرے نمی تواند شد و ایہام کہ در زمانِ سلف ترویج یافتہ شد، اکنوں طبیعت ہا مصروف بایں صنعت کم اند مگر بسیار شستگی و رفتگی بستہ شود و ایہام در اصطلاحِ اربابِ بدیع عبارت ازاں حرف است کہ بنائے بیت بر و باشد و آں در معنی دو محل داشتہ باشد، یکے قریب و دیگرے بعید و دراں مقام معنیٔ بعیدہ منظورِ شاعر باشد و قریبہ متروک آں و انداز کہ مختار تازہ گویانِ زمان است، محیطِ صنعت ہائے فصاحت و بلاغت است۔ فصاحتِ کلام عبارت از خلوصِ آن ست از ضعفِ تالیف (و تنافر کلمات و تعقیدِ لفظی و معنوی و صنفِ تالیف[2]) عبارت از کلام غیر مطابق قواعدِ مشہورۂ نحویہ است و تنافر کلمات (ثقل آنست بر زبان[3]) و بلاغت عبارت از مطابقتِ کلام است

---

[1] نکات الشعرا طبع ثانی ص ۱

[2] زیرِ قوسین عبارت مطبوعہ نسخے میں شامل نہیں، معنوی خلا کو پُر کرنے کے لیے نسخۂ آصفیہ کی بنیاد پر اضافہ کی گئی ہے۔

[3] یہاں مطبوعہ نسخے میں "ثقیلہ آنست بزبان" منقول ہے جس کے مقابلے میں نسخۂ آصفیہ کی یہ روایت قابلِ ترجیح معلوم ہوتی ہے۔

بمقتضائے مقام مع فصاحت کلام و مقام چیزیست کہ متکلم را باعث است
بر تکلم علیٰ وجہ مخصوص۔" (ص ۴ و ۵)

(ک) میر کے ہاں شاہ حاتم کا منتخب کلام ستائیس[۲۷] اشعار پر مشتمل ہے۔ گردیزی نے بہ تغیرِ ترتیب اسی انتخاب میں سے چودہ[۱۴] اشعار اپنے تذکرے میں درج کر لیے ہیں۔ اس انتخاب میں یہ شعر بھی شامل ہے ؎

مبتلا آتشک میں ہوں اب میں　　آگے آیا مرے کیا میرا　(ص ۵۰)

اس شعر کا مصرعِ اوّل اصل میں اس طرح ہے ؏

ہائے بے درد سے ملا کیوں تھا

میر نے اس شعر کو اس کی اصل کے مطابق نقل کرتے ہوئے استہزائی انداز میں لکھا ہے کہ "اگر شعرِ من می بود، ایں چنیں می گفتم:

مبتلا آتشک میں ہوں اب میں　　آگے آیا مرے کیا میرا　(ص ۷۶)

گردیزی نے بے خیالی میں اصل شعر کی بجائے اسی شعر کو اپنے ہاں نقل کر لیا ہے۔

(و) "نکات الشعرا" میں عبدالحئی تاباں کے سینتالیس[۴۷] اشعار منقول ہیں۔ گردیزی کے ہاں اشعار کی تعداد صرف پچیس[۲۵] ہے جو سب کے سب "نکات الشعرا" میں موجود ہیں۔ ان میں سے پہلے شعر کے علاوہ باقی اشعار کی ترتیب بھی بعینہٖ "نکات الشعرا" کے مطابق ہے۔

(ز) دلاور خاں بیرنگ کے اشعار کی ترتیب و تعداد دونوں تذکروں میں یکساں ہے۔

(ح) میر صاحب نے اپنے بھتیجے محمد محسن محسن کے نمونۂ کلام میں مختلف غزلوں کے تیس[۳۰] اشعار اور ایک رباعی نقل کی ہے۔ گردیزی کے تذکرے میں کل سولہ[۱۶] اشعار ملتے ہیں۔ ان میں سے صرف ایک شعر "نکات الشعرا" کے انتخاب میں شامل نہیں، باقی اشعار کی ترتیب بعض لفظی اختلافات کے باوجود میر صاحب کی تحریر کے عین مطابق ہے۔

(ط) "نکات الشعرا" میں ولی کے انتخابِ کلام کے تحت بائیس[۲۲] شعر درج ہیں۔ گردیزی نے ان میں سے دس[۱۰] اشعار اپنے ہاں نقل کر لیے ہیں۔ اگر اس سلسلے کے آخری شعر کو آٹھویں نمبر پر رکھ دیا جائے تو ترتیب بھی "نکات الشعرا" کے عین مطابق ہو جائے گی۔

(ی) میرؔ کے ہاں مصطفیٰ خاں یکرنگ کے منتخب اشعار کی تعداد چھیالیس[۴۶] ہے۔ ان میں مندرجہ ذیل شعر تینتالیسویں[۴۳] نمبر پہ درج ہے ؎

یک رنگ پاس اور سخن کچھ نہیں بساط　　رکھتا ہے دو نین جو کہو تو نظر کرے

گردیزی نے اپنے انتخاب میں اس شعر کو سب سے پہلے جگہ دی ہے۔ اس کے بعد میرؔ صاحب کی قائم کردہ ترتیب عین مطابق اپنے پسند کے مزید انتیس[۲۹] اشعار نقل کر دیے ہیں۔

(ک) محمد شاکر ناجیؔ کے نمونۂ کلام میں بارہ[۱۲] اشعار "نکات الشعرا" سے اور باقی چھ[۶] شعر غالباً کسی بیاض سے نقل کیے گئے ہیں۔ ان چھ[۶] اشعار میں سے دو شعر شاہ مبارک آبروؔ کے ہیں۔ اول الذکر بارہ اشعار میں سے ایک کے علاوہ باقی تمام شعروں کی ترتیب "نکات الشعرا" کے مطابق ہے۔

ان شواہد کی موجودگی میں یہ باور نہ کرنے کی کوئی معقول وجہ نظر نہیں آتی کہ "نکات الشعرا" کے مطالعے کے بعد ہی گردیزی نے اپنے تذکرے کی ترتیب کا آغاز کیا اور اس کا بنیادی مطمحِ نظر میرؔ کے خلاف معاندانہ جوابی کارروائی کے سوا کچھ نہیں۔ اس فیصلے کے ساتھ یہ بات خود بخود طے ہو جاتی ہے کہ اس کی ابتدا کا زمانہ ۱۱۵۶ھ کے قریب قرار دینا یقیناً ٹھیک نہیں ہے۔

"نکات الشعرا" یا "تذکرہ ہائے اخوانِ زماں" پر گردیزی نے جو اعتراضات وارد کیے ہیں یا جن کوتاہیوں نے انھیں جوابی اقدام پر مجبور کیا ان کی تفصیل یہ ہے:

(الف) تذکروں کی تالیف کے پیچھے ہمسروں کی خوردہ گیری اور معاصرین کے ساتھ ناانصافی و ستم ظریفی کا جذبہ کارفرما ہے۔

(ب) تحریر میں تفصیل و تشریح کے بجائے ایجاز و اختصار سے کام لیا گیا ہے۔

(ج) بے اعتنائی اور ذوقِ تحقیق کے فقدان کی بنا پر اکثر رنگین نگار شعرا کو نظر انداز کر دیا گیا ہے

(د) حالات کے بیان میں صحت کا خیال نہیں رکھا گیا چنانچہ جا بجا صریح غلطیاں موجود ہیں۔

ان محرکاتِ تالیف کو نظر میں رکھتے ہوئے جب ہم "گلشن راز" کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ دیکھ کر بڑی مایوسی ہوتی ہے کہ نہ تو گردیزی نے ان مظلوم شعرا کی نشان دہی کی ہے جو حریفوں کی بے جا خوردہ گیری اور ستم ظریفی کا شکار ہوئے ہیں اور نہ اپنے منظور نظر شاعروں کے حالات میں تفصیل و توضیح کا وہ انداز اختیار کیا ہے جو ان کی شخصیت کے تمام پہلوؤں کو آئینے کی طرح نمایاں کر دے۔ اس تذکرے میں کل ستانوے[۹۷] ریختہ گویوں کا ذکر کیا گیا ہے[۱] جن میں سے دو تہائی شاعروں کے تعارف ایک ڈیڑھ یا دو سطروں سے آگے نہیں بڑھے ہیں۔ تیسرے اعتراض کے جواب میں بھی مولف نے اپنی غیر جانب داری اور وسعتِ معلومات کا کوئی ثبوت فراہم نہیں کیا۔ ان کے یہاں شاعروں کی مجموعی تعداد بھی میر کے تذکرے کے مقابلے میں کم رہی ہے اور ایسے کسی خوش گو اور رنگین نگار شاعر کا اضافہ بھی نہیں جس کو نظر انداز کر دینے کی پاداش میں میر پر بے اعتنائی اور کوتاہ قلمی کا الزام عاید کیا جا سکے[۲]۔

۱؎ مقدمے کے ذیل میں مولوی عبدالحق صاحب کا یہ بیان کہ "گردیزی نے اٹھانوے[۹۸] شعرا کا ذکر کیا ہے"، درست نہیں۔ موصوف نے ردیف با کے تحت قزل باش خاں (امید) کو بھی شاملِ تذکرہ شاعروں کی فہرست میں شمار کر لیا ہے۔ حالانکہ ان کا ذکر صلاح الدین پاکباز کے حال میں ضمناً آیا ہے اور نسخۂ مطبوعہ میں جو اشعار ان کے نام سے منقول ہیں، وہ پاکباز ہی کی تصنیف ہیں۔ ان میں سے پہلے شعر کے بارے میں قزل باش خاں (امید) نے اپنی پسندیدگی ظاہر کی تھی۔

۲؎ جن شعرا کے نام "نکات الشعرا" کی فہرست سے خارج ہیں ان میں عمدۃ الملک امیر خاں انجام اور خواجہ احسن الدین خاں بیان قابلِ ذکر معلوم ہوتے ہیں لیکن "چمنستان شعرا" کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ تذکرے کے کسی دوسرے نسخے میں جس سے اس کے مولف شفیق اورنگ آبادی نے استفادہ کیا ہے، بیان کا حال اور کلام موجود تھا۔ ایسی صورت میں دوسرے شعرا کے سلسلے میں بھی بالیقین یہ بات نہیں کہی جا سکتی کہ میر فی الواقع ان سے صرف نظر کے مرتکب ہوئے ہیں۔ چونکہ گذشتہ اوراق میں تذکرۂ میر کے موجودہ نسخے میں تلخیص و اختصار کے امکانی عمل کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے، اس لیے یہاں مزید وضاحت غیر ضروری معلوم ہوتی ہے۔

میر نے ایک سو چار شاعروں کے حالات اور اشعار قلم بند کیے ہیں جن میں سے بتیس شاعروں کے احوال و اشعار سے زیر بحث تذکرہ خالی ہے[1]۔ اور گردیزی کے یہاں ایسے پچیس شعرا کا ذکر ملتا ہے جنھیں میر نے اپنے تذکرے میں جگہ نہیں دی ہے۔ آخری اعتراض بھی صرف برائے اعتراض ہے چونکہ گردیزی نے کہیں بھی ان صریح غلطیوں کی وضاحت نہیں کی ہے جو شعرا کے حالات کے بیان میں پیش رو تذکرہ نگاروں سے سرزد ہوئی ہیں۔

اس پہلو سے قطع نظر تذکرہ گردیزی کی سرسری ورق گردانی ہی ہمیں یہ کہنے پر مجبور کر دیتی ہے کہ اس کا مولف تذکرہ نگاری کے اصول و آداب کی پاسداری اور اس کے تقاضوں کی تکمیل میں یکسر ناکام رہا ہے۔ اس کی سب سے بڑی اور نمایاں کوتاہی یہ ہے کہ اس نے انتخابِ کلام پر حد سے زیادہ زور دیا ہے، یہاں تک کہ مولوی عبدالحق کے بقول اگر کسی معمولی سے معمولی اور غیر معروف شاعر کا کلام بھی دستیاب ہو گیا ہے تو اس سے دو، تین صفحات رنگ دیے ہیں[2]۔ اس کے برخلاف صرف معدودے چند مشہور و ممتاز شاعروں کو خاص توجہ کا مستحق سمجھ کر ان کے حالات میں چھ چھ سات سات سطریں لکھ دی گئی ہیں۔ ان میں بھی حقائق و واقعات کی سادہ و صاف ترجمانی کے بجائے قصیدہ سرائی کا انداز جھلکتا ہے۔ سطور ذیل میں چند اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں جنھیں اس قسم کے بہترین نمونوں یا گردیزی کے شاہکاروں سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

سراج الدین علی خاں آرزو

"نخلِ ہستیش از ریاضِ خاندانِ شیخ محمد غوث گوالیری قد کشیدہ واز ابتدائے بہارِ جوانی جابہ شاہجہان آبادِ چمن بنیاد گزیدہ۔ قلمش در قلمرو سخن

---

[1] غیر حاضر شعرا کی اس فہرست میں قزل باش خاں امید، مرزا عبدالقادر بیدل، جعفر زٹلی، امیر خسرو، بندرابن راقم، مرزا معز فطرت اور انند رام مخلص جیسے لوگ شامل ہیں جن کی ادبی یا کم سے کم تاریخی حیثیت مسلم ہے۔

[2] تذکرہ ریختہ گویاں، مقدمہ مرتب ص ۱۴

فرمان رواست و بہ بانگِ بلند انا ولاغیری سزا دیوانے ضخیم با قصائدِ غرا جمع نمودہ۔ تمام دیوانِ فغانی وسلیم را جواب گفتہ۔ و در جوابِ "محمود و ایاز" زلالی مثنوی (مسمّٰی) بہ شورِ عشق دارد و دراں تلاش ہائے بسیار کردہ، دادِ معنی یابی دادہ و بر اکثر اشعارِ معاصرین مثل افضل المتاخرین شیخ محمد علی حزیں از ستم ظریفی دخل ہا و گرفت ہائے وارد وغیر وارد دارد و تا الیٰ یومنا ہٰذا در دہلی غیر از صرفِ اوقات در تحصیل و افادۂ طلبۂ علم نصب العین او نیست۔ گاہے بہ تفنن طبع ریختہ ہم می گوید و میان آبرو و میاں مضمون کہ بنائے ریختہ ایشان ریختہ اند، استنباطِ سخن بہ او دارند و زبان ریختہ از و گرفتہ اند۔" (ص ۶ و ۷)

میر عبدالحیٔ تاباں

"نخل بندِ گلشنِ بیاں میر عبدالحیٔ تاباں، جوانے بود خوبصورت و خوش سیرت، شمعِ محفلِ جان ہا و چراغِ بزمِ دل ہا۔ در خاکِ پاکِ ہندوستان نخلِ حیاتش برومند شدہ و در ہمیں گل زمیں بہ نشو و نما رسیدہ۔ در عینِ عنفوان جوانی خاکِ مالِ فلک خورد و بساطِ حیات مستعار چیدہ داعیِ اجل را اجابت کرد۔" (ص ۳۱)

مرزا محمد رفیع سوداؔ

"نکتہ دانِ بے ہمتا، مرزا محمد رفیع سوداؔ، مرد یست سپاہی پیشہ و درست اندیشہ۔ حقا کہ رتبۂ شعرش عالی است و سخنِ دردمندانہ اش حالی۔ امروز در میدانِ گفتگو گوے سبقت از اقران و امثالِ خود می رباید و داد معنی یابی و رنگیں خیالی می دہد۔" (ص ۶۷)

ولی، دکنی

"مظہرِ کمالاتِ خفی و جلیٔ محمد ولی۔ در دکن چہرۂ ہستی افروختہ۔ از بدوِ شعور دولت معنی اندوختہ کمان پر زورِ سخن را بہ نیروے فکرت کشیدہ و ناوک اندیشہ اش بہدفِ معنی رسیدہ۔ ہر چند اشعارِ آبدارش زیبِ صفحۂ لیل و نہار است و گوشوارۂ سوامع سخن سرایانِ روزگار، لیکن بنا بر التزام بہ تحریر بیتے چند با ایجاز و

اختصار پرداخت۔" (ص ۱۴۴)

یہ مثالیں اس امر کی شہادت کے لیے کافی ہیں کہ گردیزی حالات نویسی کے فرائض اور سیرت نگاری کے آداب سے ناآشنا ہیں۔ انھوں نے جب بھی کسی شاعر کے ذکر کو طول دینا چاہا ہے، عبارت آرائی اور الفاظ کی طلسم بندی کا یہی انداز اختیار کیا ہے۔ البتہ مرزا مظہر جان جاناں کا تعارف اس روش عام سے مستثنیٰ ہے۔ یہ امتیازِ خاص جس کا تنہا مستحق مرزا صاحب موصوف کو گردانا گیا ہے، بظاہر حال ان کی ذات سے گردیزی کی غیر معمولی عقیدت و ارادت کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔ درج ذیل اقتباس سے جو اس تذکرے کا طویل ترین تعارفی نوٹ ہے، یہ کیفیت بخوبی ظاہر ہے:

"ادا فہم معنی پرور، میرزا جانِ جاناں مظہر، اصلش از معمورۂ بخارا و مولد و منشاش اکبر آباد است۔ بہ شرافتِ نسب و نبالتِ حسب موصوف است و بمکارمِ اخلاقِ شریف معروف۔ حقا کہ ذاتش مظہرِ تجلیاتِ الٰہی است و مظہرِ انوار فیوضاتِ غیر متناہی۔ از بدوِ حیات الی یومنا ہذا کہ عمر شریفش بہ پیمائش خطوۂ ستین است، از بلند منشی بتوکل و انزوا بسر بردہ و از والا ہمتی سرِ استغنا بپادشاہ و وزیر فرو نساختہ، متمکنِ مسند فراغت و مربع نشین چار بالشِ عزلت است۔ از انجا کہ از علم در فقہ و حدیث حظے وافر دارد و از کتبِ سیر و تواریخ بہرۂ متکاثر، سرش از بلند ہمتی بشعر و شاعری فرو نمی آید و ایں مشغلہ ہا را سرمایۂ افتخار نمی انگارد۔ چنانچہ اکثرے از اشعارش از راہِ بے پروائی از صفحۂ خاطر محو و منسی شدند و برخے از عدمِ اعتنا و توجہ بایں فن مہجور و ابتر گشتند لیکن چوں عشقِ سخن سرشتۂ آب و گلش ہست و مہرِ معنی جاگزینِ دلش از فرطِ استیلائے عشق معنی ہر گاہ از صحبتِ صوفیانِ خانقاہ و مستفیدانِ خدا خواہ فرصتش دست بہم می دہد، متوجہ ایں شغلِ بے حاصل می گردد و میرزا مظہر فارسِ دو میدان و والیِ دو مملکت بیانست و شعر فارسیش بغایت لطافت و نظم ریختہ اش بنہایت عذوبت۔"

(ص ۱۳۱ و ۱۳۲)

تذکرے میں ایسی دو ایک مثالیں اور بھی موجود ہیں جن میں اختصار کے باوجود کچھ کام کی باتیں آگئی ہیں۔ یہاں ان میں سے صرف عمدۃ الملک امیر خاں انجام کا حال بطورِ نمونہ نقل کیا جاتا ہے:

"نواب امیر خاں عمدۃ الملک انجام، غفرہ الملک العلام، شاگرد میرزا بیدل مرحوم۔ در فارسی و در ریختہ گوئی و ہندی و علم موسیقی و لطیفہ (گوئی) و بدیہہ سرائی و حاضر جوابی و ہمہ کمالات بے بدل بودہ۔ شش سال پیش ازیں برحمتِ حق رسید۔" (ص ۲۰)

ان مثالوں کے بعد اب ہم گردیزی کی تعارف نگاری کے کچھ ایسے نمونے پیش کرتے ہیں جن سے یہ اندازہ ہوگا کہ دوسروں پر مختصر بیانی اور تحقیق سے بے اعتنائی کے الزامات عاید کرنے والا یہی تذکرہ نگار خود کس طرح اسی قسم کی کوتاہیوں کا مرتکب ہوا ہے۔ بطورِ مثال قائم چاندپوری جن کا شمار اردو کے اور ممتاز شعرا میں کیا جاتا ہے، اس کے نزدیک اس ایک جملے سے زیادہ کے مستحق نہیں:

"محمد قائم، قائم تخلص۔ شعرش پسندیدہ است و فکرش سنجیدہ۔" (ص ۱۲۳)

اسی قبیل کی کچھ اور مثالیں یہ ہیں:

بیدار۔ "بر حالش آگہی دست نداد۔" (ص ۲۵)

بسمل۔ "نمی دانم کہ بسمل کیست۔" (ص ۲۵)

داؤد۔ "از تربیت یافتگان عزلت است۔" (ص ۶۰)

صانع۔ "زادگاہش گل زمین بلگرام است۔" (ص ۱۰۱)

میر ضیا۔ "نشو و نمایش از خاک پاکِ ہندوستان است۔" (ص ۱۰۲)

فدا۔ "نمی دانم کیست و کجائیست۔" (ص ۱۲۲)

محمد محسن کلیم۔ "سخنش دل پذیر است و حرفش بدل جاگیر۔" (ص ۱۲۷)

میر گھاسی۔ "بر احوالش اطلاع نیست۔" (ص ۱۳۰)

سوانح نگاری کے تقاضوں سے بے خبری کے پہلو بہ پہلو گردیزی کے یہاں تنقیدی

شعور کے تجزیاتی عمل کا بھی فقدان نظر آتا ہے۔ پورے تذکرے میں انھوں نے صرف بیس بائیس شاعروں کے کلام کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کیا ہے اور وہ بھی نہایت سرسری اور عامیانہ انداز میں۔ مثلاً:

احسن اللہ احسن۔ "با آبرو ہم طرح بود و در سخن تلاشِ معنیِ تازہ (می) نمود شعر را بطرز ایہام می گفت۔" (ص ۱۸)

محتشم علی خاں حشمت۔ "دیوانش فقیر سیر کردہ و چشمے آب دادہ۔ حقا کہ دراں تلاش معنیٔ تازہ کردہ (است) و الفاظ رنگین بروے کار آوردہ (است)۔" (ص ۴۹)

سعادت امروہوی۔ "در سخن تلاشِ معنی تازہ می نمود۔" (ص ۹۵)

حسن علی شوق۔ "مضامین را با آب و رنگ بستہ و تلاشِ معنیٔ تازہ کردہ است۔" (ص ۹۹)

معتبر خاں عمر۔ "در سخن تلاشِ معنی تازہ می نمود۔" (ص ۱۱۶)

محمد مزمل، مزمل۔ "معاصرِ میاں آبرو بود، در سخن تلاشِ معنیٔ تازہ می نمود۔" (ص ۱۳۶)

میر تقی میر۔ "فقیر سیرِ اشعارش نمودہ و چشمے آب دادہ۔ حقا کہ دراں تلاشِ معنیٔ بیگانہ کردہ است و حرفِ آشنا را بروے کار آوردہ۔" (ص ۱۴۸)

مصطفیٰ خاں یکرنگ۔ "با آبرو یک طرح بود و تلاشِ معنیٔ تازہ نمودہ۔ رتبۂ سخنش بلند است و پایۂ شعرش ارجمند۔" (ص ۱۶۴)

ان مثالوں کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ گردیزی کی نظر میں کمال شاعری کی معراج صرف "معنیٔ تازہ" کی تلاش ہے۔ اور اگر کسی شاعر نے "معانیٔ تازہ" کے ساتھ "الفاظِ رنگین" کا التزام بھی رکھا ہے تو اس نے گویا پیغمبریٔ سخن کا حق ادا کر دیا ہے۔ بہ الفاظ دیگر ان کی ناقدانہ بصیرت کا دائرۂ عمل "تلاش معانیٔ تازہ" کی تحسین و تعریف تک محدود ہے۔ ایک ہی خیال کی اس پے بہ پے تکرار کے علاوہ جملوں کی ساخت کا یکساں انداز اور ایک ہی قسم کے الفاظ و تراکیب کا اعادہ بھی ان کی لسانی کم مائگی اور عجز بیان کی نشان دہی کرتا ہے۔ مزید یہ کہ بات صرف ان چند جملوں تک محدود نہیں، اس نوع کی بے شمار مثالیں تذکرے

کے صفحات پر بکھری ہوئی ہیں، جو بیک نظر اس نقصِ تحریر کا احساس دلانا شروع کر دیتی ہیں۔ کچھ اقتباس ملاحظہ ہوں:

۱۔ (الف) زین العابدین آشنا۔ "طبعِ سلیم و ذہنِ مستقیم دارد۔" (ص ۱۹)
(ب) دلاور خاں بیرنگ۔ "طبعِ سلیم و ذہنِ مستقیم می داشت۔" (ص ۲۴)
(ج) عاصی برہان پوری۔ "طبعِ سلیم و ذہنِ مستقیم دارد۔" (ص ۱۱۷)

۲۔ (الف) شرف الدین علی خاں پیام۔ "زادگاہش اکبرآباد است و طبعش معنی ایجاد۔" (ص ۲۶)
(ب) خواجہ احسن اللہ خاں بیان۔ "زادگاہش اکبرآباد است و طبعش معنی ایجاد۔" (ص ۱۳۷)
(ج) میر تقی میر۔ "زادگاہش اکبرآباد است و طبعش معنی ایجاد۔" (ص ۱۳۷)

۳۔ (الف) قائم چاندپوری۔ "شعرش پسندیدہ است و فکرش سنجیدہ۔" (ص ۱۲۳)
(ب) محمد میر میر (میر سوز)۔ "شعرش پسندیدہ است و سخنش سنجیدہ۔" (ص ۱۴۸)

۴۔ (الف) محمد صلاح آگاہ۔ "شعرش دل پذیر است و فکرش بدل جاگیر۔" (ص ۲۶)
(ب) محمد حسین کلیم۔ "سخنش دل پذیر است و حرفش بدل جاگیر۔" (ص ۱۲۷)

۵۔ (الف) محمد اسمٰعیل بیتاب۔ "پایۂ سخنش بلند است و حرفش دل پسند است۔" (ص ۲۷)
(ب) محتشم علی خاں حشمت۔ "سخنش دل پسند است و فکرش بلند۔" (ص ۴۸)
(ج) سجاد اکبرآبادی۔ "در معنی یابی رتبہ اش بلند است و پایہ اش ارجمند۔" (ص ۸۲)
(د) میر یحییٰ، عاشق۔ "فکرش بلند و سخنش ارجمند۔" (ص ۱۱۸)
(ہ) فضلی دکنی۔ "طبعِ بلند و فکرِ ارجمند دارد۔" (ص ۱۲۲)

۶۔ (الف) صلاح الدین تمکین۔ "بمعمورۂ شاہجہان آباد بسر می برد و ریختہ را ہموار می گوید۔" (ص ۳۳)
(ب) عارف علی خاں عاجز۔ "ریختہ را ہموار می گوید و در خجستہ بنیاد می گذراند۔" (ص ۱۱۹)

(ج) سید خلیل قادری۔ "ریختہ را ہموار می گوید و در دکن بسر می برد۔" (ص ۱۲۷)

اعادۂ مضامین و تکرارِ الفاظ کے علاوہ گردیزی کی تحریر کا ایک نقص یہ بھی ہے کہ وہ اکثر تجزیۂ کلام کی زحمت اٹھانے کے بجائے محض شاعر کے نام یا تخلص کی رعایت سے خصوصیاتِ شاعرانہ کا تعین کر دیتے ہیں مثلاً:

(الف) کرم اللہ خاں درد۔ "سخنش خالی از چاشنیِ درد نیست۔" (ص ۶۰)

(ب) عارف شاگردِ مضمون۔ "معرفتِ سخن از شعر عارفانہ اش پیداست۔" (ص ۱۰۵)

(ج) محمد زماں غریب۔ "شعرش خالی از غرابتِ معنی نیست۔" (ص ۱۲۱)

(د) قدرت اللہ قدرت۔ "بر سخن قدرت دارد۔" (ص ۱۲۶)

اس مفصل جائزے کی روشنی میں "گلشنِ راز" کے متعلق صرف یہی رائے قائم کی جا سکتی ہے کہ بحیثیت مجموعی یہ ایک اوسط درجے کا تذکرہ ہے جس کا وجود صرف دوسروں کی خوشہ چینی و نقالی اور سطحی آرائش و زیبائش کا رہینِ منت ہے۔ اسی لیے ہم کتب خانۂ شاہانِ اودھ کے فہرست نگار اور مشہور مستشرق اشپرنگر کے اس قول سے کہ "اس کو نکات الشعرا کا بہترین ایڈیشن سمجھنا چاہیے"[1] اتفاق نہیں کر سکتے۔

---

[1] بحوالہ "یادگارِ شعرا" (ص ۶)

ریاضِ حسنی

ریاضِ حسنی شعرائے اردو کے ان تذکروں میں ہے جو ابھی تک طباعت سے محروم ہیں اور اپنی قدامت اور مخطوطات کی کم یابی کے لحاظ سے ادبی دنیا میں نوادر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس تذکرے کا ایک قلمی نسخہ سینٹرل رکارڈ آفس حیدرآباد دکن کی لائبریری میں محفوظ ہے۔ بظاہر اس کے علاوہ اس کی کوئی اور نقل ہند یا بیرونِ ہند کے کسی کتب خانے میں موجود نہیں۔ تذکرے کے مولف خواجہ عنایت اللہ فتوت اورنگ آباد کے متوطن اور سرکارِ آصفیہ کے منصب دار تھے۔ متذکرہ مخطوطے کی کتابت ان کے ایک "رفیق انیق" خواجہ محمد اکرم نے کی ہے[1] لیکن یہ املا کی لاتعداد غلطیوں اور تحریر کے بے شمار نقائص سے مملو ہے۔

رکارڈ آفس کی فہرستِ مخطوطات میں جناب نصیر الدین ہاشمی نے ریاضِ حسنی کے اس نسخے کو "بجز ایک ابتدائی ورق کے مکمل" بتایا ہے[2] لیکن یہ خیال درست نہیں کیونکہ اوّل تو کوئی ایسا قرینہ موجود نہیں جس کی بنا پر شروع کے گم شدہ اوراق کی صحیح تعداد کا تعین کیا جا سکے۔ پھر موجودہ صفحہ نمبر ۱۷۴ کے بعد سے کم از کم ایک ورق جس پر فہرست کے مطابق چار شاعروں کے حالات و اشعار درج تھے، یقینی طور پر غائب ہے۔ اس کے علاوہ شروع کے بعض مقابل صفحات میں ایک صفحے کی آخری اور دوسرے کی ابتدائی عبارات کی بے ربطی جو

---

[1] ممکن ہے یہ خواجہ محمد اکرم وہی ہوں جنھوں نے قائم چاندپوری کے تذکرے کی تاریخ "مخزن نکات" سے نکالی ہے۔

[2] فہرستِ کتب خانۂ رکارڈ آفس (قلمی) جلد اول ص ۲۵۲

یقیناً غلط شیرازہ بندی کا نتیجہ نہیں، اس طرف اشارہ کرتی ہے کہ اس حصّے سے کچھ اوراق بھی ضائع ہو چکے ہیں۔ بہرحال موجودہ صورت میں یہ نسخہ ستائیس صفحات کے ایک دیباچے اور ایک سو چوراسی شعرا کے تراجم پر مشتمل ہے۔

دیباچے میں جو اہم اور قابلِ ذکر امور زیرِ بحث آئے ہیں، ان کا ماحصل یہ ہے کہ عمر کے ایک ایسے مرحلے میں جب کہ "انتشارِ حواس" اور "استیلائے ناتوانی" کے باعث رفتہ رفتہ زندگی سے بددلی اور بیزاری کی کیفیت غالب آتی جا رہی تھی اور "وحشتِ مزاج" کسی طرح "شکیبائی" سے آشنا ہونے کا نام نہ لیتی تھی، سید عبدالولی عزلت سورتی کے کتب خانے کے منتظم خواجہ محمد اکرم نے شعرائے متقدمین و متاخرین کے دواوین اور بعض دوسری کتابیں مہیا کر کے مولف کے لیے "دل بستگی" اور تفریحِ طبع کا سامان فراہم کیا۔ ان کتابوں میں سراج الدین علی خاں (آرزو) دہلوی کا تذکرہ "مجمع النفائس" بھی شامل تھا جس کے مطالعے کے بعد ان کے دل میں "ایجادِ تذکرۂ ہندی" کی خواہش پیدا ہوئی۔ چنانچہ اپنی دست رس کے حدود میں رہتے ہوئے انھوں نے مختلف اردو شاعروں کے حالات اور اشعار جمع کیے اور انھیں ایک تذکرے کے طور پر کتابی صورت میں مرتب کر دیا۔ مختصراً یہی اس تذکرے کی شانِ نزول ہے۔

تذکرے کی تاریخِ ترتیب خود مولف نے درجِ ذیل رباعی میں نظم کی ہے:

تاریخ بنائے ایں ریاضِ حسنی — جستیم ز فیضِ خاصِ آلِ مدنی
از روئے سرو بذل ہاتف برگفت — گلدستۂ ریحانِ بہارِ معنی

پیشِ نظر نسخے میں اس رباعی کے آخری مصرعے کے نیچے ۱۱۷۵ھ مرقوم ہے لیکن دراصل اس سے ۱۱۶۶ھ برآمد ہوتا ہے[1]۔ نصیر الدین ہاشمی صاحب نے اپنے ایک مضمون میں اس اختلاف کو یکسر نظر انداز کر کے سر بذل یعنی ب کے دو اعداد کے اضافے کے ساتھ

---

[1] ممکن ہے کہ اس نسخے کی کتابت ۱۱۷۵ھ میں ہوئی ہو اور کاتب نے ازراہِ سہو اصل سنہ (سنہ تالیف) کے بجائے سالِ رواں (سنہ کتابت) لکھ دیا ہو۔

سالِ ترتیب ۱۲۶۸ھ متعین کیا ہے[1]۔ لیکن ہاشمی صاحب کے اس موقف کو قبول کرنے میں کئی قباحتیں ہیں۔ اوّل تو یہ کہ بصورتِ موجودہ مصرعِ ثالث ناموزوں ہے اور اس میں "بذل" سے پہلے واو عاطفہ کی موجودگی اور اس سے قبل بغیر کسی فصل کے "روے" اور "سر" کے اجتماع کی بنا پر تعمیہ کی صورت پوری طرح واضح نہیں۔ دوسرے یہ کہ تذکرے کے آخر میں مولف نے اعداد کی کمی یا بیشی کا ذکر کیے بغیر صرف مصرع چہارم کو تاریخِ تالیف کا حامل قرار دیا ہے۔ ان کا بیان ہے کہ

"چوں در رغربرِ افکارِ خواطرِ دریا مقاطرِ نیساں طبعاں و گل ہاے ہمیشہ بہار رنگیں خیالاں دریں (تذکرہ) مجتمع بودند، سالِ تاریخ و نامش "گلدستہ ریحانِ بہار معنی" است۔" (ص ۲۲۱)

اس صورت میں بظاہر اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں کہ مصرعِ ثالث کو محرف اور ناقابلِ فہم ہونے کی بنا پر خارج از بحث قرار دے کر ۱۱۶۶ھ کو سالِ تالیف تسلیم کر لیا جائے لیکن اس طرح تحقیق کے تقاضے پورے نہیں ہوتے۔ اس لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں مولف کے دوسرے بیانات کی طرف رجوع کیا جائے۔ گزشتہ سطور میں دیباچے کے حوالے سے یہ بات ہمارے علم میں آچکی ہے کہ فتوت نے اس تذکرے کی ترتیب سے قبل سید عبدالولی عزلت کے کتب خانے سے استفادہ کیا تھا۔ آگے چل کر ردیف العین کے تحت ان کے حالات میں انھوں نے لکھا ہے کہ:

"از چندے در نجف بنیاد حیدر آباد منبسطِ بساطِ اوقاتِ فرحتِ آیات است۔" (ص ۱۵۵)

عزلت کے کتب خانے اور ان کی ذات سے متعلق فتوت کے ان بیانات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے یہ تذکرہ حیدر آباد میں اس زمانے میں لکھا ہے جب کہ عزلت کو وہاں رہتے ہوئے کچھ مدت گزر چکی تھی۔ یہ بتانا محال ہے کہ وہ کس سنہ میں حیدر آباد

---

[1] سہ ماہی "ہندستانی" الٰہ آباد شمارہ ماہِ اکتوبر ۱۹۳۳ء ص ۳۸۴ و سہ ماہی "نواے ادب" بمبئی شمارہ ماہ اپریل ۱۹۵۶ء ص ۶۷

میں وارد ہوئے لیکن بعض قرائن کی بنیاد پر اس زمانے کا تعین کیا جا سکتا ہے۔ حیدرآباد پہنچنے سے قبل وہ مرشد آباد میں نواب علی وردی خاں مہابت جنگ (متوفی ۱۱۶۹ھ/۱۷۵۶ء) کی سرکار سے وابستہ تھے اور اس سے پہلے دو ڈھائی برس دہلی میں رہ چکے تھے۔ دہلی کے زمانۂ قیام میں علی قلی خاں والہ داغستانی نے اپنے تذکرے "ریاض الشعرا" کا ایک قلمی نسخہ انھیں بطور تحفہ پیش کیا تھا جو اب کتب خانۂ آصفیہ حیدرآباد کے ذخیرۂ مخطوطات میں شامل ہے۔ اس نسخے کی ابتدا میں عزلت نے اپنے قلم سے درجِ ذیل عبارت تحریر کی ہے:

"تذکرۂ بے بدل کہ ریاض الشعرا نام دارد تصنیف علی قلی خاں داغستانی والہ تخلص در شاہ جہان آباد در ۱۱۶۱ھ از مصنف تصنیفش تمام شد و این نسخہ خود نذرِ فقیر عزلت نمود۔ فقیر در بنگالہ بود کہ در ۱۱۷۰ھ او برحمتِ خدا رسید۔"

حیدرآباد میں ۱۱۷۰ھ/۵۷-۱۷۵۶ء کے بعد آنے والے برسوں میں ان کی موجودگی کا ثبوت جن ذرائع سے ملتا ہے، ان میں سب سے اہم گردیزی کے تذکرۂ ریختہ گویاں کے اس قلمی نسخے کا ترقیمہ ہے جس پر مولوی عبدالحق نے اپنے شائع کردہ متن کی بنیاد رکھی ہے۔ یہ نسخہ سید عبدالغنی ابن سید محمود اصفہانی نے عزلت کے "حسب الفرمائش" غالباً انھی کے کتب خانے کے لیے غرہ شعبان ۱۱۷۲ھ (۲۹ مارچ ۱۷۵۹ء) کو حیدرآباد میں مکمل کیا تھا۔ ظاہری اندازے کے مطابق عزلت اس سے کم از کم چار چھ ماہ قبل حیدرآباد پہنچ چکے ہوں گے۔ گمان غالب یہ ہے کہ انھوں نے جمادی الاولیٰ ۱۱۷۰ھ/جنوری ۱۷۵۷ء میں جنگِ پلاسی میں سراج الدولہ کی شکست اور شہادت کے بعد حالات کی نامساعدت کے باعث مرشد آباد کی سکونت ترک کی ہوگی۔ یہ بات بہرحال طے شدہ ہے کہ وہ ۱۱۷۰ھ/۵۷-۱۷۵۶ء سے قبل حیدرآباد نہیں پہنچے تھے۔ اس لیے "ریاضِ حسنی" اس سے پہلے کی تالیف نہیں ہو سکتا۔

آئندہ سطور میں پیش کردہ تفصیلات سے واضح ہوگا کہ فتوت کے اس تذکرے کا ایک بڑا حصہ تذکرۂ گردیزی سے ماخوذ ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ دوسری کتابوں کی طرح یہ تذکرہ بھی انھیں عزلت کے کتب خانے ہی سے حاصل ہوا ہوگا۔ بہ گمان غالب یہ ۱۱۷۲ھ/۱۷۵۹ء کا لکھا ہوا وہی قلمی نسخہ ہوگا جس پر مطبوعہ نسخے کا متن مبنی ہے۔ اس قیاس کی روشنی میں یہ

رائے قائم کی جاسکتی ہے کہ "ریاض حسنی" شعبان ۱۱۷۲ھ/اپریل ۱۷۵۹ء کے بعد مرتب ہوا ہے۔

متذکرہ قیاسی نتائج کو نگاہ میں رکھتے ہوئے مولف کی نظم کی ہوئی رباعی کے مصرعِ ثالث کی تصحیح اس طرح کی جاسکتی ہے کہ اس کے تیسرے لفظ کو "سر" کی بجائے "ہنر" پڑھا جائے[1]۔ اس صورت میں الفاظِ ماقبل تعمیہ کی علامت قرار پائیں گے اور ان کی بنا پر "ہنر" اور "بذل" کے پہلے حروف یعنی "ہ" اور "ب" کے سات عدد مصرعِ ثالث کے اعداد میں شامل کرنے کے بعد ۱۱۷۳ھ حاصل ہوگا۔ چونکہ دوسرے تمام شواہد سے اس سنہ کی تائید ہوتی ہے، اس لیے ہمارے نزدیک یہی ریاضِ حسنی کا سالِ تالیف ہے۔

دیباچے کے حوالے سے فتوت کا یہ بیان کہ انھیں سراج الدین علی خاں (آرزو) کے فارسی تذکرے (مجمع النفائس) سے "ایجادِ تذکرہ ہندی" کی ترغیب ملی، ابتدائی سطور میں نقل کیا جاچکا ہے۔ ممکن ہے یہ بات اپنی جگہ درست ہو لیکن "ریاض حسنی" کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں "مجمع النفائس" سے کہیں زیادہ مدد گردیزی کے تذکرے "گلشن راز" سے ملی ہے۔ اگرچہ کلیم اللہ لسآن کے متعلق اس ایک مجمل و مختصر جملے کے علاوہ کہ "در رفاقتِ محمد الحسینی الگردیزی مصنفِ تذکرۂ شعراء ہند بہرہ اندوزگشتہ" نہ تو ان کا کوئی بیان اس تذکرے سے ان کی براہِ راست واقفیت کا پتا دیتا ہے اور نہ کوئی دوسری تحریر اس کے مطالب سے استفادے کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ لیکن تقابل اور موازنے کی نظر سے دونوں تذکروں کی سرسری ورق گردانی کے ساتھ ہی یہ حقیقت منکشف ہونے لگتی ہے کہ یہ تذکرہ ان کے پیش نظر رہا ہے اور انھوں نے اس کے مشتملات سے صرف استفادہ ہی نہیں، سرقے کی حد تک خوشہ چینی کی ہے۔ درج ذیل مثالوں سے اس کیفیت کا اندازہ ہوگا:

---

[1] زیر بحث مصرع اس ترمیم کے بعد بھی ناموزوں رہتا ہے لیکن واو عاطفہ کو "ہنر" کے حرف آخر کے بجائے "بذل" کے حرفِ اول کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے تو یہ سقم دور ہوجائے گا۔ قدیم شعرا کے کلام میں اس قسم کی بے ضابطگی کی مثالیں بہ کثرت موجود ہیں۔

گردیزی	فتوت

میر محمد باقر حزیں

"صاحبِ تلاشِ معنیٔ رنگیں، میر محمد باقر حزیں..... غنچہ استعدادش از نسیم انفاسِ میرزا مظہر شگفتہ ..." (ص ۳۶)	"صاحبِ تلاشِ معنیٔ رنگیں، میر محمد باقر حزیں۔ چمنِ فکرش آب پرورد مرزا مظہر است۔" (ص ۷۸)

خواجہ میر درد

"در معنی یابی فرد، خواجہ میر درد۔ از شعرائے ممتازِ زمانہ است و در سخن گوئی یگانہ۔ بے اغراقِ طبعِ بلندش رساست و فکر دل پسندش والا۔" (ص ۵۳)	"سخن در دانگیزش ہمہ قطعہ و فرد، خواجہ میر درد طوطیٔ شکریں مقالِ شکرستانِ ہند است۔ حقا کہ در سخن گوئی یگانۂ آفاق و طبع بلند و فکرش رساست۔" (ص ۹۸)

سیتا رام عمدہ

"سیتا رام عمدہ تخلص، زادگاہش کشمیر است ..... در ریختہ تتبعِ دیوانِ انعام اللہ خاں یقین می نماید و شعر را بشستگی و رنگی می گوید۔" (ص ۱۰۷)	"عمدہ تخلص سیتا رام ..... وطن اصلش کشمیر۔ سخن را بطرز انعام اللہ یقین می گوید و تلاش بشستگی و رنگی دارد۔" (ص ۱۵۳)

میر تقی میر

"سخن سنجِ بے نظیر، میر محمد تقی میر تخلص، زادگاہش اکبر آباد است و طبعش معنی ایجاد۔ شمعِ استعدادش برکردۂ شعلۂ ادراکِ سراج الدین علی خاں آرزو است ...۔" (ص ۱۳۷)	"والا فکر بے نظیر، میر محمد تقی میر زادگاہش اکبر آباد است و فکرش رنگینیٔ ایجاد۔ مصباحِ طبعش برکردۂ تجلی کدۂ ادراکِ سراج الدین علی خاں آرزو است ...۔" (ص ۱۸۸ و ۱۸۹)

مصطفیٰ خاں یکرنگ

"معنی یاب بے درنگ مصطفیٰ خاں یکرنگ۔ باآبرو یک طرح بودہ و تلاش معنیٔ تازہ نمودہ۔" (ص ۱۶۴)	"معنی یاب بے درنگ مصطفیٰ خاں یکرنگ۔ مسموع گردیدہ کہ باآبرو ہم طرح بود ..." (ص ۲۱۸)

یہ وہ مقامات ہیں جہاں فتوت نے گردیزی کے بیانات سے بعض جملے لفظ بہ لفظ اور بعض کسی قدر ترمیم و تغیر کے ساتھ نقل کیے ہیں۔ چراغ سے چراغ جلانا کوئی بری بات نہیں۔ تقریباً تمام تذکرہ نگاروں نے اپنے پیش رو مصنفین کی معلومات سے استفادہ کیا ہے، البتہ اس طرح دوسروں کے رشحاتِ قلم پر دست درازی بلاشک و شبہ غیر مستحسن اور قابل گرفت ہے۔ اس کے باوجود اس بنا پر کہ یہ تذکرہ ایک ایسے زمانے میں لکھا گیا ہے جب کہ حصولِ معلومات کے ذرائع اور دریافت و تحقیق کے امکانات محدود تھے، معنوی اشتراک کی یہ صورت بھی کسی حد تک گوارا کی جا سکتی ہے لیکن فتوت نے بعض اوقات اس سے بھی زیادہ دیدہ دلیری کے ساتھ تذکرۂ گردیزی کے مشتملات پر شب خون مارا ہے۔ اس لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ بعض ایسے مقامات کی بھی نشان دہی کر دی جائے جہاں دونوں تذکروں کے درمیان سے دوئی کے تقریباً تمام ہی حجاب اٹھ گئے ہیں اور فتوت کے لیے سرقے کے الزام سے بچ نکلنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی ہے۔ درج ذیل اقتباسات اسی ضمن میں آتے ہیں:

گردیزی	فتوت
(۱) "عمدۂ امرائے ذیشان، اسدالدولہ انسآن، در عہد سعادت مہدِ حضرت فردوس آرام گاہ بمنصب ہفت ہزاری و جمیع سامان مکنت و حشمت کہ منتہائے متمنائے امارت است، رسیدہ محسودِ اقران و امثال گردیدہ۔ با وصف کثرتِ	"عمدۂ امرائے ذیشان، اسدالدولہ انسآن، در عہدِ سعادت مہدِ حضرت فردوس آرام گاہ بمنصب ہفت ہزاری و جمیع سامانِ مکنت کہ منتہائے متمنائے امارت است، رسیدہ محسود اقران و امثال گردیدہ و با وصف کثرتِ مشاغل دنیوی[1]

[1] اصل نسخے میں کسی شخص نے زیرِ تو سین عبارت کو قلمزد کر کے حاشیے پر "سرفرازی داشت" بنا دیا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ فتوت ہی کی تحریر ہو۔

مشاغل دنیوی باقتضائے موزونیٔ طبیعت شعر بزبانِ ریختہ می گفت و دُرِ معنی در تصوف می سفت ....“ (ص ۱۷)

(۲) ”ادا فہمِ معنی پرور، مرزا جانجاناں مظہر، اصلش از معمورۂ بخارا و مولد و منشاش اکبرآباد است .... حقا کہ ذاتش مظہرِ تجلیاتِ الٰہی است و مظہرِ انوارِ فیوضاتِ غیر متناہی .... از انجا کہ از علم و فقہ و حدیث حظے وافر دارد و از کتب سیر و تواریخ بہرۂ متکاثر، سرش از بلند ہمتی بشعر و شاعری فرو نمی آید و ایں مشغلہ ہا را سرمایۂ افتخار نمی انگارد .... لیکن چوں عشقِ سخن سرشتۂ آب و گلش ہست و مہرِ معنی جاگزینِ دلش از فرطِ استیلائے عشقِ معنی ہر گاہ از صحبتِ صوفیانِ خانقاہ و مستفیدانِ خدا خواہ فرصتش دست بہم می دہد، متوجہ ایں شغلِ بے حاصل می گردد ....“

(ص ۱۳۱ و ۱۳۲)

(۳) ”صاحبِ تلاشِ معنیٔ رنگیں، انعام اللہ خاں یقینؔ تخلص، پسر اظہر الدین خاں بہادر مبارک جنگ، نبیرۂ حضرت شیخ مجدد الفِ ثانی است و نبیسۂ نواب حمید الدین خاں مرحوم، باقتضائے موزونیٔ طبع شعر بزبان ریختہ می گفت و دُرِ معنی در تصوف می سفت ....“ (ص ۴۰ و ۴۱)

”نکتہ رسِ معنی پرور، مرزا جانجاناں مظہر، گوہرِ اصلش از دریائے بخارا و مولد و منشاش اکبرآباد است متانت فکرش مظہرِ تجلیات الٰہی است و مظہرِ فیوضاتِ غیر متناہی۔ می گویند کہ (از) بلند ہمتی بہ شعر و شاعری سر فرو نمی آرد و ایں را سرمایۂ افتخار نمی انگارد۔ اکثر اوقات گرامی خود را در تکرارِ حدیث مصروف می دارد و از سیر (و) تواریخِ سلف بہرۂ متکاثر حاصل می نماید۔ از انجا کہ آب و گلش تخمیر یافتہ سخن است، عنان اشہبِ فکر را در ساحتِ فصاحتِ ایں فن می گرداند۔ غرض امام الشعرائے عصرِ خود است منصفانِ سینہ صاف افضل المتاخرین می گویند و در ثنا مدحش بسر و چشم می پویند۔“ (ص ۱۸۳ و ۱۸۴)

”صاحبِ تلاشِ معنی رنگین، انعام اللہ خاں یقینؔ، خلف الصدق اظہر الدین خاں بہادر مبارک جنگ، نبیرۂ حضرت شیخ مجدد الف ثانی و نبیسۂ نواب حمید الدین مرحوم، شہبازِ خیالش

شہبازِ خیالش بصیدِ معنی بلند پرواز است	بصیدِ معنی بلند پرواز است و ہمائے
وہمائے اندیشہ اش برقلۂ قافِ سخن بہ پر	اندیشہ اش برقلۂ قافِ سخن بہ پرفشانی
فشانی ممتاز۔ بے اغراقِ ریختہ گوئی را	ممتاز۔ بے اغراقِ ریختہ گوئی را برطاقِ
برطاقِ بلند گزاشتہ وتخمِ معنی در زمینِ	بلند گزاشتہ وتخمِ معنی در زمینِ سخن
سخن کاشتہ۔ آنچہ از طبعش سرزدہ از	کاشتہ۔ وآنچہ از طبعش سرزدہ از فرطِ
فرطِ شیوع وحسنِ قبول در تمام ہندوستان	شیوع وحسنِ قبول در تمام ہندوستان
برافواہِ السنہ جاری است۔ استفادۂ	برافواہ والسنہ جاری است۔ استفادۂ
سخن از افادت گاہِ میرزا جانِ جاناں	سخن از افادت گاہ مرزا جان جاناں
مظہر گرفتہ۔ چنانچہ می گوید ؎	مظہر گرفتہ۔ چنانچہ می سراید ؎
جیوں نماز اپنے پہ شام وصبح لازم کر یقیں	جیوں نماز اپنے پہ شام وصبح لازم کر یقیں
حضرتِ استاد یعنی شاہ مظہرؔ کی ثنا"	حضرت استاد یعنی شاہ مظہرؔ کی ثنا"
(ص ۱۴۶)	(ص ۲۱۱)

بغیر کسی حوالے کے اخذ واقتباس کا یہ انداز ایک قسم کی علمی خیانت ہی نہیں، مولف کی کم سوادی اور عجزِ بیان کی دلیل بھی ہے۔ گردیزی نے اپنے تذکرے میں ستانوے شاعروں کا ذکر کیا ہے۔ ان میں سے (شاہ محمدی) بیدار اور محمد اسمٰعیل بیتاب کے علاوہ باقی تمام شعرا بعینہٖ اسی ترتیب اور اکثر اسی قدر انتخابِ کلام کے ساتھ "ریاضِ حسنی" میں شامل ہیں۔ گویا اس تذکرے کا تقریباً نصف حصہ تذکرۂ گردیزی سے ماخوذ ومستعار ہے۔ اس صورت حال کے پیشِ نظر بقیہ نصف حصے کے بارے میں وثوق کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ کوئی مخالف ثبوت موجود نہ ہونے کی بنا پر اگر اسے بلا شرکتِ غیرے فتوت ہی کی تحریر تسلیم کر لیا جائے، تب بھی اس کے بارے میں کوئی اچھی رائے قائم کرنا مشکل ہے کیوں کہ اس حصے میں بھی شعرا کے تعارف کے معاملے میں بالعموم گردیزی ہی کا اتباع کیا گیا ہے۔ چنانچہ یہاں بھی مختصر نویسی اور چند گنے چنے الفاظ کی تکرار اور جملوں کے اعادے کی وہی کیفیت حاوی وغالب نظر آتی ہے جو تذکرۂ گردیزی کے بیانات میں نمایاں ہے۔ البتہ دکن کے بعض مشاہیرِ سخن کے تراجم کسی حد تک

اس روشِ عام سے مستثنیٰ ہیں۔ اگرچہ ان مواقع پر بھی فتوتؔ کی توجہ حالات و واقعات کے بیان سے زیادہ عبارت آرائی پر مرکوز رہی ہے، پھر بھی ان منتخب مرقعوں میں کہیں کہیں زیرِ بحث شعرا کی شخصیتوں کے خط و خال کا عکس دیکھا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر درج ذیل اقتباسات ملاحظہ ہوں:

(۱) مرزا رضا بیگ رضاؔ

"گل سرسبدِ گلشنِ ہمیشہ بہارِ رنگیں، سروِ ممتازِ جوئبارِ چمنِ ایجاد و تکوین، پیرایش دہیِ (دہِ) ریاضِ مضموں، آرایش کنہ (کن) الفاظِ موظوں (موزوں) خائیِ سازِ دستِ شاہدِ خیال، نزاکت فہمِ معنی بندانِ عدالمثال (عدیم المثال)، غازہ کشِ چہرۂ عرائسِ رنگیں بیانی، سرمہ ریزِ دیدۂ مبصرانِ معانی، خوش خرام مصفائے تکلم (کذا) مراتِ مجلائے انظارِ ترحم (کذا) فروغِ شمعِ صفا، نو بادۂ رحین (رحیق) وفا، مرزا رضا بیگ رضاؔ، چراغِ حسین آبادِ خجستہ بنیاد است۔ طبعش از پرتوی (پرتو) روشنیٔ حضرت شاہ سراج الدین مدظلہٗ ضیا پذیر و درخشندگیٔ بدرِ اشعارش جہاں گیر، کواکبِ الفاظِ موظونِ (موزون) عالی فکرش چوں سطورِ ابیاتِ کہکشاں طالع و انوارِ جملہ صفاتِ او از کلامش شائع۔ زمینِ ریختہ را بایں طور مشرقستانِ معنی می سازد۔"[1]

(ص ۱۱۳ و ۱۱۴)

(۲) سراجؔ اورنگ آبادی

"سراجؔ انجمنِ محفلِ قدسی اساساں، بدرِ منیرِ آسمانِ شب زندہ داراں، خلّص معنی سراج المنیر، ترجمۂ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ، خورشید مطلعِ حقیقت، اخترِ برجِ طریقت، مخزنِ سرائرِ (کنوز) مصطفوی، معدنِ جواہرِ رموزِ مرتضوی، نائب

---

[1] اس اقتباس میں ہم نے خاص طور پر الفاظ کو ان کی اصل مکتوبی شکل کے مطابق نقل کر کے قوسین میں صحیح صورت پیش کر دی ہے۔ تاکہ قارئین زیرِ نظر خطی نسخے کے نقائص کتابت کا اندازہ کر سکیں لیکن دوسرے مقامات پر سہولت کی غرض سے اس قسم کی تمام تصحیحات متن میں شامل کر لی گئی ہیں۔

مناب مرتبہ سمع اللہ۔ سنجلی منورِ فتبارک اللہ، رہنمائے جادہ پیمایانِ مضمارِ معرفت، قائم مقام جانشینانِ صدرِ شریعت، خلاصۂ صفاتِ اہلِ تصوف، سلالۂ سلسلۂ با تصرف، خندہ (زن) بہ عیش ادہم صفت، زندہ دل مسیحا سیرت، مشہور آفاق، یگانہ قلوبِ بے نفاق، فخرِ افصحانِ فصاحت بیان، جانِ گلزارِ سخنانِ اعجاز تواماں، دادگرِ اہلِ کمال، فریادرس خوش نوایانِ صاحبِ حال، فخرِ ہندو دکن، عزیزِ دل ہائے پُرفن، از قدوم میمنت لزومش رونقِ خجستہ بنیاد واز انفاسِ متبرکہ اش رنگیں سوادیٔ حیدرآباد، برگزیدۂ اہلِ بہشت، کامل رشیدِ خاندانِ اہلِ چشت، والا رتبہ، عالی مزاج، حضرت شاہ میر سراج الدین حسینی، سرآج، از سادات حسینی صحیح النسب است۔ بہ جناب قدوۂ سالکان حضرت شاہ عبدالرحمٰن قدس سرہٗ دستِ بیعت دارند۔ بہ کمال توکل و استغنا بدریافتِ معنیٔ مَنْ یَتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ فَھُوَ حَسْبُہٗ، اوقاتِ ملکوتی صفات را درخجستہ بنیاد بہ یادِ حق می گذرانند و در مبادیٔ نشو و نما بر نگِ گلِ خرقہ درویشی در بر کردہ و در تباشیرِ صبحِ شعور بسانِ بلبلِ زمزمۂ سخن سنجی پیش گرفتہ۔ رتبۂ سخن گوئی از شانِ صفاتِ او بمرتبۂ ادنیٰ است و اعجازِ معجزات از کلامِ عیسیٰ سہام او ہویدا۔ صاحبِ کمالانِ منصفِ ہندو دکن افضل المتاخرین می گویند و در میدان وصفش بسر و چشم می پویند۔"

(ص ۱۳۰ و ۱۳۱)

(۳) سید عبدالولی عزلت

"اعلیٰ پایہ گاہ، بلند فطرت، والا رتبہ، رفیع الدرجت، برگزیدۂ فضلا و العلما، پیشوائے فقرا و الاتقیا، سخن را بر سائی فکرش معراج، طبعِ صفا، منزل او بحرِ موّاج دلش (از) آبائی علم لدنی معمور، چشمش از مشاہدۂ جمالِ اِنَّ اللّٰہَ جَمِیْلٌ پرنور، عالمِ علومِ وہبی، کاسبِ فنونِ کسبی، عارفِ معارفِ کنہاتِ عرفاں، واقفِ کلیاتِ اسرارِ شہود و امکاں، معزز مرتبت شاہ عبدالولی المتخلص بہ عزلت، خلف الصدق حضرت سید سعد اللہ است۔ سلسلہ نسبش بہ حضرت پیر اشرف ..... می رسد۔ مسکن و ماواش بندرِ مبارک سورت دارد۔ در ترکیب و تعلیمِ جمیع علم و فن کوشیدہ

تنش خلعتِ تہذیبِ اخلاقِ خلقِ کریم حقیقی پوشیدہ۔ ذاتِ منبع البرکاتِ او از جملہ فخرِ موجودات، از چندے در نجف بنیاد، حیدر آباد منبسطِ بساطِ اوقاتِ فرحتِ آیات است۔" (ص ۱۵۴ و ۱۵۵)

ان اقتباسات کے مطالعے سے یہ حقیقت بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ فوقیت جہاں تفصیل کی طرف راغب ہوئے ہیں وہاں بھی انھوں نے اپنا زورِ قلم شخصیت کی عقیدت مندانہ تعریف وتوصیف پر صرف کر دیا ہے۔ اس بے اعتدالی کا نتیجہ یہ ہے کہ اگر ان خاکوں میں زیرِ بحث شعرا کی شخصیات کا ایک خاص پہلو غیر معمولی طور پر نمایاں ہو گیا ہے تو بعض گوشے پوری طرح ابھر کر سامنے نہیں آسکے ہیں اور بعض یکسر تاریک رہ گئے ہیں۔ "ریاض حسنی" کے تقریباً وہ تمام ہی طویل تعارفی خاکے جنھیں مولف کی ذاتی کوشش و کاوش کا ماحصل کہا جا سکتا ہے اور جن کی مجموعی تعداد دس بارہ سے متجاوز نہیں، اسی عدم توازن کے آئینہ دار ہیں۔ حتیٰ کہ جن مقامات پر انھوں نے خاص خاص حالات وواقعات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نسبتاً بہتر طور پر تعارف کا حق ادا کرنے کی کوشش کی ہے، وہاں بھی ان کا قلم اس کوتاہی کے ازالے سے قاصر رہا ہے۔ درج ذیل اقتباسات اسی کیفیت کی نمائندگی کرتے ہیں:

(۱) عارف الدین خاں عارفؔ

"وطن بزرگانش بلخ است۔ مدتے در ہندوستان کوس سخنوری می نواخت وزد سبقت از ہمگنانِ عصر می باخت۔ آخر الاوقات بہ خجستہ بنیاد توطن گزیدہ و رگ جاں از علائقِ دنیوی بریدہ، قمری آسا لباسِ خاکستری در بر کردہ واز قبولیت حضرت شاہ محمود خلیفہ حضرت بابا شاہ مسافر نقش بندی خود را مخاطب بہ لقب شاہ ہیچ کردہ اند۔۔۔۔۔ در فنِ تاریخ گوئی بے نظیر و مغتنمِ عصر، عزیز صاحبِ کمالانِ دہر۔۔۔" (ص ۱۶۰)

(۲) ولی دکنی

"زادبومش دکن است و دستِ بیعت بجناب حضرت شاہ علی رضائے گجراتی

قدس سرہ دارد۔ موجدِ ریختہ گوئی و بانی بنائے فصاحتِ زبانِ ہندی اوست۔
درفنِ ریختہ گوئی امام الشعراست۔ مدتے در بلدۂ گجراتِ عافیتِ صفات چہرۂ
ہستی افروختہ۔ آخر الامراز سورۃ (کذا) جہانِ بے بنیاد گذشتہ بملک قدیم شتافت۔"

(ص ۲۰۸)

تاریخی و سوانحی عناصر کی طرح فتوت کے ہاں نقدِ شعر کا عنصر بھی تقریباً مفقود ہے۔ پورے تذکرے میں خصوصیاتِ کلام اور فنی امتیازات کے بارے میں اظہارِ خیال کی بہ مشکل آٹھ دس مثالیں ملتی ہیں اور ان کی نوعیت بھی کچھ اس قسم کی ہے :

(الف) خان آرزو :

"نہالِ مضموں را بہ آب و تاب در زمینِ موزونیت بہ آئینِ بہیں می نشاند۔" (ص ۳۳)

(ب) مرزا داؤد

"خاکِ قالب الفاظ را بہ آتشِ معنیٔ رنگیں تاب دادہ۔" (ص ۱۰۵)

(ج) عارف الدین خاں عارف

"شعرِ فارسی و ہندی بلاتشبہِ سخنِ غیری گوید و جادۂ مستحکم نازک خیالی
می پوید۔" (ص ۱۶۰)

(د) نصرتی بیجاپوری

"اکثر قصہ ہا و دیوان ہا بزبانِ ہندی مرتب ساختہ و دراں تلاش ہائے بسیار
کردہ و دادِ معنی یابی دادہ۔" (ص ۲۰۶)

مواد و موضوع سے متعلق متذکرہ بالا کوتاہیوں کے علاوہ فتوت کے ہاں واقعات کی غلط تعبیر اور حقائق سے انحراف کی مثالیں بھی جا بجا موجود ہیں۔ یہاں ان میں سے چند کا ذکر بے محل نہ ہوگا۔

(الف) نصرتی بیجاپوری کے حالات میں لکھتے ہیں :

"وقتے کہ شاہ اورنگ زیب عالم گیر غازی ..... ولایتِ دکن را در تسخیر
در آورد و حکم بہ قاضی بنوشت کہ سخنِ سخن سنجانِ ایں ملک را در نظر بگذرانند،

بموجبِ حکم گذرانیدند۔ کلامِ نصرتی را بر ہمہ افضل فرمودہ۔ بخطاب ملک الشعرائے ہند سرفرازی یافت۔" (ص ۲۰۶)

یہ روایت خلافِ واقعہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نصرتی کو ملک الشعرا کا خطاب اورنگ زیب نے نہیں، بیجاپور کے فرماں روا علی عادل شاہ ثانی (۱۰۶۷ھ/۱۶۵۶ء تا ۱۰۸۳ھ/۱۶۷۳ء) نے عطا کیا تھا، اور وہ (نصرتی) بیجاپور پر اورنگ زیب کے تسلط (۱۰۹۷ھ/۱۶۸۶ء) سے بارہ برس قبل ۱۰۸۵ھ/۱۶۷۴ء میں شہید ہو چکے تھے[1]

(ب) گردیزی کے تذکرے سے استفادے کے باوجود ان کی روایت کے برخلاف شیخ نجم الدین عرف شاہ مبارک آبروؔ کو شیخ مبارک اللہ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

(ج) عارف الدین خاں عاجزؔ کا ذکر ان کے اصل تخلص (عاجزؔ) کی بجائے نام کے جزوِ اول (عارفؔ) کے تحت کیا ہے۔

(د) خواجہ احسن الدین خاں بیانؔ کے حالات بہ تفصیل ذیل دو جگہ لکھتے ہیں:

۱۔ "رگِ سخن را با او پیوند جاں، خواجہ احسن اللہ بیانؔ جہان آبادی شمعِ ادراکش برکردۂ تجلی کدہ مرزا مظہرؔ۔" (ص ۶۲)

۲۔ رگِ سخن را با او پیوند، محمد احسن بیانؔ، از جہان آباد است۔" (ص ۶۴)

(ہ) مرزا رفیع سوداؔ کے بارے میں لکھتے ہیں:

"بلبلِ طبعش از آئینہ نمائی محمد میر میرؔ گویا شدہ، چنانچہ می سراید ؎

سوداؔ تو اس غزل کو غزل در غزل ہی کہہ
ہونا ہے تجھ سے (کذا) میرؔ سے استاد کی طرف ....." (ص ۱۲۱ و ۱۲۲)

---

[1] تاریخ شہادت کسی نامعلوم شاعر نے اس طرح نظم کی ہے

ضربِ شمشیر سوں یو دنیا چھوڑ — جا کے جنت منیں خوشی ہو رہے
سالِ تاریخ آ ملائک نے — یوں کہے: نصرتی شہیدا ہے

مزید تفصیلات کے لیے دیکھیے علی گڑھ تاریخِ ادب اردو جلد اول ص ۳۰۱

فتوت کی علمی لیاقت اور ان کے تذکرے کے مندرجات کی نوعیت وکیفیت کا اندازہ کرنے کے لیے یہ آخری بیان ہی کافی ہے۔ ظاہر ہے کہ جو شخص ایک سلیس وسادہ شعر کے مفہوم تک رسائی کی صلاحیت نہ رکھتا ہو اور اس سے صحیح نتیجہ اخذ کرنے سے قاصر ہو اس سے تصنیف وتالیف کے میدان میں کوئی قابلِ قدر کارنامہ انجام دینے اور بالخصوص تذکرہ نویسی کی کارگاہِ شیشہ گری سے کامیابی کے ساتھ گزر جانے کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

مخزنِ نکات

سوداؔ کے مایۂ ناز شاگرد قائمؔ چاندپوری (متوفی ۱۲۰۸ھ/۹۴-۱۷۹۳ء) جہاں اُردو کی بیشتر اصناف سخن پر قدرتِ کاملہ کی بدولت اکثر ناقدینِ شعروادب کے نزدیک اساتذۂ فن کی صف اوّل میں شمولیت کے مستحق قرار پائے ہیں، وہیں ان کے فکر وشعور کی پختگی اور اندازِ نظر کی انفرادیت شعرائے اردو کے تذکرہ نگاروں کی فہرست میں بھی انھیں ایک نمایاں مقام عطا کرتی ہے۔ ان کا تذکرہ "مخزنِ نکات" اردو کے اہم ترین تذکروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس تذکرے کو پہلی بار زیورِ طبع سے آراستہ کرنے کا شرف ڈیوڑھی مستقیم الدولہ، چھتہ بازار، حیدرآباد دکن کے ایک تاجرِ کتب سید رستم علی کو حاصل ہے[1] لیکن غالباً پریس سے بازار تک پہنچنے سے قبل ہی اس کے حقوقِ تالیف انجمن ترقیٔ اردو (ہند) اورنگ آباد، دکن نے حاصل کر لیے تھے چنانچہ اس کی اشاعت مولوی عبدالحق کے مقدمے کے ساتھ ۱۹۲۹ء میں انجمن کی طرف سے عمل میں آئی۔ اس نسخے میں کل ایک سو اکیس (۱۲۱) شاعروں کے حالات و اشعار درج ہیں۔ "مخزنِ نکات" کا دوسرا ایڈیشن نومبر ۱۹۶۶ء میں ڈاکٹر اقتدا حسن کے مقدمے اور حواشی و تعلیقات کے ساتھ مجلس ترقیٔ ادب لاہور نے شائع کیا ہے۔ یہ انڈیا آفس لائبریری، لندن کے قلمی نسخے پر مبنی ہے جو غالباً نسخۂ اول پر مولف کے اضافوں کے بعد مرتب ہوا ہے۔ اس نسخے میں نسخۂ اول کے مقابلے میں جس کی اصل کا اب کوئی سراغ نہیں ملتا، علیمؔ دکنی، اعظمؔ سندیلوی، علی نقی کافرؔ، قمرالدین منتؔ، مراد علی حیرتؔ اور محمد شاکر

---

[1] مخزنِ نکات، طبع اول ص ۸۰۔ عام نسخوں میں اس صفحے پر کاغذ چسپاں کر کے اس کے اندراجات کو چھپا دیا گیا ہے

شاکر کے احوال و اشعار زیادہ ہونے کی بنا پر مجموعی طور پر دونوں نسخوں کے شعرا کی تعداد ایک سو ستائیس (۱۲۷) ہو جاتی ہے۔ محمد شاکر ناجی کے ذکر میں قائم نے ضمناً اپنے بھائی محمد منعم منعم کا ذکر کرتے ہوئے ان کا ایک شعر بھی بطور نمونہ نقل کر دیا ہے۔ ڈاکٹر اقتدا حسن نے اس کی بنیاد پر شعرا کی فہرست میں ایک اور نام کا اضافہ کر کے ان کی تعداد ایک سو اٹھائیس (۱۲۸) قرار دی ہے۔ علاوہ بریں "طبقاتِ سخن" کے مولف مبتلا میرٹھی کے بیان کے مطابق قائم نے ان کے حالات اور نمونہ کلام کو بھی اپنے تذکرے میں جگہ دی تھی[1] چونکہ یہ دونوں نسخے ان کے ذکر سے خالی ہیں اس لیے یہ قیاس غلط نہ ہوگا کہ شعرا کی فہرست میں توسیع کا سلسلہ موخرالذکر نسخے کی ترتیب و تسوید کے بعد بھی قائم رہا ہے۔ انڈیا آفس لائبریری کے نسخے سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ قائم کو مختلف شعرا کے کلام کی فراہمی میں پنجاب کے ایک غیر معروف شاعر اور میرزا سودا کے دوست رائے سنگھ عاقل کا تعاون بھی حاصل رہا تھا۔ چنانچہ ان کی پرخلوص مساعی کا اعتراف کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے:

"شاید کہ اگر از اعانت ایں بزرگ نمی بود، سرانجام ایں کار از ہیچ مدانِ بے دماغ صورت نمی بست۔" (ص ۱۷۱)

تذکرے کا نام خواجہ اکرم کے درجِ ذیل قطعۂ تاریخ سے ماخوذ ہے۔

قائم رکھے ہمیشہ خدا تیرے نام کو — کرنے سے ذکرِ خیر کے ہے موجبِ نجات
تاریخ اس کتاب کی جب میں نے کی تلاش — پیرِ خرد نے مجھ سے کہا: "مخزنِ نکات" (ص ۶۷)

"مخزنِ نکات" سے ۱۱۶۸ھ برآمد ہوتا ہے۔ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ یہی اس تذکرے کا سالِ ترتیب ہے لیکن صورت واقعہ اس سے کسی قدر مختلف ہے۔ خواجہ اکرم کے حالات کے تحت قائم کا بیان ہے کہ:

"چوں بر نوشتنِ ایں بیاض او را وقوفے حاصل شد یک قطعہ متضمن بر

---

[1] "مولف در خدمتِ ایں قائم الصراطِ یکتائی رابطۂ آشنائی داشت چنانچہ اکثر از اشعارِ من ہیچ مداں بقیدِ احوال در تذکرہ اش ثبت است۔" (نسخۂ شاہجہاں پور ص ۲۰۸)

تاریخ ..... معہ دیگر ابیات پیش فقیر آورد۔ از آنجا کہ مادۂ تاریخ مناسبِ نامِ کتاب بود بنائً علیہ بہماں اسم موسوم نمود۔" (ص ۶۶ و ۶۷)[1]

گویا جس وقت اکرم نے یہ قطعہ اور اپنے اشعار قائم کی خدمت میں پیش کیے تھے، "مخزن نکات" زیرِ ترتیب تھا۔ اس لیے نہ تو ہم ۱۱۶۸ھ کو اس کا سالِ آغاز ہی کہہ سکتے ہیں اور نہ سنہ اتمام قرار دے سکتے ہیں۔ ان حالات میں ابتدائے ترتیب اور اختتامِ کار کے سنین متعین کرنے کی غرض سے اس قطعے کے علاوہ دوسرے قرائن و شواہد کا سہارا لینا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے دیباچے کی درج ذیل عبارت ہمیں غور و فکر کی دعوت دیتی ہے۔ لکھتے ہیں کہ:

"بر ضمیرِ مہر تنویرِ سخن طرازانِ ہندوستاں و طوطیان شکر شکنِ ایں بوستاں مخفی و محتجب نماند کہ تا الی الآن در ذکر و بیانِ اشعار و احوال شعرائے ریختہ کتابے تصنیف نہ گردیدہ و تا ایں زماں ہیچ انسانے از ماجرائے شوق افزائے سخنورانِ ایں فن سطرے بتالیف نرسانیدہ۔ بنا برایں ایں فقیر مولف محمد قیام الدین قائم بعدِ کوشش تام و سعی تمام دواوین ایں اعزہ فراہم آوردہ پارۂ ابیات از ہر کدام برسبیلِ یادگار در ذیلِ ایں بیاض کہ بہ "مخزنِ نکات" موسوم است بقید قلم آوردہ۔" (ص ۱)

"مخزنِ نکات" سے قبل میر اور گردیزی کے تذکروں کی ترتیب و تکمیل کے پیشِ نظر اس دعوے کو بظاہر حال اوّلیت کا فخر حاصل کرنے کی ناپسندیدہ کوشش سے تعبیر کیا جاسکتا ہے لیکن تحقیق کے تقاضے ہمیں اس سرسری فیصلے پر مطمئن ہو جانے کی اجازت نہیں دیتے۔ گردیزی سے قائم کے تعلقات کے متعلق ہمیں کوئی علم نہیں البتہ میر سے اپنے مراسم کی نوعیت اور ہم سایگی کے بارے میں انھوں نے خود ہی وضاحت کر دی ہے[2]۔ ایسی

---

[1] مخزن نکات کے تمام اقتباسات طبع اول سے ماخوذ ہیں۔ جہاں طبعِ ثانی سے کوئی اقتباس لیا گیا ہے، وہاں اس کا حوالہ دے دیا گیا ہے۔

[2] "چوں قریبِ بندہ خانہ تشریف دارند، اکثر اتفاقِ ملاقات می افتد۔" (طبعِ ثانی ص ۱۲۲)

صورت میں یہ ممکن نہیں کہ وہ "نکات الشعرا" کی تالیف سے بے خبر رہے ہوں یا بر بنائے مصلحت انھوں نے دانستہ اس کے وجود سے انکار کیا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ میر سے بہت پہلے اس کام کا آغاز کر چکے تھے۔ درج ذیل شہادتیں ہمارے اس خیال کی تائید کرتی ہیں:

(۱) شاہ ولی اللہ اشتیاق کے متعلق قائم نے لکھا ہے کہ:

"مدتِ ہفت سال شد کہ بدار البقا انتقال نمود۔" (ص ۸)

خیراتی لعل بے جگر لکھتے ہیں کہ:

"فی سنہ یک ہزار و یک صد و پنجاہ ..... بہ اشتیاقِ سیرِ فردوس رختِ عزیمتِ بربست۔ راقمِ آثم در سالِ وفاتش بہ تعمیہ یک عددِ دل چاک کہ مراد از الف باشد، ایں قطعہ بہم رسانید ؎

وہ چہ سازیم شاہ ولی اللہ — دست بر زندگیٔ خود افشاند
بادلِ چاک بے جگر تاریخ — گفت: صد حیف اشتیاق نماند[1]

سال وفات کی اس دریافت کے بعد منقولۂ بالا اقتباس سے متعین طور پر یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ قائم نے اشتیاق کے حالات ان کے انتقال کے سات برس بعد، ۱۱۵۷ھ/ ۱۷۴۴ء میں تحریر کیے ہیں۔ جناب عرشی رام پوری نے اسی بنیاد پر سنہ مذکور کو "مخزنِ نکات" کے آغاز کا زمانہ قرار دیا ہے[2]۔ اگرچہ احتیاط کے پیشِ نظر ہمارے لیے اس رائے سے حرف بہ حرف اتفاق ممکن نہیں تاہم اس حد تک محقق موصوف کی ہم نوائی تمام قباحتوں سے بالاتر نظر آتی ہے کہ ۱۱۵۷ھ/۱۷۴۴ء میں یہ تذکرہ زیرِ تسوید تھا۔

(۲) محمد علی حشمت کے حالات میں ان کی شہادت کا واقعہ نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

---

[1] تذکرہ بے جگر نسخہ انڈیا آفس لائبریری لندن۔ ورق ۹۔ الف و ب

[2] دیباچۂ دستور الفصاحت ص ۵۲

"سابق بریں دو[1] سال برفاقت قطب الدین علی خاں ..... سمت چکلۂ مرادآباد رفتہ بود چوں در انجا با فوج علی محمد روہیلہ پائے جنگ بمیان آمد، ہماں جامع خان مذکور بجراحتِ تمام کشتہ شد۔" (ص ۲۶ و ۲۷)

حشمت کے مشہور شاگرد میر عبدالحئی تاباں استاد کی شہادت کے اس حادثے پر اپنے جذباتِ رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے ایک طویل مرثیے کے آخر میں کہتے ہیں کہ

تیرا تاباں غریب، خستہ جگر — فکرِ تاریخ میں تھا حد مضطر
مصرعِ آخری پہ کی جو نظر — کد سے ہاتف نے اس کو دی یہ خبر
ہائے حشمت شہید واویلا[2]

آخری مصرعے کے اعداد میں مصرعِ چہارم کے پہلے لفظ "کد" کے عدد شامل کرنے کے بعد ۱۱۶۱ھ برآمد ہوتا ہے۔ "سیر المتاخرین" کے مصنف نے بھی اس معرکے کی تفصیلات اسی سنہ کے واقعات کے تحت درج کی ہیں[3]۔ اس لیے نظر بظاہر حشمت کے حالات ۱۱۶۳ھ/۱۷۵۰ء میں شامل تذکرہ کیے گئے ہیں۔

یہ دونوں شہادتیں اس صورتِ حال کو بخوبی واضح کر دیتی ہیں کہ قائم "نکات الشعرا" کی تکمیل سے کئی برس پہلے "مخزنِ نکات" کی تالیف و ترتیب کا کام شروع کر چکے تھے۔ نیز

---

[1] انڈیا آفس کے نسخے میں اس جگہ "دو سال" کی جگہ "دہ سال" درج ہے۔ اگر یہ کتابت کی غلطی نہیں ہے تو اس اندراج کو معروف زمانۂ ترتیب (۱۱۶۸ھ) کے بعد کی تحریر تسلیم کرنا ہوگا۔ اشپرنگر نے اس اندراج کی بنیاد پر تذکرے کا زمانۂ ترتیب متعین کرنے کے بجائے ۱۱۶۸ھ کو سالِ تالیف مان کر حشمت کا سالِ وفات ۱۱۵۸ھ طے کر دیا ہے۔ (یادگار شعرا ص ۶۳)

[2] دیوان تاباں مرتبہ مولوی عبدالحق شائع کردہ انجمن ترقی اردو ہند حیدرآباد دکن ص ۲۷۶

[3] بحوالہ مراۃ السلاطین ترجمہ سیر المتاخرین جلد سوئم صفحات ۲۰ تا ۲۲۔ ڈاکٹر اقتدا حسن نے سر جادو ناتھ سرکار کی "زوال سلطنت مغلیہ" کے حوالے سے حشمت کی شہادت کو ۱۱۶۲ھ کا واقعہ قرار دیا ہے (حاشیہ ص ۶۶) لیکن ہمارے نزدیک تاباں اور صاحب سیر المتاخرین کے بیانات مرجح ہیں۔

اس میدان میں سبقت و اوّلیت کے متعلق ان کا دعویٰ بے بنیاد یا مبالغہ آمیز نہیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ مسئلہ بھی حل ہو جاتا ہے کہ اکرم کا قطعۂ تاریخ بالیقین تذکرے کی ترتیب کے درمیانی زمانے کی تصنیف ہے کیونکہ تذکرے میں کچھ ایسے بیانات بھی موجود ہیں جن کا اندراج حتمی طور پر ۱۱۶۸ھ کے بعد عمل میں آیا ہے۔ مثلاً:

(۱) میر صاحب کے ذکر میں رقم طراز ہیں:

"باخانِ مغفرت نشانِ شیخ سراج الدین علی خاں آرزو نسبت خواہرزادگی داشت۔ بعدِ فوتِ والد بزرگوار بہ ہمیں مناسبت وارد شاہِ جہان آباد گردیدہ مدتے بخدمتِ ایشانِ استفادہ آگاہی نمودہ اسم و رسمے بہم رسانید۔" (طبع ثانی ص ۱۲۱ و ۱۲۲)[1]

علامہ غلام علی آزاد بلگرامی کی تحریر کے مطابق آرزو کا انتقال ۲۲ ربیع الثانی ۱۱۶۹ھ (۲۶ جنوری ۱۷۵۶ء) کو ہوا ہے[2] اور یہ عبارت یقیناً ان کی وفات کے بعد معرضِ تحریر میں آئی ہے۔

(۲) محتشم علی خاں حشمت کے بارے میں اطلاع دیتے ہیں کہ

"قبل ازیں ہفت سال بمرگ دفعتہً از جہاں رفت[3]۔" (ص ۲۷)

لچھمی نرائن شفیق[4]، اسد علی خاں تمنا اور نگ آبادی[5]، خیراتی لعل بے جگر[6]، نواب

---

[1] انڈیا آفس لائبریری کے نسخے میں میر کے حالات نسخۂ اوّل سے بالکل مختلف ہیں لیکن آرزو کا ذکر دونوں ہی جگہ صیغۂ ماضی کے تحت کیا گیا ہے۔

[2] خزانۂ عامرہ ص ۱۱۹۔ فاضل مصنف اس سے قبل "سروِ آزاد" میں آرزو کی وفات کو جمادی الاخریٰ ۱۱۶۹ھ (مارچ ۱۷۵۶ء) کا واقعہ قرار دے چکے ہیں۔ لیکن دوسرے ذرائع سے اس روایت کی تائید نہیں ہوئی

[3] اشپرنگر نے یہاں بھی وہی غلطی کی ہے جس کا حوالہ محمد علی حشمت کے حالات کے تحت دیا جا چکا ہے۔ انھوں نے ۱۱۶۸ھ کو بنیاد بنا کر حشمت کا سالِ وفات ۱۱۶۱ھ متعین کیا ہے۔ (یادگار شعرا ص ۶۴)

[4] گل رعنا مشمولہ "تین تذکرے" مرتبہ نثار احمد فاروقی ص ۲۲۶

[5] گل عجائب، مرتبہ مولوی عبدالحق۔ ص ۴۸ [6] "تذکرۂ بے جگر" نسخہ انڈیا آفس لائبریری، لندن ورق ۵۹ ب

مصطفیٰ خاں شیفتہ[1] اور مولوی عبدالجبار ملکاپوری[2] کے بیانات کے بموجب حشمت کا سالِ رحلت ۱۱۶۳ھ (۱۷۵۰ء) ہے۔ اس لیے ان کا حال یا کم سے کم یہ آخری جملہ ۱۱۷۰ھ/۱۷۵۶ء کے قریبی زمانے میں لکھا گیا ہے۔

(۳) میر قمرالدین، منت کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

"نوجوانیست از نجیب زادہ ہائے بلدۂ سونی پت ..... از بدوِ شباب بقافیہ سنجی مشغول است و مشقِ سخن پیش فقیر مولف می نماید۔ حسن قیافہ اش دال است براں کہ بعدِ مشق رشدِ کافی وحظِ وافی از سخن دانی بہم خواہد رسانید۔" (طبع ثانی ص ۱۹۸)

منت کے فرزند میر نظام الدین ممنون نے ایک قطعہ تاریخ میں "خورشید والا" کو ان کے سالِ ولادت کا متضمن قرار دیا ہے[3] جس سے ۱۱۵۸ھ برآمد ہوتا ہے۔ اس صورت میں اگر "بدوِ شباب" کو تیرہ، چودہ برس کی عمر تک محدود رکھتے ہوئے اس تعارف کو اس کے قریبی زمانے کی تحریر تسلیم کر لیا جائے تب بھی ۱۱۷۲ھ تک کارِ ترتیب کے تسلسل کا پتہ چلتا ہے۔

(۴) خواجہ میر دردؔ کے بارے میں درجِ ذیل معلومات بہم پہنچاتے ہیں:

"رسالۂ در علمِ تصوف مسمّٰی بواردات ..... تصنیف کردکہ متعلق بدیدن است ..... والدِ شریفش خواجہ محمد ناصر ..... بہ نسبت مریدی و فرزندی وے افتخار دارد۔" (ص ۳۹)

اس بیان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جس وقت قائمؔ خواجہ میر دردؔ کے حالات قلم بند کر رہے تھے، "واردات" کی تصنیف کا کام ختم ہو چکا تھا اور ان کے والد خواجہ ناصر عندلیبؔ بقیدِ حیات تھے۔ خواجہ صاحب موصوف کی وفات ۱۱۷۲ھ/۱۷۵۹ء میں ہوئی ہے اور میر دردؔ نے "واردات" کا بیشتر حصہ ان کے انتقال سے کچھ دن قبل ہی لکھ لیا تھا۔ جیسا کہ

---

[1] "گلشنِ بے خار"، طبع اوّل ص ۸۶

[2] "محبوب الزمن، تذکرہ شعرائے دکن" حصہ اوّل ص ۳۴۸

[3] دیوان ممنونؔ مخطوطہ مولانا آزاد سینٹرل لائبریری بھوپال۔ ورق ۲۰۴ ب

ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں کہ :

"بیشتر ازیں رسالہ یعنی اکثر وارد در حضور اقدس ..... قبلہ گاہی در سنہ یک ہزار و یک صد و ہفتاد و دو ہجری تحریر یافتہ بود ..... و در ہمیں سال بتاریخ دوم ماہِ مبارک شعبان المعظم روز شنبہ بین العصر والمغرب رحلتِ آں جناب شدہ است[1]"

اس طرح یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ قائم نے خواجہ صاحب کا حال ۱۱۷۲ھ/ ۱۷۵۹ء میں سپردِ قلم کیا ہے۔

(۵) مرزا رفیع سوداؔ کے حالات پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت وہ دہلی میں موجود تھے اور نہایت عزت و وقعت کی زندگی بسر کر رہے تھے لیکن مہربان خاں رندؔ کے ذکر میں ان کی ادب نوازی اور اربابِ کمال کی قدر شناسی کے متعلق درجِ ذیل بیان ایک دوسری ہی کیفیت کی نشان دہی کرتا ہے۔ لکھتے ہیں :

"دریں اثنا ..... حضرتم مرزا محمد رفیع سوداؔ اسلمہ اللہ تعالیٰ برفاقتِ وزیر الممالک نواب غازی الدین خان بہادر در بلدۂ فرخ آباد رسیدند۔ خانِ موصوف (مہربان خاں) از نواب وزیر درخواستہ مرزائے موصوف را برفاقتِ خود گرفت۔" (ص ۵۵)

حسین قلی خاں عاشقیؔ اور خیراتی لعل بے جگرؔ کے بیانات کے مطابق سوداؔ کا ترکِ وطن احمد شاہ ابدالی کی دوسری یورش کے دوران (۲۰ جمادی الثانیہ ۱۱۷۴ھ مطابق ۲۹ جنوری ۱۷۶۱ء سے ۱۴ شعبان ۱۱۷۴ھ مطابق ۲۲ مارچ ۱۷۶۱ء تک) دہلی کی تباہی و بربادی کے بعد کا واقعہ ہے[2]۔ غازی الدین خاں عماد الملک اس سے بہت پہلے ابدالی کے حملے کی اطلاع

---

[1] "علم الکتاب" ص ۹۱ بحوالہ دیباچہ "دستور الفصاحت" ص ۵۴

[2] (الف) "بعدِ تخریب دہلی از آمدنِ مکرر احمد شاہ درانی وطن خود را خیر باد گفتہ بہ تماشا برآمد و در فرخ آباد و لکھنؤ مدتے گذرانید۔" (نشترِ عشق مخطوطہ رضا لائبریری رام پور، ورق ۳۳۲۔ الف)

(ب) "بعدِ تخریب مولدِ خود دہلی از آمدنِ مکرر احمد شاہ درّانی وطن مالوفِ خود را خیر باد گفتہ متوجہ بسیاحتِ بلاد گشت۔" (تذکرۂ بے جگر نسخہ انڈیا آفس لائبریری لندن ورق ۹۳ الف)

پاتے ہی ۸، ۹ ربیع الثانی ۱۱۷۳ھ (مطابق ۲۹، ۳۰ نومبر ۱۷۵۹ء) کو یکے بعد دیگرے عالمگیر ثانی اور اس کے وزیر انتظام الدولہ خان خاناں کو قتل کر کے بھرت پور میں سورج مل جاٹ کے پاس جا چھپے تھے[1]۔ گمانِ غالب یہ ہے کہ سوداؔ نے بھی غریب الوطنی کے دن گزارنے کے لیے انھیں کے دامانِ کرم کے سائے میں پناہ لی ہوگی اور ۱۱۷۶ھ/۱۷۶۳ء میں فرخ آباد پر شجاع الدولہ کی فوج کشی کے وقت جب وہ احمد خاں بنگش کی دعوت پر ان کی مدد کے لیے فرخ آباد پہنچے ہیں[2]، تو یہ بھی ان کے شریک سفر رہے ہوں گے۔ نواب مہربان خان رندؔ کی شادی کے قطعۂ تاریخ سے بھی جس کے آخری مصرعے سے یہی سنہ برآمد ہوتا ہے[3]، ہمارے اس قیاس کی تائید ہوتی ہے۔ بہرحال اس طرح دو باتیں ہمارے سامنے آتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ قائم نے رندؔ کا حال کم از کم ۱۱۷۶ھ کے اواخر یا ۱۱۷۷ھ کی ابتدا (۱۷۶۳ء) میں قلم بند کیا ہے اور دوسرے یہ کہ "مخزنِ نکات" دہلی میں سوداؔ کے "اعزاز و امتیاز" کے دورِ عروج سے فرخ آباد میں ان کے ورود و قیام کے زمانے تک برابر اضافہ و ترمیم کے مراحل سے گزرتا رہا ہے۔

قائمؔ نے مختلف ادوار کی ادبی و لسانی روایتوں کے فرق کو مدنظر رکھتے ہوئے اس تذکرے کو تین طبقات پر تقسیم کیا ہے۔ طبقہ اوّل سعدیؔ، امیر خسروؔ، ولیؔ دکنی، مرزا عبدالقادر بیدلؔ، سراجؔ اورنگ آبادی اور ان کے پیش رو اور ہم عصر ریختہ گویوں سے متعلق ہے۔ ان میں سے ابتدائی دور کے بعض شاعروں کی تخلیقات ان کے نزدیک متاخرین کے قائم کردہ

---

[1] تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو "تاریخ ہندوستان" از مولوی ذکاراللہ جلد نہم صفحات ۲۹۶ تا ۲۹۸ و "میرؔ کی آپ بیتی" (ترجمہ ذکر میرؔ) از نثار احمد فاروقی حاشیہ صفحات ۱۱۹، ۱۲۵ و ۱۲۶

[2] "تاریخ اودھ" از نجم الغنی جلد دوم صفحات ۶۵، ۷۱ و ۷۲۔ فاضل مصنف نے شجاع الدولہ کی فوج کشی کو ۱۱۷۹ھ کا واقعہ قرار دیا ہے لیکن دوسرے واقعات اور سنہ عیسوی (۱۷۶۳ء) سے عدم مطابقت کی بنا پر یہ روایت سہوِ کتابت کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے۔

[3] "کلیات سوداؔ" مطبوعہ نول کشور پریس لکھنؤ (طبع ۱۲۸۹ھ) ص ۳۱۴۔ قطعے کا آخری مصرع یہ ہے، "ہوا ہے وصل ماہ و مشتری کا"۔

معیارِ فصاحت سے ساقط ہیں اور صرف تبرکات کی حیثیت رکھتی ہیں[۱] البتہ عبداللہ قطب شاہ کے عہد (سالِ جلوس ۱۰۳۵ھ مطابق ۱۶۲۵ء) سے بہادر شاہ (متوفی ۱۱۲۳ھ/۱۷۱۱ء) کے زمانے تک جو شاعر گزرے ہیں، انھوں نے بھی اگرچہ دکنی روزمرہ کی تقلید میں بکثرت ایسے الفاظ استعمال کیے ہیں جن سے ہمارے (شمالی ہندوالوں کے) کان مانوس نہیں تاہم ان کا طرزِ کلام نہایت مربوط و معقول ہے[۲]۔

طبقۂ دوئم "سخنورانِ متوسطین" یعنی خان آرزو، شاہ مبارک آبرو، یک رنگ، مضمون، شاہ حاتم اور ان کے معاصرین کے ذکر پر مشتمل ہے۔ اس طبقے کے شعرا کے انداز فکر اور طرزِ کلام پر بالعموم "تلاشِ لفظِ تازہ" اور "ایہام" کی حکمرانی رہی ہے۔ تیسرا اور آخری طبقہ "اشعار و احوالِ سخن طرازانِ متاخرین" کے بیان میں ہے اور اس میں مرزا مظہر، مرزا سودا، خواجہ میر درد، میر تقی میر اور ان کے ہم عصر شعرا شامل ہیں۔ ان شاعروں کی مشترک خصوصیاتِ کلام اور متروکات و مختارات کی تفصیل یہ ہے:

> "طرزِ کلام ایں ہا مانا برویہ شعر فارسی است چنانچہ جمیع صنائعِ شعری کہ قرار دادۂ اسلاف است، بکار می برند و اکثرے از ترکیبات فرس کہ موافقِ محاورۂ اردوے معلّٰی مانوس گوش می یابند، منجملہ جواز الابیان می دانند الا ترجمانِ زبانِ مغل بریختہ کردن مقبوح است، چہ دریں صورت صحتِ زبان یکے از ہر دو نمی ماند و اگر بعضے از اصلاح کہ زبان زدِ مردم فصحاے ایں دیار بود، کردہ آید، چنداں مضائقہ ندارد۔ اما اتباع و تقلیدِ کسانِ طبقۂ اولیٰ کہ یک مصرعِ شاں

---

[۱] "سلیقہ سخن سنجیٔ آں وقت دور از فصاحت ریختہ گویانِ حال است لیکن بپاسِ طبیعتِ مشتاقان ..... دو سہ چار بیت ..... تبرکاً و تیمناً ..... قلمی می گردد۔" (ذکر سعدی و خسرو ص ۲)

[۲] "از عہدِ عبداللہ قطب شاہ گرفتہ تا زمانۂ بہادر شاہ کسانے کہ شعراے ریختہ اند، نسقِ کلام ایں ہا بسیار مربوط و معقول است۔ ہر چند اکثر الفاظِ غیر مانوسِ گوش مامردم مستعملِ ایشان است لیکن چوں موافق زبان دکن است، درست است۔" (ص ۱۳)

ریختہ و دیگرے فارسی است و در بعضے مقام ریختہ و فارسی بالفاظِ غیر مانوس مخلوط ہم ساختہ، مذمومِ محض می انگارند۔" (ص ۳۲)

قائم نے اُردو شاعری کے نشو و نما اور کامیاب ارتقائی سفر میں دکن کے سلاطین و امرا کی سرپرستی اور شعرا کی ادبی خدمات کو کافی اہمیت دی ہے۔ چنانچہ طبقۂ اوّل کے ذیل میں سعدی، خسرو، ملا نوری اور محمد افضل کے بعد لکھتے ہیں:

"باید دانست کہ چوں فنِ ریختہ دراں وقت از محل اعتبار ساقط بود، بناءً علیہ ہیچ کس بر توغلِ آں اقدام نمی نمود و ایں دو سہ چار بیت کذائی کہ بنامِ اساتذۂ معتبر مرقوم است، اغلب کہ منشائے نظمش ہزلے بیش نباشد۔ اما بعد ازیں بہ سمتِ بلادِ دکن در عہدِ عبداللہ قطب شاہ کہ با سخنوران بہ محبت و مواسا پیش می آمد ریختہ گفتن بزبانِ دکنی بسیار رواج گرفت۔" (ص ۳)

مولوی عبدالحق صاحب اس بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"عبداللہ قطب شاہ کے عہد سے (ریختہ کی) ابتدا قرار دینا صحیح نہیں کیونکہ اس سے قبل سلطان قلی قطب شاہ اور محمد قلی قطب شاہ خود بڑے شاعر گزرے ہیں۔" (مقدمہ۔ ص ۷)

لیکن یہ اعتراض درست نہیں کیونکہ قائم کی تحریر سے یہ بات قطعاً ظاہر نہیں ہوتی کہ وہ عبداللہ قطب شاہ (متوفی ۱۰۸۳ھ مطابق ۱۶۷۲ء) کے عہد سے قبل ریختہ کے وجود سے منکر یا نابلد ہیں۔ انھوں نے صرف اس قدر کہا ہے کہ عبداللہ قطب شاہ کے دور میں اس زبان کی شاعری کو کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔ یہ ضرور ہے کہ انھوں نے جن دکنی شعرا کا ذکر کیا ہے وہ سلطانِ مذکور کے عہد اور زمانۂ مابعد ہی سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس سے قبل کے شاعروں کو نظر انداز کر دینے کی اصل وجہ فراہمیٔ کلام کے وسائل اور حصولِ معلومات کے ذرائع کا فقدان ہے، جس کا شکوہ کرتے ہوئے انھوں نے آئندہ سطور میں لکھا ہے کہ:

"اکثر مستعدانِ ایں فن کہ دوراں وقت بودند، مردمِ ایں دیار بر اشعار و احوالِ یکے ازیں با اطلاعے نیافتہ اند مگر معدودے چند کہ در زمانۂ سلطان ابوالحسن

لوائے شہرت برافراختند و پارۂ از ابیاتِ ایں اغرّہ براوراقِ بیاض ہائے سخن سنجانِ ہندوستان قلمی ماند۔ (اصل: قلمی نمودند) بنا بریں یک گونہ از اسم و رسم ایں ہا تعارفے باقیست ۔۔۔۔ واز مرآتِ حوصلۂ فہمِ معنی آگاہانِ پوشیدہ نیست کہ دماغِ بے دماغان بکاوکاد و مشقت بسیار (بر) نمی تابد۔ ہرآنچہ معقول و سہلہ الحصول دید، بقیدِ قلم درکشید و درد سرے کہ مافوقِ طاقتِ خود یافت، در تحقیق و تفحصِ آں نیفتاد و مفت وقتے را کہ بدلش متصور نیست، بہ اندیشۂ طول و طویل برباد نداد۔" (ص ۴)

بفرض محال اگر اس عذر کو ناقابلِ قبول قرار دیتے ہوئے یہ مان لیا جائے کہ قائم نے ابتدائی زمانے کے شعرا کے احوال و اشعار کی تحقیق و تلاش سے دانستہ کنارہ کشی اختیار کی ہے، تب بھی "مخزنِ نکات" کی ادبی و تاریخی حیثیت میں کوئی فرق نہ آئے گا کیونکہ تذکرہ نگاری کے اس ابتدائی دور میں اپنے عہد کے علمی شعور اور تصنیفی روایات کے مطابق اس فن کے تقاضوں کی تکمیل میں انھیں جس حد تک کامیابی حاصل ہوئی ہے وہ اپنی قسم کی واحد مثال ہے۔ بالخصوص شعرا کو ادوار یا طبقات میں تقسیم کر کے انھوں نے تاریخی ترتیب کے التزام کی جو روایت قائم کی ہے، اسے اردو میں ادبی تاریخ نگاری کے اس طویل سلسلے کا سنگِ بنیاد کہنا چاہیے جس کا پہلا کامیاب نمونہ "آبِ حیات" کی صورت میں منظرِ عام پر آیا۔

"مخزنِ نکات" کی دوسری نمایاں اور قابلِ ذکر خصوصیت اختصارِ الفاظ و وسعتِ معانی کا امتزاج اور طرزِ بیان کی متانت اور سادگی ہے۔ مولف نے اساتذہ کے علاوہ اکثر شعرا کے تعارف میں اختصار سے کام لیا ہے لیکن بیشتر مقامات پر مطالب کی جامعیت اس ظاہری نقص کا ازالہ کر دیتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ روش تشبیہات و استعارات سے گراں بار اس طویل مگر لاحاصل عبارت آرائی کے خلاف ردِ عمل کا نتیجہ ہے جسے اس زمانے کے اہلِ قلم اپنا طرہ امتیاز سمجھے ہوئے تھے۔ سطور ذیل میں شعرائے دکن سے متعلق تذکرے کے چند اقتباسات نقل کیے جاتے ہیں جن سے قائم کے طرزِ تعارف نگاری اور اسلوب تحریر دونوں کا اندازہ ہوگا۔

محمد غوث غوثی:" در جمیع علوم و فنون مُشارٌ الیہ بود و ہمیشہ بدرس و تدریس اشتغال داشت۔ گاہ گاہ بمقتضائے موزونیٔ طبیعت دو سہ مصرعِ ریختہ (و) فارسی نیز موزوں می کرد۔ در آخر عمر در طلب دامن گیرِ حالِ او شد۔ از خویش و قوم برآمدہ بزیارتِ حرمینِ شریفین زادہما اللہ تشریفاً مستعد گردید و ہمانجا ودیعت حیات سپرد۔" (ص ۵)

شجاع الدین نوری:" ہرچند از ساداتِ بلدۂ گجرات است امّا تمام عمر بعلاقہ روزگار در حیدرآباد بسر بردہ۔ آخرِ حال بہ عہدۂ تعلیمِ پسر وزیرِ سلطان ابوالحسن پایۂ امتیاز یافت۔ چندے بمنصب معہودہ قیام می نمودہ کہ ناتوان بینانِ روزگار بر سبیلِ حسد بہ عشق وزیرزادہ متہم ساختہ از خدمتِ مامورہ باز داشتند۔ چوں بوقوفِ ایں حال رسید، بیچارہ انفعال کشید۔ بے اطلاع ہمہ کس از حیدرآباد برآمدہ در قصبہ بلنڈہ رختِ اقامت انداخت و بہماں جائگاہ بجوارِ ایزدی پیوست۔" (ص ۶)

شاہ قلی خاں شاہی:" متوطن بھاگ نگر بود۔ بدرستیٔ طبع و رسائیٔ فکر دادِ سخن سرائی می داد۔ مدتے بتوسلِ نوکریٔ بادشاہی در بلدۂ حیدرآباد می گذرانیدہ۔ آخرِ حال بمنصبِ ندیمیٔ تاناشاہ معزز و مباہی گشتہ۔ اکثر حسب الایمائے بادشاہِ مذکور شعرِ مرثیہ نگری کرد۔ چنانچہ سابق بریں پنجاہ سال ابیات مرثیہ اش در بلدۂ ہندوستان دست بدست گردیدہ اند و بالفعل جزو اندراس بگوشۂ خمولِ کاغذ فرسودہ و آخزیدہ سوائے ایں مطلع اشعارِ غزل از وے مسموع نیست۔" (ص ۶)

ولی، دکنی ــــ" شاعریست مشہور۔ مولدش گجرات است۔ گویند کہ بہ نسبتِ فرزندی شاہ وجیہ الدین گجراتی کہ از اولیائے مشاہیر است، افتخارہا داشت۔ در سنِ چل و چہار از جلوسِ عالم گیر بادشاہ ہمراہ میر ابوالمعالی

نام سید پسرے کہ دلش فریفتۂ او بود، بہ جہان آباد آمد۔ گاہ گاہ بزبانِ فارسی دو سہ بیت در وصفِ خط و خالش می گفت۔ چوں در آن جا بسعادتِ ملازمتِ حضرت شاہ (سعد اللہ) گلشن قدس سرہ مستعد دگر دید، بگفتنِ شعر بہ زبانِ ریختہ امر فرمودند و ایں مطلع نغز موزوں کردہ حوالۂ او نمودند:

خوبیٔ اعجاز حسنِ یار اگر انشا کروں
بے تکلف صفحۂ کاغذ ید بیضا کروں

بالجملہ بیمنِ تفوّلِ زبانِ ایشانِ سخنِ ایں بابا چناں حسنِ قبول یافت کہ ہر بیتِ دیوانش روشن تر از مطلعِ آفتاب گردیدہ و ریختہ را قسمے بہ فصاحت و بلاغت می گفت کہ اکثر استادانِ آں وقت از راہِ ہوس شعرِ ریختہ موزوں می نمودند۔" (ص ۱۰)

یہ خاکے اگرچہ مختصر ہیں تاہم ان کی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ میر اور گردیزی نے ان شعرا میں سے صرف ولی کا ذکر کیا ہے لیکن وہ بھی ان کی شخصیت کا کوئی واضح ترمرقع پیش نہیں کر سکے ہیں بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ قائم کی تحریر اپنے ان معاصرین کے بیانات سے زیادہ وقیع ہے۔ قطع نظر اس سے بحیثیت مجموعی دکنی شاعروں کے متعلق جس قدر معلومات "مخزنِ نکات" میں بہم پہنچائی گئی ہیں، "نکات الشعرا" اور تذکرۂ گردیزی ان کی فراہمی سے قاصر ہیں۔

شمالی ہند کے مقتدر اساتذہ کے بارے میں قائم کے اظہارِ خیال کا انداز کسی قدر ارادت مندانہ ہے لیکن یہ عقیدت و ارادت بالعموم اس قسم کے جملوں کے ساتھ آغازِ کلام تک محدود رہی ہے:

میر زا مظہر۔ "مرہم گزارِ سینۂ ریش بمعنی بادشاہ بصورتِ درویش، معنی آگاہ، عارف باللہ میر زا جانِ جاناں مظہر سلمہ اللہ تعالیٰ۔" (ص ۳۴)

میر زا سودا۔ "عندلیب خوش نغمۂ گلشنِ روزگار، گل سرسبد محافل اشعار، یگانۂ

کشورِ افصال، نقاوۂ دودمانِ کمال، انتخابِ نسخۂ صاحب کمالی
حضرت میرزا رفیع سودا مدظلہ العالی ..." (ص ۳۵)

میر تقی میر۔ "شمعِ انجمنِ عشق بازاں، فروغِ محفلِ سخن پردازاں، جامعِ آیاتِ سخن
دانی، مجمعِ کمالاتِ انسانی، معجز طرازِ کرامت تحریر، محمد تقی المتخلص
بہ میر۔" (ص ۴۰)

درجۂ دوئم کے اساتذہ اور عام شعرا کے اخلاق و عادات اور اوصاف و اطوار کے بارے میں اظہارِ خیال کے لیے قائم نے جو انداز اختیار کیا ہے اس کے چند نمونے درج ذیل ہیں:

مہر علی رافت۔ "از غایتِ سبک سری و زیاد گوئی معاصرانِ خود را بطعن و استہزا
می رنجانید و ہیچ کس را در برابرِ خود مقدارے نمی نہاد۔" (ص ۷)

برہان الدین عاصمی۔ "در کمال دانائی و ہشیار خرامی و بذلہ گوئی و نادر کلامی مستثنائے روزگار بود
و در عالم جواہر شناسی بصارتِ تمام داشت۔" (ص ۲۶)

ہدایت اللہ ہدایت۔ "بسیار با استغنا می گذراند و آبرو بر در ہا نمی ریزد بالجملہ مردے از قومِ
افاغنہ بایں جمعیتِ اخلاق و احوال برنخاستہ۔" (ص ۴۵)

محمد یار خاکسار۔ "در حقیقت متمکن و با عتقادِ خود ظریف۔ ہر چند شوخیس (اصل حسن)
با آشنا و غیر آشنا بر سر رشتۂ مزاح می آرد لیکن تمکینش (اصل پیکش)
تابِ شنیدنِ جواب ندارد، بنا بریں از تمام عالم شاکی است۔" (ص ۵۲)

میر ضیا۔ "بشاہد پرستی مشہور است و لیل و نہار با شاہدانِ روزگار محشور۔
ظاہر حالش آراستۂ تمکین و صلاح است ممکن کہ باطنش نیز بخیر و
فلاح باشد۔" (ص ۶۰)

خوشوقت رائے شتاب۔ "ہیولائے استعدادش قبولِ تربیت بہ آسانی (می) کند ..... با اقران و
امثالِ خود بہ اعزاز و امتیاز بسر می برد۔ از آنجا کہ بسیار مودب و
مہذب است، جائے او در خلوت سرا۔ بر دل ہا خالی است۔" (ص ۷۲)

نول رائے وفا۔ "جدتِ ذہن و جودتِ فہم و اصابتِ رائے لطافتِ مزاج بدرجۂ اتم

دارد۔" (ص ۷۲)

میر قمرالدین منت۔ "آثارِ فراست و شواہدِ کیاست از جبینِ نور آگینش ہویدا و استعدادات جمیع مراتبِ کمال از ہیولائے مزاجش پیدا۔" (طبعِ ثانی ص ۱۹۸)

ان مثالوں کو سامنے رکھ کر سیرت نگار کی حیثیت سے قائم کے مرتبے کا تعین زیادہ دشوار نہیں۔ انھوں نے جس خوبی کے ساتھ شعرا کے محاسنِ سیرت اور معائبِ اخلاق کا احاطہ کیا ہے، اس سے ان کی غیر معمولی قوتِ مشاہدہ اور ژرف نگاہی کے پہلو بہ پہلو ان کی فراخ دلی اور صاف گوئی کا بھی پتا چلتا ہے۔ یہی خصوصیت ان کے یہاں فن کے حسن و قبح سے متعلق بحثوں میں بھی کارفرما رہی ہے۔ اگرچہ ابتدا میں ہر طبقے کے شاعروں کی نمایاں خصوصیاتِ کلام پر مجموعی تبصرے کے باعث اس موضوع پر اظہارِ خیال کی نوبت کم ہی آئی ہے تاہم جہاں کہیں کسی شاعر کے کلام کی کسی منفرد خصوصیت یا قابلِ ذکر نقص کا تذکرہ ناگزیر معلوم ہوتا ہے وہ پورے اعتماد اور وثوق کے ساتھ اپنی رائے ظاہر کر دیتے ہیں۔ مثلاً

احسن اللہ۔ "تلاشِ لفظِ تازہ و ایہام می کرد، امّا از غایتِ ہجومِ الفاظ معنیٔ شعرش کمتر بہ نظر می آید۔" (ص ۲۲)

مرزا علی قلی ندیم۔ "اکثر مرثیۂ حضرت ابی عبداللہ الحسین علیہ الصلوٰۃ والسلام بہ قوتِ تام و قدرتِ تمام می گفت و در مشکل ترین ردیف و قوافی طبع آزمائی ہا می کرد۔" (ص ۲۵)

میر سجاد۔ "صنائعِ لفظی را بہ تلاش ہائے معین مقارن معنی نشاندہ و معنی را بہ وساطتِ الفاظ رنگیں بہ اوجِ سربلندی رسانندہ ..... ابیات دیوانش قریبِ ہفصد شعر در نظر در آمدہ۔ شعرِ بے حاصل کمتر بر می آید۔" (ص ۲۸)

کمتر۔ "در عالمِ ہزل گوئی و ہجو پردازی نظیرِ خود نداشت۔" (ص ۳۲)

خواجہ میر درد۔ "ابیات و رباعیات بطور سحابی و خیام بسیار دارد ..... کلامش ... ہمگی لب لباب و تمامی انتخاب است۔" (ص ۳۹)

میر تقی میر۔ "انواعِ شعر را بہ سستگی و رنگی سر انجام (می) دہد۔" (طبع ثانی ص ۱۲۱)

محمد حسین کلیم۔ "چنیں شاعرِ زبردستے است کہ او را پہلوانِ میدانِ سخن می تواں گفت۔ قریب بہ بیست ہزار بیت (بہ) طورِ قصیدہ و غزل بہ وضعِ میرزا بیدل در حیزِ خامۂ دو زبانش ترتیب یافتہ۔" (ص ۴۳ و ۴۴)

بندرابن راقم۔ "غزل را برنگے مخمس (می) کند کہ زیادہ از پنجۂ حنائی گلِ رخاں ناخن بدل (می) زند۔" (ص ۵۶)

بسمل۔ "آہنگِ سخن گوئی دارد۔ امّا از کم بضاعتی در کردِ عاجز بیانی است۔ چیزے کہ در دلِ او بزاید، بر لبِ اظہار نمی تواند آورد۔" (ص ۶۲)

میر ہادی۔ "دیوانش قریبِ ہفصد بیت از نظر گذشتہ۔ بعدِ یک دو ورق شعرِ بامزہ می برآید۔" (ص ۶۴)

مغل بیگ زار۔ "باوجودِ کم بضاعتی و نو مشقی طرزِ کلامش خالی از انداز نیست۔" (ص ۶۷)

"مخزنِ نکات" کے مطالعے سے جہاں ہمیں مختلف شاعروں کے بارے میں بعض اہم اور مفید معلومات حاصل ہوتی ہیں، وہیں شعر و ادب کے متعلق مولّف کے بعض نظریات کا بھی پتا چلتا ہے۔ قائم کا تعلق اردو شاعری کے اس دور سے ہے جب کہ ایہام گوئی اور رعایتِ لفظی کے خلاف ردِّ عمل شروع ہو چکا تھا۔ دوسرے اساتذہ کے شانہ بشانہ وہ خود بھی اس روایت سے انحراف میں پیش پیش تھے۔ تذکرے میں بھی جا بجا اس رجحان کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ چنانچہ شعرائے طبقۂ دوم کے اندازِ شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"شاعران ابتدائی زمانہ محمد شاہ بہ اعتقادِ خود تلاشِ الفاظِ تازہ و ایہام نمودہ شعر را از مرتبۂ بلاغت انداختند تا بمعنی چہ رسد غرض ناگفتہ بہ۔" (ص ۱۴)

شاہ حاتم کے ذکر میں، جنھیں ایہام گوئی سے خاص شغف تھا، رقم طراز ہیں:

"ابیاتِ دیوانش قریب چار ہزار بیت از نظر گذشتہ۔ شعرِ خوب جستہ جستہ می برآید۔" (ص ۲۴)

یہ رائے بھی اسی نظریے کی روشنی میں قائم کی گئی ہے۔

شاہ آبرو کی استادی کے ثبوت میں قائم کی یہ دلیل کہ "شعر ریختہ بہ وضع خود بسیار مربوط می گفت"، اس خیال کی نشان دہی کرتی ہے کہ ان کے نزدیک ایہام گوئی کی صورت میں محاسنِ معنوی کو برقرار رکھنے کے لیے بڑی فن کاری اور سلیقہ مندی کی ضرورت ہوتی ہے۔ ورنہ جیسا کہ احسن اللہ کے کلام پر تبصرے کے دوران واضح کر چکے ہیں، شعر صرف الفاظ کا ایک طلسم بن کر رہ جاتا ہے۔

قائم عاشق مزاجی اور اس کے نتیجے میں شعر گوئی کو مقتضائے شباب تصور کرتے ہیں۔ یہ بات مرزا مظہر کے متعلق ان کے اس بیان سے ظاہر ہوتی ہے کہ:

"در اوائلِ جوانی کہ مقتضائے آن ظاہر است بہ شعر و شاعری مشغول بود۔" (ص ۲۴)

اس کے باوجود ان کی رائے کے مطابق علوم رسمیہ میں دست گاہِ کامل حاصل کیے بغیر قافیہ پیمائی تو کی جا سکتی ہے، شاعری کے مرتبۂ اعلیٰ تک پہنچنا تقریباً ناممکن ہے۔ کرم اللہ خاں درد کے بارے میں ان کا یہ قول اسی طرف اشارہ کرتا ہے کہ

"پارۂ از علومِ رسمیہ اندوختہ بہ قافیہ سنجی مشغول شد۔ ثمرِ استعدادش ہمچناں نارسیدہ بر خاک اوفتاد۔" (ص ۴۵)

اس اشارے کی وضاحت محمد حسین کلیم کے متعلق درج ذیل بیان سے ہوتی ہے کہ:

"مراتبِ دانش کسب کرد و سرمایہ سخن سرائی بدست آوردہ۔" (ص ۴۳)

علی قلی ندیم کے ذکر میں معاصرین کے طرزِ مرثیہ گوئی پر اس طرح تنقید کرتے ہیں:

"بالفعل طورِ گفتن مرثیہ بے ادبانہ دل نشینِ مردم است۔" (ص ۲۵)

اس جملے کی تہ میں یہ نقطۂ نظر کارفرما ہے کہ مرثیے میں حفظِ مراتب کا خیال رکھنا اشد ضروری ہے اور یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ زبان و بیان پر قدرت کاملہ کے بغیر اس صورت کی تکمیل ممکن نہیں۔

"مخزنِ نکات" کی تحریروں میں قائم کی ادبی اور علمی صلاحیتوں کے جن پہلوؤں کی جھلک جا بجا نظر آتی ہے، ان میں سب سے زیادہ نمایاں ان کا مورخانہ شعور ہے جو انھیں

ان کے ہم عصر تذکرہ نگاروں سے ممتاز کرتا ہے۔ اس وصف خاص کا اظہار ان واقعات سے ہوتا ہے جو انھوں نے شعرا کے حالات میں ضمناً نقل کیے ہیں۔ تواریخ وسنین کے حوالے دینا تو اس وقت ضروری سمجھا ہی نہیں جاتا تھا اس لیے یہ کمی ان کے ہاں بھی موجود ہے۔ البتہ بعض جگہ ظہورِ واقعات کی مدت متعین کرکے انھوں نے کسی حد تک اس نقص کی تلافی کر دی ہے جس کی بدولت تھوڑی سی تلاش وجستجو کے بعد بہ آسانی یہ مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ ممکن ہے بیک نظر اس التزام کی اہمیت کا اندازہ نہ ہو لیکن انفرادیت خواہ کتنی ہی کم ارزکیوں نہ ہو، بہرحال انفرادیت ہے اور اس کی قدر وقیمت کا تعین معاصرانہ روایات سے تقابل کے ذریعے ہی کیا جاسکتا ہے۔ اس قبیل کے کچھ نمونے زمانۂ ترتیب کی بحث کے ذیل میں شاہ ولی اللہ اشتیاق، محتشم علی خاں حشمت اور محمد علی حشمت کے حالات سے نقل کیے جا چکے ہیں اور کچھ یہ ہیں:

ولی دکنی ــــ "درسنہ چل وچار از جلوسِ عالم گیر بادشاہ ہمراہِ میر ابوالمعالی ..... بجہان آباد آمد۔" (ص ۱۰)

برہان الدین عاصمی۔ "سابق بریں دو سال از جہان رفت۔" (ص ۲۶)

نادر ــــــ "قبل ازیں دو سال در کوٹلۂ فیروز شاہ کہ (از) قدیم مسکنِ وے بود، ملول شدہ انتقال نمود۔" (ص ۲۸)

اشرف علی خاں فغاں۔ "بعد انقضاے زمان دولتِ (احمد شاہ) بہ رنجشِ وزیر الممالک نواب غازی الدین خاں بہ خواریٔ تمام از شہر برآمدہ خود را بہ عظیم آباد پٹنہ رسانید۔" (طبع ثانی ص ۱۵۹)

رسوا ــــــ "چند ماہ است کہ ..... از جہاں رفت۔" (ص ۶۳)

نجم الدین سلام "ہمراہ لشکرِ نواب صفدر جنگ بہ پورب رفتہ ودیعت حیات سپرد۔" (ص ۶۲)

آخر میں قائم کے بعض ایسے بیانات کا تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے جو غلط فہمی یا حقائق سے بے خبری پر مبنی ہیں اور ہمارے لیے قابلِ قبول نہیں۔ مثلاً سعدی کے ذکر سے طبقۂ اوّل کا آغاز کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اتفاق جمہور بر آنست کہ چوں حضرت شیخ سعدی شیرازی در ہنگام سیاحت بہ طرف گجرات تشریف آوردند، بسببِ مجاورتِ سومنات چناں کہ در نسخۂ بوستاں مذکور است، بہ زبانِ ایں دیار وقوف یافتہ یک دو غزلِ ریختہ ..... مع دیگر ابیات بر سبیل تفنن ارشاد فرمودند[1]" (ص ۳)

اب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ دیارِ ہند کی زبان میں طبع آزمائی کرنے والے سعدی شیخ شیراز سے بالکل مختلف شخصیت ہیں۔ میر اور ان کے متبعین نے انھیں باشندۂ دکن قرار دیا ہے لیکن حافظ محمد علی حیدر کاکوروی کے مطابق وہ لکھنؤ کے قصبہ کاکوری کے رہنے والے تھے۔ حافظ صاحب موصوف نے ان کی تاریخ وفات ۳ ذی الحجہ ۱۰۰۳ھ (۱۰ اگست ۱۵۹۴ء) بتائی ہے[2]۔ وطن کے بارے میں متذکرہ اختلاف سے قطع نظر میر صاحب نے یہ حقیقت پوری طرح واضح کر دی ہے کہ

"آنچہ بعض ایں را شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ گمان بردہ اند، خطاست[3]"

ولی دکنی کا نام میر ابو المعالی کے بیٹے سید محمد تقی کی تحریر کے مطابق "ولی محمد" ہے[4] لیکن

---

[1] انڈیا آفس لائبریری کے نسخے میں زیر بحث اقتباس کے دوسرے لفظ "جمہور" کو "بعضے از مورخین" سے بدل دیا گیا ہے۔ (طبع ثانی ص ۵) جس سے مولف کے بیان میں کسی قدر احتیاط کا عنصر شامل ہو گیا ہے۔

[2] تفصیل کے لیے دیکھیے: تذکرۂ مشاہیر کاکوری ص ۱۸۷ تا ص ۱۸۹

[3] نکات الشعرا مرتبہ مولوی عبدالحق ص ۱۰۳

[4] ترقیمۂ دیوانِ ولی مخزونہ انڈیا آفس لائبریری لندن مکتوبہ "دویم شہر ذی قعدہ ۱۱۵۶ھ بروز پنجشنبہ" (۸ دسمبر ۱۷۴۳ء) بحوالہ سہ ماہی "اردو" کراچی، شمارہ جولائی ۱۹۶۶ء ص ۱۰۲۔ پنجاب یونیورسٹی لاہور کے ذخیرۂ شیرانی کے ایک قلمی نسخے کے ترقیمے سے بھی اس اندراج کی تائید ہوتی ہے۔ یہ نسخہ ولی کے ایک شاگرد ثناء اللہ نے چہار شنبہ ۱۴ محرم ۱۱۳۹ھ (۳۱ اگست ۱۷۲۶ء) کو احمد آباد میں لکھ کر مکمل کیا ہے۔ ثناء اللہ نے ولی کا پورا نام سید ولی محمد لکھا ہے۔ (ایضاً بحوالہ سہ ماہی "اردو" شمارہ مذکور الصدر ص ۸۷)

قائم انھیں "شاہ ولی اللہ" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ولی اور ابو المعالی کے قریبی تعلقات کے پیش نظر ہمیں پہلی روایت زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔

"مخزنِ نکات" کی ایک اور خامی جو عمومیت کے ساتھ تقریباً تمام ہی تذکروں میں پائی جاتی ہے، یہ ہے کہ مولف نے بعض شاعروں کے ذکر میں حد سے زیادہ اختصار سے کام لیا ہے اور کہیں کہیں ابتدائی تفصیلات بھی یکسر نظر انداز کر دی ہیں، مثلاً بے نوا (ص ۲۳)، نادر (ص ۲۸)، کمترین (ص ۳۲)، بسمل (ص ۶۲)، شاغل (ص ۶۲) اور آشنا (ص ۷۰) کے تراجم میں ان کے نام درج نہیں، مہربان خاں (رند) کا ذکر خلاف معمول کافی تفصیل کے ساتھ کیا ہے اس کے باوجود یہ نہیں بتایا کہ ان کا تخلص مہربان یا رند تھا۔ اس قسم کی کوتاہیاں تحقیق و تنقید کے موجودہ معیار کے لحاظ سے کافی اہم ہیں لیکن اس زمانے کی روایات اور معلومات کے محدود ذرائع و وسائل کے پیش نظر ان پر زیادہ زور دینا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ بحیثیت مجموعی "مخزنِ نکات" ایک گراں مایہ اور قابلِ قدر ادبی دستاویز ہے جس کا مطالعہ اردو شاعری کے ارتقائی مدارج کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے صرف سود مند ہی نہیں ناگزیر بھی ہے۔

چمنستان شعرا سے گلشن سخن تک

یہ باب ابتدائی تذکروں کے بعد اور تیرھویں صدی ہجری کے اختتام سے قبل ترتیب پائے ہوئے مندرجہ ذیل آٹھ تذکروں کے جائزے پر مشتمل ہے:

۱۔ چمنستانِ شعرا مولفہ لالہ لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی۔
۲۔ طبقات الشعرا مولفہ مولوی قدرت اللہ شوق۔
۳۔ تذکرۂ شعرائے اردو مولفہ میر حسن دہلوی۔
۴۔ تذکرۂ شورش (رموز الشعرا) مولفہ میر غلام حسین شورش عظیم آبادی۔
۵۔ مسرت افزا مولفہ ابوالحسن امیر الدین احمد عرف امراللہ الہ آبادی۔
۶۔ گل عجائب مولفہ اسد علی خاں تمنا اورنگ آبادی۔
۷۔ گلزارِ ابراہیم مولفہ علی ابراہیم خاں خلیل عظیم آبادی۔
۸۔ گلشنِ سخن مولفہ میرزا کاظم مخاطب بہ مردان علی خاں مبتلا لکھنوی۔

"چمنستان شعرا" کا سالِ ترتیب ۱۱۷۵ھ/ ۶۲-۱۷۶۱ء ہے، اس لیے اسے ان تذکروں میں سرفہرست رکھا گیا ہے۔ "طبقات الشعرا" نے اگرچہ موجودہ صورت ۱۲۰۹ھ/ ۹۵-۱۷۹۴ء میں نظرِ ثانی کے بعد اختیار کی ہے لیکن اس کا نقشِ اوّل ۱۱۸۸ھ/ ۱۷۷۴ء میں تیار ہو چکا تھا۔ اس لحاظ سے اسے بہ اعتبارِ زمانہ اس سنہ (۱۱۸۸ھ) کے بعد مرتب ہونے والے تذکروں پر فوقیت حاصل ہے۔ ہم نے یہاں اس تقدم کو برقرار رکھتے ہوئے "چمنستانِ شعرا" کے فوراً بعد اس کا ذکر کیا ہے۔ میر حسن کے تذکرۂ شعرائے اردو کا سالِ تکمیل عام طور پر ۱۱۹۲ھ/ ۱۷۷۸ء خیال کیا جاتا ہے مگر قاضی عبدالودود کے کتب خانے کے قلمی نسخے سے پتا چلتا ہے کہ

یہ ۱۱۸۹ھ/۱۷۷۵ء میں مکمل ہو چکا تھا اور اس کے بعد صرف چند اضافے ہوئے ہیں۔ اس لیے اسے ۱۱۸۹ھ/۱۷۷۵ء کے بعد ترتیب پانے والے تذکروں سے پہلے جگہ دی گئی ہے۔ شورش عظیم آبادی اور امراللہ الہ آبادی کے تذکرے علی الترتیب ۱۱۹۱ھ/۱۷۷۷ء اور ۱۱۹۳ھ/ ۱۷۷۹ء میں مرتب ہوئے ہیں۔ "گل عجائب" کا زمانۂ ترتیب واضح نہیں۔ اندازہ یہ ہے کہ یہ ۱۱۹۶ھ/۱۷۸۲ء کے قریب پایۂ تکمیل کو پہنچا ہے۔ لہٰذا اس کا ذکر "مسرت افزا" کے بعد کیا گیا ہے۔ "گلزارِ ابراہیم" کا سالِ تکمیل اس کے مولف کے بیان کے مطابق ۱۱۹۸ھ مطابق ۱۷۸۴ء ہے۔ "گلشن سخن" میں اگرچہ بار بار ۱۱۹۴ھ (۱۷۸۰ء) کے حوالے سالِ رواں کے طور پر دیے گئے ہیں اور مولف کے طبع زاد قطعۂ تاریخ کے آخری مصرعے سے بھی یہی سنہ برآمد ہوتا ہے لیکن یہ تذکرہ اصلاً "گلزارِ ابراہیم" کا چربہ ہے اس لیے ۱۱۹۸ھ/۱۷۸۴ء سے قبل اس کی تکمیل خارج از امکان ہے۔ اسی بنا پر اسے "گلزار ابراہیم" کے بعد جگہ دی گئی ہے۔

چمنستانِ شعرا

دکنی تذکروں میں حسنِ ترتیب، جامعیت اور ادبی معیار کے لحاظ سے "چمنستانِ شعرا" کا نام سرِفہرست ہے۔ اس کے مولف لچھمی نرائن شفیق بڑے باصلاحیت اور ذی علم انسان تھے۔ اورنگ آباد جیسے گہوارۂ علم وادب سے وطنی وابستگی اور علامہ آزاد بلگرامی کے فیضانِ تربیت کی بدولت ان کی شخصیت کے جوہر نکھرے اور کم عمری ہی میں شعروادب نیز تصنیف و تالیف سے ان کی طبعی دل چسپیاں بامِ عروج تک پہنچ گئیں۔ یہ تذکرہ جو انھوں نے صرف سترہ (۱۷) سال کی عمر میں ترتیب دیا تھا اور جسے بابائے اردو مولوی عبدالحق ۱۹۲۸ء میں انجمن ترقیِ اردو (ہند) کی جانب سے شائع کر چکے ہیں، ان کے غیر معمولی علمی شغف اور شائستہ ادبی ذوق کا ایک بیّن ثبوت ہے۔ اگرچہ بقول شفیق ان سے پہلے دکن کے کئی اہلِ قلم اس میدان میں اپنے علم وبصیرت کی داد دے چکے تھے لیکن ان کا دائرۂ کار بیشتر دکنی شاعروں کے تعارف تک محدود تھا۔ یہ ایک بہت بڑی کمی تھی جسے انھوں نے محسوس کیا اور جب میر اور گردیزی کے تذکروں کی وساطت سے شمالی ہند کے ریختہ گویوں کے حالات اور کلام تک ان کی رسائی ہوئی تو وہ اس کے ازالے کی غرض سے "چمنستانِ شعرا" کی تسوید و ترتیب کی طرف راغب ہوئے اور تھوڑے ہی عرصے میں ان کی یہ گراں مایہ تالیف تکمیل کے مراحل طے کر کے منظرِ عام پر آگئی۔ دیباچے کے ذیل میں ان حالات و محرکات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"دریں اثنا تذکرۂ "نکات الشعرا" من تصنیفِ میر محمد تقی میر و تذکرہ فتح علی خاں تازہ از ہندوستان نزول نمودہ شورے در عالم انداخت و جہانے را در اشتیاقِ

اشعارِ ہند کہ بہم رسیدنِ آں اہل دکن را خیلے دشوار است، تہ و بالا ساخت۔ لہٰذا بخاطرِ فاتر و فکرِ ناقص گذشت کہ خود ہم ایں ہمہ اشعارِ ہر دو تذکرہ گرفتہ و دیگر لآلی را یک جا جمع ساختہ بطورِ سفینہ کہ انیسِ یکتائی و ہمدمِ تنہائی شود، نقش باید بست زیرا کہ بدینِ تقریبِ غریب و تمہیدِ عجیب شاید احوالِ بعضے محبانِ سخن داں برگزیدۂ تبیین می تواند نشست ..... (پس) کمر را چست بستم و سمندِ صبا تگِ قلم بسرعتِ سریعہ در میدانِ تحریر ایں نسخہ بر انگیختم۔" (ص ۲ و ۳)

تذکرے کا سالِ ترتیب ۱۱۷۵ھ/۶۲-۱۷۶۱ء ہے، اسی لیے اس کا نام بقیدِ تاریخ "چمنستانِ شعرا" رکھا گیا ہے۔ اس کے اگلے سال یعنی ۱۱۷۶ھ/۶۳-۱۷۶۲ء میں اگرچہ بعض مقامات پر کچھ ترمیمیں اور اضافے کیے گئے ہیں لیکن وہ کیفیت اور کمیت دونوں ہی کے اعتبار سے چنداں اہم نہیں۔

زمانۂ آغاز کے بارے میں عام تذکرہ نگاروں کی طرح شفیق نے بھی کوئی وضاحت نہیں کی ہے تاہم میر مرتضیٰ مہدی کے متعلق ان کے اس بیان سے کہ "در سنِ اربع و سبعین و مایۃ والف در جنگِ مرہٹہ شربتِ شہادت چشید" (ص ۲۹۲) یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس تذکرے کی ترتیب ۱۱۷۴ھ/۶۱-۱۷۶۰ء کے بعد شروع ہوئی ہے اور شفیق نے یہ کام صرف سال ڈیڑھ سال کی مختصر مدت ہی میں پایۂ تکمیل کو پہنچایا ہے۔ دیباچے کے منقولۂ بالا اقتباس میں "سرعتِ سریعہ" کی جانب اشارے کے علاوہ مندرجہ ذیل بیانات سے بھی اس قیاس کی تائید ہوتی ہے:

(الف) شاہ حاتم۔ "بوقتِ تحریر ایں چند ابیات دیوانے ضخیم از و بدست آمد، اما فرصتِ انتخابش نہ شد۔ لاچار ایں چند گلہائے تازہ بنا بر جلدی از گلستانش چیدہ حوالۂ قلم می شود۔" (ص ۱۳۵)

(ب) کمال۔ "دیوانِ اشعارش بمطالعہ در آمد لیکن فرصت انتخاب دست نداد۔" (ص ۲۳۹)

دواوین کی دستیابی کے باوجود انتخابِ کلام کی مہلت نہ ملنا اس بات کی کھلی ہوئی

علامت ہے کہ مولف نے حد درجہ عجلت سے کام لیا ہے۔ اس سلسلے میں اختتامیہ عبارت کا درجِ ذیل اقتباس بھی قابلِ غور ہے۔ تشبیہات و استعارات کے پیرائے میں موضوعِ زیرِ بحث پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"ایں چمنستانِ شعرا و ایں گلستانِ فصحا محض بہ افضالِ الٰہی بے امداد غیرے و بے معاونتِ یارے در عرصۂ قلیلے کہ حنا قیام بدست دارد یا بہار کہ تشریف بہ بوستاں آرد، رونقِ تازہ و رنگے از سر گرفت۔" (ص ۵۵۸)

شفیق کے اس اعتراف کے بعد ہمارے اس قیاس میں کہ "چمنستانِ شعرا" ۱۱۷۴ھ/ ۶۱-۱۷۶۰ء اور ۱۱۷۶ھ/۶۳-۱۷۶۲ء کے درمیانی عرصے کی تالیف ہے، کسی شک اور شبہے کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ تذکرہ نگاری کی تاریخ میں اتنے کم وقت کے اندر اتمامِ کار کی مثالیں نادر و نایاب تو نہیں لیکن کم یاب ضرور ہیں۔

اس تذکرے کی فہرست میں جسے شفیق نے غالباً تاریخ گوئی سے شغفِ خاص کی بنا پر قاعدۂ جمل کے بموجب حروف ابجد کے اعتبار سے ترتیب دیا ہے، دو سو تیرہ (۲۱۳) شاعروں کے نام شامل ہیں۔ ضروری مواد کی فراہمی میں میر اور گردیزی کے تذکروں کے علاوہ شاہ عبدالحکیم لاہوری کے تذکرے "مردم دیدہ" خان آرزو کے "مجمع النفائس" اور علامہ غلام علی آزاد بلگرامی کے "سروِ آزاد" سے بھی حسبِ ضرورت استفادہ کیا گیا ہے۔ چنانچہ خواجہ میر درد، محمد فقیہ دردمند، نورالعین واقف پٹالوی، میرزا مظہر، میرزا معزالدین معز، محمد عارف عارف اور نظام الدین احمد صانع بلگرامی کے حالات میں ان تذکروں کے حوالے موجود ہیں۔ عبدالہادی ہادی، محمد ماہ محرم اور صابر لاہوری کے حالات و اشعار ایک دوست حاجی میر اکبر علی اکبر کے حسبِ خواہش ان کی فراہم کردہ معلومات کی بنیاد پر داخلِ تذکرہ کیے گئے ہیں جب کہ سراج اورنگ آبادی کے متعلق بہت سی باتیں ان کے دیباچہ منتخب دواوینِ فارسی (منتخبِ دیوان ہا) سے معلوم ہوئی ہیں۔

حالاتِ زندگی کے ضمن میں شفیق نے بالعموم انھیں باتوں کا اعادہ کیا ہے جو ان سے قبل دوسرے تذکرہ نگار لکھتے آئے ہیں، حتیٰ کہ بعض جگہ انھوں نے حاکم لاہوری، خان آرزو

اور علامہ آزاد کے بیانات لفظ بہ لفظ نقل کر دیے ہیں۔ اس لیے تذکرے کا یہ پہلو بہ حیثیتِ مجموعی کسی خاص امتیاز اور انفرادیت کا حامل نہیں۔ البتہ دکن کے بعض شاعروں اور اپنے چند دوستوں کے ذکر میں انھوں نے متذکرۂ بالا ماخذ سے حاصل شدہ معلومات پر اکتفا نہ کرتے ہوئے ذاتی علم و آگاہی اور تحقیق و تلاش سے بھی کام لیا ہے۔ دراصل یہی وہ مقامات ہیں جہاں وہ ایک قابلِ لحاظ تعارف نگار کی حیثیت سے ہمارے سامنے آئے ہیں اور ان کے قلم کی پرکاری کے جوہر کھلے ہیں۔ اس قسم کی مثالیں تعداد کے اعتبار سے کم سہی لیکن قدر و قیمت کے لحاظ سے کسی طرح نظر انداز نہیں کی جا سکتیں۔ اہم واقعاتِ زندگی کے انضباط اور سیرت و شخصیت کے عناصرِ ترکیبی کے تجزیے کا یہ خصوصی انداز میر اکبر علی رسا کے ذکر میں جو تقریباً تین صفحات کو محیط ہے، پوری آب و تاب کے ساتھ بروے کار آیا ہے۔ اس طویل ترجمہ احوال کے چند منتشر مگر داخلی طور پر مسلسل و مربوط اجزا جنھیں شاعرِ موصوف کی سرگذشتِ حیات کا خلاصہ کہا جا سکتا ہے، سطورِ ذیل میں بطور نمونہ پیش کیے جاتے ہیں:

"ازلاہور کہ مولدِ اوست، در عمرِ بست و یک سالگی محملِ سفر بسمتِ بیت اللہ بربست و در شاہجہان آباد سہ ماہ بمقتضائے قضا و قدر بہ اکابرانِ آنجا مثلِ مظہرِ جانِ جاناں و عبدالحئی تاباں و مرزا رفیع سودا درخوردہ۔ بعدہٗ از اکبر آباد بہ گوالیر برآمدہ بہ سرونج رسیدہ و ہشت ماہ در آنجا تمکن گزیدہ بدارالسرور (برہان پور) چندے محل انداخت۔ ازانجا عزم بیت اللہ برخود مصمم کردہ بہ سورت وارد۔ گشت و چہار ماہ در آن گل زمین بسر بردہ آخر بجہاز سوار شدہ در سہ ماہ بجدہ احرام بیت اللہ بربست و دو نیم سال در مکہ معظمہ و شش ماہ در مدینہ منورہ سعادت حاصل کردہ عازمِ ایں طرف گردیدہ دستِ بیعت بدامنِ خلاصۂ اولیاے دکن حضرت شاہ یٰسین نذر یاری نوراللہ مرقدہٗ آویخت ..... بعدہ در خجستہ بنیاد (اورنگ آباد) رسیدہ بہ کمالِ کامل بماند واز شاہ سامی ملاقات کردہ شوقِ ریختہ گوئی پیدا کرد ..... پس ازان در برہان پور بہ سید معزالدین خاں شحنۂ آنجا..... درخورد و دو سال در آنجا بگذرانید ..... ازانجا مراجعت بہ طرف خجستہ بنیاد نمود۔

چندے اقامت کردہ متوجہ حیدرآباد گشت۔" (ص ۱۴۸ تا ۱۵۰)

دکن کے جن شاعروں کے حالات و اشعار اس تذکرے میں شامل ہیں، ان میں تاریخی اہمیت اور شہرت و مقبولیت کے نقطۂ نظر سے ولی کا نام سرِفہرست ہے۔ ان کے وطن کا مسئلہ آج تک ان کے سوانح نگاروں کے درمیان مابہ النزاع ہے۔ بعض حضرات کو اس پر اصرار ہے کہ وہ احمد آباد (گجرات) کے رہنے والے تھے جب کہ بعض لوگ اورنگ آباد کو ان کا مولد و منشا قرار دیتے ہیں۔ شفیق دوسرے گروہ کے ہم نوا ہیں، چنانچہ اپنے مخالفین کی غلط فہمیوں کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مولد او خاکِ پاکِ اورنگ آباد است۔ چوں اکثر بہ گجرات در درگاہ حضرت شاہ وجیہ الدین قدس سرہ کسبِ علم کردہ و در نیلی گنبد متصل گڈ مدفون گشتہ، مردمان نسبت او بہ گجرات کردہ غلط محض۔" (ص ۱۰۴)

واقعاتِ زندگی کے بیان میں سنین کی نشان دہی ایک بنیادی ضرورت کی حیثیت رکھتی ہے لیکن شعرائے اردو کے ابتدائی تذکروں کی ایک بڑی خامی ہے کہ ان کے مولفین اس ضرورت کے احساس سے یکسر ناآشنا رہے ہیں۔ شفیق پہلے شخص ہیں جنھوں نے اس روشِ عام کے برخلاف واضح الفاظ میں بعض شاعروں کے زمانہ ہائے وفات کا تعین کیا ہے۔ اس معاملے میں فنِ تاریخ گوئی سے ان کی دل چسپی ایک اہم محرک کی حیثیت سے کارفرما رہی ہے۔ چنانچہ انھوں نے کہیں کہیں مفرد تاریخی مصرعے اور کہیں مکمل قطعات بھی بطورِ سند پیش کیے ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

۱۔ خان آرزو۔ "در ماہ جمادی الثانیہ سنہ تسع وستین و مائۃ والف (۱۱۶۹ھ) بہ بلدۂ لکھنؤ ایں جہان فانی را وداع نمودہ جا در عالم باقی گزید۔" (ص ۶)

۲۔ امیر خاں انجام۔ "در سنہ تسعہ و خمسین و مائۃ والف (۱۱۵۹ھ) تاریخ وفاتش نوشتہ اند۔ کاتبِ حروف تاریخ وفات چنیں یافتہ و یک عدد زاید را بایں حسنِ تعمیہ ساقط ساختہ۔

آں عمدۂ معنی آفریناں　　در خلدِ بریں نمود آرام
رفت آں یکتا و گشت تاریخ　　جان داد امیر خانِ انجام" (ص ۳)

۳۔ انعام اللہ خاں یقینؔ۔ "قطعۂ تاریخِ وفات از مولفِ تذکرہ:

شاعرِ نازک سخن خوش خیال　　کرد سفر جانبِ ملکِ عدم
سالِ وصالش خرد نکتہ سنج　　گفت: "یقینؔ رفت بسوئے ارم" (ص ۱۶۱)

۴۔ مرزا گرامی۔ "در سنہ ست و خمسین و مائۃ والف (۱۱۵۶ھ) خرقۂ ہستی بگذاشت۔
مورخے تاریخِ رحلتش ایں مصراع یافت ؎

"رندے عجب از یں جہاں رفت" (ص ۲۳۶)

۵۔ نورالدین حسین خاں رنگینؔ۔ "بتاریخ بست و چہارم جمادی الثانیہ سنہ سبعین و مائۃ والف (۱۱۷۰ھ) روز جمعہ یک پاس روز بر آمد، در بلدۂ ایلچپور....
بمرگِ مفاجات جان بحقِ تسلیم نمود۔" (ص ۵۱۹)

اپنے حالات میں شفیقؔ نے جہاں اور بہت سی باتیں لکھی ہیں، وہیں تخلص کی تبدیلی کا واقعہ بھی التزامِ تاریخ کے ساتھ نقل کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"الحال کہ سالِ ہژدہ از عمر گذشتہ باشد، چوں مطلع شد کہ میر محمد مسیح صاحب تخلص در فارسی گذشتہ است، بجنابِ فیض مآب حضرت میر صاحب و قبلہ (آزاد بلگرامی) التماسِ تخلص نمود، آنجناب از راہِ شفقت تخلصِ شفیقؔ عنایت فرمودند..... تاریخ مرحمتِ تخلص "تخلص نو" (۱۱۷۶ھ) یافتم و مصرعے دیگر کہ از و ہم اعدادِ سنہ حال مستخرج می شوند، قطعہ نمودم:

از حضرت فیض بخش آزاد　　گردید مرا تخلص انعام
تاریخ بہ اہلِ بزم گفتم　　امداد شفیقؔ شد مرا نام

۱۱۷۶ھ　　(ص ۴۹۴ و ۴۹۵)

سیرت و شخصیت کے متعلق اظہارِ خیال کے معاملے میں بھی شفیقؔ کی کوششیں قابلِ قدر ہیں۔ اگرچہ کہیں کہیں میرؔ کی طرح انھوں نے بھی تشبیہات و استعارات کا پیرایہ

اختیار کر کے سادگی اور واقعیت کو تکلفات کی نذر کر دیا ہے تاہم ان کے یہاں ایسے مرقعے بھی خاصی تعداد میں موجود ہیں جن کا آب و رنگ تصنع کی آلودگی سے پاک ہے۔ ان تحریروں کے ذریعے شخصیت کے جن پہلوؤں کو نمایاں کرنا مقصود ہے، یہ ان کی صورت گری میں بڑی حد تک کامیاب ہیں۔ بیانات کے اس سلسلے میں سب سے پہلے خان آرزو کے حالات سے ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے جس کا اسلوب واضح طور پر "نکات الشعرا" کے اثرات کی نشان دہی کرتا ہے۔ فرماتے ہیں:

"گلدستہ بندِ گل ہائے خیالاتِ رنگیں و نو بادہ نشانِ سخن ہائے دل نشیں است۔ در گلشنِ ہند مثلِ او عندلیبِ ہزار داستان کم تر می توان پنداشت و در مجلس دکن ہم چو آں پروانۂ چراغِ سخن عدیم باید انگاشت۔ غزالانِ معنی را بحدّے مسخر کردہ کہ می باید وسیہ، جردگان الفاظِ پاکیزہ را نوعے حلقہ در گوش ساختہ کہ می شاید۔ در غزل گفتن کوہ جاں می کشد و دیوان خانۂ ریختہ ہم بنہایت پرکاری طاق می بندد۔ خضر طبعش چشمہ چشمہ متعطش اجسام کتب را آبِ زندگی بخشندہ و آفتابِ کلکش جہاں جہاں ظلماتِ نقصِ سخنِ غیر را موکشان کشندہ۔"

(ص ۶)

اس طرزِ بیان کی خرابی یہ ہے کہ یہ قاری کو متاثر تو کرتا ہے اس کے دائرۂ علم کو وسیع نہیں کرتا۔ چنانچہ مندرجۂ بالا عبارت خان آرزو کی علمیت، ہمہ دانی اور قادر الکلامی کے متعلق ایک پرشکوہ تاثر قائم کرنے میں کامیاب ہے مگر اس کی روشنی میں یہ اندازہ کرنا دشوار ہے کہ ان اوصاف کی واقعی نوعیت و کیفیت کیا تھی اور ان کا اظہار کن صورتوں میں ہوا۔ صرف یہ کہہ دینا کہ ان کے خضرِ طبیعت نے اجسامِ کتب کو آبِ حیات عطا کر کے زندۂ جاوید کر دیا ہے، ایک متجسس ذہن کے لیے قطعاً کافی نہیں۔ اس کے برخلاف سید عبدالولی عزلت سورتی کے بارے میں مولف کا درج ذیل بیان ان کی شخصیت کے خط و خال اور اس کے تابناک پہلوؤں کو نسبتاً زیادہ مناسب اور قطعی انداز میں نمایاں کرتا ہے۔ ملاحظہ ہو:

"نکاتِ رنگیں بہ یمنِ انفاسِ مسیحایش زندہ و خیالاتِ شیریں بر طبعِ چالاکش نازندہ۔ در مصوری قدرتے دارد کہ مانی و بہزاد پیش او مانند پیکرِ تصویر در بندِ حیرت می ماندند و در موسیقی و سنگیت دستے دارد کہ صاحب کمالان ایں فن بنامش دست بہ گوش می گذارند۔ در علم دوہرہ و کبتِ دریائیست مواج و بحریست متلاطم۔ شعر خوانیِ گلوسوزش جانے از سامعاں می برد و سخن گوئی دل فروزش روحے تازہ عطا می کند۔" (ص ۴۴۶)

انعام اللہ خاں یقینؔ نے بہت کم عمر پائی لیکن مرزا مظہرؔ جانِ جاناں کے فیضِ تربیت نے انھیں فکرِ سخن کے ابتدائی دور ہی میں شہرت و مقبولیت کی اس معراج تک پہنچا دیا تھا جو عام طور پر بڑی ریاضت اور پختگیٔ مشق کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ تخلیقی صلاحیتوں کے اس غیر معمولی نشو و نما کی بنا پر ان کی شخصیت معاصرین کے لیے رشک و حسد کا سبب بن گئی تھی۔ چنانچہ بعض لوگ ان کی موزوں طبعی پر شک کرتے ہوئے ان کے کلام کو مرزا صاحب کی نوازش اور توجہ کے نتائج سے تعبیر کرنے لگے تھے۔ شفیقؔ نے اپنے تذکرے میں ان بدگمانیوں کے خلاف بڑے اعتماد کے ساتھ آواز اٹھائی ہے اور اس مقصد کے لیے کئی صفحات وقف کر کے ان ناانصافیوں کا ازالہ کرنے کی کوشش کی ہے جو محض معاصرانہ چشمک کی بنا پر ایک قادرالکلام اور خوش گو شاعر کی شہرت کو داغ لگانے کی خاطر روا رکھی گئی تھیں۔ اگرچہ اس ضمن میں کہیں کہیں ان کی گفتگو باطل پرستی کے حدود میں داخل ہو گئی ہے، پھر بھی ان کے بیانات ہمیں غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں جس سے ذاتی مطالعے اور تحقیق و تلاش کی روشنی میں اصل حقیقت تک پہنچنے اور شاعر کا مقام متعین کرنے کی تحریک ملتی ہے۔ یہی شفیقؔ کا منتہائے مقصود بھی ہے۔ تعارف کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

"شہنشاہِ قلمروِ سخن دانی، یوسفِ کنعانِ معانی است۔ طوطیِ شکر مقال از گلستان ہند برخواستہ کہ بآں عندلیب ہزار داستاں سخن بہ تشابہ گراید و شہسوارے چابک خرام از رائضانِ دکن پیدا نشدہ کہ قصب السبق ازاں فارسِ

میدانِ خوش تلاشی بر باید۔ بسیارے از شکرِ مقالانِ متین، خیال پرّہ ہم صفیریِ او برداشتند، آخر پشتِ دست بزمینِ نارسائی بگذاشتند واکثر از نازک خیالانِ شیریں مقال بہ مقابلۂ او برخاستند، آخر از قصور بہ گوش مالیٔ خود پرداختند۔

ازوست :

یقیں تائیدِ حق سنیں شعر کے میداں کا رستم ہے
مقابل آج اس کے کون آسکتا ہے کیا قدرت

آرے عندلیب کلکش دم از ہمدمیٔ عیسیٰ می زند و مزاجِ عالیش معانیٔ نازک می گزیند۔ ہر قطرہ کہ از سحابِ خامہ اش بچکید، لعلے گراں بہا شد و ہر سطرے کہ از (قلمش) سر زد، فرحت عطا کنِ جان ہا شد۔ معنی آفرینانِ ایں زماں از نامِ تضمین کلامش گرم بازاری می دارند و خوش تلاشانِ ایں عصر از اصغائے نامِ نامیش دست بہ گوش می گذارند ۔۔۔۔۔" (ص ۱۶۱)

اس کے بعد شفیق اپنے مشاہدات و تاثرات ان الفاظ میں قلم بند کرتے ہیں :

"الحاصل یقیں یکتائے عصر و یگانۂ زمانہ است۔ چشم روزگار چنیں معنی آفرینے نکتہ رس ندیدہ و گوشِ سپہرِ دوّار مثلِ ایں والا منشے آتش دم نشنیدہ۔ سخن سرایانِ والاگوہر و آتش نفسانِ گرامی قدر مصرعِ طبع زادش را چوں خیالِ مصرعِ قامتِ خوباں بدل جامی دہند و بیت نقش بستۂ کلکش را چوں دیتِ ابرو بر چشم می نہند۔ فی الواقع اگر آن سحر پرداز دعویٔ اعجاز می کرد، سخن سازاں را بجز ایماں آوردن چارہ نبود و ایں آیۂ گراں مایہ "وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ" زنگِ شبہ از آئینۂ دل می زدود۔" (ص ۱۶۲ و ۱۶۳)

گذشتہ سطور میں پیش کردہ اقتباسات میں مولف نے اخلاق و عادات اور سیرت و کردار کے بارے میں اظہارِ خیال سے صرفِ نظر کرتے ہوئے صرف ادبی و فنی اکتسابات کی تحسین و توصیف سے سروکار رکھا ہے۔ یہ محدود اندازِ نظر ان شاعروں سے ان کی براہ راست واقفیت کے فقدان پر مبنی معلوم ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف اُن شاعروں کے ذکر میں

جواُن سے قریب تر رہے ہیں، انھوں نے شخصیت کے ان پہلوؤں پر بھی بقدرِ ضرورت توجہ صرف کی ہے۔ اس ضمن میں تذکرے کے درج ذیل بیانات توجہ طلب ہیں۔

۱۔ میر ایوب ایوبؔ: "ستونِ اخلاق را از قوتِ بازوے حسنِ خلقِ خود باوجود صغرِ سن بلند می سازد و سمندِ شعر فہمی را در میدانِ فصاحت بہ نہایت جولانی می تازد۔" (ص ۳۹)

۲۔ مرزا محمد اکبر طپشؔ: "بہ فروتنی و عجز و انکسار کہ لازمۂ کمال است، یگانۂ روزگار و بہ جدت فہم و ذکاے ذہن و صوابِ رائے یکتاے عصر است۔" (ص ۱۶)

۳۔ الف خاں مبتلاؔ: "جوانے است صالح، سپاہی وضع ..... آثارِ سعادت از جبینش ہویدا و نورِ نجابت از لمعانِ انوار او پیدا است۔ گویا رسامِ قدرت نقشِ ہستیش را از آب و رنگِ غربت و انکسار آراستگی بخشیدہ۔" (ص ۳۰۳)

۴۔ مرزا منعم شورشؔ: "بسیار مجردانہ و قلندرانہ زندگی بسر بردہ ..... اشعارِ پختہ و فارسی بسیار گفتہ امّا از کمال بے دماغی کہ داشت، مسوّدات بہ شمع و چراغ می سوخت۔" (ص ۵۲۹)

فن کار کی افتادِ طبع کسی نہ کسی حد تک اس کے فن کو ضرور متاثر کرتی ہے اس لیے اس قسم کے بیانات سے کسی شاعر کے کلام کے بارے میں کوئی واضح اور قطعی رائے قائم کرنے میں مدد نہ ملے تب بھی اس کے بعض پہلوؤں یا کسی خاص پہلو کی تفہیم و تحسین کے نقطۂ نظر سے ان کی اہمیت مسلّم ہے۔

"چمنستانِ شعرا" میں ابتدائی دور کی عام روایات کے برخلاف تنقیدی مواد بھی خاصی مقدار میں موجود ہے۔ شفیقؔ نے کلام کے متعلق عام طور پر جن الفاظ میں اظہارِ خیال کیا ہے، ان کے تجزیے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ شاعری کے لیے "معانیٔ تازہ و مضامین بیگانہ" کی تلاش اور "متانتِ خیال و شیرینیٔ مقال" کو خاص اہمیت دیتے ہیں اور صرف ان فن پاروں کو "لائقِ تحسین" خیال کرتے ہیں جو پڑھنے اور سننے والوں کے لیے

"انشراحِ طبیعت" کا سامان فراہم کر سکیں۔ بہ الفاظِ دیگر ان کے نزدیک کوئی شخص اس وقت تک ایک کامیاب شاعر کہلائے جانے کا مستحق نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کے کلام میں متذکرۂ بالا خوبیاں موجود نہ ہوں۔ شفیق کے زمانے سے آج تک نقد و نظر کے معیاروں کی مسلسل تبدیلی کے باوجود شاعری سے متعلق ان نظریات و تصورات کی معنویت سے انکار ممکن نہیں۔ البتہ شفیق کا طرزِ نگارش اس صفائے بیان اور وضاحت و قطعیت سے عاری ہے جو اس قسم کے موضوعات سے متعلق گفتگو کو عالمانہ وزن و وقار عطا کرتی ہے۔ لیکن مرصع نگاری اور رنگیں بیانی کی یہ لے اتنی بڑھی ہوئی بھی نہیں کہ الفاظ کے ہجوم میں سررشتۂ مطالب ہی گم ہو جائے یا کوہ کنی کے بعد صرف پرِ کاہ برآمد ہو۔ اس دعوے کی تائید میں مندرجہ ذیل مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں:

۱۔ شاہ مبارک آبروؔ۔ "در معنی یابی بہ دیوانِ موزوں خیالی دادِ سخن می دہد و گل گشتِ خیابانِ اشعارش انشراحِ فراواں بہ نظارگیاں می بخشد۔ متانتِ الفاظ و نزاکتِ معنیش بر سخن فہمانِ انصاف دوست روشن است۔ اشعار ایہام بسیار می دارد ..... شاعرِ شیریں مقال و معنی یابِ متین خیال است ..... لولوے گراں بہاے سخن را بہ نہایت آب و تاب در رشتۂ نظم سفتہ۔" (ص ۸ و ۹)

۲۔ احسن اللہ احسنؔ۔ "در نکتہ سنجی یگانۂ روزگار و صاحبِ تلاشِ معانیٔ پرکار است۔ از بس کہ طوطیٔ طبعش شکرِ ایہام می ریزد، از صفاے مرآتِ اظہار می گریزد ..... نیسان کلکش لآلیٔ معانی می افشاند و مشاطۂ طبعش عروسِ سخن را بوجہِ احسن بر کرسیٔ رنگینی می نشاند۔" (ص ۳۲)

۳۔ ولیؔ دکنی۔ "شاعر والا اقتدار و سخن سنجِ شیریں گفتار است۔ رتبۂ سخن ریختہ در زمانش بہ اوجِ کمال رسیدہ و بازار ایں زبانِ آمیختہ در دورِ او گرم گردیدہ۔ اگرچہ در ازمنۂ ماضیہ موزونانِ ایں جا شعر را بہ زبانِ ریختہ گفتہ اند امّا صاحب دیوانے بہ ایں متانت و

فصاحت از کتمِ عدم سر نہ کشیدہ و شعرائے سلف ہر چند طوطیِ
شکر مقال بوستانِ سخن دانی اند لیکن چنیں بلبل ہزار داستاں
بہ گوش نہ رسیدہ۔ آرے والیٔ ولایتِ نازک خیالی و شہنشاہِ قلمروِ
خوش مقالی است۔" (ص ۱۰۴)

۴۔ سید عبدالولی عزلت: "شعرِ فارسیش گوہر یست آبدار و نظمِ ریختہ اش لولوئیست شاہوار۔
نکاتِ رنگین بہ یمنِ انفاسِ مسیحایش زندہ و خیالاتِ شیریں
بر طبعِ چالاکش نازندہ۔" (ص ۴۴۶)

رنگین و دقیق اسلوب میں اظہارِ خیال کی ان مثالوں کے پہلو بہ پہلو شفیق کے ہاں کہیں کہیں طرزِ کلام اور رنگِ سخن پر تبصرہ و تنقید کے ایسے نمونے بھی مل جاتے ہیں جن کی زبان بڑی حد تک سادہ و بے تکلف اور اندازِ بیان نسبتاً زیادہ عام فہم اور شگفتہ و سلیس ہے مثلاً:

۱۔ ملک الشعرا نصرتی: "شاعرے بود فصیح البیان ..... اشعارِ او اکثر مضامینِ تازہ
وارد و معانیٔ بیگانہ را بہ الفاظِ آشنا می سازد۔ اگرچہ الفاظش
بطورِ دکنیان بر زبان ہا گراں می آید، امّا خالی از لطفے و لذتے
نیست۔" (ص ۳۲۲)

۲۔ میر سجاد اکبرآبادی: "شعرا یہام بسیار می گوید و مضامینِ خوب خوب بہ نظم می آرد۔
حقّا کہ رتبۂ عالیٔ او فوقیت بر رتبۂ میاں آبرو (استادِ آن)
می دارد و شعر شیرینش در عذوبتِ ایں حقیر بہتر از وی شمارد۔"
(ص ۳۷۹)

۳۔ سراج اورنگ آبادی: "بازارِ ریختہ در دکن بعدِ ولی دکنی از و گرم گردیدہ .....
شعرِ پر سوزش دل فروز و سخنِ پختہ اش گلو سوز است .....
مثنویٔ شاہ صاحب مسمّٰی بہ "بوستانِ خیال" ..... بہ نظر در آمد
حقّا کہ خون از رگِ اندیشہ چکانیدہ است۔" (ص ۴۰۰ و ۳۹۸)

عارف الدین خاں عاجز: "شاعریست زبردست و معنی آفرینے است صاحبِ قدرت۔

زمین ہائے سنگلاخِ ریختہ طرح می کند و قوافیٔ تازہ و دلچسپ بکار
می برد و ہیچ جا عاجز نمی ماند۔" (ص ۴۶۴)

فارسی و اردو شاعری میں روایتی طور پر اظہارِ عشق مرد کی طرف سے ہوتا ہے اور مرکزِ عشق بھی مرد ہی کی ذات ہوتی ہے۔ اس کے برخلاف عربی میں مرد کی طرف سے عورت کے لیے اور قدیم ہندی شاعری میں عورت کی طرف سے مرد کے لیے اظہارِ محبت کی روایت ملتی ہے۔ ہاشم دکنی آخرالذکر روایت کے پیرو ہیں۔ اردو میں متقدمین کی حد تک یہ اپنی قسم کی منفرد مثال ہے۔ شفیق نے ان کے کلام کی اس خصوصیت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

"چوں مقرر است کہ در عربستان مردِ عاشقِ زن است، اکثر اشعار در زبانِ مرد نسبتِ زن موزوں می کنند۔ مثلِ لیلیٰ و سلمیٰ و سعاد و در ایران و توران عاشقِ مرد مرد است، چنانچہ از اشعارِ ایشاں معلوم می شود و قصۂ ایاز و محمود دال است بریں معنی و در ہندوستان زن عاشق مرد است چنانچہ ایں رمز از خواندنِ اشعار ہندی یعنی کبت و دوہرا و دیگر تصانیفِ ہندی واضح می گردد و طرفہ بر آں کہ در کلام مجید قصۂ عاشقیٔ زن بر مرد واقع شدہ یعنی قصۂ یوسف علیہ السلام۔ ..... لہٰذا ہاشم در اشعارِ خود بموجبِ ضابطۂ ہندی اظہارِ عشق از طرفِ زن می نماید۔" (ص ۱۰۲)

یہ رائیں مؤلف کی وسعتِ مطالعہ، متانتِ فکر اور اصابتِ رائے کا پتا دیتی ہیں۔ مبالغہ آرائی اور تحسینِ بے جا سے احتراز کرتے ہوئے مناسب انداز اور محتاط الفاظ میں خصوصیاتِ کلام پر تبصرے کی یہ روش ان کے ہاں عام ہے۔ البتہ انعام اللہ خاں یقینؔ کے معاملے میں میرؔ صاحب کے بیانات کا شدید ردِ عمل انھیں اس جادۂ اعتدال سے ہٹا کر اغراق و غلو کی حد تک لے گیا ہے جیسا کہ مندرجہ ذیل اقتباس سے اندازہ ہوگا:

"عزیزے می گوید۔ رباعی:

جس طرح سے لاتے ہیں مضامینِ متین — اشعار میں ریختہ کے سوداؔ و یقینؔ
ایسا کوئی نہیں ہند میں ہر چند کہ ہیں — سجادؔ و کلیمؔ و میرؔ و دردؔ و تمکینؔ

اگرچہ یقین است کہ مرزا سودا در غزل و رباعی و مخمس و مثنوی و قصیدہ و قطعہ بند وغیرہ اشعارِ ریختہ رتبۂ رفیع می دارد و عالی تلاشیٔ فراواں می نماید لیکن در ریختۂ یقین فصاحت و ملاحتِ دیگر است مولفہ:

اگر ہزار برس تک یہ میرزا سودا — کرے جو فکر تتبع یقین کا از دل و جاں
کہے گا معنیٔ باریک و خوب شیریں تر — ولے نزاکت و یہ لطف و یہ قبول کہاں

(ص ۱۶۲)

یقین کو سودا کا ہمسر قرار دینے اور میر و درد جیسے ممتاز شعرا سے برتر و بلند تر ثابت کرنے کی یہ کوشش کسی اعتبار سے مستحسن نہیں کہی جا سکتی۔ سجاد، کلیم اور تمکین وغیرہ پر ان کی افضلیت مسلم ہے لیکن فکر و فن کے تمام محاسن اور زبان و بیان کی ساری خوبیوں کے باوجود ان کا کلام سودا اور میر و درد کی تخلیقات کا ہم پایہ نہیں۔ شفیق نے اس معاملے میں جس مبالغہ آرائی سے کام لیا ہے وہ نہ تو ایک مبصر کے منصب کے شایان شان ہے اور نہ ان کے عام تنقیدی رویے سے مطابقت رکھتی ہے۔

بعض جگہ شفیق نے میر کی طرح الفاظ و محاورات کے نامناسب یا غلط استعمال پر بھی گرفت کی ہے اور اشعار کے ظاہری و معنوی اسقام سے بحث کرتے ہوئے مناسب تر الفاظ اور متبادل مصرعے بھی تجویز کیے ہیں۔ ہر چند کہ اس قسم کی تجاویز و اصلاحات تعداد کے اعتبار سے قابلِ اعتنا نہیں تاہم ان میں سے بعض کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے تاکہ ان کی روشنی میں مولف کی ناقدانہ بصیرت اور شاعرانہ مہارت کا اندازہ کیا جا سکے۔

(الف) لالہ نہال کرن داغ کا ایک شعر ہے ؎

انتظاری سے تری اے گلِ پُرکیفیت — دیدۂ نرگسِ فتاں میں بھرے ہیں جالے

شفیق لکھتے ہیں:

"اگر بجائے پرکیفیت "نسریں رخسار" می گفت، خوب است۔" (ص ۹۵)

یہ اصلاح رعایت لفظی کی طرف مولف کے میلانِ طبع کی نشان دہی کرتی ہے۔

(ب) جعفر علی خاں ذکی کی ایک غزل کا مطلع ہے:

دل میں آئے سو کر و اب تو گرفتار ہوا　　میں تو تحقیق محبت کا گنہگار ہوا

پہلے مصرعے میں ذم کے پہلو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"مصرعۂ اول خلافِ محاورۂ نکتہ چیناں است اگر چنیں می گفت خوب بود:

دل میں کیا ہے سو کہو اب تو گرفتار ہوا" (ص ۱۱۸)

محمد باقر حزیں کے حالات میں ان کے ایک شعر کی نسبت گردیزی کے اعتراض اور سید عبدالولی عزلت سورتی کی جوابی تنقید پر شفیق کا قول فیصل بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ حزیں کا شعر اور متعلقہ تبصرہ درج ذیل ہے:

"فرش ہو جاتا ہوں سنگِ آستاں تیرے کو دیکھ

طور کا کرتے تھے جیسے حضرتِ موسیٰ ادب

فتح علی خاں می گوید کہ "بے ہوشی حضرتِ موسیٰ از ظہورِ تجلی بود نہ از مشاہدۂ طور۔ شرح و بسطِ ایں قصہ از فرطِ شیوع دریں نسخہ کہ خیلے بہ ایجاز و اختصارش کوشیدہ شد، مناسب نہ افتاد۔ وَمَنِ ادَّعیٰ فَعَلَیْہِ السَّنَدُ۔

سید عبدالولی عزلت سلمہٗ اللہ تعالیٰ بر حاشیہ مرقوم نمودہ اند کہ بعد از ظہورِ تجلی بر طور حضرت موسیٰ ہر گاہ بر طور می رفتند، بہ آدابِ تمام پا می گذاشتند ..... وحزیں ادب حضرتِ موسیٰ را تمثیلے کردہ است نہ کہ بے ہوشیٔ او شاں پس اعتراض مصنف بیجا است و ناشی از سوء تامل است۔

راقمِ سطور می گوید کہ بے ہوشیٔ حضرتِ موسیٰ از ظہورِ تجلی نوشتہ واقعی است چنانچہ ملک العلام در کلام ذوی الاحترام می فرماید: فَلَمَّا تَجَلّٰی رَبُّہٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَہٗ دَکًّا وَّخَرَّ مُوْسٰی صَعِقًا ..... لیکن از بیتِ مذکور معنیٔ بے ہوشی استخراج نمی شود، مگر معنیٔ "فرش شدن" معنیٔ "بے ہوشی" قرار یابد، در صورتِ ایں معنی ربطِ مصرع یا مصرع نمی شود و چسپانی مطلق نمی گردد و جوابے کہ سید عزلت سلمہٗ ربہٗ نوشتہ بجا، زیرا کہ فرش شدن را چرا بمعنیٔ بے ہوشی باید گرفت

یعنی معنیٔ قرب صاف از ادب استخراج چرا نہ باید کرد تا چسپاں مصرعین شود و معنیٔ درست معلوم گردد۔" (ص ۱۲۳ و ۱۲۴)

اس بحث سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شفیق ذاتی غور و فکر کے ذریعے مسائل کی تہ تک پہنچنے کے عادی ہیں اور کسی شخص کے دعوے کو محض اس بنا پر کہ وہ ایک مسلمہ علمی و ادبی حیثیت کا مالک ہے، بلا حجت تسلیم کر لینا آئینِ درایت کے خلاف سمجھتے ہیں لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ نمونۂ کلام کے سلسلے میں انھوں نے ذاتی پسند اور ترجیحات کو بالائے طاق رکھ کر بلا استثنا وہ تمام اشعار اپنے انتخاب میں شامل کر لیے ہیں جنھیں میر اور گردیزی اپنے تذکروں میں نقل کر چکے ہیں۔ "نکات الشعرا" سے منقول میر صاحب کے کلام کے بارے میں مندرجہ ذیل بیان اس ضمن میں ان کے موقف کی وضاحت کرتا ہے۔ لکھتے ہیں:

"ایں قدر اشعار خود میر محمد تقی میر در اختتام تذکرۂ "نکات الشعرا"... می نویسد۔ اگرچہ دل نخواست کہ ایں ہمہ را بہ قیدِ قلم آرد و ایں قدر دردِ سر بیجا بہ نظارگیان دہد۔ لیکن چوں التزام نمودہ کہ اشعارِ تذکرتین ہم برطرازم، مانع آمد۔ لاچار آں کل را نقل برداشتہ می شود۔" (ص ۲۶۲ و ۲۶۳)

بعض شاعروں کے کلام کے تحت شفیق نے ضمنی طور پر اپنی ہم طرح غزلیں بھی نقل کی ہیں۔ مثلاً:

حاتم:— "جیوں کہا قاصد نے چل حاتم بلایا ہے تجھے
دل ستی جاتا رہا سنتے ترا پیغام، غم

کاتب الحروف دریں زمیں ریختہ دارد، ایں است:

آج مجھ سے ہو گیا ہے من و عن آرام رم
اب تو کچھ جور و جفا کر اے بتِ خود کام کم" (ص ۱۲۹)

جامی:— "مکتبوں میں ہند کے ہے یوسفستاں کی بہار
فقیر دریں زمیں ریختہ بسلکِ نظم کشیدہ و ایں مصرعہ را تضمین چنیں نمودہ:

چاہ کنعاں کی عبث صاحب سخن جامی کا سن مکتبوں میں ہند کے ہے یوسفستاں کی بہار" (ص ۱۵۱)

شفیق ہجو گوئی اور ہزل نگاری کو پسند نہیں کرتے حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ یہ اصنافِ سخن بہت جلد شاعر کے سر پر شہرت و مقبولیت کا تاج رکھ دیتی ہیں۔ چنانچہ غلام حسین خاں افسق کے متعلق لکھتے ہیں کہ

"از بس کہ ہجو بر مزاجش غالب آمد، شہرۂ عوام گردید۔ در شعر تتبعِ زانی می نماید و اکثر مزاجِ او بہ طرفِ ہزل می آید ..... کاش کہ ایں خیال در دل او جا نیافتے و آفتاب اشعار رنگین بر سینہ اش بتافتے۔" (ص ۱۴۱)

گذشتہ اوراق میں صاحبِ "نکات الشعرا" سے شفیق کے بعض اختلافات کی جانب اشارہ کیا جا چکا ہے۔ یہاں ہم یقین کے حالات سے ایک اور اقتباس نقل کرتے ہیں جس میں میر صاحب کی خوردہ گیری و نکتہ چینی کی عادت اور یقین کے ایک شعر پر سرقے کے الزام کی سخت تر لہجے میں گرفت کی گئی ہے۔ یہ عبارت اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ مولف نے اس بحث کے ضمن میں اپنے طریقِ کار کی وضاحت بھی کر دی ہے۔ "نکات الشعرا" کے ایک اقتباس سے ابتدا کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"کیا بدن ہوگا وہ جس کے کھولتے جامے کا بند
برگِ گل کی طرح ہر ناخن معطر ہو گیا

میر محمد تقی میر در ترجمہ یقین می طراز د کہ "اگرچہ شاعرانِ ریختہ را مبتذل بسند یافتہ ام۔ مبتذل می گویند و توارد می نامند گویا کہ ایں شعرا استاد و در حق ایشاں است

ہر چہ گویند بے محل گویند در توارد غزل غزل گویند

لاکن شعرِ یقین لفظاً لفظاً مبتذلِ رائے انند رام مخلص است ..... طرفہ تر ایں کہ آں ہم در سلیقۂ سرقہ یکہ بودہ است۔ خداوند کہ ایں معنی در اصل از کیست؟ شعر ایں است .....

ناخن تمام گشت معطر چو برگِ گل بندِ قبائے کیست کہ وا می کنیم ما

انتہیٰ" ناچار مہرِ سکوت از دہن بر می دارم و حرفے بہ ناخن فیہ می نگارم کہ کسانے کہ تذکرہ می نویسد و احوالِ ہر یک را از ستم ظریفیٔ بیجا پرو پوچے بقلم می آرند۔

اوشاں را چہ گوہر استفادہ بدامن می افتد مگر ایں کہ در دل خود نازاں می شوند کہ ما ہم چنیں ہستیم کہ بر چنیں شاعراں دخل ہا کردہ ایم و غافل ازیں کہ "چاہ کندہ را چاہ در پیش" مردماں در پس غیبت مصنف ہر چہ کلمات ناشائستہ در حق او می گویند۔ آرے

عیبِ مردم فاش کردن بدترین عیب ہاست
عیب گو اول کند بے پردہ عیب خویش را

چنانچہ مشاہدہ باید کرد کہ ہر چہ بد در حق ما کردہ و یقین چہ نیک نمودہ کہ کمر برایراد او بستہ ایم، مگر بر عیب گیریٔ او خوں بجوشے می آید و الفاظِ چند بر جریدہ ثبت می نماید۔ اول می باید کہ خود را بیاراید بعد ازاں بر دیگراں ستم ظریفی نماید۔ خود اصلا مذاقِ سخن نمی دارد و بر دیگراں سخن می نہد۔ اگر در سخنِ او خطا و سرقہ بگیریم، بیتے از انتخابِ او کہ آخرِ تذکرہ خود نوشتہ، درست نخواہیم یافت لیکن در روزِ ازل رسامِ ارادت بقسمت ما نقش نہ نوشتہ کہ انگشت بر حرفِ کساں نہیم و ایں توفیق حق سبحانہ و تعالیٰ نہ دادہ کہ آہو گیریٔ ابنائے جنسِ خود نمائیم۔ باید کہ میر از زبان خود قائل می شود و داد کلام می دہد یعنی جائے در ترجمہ یقین می نویسد کہ او را شعر مرزا مظہر گفتہ می دہند و بجائے نوشتہ کہ شعر یقین لفظاً لفظاً مبتذلِ رائے انند رام مخلص است و نیز می گوید کہ او ہم سلیقۂ شعر درست نمی دارد واللہ اعلم از کیست۔ ازیں دریافت باید کرد و علیٰ ہذا القیاس ما ہم می توانیم کہ تیغ زبان بر کشیم و دخل در قلم روِ سخن غیر بکنیم چنانچہ مارا آں قدر احوالِ شعرا از نیک و بد معلوم است کہ دیگرے را بر او اطلاع یافتن مدتہا می کشد لاکن از روزِ شمار و سواس بہ خاطر راہ می یابد و اندیشہ از ابنائے نوع دامن دل می گیرد۔ لہٰذا ہر ادنائے را بقدرِ مقدورِ خود بہ نیکی یاد کردم و ہر جائے کہ در احوالِ آشنا مصرعے ثقیل یافتہ، از طرفِ خود ضم کردم و بجائے غیر مصرعے نوشتم و گفتم کہ ایں چنیں ہم مصرع خوب می نماید۔ بارے اختیارِ پسند در قبضۂ مصنف است خود چرا ترجیح باید داد کہ من از و بہتر یافتہ ام آناں کہ مبصر اند، می پندارند۔" (ص ۱۶۶ تا ۱۶۸)

اسی سلسلے میں آگے چل کر ایک اور دل چسپ بحث نکل آئی ہے جو شاعری کی نوعیت کے بموجب شعرا کی گروہی تقسیم سے متعلق ہے۔ لکھتے ہیں کہ:

"دردانست فقیر موزونانِ برچار قسم اند۔ یکے آں کہ شعر کسے را بے تفاوتِ الفاظ و معانی بنامِ خود خواند۔ ایں را حاجتِ تمثیل نیست۔ دوم آں کہ معنیِ لطیفِ کسے دیدہ بہ تفاوت الفاظ تغیر دادہ بخود نسبت دہد۔ بریں حملِ توارد ہم می تواں کرد، امّا بہ ترکیبِ بستگیٔ او نظر باید نمود کہ در ہر کہ نزاکتِ خاص باشد، مقبول باید داشت۔ سوم جماعتے اند کہ روادارِ مضمون و الفاظ غیر اصلا نمی شوند۔ اگر توارد افتد، ایں امر علٰحدہ است لیکن تا مقدور بعدِ تحقیقات از دیوان خود حک می کنند کہ اوّل قبیح باشد یا احسن۔ ایں را ہمتِ عالی می باید، از ہر کسے نمی تواند شد۔ چہارم گروہے اند کہ مضمون زبانے بزبانِ دیگر بہ احسن وجہ بیارند چنانچہ مضمونِ فارسی بریختہ و مضمونِ کبت بفارسی علیٰ ہذا القیاس۔ ایں امر را احسن پنداشتہ اند"

(ص ۱۷۲ و ۱۷۳)

شفیق نے جہاں کچھ شاعروں کے حالاتِ زندگی اور شخصیات کے متعلق کافی شرح وبسط کے ساتھ خامہ فرسائی کی ہے، وہیں بعض لوگوں کے بارے میں ان کے بیانات حد درجہ مختصر اور تشنہ ہیں۔ اس اختصار اور تشنگی کے لیے دوسرے اسباب کے علاوہ کسی حد تک ان کی عجلت پسندی بھی ذمہ دار ہے۔ مندرجہ ذیل مثالوں سے اس کیفیت کا اندازہ ہوگا۔

۱۔ بے نوا ــــ "شخصے معنی آفریں بہ طرفِ ہندوستان گذشتہ۔ احوالِ او بوجہ خوب تنقیح نمی پذیرد۔" (ص ۵۰)

۲۔ شاہ عزیز اللہ عزیز "عزیزِ مصر نازک خیالی است۔" (ص ۴۳۴)

۳۔ فدا ــــ "احوالش بر فقیر نرسیدہ۔ ایں قطعہ فتح علی خاں در تذکرہ خود نوشتہ بود۔ بقلم آمد۔" (ص ۴۸۵)

۴۔ فخری۔ "احوالش معلوم نیست۔ میر محمد تقی میر ایں یک بیت از و

می نویسد۔" (ص ۴۸۶)

۵۔ قائم چاندپوری۔ "ذہن سلیم و فکرِ مستقیم دارد۔ اشعارِ آبدارش محتوئ لطافت و ابکارِ افکارش حاوئ ملاحت۔" (ص ۵۰۱)

تذکرے کا نمایاں ترین نقص جس کی طرف اس سے پہلے بھی ضمناً اشارے کیے جاتے رہے ہیں، شفیق کا پرتکلف اور صنعت کارانہ اسلوبِ نگارش ہے۔ وہ سلاست وسادگی سے گریزاں اور رنگیں نگاری و مرصع کاری پر فریفتہ ہیں۔ اگرچہ ان کی سلیقہ مندی وچابک دستی نے عام طور پر ان کی تحریر کو اُس ابہام اور پیچیدگی کا شکار ہونے سے بچائے رکھا ہے جو مرصع سازی کے اس رجحان کے نتیجے میں تقریباً ناگزیر ہو جاتی ہے تاہم کہیں کہیں شوق کی بے پایانی و بے اختیاری کے باعث ان کے لیے سلامت روی کی اس روش پر ثابت قدم رہنا دشوار ہو گیا ہے۔ چنانچہ درج ذیل مثالوں سے واضح ہو گا کہ بعض اوقات انھوں نے محض زبان پر حاکمانہ قدرت کے اظہار اور زورِ قلم کی نمائش کے لیے نہایت پیچیدہ اور سامعہ فریب و سحر آفریں اندازِ بیان اختیار کیا ہے۔

قزل باش خاں امید کے حال میں اس مضمون کو کہ ان کے اشعار میر صاحب کے تذکرے سے نقل کیے گئے ہیں، اس طرح ادا کرتے ہیں:

"طاوسانِ خیالِ او باحسن وجمال از صحرائے تذکرۂ میر پریدہ دریں سبزہ زار برقص می آئند و بر دلِ تفرجیانِ ایں گلشن داغے تازہ برآں می افزایند۔" (ص ۲۹)

لالہ ٹیک چند بہار کے ذکر میں بہار و چمن کے تلازموں کے ساتھ رعایت در رعایت کی یہ کیفیت بھی ملاحظہ طلب ہے:

"طرۂ پر پیچ سنبلِ مویانِ نسرینِ رخسارِ نازک خیالی را بشانۂ قلم دو زباں وا می نماید و ابروے خمدارِ سروِ قامتانِ تدرو رفتارِ شیریں مقالی را بہ سوادِ سیاہی وسمہ می آراید۔" (ص ۴۴)

کچھ اور شاعروں کے متعلق ان کے نام یا تخلص کی رعایت سے چند مبہم و مختصر جملوں میں اظہارِ خیال کی مندرجہ ذیل مثالیں بھی اسی ضمن میں آتی ہیں:

۱۔ میرزا داؤد "شکر بیانی از سخنش پیدا و خوش الحانی از نامش ہویدا است۔" (ص۸)
۲۔ مصطفیٰ خاں یکرنگ "یک رنگی اخلاصش از تخلصِ او پیدا و خلقِ محمدی از نامش ہویدا است۔" (ص ۲۲۲)
۳۔ محمد حسین کلیم۔ "عصائے کلکش سحر شکنی می نماید و طبعِ بلندش در چشمِ ورق ..... سرمہ می آراید۔" (ص ۲۲۹)

عاجز دہلوی کے متعلق مندرجہ ذیل بیان میں لفظ "عاجز" کی غیر ضروری تکرار بھی لفظی بازی گری کے اسی رجحان کی نمائندگی کرتی ہے:

"از شعرائے ہندوستان است۔ جودتِ ذہنِ عاجزِ دکن مشہور آفاق و شوخیٔ مزاجِ عاجز ہندوستان از ہمیں بیتِ او ہویدا است۔ ظاہرا تخلص عاجز را شرف است۔ سوائے ایں بیتِ عاجز کہ بتذکرہ نکات الشعرا تحریر است دیگر بسمعِ ایں عاجز نرسید۔" (ص ۴۴۱)

کلام کے انتخاب و اندراج میں شفیق نے بالعموم احتیاط سے کام لیا ہے حتیٰ کہ جن شعروں کی ملکیت کے بارے میں کوئی قابل اعتبار سند نہیں مل سکی ہے انھیں متن کے بجائے تذکرے کے آخر میں بطورِ ضمیمہ جگہ دی ہے پھر بھی بعض اشعار غلطی سے اصل مصنفین کے بجائے دوسرے شاعروں کے سرمایۂ افکار میں شامل ہو گئے ہیں۔ مثلاً میر حسن کے استاد میر ضیا دہلوی کا یہ شعر شاہ آبرو سے منسوب ہے:

جب تلک تھا صاف، قاصد کو جوابِ صاف تھا
اب جو خط آنے لگا شاید کہ خط آنے لگا (ص ۱۸)

مندرجہ ذیل اشعار دیوان کے اکثر نسخوں میں موجودگی کی صراحت کے ساتھ انعام اللہ خاں یقین سے منسوب کیے گئے ہیں:

بدلہ ترے ستم کا کوئی تجھ سیں کیا کرے — اپنا ہی توں فریفتہ ہووے خدا کرے
خلوت ہو اور شراب ہوے معشوقِ خوبرو — زاہد تجھے قسم ہے جو تو ہو تو کیا کرے
قاتل ہماری نعش کی تشہیر ہے ضرور — آئندہ تا کوئی نہ کسی سے وفا کرے (ص ۱۹۵)

چونکہ یہ اشعار ایک اور شعر اور مقطع کے ساتھ دیوان یقینؔ کے مطبوعہ نسخے میں بھی موجود ہیں[۱]، اس لیے بظاہر اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں لیکن سید صباح الدین عبدالرحمٰن نے دیوانِ فغاںؔ کے ایک قلمی نسخے (مملوکہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری، لاہور) کے حوالے سے انھیں اشرف علی خاں فغاںؔ کی تصنیف قرار دیا ہے[۲] اور میر حسنؔ نے پہلے دو اشعار پر مرزا رفیع سوداؔ کی ملکیت ظاہر کی ہے[۳]۔ سوداؔ کے دیوان میں الحاقی کلام کی افراط کے باوجود ان سے ان اشعار کا انتساب ہمارے خیال میں اس بنا پر قابلِ ترجیح ہے کہ یہ تینوں شعر ان کے ہاں صرف متعلقہ غزل ہی میں شامل نہیں، اس تضمین میں بھی موجود ہیں جو انھوں نے اپنی غزل کے اشعار پر کی ہے[۴]۔

محمد شاہ بادشاہِ دہلی کے انتخابِ کلام میں یہ اشعار بھی شامل ہیں:

ملاحت ہے تمھارے حُسن میں جاوید روز افزوں
اگر شوخی کی خو جاوے ہوئے ہر روز عاشق کا
کھول کر بندِ قبا دل کے تئیں غارت کیا
کیا حصارِ قلب دلبر نے کھلے بندوں لیا (ص ۲۴۶)

پہلے شعر کے متعلق اس وقت یہ بتانا مشکل ہے کہ یہ کس کی تصنیف ہے لیکن دوسرا شعر بہ ادنیٰ تغیرِ الفاظ خان آرزوؔ اور احسن اللہ احسنؔ سے منسوب کیا جاتا رہا ہے۔ محمد شاہ سے انتساب کی تائید کسی دوسرے تذکرے سے نہیں ہوتی۔

سوداؔ کی ایک غزل کا مشہور مطلع ہے ؎

آدم کا جسم جب کہ عناصر سے مِل بنا
کچھ آگ بچ رہی تھی سو عاشق کا دِل بنا (ص ۵۰)

---

[۱] دیوانِ یقینؔ مرتبہ مرزا فرحت اللہ بیگ۔ ص ۴۸

[۲] دیوانِ فغاںؔ مرتبہ صباح الدین عبدالرحمٰن ص ۳۱ و ۵۸

[۳] تذکرہ شعرائے اردو طبعِ ثانی ص ۸۵

[۴] کلیاتِ سوداؔ مطبوعہ نول کشور پریس (مطبوعہ ۱۲۸۹ھ) ص ۳۳۸ و ۳۳۹

شفیق کے ہاں یہ مطلع قائم کے انتخابِ کلام میں شامل ہے (ص ۵۰۱) چوں کہ کلیاتِ سودا کے معتبر نسخوں کے علاوہ خود قائم کے تذکرے (مخزن نکات) سے بھی سودا کی ملکیت کی تائید ہوتی ہے، اس لیے شفیق کے اس فیصلے سے بھی اتفاق نہیں کیا جا سکتا۔

متذکرۂ بالا لسانی و بیانی نقائص اور واقعاتی خامیوں کے باوجود "چمنستان شعرا" ایک اہم اور قابل قدر تذکرہ ہے جو اردو شاعری کے ابتدائی دور سے متعلق تحقیق و تلاش کے سلسلے میں ایک معتبر ماخذ اور مستند ذریعۂ معلومات کی حیثیت رکھتا ہے۔

طبقات الشعرا

"طبقات الشعرا" کے مولف مولوی قدرت اللہ قدرتؔ و شوقؔ (متوفی ۱۲۲۴ھ/ ۱۸۰۹ء) جنھیں رام پور میں طویل قیام کی بنا پر بالعموم رام پوری کہا جاتا ہے، اصلاً موضع موئی مضافاتِ سنبھل ضلع مراد آباد کے رہنے والے تھے۔[1] موطن و مسکن کا یہ فرق اور شہرتِ عام کی منزل تک پہنچنے کے بعد قدرتؔ کی بجائے شوقؔ کا تخلص کے طور پر انتخاب تذکرہ نگاروں کے ہاں ان کے تعارف کے سلسلے میں ایک قسم کے خلط مبحث کا سبب بن گیا ہے، چنانچہ مصحفی جو محمد یار خاں امیر، رئیسِ ٹانڈہ کی ملازمت کے دوران قائمؔ چاندپوری کی صحبت میں ان سے ایک ملاقات بھی کر چکے تھے، "تذکرہ ہندی" میں انھیں "مولوی قدرت اللہ قدرتؔ تخلص مولف تذکرہ ہندی گویاں کے طور پر اور "ریاض الفصحا" میں "مولوی قدرت اللہ شوقؔ تخلص، ساکن رام پور" کی حیثیت سے یاد کرتے ہیں۔[2] "عیار الشعرا"، "عمدۂ منتخبہ"، "مجموعۂ نغز"، "تذکرۂ بے جگر"، "گلشن بے خار" اور دوسرے تذکروں میں بھی غالباً مصحفی کی تقلید ہی کے نتیجے میں ان کی شخصیت اسی طرح دو مختلف خانوں میں بٹی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس غلط فہمی سے قطع نظر تقریباً تمام تذکرہ نویس ان کے فضل و کمال، ذکاوت و ذہانت اور استادی و مشاقی کے معترف ہیں۔ میر غلام علی عشرتؔ بریلوی (متوفی ۱۲۳۶ھ/ ۱۸۲۱ء) نے پدماوت (مصنفہ ۱۲۱۱ھ/ ۹۷-۱۷۹۶ء) کے دیباچے

---

[1] نسخہ مطبوعہ ص ۶۲۳۔ آج کل یہ گانو تحصیل بہیڑی ضلع بریلی میں شامل ہے۔

[2] "تذکرۂ ہندی" ص ۱۷۵ و "ریاض الفصحا" ص ۱۵۰

میں رام پور میں ہر ہفتے جمعے کی نماز کے بعد ان کے مکان پر مشاعرے کے انعقاد کا بھی ذکر کیا ہے[1]، جس سے ان کی ادبی سرگرمیوں کا پتا چلتا ہے۔ تصنیفی و تالیفی کارناموں کے ذیل میں "طبقات الشعرا" کے علاوہ تاریخ عالم کے موضوع پر ایک کتاب "جام جہاں نما" (مرتبہ مابین ۱۱۹۱ھ و ۱۱۹۹ھ/ ۱۷۷۷ء و ۱۷۸۵ء) اور شعرائے فارسی کا ایک تذکرہ "تکملۃ الشعرا" (۱۱۹۹ھ - ۱۲۱۳ھ/ ۱۷۸۵ء - ۱۷۹۸ء) بھی ان سے یادگار ہے۔

"طبقات الشعرا" کے دو قلمی نسخے کتب خانہ آصفیہ (اسٹیٹ لائبریری) اور سینٹرل رکارڈز آفس حیدرآباد دکن میں محفوظ ہیں۔ ترقیمے کے مطابق پہلے نسخے کی کتابت پنجشنبہ ۹ رجب ۱۲۰۱ھ (۲۶ اپریل ۱۷۸۷ء) کو فیض علی کے قلم سے مکمل ہوئی ہے۔ دوسرا نسخہ سید محمد علی ملیح آبادی نے ۲۹ رمضان ۱۳۲۷ھ (۱۴ اکتوبر ۱۹۰۹ء) کو حیدرآباد ہی کے کسی کرم خوردہ مخطوطے سے نقل کیا ہے جس کا ترقیمہ بعینہٖ اول الذکر نسخے کے ترقیمے سے مطابقت رکھتا ہے۔ لیکن اس ظاہری مماثلت کے باوجود ثانی الذکر نسخے کو اول الذکر کی نقل نہیں قرار دیا جا سکتا کیوں کہ اولاً تو کتب خانۂ آصفیہ کا نسخہ سید محمد علی ملیح آبادی کے بیان کے برخلاف کرم خوردگی سے محفوظ ہے، ثانیاً طبقات کی تقسیم و ترتیب کے اعتبار سے یہ دونوں نسخے باہم مختلف ہیں۔ پروفیسر نثار احمد فاروقی نے انھی دونوں کو سامنے رکھ کر اس تذکرے کا ایک تنقیدی ایڈیشن مرتب کیا ہے جو ۱۹۶۸ء میں مجلس ترقیٔ ادب لاہور سے شائع ہو چکا ہے۔ آئندہ سطور میں حوالے کے لیے یہی اشاعت ہمارے پیش نظر رہی ہے۔

نسخۂ مطبوعہ کے مطابق یہ تذکرہ دو سو اٹھاسی (۲۸۸) شاعروں کے احوال و اشعار پر مشتمل ہے۔ نسخۂ آصفیہ اور نسخۂ رکارڈز آفس کے منقول عنہ دونوں ہی کے متعدد درمیانی اوراق ضائع ہو جانے کی وجہ سے ان میں سے کئی شعرا کے تراجم ناقص ہیں۔ ان میں مرزا محمد رفیع سوداؔ (ص ۱۱۹)، نول رائے وفاؔ (ص ۲۸۹) اور باقر علی ممنونؔ (ص ۳۲۲)

---

[1] تذکرۂ کاملانِ رام پور ص ۳۰۱

بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں کیوں کہ پہلے دونوں شاعروں کے حالات اور کلام کے ابتدائی حصے اور تیسرے شاعر کے ترجمے کی شروع کی ایک دو سطریں بھی غائب شدہ اوراق کے ساتھ ضائع ہوچکی ہیں۔

طبقات الشعرا کا ایک اور قلمی نسخہ دار المصنفین اعظم گڑھ کے کتب خانے میں اور اس کی دستی نقل راقم السطور کے ذخیرے میں موجود ہے۔ یہ نسخہ آخری تین شاعروں کے حالات و کلام کے بقدر ناقص ہے۔ پروفیسر نجیب اشرف ندوی نے اس کے اختلافات رکارڈز آفس کے نسخے میں اس کی جلد بندی کے وقت مقابلۂ متن کے لیے لگوائے گئے سادہ سادہ اوراق پر درج کر دیے ہیں۔ پروفیسر فاروقی نے انھی اختلافاتِ متن کے توسط سے بالواسطہ طور پر اس نسخے سے استفادہ کیا ہے اور اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ بظاہر اس نسخے اور نسخۂ رکارڈز آفس کا منقول عنہ ایک ہی ہے کیوں کہ ان میں انتخاب کلام کی کمی بیشی کے سوا تراجم میں کوئی اہم فرق نہیں ہے جب کہ نسخۂ آصفیہ میں ان کے مقابلے میں بہت کچھ اضافے اور ترمیمیں ہوئی ہیں۔ (مقدمہ ص ۴۹) لیکن فاروقی صاحب کے یہ قیاسات از روے واقعہ پوری طرح درست نہیں کیوں کہ یہ نسخہ اگر ایک طرف نول رائے وفا اور باقر علی ممنون کے حالات و کلام اور بعض اوراق کی بے ترتیبی و ضیاع کے معاملے میں نسخۂ آصفیہ اور نسخۂ رکارڈز آفس سے مطابقت رکھتا ہے تو "ملک الشعرا مرزا رفیع السودا" کے ترجمۂ احوال کی موجودگی کے لحاظ سے ان سے مختلف بھی ہے۔ علاوہ بریں اس میں متعدد ایسے شاعروں کے تراجم بھی موجود ہیں جو حیدرآباد کے دونوں نسخوں سے غائب ہونے کی وجہ سے نسخۂ مطبوعہ میں جگہ نہیں پا سکے ہیں۔ مثلاً میر محمدی بیدار (ص ۱۱۵) اور مرزا رفیع سودا (ص ۱۱۹) کے درمیان از روے فہرست اٹھارہ[۱۸] اور از روے متن سترہ[۱۷] شاعروں کے حالات و اشعار نسخۂ مطبوعہ کی بہ نسبت زائد ہیں۔ کچھ اور بھی اختلافات ہیں جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔

فاروقی صاحب نے محض شمار کی حد تک اس تذکرے کے ایک چوتھے نسخے کا بھی ذکر فرمایا ہے جو ان کے بقول پنڈت برج موہن وتاتریہ کیفی کے کتب خانے میں تھا

اور اب لاہور پہنچ چکا ہے۔ (مقدمہ ص ۴۷) راقم الحروف کو اس نسخے کی لاہور میں موجودگی اور اس کے موجودہ مالک کے بارے میں کوئی علم نہیں لیکن اتنا باوثوق طور پر معلوم ہے کہ یہ دراصل لالہ سری رام کی ملکیت تھا اور اس کی ایک نقل (ایک کپڑے میں بندھے ہوئے منتشر اوراق کی صورت میں) اکتوبر ۱۹۶۶ء تک قاضی عبدالودود صاحب کے کتب خانے میں محفوظ تھی۔ اس کا ترقیمہ بھی ایک بہت معمولی مگر نہایت اہم فرق کے ساتھ دونوں حیدرآبادی نسخوں کے ترقیمے کے مطابق ہے۔ فرق یہ ہے کہ اس میں سالِ کتابت ۱۲۰۱ھ کی بجائے ۱۲۱۰ھ لکھا ہوا ہے۔ لیکن مرحوم نصیرالدین ہاشمی صاحب نے نسخۂ رکارڈز آفس یا اس کا منقول عنہ کے حوالے سے اپنے ایک مضمون میں اور پروفیسر ابواللیث صدیقی نے نسخۂ آصفیہ کی تلخیص میں بھی اس جگہ ۱۲۰۱ھ کی بجائے ۱۲۱۰ھ ہی نقل کیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ نسخۂ آصفیہ کی حد تک جو نسخۂ رکارڈز آفس سے زیادہ معتبر اور بہ اعتبارِ زمانہ اس پر مقدم ہے، اسے ۱۲۱۰ھ بھی پڑھا جا سکتا ہے۔ فاروقی صاحب بھی قرأت کے اس امکان سے نہ صرف یہ کہ متفق ہیں بلکہ ان کے نزدیک یہی صحیح بھی معلوم ہوتا ہے۔ (مقدمہ ص ۵۴)

قاضی صاحب کے کتب خانے کی متذکرہ بالا نقل کے آخر میں ترقیمے کے بعد "نقل مطابق اصل از نسخۂ قلمی مملوکہ کتب خانہ عثمانیہ" کے اندراج سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حیدرآباد میں کسی زمانے میں دو سابق الذکر نسخوں کے علاوہ اس تذکرے کا ایک اور نسخہ بھی موجود تھا۔ یہ نسخہ بالیقین باقی دونوں موجود و معلوم نسخوں سے مختلف تھا، کیوں کہ ان نسخوں کے برخلاف اس میں مرزا محمد رفیع سوداؔ اور نول رائے وفاؔ دونوں کے حالات و اشعار موجود تھے۔ علاوہ بریں راقم السطور نے ۱۹۶۶ء میں اس نسخے سے بہت ہی محدود تعداد میں جو اقتباسات اخذ کیے تھے، ان کی بنیاد پر کہا جا سکتا ہے کہ متن کے بعض اہم اختلافات بھی اس کے باقی تینوں نسخوں سے علٰحدہ ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔ بعض شاعروں مثلاً مرزا نعیم بیگ جواںؔ و وحشتؔ شاگردِ حسرتؔ، میر محمد علی وہمؔ، عشقیؔ مرادآبادی، شاہ واقفؔ میر ہاشم علی ہاشمؔ، مرزا محمد ہاتفؔ اور میر شمس الدین ہوشؔ کے تراجم دوسرے نسخوں کی بہ نسبت زیادہ ہیں۔ یہ اس تذکرے کا غالباً آخری ترمیم یافتہ اور اضافہ شدہ ایڈیشن تھا

جو بظاہر اس کے سالِ کتابت یعنی ۱۲۱۰ھ میں یا اس سے کچھ پہلے مرتب ہوا تھا۔
تذکرے کی تالیف کے اسباب و محرکات اور اس کے زمانۂ ترتیب کے سلسلے میں مولف کا بیان ہے :

"از ایامِ طفلی بہ اتفاق صحبتِ سخن طرازاں ..... شوقِ کلام موزوں از ہر زبانے کہ باشد خصوصاً زبانِ ریختہ بہ سببِ مناسبتِ ہم زبانی در دل عزیزم زیادہ از حد بود۔ اکثر اشعارِ استادانِ ایں فن از دواوینِ مولفہ و ابیاضِ متفرقہ تلاش و تجسس نمودہ جمع نمودہ بودم۔ می خواستم کہ ایں ہمہ مزخرفات را بطریق تذکرہ تالیف سازم فاما بہ سببِ عدمِ مساعدتِ روزگار فرصتِ وقت نمی یافتم و باوجودِ فرمائشِ بعضے عزیزاں در تعویق می انداختم۔ بالضرور رضامندیٔ آنہا کہ از جملۂ لزومات بود، مقدم جمیع امور دانستہ در سنہ یک ہزار و یک صد و ہشتاد و ہشت ہجری کہ تعطیل و تنہائی محض لاحقِ حالِ ایں ہیچمداں بود، بہ ایں صور و نقوشِ کاغذی صحبتِ برگزیدم و ایں چند اوراق در سلکِ تحریر آوردم ..... و تالیفِ ایں مختصر کہ مسمّٰی بہ طبقات الشعرا است، مشتمل بر چہار طبقہ و خاتمہ نمودہ شد۔" (ص ۳)

"تکملۃ الشعرا" میں شوق نے متعدد مقامات پر مختلف ناموں سے اس تذکرے کا ذکر کیا ہے۔ کہیں وہ اسے صرف "تذکرہ ہندی" لکھتے ہیں اور کہیں "تذکرۂ طبقات شعرائے ہندی" یا "حقیقت الشعرا" کے نام سے اس کا حوالہ دیتے ہیں[۱]۔ ان میں سے پہلا نام ہمارے خیال میں کتاب کے موضوع کی وضاحت کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ دوسرا نام بھی اصل نام میں تھوڑے سے تصرف کے ساتھ اسی طرف اشارہ کرتا ہے۔ تیسرا نام اعزالدین عزیز عثمانی بدایونی کے مستخرجہ مادۂ تاریخ "حقیقتِ شعرا" کی ترمیم یافتہ شکل ہے، جس سے تذکرے کا سالِ اتمام سنہ ۱۱۸۹ھ برآمد ہوتا ہے[۲]۔ سنہ تالیف

---

[۱] بحوالہ دستور الفصاحت دیباچہ مرتب ص ۱۷

[۲] "تاریخ ایں تذکرۂ فقیر "حقیقت شعرا" خوب گفتہ" ص ۵۶۲

سے متعلق یہ شہادت "طبقات الشعرا" کے نقش اول کی ترتیب کا زمانہ متعین کرتی ہے۔ مولف کے تحریر کردہ سنہ اور اس تاریخ میں ایک سال کا فرق اس لیے قابلِ لحاظ نہیں کہ نواب محمد یار خاں امیر متوفی یکم ذی قعدہ ۱۱۸۸ھ/۳ جنوری ۱۷۷۵ء[۱] کے ذکر میں ان کے اس بیان سے کہ ان (امیر) کے انتقال کو ایک ماہ کے قریب ہوا ہے[۲]، یہ پتہ چلتا ہے کہ ذی الحجہ ۱۱۸۸ھ/فروری ۱۷۷۵ء تک تذکرے کی تسوید و تحریر کا سلسلہ جاری تھا اور بظاہر شوق ۱۱۸۹ھ کے اوائل ہی میں اس کام سے فارغ ہوئے ہوں گے۔

۱۱۸۸ھ یا ۱۱۸۹ھ کے آغاز میں اس تذکرے کے نقشِ اوّل کی تکمیل کے بعد شوق نے بقول شیخ چاند "۱۲۰۹ھ میں اس میں معتدبہ اضافہ کیا" تھا[۳]۔ ان کے بیان کے مطابق سودا سے متعلق تحقیقی کام کے زمانے میں ۱۱۸۸ھ اور ۱۲۰۹ھ کے یہ دونوں نسخے ان کے پیشِ نظر رہے تھے۔ لیکن بحالتِ موجودہ ہمیں ایسے کسی نسخے کا علم نہیں جس کے مقدمے یا متن میں ۱۲۰۹ھ میں اس کی ترتیبِ جدید یا نظرِ ثانی کی طرف کوئی واضح اشارہ موجود ہو۔ ممکن ہے کہ اس سے ان کی مراد کتب خانۂ عثمانیہ کا وہی نسخہ ہو جس کا ذکر کتب خانۂ لالہ سری رام کے نسخے کے تعارف میں آچکا ہے۔ بہرصورت یہ امر شبہے سے بالاتر ہے کہ اس تذکرے میں نسخۂ عثمانیہ کے سالِ کتابت یعنی ۱۲۱۰ھ سے قریب ترین زمانے تک اضافے ہوتے رہے ہیں۔ شوق کے جن بیانات سے اس خیال کی تائید ہوتی ہے ان میں سے چند درج ذیل ہیں:

(الف) مصحفی کے بارے میں لکھتے ہیں:

"رتبۂ سخن او الحال بہ مرتبہ رسیدہ کہ حالا در لکھنؤ در جوگہ شعرا داخل است"

(ص ۳۶۵)

---

[۱] اخبار الصنادید جلد اول ص ۵۶۰ و انتخابِ یادگار ص ۳۲

[۲] "قریب یک ماہ شد کہ ازیں جہانِ فانی رحلت نمودہ"، ص ۴۲۲

[۳] سودا ص ۱۲۷

مصحفی دہلی سے ترکِ سکونت کے بعد ۱۱۹۸ھ/۱۷۸۴ء میں لکھنؤ پہنچے تھے۔[1] ان کی شہرت کے عروج و شباب کا زمانہ تیرھویں صدی ہجری کے آغاز کے ساتھ شروع ہوا اگر اس موخرالذکر پہلو کو نظرانداز کر کے صرف قیامِ لکھنؤ ہی کی بنیاد پر زمانۂ تحریر کا فیصلہ کیا جائے تب بھی اس میں کوئی شک نہیں کہ شوق نے مصحفی کے حال میں یہ اضافہ ۱۱۹۸ھ کے بعد کیا ہے۔

(ب) میر ضیا دہلوی کے متعلق رقم طراز ہیں:

"از استادانِ میر حسن کہ مصنف بدرِ منیر است، بودہ۔" (ص ۳۲۷)

میر حسن کی یہ مثنوی ۱۱۹۹ھ/۱۷۸۵ء کی تصنیف ہے۔ اس لیے اس کے حوالے کی نوبت اس سنہ کے بعد ہی آئی ہوگی۔

(ج) مرزا جواں بخت جہاں دار شاہ کے بارے میں اطلاع دیتے ہیں کہ

"در بلدۂ بنارس از مرگِ مفاجات درگذشت۔" (ص ۳۹۴)

عام روایت کے مطابق جہاں دار شاہ کی وفات شعبان ۱۲۰۲ھ (مئی ۱۷۸۸ء) کا واقعہ ہے[2] اس لیے یہ بات پورے یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ ان کے حالات اس سنہ کے بعد لکھے گئے ہیں۔

(د) مرزا سلیمان شکوہ کے حال میں لکھتے ہیں:

"از مدتے بسبب افراط و تفریط روزگارِ ناہنجار ۔۔۔۔۔ از قلعۂ دہلی برآمدہ در لکھنؤ اقامت ورزیدہ، اوقات در گوشہ گیری می گذارد۔" (ص ۳۹۸)

سید کمال الدین حیدر عرف سید محمد میر کا بیان ہے کہ سلیمان شکوہ ۱۲۰۵ھ (۹۱-۱۷۹۰ء)

---

[1] عقد ثریا ص ۱۴

[2] تاریخ اودھ از نجم الغنی جلد سوئم ص ۲۰۶۔ عرشی صاحب نے "نادرات شاہی" کے دیباچے میں ایک اہم دستاویزی ثبوت کی بنیاد پر جہاں دار شاہ کا زمانۂ وفات ۷ ذی قعدہ ۱۲۰۲ھ کے بعد متعین کیا ہے۔ (ص ص ۵۲ و ۵۳)

میں بعہد آصف الدولہ لکھنؤ میں وارد ہوئے اور نصیر الدین حیدر کے زمانۂ جلوس (۱۲۴۳ھ/ ۱۸۱۴ء) تک کمالِ اعزاز و احترام کے ساتھ وہیں مقیم رہے[1]۔ چونکہ شوق نے ان کے متعلق یہ جملے ایسے وقت میں سپردِ قلم کیے ہیں جب کہ قلعۂ معلّٰی سے ان کے خروج اور لکھنؤ میں آمد کے واقعات بیتے ہوئے دنوں کی واردات بن چکے تھے، لہٰذا ان کا ترجمہ بالیقین ۱۲۰۵ھ/ ۱۷۹۱ء کے کئی برس بعد کی تحریر ہے۔

(۸) کتب خانۂ لالہ سری رام کے نسخے میں شاہ واقف واقفؔ تخلص کے حالات میں یہ صراحت ملتی ہے کہ "ایں چند اشعار او در تذکرۂ مصحفی دیدہ بودم، بتحریر آمدہ"۔ اس نسخے میں شامل بعض اور شعرا کے تراجم میں بھی اس تذکرے سے اخذ و اقتباس کے شواہد موجود ہیں۔ چوں کہ یہ تذکرہ (تذکرۂ ہندی) ۱۲۰۹ھ/ ۹۵-۱۷۹۴ء میں مرتب ہو کر منظرِ عام پر آیا تھا اس لیے یہ قیاس بے جا نہ ہوگا کہ ان تمام شعرا کے حالات ۱۲۰۹ھ/ ۹۵-۱۷۹۴ء میں یا اس کے بعد لکھے گئے ہوں گے۔

(۹) قدرت اللہ بلیغؔ کے بارے میں رقم طراز ہیں کہ

"چند سال شد کہ بطرفِ کعبۃ اللہ رفتہ بود۔ شنیدہ می شود کہ الحال بطرفِ نواحِ دکن استقامت دارد" (ص ۳۶۹)

عبداللہ خاں ضیغمؔ کے بیان کے مطابق بلیغ ۱۲۰۸ھ (۹۴-۱۷۹۳ء) میں دکن پہنچے تھے[2] اگر یہ روایت درست ہے تو ان کا حال یا کم از کم یہ جملہ ۱۲۱۰ھ/ ۹۶-۱۷۹۵ء کے آس پاس لکھا گیا ہوگا۔

ان شواہد سے یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ اس تذکرے میں ۱۱۸۸ھ/ ۱۷۷۵ء کے بعد بھی وقتاً فوقتاً ترمیمیں اور اضافے کرتے رہے ہیں اور تجدید و توسیع کا یہ سلسلہ ۱۲۱۰ھ/ ۹۶-۱۷۹۵ء کے قریب تک جاری رہا ہے۔

---

[1] تواریخ اودھ جلد اوّل ص ص ۲۸۰-۲۸۲

[2] یادگار ضیغم بحوالہ فہرست مخطوطات ادارۂ ادبیات اردو ص ۱۳۲

اپنے نام کی مناسبت سے یہ تذکرہ بہ تفصیل ذیل چار طبقات پر منقسم ہے۔

طبقۂ اول۔ در بیانِ ایجادِ شعرِ ریختہ و ذکر شعرائے دکھنی و بعضے معاصرِ آنہا (۲۱ شعرا)

طبقۂ دوم۔ در ذکر شاعرانِ ایہام گو (۲۱ شعرا)

طبقۂ سوم۔ در ذکر شعرائے متاخرین و بعضے نومشقانِ دیگر (۵۱ شعرا)

طبقۂ چہارم۔ در ذکر شعرائے تازہ گو و بعضے نومشقان دیگر مشتمل بر پنج مقالات (۱۹۵ شعرا)

مقالۂ اوّل: در ذکر بعضے تازہ گویانِ سرآمدِ روزگار (۵۸ شعرا)

مقالۂ دوم: در ذکر بعضے سلاطینِ روزگار و وزرائے نامدار و امرائے والاتبار و بعضے منصب دارانِ سرکارِ فیض آثار و مصاحبانِ شاہزادۂ عالی مقدار۔ (۲۰ شعرا)

مقالۂ سوم: در ذکر بعضے امرائے افغانانِ ایں دیار وغیرہ و افاغنہ قرب و جوار (۲۰ شعرا)

مقالۂ چہارم: در ذکر بعضے عزیزان و یاران ہمدم و دوست داران ثابت قدم (۱۱ شعرا)

مقالۂ پنجم: در ذکر بعضے برادران و خویشان و دوست داران و یارانِ دل ریشان و بعضے نومشقان کہ چنداں مایۂ شاعری ندارد و بسببِ موزونیٔ طبیعت خود را از خود زیادہ پنداشتہ در جرگہ شعرا می شمارند۔ (۸۶ شعرا)

زمانے اور مراتب کے اعتبار سے شعرا کی یہی مفصل اور واضح گروہی تقسیم "طبقات الشعرا" کا طرۂ امتیاز ہے۔ مورخانہ شعور کی اس کارفرمائی کی مثال اس سے قبل قائم چاندپوری کے علاوہ کسی دوسرے تذکرہ نگار کے ہاں نظر نہیں آتی۔ اگرچہ "مخزن نکات" کی طرح یہ نقص اس تذکرے میں بھی موجود ہے کہ حروفِ تہجی کے اعتبار سے مرتب کی ہوئی فہرست کے بغیر بعض اوقات کسی خاص شاعر کے حالات و کلام کی جستجو ایک مرحلہ دشوار کی صورت اختیار کر لیتی ہے تاہم تاریخی نقطۂ نظر سے شوق کے اس کارنامے کا اعتراف ناگزیر ہے۔

"طبقات الشعرا" سے پہلے شمالی ہند میں شعرائے اردو کے جو تذکرے لکھے

جا چکے تھے، خیال ہے کہ شوق اپنے علمی شغف اور شعر و ادب سے دل چسپی کی بنا پر ابتدا ہی میں ایک عام قاری کی حیثیت سے ان کا مطالعہ کر چکے ہوں گے۔ بعد ازاں جب انھوں نے خود بھی اس میدان میں قدم رکھا تو دوسرے عوامل اور وسائل معلومات کے ساتھ ہی پیش رو اہلِ قلم کے جلائے ہوئے ان چراغوں نے بھی انھیں راہ و رسمِ سفر سے آگاہ مسافر کی طرح اپنی منزل کی طرف بڑھنے کا حوصلہ عطا کیا چنانچہ لکھتے ہیں کہ

"چوں دیدیم کہ ذکرِ اکثر استادان در تذکرۂ مولفینِ سابق کہ احوالش خواہد آمد، موجود است از آنہا بر آوردیم و اشعار اکثر استادان و تازہ گویان و نو مشقان کہ خارج از تذکرہ ہا بودند، نیز از بیاض ہا تجسس نمودہ درج کردیم تا چندے موجبِ اشتہار و باعثِ یادگاری نام چندیں بزرگوار بر صفحۂ روزگار گردد۔" (ص ۳)

شوق نے اس سلسلے میں کن کن تذکروں سے استفادہ کیا ہے، ان کی تحریریں اس کے متعلق واضح طور پر کوئی معلومات فراہم نہیں کرتیں۔ صرف لالہ سری رام کے کتب خانے کے نسخے میں ایک دو جگہ "تذکرۂ مصحفی" کا حوالہ ملتا ہے۔ علاوہ بریں محمد یار خاکسار اور میر کے حالات میں مجملاً ان کے تذکروں کا ذکر آیا ہے لیکن وہاں اس امر کی تصدیق کا کوئی قرینہ موجود نہیں کہ یہ تذکرے فی الواقع ان کی نظر سے گذر چکے تھے۔ تذکرۂ خاکسار چونکہ نایاب ہے اس لیے اس امکان سے قطع نظر کہ اس کے متعلق شوق کی اطلاع میر کے بیان پر مبنی ہو سکتی ہے، ان سطور میں اس استفادے کی نوعیت پر اظہارِ خیال کی کوئی گنجائش نہیں۔ البتہ "نکات الشعرا" کے مطالعے اور اس سے کسبِ فیض کی توثیق کے لیے دونوں تذکروں سے چند ہم مضمون عبارتیں یہاں نقل کی جاتی ہیں:

نکات الشعرا	طبقات الشعرا
مرزا مظہر	
"خوش تقریر مرتبہ است کہ در تحریر نمی گنجد" (ص ۵)	"خوش تقریر مرتبہ ایست کہ در تحریر نمی آید" (ص ۱۱)
آبرو	
"از ابتدائے جوانی در شاہجہاں آباد	"از ابتدائے جوانی در شاہجہاں آباد

آمدہ، چنانچہ مشقِ سخن ہم ایں جا کردہ۔ شاگردِ خاں صاحب سراج الدین علی خان است ..... مستثنیٰ وقتِ خود بود۔ در عہد محمد شاہ کہ عہد محمد شاہ باشد۔ خداش مغفرت کند۔" (ص ۹)

آمدہ مشقِ سخن بہم رسانیدہ۔ شاگردِ سراج الدین علی خاں آرزو ..... مستثنیٰ وقتِ خود بود۔ در عہد محمد شاہ ..... ازیں جہانِ فانی .... رفت۔ حق تعالیٰ مغفرتش کند۔" (ص ص ۲۴ و ۲۵)

حشمت

"سید صحیح النسب بود، سپاہی عمدۂ روزگار، شاعرِ خوب فارسی و ریختہ فہمیدہ و سنجیدہ ..... جنسے بود کہ در دلِ ہمہ کس جاے او خالی است .... در مغل پورہ سکونت داشت۔ برادرِ کلانِ او کہ میر ولایت اللہ خاں باشد از معتمناتِ روزگار است۔" (ص ۷۳)

"سید صحیح النسب، متواضع و خلیق کہ در دلِ ہر کس جاے او خالی است۔ عمدۂ روزگار، ساکنِ مغل پورہ۔ شاعرِ زبردستِ فارسی و ریختہ۔ بسیار سنجیدہ فہمیدہ۔ برادرِ کلانِ او میر ولایت اللہ خاں از معتمناتِ روزگار بود۔" (ص ۶۸)

عزلت

"خلف الصدقِ حضرت سید سعد اللہ قدس سرہٗ سورتی کہ مستبدِ عالمگیر بودند۔ درویش وضع، عالم فاضل، بزرگِ متوکل۔ مشقِ شعرِ فارسی ہم کردہ اند لیکن مزاج اوشان میلانِ ریختہ بسیار دارد۔ تازہ واردِ ہندوستان کہ عبارت از شاہجہان آباد است، شدہ اند .... از اسالیبِ کلامِ شان واضح می گردد کہ بہرۂ بسیارے از دردمندی دارند۔" (ص ۹۲)

"خلفِ رشید سید سعد اللہ سورتی قدس سرہ کہ مستند شاہ اورنگ زیب عالمگیر بود۔ درویشِ متوکل فاضلِ مستعد۔ اگرچہ مشقِ شعرِ فارسی زیادہ می کرد فاما مزاجِ او بطرفِ اشعارِ ریختہ مائل بسیار بود۔ در ہندوستان کہ عبارت است از شاہجہان آباد دہلی، نیز بطریقِ سیر آمدہ بود۔ سخن او خالی از دردمندی نیست۔" (ص ۱۵)

میر صاحب نے "نکات الشعرا" کو ریختہ کے مختلف اقسام کی تعریف و توضیح پر ختم کیا ہے۔ طبقات الشعرا کا خاتمہ بھی اسی موضوع سے متعلق ہے اور یہاں بھی نکات الشعرا سے کسبِ فیض کے اثرات واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ نکات الشعرا کا متعلقہ اقتباس اس سے قبل گذشتہ باب میں دو جگہ نقل کیا جا چکا ہے۔ طبقات الشعرا کی عبارت درج ذیل ہے:

"بدان کہ ریختہ بر چند اقسام است۔ اوّل آں کہ یک مصرع فارسی و یک ہندی۔ دوم آں کہ نیم مصرع فارسی و نیم ہندی و قسمِ ثالث کہ مناسبتِ تمام با کلمۂ ریختہ دارد، آں کہ کلمۂ فارسی و کلمۂ عربی و کلمۂ ہندی بود، فاما الفاظ مستعمل باید آورد و کلمہ عجیب و غریب نیارد۔ چنانچہ روزمرۂ ہندوستان کہ عبارت است از شاہجہان آباد و محاورۂ عوام و خواصِ آنجاست و ہمیں قسمِ ثالث در استعمال شعرائے ایں زماں مستحسن و معتبر است۔ اما شاعر ایں فن را ایں قدر امتیاز لابدی است، کہ از آوردنِ حروفِ مفردۂ فارسی بدوں متعلقِ آں در ریختہ اجتناب نماید۔ چنانچہ لفظِ "در" یا "بر" یا "از" وغیر ذالک و تراکیبے کہ موجبِ ثقلِ تلفظِ زبانی باشد، باز ماندن ازاں ہم ضرور بل واجب است اگرچہ مرکب از کلماتِ فصیح باشد و رعایت عیوبات شعر و اوزان و قوافی و ردیف وغیرہ کہ مفصل در رسالہ عروض مذکور است، البتہ شاعر ازاں خبردار خواہد شد پس دریں مختصر نوشتن فضولی است۔" (ص ۴۳)

بعض قرائن سے اندازہ ہوتا ہے کہ شوق نے اس تذکرے کی ترتیب میں "نکات الشعرا" اور "تذکرۂ ہندی" کے علاوہ کچھ اور تذکروں سے بھی مدد لی ہے۔ چنانچہ مرزا مظہر کے حالات علامہ غلام علی آزاد بلگرامی کے "سرو آزاد" سے ماخوذ معلوم ہوتے ہیں اور تذکرے کا اندازِ ترتیب "مخزنِ نکات" سے اثر پذیری کی نشان دہی کرتا ہے۔ محمد یار خاں امیر کی سرکار میں قائم کے ساتھ ان کی رفاقت و ہم نشینی کا حال اس سے پہلے ہی مصحفی کی وساطت سے ہمارے علم میں آچکا ہے۔ اس کے بعد تذکرے پر نظر ثانی سے قبل رام پور میں جو قائم (متوفی ۱۲۰۸ھ) کا مدفن بھی ہے، دوبارہ دونوں تذکرہ نگاروں کی ملاقات اور قدیم تعلقات

کی از سرِ نو استواری بھی خارج از امکان نہیں۔ مزید برآں بعض تذکرہ نگاروں نے شوق کو قائم کے تلامذہ میں شمار کیا ہے[1]۔ اس لیے "مخزنِ نکات" سے ان کی ناواقفیت بظاہر ناممکنات کا درجہ رکھتی ہے۔ لیکن ان تمام باتوں کے ساتھ ہی اس حقیقت کا اظہار بھی ضروری ہے کہ شوق پر اپنے مآخذ کے ذکر سے صرفِ نظر کے باوجود نہ تو گردیزی کی طرح تحقیق و تفحص کے بلند بانگ دعووں کے بعد تقلیدِ محض تک محدود رہنے کا الزام عاید کیا جا سکتا ہے اور نہ فتوت کی مانند کسی پیش رو تذکرہ نگار کے فراہم کردہ سرمایہ معلومات پر غاصبانہ تصرف کی فردِ جرم لگائی جا سکتی ہے، کیونکہ ان کے تذکرے کا دو تہائی حصہ ان معروف اور غیر معروف فن کاروں کے تعارف پر مشتمل ہے جو اس وقت تک کسی دوسرے تذکرہ نگار کے ہاں بار نہ پا سکے تھے۔ اس طرح ان کے تذکرے میں دوسروں کے خرمنِ فیض سے خوشہ چینی کا تناسب ناقابلِ لحاظ حد تک کم ہو گیا ہے۔

تذکروں کے علاوہ شوق نے شعرا سے براہِ راست ملاقاتوں، مختلف ادبی مراکز سے ترکِ وطن یا سیر و سیاحت کر کے آئے ہوئے دوستوں، خط و کتابت اور اسی قسم کے دیگر ذرائع و وسائل سے بھی حصولِ معلومات میں کافی مدد لی ہے۔ ہم عصر شاعروں کے احوال و اشعار کی تحقیق و دریافت کا یہی وہ بہترین اور مناسب طریقہ تھا جو انھوں نے اختیار کیا اور جس کی جامعیت و ہمہ گیری کا اندازہ درج ذیل مثالوں سے کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ شاہ حاتم۔ "بعضے آشنایان کہ الحال در دہلی از و ملاقی شدہ، چند غزل متفرقہ نوشتہ آوردہ بودند ..... بعضے ازاں تبحر برخواہد آمد۔" (ص ۴۸)

۲۔ برہان الدین عاصمی۔ "چند اشعارِ آن بزرگوار دریں روزگار بزبانی ..... سید معصوم طالب علم مانک پوری کہ در خانۂ شاعرِ مسطور مدتے بطریقِ نوکری ماندہ، بسمع رسیدہ۔" (ص ۱۰۹)

۳۔ میر تقی میر۔ "از غزلیات تازۂ اوست کہ بایں راقم الحروف نوشتہ۔" (ص ۲۲۱)

---

[1] گلشنِ بے خار طبع اوّل۔ ص ۲۱۵ و تذکرہ خوش معرکۂ زیبا (مولفہ سعادت خاں ناصر) جلد اوّل ص ۳۰

۴۔ محمد اکرم۔ "بزبانی پسرش کہ بلاقی نام ..... دارد، چند اشعار متفرقہ او بسمع رسیدہ۔" (ص ۲۴۲)

۵۔ علی محمد خندآں۔ "چند ابیات کہ بدستخط خاص مرقوم نمودہ بود، بتحریر می آید۔"
(ص ۳۲۸)

۶۔ میر حسن۔ "چند اشعار او بعضے احباب (از لکھنؤ) نقل کردہ آوردہ بودند، ازاں انتخاب نمودہ بتحریر (می) آید۔" (ص ۳۲۹)

۷۔ جلیل شاہ سائلؔ۔ "چند غزلیات بعد ملاقاتِ او از مسودہ اش بقلم آوردہ شد۔"
(ص ۳۵۹)

تذکرے کی ابتدا حضرت امیر خسرو کے ذکر سے ہوتی ہے۔ شوقؔ نے انھیں اردو شاعری کا "موجد" قرار دیا ہے اور ان کے تعارف سے قبل "ایجادِ شعر ریختہ" سے متعلق رائج الوقت روایات اور اس سلسلے میں اہلِ علم کے مختلف فیہ نقطہ ہائے نظر کی ان الفاظ میں نشان دہی کی ہے:

"باید دانست کہ ابتدائے انشائے فنِ ریختہ بعضے نسبت بشیخ سعدی شیرازی رحمۃ اللہ علیہ کردہ اند و بعضے بہ سعدیٔ دکھنی۔ امّا بہ تحقیق نمی پیوندد کہ کدام سعدی است۔ یک غزل بنامِ او مشہور است بتحریر خواہد آمد و اکثرے اتفاق دارند کہ موجدِ ایں فن امیر خسرو دہلوی ..... است ..... اکثر صنائع و بدائعِ آں بزرگوار مثل پہیلی و مکرنی و دوبولہ و چوبولہ و ریختہ و نسخۂ اعجاز خسروی و خالق باری و خمسہ و دیگر راگ و راگنی از تصانیفِ او بزبانِ ہندی و فارسی مشہور و متعارف اند، لہٰذا شروع بنامِ آں بزرگوار نمودہ شد۔" (ص ۴)

خسرو کے متعلق شوقؔ کا بیان ہے کہ

"اصلش از اویماقِ ہزارہ من بلادِ ترکستان و مولدش (تولدش) در سنہ احدی وخمسون وستمأۃ (۶۵۱ھ) در قصبہ پٹیالی مضافِ صوبہ دارالخلافہ اکبر آباد معمورۂ ہندوستان۔ و بعضے برآنند کہ در سنِ سہ سالگی ہمراہِ والدین خود از ولایت بہ ہندوستان

آمدہ۔ پدرش امیر محمود در عہدِ سلطنت سلطان ناصر الدین بدرجۂ امارت رسیدہ بود۔ بعدِ وفاتِ پدرش ہمان منصب بروے مقرر و مفوض گشتہ۔ بعد انقضاے چند ایام آن فرید الدہر، وحید العصر، خسروِ ولایتِ سخنوری، مخزنِ اسرارِ الٰہی، مطلعِ انوار نامتناہی، ترکِ روزگار نمودہ و چندلک جنس و نقد در راہِ الٰہی صرف نمودہ انزوا اختیار نمود و از فیضِ صحبتِ شیخ المشائخ، امام الاتقیا، نظام الدین اولیا نور اللہ مضجعہٗ و مرقدہٗ باایں کمالِ فضل و بلاغتِ ظاہری و دانش و بینشِ صوری صفاے قلبی و مکاشفۂ باطنی حاصل نمود۔ از اعاظم مستعدان و اکابرِ عالی فطرتانِ جہاں بود۔ فضائل او از دائرۂ امکاں و طاقتِ انساں خارج است۔" (ص ص ۴ و ۵)

"طبقات الشعرا" میں علی العموم حالات نویسی کا یہ انداز نہیں ملتا اور نہ خسرو کے علاوہ کسی دوسرے شاعر کا سالِ پیدائش یا زمانۂ وفات ہی اس تذکرے میں مذکور ہے۔ پھر بھی نصف سے زائد شعرا کے ذکر میں زندگی کے چیدہ چیدہ واقعات نقل کر کے شوق نے کسی حد تک اس تشنگی اور اختصار کی تلافی کر دی ہے، جو ابتدائی دور کے تذکروں کا ایک نمایاں اور مشترک نقص ہے۔ دکن میں شفیق اورنگ آبادی ان سے بہت پہلے التزامِ سنین کے ساتھ بعض شاعروں کی رودادِ حیات قلم بند کر کے تذکرہ نگاری کے فن کو ایک نئی جہت سے آشنا کر چکے تھے لیکن شمالی ہند میں اس وقت تک ایسا کوئی تذکرہ معرضِ وجود میں نہیں آیا تھا جس کے مولف کی نظر روایات کے دھندلکوں سے پرے کسی جہانِ تازہ کی دریافت اور وسیع تر دائرہ کار کی تلاش میں سرگرم عمل رہی ہو۔ اس اعتبار سے تعارف کا یہ نسبتاً بدلا ہوا انداز "طبقات الشعرا" کو شعراے اردو کے تذکروں کے درمیان ایک امتیازی حیثیت عطا کرتا ہے۔ مثال کے لیے درجِ ذیل اقتباسات ملاحظہ ہوں:

مسکینؔ۔ "مردے بود صاحبِ درد و مسکین وضع محبتِ اولادِ نبی و آلِ علی در دلِ خود بدرجۂ کمال داشت۔ تمام عمرِ خود در تصنیفِ مرثیۂ امام حسنؓ و امام حسینؓ ..... صرف نمود و بوقت مرگِ خود یک صندوقچہ پُر از مسوداتِ مرثیہ بجاے ترکہ گذاشت و بورثہ (ورثا) خود وصیت نمود کہ ہر سال یک پرچہ

کاغذِ جدید ازیں ہا بر آوردہ در ایامِ عاشورہ رواج دہند۔ چنانچہ اکثر مرثیہ ہائے او در ایام محرم الحرام خواص و عوام بالحنِ خوش و صوتِ حسن در ماتم امامینِ ہمامین ۔۔۔۔ می خوانند و خاک مذلّت در دیدہ اعدا می اندازند۔" (ص ص ۹۲ و ۹۳)

قلندرؔ ۔ "قوم کھتری، متوطن دہلی۔ جوانے بود قابل و خوبصورت، آزاد سیرت ۔ حوصلۂ عالی و وضع لاابالی داشت۔ ہرچند عمدۂ روزگار بود، اما محبتِ ہر دو جہاں را پس پشت داد و قریب دو لکھ نقد و جنس در یک لحہ یک مشت تصرف نمودہ در فرقۂ نانک پنتھی فقیر شد و اصلا بریں مال و منال التفاتے ننمود چنانچہ مقولۂ اوست:

دو جہاں ایک داؤ ہے میرا کھیلتا ہوں قمار آنکھوں میں

لباسِ آزادی را در بر کرد (می گر) دید و تماشائے نیرنگی گردشِ دور و دورانِ چرخ رفتار از دیدۂ عبرت بیں می نمود و اصلا لب شکوہ و شکایت و طمع پیشِ کسے نمی کشود۔ بعضے اعزّہ کہ احوالاتِ او نقل می کردند چنیں تعجب روے می داد کہ از انسان ایں چنیں کارہا بوقوع آمدن ممکن نباشد۔ مثلاً بعض وقت در دل او می آمد کہ طعام نباید خورد ہفتہ دو ہفتہ بیست روز تا یک ماہ علی الاتصال گرسنہ می ماند و ہرگز کسے معلوم نمی کرد۔ عجب مردِ دیوانہ بود چنانچہ خود می گوید:

وہ سکھ کہ جس کے واسطے دکھ سے مریں ہیں لوگ
میں اس کو اپنے نفس پہ دھر کر اُڑا دیا

ایں شعرِ قلندرانہ دال بر آزادی و بے پروائیِ اوست۔ از چند سال در بلدۂ بریلی آمدہ اقامت گرفتہ بود۔ چوں اجلش نزدیک رسیدہ، دفعۃً بیماریٔ شدید کشید۔ در حالتِ نزع از صاحبِ خانہ گفت کہ چہار پائی ما در کسے وادی بنہید، شاید کہ ایں طائرِ روح ازیں قفسِ تن پرواز نماید۔ و ایں قالبِ خاکی بارِ دوشِ کے نشود آشنایان ہرچند منع نمودند، اصلا لبِ اجابت نکشود۔ لاچار نعشِ او در وادی نہادند، آخر ہماں جا در گذشت۔ فکرِ صائب و ذہن مناسب داشت بعد وفات او مسودہ اش ہولاس رائے رنگینؔ ۔۔۔۔۔۔ جمع نمودہ نزدِ خود نگاہ داشتہ۔ دیوانش از نظرِ

ایں عاصی گذشتہ۔" (ص ص ۲۵۷ و ۲۵۸)

فدوی لاہوری: "فیض اللہ بیگ فدوی ساکنِ ضلع پنجاب۔ مردے بود ذوموئے آبلہ روئے، زیادہ گوئے، جنگ جوئے، نوکری پیشہ، بے اندیشہ، مائل برفض۔ گزافِ لایعنی و سخنانِ بے معنی پیشِ ہر کس می گفت و باوجودِ، ہیچ مدانی خود را ہمہ داں می شمرد۔ بموجبِ مقولۂ کسے:

ہر کس کہ نداند و بداند کہ بداند در جہلِ مرکب ابدالدہر بماند

بسبب سخنانِ بیہودہ با کسے صحبتِ برآرنمی شد۔ قریب دو ماہ شد کہ از بیماریٔ تپ و لرزہ در بریلی فوت شد۔ با ایں راقم در قصبۂ آنولہ یک دو ملاقات شدہ بود۔ اکثر غزلیاتِ قطعہ بندِ او بنظرِ ایں مولف گذشتہ شعرا بوضعِ خود تراشی بطورِ شاہنامہ بہ آواز کرخت می خواند۔ سامعانِ نافہم لبِ تحسین و آفریں می کشودند۔ غرۂ شاعری در دلِ خود چناں داشت کہ خود را زیادہ از خود می پنداشت۔ بعضے اعزہ در مرض الموت برائے ملاقاتِ او رفتہ بودند، بمجرد ملاقات گفت کہ یاراں بشنوید، دریں روزہا چہ مطلع تازہ موزوں کردہ ام:

پہلو میں اپنے درد اٹھا دل کے متصل
بیٹھا رقیب ساتھ جو وہ مل کے متصل

طبعِ موزوں و مناسب داشت۔ قصۂ یوسف زلیخا را در زبانِ ریختہ بوجہ احسن بستہ۔" (ص ص ۲۷۴ و ۲۷۵)

حالات کے بیان میں تفصیل و وضاحت کی اس بنیاد گزاری کے ساتھ ہی شوق نے شخصیت کے خط و خال کی عکاسی میں بھی فن کارانہ مہارت و مشاقی کا ثبوت دیا ہے۔ الفاظ کے ذریعے پیکر تراشی کا یہ عمل جس چابک دستی، خوش سلیقگی اور امعانِ نظر کا طالب ہے، وہ اس سے واقف بھی ہیں اور بہرہ یاب بھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے تیار کیے ہوئے مرقعے ایک ماہرِ فن بُت ساز کے مجسموں اور آزمودہ کار مصوّر کی تصویروں کی طرح اہلِ نظر کو اپنا گرویدہ بنا لیتے ہیں۔ اس سلسلے میں عبدالحئی تاباںؔ کے بارے میں

ان کا یہ بیان بطورِ خاص ملاحظہ طلب ہے :

"جوانے بود وجیہ و شکیل و در حسن و خوبی بے تمثیل۔ ہمانا حورے بود در لباسِ انسانی یا فرشتۂ از عالمِ نورانی۔ خندہ رو، کشادہ پیشانی کہ چشمِ بیننده را از و مانندِ آئینہ سراسر حیرانی و پریشانی رومی داد و شنونده بکمالِ استیلائے آتشِ شوقِ دیدار متاع خرد و ہوش بر باد می ساخت بسیار ..... خوش لباس و خوش پوشاک، جامۂ زیب و دل فریب بود ..... تا حال در فرقۂ شعرا ہم چو شاعر خوش ظاہر محبوبِ خوش اسلوب در لطافت و خوبی و حسن و نزاکت و خوش اسلوبی از کتمِ عدم پائے بمعورۂ وجود ننہادہ۔" (ص ۹۵)

اہلِ علم کی تعظیم و تکریم اور اربابِ فضل و کمال کی قدر شناسی مشرقی تہذیب کے آداب میں داخل رہی ہے۔ اس روایت کے اتباع میں تذکرہ نگاروں نے بھی بالعموم بڑی فراخ دلی کے ساتھ ان فن کاروں کے ذاتی اوصاف و محاسن کا اعتراف کیا ہے جنھیں اپنی گراں قدر خدمات کے صلے میں کاروانِ شعر و ادب کی رہبری کا اعزاز حاصل ہو چکا تھا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ بعض لوگوں نے اظہارِ مطالب کے لیے سادگی و سلاست کی راہ اپنائی ہے اور بعض لفظوں کی طلسم بندی میں اُلجھ کر رہ گئے ہیں۔ شوق پہلے گروہ سے تعلق رکھتے ہیں چنانچہ ان کے ہاں نہ تو مبالغے کی کثرت ہے اور نہ انھوں نے غیر ضروری الفاظ ہی سے اپنی تحریر کو بوجھل کیا ہے۔ کام کی زبان میں کام کی بات کرنے کا یہ انداز قاری کو مطمئن بھی کرتا ہے اور متاثر بھی۔ مندرجہ ذیل مثالوں سے اس خصوصیت کا اندازہ ہوگا۔

مرزا مظہر : "زبدۃ العارفین قدوۃ الواصلین، واقفِ رموزِ جناب اکبر، کاشفِ کنوزِ طریقِ پیغمبر، مرزا مظہر جانِ جاناں متخلص بہ مظہر مردیست فرشتہ صفت ..... درویش صاحبِ حال، باکمال، خوش مقال۔ مرجع و مستندِ عالم، معزز و مکرم، عالمِ متبحر و نحریر، فاضلِ مستعد و بے نظیر، خوش گو و خوش تقریر ..... در شاہجہان آباد دہلی کہ منتخبِ ہفت اقلیم بود، ہم چو او شخصِ خوش قماش نازک طبع برنخاستہ۔" (ص ۶۱)

خان آرزو:

"ملک الشعرائے ہندوستان ..... صاحبِ طبع وقت آفریں پایہ سخنوری و سخن فہمی و محاورہ دانی را بدرجۂ کمال رسانیدہ بود۔ از فصحائے زمانہ واستادِ یگانہ بود۔ در تمام خطۂ ہند ہم چو او شاعرِ پرگو، پرزور و خوش گو قادرِ سخن بایں فضل و کمال پیدا نشدہ۔ حاصل کمالاتِ او از حیزِ تحریر و تقریر بیروں۔ اکثر استادانِ فارسی و ریختہ از تلامذہ اویند۔" (ص ۶۴)

مرزا سودا:

"مرد یست بسیار سنجیدہ و فہمیدہ ..... بجمیع صفات انسانی موصوف و در سفتنِ لآلیٔ آبدار مشہور و معروف۔ امروز در ہندوستانِ جنت نشان کوسِ رستمی می نوازد و دادِ سخن وری و خوش خیالی می دہد۔ ہر بیتش وردِ زبانِ سخنوراں و لوحِ دیوانش محرابِ سجودِ معنی گستراں۔ در فنونِ انواعِ سخن سنجی طاق و بجمیع کمالاتِ سخنوری شہرۂ آفاق ..... در قیافہ دانی نہایت رسا و قابل و در فنِ موسیقی استادِ کامل۔ اگرچہ تحریرِ کمالاتش خارج از دائرۂ گفتگوست فاما بسیار پرگو و خوش گوست ..... از مغتنماتِ روزگاراست۔" (مخطوطۂ اعظم گڑھ ص ۱۱۵)

میر تقی میر:

"از اعاظم مستعدان و اکابرِ عالی فطرتانِ زمانِ خوداست۔ شاعرِ پرمغز و ہمہ دان استادِ ہم چشمان۔ اکثر سخن طرازان و معنی یاباں محاورات و روزمراتِ ایں فن از ایشان اخذ نمودہ۔ از مغتنمات زمانہ واستادِ یگانہ، شہسوارِ سمندِ عرصۂ فصاحت، فارسِ مضمارِ بلاغت، مجمعِ قابلیت، صاحب طبع و خوش فکر، ..... متلاشیٔ مضامینِ رنگیں، متجسسِ الفاظِ چرب و شیریں ....." (ص ۲۰۶)

اپنے عہد کے جن شاعروں سے شوق کے دوستانہ تعلقات تھے یا جن لوگوں سے انھیں بربنائے اتفاق کسی نجی یا ادبی صحبت میں ملاقات اور تبادلۂ خیال کے مواقع حاصل ہوئے تھے، ان کے ذکر میں انھوں نے ان کے مزاج و طبیعت، عادات و خصائل اور

وضع قطع کے بارے میں اظہارِ خیال کو بھی خاص اہمیت دی ہے اور مختصر مگر جامع الفاظ میں اس خوبی کے ساتھ ان پہلوؤں کا احاطہ کیا ہے کہ پڑھنے والے کو کوئی تشنگی محسوس نہیں ہوتی۔ درج ذیل مثالیں اسی ضمن میں آتی ہیں۔

سید عبدالرشید مارہروی۔ "جوانے بود جامع کمالاتِ انسانی ..... در فرقۂ علمار چنیں شخص در عرصۂ وجود نیامدہ و ندیدہ بلکہ گوشِ کسے نشنیدہ۔ مجمع ہنر و اخلاق و در استقامتِ عقل و ظرافتِ طبع یکتا و طاق۔ خاطرش بہ طرفِ لطیفہ گوئی بسیار مائل و لطیفہ اش بر السنۂ عوام و خواص متداول۔" (ص ص ۹۴ و ۹۵)

قائم چاند پوری۔ "بسیار آدمِ بامزہ و اہلِ درد متواضع، خلیق، مہذب صورت، پاکیزہ سیرت نہایت پرگو و خوش مقال ..... از خوش خیالانِ زماں و بلند فطرتانِ جہاں ..... فضائل او از حیزِ تحریر بیرون است۔" (ص ۱۸۲)

فضلِ علی ممتاز۔ "جوانِ خوش عنوان ..... طبعِ سلیم و جولاں داشت ..... بجمیع فضائلِ انسانی موصوف و مستثنیٰ ..... مردے بود جاں باز، صاحبِ امتیاز و در ہم چشمانِ خود ممتاز۔ ایں راقم الحروف نیز در آنولہ واقفِ راز و نیاز او شدہ بود۔ بسیار بتواضع و مدارا پیش می آمد۔" (ص ۲۵۰)

مراد علی حیرت۔ "جوانے بود قابل، درویش سیرت۔ آزادانہ مزاج، خوش تقریر و دردمند، متواضع و خلیق۔" (ص ۲۵۳)

اکرام اللہ محشر۔ "جوانیست قابل، سعادت مند، خوش خصال، پسندیدہ افعال ..... پاکیزہ سیرت، خلیق، آشنا پرست ..... مزاج آزادانہ و در بیگانگی ایں جہانِ فانی یگانہ۔ طبع سلیم و ذہن مستقیم دارد۔" (ص ۲۶۲)

جوانِ قابل، ہشاش و بشاش، حریفِ ظریف، خوش خلق و خوش خو۔" (ص ۵۵۹)

شوق کے ہاں تنقیدِ کلام کا عنصر نسبتاً کم ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے تمام شاعروں کو ان کے زمانے اور مراتب کے فرق نیز سن و سال کے اعتبار سے مختلف طبقات میں تقسیم کر کے اپنے نزدیک فرداً فرداً ہر شخص کے نتائجِ فکر کے بارے میں اظہارِ خیال کی گنجائش ہی نہیں چھوڑی ہے۔ طبقۂ اوّل میں ان شاعروں کا ذکر ہے جو ہماری روایاتِ شعری کے بنیاد گزاروں میں شمار کیے جاتے ہیں اور جن کا کلام تکلفات سے عاری اور سادگی و سلاست کا مظہر ہے۔ طبقۂ ثانی ایہام پسند شاعروں کے ذکر پر مشتمل ہے۔ اس کی ابتدا ان الفاظ سے ہوتی ہے:

"بعد از طبقۂ شاعرانِ دکن کہ معاصرِ ولی بودند، رواج ایہام بسیار شد و ایہام عبارت است از لفظے کہ دو معنی داشتہ باشد۔ قریب و بعید۔ بعید منظورِ شاعر باشد و قریب متروکِ او۔" (ص ۲۴)

طبقۂ ثالث اگرچہ بلحاظِ عنوان صرف "شعرائے متاخرین و بعضے نومشقانِ دیگر" سے متعلق ہے، لیکن درحقیقت اس کے ذیل میں ان شعرا کے حالات و کلام کو جگہ دی گئی ہے جنھوں نے ایہام گوئی کو قابلِ ترک قرار دے کر صاف و سادہ اور شستہ و رفتہ زبان میں فکرِ سخن کی طرح ڈالی اور جن کے شیوۂ گفتار کی بدولت صنف غزل کو وہ مقبولیت اور توانائی حاصل ہوئی کہ فکر و نظر کی تمام تبدیلیوں کے باوجود اس کی دلبری اور دلکشی آج بھی برقرار ہے۔ اس طبقے کے آغاز میں مولف نے یہ خیال ظاہر کر کے کہ

"اوّل کسے کہ طرزِ ایہام گوئی ترک نمودہ و ریختہ را در زبانِ اردوے معلیٰ شاہجہان آباد کہ الحال پسندِ خاطرِ عوام و خواصِ وقت گردیدہ، مروج ساختہ ..... مرزا جان جاں متخلص بہ مظہر ..... است۔" (ص ۶۱)

مجملاً یہی بات کہنا چاہی ہے کہ مرزا صاحب اس طرزِ جدید کے بانی ہیں اور ان کے ساتھ شامل کیے جانے والے دوسرے شاعران کے رفقا یا متبعین کے ذیل میں آتے ہیں۔

طبقۂ چہارم کی ترتیب بھی مولف کی ذہانت اور بالغ نظری کی آئینہ دار ہے۔ اس طبقے کے تحت مقالۂ اوّل میں "تازہ گویانِ سرآمدِ روزگار" کے عنوان سے ان شاعروں

کا ذکر ہے جو اس وقت تک شہرت و کمال کے نقطۂ عروج تک پہنچ چکے تھے۔ اس کے بعد کے مقالات علی الترتیب اس زمانے کے سلاطین و وزرا اور ان کے مصاحبین و اعیانِ سلطنت، رام پور اور قرب و جوار کے افغان امرا اور ان کے متعلقین و متوسلین، مولف کے ہمدم و ثابت قدم عزیزوں اور دوستوں اور نو مشق و کم حیثیت احباب و معاصرین کے علٰحدہ علٰحدہ ذکر پر مشتمل ہیں۔ یہ تفریق فرداً فرداً اس غیر جانبدارانہ اظہارِ رائے سے صرفِ نظر کا جواز پیدا کرتی ہے جس کی راہ میں پاس ادب، خاندانی تعلقات، ذاتی مراسم، حوصلہ شکنی کے اندیشے اور اسی قسم کے دوسرے عوامل قدم قدم پر مولف کو آزمائش میں مبتلا کرتے رہتے ہیں۔ اس کے باوجود شوق کے ہاں جا بجا انفرادی تنقید کے ایسے نمونے موجود ہیں جن کی روشنی میں متعلقہ شاعروں کے کلام کی بعض نمایاں خصوصیات پوری طرح سامنے آجاتی ہیں۔ مثلاً:

سجاد اکبر آبادی۔ "بسیار خوش گو، نزاکت بند ..... سلیقہ اش درست و رسا و استوار از ہر فردش رتبۂ شاعری نمودار۔ سخنانِ دل فریبش بس شیریں و خوش گوار۔" (ص ۳۹)

شاہ حاتم۔ "دیوانِ قدیم او از نظر ایں مولف گذشتہ۔ بطرزِ آبرو و ناجی حرف می زند۔ اکثر اشعارش از لطفِ شاعری خالی یافتم۔" (ص ۸۴)

انعام اللہ خاں یقین۔ "مشقِ سخن او بپایۂ استادی رسیدہ بود ..... ہر قدر کہ دیوانش مرتب است، ہمہ انتخاب واز در د خالی نیست۔" (ص ۷۶)

محمد حسین کلیم۔ "فکر ہایش ہمہ تلاشی و الفاظش مزین بخوش قماشی۔ طرزش بطرزِ کسے مانا نیست۔" (ص ص ۱۷۹ و ۱۸۰)

میر تقی میر۔ "متلاشیٔ مضامینِ رنگین، متجسسِ الفاظِ چرب و شیریں۔ ہر چند سادہ گوست اما در سادہ گوئی تہ داری و پر کاریٔ او ظاہر و نمودار است۔" (ص ۲۰۶)

بعض شعرا کے حالات میں ان کے کلام کے متعلق اختصار کے ساتھ ایسی رائیں

ظاہر کر دی ہیں جن سے ان کی مجموعی کیفیت کا اندازہ ہو جاتا ہے چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

عبدالولی عزلت سورتی۔ "سخنِ او خالی از دردمندی نیست" (ص ۱۵)

سراج اورنگ آبادی۔ "سخنِ او خالی از دردمندی نیست" (ص ۲۳)

مصطفیٰ خاں یکرنگ۔ "ہر چند پرگو فاما بسیار پوچ گوست" (ص ۳۶)

سعادت امروہوی۔ "ہر چند کم گو بود فاما اشعارش از لطفِ شاعری خالی نیست"

(ص ۳۸)

مراد علی حیرت۔ "ہر چند کم گو و کم مشق بود فاما مذاقِ سخنش کم از مرتبۂ استادان نیست" (ص ۲۵۳)

امیرالدین امیر بدایونی۔ "اگرچہ کم گوست فاما بسیار خوش گو۔ مشقِ سخن او بدرجۂ استاداں رسیدہ" (ص ۲۷۱)

تنقید کے اسی سلسلے میں شوق نے کہیں کہیں اشعار کے لفظی و معنوی نقائص کی بھی گرفت کی ہے اور بعض جگہ متبادل اور مناسب تر الفاظ بھی تجویز کیے ہیں لیکن اس قسم کی تنقید میں ان کی نظر ان بلندیوں تک رسائی میں ناکام رہی ہے، جہاں میر کی نگاہِ نکتہ رس اپنا جادو جگاتی ہے اور جہاں ایک عام فن کار اور ماہرِ فن یا مقلد اور مجتہد کے مرتبہ و مقام کا فرق ظاہر ہوتا ہے۔ درجِ ذیل مثالوں سے ان کے اعتراضات اور اصلاحوں کی نوعیت کا اندازہ ہو گا۔

(الف) ولی دکنی کا ایک شعر ہے ؎

شب تیری زلفِ سیتی مطول کی بحث تھی
تیرے دہن کو دیکھ سخن مختصر کیا

شوق لکھتے ہیں:

"ہر چند دریں فرد تناسباتِ شاعری بوجہ احسن جمع نمودہ فاما از دل شکنی زلف پریشانیٔ تمام روے می دہد۔ پس ازیں جاست کہ الانسان مرکب من السہو والنسیان شاید کہ از پریشانیٔ خاطر چنیں خطا کہ بوے آں تا بہ حنین رسیدہ از خاطرِ

پریشانِ او راہ یافتہ والا ایں قدر غلطی فاش از چنیں اشخاص چہ معنی دارد۔" (ص ۲۵۵)

(ب) قائم چاندپوری کی ایک غزل کا مقطع ہے:

قائم کو اس طرح سے تو دیتا ہے گالیاں
جس کو کسی نے آج تلک تو نہیں کیا

شوق کہتے ہیں کہ:

"بزعم ایں نافہم اگر بجائے لفظ "کیا" کہ ردیف است لفظ "کہا" باشد موافقِ محاورہ درست می نشست والا نہ، غلطی است چرا کہ "کیا" فعل و کلمہ "تو" قول (است) و فعل را بر قول اطلاق نمی کنند۔" (ص ۱۸۶)

(ج) جعفر علی حسرت کا ایک مطلع ہے:

تجھ کو ہے گر قتل کی چاہ — حاضر ہوں میں بسم اللہ

شوق کا خیال ہے:

"برائے رعایتِ "بسم اللہ" لفظ "ذبح" بجائے "قتل" بہتر است۔" (ص ۲۹۶)

(د) مرزا رفیع سودا کا ایک مطلع ہے:

عاشق تو نامراد ہیں پر اس قدر کہ ہم
دل کو گنوا کے بیٹھ رہے صبر کر کے ہم

شوق لکھتے ہیں کہ:

"اگرچہ قافیۂ مصرعۂ اخیر در ظاہر مائل بہ نقصان است چرا کہ مدارِ قافیہ در تمام غزل بر کافِ بیانیہ است دریں مصرعہ کاف مرکب بیاست فاما در تلفظ یکسان است۔ شاید کہ شاعرِ مذکور بہمیں لحاظ جائز داشت۔" (ص ۱۲۶)

جیسا کہ ان مثالوں سے ظاہر ہے، شوق کے یہاں تنقیدی شعور کے معاملے میں اس خود اعتمادی اور وثوق کی کمی محسوس ہوتی ہے جو کسی غلط بات کو بلا خوفِ تردید غلط کہنے کی جرأت عطا کرتا ہے، ورنہ وہ سودا کے منقولۂ بالا شعر پر تبصرہ کرتے ہوئے تاویل کا انداز اختیار نہ کرتے۔

انتخابِ کلام میں شوق نے تنوع اور رنگا رنگی کا خاص خیال رکھا ہے۔ اگرچہ ان سے قبل کے تذکرہ نگار بھی کسی ایسے اصول کے پابند نہیں کہ نمونۂ کلام کے تحت صرف غزلوں ہی کے اشعار پیش کیے جائیں پھر بھی ان کے ہاں دوسری اصنافِ سخن کو صرف برائے نام نمایندگی ملی ہے۔ اس کے برخلاف "طبقات الشعرا" میں اس قسم کی مثالیں بکثرت موجود ہیں جہاں خصوصیت کے ساتھ ان اصناف کے نمونے بھی پیش کیے گئے ہیں جو بطورِ خاص کسی شاعر کا مرکزِ توجہ رہی ہیں۔ مثال کے طور پر سوداؔ کے کلام میں ان کے سولہ قصیدوں اور تین مثنویوں کے انتخابات بھی شامل ہیں۔ مشہور مرثیہ گو میاں مسکینؔ کے نمونۂ کلام کے ذیل میں صرف ایک مرثیہ کے کچھ اشعار نقل کیے ہیں اور اس کے ساتھ یہ صراحت بھی کر دی ہے کہ

"از معاصرینِ او دیگر مرثیہ گو مثل گدا و سکندر وغیرہ بسیار ند۔ چوں در شاعری مرثیہ غلطیٔ الفاظ بسیار یافتم لہٰذا دریں مختصر درج ننمودم۔" (ص ۹۴)

اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شوق نے شاعر کی خصوصی دل چسپی کے پہلو بہ پہلو تخلیقات کے فنی معیار کو بھی مدِ نظر رکھا ہے۔ البتہ بعض ایسے شاعروں کے ذکر میں جنھوں نے ہجو نگاری اور ہزل گوئی کو اپنا شعار بنایا اور تہذیب و شائستگی کے تمام تقاضوں کو بالائے طاق رکھ کر ان اصناف کے مطالبے پورے کیے، انھوں نے وہ اشعار بھی نقل کر دیے ہیں جن کا ایک ایک لفظ رکاکت و ابتذال میں ڈوبا ہوا ہے۔ لیکن یہ بے راہ روی اس زمانے کے ادبی مذاق کے خلاف نہ تھی، اس لیے شوق کے اس انتخاب پر حرف گیری کی گنجائش کم ہی نکلتی ہے۔

"طبقات الشعرا" کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وسعت و جامعیت کے باوجود اس میں واقعاتی و انتسابی غلطیاں تقریباً نہ ہونے کے برابر ہیں، تاہم چند ایسے مقامات کی طرف جہاں مولف کی لغزشِ قلم قابلِ گرفت معلوم ہوتی ہے، اشارہ ضروری ہے

(الف) میر ضیاء الدین ضیاؔ دہلوی (نسخۂ اعظم گڑھ) اور میر ضیاؔ دہلوی استادِ میر حسنؔ (ایضاً نسخۂ اعظم گڑھ و نسخۂ مطبوعہ ص ۳۲۷) کو اس تذکرے میں دو مختلف شاعروں

کی حیثیت سے روشناس کرایا گیا ہے[۱]، حالانکہ ان دونوں میں کوئی فرق نہیں[۲]۔

(ب) امان اللہ نثار دہلوی کے حالات و اشعار بھی نسخۂ آصفیہ میں تھوڑے سے فرق کے ساتھ دو جگہ نقل کیے گئے تھے (ورق ۱۶۱ ب و ورق ۱۶۹ ب) نسخۂ مطبوعہ میں مرتب نے پہلے ترجمے کو حذف کر کے اس کے تحت منقول اشعار دوسرے ترجمے میں شامل کر دیے ہیں۔ (ص ۳۷۱)

(ج) حزیں شاگردِ مرزا مظہر کا ذکر شوق نے محمد علی کے نام سے کیا ہے (ص ۹۰) دراصل ان کا نام میر محمد باقر ہے[۳]۔

دو تین مقامات پر ایسا بھی ہوا ہے کہ ایک شاعر کا کلام غلطی سے دوسرے شاعر سے منسوب کر دیا گیا ہے مثلاً مندرجہ ذیل شعر مرزا مظہر جاں جاناں کے نام سے نقل کیا گیا ہے:

نکالا باغ سے صیاد نے یوں ہم کو یا قسمت
لکھا یوں تھا کہ فصلِ گل میں چھوڑیں آشیاں اپنا (ص ۶۳)

گردیزی، شفیق، میر غلام حسین شورش، علی ابراہیم خلیل اور مرزا علی لطف نے مصرع اوّل کے فرق (یہ کہہ کر باغ سے رخصت ہوئی بلبل کہ یا قسمت) کے ساتھ اسے میر محمد باقر حزیں شاگرد مظہر کے کلام میں شامل کیا ہے[۴] اور یہی صحیح بھی معلوم ہوتا ہے۔

مرزا عظیم بیگ عظیم کے یہ دو اشعار گنا بیگم کے انتخاب کلام میں شامل ہیں[۵]۔

آکر ہماری خاک پہ کیا یار کر چلے — خوابِ عدم سے فتنے کو بیدار کر چلے

---

[۱] نسخۂ آصفیہ کے وہ اوراق جن میں میر ضیاء الدین ضیا دہلوی کا ذکر تھا، ضائع ہو چکے ہیں۔

[۲] تفصیل کے لیے دیکھیے "تذکرہ شعرائے اردو" طبع ثانی ص ۱۰۰ و "دو تذکرے" جلد دوم ص ص ۴۰ و ۴۱

[۳] "نکات الشعرا" طبع ثانی ص ۱۰۶، مخزنِ نکات ص ۵۱، تذکرۂ شورش۔ دو تذکرے جلد اول ص ۲۲۱

[۴] تذکرۂ ریختہ گویاں ص ۳۷، چمنستانِ شعرا ص ...، تذکرۂ شورش۔ دو تذکرے جلد اوّل ص ۲۲۱، گلزارِ ابراہیم ص ۸۶ و گلشنِ ہند (طبعِ ثانی) ص ۱۰۵

[۵] عظیم کی ملکیت کے لیے دیکھیے مجموعہ نغز جلد دوم ص ۱۰ و تذکرہ شعرائے اردو ص ص ۱۰۹ و ۱۱۰

جاتے تو ہو بھرے ہوئے گرد و غبار میں　　تعمیر کس کے دل کی یہ مسمار کر چلے

(ص ۴۰۵)

کہیں کہیں "طبقات الشعرا" کی لسانی و بیانی خامیاں بھی انگشت نمائی کے مواقع فراہم کرتی ہیں لیکن اس خیال کے پیشِ نظر کہ فارسی شوقؔ کی مادری زبان نہ تھی اور کسی غیر ملکی زبان پر حاکمانہ قدرت حاصل کر لینا ہر شخص کے بس کی بات نہیں، ثانوی اہمیت کی دوسری خامیوں کے ساتھ تحریر کے اس نقص کو بھی نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ شوقؔ نے یہ تذکرہ ترتیب دے کر اس صنف کے سرمائے میں ایک اہم اور قابلِ قدر اضافہ کیا ہے جس سے شمالی ہند میں ایک نئے دور کی ابتدا بھی ہوتی ہے اور پہلی بار اردو شاعری کے ہمہ گیر اور ترقی پذیر نفوذ و اثر کا بھی پتا چلتا ہے۔

تذکرۂ شعرائے اردو

شعرائے اردو کے ان تذکروں میں جن کے مولفین اردو کے ممتاز سخنوروں میں شمار کیے جاتے ہیں، میر حسن (متوفی غرہ محرم ۱۲۰۱ھ مطابق ۲۴ر اکتوبر ۱۷۸۶ء) کا تذکرہ کافی اہمیت رکھتا ہے۔ انجمن ترقیٔ اردو (ہند) کی جانب سے ۱۹۲۲ء اور ۱۹۴۰ء میں اس تذکرے کے دو ایڈیشن "بہ تصحیح و تنقیدِ جناب مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی" شائع ہو چکے ہیں۔ اگرچہ سرورق کے اندراج کے مطابق ان دونوں ایڈیشنوں کا مرتب شروانی صاحب ہی کو خیال کیا جاتا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ اشاعت ثانی کے اصل مرتب قاضی عبدالودود ہیں۔ پروفیسر مختار الدین احمد اس سلسلے کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"قاضی صاحب نے انجمن کے لیے میر حسن کا تذکرہ کئی قلمی نسخوں کی مدد سے از سر نو مرتب کیا۔ اس کی کاپیوں کی تصحیح کی اور تذکرے کا متن لطیفی پریس، دہلی سے چھپ گیا، لیکن مقدمہ و تعلیقات کے لکھنے اور بھیجنے میں حسب معمول انھوں نے اس قدر تاخیر کی کہ مولوی (عبدالحق) صاحب کو لکھنا پڑا کہ آپ نے مقدمہ جلد نہ بھیجا تو کتاب آپ کے مقدمے کے بغیر شائع کر دی جائے گی۔ قاضی صاحب ایسے معاملات میں بڑے ذکی الحس بلکہ زود رنج واقع ہوئے تھے۔ انھوں نے ناراض ہو کر لکھا: "بہتر ہے، شائع کر دیجیے۔" چنانچہ مولوی صاحب نے صدر یار جنگ کا ۱۹۴۱ء (کذا = ۱۹۲۲ء) کا لکھا ہوا پرانا مقدمہ جو تذکرے کی پہلی اشاعت میں تھا، اس دوسری اشاعت میں شامل کر کے کتاب ۱۹۴۸ء (کذا = ۱۹۴۲ء)

میں چھاپ دی۔ کمال یہ کیا کہ اندرونی سرورق "بہ تصحیح وتنقید جناب مولانا محمد حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی" لکھ کر چھپوا دیا۔۔۔۔ میرا خیال ہے مولوی صاحب کو دو سطروں میں صورتِ حال واضح کر دینی چاہیے تھی یا سرورق پر "مرتبہ قاضی عبدالودود" کے اندراج کے بعد "مع مقدمہ از صدر یار جنگ" لکھ دینا چاہیے تھا۔[1]

"تذکرۂ شعرائے ہندی" کے نام سے اس کا تیسرا ایڈیشن اپریل ۱۹۷۹ء میں ڈاکٹر اکبر حیدری نے مرتب کر کے اردو پبلشرز، نظیر آباد، لکھنؤ سے شائع کیا ہے۔ یہ اشاعت کتب خانۂ سلطان المدارس، لکھنؤ کے ایک قلمی نسخے پر مبنی ہے جو بقول مرتب "تذکرۂ میر حسن کا قدیم ترین مخطوطہ ہے اور غالباً مصنف کے ہاتھ ہی کا مکتوبہ ہے (کیونکہ اگر یہ کسی کاتب کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہوتا تو پھر اس میں کہیں نہ کہیں کاتب کا نام یا تاریخِ کتابت بھی درج ہوتی۔" (ص ۱۸) قطعِ نظر اس سے کہ یہ دلیل بجائے خود کوئی وزن نہیں رکھتی، املا کی متعدد فاحش غلطیاں اور واقعاتی نوعیت کے بعض اندراجات جن میں خود مولف اور ان کے پردادا کے نام بھی شامل ہیں[2]، اس قیاس کے خلاف ثبوت فراہم کرتے ہیں۔

انجمن ترقیٔ اردو کی مذکورہ بالا دونوں اشاعتوں میں کل تین سو چار ریختہ گویوں کے حالات واشعار ملتے ہیں جب کہ سلطان المدارس کا زیرِ بحث نسخہ صرف ایک سو پچانوے شاعروں کے تراجم پر مشتمل ہے۔ ان میں سے تین شاعر (۱) فضلی (۲) مرزا حسین بخش

---

[1] حواشی مضمون "مولوی عبدالحق صاحب کے غیر مطبوعہ خطوط" مشمولہ ماہنامہ "قومی زبان" کراچی شمارہ اگست ۱۹۹۱ء ص ۱۴

[2] نسخۂ سلطان المدارس میں حسن کا نام میر محمد حسن اور ان کے پردادا کا نام میر ہدایت اللہ لکھا ہوا ہے۔ (عکس مقابل ص ۳۶) پروفیسر مسعود حسن رضوی کی تحریر کے مطابق دوسرے تمام معتبر مآخذ کی رو سے ان دونوں کے نام بالترتیب میر غلام حسن اور میر برأت اللہ ہونا ثابت ہے۔
(اسلاف میر انیس ص ۹ تا ص ۱۱)

فراق اور (۳) کھتری (جیون مل کھتری متخلص بہ عشاق) پہلی دونوں اشاعتوں میں شامل نہیں۔ اس طرح گذشتہ دونوں اشاعتوں کے مقابلے میں ایک سو بارہ شاعر اس نسخے سے غیر حاضر ہیں۔ حیدری صاحب نے اپنے مرتبہ نسخے میں اشاعتِ ثانی کے حوالے سے ان شاعروں کے حالات و اشعار شامل کر کے اس کمی کو پورا کر دیا ہے۔ اس طرح اس اشاعت میں شعرا کی مجموعی تعداد تین سو سات ہو گئی ہے۔

اشاعتِ اول کی ترتیب کے وقت اس تذکرے کا جو قلمی نسخہ شروانی صاحب کے پیشِ نظر تھا، اس کے آخر میں کوئی خاتمہ یا ترقیمہ موجود نہ تھا چنانچہ موصوف نے مختلف قیاسات و قرائن کی بنیاد پر یہ فیصلہ فرمایا تھا کہ "یہ تذکرہ ۱۱۸۸ھ اور ۱۱۹۲ھ کے مابین لکھا گیا ہے۔" (ص ۲) اس کے برخلاف دوسری اشاعت کے خاتمے میں خود مولف کی یہ صراحت موجود ہے کہ "ایں تذکرہ من ۔۔۔۔ در تاریخ یک ہزار و یک صد و نود و یک ہجری بہ اتمام رسید۔" (ص ۲۰۸) لیکن قاضی صاحب کے بیان کے مطابق ان کے کتب خانے کے ایک قلمی نسخے کے بموجب اس تذکرے نے کتابی صورت دراصل ۱۱۸۹ھ/۱۷۷۵ء ہی میں حاصل کر لی تھی[1] نسخۂ سلطان المدارس اس سے بھی ایک سال قبل یعنی ۱۱۸۸ھ میں اس کی تکمیل کی نشان دہی کرتا ہے۔ یہ بات اس کے خاتمے میں "یک ہزار و یک صد و نود و یک ہجری" کی بجائے "یک صد و یک ہزار و ہشتاد و ہشت ہجری" کے اندراج (عکس مقابل ص ۳۳۶) سے ظاہر ہے۔

زمانۂ اختتام سے متعلق یہ مختلف فیہ بیانات بظاہر مختلف اوقات میں شاعروں کی کمی بیشی یا بعض اندراجات میں جزوی ترمیم و تغیر کے ساتھ نئے نسخوں کی ترتیب پر دلالت کرتے ہیں۔ اس لیے آغاز کار اور اتمامِ کار کے حدود کا زیادہ وثوق کے ساتھ تعین کرنے کے لیے داخلی شہادتوں کی طرف رجوع زیادہ سود مند ہو گا۔ جہاں تک اتمامِ کار کا تعلق ہے، اس سلسلے میں شاہ فصیح کے متعلق اس اندراج کے علاوہ کہ "در سال یک ہزار و

---

[1] عیارستان ص ۳۶ و مکتوب بنام راقم مورخہ ۵ مارچ ۱۹۶۶ء

یک صد و نود و دو برحمت حق پیوست" (ص ۱۲۶) کوئی اور شہادت نہیں ملتی۔ زمانۂ آغاز کے سلسلے میں مندرجہ ذیل بیانات مفید معلومات فراہم کرتے ہیں:

(الف) نعیم اللہ نعیمؔ کی نسبت رقم طراز ہیں:

"مرد یست متوطن شاہجہاں آباد، می گویند کہ بسیار بر خود غلط است۔ بندہ اورا ندیدہ است۔" (ص ۱۸۱)

ان جملوں سے نعیمؔ کے بقیدِ حیات ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ مصحفی ان کی وفات کو جنگِ سکرتال (یکم شوال ۱۱۸۵ھ/ ۷ جنوری ۱۷۷۲ء) کے چند دن بعد کا واقعہ قرار دیتے ہیں[۱]۔ مولوی قدرت اللہ شوقؔ نے بھی ان کا سال وفات ۱۱۸۵ھ (۷۲-۱۷۷۱ء) ہی تحریر کیا ہے[۲]۔ لہٰذا ان کے حالات ۱۱۸۵ھ کے اوائل (۱۷۷۱ء) میں یا اس سے کچھ قبل لکھے گئے ہوں گے۔

(ب) میر شمس الدین فقیرؔ کے بارے میں لکھتے ہیں:

"دریں ولا بطرفِ کربلائے معلّٰی تشریف بردہ بود، ہماں جا بجوارِ رحمتِ ایزدی پیوست۔" (ص ۱۱۴)

حسین قلی خاں عاشقیؔ عظیم آبادی نے فقیرؔ کے اس سفر کی تفصیلات ان الفاظ میں بیان کی ہیں:

"در سنہ یک ہزار و یک صد و ہشتاد و یک شوقِ زیارتِ عتباتِ عالیات دامن گیرِ حالِ او گردیدہ کشاں کشاں براہِ سعادت برد چنانچہ ..... بہ بقعاتِ طیبات رسیدہ و حصولِ مرام نمودہ پس از انقضائے دو سال در سنہ یک ہزار و یک صد و ہشتاد و سہ روانۂ ہندوستان شدہ تا بصرہ آمد و چوں از انجا روانۂ ایں طرف گشت، ناگاہ از بادِ مخالف کشتیٔ سواریٔ او بہ تباہی آمد و او غریقِ رحمتِ الٰہی گردید[۳]۔"

---

[۱] تذکرۂ ہندی ص ۲۵۹

[۲] تکملۃ الشعرا (قلمی رام پور) بحوالۂ دستور الفصاحت، دیباچۂ مرتب ص ۲۷

[۳] نشترِ عشق مخطوطہ رضا لائبریری رام پور ورق ۵۲۶

اس بیان کے مطابق فقیر کا انتقال ۱۱۸۳ھ/۷۰-۱۷۶۹ء میں ہوا ہے اور میر حسن اسے زمانہ قریب کا واقعہ بتاتے ہیں۔ اس لیے گمانِ غالب یہ ہے کہ انھوں نے فقیر کے حالات ۱۱۸۴ھ/۷۱-۱۷۷۰ء یا ۱۱۸۵ھ/۷۲-۱۷۷۱ء میں قلم بند کیے ہوں گے۔

تذکرے کے ان اندراجات سے ثابت ہوتا ہے کہ میر حسن اس کی ترتیب کا کام ۱۱۸۳ھ/۷۰-۱۷۶۹ء میں فقیر کے انتقال کے بعد اور ۱۱۸۵ھ/۷۲-۱۷۷۱ء میں نعیم کی وفات سے قبل شروع کر چکے تھے۔ اس صورتِ حال کے مطابق قیاسی طور پر ۱۱۸۴ھ/۷۰-۱۷۷۱ء کو سالِ آغاز کہا جا سکتا ہے۔

اس تذکرے کی ترتیب سے قبل شعرائے اردو کے کئی تذکرے علمی و ادبی حلقوں میں کافی مقبولیت حاصل کر چکے تھے۔ ان میں سے میر حسن کے ہاں میر اور قائم کے تذکروں کا ذکر بار بار آتا ہے۔ آنند رام مخلص اور غنی بیگ قبول کے حالات میں انھوں نے "تذکرہ خان آرزو" (مجمع النفائس) کے حوالے بھی دیے ہیں لیکن یہ تذکرہ غالباً ان کی نظر سے نہیں گذرا تھا کیونکہ یہ دونوں مقامات وہ ہیں جہاں انھوں نے میر کے بیانات سے استفادہ کیا ہے۔ ان تذکروں کے علاوہ سید امام الدین مظلوم کے حال میں ان کے "تذکرۂ مختصر معاصرین" کا بھی ذکر ملتا ہے (ص ۱۴۹) یہ تذکرہ چونکہ نایاب ہے اس لیے نہیں کہا جا سکتا کہ میر حسن نے اس سے کس قدر مدد لی ہے لیکن میر اور قائم کے تذکرے قدم قدم پر ان کے لیے چراغِ راہ کا کام دیتے رہے ہیں۔ خاص طور سے وہ قائم کے تذکرے سے بے حد متاثر ہیں۔ غالباً اسی تذکرے کے طرزِ ترتیب کی تقلید میں انھوں نے اپنے ہاں متقدمین، متوسطین اور متاخرین کے علٰحدہ علٰحدہ طبقات قائم کیے ہیں لیکن قائم کے برخلاف ان کے ہاں شعرا کی یہ گروہ بندی حروفِ تہجی کے مطابق ترتیب کی تابع ہے۔ یعنی اولاً تمام شاعروں کو تخلص کے حرفِ اول کی رعایت سے ردیف وار مختلف حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے، اس کے بعد ہر ردیف کے تحت متقدمین، متوسطین اور متاخرین کے حالات و اشعار علٰحدہ علٰحدہ لکھے گئے ہیں۔ طبقہ اوّل میں زیادہ تر دکنی شعرا کا ذکر ہے۔ دوسرا طبقہ "شعرائے اواخرِ عہدِ فرخ سیر و ابتدائے سلطنتِ محمد شاہ" سے متعلق ہے۔

تیسرے طبقے کے ذیل میں معاصرین کے حالات و کلام کو جگہ دی گئی ہے۔

تذکرے کے خاتمے میں میر حسنؔ نے تمام شعرا کے حالات کا احاطہ کرنے سے اپنی معذوری کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے:

"پوشیدہ نماند کہ احاطہ نمودنِ کلام جمیع شعرا از قبیلِ دریا بہ کوزہ کردن است، چرا کہ ہیچ جائے نیست کہ دردِ صاحب سخنے نخواہد بود۔ پس ایں بے استعداد راچہ یارا کہ از ملک بہ ملک یا از شہر بہ شہر احوالِ ہر کس را تفتیش نماید و اشعارِ ہر صاحبِ سخن را درج کند مگر احوالِ بعضے اشخاص کہ شنیدہ شد، یا در تذکرہ ہائے متقدمین دیدہ شد یا خود ملاقات نمودہ شد، پارۂ دریں جا ثبت نمود۔" (ص ۲۰۸)

اس بیان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس تذکرے میں صرف ان شاعروں کو شامل کیا گیا ہے جن سے میر حسنؔ ذاتی واقفیت رکھتے تھے یا جن کے بارے میں انھیں دوسرے ذرائع سے حصولِ معلومات کے مواقع حاصل تھے۔ اپنے کام کو اس طرح کسی مخصوص دائرے تک محدود رکھنے والے دوسرے تذکرہ نگاروں نے شعرا کے سوانح حیات کے سلسلے میں بعض اوقات بڑی کارآمد معلومات فراہم کی ہیں لیکن یہ عجیب بات ہے کہ میر حسنؔ نے حالات کی دریافت و تحقیق کے وسیع امکانات کے باوجود شعرا کے تعارف میں سوانحی پہلو کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے صرف سیرت و شخصیت کے بارے میں اظہارِ خیال اور کلام کے متعلق رائے زنی سے سروکار رکھا ہے چنانچہ اس تذکرے میں نہ تو شاہ فصیحؔ کے سالِ وفات کے علاوہ کسی دوسرے واقعے کا سنہ مذکور ہے اور نہ عام طور پر معلوم و مشہور باتوں کے علاوہ کسی شاعر کی داستانِ حیات سے متعلق کوئی خاص مواد ملتا ہے۔ حتّٰی کہ ان شاعروں کے ذکر میں بھی جو مولف کے معاصرین اور احباب میں شامل ہیں اور جن کے بارے میں ضروری معلومات کی فراہمی زیادہ دشوار نہ تھی، انھوں نے تعارف کی جو روش اختیار کی ہے اس کا اندازہ ذیل کی مثالوں سے کیا جا سکتا ہے:

رسواؔ۔ "آفتاب رائے رسوا تخلص از سلکِ متوسطین، ہندو پسرے بود۔ در توپ خانہ نوکری داشت۔ از چندے ترکِ روزگار نمودہ بریک پسر کبوہ متونام

تعشق پیدا کردہ بود۔ زبانش بہ لفظِ میاں بسیار آشنا بود۔ ہر کہ سخن می گفت "میاں" می گفت و می گریست ..... عریاں می گشت، آخر بہ ہماں حالت مرد۔" (ص ۷۲)

زآر ۔ "میر مظہر علی زآر تخلص از متاخرین است ..... استفادۂ سخن از شاہ حفیظ اللہ صاحب دام افضالہ کہ در دیارِ لکھنؤ عالم و فاضل و مثنوی داں مشہور اند، حاصل نمودہ، اصلش از شاہجہان آباد است۔ الحال در فیض آباد در رفاقتِ نواب مرزا علی خاں بہادر بسر می برد۔" (ص ۷۶)

سجّاد ۔ "میر محمد سجاد متخلص بہ سجّاد خلف الصدق میر محمد عظیم ابنِ محمد اکرم خاں مرحوم ۔ سر نشاے منشیانِ بادشاہی، مصحح فرامینِ شاہنشاہی، ہم راہیٔ یحییٰ خاں میر منشی ۔ وطنِ آبا و اجدادِ ایشان بعد آمدن از ولایتِ آذربائیجان اکبر آباد بود و معاشرت ایشاں شاہجہان آباد ۔ در ہر امور کہ دخل نمودہ، آں را بکمال رسانیدہ ۔ علم طب ہم حاصل نمودہ ۔ در اکبر آباد بہ مساکنِ قدیم استقامت دارند ..... از شاگردانِ میاں آبرو ....." (ص ۸۰)

فدوی ۔ "مرزا بھجو المتخلص بہ فدوی ..... اصلش از شاہجہان آباد، از شاگردانِ شاہ عشق دام افضالہ ۔ دیوانِ اوائل را بہ آب شستہ ..... بہرہ از علمِ موسیقی دستار نوازی، قدرے نیز حاصل کردہ ..... در یک جا قرار نمی کند گاہے در عظیم آباد و گاہے بہ مرشد آباد، گاہے بہ فیض آباد می ماند ۔ الحال شنیدہ ام کہ در بنگالہ پیش نگر سیٹھ بسر می برد ۔ با فقیر حاضر و غائب دوستی دارد۔" (ص ص ۱۲۱ و ۱۲۲)

قائم ۔ "شیخ محمد قائم ..... در اوائل مدتے داخلِ جرگۂ خواجہ میر درد ماندہ، آخر بہ شاگردیٔ میرزا محمد رفیع سودا قایم گردید ۔ متوطنِ چاند پور رندینہ (گینہ) چوں از ابتداے جوانی در شاہجہان آباد آمدہ بسر بردہ، بنابراں محاورۂ او درست گشت ..... الحال در سنبھل مراد آباد است۔" (ص ص ۱۲۸ و ۱۲۹)

کلیمؔ۔ "میر محمد حسین کلیمؔ۔ جوان محمد شاہی۔ گندم گوں و دراز قد بود۔ با خانِ آرزوؔ مرحوم و میر محمد تقی قرابتِ قریبہ داشت ..... رسالۂ در عروض و قافیۂ ہندی تصنیف نمودہ و فصوص را کہ کتابِ عربی است بزبانِ ریختہ ترجمہ کردہ۔ کتابے در نثر ہندی نیز ایجاد نمودہ ..... در شاہجہان آباد برحمتِ الٰہی پیوست۔" (ص ۱۳۸)

میر حسنؔ سے قبل شفیقؔ اورنگ آبادی اور مولوی قدرت اللہ شوقؔ اپنے تذکروں میں حالات نویسی کا جو معیار پیش کر چکے ہیں، یہ اقتباسات اس پر پورے نہیں اترتے کیفیت کے اس فرق سے قطع نظر میر حسنؔ کے ہاں، تعداد کے لحاظ سے بھی ان شعرا کا تناسب بہت کم ہے جن کی زندگی کے بعض پہلو اسی انداز میں زیرِ بحث آگئے ہیں۔ اس لیے سوانحی نقطۂ نظر سے اس دور کے تذکروں میں یہ تذکرہ کسی خاص اہمیت کا حامل نہیں۔

سیرت نگاری اور شخصیت کی مرقع کشی میں بھی اگرچہ میر حسنؔ کے ہاں سادگی و پُرکاری کا وہ امتزاج نظر نہیں آتا جو ان کے پیش رووں میں میرؔ کا طرۂ امتیاز ہے، پھر بھی اس باب میں وہ اپنے عہد کے اکثر تذکرہ نگاروں پر فوقیت رکھتے ہیں۔ خاص طور پر دہلی و لکھنؤ کے نامور اساتذہ اور ابھرتے ہوئے فن کاروں کے ذکر میں انھوں نے ان کی سیرت و شخصیت کے امتیازی پہلوؤں کو بڑی خوبی اور خوش اسلوبی کے ساتھ نمایاں کیا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

خواجہ میر دردؔ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ

"از عالمانِ خوش ذات و درویشانِ نیکو صفات۔ طنطنۂ فضل و کمال و دبدبۂ جاہ و جلال او بفلک رسیدہ و طناب خیمۂ فکر عالیش چوں شعاعِ مہر از مشرق تا مغرب کشیدہ ..... مرشد بوادی طریقت و رہبر بمیدان شریعت۔ دلِ آگاہِ وے مخزنِ اسرارِ خدائی، صفائے باطنش محرمِ کعبۂ (کذا، کنہ) کبریائی۔ خسروِ اقلیمِ حال و قال، جامعِ صفاتِ جلال و جمال ..... اکثرے از دستِ عسرت پریشان شدہ بطرفے رفتند، لیکن آں ثابت قدم بحبلِ توکل نمودہ قدم از جا نبرداشت۔" (ص ۶۶)

میر حسن کو فیض آباد اور لکھنؤ کے زمانۂ قیام میں اپنے عہد کے جس ممتاز ترین شاعر کی صحبت سے سب سے زیادہ اکتسابِ فیض کا موقع ملا، وہ مرزا سودا ہیں۔ تذکرے کی تالیف کے وقت ان سے تعلقات قائم ہوئے دو ڈھائی سال سے زیادہ نہ ہوئے ہوں گے اس مختصر مدت میں میر حسن کے ذہن پر ان کی شخصیت کا جو نقش قائم ہو چکا تھا اسے ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

"استادِ شعرائے عصر و مقتدائے بلغائے دہر..... بر سپاہِ دانش شاہ و بر آسمان بینش ماہ..... مردیست از مغتنماتِ روزگار۔ خوش خلق و نیک خو یار باش..... در علمِ موسیقی نیز ماہر است..... تا حال مثلِ او در ہندوستانِ جنت نشاں کسے بر نخاستہ۔ اکثر فقیر در خدمتِ آن بزرگوار می رسد۔ بسیار کرم می فرماید..... حق تعالیٰ سلامت باکرامت دارد کہ زندگیٔ سخن وابستۂ ذات اوست۔" (ص ص ۸۲و۸۳)

میر سوز کے ذکر میں بھی میر حسن نے اپنے تاثرات جو عینی مشاہدات پر مبنی ہیں، خاصی تفصیل سے بیان کیے ہیں۔ لکھتے ہیں:

"فقیہ بے مثال و درویشِ باکمال، منشی بے نظیر و خوش نویسِ دل پذیر..... مجلس نشینِ دانش مندی، قصرِ فطرتش در غایتِ بلندی..... فضائلش چوں حُسنِ خوباں عالمگیر و خصائلش چوں خمیازۂ نازِ محبوباں دل پذیر۔ معجز قلم و شیریں رقم..... از بدرنگیٔ آفاق بہ گوشہ نشینی ساختہ..... خواندن اشعارش از زبانِ او..... چناں خوب می نماید کہ در گفتن نمی آید۔ مردیست متواضع و متوکل، قابل دوست و جوہر شناس۔" (ص ص ۸۷و۸۸)

اپنے استاد میر ضیاؔ دہلوی کی نسبت رقم طراز ہیں:

"بدریست از سپہرِ کمال و صدریست از مجلسِ جلال۔ شمعے است پر ضیاء عاشقیست باصفا۔ طبعِ عالیش بلند و دل و جانش گداز و دردمند..... چنیں آشنائے درست در آشنائی ندیدہ و نشنیدہ۔ متواضع، مودب، اہلِ دل، منصف مزاج دردمند۔ از ہر کہ شعرِ پر درد شنیدند، محظوظ شدند و گریستند۔" (ص ۱۰۰)

ان تحریروں میں اگرچہ نفسِ مضمون پر رنگینیٔ بیان غالب ہے تاہم ان کے مطالعے سے زیرِ بحث شاعروں کے فن اور سیرت کی عظمت و دل کشی کا جو نقش ابھرتا ہے اس کی پائیداری میں کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا۔

ڈاکٹر سید عبداللہ کے بقول میر حسن کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ "اعتدال اور میانہ روی کی صفت سے متصف ہیں"[1] چنانچہ انھوں نے کسی شاعر کے اوصافِ ذاتی و صفاتی کی تعریف یا اس کی کوتاہیوں کے بیان میں مبالغے سے کام نہیں لیا ہے۔ اگر کسی شخص کے اندر انھیں کچھ کوتاہیاں نظر آتی ہیں تو ان کی نشان دہی کے ساتھ ہی وہ اس کی خوبیوں کے اعتراف کو بھی ضروری سمجھتے ہیں۔ اس کی بہترین مثال معینؔ بدایونی شاگردِ سوداؔ کے متعلق ان کی اس تحریر میں ملتی ہے:

> "طبعِ وقتِ پسندش بر نکتہ چینی دیوانہ۔ اکثر با شعرائے معاصرین پیچش دارد۔ چنانچہ یک بار بر شعر فقیر اعتراض بیجا نمود۔ ہر چند فہمانیدم، نفہمید۔ سندِ مرزا رفیع دادم قبول نہ کرد۔ گفت: دیوانِ مرزا من صحیح دارم، در او ایں طور نیست۔" غرض ہر جا کہ ہمچنیں لفظ می یابد، دیوانِ استادِ خود را موافقِ طبعِ خود درست می کند و سخنِ خود را سرسبزی نماید ..... لیکن باوجودِ ایں ہمہ خود آرائی و خود پسندی مثلِ او ہم صاحبِ طبع پیدا نیست۔" (ص ۱۶۵)

سیرت و شخصیت کے جائزے کی طرح تنقیدِ سخن کے معاملے میں بھی میر حسن نے بڑی خوش سلیقگی اور صائب نظری کا ثبوت دیا ہے۔ مولوی عبدالحق کے بقول "وہ شعرا کے کلام پر رائے کے اظہار میں (بھی) اعتدال اور انصاف کو مدِّ نظر رکھتے ہیں اور کبھی دل آزاری کا پہلو اختیار نہیں کرتے"[2] ان کی رائیں بالعموم مجمل تاثرات پر مشتمل یا ایک دو مختصر جملوں میں محدود ہوتی ہیں، تاہم ان سے شاعر کی فنّی استعداد، رجحانِ

---

[1] شعرائے اردو کے تذکرے ص ۴۴

[2] انتخابِ ماہِ نو ۱۹۴۸ء تا ۱۹۵۲ء ص ۳۸

طبیعت اور ادبی مرتبے کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر مرزا سوداؔ کے بارے میں لکھتے ہیں:

"در میدانِ نزاکتِ بیان فکرش چوں مہرِ گرم تاز است و در عرصۂ لطافت و قدرت و متانتِ سخن بازوے فطرتِ او چوں تیر راست انداز است ..... میدانِ بیانِ او وسیع و طرزِ معانی او بدیع ..... در قصیدہ و ہجو ید بیضا دارد۔ قصائدِ عذب و دلآویز و بیانِ ہجوِ بلند نظمش طرب انگیز است۔" (ص ص ۸۲ و ۸۳)

سوداؔ قصیدہ نگاری اور ہجو گوئی کے امام ہیں اور میرؔ سفینۂ غزل کے ناخدا۔ حسنؔ کی نگاہِ نکتہ رس اس فرق سے بخوبی واقف ہے۔ چنانچہ میرؔ صاحب کے کمالاتِ شعری پر تبصرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ

"شعرش چوں دُرِ خوش آب و اندازِ سخنش بے حساب ..... از استادانِ صاحبِ قدرت است۔ طرزش مانا بطرزِ شفائی ..... رباعی و غزل و قصیدۂ ہجو و مدح ہمہ می گوید، لیکن آنچہ گوید از غزلیات کہ بسیار بہ انداز و طرز از دو می تراود (کذا) بلکہ گرم بازاری او ہمیں است۔" (ص ص ۱۵۱ و ۱۵۲)

مشہور مرثیہ گو میاں سکندرؔ کے متعلق لکھتے ہیں:

"از مرثیہ گویانِ متاخرین است۔ اکثر در زبانِ پوربی و پنجابی و بنگالی و مارواڑی مرثیہ گفتہ و بسیار مربوط گفتہ ..... یک قصۂ ملاح و ماہی و بادشاہِ دل خوار بسیار بہ آب و تاب نظم نمودہ است۔ اگرچہ علم ندارد و لیکن بر کلام او جاے انگشت نیست۔ ..... بطرزِ قدیم شعر می گوید۔ طبعش مائل ایہام بسیار است۔" (ص ۹۳)

میر ضیاؔ دہلوی کی شاعری پر ان الفاظ میں تبصرہ کرتے ہیں:

"شعرِ پر دردش بر جگرِ عاشقان نشتر زاریست و برائے سوختگانِ عشق شرارے۔ اکثر غزل در زمین سنگلاخ گفتن و الفاظِ نا مقبول را در بندشِ مقبولِ دل ہا ساختن کارِ اوست ..... قصیدہ و ہجو و مثنوی و رباعی کم گفتہ۔ بیشتر غزلیات ازاں مشہور است۔" (ص ۱۰۰)

بعض شعرا کے ذکر میں میر حسن نے ان کے طرزِ سخن کو فارسی کے ایسے اساتذہ کے انداز سے نسبت دی ہے جن کے انفرادی رنگ اور استادانہ حیثیت سے اس زمانے کے اہلِ ذوق عام طور پر واقف تھے۔ تنقید میں اس قسم کا تقابل بظاہر بہت آسان معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کے لیے وسعتِ مطالعہ اور اصابتِ رائے دونوں بے حد ضروری ہیں۔ میر حسن کے ہاں یہ دونوں عناصر بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ گذشتہ سطور میں میر کی شاعری پر تبصرے کے ذیل میں اس سلسلے کی ایک مثال گذر چکی ہے دوسری مثالیں یہ ہیں:

۱۔ خواجہ میر درد۔ "دیوانش اگرچہ مختصر است لیکن چوں کلامِ حافظ سراپا انتخاب"۔ (ص ۶۶)

۲۔ قائم چاند پوری۔ "طرزش بطرزِ طالبِ آملی می ماند" (ص ۱۲۸)

۳۔ میر محمدی شرف۔ "بیشتر بطور ناصر علی و مرزا جلال اسیر ریختہ می گوید" (ص ۹۷)

۴۔ شاہ واقف۔ "طرزِ کلامش مانا بطرزِ ناصر علی و جلال اسیر است" (ص ۱۹۰)

ناقد کا اہم ترین فرض یہ ہے کہ وہ زیرِ بحث شاعر کے کلام کے ہر پہلو پر پوری دیانت داری اور آزادی کے ساتھ اظہارِ خیال کرے۔ اس ضمن میں بیجا تنقیص کی طرح معائب سے صرفِ نظر بھی اصولِ تنقید سے انحراف کی حیثیت رکھتا ہے۔ میر حسن اس رمز سے آشنا ہیں چنانچہ وہ صرف محاسن کی نشان دہی پر اکتفا نہیں کرتے، فنی و فکری نقائص کی طرف بھی حسبِ ضرورت اشارے کرتے چلتے ہیں۔ مثلاً محمد حسین کلیم کے ذکر میں ان کی استادی اور ہمہ گیر لیاقت و صلاحیت کا اعتراف کرتے ہوئے آخر میں یہ رائے دیتے ہیں کہ

"باوجودِ ایں زور و قوتِ شاعری نمک در کلام نیافتہ، بنا بریں اشعارش اشتہار نیافت" (ص ۱۳۸)

اسی قسم کے آزادانہ اظہارِ خیال کے کچھ اور نمونے درجِ ذیل بیانات میں ملتے ہیں:

۱۔ آشوب۔ "قدم در مسخرگی گذاشتہ است۔ پوچ و بے معنی و ناموزوں می گوید" (ص ۲۲)

۲۔ فرحت مرشد آبادی: "رطب و یابس بسیار دارد" (ص ۱۲۱)

۳۔ شاہ مجنوں: "خود را از شاگردانِ میر تقی می شمارد لیکن ہماں مثیل است:

خرِ عیسیٰ اگر بہ مکہ رود ۔ باز آید ہنوز خر باشد (کذا)" (ص ۱۶۶)

۴۔ نعیم دہلوی ۔ "از کلام او چنیں معلوم می شود کہ فکرش سرسری است، بہ عالم اعلیٰ نرسیدہ است مگر بعضے جستہ جستہ خوب می گوید" (ص ۱۸۲)

میر حسن کی صاف گوئی اور آزادیٔ رائے کا ثبوت اس رائے سے بھی ملتا ہے کہ وہ میر جیسے مسلم الثبوت استاد کی اصلاح کو بھی بلا تامل تسلیم کر لینے کے لیے تیار نہیں۔ میر صاحب نے میر محمد یار خاکسار کے اس شعر پر کہ

خاکسار اس کی تو آنکھوں کے کہے مت لگیو
مجھ کو ان خانہ خرابوں ہی نے بیمار کیا

یہ اعتراض کیا ہے کہ یہاں "بیمار کیا" کی بجائے "گرفتار کیا" ہونا چاہیے[1]۔ میر حسن اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"در عقلِ فقیر چنیں می گزرد کہ اگر چشم خود می بود گرفتار مناسب بود۔ چوں ایں جا چشم معشوق است، بیماری صحت دارد" (ص ۶۱)

کہیں کہیں حسن نے زبان اور فن کے نقطۂ نظر سے اشعار کی قابلِ اعتراض خامیوں کی بھی گرفت کی ہے۔ مثلاً بندرابن راقم کا ایک شعر ہے:

کام عاشقوں کا کچھ تجھے منظور ہی نہیں
کہنے کو ہے یہ بات کہ مقدور ہی نہیں

میر حسن اس شعر کے پہلے مصرعے میں اسقاطِ عین پر اعتراض کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اغلب کہ ایں شعر بے اصلاح باشد، چرا کہ از افتادنِ عین ناموزوں می شود و دریں جا عین می افتد، عین خطاست۔ در دانست فقیر چناں بہتر می شود:

میرا تو کام کچھ تجھے منظور ہی نہیں" (ص ۴۷)

---

[1] نکات الشعرا طبع ثانی ص ۱۶

ایسا ہی اعتراض معینؔ بدایونی کے اس شعر پر بھی کیا ہے :

خوش ہم عریانی سے اپنی ہیں برنگِ بوے گل
نکلے جاتے ہیں ٹھہرتے نہیں پوشاک میں ہم

لکھتے ہیں :

"خوش ہم عریانی ناموزوں است چرا کہ میم بار اپنان چسپیدہ است کہ عین چوں چشمِ غزال از میان رم کردہ است و ایں سخت عیب است۔"

(ص ص ۱۶۵ و ۱۶۶)

معینؔ کی اسی غزل کا ایک اور شعر ہے :

لختِ دل نہیں ہے جو لے نکلے ہے نت قاصدِ اشک
پرزے حال اپنے کے بھیجے ہیں تجھے ڈاک میں ہم

میر حسنؔ کا خیال ہے کہ

"ایں مضمون بسیار خوب است لیکن بندش درست نیست ہر کہ محاورہ دان است می داند۔" (ص ۱۶۵)

معینؔ ہی کے ایک اور شعر میں "دوپہری ڈھلی" کے استعمال کو روزمرہ کے خلاف قرار دیتے ہوئے رقم طراز ہیں :

"ایں محاورہ درست نیست مردم شاہجہان آباد "دوپہر ڈھلی" می گویند نہ "دوپہری" مگر مردم بیرونجات۔" (ص ۱۶۶)

پروفیسر کلیم الدین احمد نے میر حسنؔ کی ان رایوں کو سطحی تنقید سے تعبیر کیا ہے کیونکہ ان کا تعلق زبان، محاورے اور عروض سے ہے[1]۔ یہ اعتراض فی نفسہٖ بالکل درست ہے لیکن اس سے ان کی اہمیت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ ان تنقیدی اشارات سے کلام کے حسن و قبح اور بلند و پست کا بہر طور اندازہ ہو جاتا ہے اور دو سو سال پہلے کے فنی

---

[1] اردو تنقید پر ایک نظر ص

تصورات اور معیارِ فکر و نظر کو نگاہ میں رکھتے ہوئے ایک تذکرہ نگار سے اس سے زیادہ توقع نہیں کی جا سکتی۔

اس تذکرے سے ہمیں عشق بازی و شاہد پرستی سے اس زمانے کے شعرا کی عام دل چسپیوں کے بارے میں بھی کچھ معلومات حاصل ہوتی ہے۔ اہلِ ذوق کے اس زمرے میں صاحبِ تذکرہ خود بھی شامل ہیں اور ان کے استاد میر ضیاؔ بھی۔ تفصیل کے لیے درج ذیل اقتباسات ملاحظہ ہوں:

(الف) عبدالحیٔ تاباںؔ:

"سید زادۂ بود بہ کمالِ حسن و وجاہت، تمام عالم فریفتۂ حسنِ او بود۔ بلکہ گرم بازاریٔ ریختہ ازاں شعلہ رو دوبالا شد۔ اکثر اشخاص ایں فن را وسیلہ ساختہ دخیلِ صحبتِ او می شدند ..... عاشقِ معشوق مزاج۔ بیک طفلے سلیمان نام تعشق داشت۔" (ص ۳۵)

(ب) میر مستقیم جرأتؔ:

"بندہ او را در صغر سن بہ شاہجہان آباد دیدہ ام۔ بسیار خوش رو بود کہ بے اختیار دل را می ربود۔" (ص ص ۴۲ و ۴۳)

(ج) فضائل علی خاں بیقیدؔ:

"بایکے از بتانِ ہند تعشق پیدا کردہ بود ..... از فراقِ محبوب چوں ماہیٔ بے آب و آہوانِ بے صحرا می تپید و وحشت می نمود۔" (ص ۱۱۸)

(د) میاں صلاح الدین پاکبازؔ:

"در لکھنؤ بر سوہنا و مکھن کہ قوال بچہ مشہور اند، نظرِ الفتے داشت۔" (ص ۱۵۰)

(ہ) مرزا نور اللہ دہلوی:

"بر یک فرنگی بچہ تعشق بہم رسانیدہ آوارہ می گشت یعنی کارش بہ سودا کشیدہ بود۔" (ص ۱۷۹)

(۹) میر احمد یار دہلوی:

"محبوبِ روزگار و یارِ طرح دار ..... جوانے بود بکمالِ وجاہت و ملاحت کہ یوسفِ ثانی تواں گفت۔ دراں زماں عالم عالم فریفتۂ رخ نیکو و آشفتۂ زلفِ او بود۔ در وقتِ احمد شاہ ہنگامۂ حسنِ او گرم بود۔ ایں ہمہ شعرائے متوسطین مانندِ پروانہ دلِ خود را بر شعلۂ حسنش می سوختند و او نیز بہ اینہا صحبت می داشت ..... میر ضیا سلمہ اللہ بہ او نظرِ الفت داشتند چنانچہ تا حال ہر وقت کہ یادِ او می کنند، می گریند"۔ (ص ص ۲۰۰ و ۲۰۱)

اس تذکرے سے ایک خاص بات یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ اس زمانے میں لوگ ہجو کو اپنی شہرت کا ذریعہ تصور کرتے تھے۔ چنانچہ اس طرح کی نظموں میں جس شخص کو ہدفِ ملامت بنایا جاتا تھا اس کے دل میں ندامت و شرمندگی اور ذلت و رسوائی کے بجائے ایک قسم کی برتری کا احساس پیدا ہو جاتا تھا۔ میر حسن اس رجحان کو بے حسی اور فقدانِ غیرت کی دلیل قرار دیتے ہوئے میر جعفر زٹلی کے حال میں لکھتے ہیں:

"زبانِ گزندہ داشت کہ اعلیٰ و ادنیٰ ہمہ کس از و ملاحظہ می نمودند۔ بس کہ دراں زمانہ عالمِ غیرت داشت، چیزے می دادند و زبانش بند می کردند۔ الحال اگر کسے در ہجو کسے بگوید، مدح خود می شمارند"۔ (طبع اول ص ۷۲)

میر محمد حسین کلیم کے ذکر میں میر حسن نے شاعری میں ان کی مہارتِ تامہ کی تعریف کے بعد لکھا ہے کہ "کتابے در نثر ہندی نیز ایجاد نمودہ" (ص ۱۳۸) اور اس کتاب کے چند جملے بھی جو انھیں یاد رہ گئے تھے، بطور نمونہ نقل کیے ہیں۔ یہ جملے اس دور کے اسلوبِ نگارش کی نمائندگی کرتے ہیں، اس اعتبار سے ان کی ایک تاریخی حیثیت ہے اور یہاں ان کا نقل کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ احمد شاہ (۱۱۶۱ھ/ ۱۷۴۸ء تا ۱۱۶۷ھ/ ۱۷۵۴ء) کے مکحول کیے جانے کے واقعے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"کل کے دن تھے بادشاہ اور وزیر　　آج کے دن ہو بیٹھے ہیں اندھے ہو بصیر
ایسی دولت سے زینہار زینہار　　فَاعْتَبِرُوا يَا أُولِي الْأَبْصَارِ"

(ص ۱۳۸)

جیسا کہ ابتدا میں لکھا جا چکا ہے میر حسن نے اس تذکرے کی ترتیب میں میر اور قائم کے تذکروں سے کافی مدد لی ہے اور بحیثیت مجموعی وہ قائم سے زیادہ متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ چنانچہ قائم کے مقابلے میں وہ میر کے بیانات کو زیادہ مستند اور قابلِ اعتبار نہیں سمجھتے۔ قائم نے "مخزنِ نکات" کی ابتدا سعدی کے ذکر سے کی ہے اور انھیں شیخِ شیراز قرار دیا ہے[1]۔ اس کے برخلاف میر صاحب کا قول یہ ہے کہ

"آنچہ بعض ایں را شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ گمان بردہ اند، خطاست"[2]

میر حسن نے ان دونوں روایتوں کا حوالہ دیتے ہوئے دبے لفظوں میں قائم کے خیال کی تائید کی ہے۔ لکھتے ہیں:

"بعضے ایں را سعدی شیرازی قرار دادہ اند و بعضے سعدی دیگر یعنی دکھنی۔ واللہ اعلم..... چوں زبانِ فارسی دریں (در ریختہ اش) شامل است، اغلب کہ سعدی شیرازی است۔" (ص ۷۸)

عام تذکرہ نگاروں کی طرح میر حسن کے یہاں بھی کہیں کہیں ایسے بیانات ملتے ہیں جو حقیقتِ حال سے مطابقت نہیں رکھتے۔ مثلاً سراج اور نگ آبادی کے بارے میں انھوں نے لکھا ہے کہ

"در وقتِ عالمگیر اول بود۔" (ص ۷۸)

عالمگیر اول یعنی محی الدین اورنگ زیب کا سالِ وفات ۱۱۱۹ھ/۱۷۰۷ء ہے اور سراج اورنگ آبادی اس کے نو سال بعد ۱۱۲۸ھ/۱۷۱۶ء میں پیدا ہوئے اور

---

[1] مخزن نکات ص ۲

[2] نکات الشعرا طبع ثانی ص ۱۰۳

۱۱۷۷ھ/۱۷۶۴ء تک زندہ رہے[1]۔ اس لیے انھیں عالمگیر کا ہم عصر قرار دینا غلط ہے۔

میر کو وہ "برادر زادہ سراج الدین علی خاں آرزو" لکھتے ہیں (ص ۱۵۱) ان دونوں حضرات کے درمیان اس اضافی رشتے کے سوا کوئی رشتہ نہ تھا کہ میر صاحب کی والدہ سے قبل ان کے والد سے آرزو کی بہن منسوب تھیں[2]۔ اس حقیقت سے میر حسن کی بے خبری حیرت انگیز ہے۔

عزلت سورتی کو میر حسن نے عبدالواسع کے نام سے یاد کرتے ہوئے محمد شاہ کے عہد میں "تازہ واردِ ہندوستان" بتایا ہے (ص ۱۰۷) لیکن علامہ غلام علی آزاد بلگرامی اور دوسرے تذکرہ نگاروں کی تحریر کے مطابق ان کا نام عبدالولی تھا اور وہ محمد شاہ کی وفات (۱۱۶۱ھ/۱۷۴۸ء) کے تین برس بعد ۲۰ جمادی الاولیٰ ۱۱۶۴ھ مطابق ۵ اپریل ۱۷۵۱ء کو دہلی میں وارد ہوئے تھے[3]۔

معلومات کے ان نقائص سے بھی کہیں زیادہ "تذکرہ شعرائے اردو" کی جو خامی بار بار نظر میں کھٹکتی ہے وہ اس کی زبان کی صنعت کاری اور انداز بیان کی پیچیدگی ہے۔ میر حسن سادگی اور سلاست کو انشا پردازی اور ادبیت کے منافی سمجھتے ہیں۔ وہ رنگین بیانی اور مرصع نگاری کے دلدادہ ہیں اور ان کے خیالات اکثر مقفیٰ اور مرجز جملوں اور فقروں کی صورت میں نوکِ قلم تک آتے ہیں۔ مثلاً انھوں نے شعرا کے تعارف کا آغاز عام طور پر اس انداز میں کیا ہے:

(الف) "آبِ جوئبارِ شرافت و سروِ بوستانِ سیادت، گلِ گلزارِ ہاشمی، میر برہان الدین آتشی۔" (ص ۱۴)

(ب) "چراغِ بزمِ آشنائی و شمعِ انجمن آرائی، تیغ شجاعت را جوہر و کانِ مروت

---

[1] کلیات سراج مرتبہ پروفیسر عبدالقادر سروری ص ۲۶ و ۵۵

[2] دلی کالج میگزین میر نمبر ص ۲۸

[3] سروِ آزاد ص ۲۳۶۔ نکات الشعرا طبع ثانی ص ۹۲، گلشن گفتار ص ۶۵ و چمنستانِ شعرا ص ۴۴۵

راگوہر، مرزا احمد علی المتخلص بہ جوہر۔" (ص ۴۲)

(ج) "سالکِ مسالکِ مکاشفاتِ دینی و ناہجِ مناہجِ مجاہداتِ یقینی، از عرفائے عالی مقام و فقہائے ذوی الاحترام، بر آسمانِ سخن مانند خورشید فرد، حضرت خواجہ میر المتخلص بہ درد ....." (ص ۶۶)

(د) "سلالۂ دودمانِ مصطفوی و نقادۂ خاندانِ مرتضوی، موصوف بہ اوصافِ حمیدہ، مخلوق بہ اخلاقِ سنجیدہ، شہرۂ انفس و آفاق، در لطیفہ گویان و ایہام بندان طاق، سیادت و شرافت نہاد، نیک نیت و خوش اعتقاد، میر محمد سجاد ہم متخلص بہ سجاد ....." (ص ۸۰)

ایک تاریخی و تنقیدی نوعیت کی کتاب کے لیے یہ اسلوبِ نگارش مناسب نہیں کیوں کہ اس طرح اکثر نفسِ مضمون قافیوں کی بندش اور الفاظ کے طلسم میں گم ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اگر مصنف ایہام، رعایتِ لفظی اور صنع جگت کے استعمال سے بھی دل چسپی رکھتا ہو تو بجز سخن طرازی و عبارت آرائی کے کام کی بات کم ہی نکل پاتی ہے۔ میر حسن کے بعض بیانات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس طرح کی رعایتوں کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھتے۔ پھر بھی جس طرح انھوں نے اپنے کلام میں ان صنعتوں کو کسی حد تک روا رکھا ہے اسی طرح کبھی کبھی نثر میں بھی ان کی مدد سے اپنے اسلوب کو ایک نیا رنگ دینے کی کوشش کی ہے۔ یہاں صرف ایک اقتباس بطورِ نمونہ پیش کیا جاتا ہے۔ حجام کے بارے میں لکھتے ہیں:

"دوکانِ سخن را گرم داشتہ مضمون تراشی می نماید لیکن ..... کلامش بے اصلاح است۔ در موشگافیٔ معانی قصر دارد۔" (ص ۵۰)

انتخابِ اشعار کے لحاظ سے یہ تذکرہ شعرائے اردو کے چند بہترین تذکروں میں شمار کیے جانے کے قابل ہے۔ حتیٰ کہ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے مشاہدے کے مطابق بعض اوقات میر حسن کا انتخاب میر کے انتخاب سے بھی بہتر معلوم ہوتا ہے۔[1]

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو مقدمۂ مرتب ص ۱۷ تا ۱۹

غزلوں کے علاوہ میر حسن نے کہیں کہیں قصائد اور مثنویات کے اقتباس بھی بطور نمونہ پیش کیے ہیں۔ اس طرح اس تذکرے کے حصۂ نظم میں نفاست اور تنوع دونوں ہی خوبیاں یکجا ہو گئی ہیں۔

حاصل کلام یہ کہ یہ تذکرہ اپنی بعض خامیوں کے باوجود کئی پہلوؤں سے اردو ادب کی تاریخ میں امتیازی حیثیت کا حامل ہے۔ خصوصاً بارھویں صدی ہجری کے نصف آخر کی ادبی فضا اور ارتقائے شعری کی رفتار کے مطالعے میں اس سے کافی مدد ملتی ہے۔ میر حسن نے شخصیات کی خاکہ کشی اور تنقیدِ کلام کے جو نمونے پیش کیے ہیں، ان کی انفرادیت نے بھی ان کے مقام کو ہم عصر تذکرہ نگاروں کی صف میں کافی بلند کر دیا ہے۔

رموز الشعرا یا تذکرۂ شورش

بارھویں صدی ہجری کے اواخر میں عظیم آباد میں اردو شاعری کی روز افزوں مقبولیت کے زیر اثر تذکرہ نگاری کا جو رجحان پیدا ہوا، اس کی نمائندگی میں "تذکرۂ شورش" کا نام سرِفہرست ہے۔ یہ تذکرہ میر غلام حسین شورش عظیم آبادی (متوفی ۱۱۹۵ھ/۱۷۸۱ء) کی تالیف ہے۔ شورش میر محمد باقر حزیں اور مرزا گھسیٹا عشق کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ اگرچہ بحیثیت شاعر وہ اس مقام کے مستحق نہیں جو اس دور کے عظیم آبادی شعرا میں محمد عابد دل، محمد روشن جوشش اور ہیبت قلی خاں حسرت وغیرہ کو حاصل ہے لیکن تصنیفی و تالیفی شغف اور زبان و ادب کی خدمت میں غیر معمولی انہماک کے لحاظ سے وہ اپنے تمام ہم وطن معاصرین پر فوقیت رکھتے ہیں۔ تذکرے کی ترتیب سے چند سال قبل تقریباً ایک برس تک ان کے ہاں باقاعدگی کے ساتھ ہر جمعہ کو محفلِ مشاعرہ بھی منعقد ہوتی رہی تھی۔ اس مشاعرے میں عظیم آباد کے تمام اردو شعرا اور ادب دوست پابندی سے شرکت کرتے تھے۔

تذکرۂ شورش پہلی بار پروفیسر کلیم الدین احمد کی کوشش سے مطبوعہ صورت میں منظرِ عام پر آیا۔ انھوں نے اسے "تذکرۂ عشقی" کے ساتھ "دو تذکرے" کے عنوان سے دو جلدوں میں شائع کیا ہے۔ پہلی جلد ۱۹۵۸ء میں اور دوسری ۱۹۶۳ء میں لیبل لیتھو پریس رمنہ روڈ، پٹنہ سے چھپ کر شائع ہوئی ہے۔ یہ اشاعت بودلین لائبریری آکسفورڈ کے قلمی نسخے پر مبنی ہے جس کا آغاز شاہ عالم آفتاب کے ذکر سے

اور اختتام کاتب کی مختصر و مبہم تحریر "تمام شد تذکرۂ میر غلام حسین شورش پر ہوتا ہے۔ اس نسخے میں حروف تہجی کی ترتیب کے مطابق کل تین سو چوبیس (۳۲۴) شاعروں کا ذکر ہے[۱]۔ اس اشاعت کے منظرِ عام پر آنے کے بعد خانقاہِ رشیدیہ جون پور کے کتب خانے میں تذکرۂ شورش کا ایک اور قلمی نسخہ دستیاب ہوا جسے ۱۹۸۴ء میں پروفیسر محمود الٰہی کے بسیط مقدمے کے ساتھ اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ نے شائع کر دیا ہے۔ اس نسخے کے آخر میں کوئی ترقیمہ نہیں لیکن ابتدا میں ایک طویل اور مبسوط خطبۂ افتتاحیہ شامل ہے[۲]۔ نسخۂ آکسفورڈ کی طرح اس کا آغاز بھی شاہ عالم آفتاب کے ذکر سے اور اختتام انعام اللہ خاں یقینؔ کے اشعار پر ہوتا ہے لیکن شعرا کی تعداد، ان کی سلسلہ وار ترتیب اور ان سے متعلق بیانات کے لحاظ سے دونوں نسخے کافی حد تک ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ موخر الذکر نسخے میں دو سو ستاون[۲۵۷] شاعروں کے حالات و اشعار منقول ہیں[۳] جن میں بعض ایسے شعرا بھی شامل ہیں جن کے نام بودلین لائبریری کے نسخے میں نہیں ملتے۔ داخلی شواہد سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ نسخہ زمانۂ ترتیب کے اعتبار سے اول الذکر نسخے سے قدیم تر ہے۔

افتتاحیہ خطبے کی شمولیت و عدم شمولیت اور شعرا کی تعداد کے فرق جیسے بَیِّن اختلافات سے قطعِ نظر دونوں نسخوں کی مشترک تعارفی عبارات کے تقابلی

---

[۱] سلسلہ وار نمبروں کے غلط اندراج سے دھوکا کھا کر اشپرنگر، دی تاسی اور بعض دوسرے مصنفین نے اس تذکرے میں شامل شعرا کی تعداد تین سو چودہ بتائی ہے لیکن درحقیقت نسخۂ آکسفورڈ میں جو ان حضرات کا ماخذ ہے، تین سو چوبیس شاعروں کا ذکر ہے۔

[۲] انعام اللہ خاں یقینؔ کے حال میں شورشؔ نے تذکرے کے اس پیش لفظ کو "خطبہ" کا نام دیا ہے موقعے کی مناسبت سے افتتاحیہ ہمارا اضافہ ہے۔

[۳] محمود الٰہی صاحب نے شعرا کی تعداد دو سو تریسٹھ (۲۶۳) بتائی ہے جو درست نہیں۔ صحیح تعداد دو سو اکسٹھ ہے جن میں سے چار شاعروں کے حالات مکرر درج ہیں۔

مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ نسخۂ جون پور مولف کی کاوشِ قلم کا اصل مرقع ہے جب کہ نسخۂ آکسفورڈ میں کسی نامعلوم شخص نے جا بجا اپنے طور پر ترمیم و تحریف کی ہے۔ دستِ غیر کے اس دخل کا سب سے بڑا ثبوت خود مولفِ تذکرہ کا تعارف ہے۔ نسخۂ جون پور میں شورش نے اپنے ادبی اکتسابات اور تصنیفی و تالیفی کارناموں کے متعلق جو کچھ بتایا ہے، وہ خطبۂ افتتاحیہ کا ایک حصہ ہے۔ ابتدائی اوراق میں اس طرح خود کو قارئین سے متعارف کرا دینے کے بعد انھوں نے تذکرے میں دوسرے شعرا کے پہلو بہ پہلو اپنے ترجمۂ احوال کی تکرار کو غیر ضروری سمجھتے ہوئے صرف "غلام حسین شورش" کا عنوان قائم کر کے اپنے اشعار نقل کر دیے ہیں۔ اس کے برخلاف نسخۂ آکسفورڈ میں ان کا حال ان الفاظ میں درج ہے:

"سید غلام حسین عرف میر بھینا شورش تخلص، از نجابانِ عظیم آباد است۔ علم و فضل و ریاست از بزرگاں میراث دارد۔ در ابتدائے مشقِ سخن از خدمتِ میر باقر مرحوم کہ حزیں و ظہور تخلص می نمود، بہرۂ وافی برداشتہ۔ آخر دیوانِ خود را از نظرِ مرزا گھسیٹا عشق تخلص گذرانیدہ، فوائدِ کافی حاصل نمودہ۔ شعر بفصاحت و سلاستِ تمام می گوید۔ غزل در طرفۃ العین انجام می نماید۔ قصیدہ و مثنوی و رباعی بشستگی و رفتگی مالا کلام رقم پذیر می سازد۔ مذاق صوفیہ دارد۔ اکثر شعر ہم بمذاقِ صوفیہ می فرماید۔ کلیاتش قریبِ چار ہزار شعر بنظر درآمدہ ....."

(دو تذکرے، جلد دوم ص ۲)

قطع نظر اس سے کہ کوئی بھی باہوش اور معقول انسان اس طرح نثر میں اپنی زبان سے اپنے فضل و کمال، شرافت و نجابت اور فنی مہارت و مشاقی کی شان میں قصیدہ سرائی نہیں کر سکتا، منقولہ عبارت میں شروع سے آخر تک صیغۂ غائب کا استعمال اس حقیقت کی غمازی کر رہا ہے کہ یہ مولفِ تذکرہ کی بجائے کسی دوسرے شخص کی تحریر ہے۔ تذکرے کے مختلف اوراق سے اس قسم کے الحاق و تصرف

کی متعدد مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں[1] لیکن ایک طرف تو مولف کے علاوہ کسی دوسرے شاعر کے حالات میں اس یقین اور قطعیت کے ساتھ تحریف کی نشان دہی اور اس کے حدود کا تعین دشوار ہے، دوسری جانب ایک واضح مثال کی موجودگی میں متصرف کی طرف سے مولف کے بیانات کی قطع و برید اور ان میں بیجا اضافہ و حذف کے امکانات کو کسی جگہ بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس غیر یقینی صورتِ حال کے پیش نظر ہم تذکرے کے اس نسخے کو شورش کے خیالات و بیانات سے ان کی مسخ شدہ شکل میں واقفیت حاصل کرنے کی حد تک ناقابل اعتبار قرار دیتے ہوئے اپنے مطالعے کے لیے نسخۂ جون پور کا انتخاب کرتے ہیں۔

نسخۂ جون پور شروع اور آخر کے کم از کم ایک ایک ورق کے بقدر ناقص ہے۔ اس کے شروع میں جو خطبۂ افتتاحیہ بطورِ مقدمہ شامل ہے، اس میں اس تذکرے کا نام "رموز الشعرا" بتایا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ صراحت بھی موجود ہے کہ "اگر تذکرۂ شورش ہم گویند، مضائقہ ندارد" (ص ۷۰)۔ اسے محض اتفاق ہی کہا جا سکتا ہے کہ تذکرے کو اس دوسرے نام ہی سے شہرت حاصل ہوئی اور اصل نام زیرِ نظر نسخے کی دریافت تک معرضِ خفا میں رہا۔ شورش کے ہم عصر تذکرہ نگاروں میں صرف ابو الحسن امراللہ الہ آبادی نے اپنے ہاں کسی قدر تفصیل سے اس تذکرے کا

---

[1] ان متعدد مثالوں میں سے ایک مثال بطورِ نمونہ درج ذیل ہے:

نسخۂ جون پور میں شاہ غلام قلندر قلندرؔ کے بارے میں مولف کا بیان ہے کہ "قریب بست سال است کہ طرفِ مغرب تشریف می دارند" (ص ۴۷۲)، نسخۂ آکسفورڈ میں اس جگہ "قریب سی سال است کہ بطرفِ دہلی می باشند" (دو تذکرے۔ جلد دوم ص ۱۵۴) لکھا ہوا ملتا ہے۔ اول الذکر نسخے کے مطابق اس تذکرے کا سال ترتیب ۱۱۹۱ھ ہے۔ اس اعتبار سے پہلی تحریر ۱۱۹۱ھ کی اور دوسری ۱۲۰۱ھ کی ہونا چاہیے۔ چوں کہ شورش ۱۱۹۵ھ میں فوت ہو چکے تھے، اس لیے ۱۲۰۱ھ کی کسی تحریر کو ان سے منسوب نہیں کیا جا سکتا۔

ذکر کیا ہے لیکن وہ بھی اس نام سے ناواقف ہیں بلکہ اس کے برخلاف ان کا بیان یہ ہے کہ:

"نامش "یادگارِ دوستان" مقرر نمودہ وہم ازیں مصرع تاریخ تالیفش برآوردہ:

یادگارِ دوستانِ روزگار ....."[1]

موجودہ نسخوں کی کسی تحریر سے اس روایت کی تائید نہیں ہوتی۔ ممکن ہے کسی دوسرے نسخے میں اس قسم کی کوئی صراحت موجود ہو کیوں کہ اس سلسلے میں امراللہ کا بغیر کسی بنیاد کے اپنی طرف سے کچھ لکھ دینا بالکل بے ضرورت اور بعید از قیاس معلوم ہوتا ہے۔ امراللہ کی تحریر کے دوسرے جز یعنی مصرعۂ تاریخِ تالیف کا بھی ان نسخوں میں کوئی ذکر نہیں لیکن اس مصرعے سے جو سنہ (۱۱۹۱ھ) برآمد ہوتا ہے وہ امرِ واقعہ کے عین مطابق ہے۔ شورش نے اگرچہ علیحدہ سے زمانۂ تالیف کے سلسلے میں کوئی وضاحت نہیں کی ہے لیکن نسخۂ جون پور میں غلام علی اظہر کے حال میں ان کا یہ جملۂ معترضہ کہ

"قبل ازیں ارادۂ تحریرِ تذکرہ نبود ..... الحال در سنہ ۱۱۹۱ھ مزاجِ احقر بایں طرف مائل شدہ" (ص ۸۲)

اس حقیقت کا پتا دیتا ہے کہ یہ تذکرہ ۱۱۹۱ھ میں مرتب ہوا ہے اس لیے اس مصرعے کو تاریخِ تالیف تسلیم کر لینے میں کوئی عذر مانع نہیں۔ ۱۱۹۱ھ/۱۷۷۷ء کے بعد تذکرے کے ابتدائی متن میں کسی ترمیم و تغیر کے متعلق زیرِ بحث نسخے سے کوئی معلومات حاصل نہیں ہوتی۔

خطبۂ افتتاحیہ میں شورش نے عظیم آباد کے ادبی ماحول، تخلیقی و تصنیفی کاموں سے اپنی دل چسپی، تذکرے کی تالیف کے اسباب و اغراض، فنِ شعر کی عظمت، اہمیت اور ریختہ کے مختلف اقسام کے متعلق ضروری معلومات فراہم کی ہیں۔ عظیم آباد کے

---

[1] تذکرہ مسرت افزا، شائع کردہ قاضی عبدالودود ص ۱۱۲

شعری ماحول کی تعمیر و تشکیل کو وہ براہِ راست شعرائے دہلی کے فیضان کا رہینِ منت قرار دیتے ہیں۔ ان کے بیان کے مطابق عظیم آباد میں اردو شعر و سخن کی بنائیں دہلی کے بعض اساتذہ کی تخلیقات کے وہاں تک پہنچنے اور ادبی حلقوں میں قبولِ عام حاصل کرنے کے بعد ہی استوار ہوئیں۔ مرزا مظہر جانِ جاناں، میر محمد باقر حزیں، انعام اللہ خاں یقین، محمد فقیہ دردمند اور منشی بساون لال بیدار کے کلام کی شہرت و مقبولیت وہاں نادر شاہ کے حملے (۱۱۵۱ھ مطابق ۱۷۳۹ء) سے قبل ہی عام ہو چکی تھی۔ اس کے بعد کی ادبی فضا اور اس کے زیرِ اثر اپنے ذوقِ سخن کی تہذیب و تربیت کا حال انھوں نے ان الفاظ میں سپردِ قلم کیا ہے:

"بعد نادر شاہی میر باقر موصوف از شاہجہان آباد تشریف بہ عظیم آباد آوردند ..... و گفتگوے شعر و شاعری بطورِ مرزا موصوف (مرزا مظہر) رواج یافتہ۔ بہ تفضّلِ برادرِ گرامی قدر میر محمد رضاے جرأت کہ فاضلِ جید بودند و در نثر و نظم مہارتِ کمال داشتند و گاہے غزلِ فارسی بمشورۂ فقیہ صاحب مذبور می فرمودند، میلانِ طبیعتِ احقر طرفِ ریختہ آمدہ غزل گفتہ۔ بعدازاں برادرِ مسطور ایں عاصی را بمیر باقر مذکور سپرد فرمودہ تا بیست غزل اصلاح از میر باقر موصوف گرفتہ بعدہ مزاجِ احقر مائل طرفِ مثنوی شد۔ مثنوی "درد و الم" و "باغ و بہار" گفتہ۔ بعدۂ میر باقر حزیں و میر محمد رضاے جرأت رحلت از عالمِ فانی بعالمِ جاودانی نمودند[1] صحبت شعر و شاعری برہم خوردہ و زندگی بے حلاوت گردیدہ۔ بعدِ یک سال چوں قدرے مزاج درست و بحال شدہ، مثنوی سوم در تعریفِ علی باغ مشتمل بر مدحِ حضرت مولوی محمد وحید قدس سرہٗ و زائر حسین صاحب غفرلہٗ باتمام رسانیدہ و گاہے غزل ہم می گفت و دیوانِ خود درست می ساخت۔

---

[1] جرأت نے ۹ محرم ۱۱۶۷ھ کو وفات پائی۔ سالِ رحلت میر ہادی کے مستخرجہ مادہ تاریخ "سید محمد رضا" سے نکلتا ہے۔ تذکرہ شورش۔ دو تذکرے، جلد اول ص ۱۷۳

دریں ضمن خمسۂ مرزا محمد رفیع سودا سلمہ اللہ تعالیٰ کہ ایں مصرعۂ یقین غفرلہٗ ع:
"کیا کام کیا دل نے دیوانے کو کیا کہیے" مصرعۂ پنجم او بود، شہرت دریں شہر یافتہ۔
بعدۂ غزل مرزا و اشعارِ حضرت خواجہ میر درد وغیرہ از دہلی رسیدہ و شہرت یافتہ و طرزِ
سخن بطورِ دیگر گردیدہ۔

حسبِ اتفاق در صوبہ داریٔ میر محمد کاظم خاں بہادر احترام الدولہ بصلاحِ
دوستان و آشنایانِ محفلِ مشاعرہ بروز جمعہ قرار یافتہ و دراں وقت اکثر صاحبانِ
مہربان فکرِ اشعارِ فارسی و ریختہ می فرمودند۔۔۔۔۔۔ دریں عرصہ شاہ سالکن از
محمد آباد بنارس و خواجہ عبداللہ آگاہ سلمہ اللہ تعالیٰ از مرشد آباد تشریف آوردند۔
میر غلام علی اظہر گفتند کہ حضرت شاہ رکن الدین عشق عرف حضرت مرزا گھسیٹا صاحب
مدظلہ العالی از مرشد آباد ترکِ روزگار نمودہ نیز بہ عظیم آباد تشریف آوردہ اند[1] اگر
دریں محفلِ مشاعرہ تشریف آرند، احسن است۔ احقر ہمراہِ میر مذکور رفتہ ملازمت
نمود و متصدیع (مصدع) خدمت گرامی شد۔ از راہِ نوازش قبول فرمودند و تا محفلِ
مشاعرہ کہ کم از یک سال نماندہ، تشریف مع میر محمد امین صاحب دیوانہ غفرلہٗ
ارزانی می فرمودند" (ص ص ۵۴ و ۵۵)

ماہِ رمضان کے آغاز کے ساتھ یہ محفلِ سخن برہم ہوگئی۔ لیکن شورش کو اس عرصے میں مرزا گھسیٹا عشق سے جو نیازمندانہ وابستگی پیدا ہوگئی تھی اس کی بنا پر وہ برابر ان کی خدمت میں حاضری دیتے اور ان کے ارشادات گرامی سے مستفید ہوتے رہے لکھتے ہیں کہ:

---

[1] آگے چل کر عشق کے حالات میں شورش نے یہ بتایا ہے کہ "از بست و دو سال در عظیم آباد تشریف آوردہ۔۔۔۔ استقامت فرمودہ" اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مرزا صاحب ۱۱۶۹ھ یا ۱۱۷۰ھ (۵۷-۱۷۵۶ء) میں عظیم آباد پہنچے تھے۔ گمان غالب یہ ہے کہ انھوں نے جمادی الاولیٰ ۱۱۷۰ھ/جنوری ۱۷۵۷ء میں جنگ پلاسی میں سراج الدولہ کی شکست کے بعد مرشد آباد کی سکونت ترک کی ہوگی۔

"دراں وقت اکثر مردم بخدمت عالی مثنوی حضرت مولوی روم قدس سرہٗ وملمعات وشرح رباعیات مولوی جامی نوراللہ مرقدہٗ می خواندند۔ ایں عاصی ہمراز دورِ سماعت می نمود وسوائے ازیں ہرچہ ارشاد می فرمودند، آن را بطور ملفوظ قلمبند می ساخت۔" (ص ۵۵)

ان جلسوں میں دو ایک بار شعرائے اردو کے تذکروں کا بھی ذکر آیا۔ حتیٰ کہ ایک روز مرزا صاحب نے ان کے بعض اہم نقائص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شورش سے ایک تذکرہ مرتب کرنے کی فرمائش کی۔

"روزے ارشاد شد کہ شخصے در تذکرۂ خود یک شعر از قصیدۂ مرزا محمد رفیع سودا نوشتہ است دیگر خیر[1]۔۔۔۔۔۔ روزے باز حضرت مرزا صاحب ارشاد فرمودند کہ مردمان کاہ را کوہ وکوہ را کاہ می نمایند اشعارِ ہریک بقدرِ ہریک نمی نویسند، اگر شما تذکرہ بنویسید، خوب است۔۔۔۔۔ امرِ عالی را سعادتِ دارین تصور نمودہ تحریر می نماید والّا نہ، ایں ہیچمداں را دریں فن چہ شعور وچہ مقدور کہ دم زند۔"

(ص ص ۵۵ و ۵۶)

تذکرے کی ترتیب کے اس پس منظر پر روشنی ڈالنے کے بعد شورش نے کسی قدر تفصیل کے ساتھ فن شعر کی عظمت واہمیت کے بارے میں اپنے تاثرات وخیالات قلم بند کیے ہیں۔ خطبے کا یہ حصہ "شاعری جزویست از پیغمبری" کی تشریح وتفسیر ہے۔ شورش کے نزدیک وحی الٰہی اور کلامِ موزوں ایک ہی سلسلے کی دو کڑیاں ہیں، کیونکہ ان دونوں کا مبدا ایک ہے اور الہامی والقائی کیفیت ان دونوں کے درمیان ایک قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتی ہے۔ انبیا کی طرح شعرا بھی براہ راست فیضانِ الٰہی سے مستفید ہوتے ہیں۔ ان کا یہ امتیاز انھیں عوام الناس پر برتری عطا

---

[1] میر صاحب کی جانب اشارہ ہے جنھوں نے اپنے تذکرے میں قصیدہ تضحیکِ روزگار کا صرف ایک شعر نقل کیا ہے۔ ملاحظہ ہو "نکات الشعرا" طبع ثانی ص ۳۱

کرتا ہے۔ شعر کی عظمت اور برتری کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ قرآن حکیم کی ابتدا بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے ہوتی ہے جو نثر کی بجائے نظم کا ایک ٹکڑا بلکہ مکمل مصرع ہے۔ اس کے علاوہ بھی کلامِ موزوں کی مثالیں قرآن حکیم میں جا بجا موجود ہیں۔

اقسامِ ریختہ سے متعلق شورش کے بیانات میر صاحب کے فرمودات کی صدائے بازگشت معلوم ہوتے ہیں۔ پروفیسر محمود الٰہی صاحب کا تاثر اس سے قدرے مختلف ہے۔ انھوں نے خطبۂ افتتاحیہ کے اس حصے پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

"اس باب میں شورش نے میر کے بیانات پر گراں قدر اضافے کیے ہیں، جنھیں اردو میں قواعد سازی کی ابتدائی کاوشوں کا جائزہ لیتے ہوئے نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔

میر نے ریختہ کی چھ قسمیں بتائی ہیں۔ شورش نے اقسام کی تعداد دس تک پہنچا دی ہے۔ (لیکن) یہ تقسیم کس بنیاد پر عمل میں آئی (ہے) اس کی نشان دہی نہ تو میر نے کی (ہے) اور نہ شورش نے۔" (ص ۴۷)

اس تبصرے میں ڈاکٹر صاحب نے اقسامِ ریختہ کی جس بڑھی ہوئی تعداد کو گراں قدر اضافے سے تعبیر فرمایا ہے وہ دراصل میر صاحب کے بیانات کی بیجا قطع و برید اور ان میں لایعنی تصرف کا نتیجہ ہے جس کا اندازہ ذیل کی مثالوں سے کیا جا سکتا ہے۔ میر صاحب کی تقسیم کے مطابق ریختہ کی چوتھی قسم کی تفصیل یہ ہے کہ:

"ترکیبات فارسی می آرند اکثر ترکیب کہ مناسب زبانِ ریختہ می افتد آن جائز است و ایں را غیر شاعر نمی داند... ترکیبے کہ مانوس ریختہ می باشد آن معیوب است و دانستنِ ایں نیز موقوف بہ سلیقۂ شاعری است۔ اگر ترکیبِ فارسی موافق گفتگوے ریختہ بود، مضائقہ ندارد۔"[1]

---

[1] نکات الشعرا طبع ثانی ص ۱۷۹

شورش نے میر صاحب کے اس بیان کو بالکل غیر ضروری طور پر دو حصوں میں تقسیم کر کے ایک قسم کے اضافے کی گنجائش نکال لی ہے۔ سلسلہ وار ترتیب کے تھوڑے سے فرق کے ساتھ لکھتے ہیں :

"پنجم اکثر ترکیبِ فارسی کہ مناسبِ زبان ریختہ افتد، آں جائز است چنانچہ گفتہ ؏ میرِ گم کردہ چمن زمزمہ پرداز ہے ایک۔

ششم ترکیبے کہ نامانوسِ زبانِ ریختہ باشد این است ؏ دل دادہ ام زکفِ رخِ دلبر ندیدہ ہوں۔ و یا مضاف فارسی باشد و مضاف الیہ ہندی باشد، ممنوع است و یا مبتدا فارسی و خبرش ہندی (اگر) مانوسِ زبانِ ریختہ باشد درست است ...." (ص ص ۶۴ و ۶۵)

میر صاحب نے ریختہ کی چھٹی اور آخری قسم کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے :

"ششم انداز است کہ ما اختیار کردہ ایم و آن محیطِ ہمہ صنعت ہاست تجنیس، ترصیع، تشبیہ، صفائے گفتگو، فصاحت، بلاغت، ادا بندی، خیال وغیرہ ایں ہمہ در ضمن ہمین است[1]"

یہاں میر صاحب کا موضوعِ گفتگو وہ اندازِ سخن ہے جو انھوں نے اور ان کے معاصرین نے اختیار کیا تھا اور جس میں حسبِ موقع و ضرورت تمام محاسنِ شعری سے آرائشِ کلام کے امکانات موجود تھے۔ شورش غور و فکر کی کمی کی وجہ سے گفتگو کے اس مرکزی نقطے تک پہنچنے سے قاصر رہے۔ چنانچہ انھوں نے بزعمِ اجتہاد اس جامع اور ہمہ گیر تصور کو پارہ پارہ کر دیا اور ہر صنعت کو شاعری کی ایک علیحدہ قسم سے تعبیر کرتے ہوئے میر صاحب کی بیان کردہ قسم ششم کی بجائے حسب ذیل چار اقسام قائم کر ڈالیں :

"ہفتم شعر تشبیہ ..... ہشتم شعر توشیح۔ توشیح آن را گویند کہ از حرفِ

---

[1] نکات الشعرا طبع ثانی ص ۱۸۰

اوّلِ ہر مصرع نامِ خود یا دیگرے برآرند ..... واز آخرِ مصرع ہم حرف می گیرند واز مصرع ثانی ہم حرفِ اول و آخر می گیرند۔ نہم از صنائع شعر لف و نشر مرتب است ..... دہم تجنیس است ....." (ص ص ۶۵ و ۶۶)

اول تو یہ صنعتیں صرف اردو شاعری کے ساتھ مخصوص نہیں، اس لیے اقسامِ ریختہ کے باب میں ان کا تذکرہ قطعاً بے معنی ہے۔ دوسرے اگر میر صاحب کے فرمودات میں ترمیم کی گنجائش کا عذر تراش کر شورش کی اس تقسیم کو قابلِ قبول تصوّر کر لیا جائے تو صنائع لفظی و معنوی کی کثرتِ تعداد کے پیشِ نظر اقسامِ ریختہ کی کوئی حد متعین نہ کی جا سکے گی۔

اقسامِ ریختہ کی اس بحث کے ذیل میں شورش نے اپنے قارئین کو مختصراً علم عروض کے مبادیات سے بھی روشناس کرانے کی کوشش کی ہے اور ہیئت کے لحاظ سے اصنافِ سخن کے حدود کا بھی تعین کیا ہے۔ ہم یہاں بنظرِ اختصار ان مباحث کی تفصیل سے کنارہ کرتے ہوئے غزل کی ہیئتِ ترکیبی کے متعلق ان کا بیان بطورِ نمونہ نقل کرتے ہیں:

"غزل را تا سہ بیت گفتہ اند، یکے مطلع، دویم مقطع، سیوم بیت الغزل و بعضے پنج بیت فرمودہ اند، یکے مطلع و دیگر حسن مطلع و بیت الغزل و حسن مقطع و مقطع۔ ازیں کمتر غزل نمی شود زیادہ تا نوزدہ بیت بلکہ بیست و پنج بیت دیدہ شد۔" (ص ۶۸)

بحث کے خاتمے پر شورش کے ہاں ایک بار پھر درج ذیل ہدایات کی شکل میں میر کے اقوال کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے:

"شاعر را می باید کہ تصرف در مثل نکند و صحتِ لفظِ ہندی و فارسی و عربی کہ داخلِ محاورۂ فصحائے اردوے معلّٰی است، نگاہ دارد و در پئے تلاشِ ایں باشد، ہرگز تغافل نہ کند و برائے تلاشِ لفظ فصاحت و بلاغت را از دست ندہد و اگر ہر دو میسر آید اولیٰ ..... و بہترین شعر انداز است و آں محیطِ ہمہ

صنعت ہاست۔ ہر صنعت کہ فرض کنند داخلِ انداز است خارج نیست۔" (ص ۶۹)

مقدمے کے آخر میں شورش نے تذکرے کی ترتیب کے لیے اپنی آمادگی کی ایک خاص وجہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

" در ہندوستان اکثر بزرگان تذکرہ نوشتہ اند و اشعار شاعرانِ قدیم و جدید بقیدِ قلم آوردہ اند مگر دریں شہر گاہے کسے تذکرۂ فارسی ہم نہ نوشتہ، بہ ہندی چہ رسد۔ بنا بریں محنت را برخود اختیار نمودہ کہ احوال و اشعار شاعرانِ ایں جا مع اشعارِ شاعرانِ ہندوستان بقیدِ قلم آرد کہ در زمانہ حال و استقبال یادگار گردد۔" (ص ۷)

شورش کے ابتدائی بیانات کے اس تفصیلی جائزے کے بعد تذکرے کی تالیف کے اسباب اور مقاصد و محرکات کے سلسلے میں جو باتیں سامنے آتی ہیں، وہ حسب ذیل ہیں:

(الف) عظیم آباد میں اردو شاعری کی روز افزوں مقبولیت نے تذکرہ نویسی کی ضرورت کا احساس پیدا کیا

(ب) زیرِ بحث تذکرے کی تالیف مرزا گھسیٹا عشق کے ایما پر عمل میں آئی۔

(ج) تذکرے کی ترتیب کا اصل مقصد دوسرے تذکرہ نگاروں کی روش کے برخلاف ہر شاعر کے صحیح مرتبے کے مطابق اس کے کلام کا انتخاب پیش کرنا اور

(د) عظیم آباد کے شعرا کو شائقین شعر و ادب سے روشناس کرانا ہے۔

تذکرے کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی ترتیب سے قبل شعرائے اردو کے جو تذکرے مرتب ہو چکے تھے، شورش ان میں سے صرف میر اور گردیزی کے تذکروں سے واقف ہیں۔ انھوں نے شعرا کے حالات و اشعار کی فراہمی میں ان دونوں تذکروں سے کافی مدد لی ہے لیکن شفیق اورنگ آبادی کی طرح میر کے تذکرے سے وہ بھی پوری طرح مطمئن نہیں[1]

---

[1] میر صاحب کے ذکر میں لکھتے ہیں کہ "در تذکرۂ خود ہم عصرانِ خود را در پایۂ التزام کشیدہ و اکثرے را ہجو نمودہ مگر بعضے اعزہ کہ از و مربوط بودند آن را محفوظ داشتہ۔" (ص ۴۸۹)

چنانچہ "چمنستان شعرا" کی مانند یہ تذکرہ بھی دراصل "نکات الشعرا" کے خلاف ردعمل کے سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ مرزا گھسیٹا عشق کے یہ اعتراضات کہ ایک تذکرہ نگار نے سودا کے قصیدے کا صرف ایک شعر اپنے ہاں نقل کیا ہے اور عام طور پر تذکرہ نگار انتخابِ کلام میں فرقِ مراتب کا خیال نہیں رکھتے، جن میں بلاشک وشبہ یہی تذکرہ موردِ تنقید ہے، اس جانب واضح اشارہ کرتے ہیں۔ جیسا کہ پروفیسر محمود الٰہی کا بھی خیال ہے "نکات الشعرا" کے مقابلے میں "رموز الشعرا" نام رکھنا بھی اسی حریفانہ طرزِ فکر کی غمازی کرتا ہے۔ اگرچہ بظاہر اس ردعمل کی خاص وجہ یقین کی موزوں طبعی کے بارے میں میر کے شکوک وشبہات معلوم ہوتے ہیں جن کی تردید پر شورش نے کافی زورِ قلم صرف کیا ہے لیکن نکات الشعرا سے مرزا گھسیٹا عشق کی بے اطمینانی اور ان کے ایما سے شورش کی ترتیبِ تذکرہ کے لیے آمادگی کا ایک اہم سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ عشق کا ذکر اس تذکرے میں شامل نہیں۔

جہاں تک عام شعرا کے تعارف کے سلسلے میں "نکات الشعرا" اور تذکرۂ گردیزی کے نقائص کی تلافی یا ان کی سطح سے بلند تر ہو کر کچھ لکھنے کا تعلق ہے، شورش اعتدال پسندی اور رتبہ شناسی کو اپنا مطمحِ نظر بنا کر کام شروع کرنے کے باوجود بہت زیادہ کامیاب نہیں رہے ہیں۔ انھوں نے نہ صرف یہ کہ میر اور گردیزی کی معلومات پر بالعموم کوئی اضافہ نہیں کیا ہے بلکہ اکثر انھی کے بیانات بجنسہٖ انھی الفاظ میں یا چند لفظوں کے ناقابلِ لحاظ ردوبدل کے ساتھ اپنے ہاں نقل کر لیے ہیں۔ اس اخذ واقتباس کی مثالیں بعض اوقات یکے بعد دیگرے اس تواتر کے ساتھ سامنے آتی ہیں کہ اس تذکرے کی انفرادی حیثیت ہی مجروح ہونے لگتی ہے۔ ہم یہاں کسی خاص ترتیب اور تسلسل کا خیال رکھے بغیر ان میں سے چند مثالیں بطورِ نمونہ پیش کرتے ہیں:

(الف) شاہ ولی اللہ اشتیاق:

"از نبائرِ شیخ مجدد الفِ ثانی است وطبعش موجدِ معانی۔ باوصفِ ذکر وفکر دینی گاہے شغلِ شعر ہم می کرد ..... (ماخوذ از تذکرہ گردیزی) ..... در تذکرۂ میر

مرقوم است نبیسۂ شاہ محمد گل، مولدِ او سرہند است۔ در کوٹلہ فیروز شاہ سکونت داشت فکر ریختہ می نمود۔" (ص ۷۶)

(ب) محمد اسمٰعیل بیتاب :

"در تذکرۂ میر مرقوم است کہ مردِ درویش بود۔ شاگردِ میاں یکرنگ۔ بسیار مربوط و مضبوط الاحوال۔ دریں ایام بخانۂ جعفر علی خاں می رفت کہ از پشتِ اسپ بر افتاد و دستش شکست۔ بیماریٔ دو سہ ماہ کشید۔ آخر از ہمان آزار راہِ فنا گرفت۔ خدا مغفرت کند۔" (ص ۱۰۷)

(ج) میاں صلاح الدین عرف مکھن پاکباز تخلص :

"در تذکرۂ تقی میر مرقوم است کہ شخصے است گوشہ نشین، شاگردِ میاں یکرنگ۔ بسیار کم اختلاط، گویا آشنا شدن را نمی داند۔ پسرِ میاں شاہ کمال، نبیرۂ شاہ جلال قدس سرہٗ است۔ اکثر بورد و وظائف مشغول باشد۔ در مجمعِ شاعرانِ ریختہ کہ بتاریخِ پانزدہم ہر ماہ قرار یافتہ است، اگر دماغ وفا می کند، تشریف می آرد۔ مزاجش خالی از وحشت نیست۔" (ص ۱۲۴)

(د) میر شیر علی جرأت :

"در تذکرۂ سید فتح علی تبریزی (کذا) مرقوم است کہ دل بستۂ صحیح قدان بود و تحصیلِ کتبِ متداولہ می نمود۔ شعر را کم می گفت و اگر احیاناً می گفت، کمتر می خواند۔ ازاں روزے از شاہجہان آباد متوجۂ طرفِ ملکِ دکن شدہ، باز بر حالش اطلاع نہ گردیدہ۔" (ص ۱۴۳)

عظیم آباد اور اس کے اطراف و نواح سے تعلق رکھنے والے شعرا کے بارے میں شورش کے بیانات البتہ کسی قدر مفصل اور معلومات افزا ہیں۔ یہاں بھی اگرچہ انھوں نے بجز ایک دو مقامات کے کسی جگہ سنین و تواریخ کے تعین سے کوئی سروکار نہیں رکھا ہے پھر بھی ان کے بیانات سے بعض شاعروں کے متعلق کچھ ایسی باتیں ضرور معلوم ہو جاتی ہیں جن کا ذکر دوسرے تذکرہ نگاروں کے ہاں موجود نہیں۔ مثال کے طور پر درجِ

ذیل اقتباسات میں پیش کی ہوئی معلومات سے ہماری واقفیت کا واحد ذریعہ صرف یہی تذکرہ ہے۔

(الف) محمد روشن جوشش :

"ساکن محلہ لودی کٹرہ، من محلاتِ بلدۂ عظیم آباد۔۔۔۔۔" (ص ۱۵۱)

(ب) ہیبت قلی خاں حسرت :

"۔۔۔۔ اول بنائے ریختہ در عظیم آباد ایشان ریختہ۔۔۔۔" (ص ۱۹۴)

(ج) محمد عابد دلؔ :

"۔۔۔۔ در جنگِ شاہ عالم بادشاہ[1] ہمراہِ راجہ رام نرائن صوبہ دار عظیم آباد بودہ وزخمی شدہ در میدان افتاد۔ میاں محمد روشن (جوشش) ہمراہ بودند۔ آخر بخانۂ خود آمدہ ہر چند تدبیرات نمودہ لیکن یک دست و یک چشم از کار رفتہ و دستِ دیگر ہم مجروح است۔" (ص ۲۴۶)

(د) شاہ رکن الدین عرف مرزا گھسیٹا عشقؔ :

"۔۔۔۔ از بست و دو سال در عظیم آباد تشریف آوردہ ترکِ روزگار نمودہ استقامت فرمودہ۔۔۔۔۔" (ص ۴۳۸)

(ہ) اشرف علی خاں فغاںؔ :

"در عشرۂ ماہ محرم قبل از شمشیر خانی[2] در عظیم آباد تشریف آوردہ۔۔۔۔ چند روز نگذشتہ بود کہ بموجبِ طلبِ احمد شاہ بہادر بادشاہ روانۂ طرفِ دہلی گردیدہ در انجا کوکہ خان خطاب یافتہ۔ بعدِ تخللِ سلطنتِ شاہِ موصوف باز تشریف بہ عظیم آباد آوردہ و بخدمتِ مہاراجہ شتاب رائے دوستی پیدا نمودہ و بوسیلۂ ظرافت چناں پیشین

---

[1] جنگ بکسر کی طرف اشارہ ہے جو ۲۶ ربیع الثانی ۱۱۷۸ھ/ ۲۳ اکتوبر ۱۷۶۴ء کو وقوع پذیر ہوئی تھی۔

[2] شمشیر خان افغان کی بغاوت محرم ۱۱۶۱ھ کا واقعہ ہے۔ اس بغاوت ہی کے دوران ۲۲ محرم (۱۳ جنوری ۱۷۴۸ء) کو زین الدین احمد خاں بہادر ہیبت جنگ نائب صوبہ دار بہار قتل ہوئے۔

آمدہ کہ التقا بہم رسانیدہ وخطاب ظریف الملک مصاحب الدولہ یکہ تاز جنگ یافتہ ۔۔۔۔" (ص ۴۵۰)

جن شاعروں کے تعارف پر شورش نے خاص توجہ صرف کی ہے، ان سے متعلق واقعات کے بیان میں ان کے ہاں ایسے قرائن اور حوالے خاصی تعداد میں موجود ہیں جن سے ان کے زمانۂ وقوع کی دریافت میں مدد ملتی ہے اور کسی حد تک اس کمی کا ازالہ ہو جاتا ہے جو تواریخ وسنین کے التزام سے بے اعتنائی کا نتیجہ ہے۔ درج ذیل مثالوں سے اس خصوصیت کا اندازہ ہو گا۔

(الف) غلام علی اظہر:

"خلف الرشید میر محمد جعفر۔ میر غلام علی اظہر سلمہ اللہ تعالیٰ روزے می فرمود بر سبیلِ حکایت کہ جدِ من ہمراہِ رکابِ امیر تیمور آمدہ در دہلی مسکن اختیار نمودہ۔ تا وقتِ محمد شاہ بادشاہِ فردوس آرام گاہ نمطِ نوکری وخداوندی بجا بود۔ باعثِ تخللِ سلطنت تفرقہ رو نمود۔ ہمراہِ رکابِ شاہ عالم بادشاہِ غازی احقر بہ عظیم آباد آمدہ۔ بعدِ فتح راجہ رام نرائن صوبہ دار بسببِ عدم حصول زر بموضع سیلاوا ندک فرصت گرفتہ بعدہٗ بشہر آمدہ۔ ذوقِ شعر وشاعری از صبحِ شعور بود۔ شاگردیٔ میر شمس الدین فقیر غفرلہ اختیار نمودہ وبرائے استحکامِ ایں فکر از میزان تا مطول خواندہ وگاہے ہیئت وگاہے ہندسہ وغیرہ بمطالعہ آوردہ۔ بہر حال ایں دولت علم عربی در عظیم آباد بہم رسانیدہ۔ واقعی در فنِ شعرِ فارسی الحال دریں شہر ذاتِ والا صفاتِ ایشاں غنیمت است واز لوازمِ ایں اطلاع کلی دارد۔ در محفلِ مشاعرۂ فقیر (شورش) غزلِ طرحی بوجہ احسن سر براہ فرمودہ وبہ پاسِ خاطرِ دوستان دو سہ غزل ریختہ نیز گفتہ۔ بعدِ چندے باعثِ صحبت واتحادِ قدیم حضرت عشق مدظلہ العالی قریب پنجاہ غزلِ ریختہ طرح فرمودہ۔" (ص ص ۸۱ و ۸۲)

(ب) منشی بساون لعل بیدار:

"کاملِ روزگار منشی بساون لعل بیدار، صاحبِ دیوانِ فارسی، شاگرد حضرت

مرزا مظہر مدظلہ العالی۔ برفاقتِ غلام حسن خاں خلفِ نواب اعظم خان دیوانِ بادشاہی پیش از نادر شاہی تشریف آورد و تا بودنِ خدمتِ دیوانی خاں صاحب موصوف بعظیم آباد ماندہ و باز تشریف بہ شاہجہان آباد برد و ازاں روز یکہ غلام حسن خاں صاحب موصوف ہمراہ نواب صفدر جنگ وزیر برآمدہ در مرشد آباد استقامت ورزیدہ۔ منشی صاحب را بخدمتِ نواب شہامت جنگ سپرد فرمودہ۔ بعدِ انتقالِ نواب شہامت جنگ غفرلہٗ منشی صاحب دست از روزگار برداشتہ بہ عظیم آباد تشریف آوردہ و بطریقِ سیر بخدمت شیخ عبدالشکور صاحب غفرلہٗ رفتہ۔ چندے در سرکارِ ترہت و چندے در سرکارِ چنپارن تشریف داشت۔ اکثر مردم از فیضِ صحبتِ تربیت یافتہ چنانچہ ایں احقر قدرے دیوانِ حضرتِ مرزا موصوف (مظہر) خواندہ ۔۔۔۔۔ قریب چہار سال است کہ بطرف محمد آباد بنارس رفتہ۔ الحال معلوم گشتہ کہ در کاشی قیام نمودہ در یادِ مولیٰ کہ از ہمہ افکار اولیٰ است، لیل و نہار مشغول می باشد۔" (ص ۱۱۷)

(ج) ہیبت قلی خاں حسرت:

"شاعرِ صاحب جرأت، ہیبت قلی خاں حسرت عرف میر محمد حیات سلمہ اللہ تعالیٰ کہ اول بنائے ریختہ در عظیم آباد ایشان ریختہ۔ حسبِ اتفاق بعد نادر شاہی میر باقر موصوف غفرلہ از شاہجہان آباد بہ عظیم آباد تشریف آوردہ۔ میر محمد حیات مذکور شاگردیٔ میر مسطور اختیار نمودہ ۔۔۔۔۔۔ ہمراہِ ایشاں بہ پرنیہ تشریف بردہ آنجا داروغۂ دیوان خانۂ نواب شوکت جنگ شہید شدہ۔ بعد ازاں از ہمشیرۂ میر باقر مذکور منسوب گشتہ و داروغۂ دیوان خانہ نواب سراج الدولہ گردیدہ و در رفاقت آں کارہا نمودہ و از فضلِ الٰہی بعزت و بحرمت ماندہ بلکہ خطاب خانی و جاگیر یافت ۔۔۔۔۔ دریں روزہا نوکرِ نواب مبارک الدولہ اند و در مرشد آباد بدستور قیام می دارند۔" (ص ۱۹۴)

(د) میر محمد باقر ظہور:

"خلف فخر اللہ خاں ساکنِ عظیم آباد۔ بعدِ شہادتِ خان موصوف تشریف بہ شاہجہان آباد بردہ و بخدمت برادر نسبتی خواجہ محمدی خاں صاحب غفرلہٗ رسیدہ

وشاگردِ حضرت مرزا مظہر گردیدہ، حزیں تخلص یافتہ چنانچہ مشہور و معروف است کہ صاحبِ دیوان است۔ آخر در وقتِ حکومت نواب زین الدین احمد خاں ہیبت جنگ از دہلی مراجعت نمودہ در سرکارِ نواب موصوف نوکر گشتہ بسیار بعزت و حرمت اوقات بسری برد۔ دیوانِ دیگر در ڈھاکہ درست فرمودہ و تخلص ظہور قرار دادہ۔ چوں باز در عظیم آباد آمدہ ساقی نامہ و ترجیع بند تصنیف نمودہ۔ آخر ہمراہِ نواب صولت جنگ بوسیلۂ میر محمد وحید صاحب و قبلہ مغفور در پرنیہ رفت و جان بجاناں داد۔ در روضہ حضرت شاہ مصطفیٰ جمال الحق قدس سرہٗ زیرِ چبوترہ جائے مدفن یافت۔"

(ص ص ۴۱۹ و ۴۲۰)

عام شاعروں کے تعارف میں مختصر نگاری یا میر اور گردیزی کے بیانات پر اکتفا کے علاوہ "تذکرۂ شورش" کا ایک نمایاں نقص یہ بھی ہے کہ اس کے مولف نے سیرت و شخصیت کے مطالعے کو مطلقاً غیر ضروری تصور کیا ہے۔ اخلاق و عادات، مزاج و طبیعت اور علمی و ذہنی صلاحیتوں کے متعلق اظہارِ خیال سے صرف نظر کی یہ کیفیت شورش کے یہاں اس قدر عام ہے کہ دور افتادہ معاصرین اور متقدمین کے پہلو بہ پہلو ان کے احباب و اعزہ اور ہم وطن معاصرین بھی اس کی زد سے نہیں بچ سکے ہیں۔ چنانچہ سرسری اندازے کے مطابق دو سو ستاون (۲۵۷) میں سے تقریباً دو سو چالیس (۲۴۰) شاعروں کے ترجمے شخصیت کے ان عناصرِ ترکیبی کے ذکر سے یکسر خالی ہیں۔ باقی شعرا کے حالات میں اس سلسلے میں جو کچھ کہا گیا ہے اس کی کیفیت ذیل کی مثالوں سے ظاہر ہے:

(الف) منشی بساون لعل بیدار:

"چشمش مائل طرفِ حسن پرستی و دلش تارکِ بلند و پستی۔" (ص ۱۱۷)

(ب) علی ابراہیم حالؔ و خلیلؔ:

"آنچہ انسان را می باید ہمہ چیز می دارند۔" (ص ۲۲۱)

(ج) محمد عابد دلؔ:

"مرد یست مزاج گرفتہ و شوخ طبع، متصدی پیشہ و سپاہی وضع۔" (ص ص ۲۴۵ و ۲۴۶)

(د) میر زین الدین عشقؔ:

"مردیست مجسّم بعجز وانکسار از نوادرۂ روزگار۔" (ص ۴۳۲)

(ہ) شاہ رکن الدین عشقؔ:

"آنچہ انسانِ کامل را می باید، ہمہ می دارند۔" (ص ۴۳۸)

(و) اشرف علی خاں فغاںؔ:

"بسیار گرم جوش وصاحبِ اختلاط بنظر آمدہ۔" (ص ۴۵۰)

تنقید کلام کے نقطۂ نظر سے بھی شورشؔ کا تذکرہ اس معیار پر پورا نہیں اترتا جو ان کے بعض پیشرو اور ہم عصر تذکرہ نویسوں نے پیش کیا ہے۔ اس تذکرے میں تنقیدی مواد کیفیت کے لحاظ سے ہی کم ارزش نہیں، کمیت کے اعتبار سے بھی ناقابلِ اعتنا ہے۔ شورشؔ اس ناقدانہ شعور اور فنی بصیرت سے تقریباً محروم نظر آتے ہیں جس کے بغیر کسی تذکرہ نگار کے اندر خود اعتمادی اور اظہارِ خیال کی جرأت پیدا نہیں ہو سکتی۔ اس لیے وہ ان شعرا کے کلام کے متعلق بھی جن کے دواوین ان کے زیرِ مطالعہ رہے ہیں، کسی قسم کی رائے ظاہر کیے بغیر اشعار نقل کر دینے پر اکتفا کرتے ہیں۔ اس معمول کے برخلاف اگر اتفاقاً کسی شاعر کی فنکارانہ حیثیت یا اس کی تخلیقات کے محاسنِ خصوصی کے بارے میں انھوں نے اپنے تاثرات سپردِ قلم کیے بھی ہیں تو وہ اس طرح کے مختصر جملوں سے آگے نہیں بڑھتے:

(الف) شاہ نجم الدین آبروؔ:

"معنیٔ تلاشی را برطاقِ بلند گذاشتہ ۔۔۔۔۔ اشعارِ مثنوی وایہام در وقتِ خود خوب گفتہ۔" (ص ۴۷)

(ب) منشی بساون لعل بیدارؔ:

"سخنِ او سخنے است دل پذیر و نثرِ او نثرے بے نظیر۔" (ص ۱۱۷)

(ج) محمد روشن جوششؔ:

"در فکرِ شعر ممتاز ۔۔۔۔۔ مثلِ خود دریں شہر در فکرِ سخن ندارد مگر برادر خود۔"

(ص ۱۵۱)

(د) محمد عابد دلؔ:

"در فنِ شعر در شہر نظیرے ندارد مگر میاں محمد روشن برادرِ خود۔" (ص ۲۴۶)

(ہ) مرزا بھچو فدوؔی:

"شاعر ایست شیریں کلام ..... غزل بوضع درست می گوید۔" (ص ۴۵۵)

(و) فرحت اللہ فرحتؔ:

"شعرِ او از فصاحت و بلاغت خالی نیست۔" (ص ۴۵۹)

کلام کی نمایاں خصوصیات اور فنی ولسانی معیار کے متعلق اظہارِ خیال کی بہ نسبت شورؔش نے اشعار کے لفظی و معنوی اسقام کی گرفت پر کسی قدر زیادہ توجہ صرف کی ہے۔ اس سلسلے میں ان کے بعض اعتراضات مدلل بھی ہیں اور معقول بھی۔ مثلاً خواجہ امین الدین امینؔ کا ایک مطلع ہے:

کیا فائدہ ہے رونے سے اے اہلِ درد پھر
آیا ہے بعد مرنے کے یاں کوئی مرد پھر

شورؔش کا اعتراض ہے کہ:

"ایں مرد شعر را بے معنی کردہ است تخصیصِ لفظِ مرد بیجا ست کہ کسے باز نہ آمدہ است۔" (نسخۂ مطبوعہ ندارد ص ۹۰)

میر ضیاؔ دہلوی کا شعر ہے:

خم ہی میں بیٹھی بیٹھی ادھلی پڑے ہے باہر
دخترِ مغاں نے اپنی کتنی دلیر کی ہے

شورؔش اس شعر پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ

"در اول مصرع لفظِ "ادھلی" گاہے بسمعِ احقر مولف نہ آمدہ و در آخرِ مصرع شراب را دخترِ مغاں قرار دادہ است۔ اگرچہ دخترِ رز و دخترِ تاک و بنت العنب شراب را می گویند لیکن دخترِ مغاں گاہے نشنیدہ۔" (ص ص ۴۱۶ و ۴۱۷)

مصطفیٰ خاں یکرنگؔ کی ایک غزل کا مقطع ہے:

محبت کا عجب یکرنگ ہے رنگ　　کبھی عاشق کبھی معشوق ہیں ہم

شورش کا خیال ہے کہ

"دریں شعر تخلص لطف نمی دہد۔ مصرعِ ثانی مشتمل بر نیرنگی است، یک رنگی فائدہ نمی کند۔" (ص ۵۴۲)

پروفیسر محمود الٰہی نے تذکرہ شورش کے نسخہ جون پور کو پہلی بار متعارف کراتے ہوئے اپنے ایک مضمون میں لکھا تھا:

"شورش کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ شعرا کے کلام پر بڑے اعتماد کے ساتھ آزادانہ اور بے باک رائے دیتے ہیں۔ تنقید کا یہ فن انھوں نے حضرت رکن الدین عشق سے سیکھا ہے جو بلاشبہ عظیم آباد کے عالموں، صوفیوں اور شاعروں میں ایک امتیازی مقام رکھتے تھے۔"[1]

نسخۂ جون پور کے واسطے سے تنقیدِ کلام کی جتنی مثالیں ہمارے سامنے آئی ہیں ان میں اعتماد اور آزادیٔ رائے کی جھلک کسی جگہ بھی نظر نہیں آتی البتہ اگر کلام پر اظہارِ رائے کی تخصیص کو ختم کر کے میر صاحب کے تذکرے کی حریفانہ خردہ گیری کو بھی تنقید ہی کے زمرے میں شامل کر لیا جائے تو کسی حد تک ڈاکٹر صاحب کے قول سے اتفاق کی گنجائش نکل سکتی ہے۔ شورش نے میر کی شخصیت، ان کے کلام، دوسروں کے کلام پر ان کی اصلاحات اور انعام اللہ خاں یقین کے بارے میں ان کے خیالات کی تنقیص و تکذیب میں جس زورِ قلم اور جوشِ بیان کا مظاہرہ کیا ہے، اسے دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کسی طغیانی کے اثر سے یک بیک کسی رُکے ہوئے دریا کا بند ٹوٹ گیا ہو۔ "نکات الشعرا" کے متعلق شورش کی رائے کا حوالہ پہلے ہی دیا جا چکا ہے، اس لیے یہاں اس کا اعادہ غیر ضروری ہے۔ باقی امور کے سلسلے میں ان کی تحریروں کے چند اقتباس ضروری توضیحات کے ساتھ سطورِ ذیل میں پیش کیے جاتے ہیں:

---

[1] بازیافت ص ۱۹۳

(الف) دعویٔ سیادت کی تردید

شورش میر کے دعویٔ سیادت کو تسلیم نہیں کرتے۔ چنانچہ انھوں نے انھیں ہر جگہ میر تقی کی بجائے تقی میر کے نام سے یاد کیا ہے۔ ردیف میم کے ذیل میں ان کا مفصل تعارف سپردِ قلم کرتے ہوئے اپنے اس موقف کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں:

"خود را سید نوشتہ اند۔ مردمان می گویند کہ شیخ است چنانچہ مرزا محمد رفیع سودا می فرماید: دلّی کا ایک شیخ زادہ گنجفے کا میر ہے۔ یعنی در حقیقت میر نیست۔ شاعرِ دیگر می گوید ع شیخ تقی نام ہو اور میر کہاوے[1]

شاید ایں حدیثِ شریف بگوشِ ہوشِ ایشان نرسیدہ: لَعْنَةُ اللهِ عَلٰی دَاخِلِ النَّسَبِ وَعَلٰی خَارِجِ النَّسَبِ وسوائے ازیں سید فتح علی تبریزی (کذا) در تذکرۂ خود تقی میر را سید نہ نوشتہ است، پس ایشاں برائے استحکامِ سیادت کاذبۂ خود میر تخلص نمودہ اند۔ وجہ تخلصِ میر الحال معلوم گشتہ۔" (ص ۴۸۹)

(ب) کلام پر اعتراضات

شورش نے میر کے اشعار میں الفاظ کے محلِ استعمال پر اعتراض اور ان کے معنوی استقام کی گرفت کا بھی حتی الامکان کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا ہے۔ ان اعتراضات کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ان کا تعلق صرف ان اشعار سے ہے جو میر نے خود ہی اپنے منتخب کلام کے طور پر "نکات الشعرا" میں نقل کیے ہیں۔ ہم یہاں ان میں سے صرف چند کا ذکر کرتے ہیں، جن سے ان کی عمومی کیفیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے:

(۱) شعر: سیر کے قابل ہے دل صد پارہ اس نخچیر کا
جس کے ہر ٹکڑے میں ہو پیوستہ پیکاں تیر کا

اعتراض: "در مصرعِ اوّل اضافت طرفِ صد پارہ می باید یعنی "دلِ صد پارہ"۔ ایں جا قطعِ اضافت درست داشتہ اند۔ دیگر اینست (کہ کاتب) نوشتہ است

---

[1] "شاعرِ دیگر سے "کہاوے" تک کی عبارت نسخۂ رقلمی کے حاشیے پر درج ہے۔ یہ مطبوعہ نسخے میں جگہ نہیں پا سکی ہے۔

"اِس نخچیر کا" ایں درست نمی شود۔ می باید "اوس نخچیر کا" تا از مصرعِ ثانی التزام یا بد و معنی پیدا کند والّا نہ، شعر بے معنی می شود۔" (ص ۴۹۰)

(۲) شعر: جو ترے کوچے میں آیا پھر نہیں کاڑھا اسے
تشنۂ خوں میں تو ہوں اس خاک دامنگیر کا

اعتراض "در مصرعِ اوّل لفظ "کاڑھا" آوردہ اند برائے مایاں سند است لیکن در عظیم آباد مردمانِ فصیح نمی گویند مگر اراذل می گویند "کھانا کاڑھا گیا"۔ بہر حال اگر شعرِ من می بود، ایں طور می گفتم:

جو ترے کوچے میں آیا پھر نہیں چھوڑا اسے
تشنۂ خوں میں تو ہوں اس خاک دامن گیر کا۔" (ایضاً ص ۴۹۰)

(۳) شعر: کو گل و لالہ، کہاں سنبل سمن و نسترن
خاک سے یکساں ہوئے ہیں ہائے کیا کیا آشنا

اعتراض "دریں شعر ہم تامل است۔ لفظِ "کو" فہمیدہ نمی شود کہ ایں جا چہ کار می کند۔" (ص ۴۹۴)

(ج) اصلاحات سے اختلاف

میر نے نکات الشعرا میں مختلف شعرا کے اشعار پر جو اصلاحیں دی ہیں شورش کے نزدیک ان میں سے بھی اکثر قابلِ قبول نہیں۔ مثال کے طور پر

(۱) مصطفیٰ خاں یک رنگ کے اس شعر میں کہ:

سچ کہے جو کوئی سو مارا جائے　　راستی ہے گی دار کی صورت

میر صاحب "سچ" کی بجائے "حق" کو قابلِ ترجیح تصور کرتے ہیں[1]۔ شورش کا اس سلسلے میں یہ خیال ہے کہ

"سچ ہندی و راست فارسی و حق عربی، ہر سہ یک معنی دارد۔ غالباً است

---

[1] "باعتقادِ فقیر بجائے "سچ" حرف "حق" اولیٰ است ۔۔۔" نکات الشعرا طبع ثانی ص ۸۶

کہ شاعر از حروفِ حق غافل نباشد لیکن مثل مشہور ہمیں طور است" سچ کہے جو کوئی سو مارا جائے"۔ "حق کہے جو کوئی سو مارا جائے" مشہور نیست و در مثل دخل نمودن درست نیست۔ وحق برائے دار خوب است اگر مثل نمی بود مضائقہ نداشت۔ سوائے ازیں (حضرت شیخ سعدی قدس سرہ می فرمایند۔ لفظِ جہاں گشتہ و) معنی غریب (در شعر می باید) (دریں مقام لفظِ جہاں گشتہ[1]) لفظ "سچ" است انصاف شرط است۔ احقر طرف نمی کند۔" (ص ۵۴۲)

(۲) انعام اللہ خاں یقین کا ایک شعر ہے

مجنوں کی خوش نصیبی کرتی ہے داغ مجھ کو
کیا عیش کر گیا ہے ظالم دوانہ پن میں

میر صاحب کا خیال ہے کہ "اگر بجائے "خوش نصیبی" "خوش معاشی" می گفت ایں شعر بسیار بامزہ می شد۔"[2] شورش صرف اس تجویز سے ہی اختلاف نہیں کرتے بلکہ اس کی تنقیص کے ساتھ میر کی سخن فہمی اور فنی بصیرت پر طنز کا بھی ایک موقع نکال لیتے ہیں۔ ان کی رائے ہے کہ

"ہمہ چیز از نصیب تعلق دارد چنانچہ گفتہ (اند) آنچہ نصیب تست بتو می رسد، کسے کہ چیزے در ظاہر بہ تدبیر بہم رساند و بیجا خرچ می نماید، آں را خوش معاش می گویند و دیوانہ پن محض از نصیب بدست می آید، بنابر "خوش نصیبی" گفتہ و "خوش معاشی از عقل تعلق دارد و "دیوانہ پن" از بے عقلی۔ پس بے عقل را خوش معاش نباید گفت۔ ایں جا رائے میر غلطی کردہ است لہٰذا مردمان می گویند کہ شعور کلی دریں

---

[1] زیر تو سین عبارت قلمی نسخے سے ماخوذ ہے۔ فاضل مرتب غالباً اسے پڑھ نہیں سکے اس لیے انھوں نے اس جگہ نقطے لگا دیے ہیں۔ اس عبارت میں بھی (در شعر می باید) راقم کا اضافہ ہے کیوں کہ اس کے بغیر مفہوم واضح نہیں ہوتا۔

[2] نکات الشعرا طبع ثانی ص ۸۱

فن ندارد۔ خان آرزو، دیوان درست کردہ دادہ است چنانچہ کسے گفتہ است

ہر ورق پر ہے میر کے اصلاح　　لوگ کہتے ہیں سہو کاتب ہے"

(ص ص ۵۵۴ و ۵۵۵)

(د) یقین سے متعلق بیانات کا تجزیہ

میر نے اپنے تذکرے کے ذریعے قارئین کو انعام اللہ خاں یقین کی شخصیت اور شاعری کے خلاف جو تاثر دینے کی کوشش کی ہے، شورش اسے حریفانہ چشمک کی ایک کرشمہ کاری سے تعبیر کرتے ہوئے زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ انھوں نے اس سلسلے میں حتی الامکان اپنی طرف سے کوئی صفائی پیش کرنے کی بجائے اس روایت کو درایت کے معیار پر پرکھنے کا طریقہ کار اپنایا ہے اور بڑی خوبی کے ساتھ میر صاحب کی پیش کی ہوئی شہادتوں کے تناقص اور داخلی کمزوریوں کو واضح کیا ہے۔ وہ ہر بیان کے تمام پہلوؤں پر پوری تفصیل کے ساتھ بحث کرتے ہیں تاکہ یہ ظاہر ہو جائے کہ ان میں کس حد تک ثقاہت وصداقت موجود ہے۔ مثال کے طور پر میر صاحب فرماتے ہیں:

"میاں یقین را مردماں می گفتند کہ مرزا مظہر اورا شعر گفتہ می دہد و وارثِ شعرہائے ریختہ خود گردانیدہ[۵۱]"

شورش نے اس بیان کے رد میں جو دلائل پیش کیے ہیں منجملہ ان کے ایک دلیل یہ ہے کہ

"اگر مرزا یقین را دیوان گفتہ می داد، میر باقر حزیں جوابِ دیوانِ میاں یقین نمی گفتند۔ چرا کہ میر باقر حزیں بے ادب نبودند کہ جوابِ دیوانِ استاد می گفتند (لہٰذا) ایں غلط است کہ مرزا گفتہ دیوان بنام یقین رواج دادہ وآن دیوان الحال موجود است کہ میر باقر حزیں در جواب گفتہ اند[۵۲]"

---

۵۱ نکات الشعرا طبع ثانی ص ۸۱

۵۲ یہ عبارت نسخۂ جون پور کے حاشیے پر درج ہے، نسخۂ مطبوعہ میں جگہ نہیں پا سکی ہے۔

میر صاحب کی معلومات کے مطابق یقین کے دل میں اپنے استاد مرزا مظہر کی کوئی خاص قدر و منزلت نہ تھی۔ یہ بات دوسروں تک پہنچانے کے لیے انھوں نے ایک مجہول الاسم راوی کے حوالے سے مندرجہ ذیل واقعہ نقل کیا ہے:

"بخانۂ عطیۃ اللہ خاں پسر نواب عنایت اللہ خاں مرحوم یقین نشستہ بود و می گفت ازاں روزے کہ مرزا دستِ استادی از سرِ من برداشتہ است، شعرِ من ترقی کردہ۔ شخصِ مذکور ایں مصرعِ نظامی بآوازِ بلند پیشِ حضارِ مجلس خواند ع شد آن مرغ کو خایہ زریں نہاد۔ حاصل اورا بیضہ در کلاہِ شکست[1]"

شورش اس الزام کے جواب میں میر صاحب ہی کے ایک سابقہ بیان کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

"دروغ گو را حافظہ نمی باشد۔ گاہے می گوید کہ یقین فہم و فراستِ شاعری نمی دارد و گاہے می نویسد کہ استادیٔ مرزا را بخاطر نمی آرد۔ ازیں معلوم می شود کہ ہمہ غلط است ۔۔۔۔۔ سوائے ازیں میر صاحب انصاف فرمایند کہ یقین در دیوانِ خود گفتہ رفتہ است:

جیوں نماز اپنے پہ شام و صبح لازم کر یقین
حضرت استاد یعنی شاہ مظہر کی ثنا

ثنائے میرزا مظہر ازیں تحریر باثبات می رسد و ندمت از گفتہ و مخالف۔ پیشِ تحریر تقریر بکار نمی آید" (ص ۵۴۹)

میر صاحب یقین کی موزوں طبعی پر شبہے کی تائید میں ایک اور واقعہ اس طرح بیان کرتے ہیں:

---

[1] نکات الشعرا کے مطبوعہ نسخے میں اس عبارت میں "از سرِ من برداشتہ است" کی بجائے "در سر من داشتہ است" ملتا ہے (طبع ثانی ص ۸۲) لیکن سیاق و سباق کے پیش نظر تذکرۂ شورش کی روایت قابلِ ترجیح معلوم ہوتی ہے۔

"میاں شہاب الدین ۔۔۔۔ ثاقب نقل می کرد کہ من محض برائے امتحان بخانۂ او (یقین) رفتم و یک غزل طرح کردم۔ من غزل بانصرام رسانیدم و ازو مصرعے موزوں نشدہ۔ اللہ اعلم"[1]

شورش کے خیال میں یہ واقعہ صحیح ہو سکتا ہے لیکن اس سے جو نتیجہ اخذ کیا گیا ہے وہ لازماً درست نہیں ہو سکتا۔ وجہ یہ ہے کہ

"تقی میر در تذکرۂ خود در حق میاں ثاقب نوشتہ اند کہ ہمہ چیز می داند و ہیچ نمی داند[2]" پس کسے کہ ہیچ ندانستہ باشد چگونہ مثلِ یقین شاعر ہم طرحِ او شود۔ اگر ہم چشم خود دانست، چیزے می فرمود و ایں ہم احتمال دارد کہ آں غزل میاں ثاقب پیشتر گفتہ باشند و بسمعِ میاں یقین رسیدہ باشد از راہِ ستاری چیزے نگفتہ باشند۔" (ص ۵۵)

"تذکرۂ شورش" کی تنقیدی کائنات انھیں معارضانہ بحثوں تک محدود ہے اور ان میں بھی چونکہ "نکات الشعرا" کی تنقیص کے علاوہ کوئی دوسرا مقصد مولف کے پیشِ نظر نہیں، اس لیے ہمیں اپنی اس رائے پر اصرار میں کوئی عذر مانع نہیں معلوم ہوتا کہ یہ تذکرہ تنقیدِ فن کے نقطۂ نظر سے اس معیار کی تالیف نہیں جو شورش سے قبل اور ان کے زمانے میں بھی بعض دوسرے تذکرہ نگاروں نے پیش کیا ہے۔

انتخابِ کلام کے معاملے میں بھی شورش کے یہاں کوئی ندرت اور انفرادیت نظر نہیں آتی۔ انھیں دوسرے تذکرہ نگاروں سے تو یہ شکایت ہے کہ انھوں نے اشعار کے نقل کرنے میں تناسب و اعتدال اور شعرا کے مراتب کی نگہداری سے کوئی سروکار نہیں رکھا ہے لیکن خود ان کے ہاں ایسی مثالیں بکثرت موجود ہیں جہاں کبھی انھوں نے محض تساہل اور سہل انگاری کی بنا پر دواوین کی تلاش و جستجو اور براہ راست انتخاب کی زحمت سے پہلو تہی کر کے دوسروں کے نقل کیے ہوئے یا سنے سنائے چند اشعار

---

[1] نکات الشعرا طبع ثانی ص ۸۲

[2] در ہمہ چیز دست دارد و ہیچ نمی داند۔ نکات الشعرا طبع ثانی ص ۸۹

نقل کر دیے ہیں اور کبھی شاعر کی حیثیت اور مرتبے کے برخلاف محض غیر شعوری طور پر یا ذاتی و وطنی تعلق اور اسی قسم کے دوسرے محرکات کے زیرِ اثر ضرورت سے زیادہ کلام انتخاب کر لیا ہے۔

زبان و بیان کے لحاظ سے بھی اس تذکرے میں بعض نمایاں خامیاں نظر آتی ہیں۔ شورش کی عبارت میں نہ پختگی ہے اور نہ دل کشی بلکہ بعض اوقات ان کی تحریر کا انداز بالکل مبتدیانہ معلوم ہوتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ "احقر دریں کلام ہرگز ارادۂ انشا نہ کردہ است ..... صاف مطلب نوشتہ است" (ص ۷۰) لیکن وہ جس چیز کو صفائی بیان سے تعبیر کرتے ہیں وہ سادگی و سلاست کی بہ نسبت سپاٹ پن سے زیادہ قریب ہے۔

مسرّت افزا

تذکرہ "مسرت افزا" ابوالحسن امیر الدین احمد معروف بہ امراللہ الہ آبادی کی تالیف ہے۔ اس تذکرے کا ایک قلمی نسخہ خدا بخش اورنٹیل پبلک لائبریری، پٹنہ میں اور دوسرا آکسفورڈ یونیورسٹی لائبریری لندن میں محفوظ ہے۔ موخرالذکر نسخے کا متن قاضی عبدالودود صاحب نے سہ ماہی معاصر پٹنہ کے ۱۹۵۴ء اور ۱۹۵۵ء کے بعض شماروں میں بالاقساط شائع کر دیا ہے۔ یہی مطبوعہ متن اس وقت ہمارے پیشِ نظر ہیں۔ مولف تذکرہ کا بیان ہے کہ وہ ماہِ صفر ۱۱۹۲ھ (مارچ ۱۷۷۸ء) میں دیارِ مشرق کی سیر و سیاحت کے ارادے سے اپنے بڑے بھائی خیر الدین محمد کے ہمراہ وطن سے نکلے اور عظیم آباد پہنچے۔ وہاں مختلف معروف اور غیر معروف شاعروں سے ملنے اور ان کا کلام سننے کے بعد حالات کی ترتیب و تحریر کا خیال پیدا ہوا، لیکن یہ خیال ابھی محتاج عمل تھا کہ انھیں عظیم آباد سے کلکتے کی طرف چل دینا پڑا چونکہ مستقبلِ قریب میں اطمینان و سکون میسر آنے کی کوئی یقینی صورت نہ تھی، اس لیے دورانِ مسافرت ہی میں کام شروع کر دیا گیا اور سوم ماہ جمادی الاخریٰ ۱۱۹۳ھ (۱۸ جون ۱۷۷۹ء) کو اس کی تکمیل ہو گئی جیسا کہ مندرجہ ذیل اشعار سے ظاہر ہے ؎

از ہجرتِ افضل البشر بود — تسعین و ہزار و صد سہ افزود
بودہ زمہِ جمادِ دویم — تاریخ سوم نہ بیش نے کم
کیں تذکرۂ مسرت افزا — ایں خامۂ من نمود املا

لیکن تذکرے میں بعض ایسے بیانات بھی موجود ہیں جن سے یہ پتا چلتا ہے کہ ۱۱۹۳ھ

۱۷۷۹ء کے بعد بھی وقتاً فوقتاً کچھ اضافے کیے جاتے رہے ہیں۔ خاتمے کی عبارت میں امراللہ نے خود اس بات کا اقرار کیا ہے کہ

"چوں در سنہ نود و چہارم باز اتفاقِ مراجعت و وُرود (بہ) بلدۂ لکھنؤ روداد براحوالِ اکثر نکتہ پردازانِ ایں زماں اطلاع دست داد، تذکارِ شانِ دریں تذکرہ کہ معیارِ احوال ایں گروہ است، مناسب دید۔"

۱۱۹۴ھ/۱۷۸۰ء میں جن شاعروں کو اس محفل میں شریک کیا گیا ہے ان میں سے بعض کے ذکر میں زمانۂ شمولیت کی وضاحت بھی کر دی گئی ہے۔ مثلاً شاہ عالم آفتاب کے حالات اس جملے پر ختم ہوتے ہیں:

"از سالِ جلوس تا امسال کہ سنہ یک ہزار و یک صد و نود و چہارم است، فرماں روائی و عدالت گستریٔ وے در تزاید است۔" (ص ۶)

سنینِ تحریر کی تحقیق اور تعیین کے اسی سلسلے میں مندرجہ ذیل اقتباسات بھی قابلِ غور ہیں۔

(الف) میرزا مظہر جانِ جاناں:

"بعد تحریرِ تذکرہ امسال کہ سنہ یک ہزار و یک صد و نود و پنجم است، کسے از اوباشانِ دہلی وے را بتاریخِ ہفتم یا نہم ماہِ محرم بضربِ گولیٔ پستول بدرجۂ شہادت رسانید و خود را تا ابد ہدفِ سہامِ نفرت گردانیدہ۔" (ص ۱۸۳)

(ب) شورش عظیم آبادی:

"بعدِ اتمامِ ایں تذکرہ در عشرۂ اولیٰ ماہِ شعبان سنہ یک ہزار و یک صد و نود و پنجم ہجری جہانِ پرشور را پدرود کرد۔" (ص ۱۱۲)

(ج) سید امام تصوّر نارنولی:

"بعدِ تحریرِ تذکرہ تصوّر بہ رفاقتِ مولف از الٰہ آباد بہ رام نگر بنارس آمدہ و مدتے در معیتِ من فارغ البال گزرانیدہ۔ آخر بمرض تپِ محرقہ گرفتار شدہ۔ خسر پورہ اش کہ ملازمِ راجہ چیت سنگھ بود، بہ استماعِ بیماریٔ وے آمدہ بخواہشِ تمام

بخانہ بردہ۔ آخرالامر در آخرِ ماہ شعبان سنہ یک ہزار و یک صد و نود و پنجم کہ سالخۂ فرار بر راجہ و متوسلانش افتادہ، تصور راطاقتِ گریختن و ہمراہ رفتن متصور نبود، ناچار اورا در مرزاپور کہ مسافتِ دہ کروہ از رام نگر باشد، بتصور آں کہ در آں جا بہ آرام خواہد بود، گذاشتند۔ قضا کار ہمون روز قضا دامن گیرِ او شدہ۔ در عین ہنگامۂ گیر و دار و گریز و فرار راہِ دارالقرار گرفت۔" (ص ۴۱)

ان عبارتوں کے اندازِ بیان سے مترشح ہوتا ہے کہ یہ ۱۱۹۵ھ/۱۷۸۱ء کے آخری ایام میں یا اس سال کے بعد لکھی گئی ہیں۔ اور اس طرح یہ بات طے ہو جاتی ہے کہ "مسرت افزا" کی تسوید و ترتیب کا سلسلہ کم سے کم ۱۱۹۵ھ/۱۷۸۱ء کے اواخر تک جاری رہا ہے۔

یہ تذکرہ دو سو پچپن (۲۵۵) شاعروں کے ذکر پر مشتمل ہے، جن میں سے بیشتر کے متعلق مولف کے بیانات ذاتی علم و آگاہی اور معتبر و مستند زبانی روایات پر مبنی ہیں۔ اس کے علاوہ جا بجا سروِ آزاد، نکات الشعرا، تذکرۂ گردیزی اور تذکرۂ میر حسن کے حوالے ملتے ہیں۔ میر قطب الدین علی خاں شاداں غازی پوری اور شیخ احمد وارث احمدی کے اشعار موخرالذکر (احمدی) کے تذکرے سے ماخوذ ہیں۔ علی ابراہیم کے تذکرے کے بارے میں بھی انھیں اپنے بعض احباب سے معلومات حاصل ہوئی تھی لیکن کوشش کے باوجود اس کے مطالعے سے محروم رہے۔ اس سلسلے میں اپنے اشتیاق اور علی ابراہیم کے عدم تعاون کی کیفیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"فقیر از دوستانِ آں دیار (عظیم آباد) شنیدہ کہ وے در ضمنِ تالیف تذکرۂ محافل الشعرا تذکرۂ شعرائے ریختہ نیز ترتیب دادہ و اشعارِ اساتذہ چیدہ و پسندیدہ دراں دُرجِ لآلیٔ آبدار درج نمودہ۔ حالاتِ وے نیز مشروحًا با اشعارش دراں مندرج است۔ بہ خواہشِ تمام در خدمتِ وے استدعائے آں تذکرہ نمود تا ازاں حالاتِ اساتذہ کہ از حالاتِ شان بما خبر نہ رسیدہ، خصوصًا احوالِ وے از تالیف وے استخراج نمایم لیکن خدا داند بخاطرش چہ خطور کرد و ہمت رسایش چرا قصور نمود کہ ابا و انکار نمود۔ مکرر ارشاد فرمود کہ بعد ترتیب پریشان

ساختم۔" (ص ۷۳)

میر غلام حسین شورش عظیم آبادی کے تذکرے سے استفادے کے متعلق اگرچہ کوئی واضح شہادت موجود نہیں پھر بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ تذکرہ ان کی نظر سے گزر چکا ہے۔ شورش کے حال میں لکھتے ہیں:

"از مدتے در فکرِ جمع کردنِ تذکرۂ شعرائے ریختہ ہمتِ خود گماشتہ و آب و رنگِ ترتیب بروے اشعارِ پراگندۂ اساتذۂ ایں فن ریختہ، صفحۂ کاغذ را آراستہ آغازش را بہ انجام رسانیدہ۔ نامش یادگارِ دوستان مقرر نمودہ و ہم ازیں مصرعہ تاریخِ تالیفش برآوردہ ؎ یادگارِ دوستانِ روزگار۔" (ص ۱۱۲)

"نکات الشعرا" کے بارے میں امراللہ کوئی اچھی رائے نہیں رکھتے۔ انھوں نے اس تذکرے کو متذکرہ شاعروں کے خلاف زہر افشانی اور ان کی تحقیر و تنقیص کی ایک نازیبا کوشش قرار دیتے ہوئے اپنے تذکرے کی تالیف کو اس کے ردِّ عمل سے تعبیر کیا ہے۔ میر صاحب کے حالات میں رقم طراز ہیں:

"تذکرۂ نکات الشعرا تالیفِ اوست۔ دراں عجب نکتہ چینی در کلامِ شعرائے ریختہ نمودہ۔ ہر کرا یاد نمودہ، بہ تحقیر و بے ادای آوردہ۔ اشعارِ ایشاں را بے رتبہ و ناپسندیدہ و چیدہ ذکر کردہ۔ اگر راست بگویم سببِ تالیف ایں تذکرۂ مسرت افزا ہم ہمیں بود کہ من برغمِ حاسدانِ عیب بیں و خردہ گیرانِ نکتہ چیں حالاتِ ہر یکے کماہی در مسطر تحریر کشیدم لیکن چوں دریں غربت دیوانِ احدے باخود نبود کہ اتفاقِ انتخاب شعر ہم می شدہ از اشعارِ ایشاں آنچہ یاد بود، نوشتم طرفہ ترکہ میر چوں ہمتِ خود بہ انتخابِ اشعار ناپسندیدۂ شعرا گماشتہ بود، طبعش بہ ہمیں مرغوب گشتہ۔ ازیں جہت از اشعارِ خود ہم ہر چہ دراں تذکرہ نوشتہ، اکثرے ازاں بے رتبہ و ناپسندیدہ است۔ در دیوانش بہتر ازیں اشعار بنظرِ فقیر در آمدہ۔" (ص ص ۱۹۹ و ۲۰۰)

اس بیان کے ذریعے میر صاحب کے خلاف جو فردِ جرم عائد کی گئی ہے اس پر

تفصیل کے ساتھ بحث کی تو یہاں گنجائش نہیں، البتہ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ انتخابِ کلام سے متعلق آخری اعتراض میں نواب صدر یار جنگ حبیب الرحمٰن خاں شروانی بھی امراللہ کے ہم خیال ہیں۔ چنانچہ تذکرۂ میر حسن کے مقدمے میں مولف کے حسن انتخاب کی داد دیتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں کہ

"آفریں میر حسن کے انتخاب کو کہ میر کے کلام کا انتخاب خود میر سے بہتر کیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جن غزلوں کے اشعار خود میر صاحب نے منتخب کر کے لکھے ہیں ان ہی غزلوں سے بعض ایسے نادر اشعار میر حسن نے انتخاب کر لیے ہیں جو خود میر کے انتخاب سے زیادہ نادر ہیں اور یہ ایک انسانی کمزوری کا پہلو ہے کہ بعض اوقات خود اپنے کمال پر وہ قلم پھیر دیتا ہے۔" (طبعِ ثانی ص ص ۱۷، ۱۸)

ان تمام تفصیلات کا ماحصل یہ ہے کہ مسرت افزا کے مولف نے حصولِ معلومات کے لیے ہر ممکن ذریعے سے مدد لی ہے اور خوردہ گیری و عیب جوئی سے حتی الامکان اپنا دامن بچائے رکھنے کی کوشش کی ہے۔ میر کے برخلاف وہ "ہمہ را بہ نیکی یاد کردن" کے اصول پر عمل پیرا ہیں اور کسی شخص کی ذات یا فن کے نقائص کو بلاضرورت منظرِ عام پر لانا معیوب اور نامناسب خیال کرتے ہیں۔ میر صاحب ہی کے ذکر میں انھوں نے ایک جگہ اپنے اس نقطۂ نظر کی وضاحت کے لیے یہ شعر بھی نقل کیا ہے ؎

عیب مردم فاش کردن بدترینِ عیب ہاست
عیب جو اول کند بے پردہ عیب خویش را

اس تذکرے کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں بنارس، لکھنؤ، الہ آباد، عظیم آباد، مرشد آباد اور کلکتہ کے بہت سے ایسے شاعروں کے مفصل حالات درج ہیں، جن کا ذکر دوسرے تذکرہ نگاروں نے شاذ و نادر ہی کیا ہے جن کے بارے میں عام لوگوں کا دائرہ بہت محدود ہے۔ مثال کے طور پر یہ پہلا تذکرہ ہے جس کی فہرست میں "نوطرزِ مرصع" کے مصنف میر حسین عطا خاں تحسین کا نام بھی شامل

ہے اور ان کے متعلق یہ تفصیلات فراہم کی گئی ہیں :

"حسین عطا خاں تحسین تخلص مخاطب بہ خطابِ مرصع رقم خاں خلف میر محمد باقر خاں شوق۔ سید گردیزی است۔ بزرگان وے در وقتِ بابر بادشاہ از گردیز بہ ہندوستان آمدہ در کڑہ مانک پور قیام ورزیدہ و پدرِ وے از عہدِ طفولیت در دہلی بہ خدمتِ اورنگ زیب عالمگیر بہ منصبِ سہ ہزاری و جاگیر سرفرازی یافتہ ..... ہر گاہ فرخ سیر بادشاہ بدستِ سادات بارہ گرفتار شدہ، از ضعفِ سلطنت و برہمیٔ سررشتۂ دابِ خاندان تیموریہ خانہ نشین شدہ۔ در سنِ نود و پنج سالگی آخر سلطنتِ محمد شاہ در شاہجہان آباد بجوارِ رحمتِ ایزدی پیوست۔ وے سلمہ اللہ تعالیٰ از عطائے الٰہی در عنفوانِ شباب بہ کمالات ظاہری و باطنی سعادت اندوز شدہ بسببِ انقلاب زمانہ از دہلی برآمدہ مدت ہا در خدمتِ ناظمانِ بنگالہ بعزّت و اعتبارِ تمام نشو و نما یافتہ۔ در ابتدائے عملِ انگریز از مردمِ ہندوستان اول از ملازمانِ کمپنیٔ انگریز کہ بخدمت بادشاہ ہند امتیاز منصب و جاگیر حاصل کردہ، او بود ..... سوانح قاسمی و انشائے تحسین و ضوابط انگریزی جملہ نتائج طبع وے محل تحسین سخنوران است و موقعِ آفرینِ زبان آوران۔ سوائے کتبِ فارسی نسخۂ "نوطرزِ مرصع" مشتمل بر قصۂ چار درویش بعبارتِ ہندی تالیف نمودہ۔" (ص ۴۲)

علی ابراہیم خاں خلیل کے مفصل حالات زندگی بھی پہلی مرتبہ اسی تذکرے میں پیش کیے گئے ہیں۔ سابقہ تعارف کے علاوہ مولف کو عظیم آباد میں قیام کے دوران تقریباً ایک سال تک ان کے تقرب کا شرف حاصل رہا تھا۔ اس قربت و ہم نشینی کو انھوں نے غریب الوطنی کے عالم میں اپنے لیے "انبساطِ خاطرِ محزون و پریشاں" اور "انشراحِ طبیعتِ افسردہ و حیراں" کا سبب قرار دیا ہے۔ چونکہ اس وقت "مسرت افزا" کے سوانحی پہلو کا جائزہ مقصود ہے، اس لیے دوسری تفصیلات سے قطعِ نظر کرتے ہوئے صرف اسی پہلو سے متعلق عبارتیں ذیل میں نقل کی جاتی ہیں:

"مولدش موضع شیخ پورہ نواحی بلدۂ عظیم آباد است ونشو ونمائش مرشد آباد۔ در وقتِ نواب مہابت جنگ بہادر بہ مرشد آباد آمدہ وسامانے از ثروت وجاہ بہم رسانید۔ در ایام حکومتِ نواب عالی جاہ میر محمد قاسم خاں بہ اعلیٰ مراتبِ حشمت وجاہ رسیدہ وسر آمدِ سرداران سرکارش گردید۔ چوں نیّرِ طالعش در عروج بود، روز بروز بمعارجِ دولت صعود می نمود تا در خانۂ نواب مظفر جنگ نائب ناظم بنگالہ مختار ومدار المہام گردید لیکن از برہمیٔ اطوارِ روزگارِ جفا کار مدّتے است کہ خانہ نشین گشتہ ..... بعدِ تحریر تذکرہ در رجب المرجب سنہ یک ہزار ویک صد ونود وپنجم ہجری کہ نواب عماد الدولہ گورنر جنرل مسٹر ہشٹن بہادر حلاوت جنگ بہ عزمِ تسخیرِ ممالکِ مغرب زمیں از کلکتہ نہضت فرمودہ وقتِ جلوہ افروز شدنِ بلدۂ مرشد آباد خانِ موصوف را بصد اکرام واعزاز بہمراہیٔ خود سرفراز نمودہ۔ چوں راجہ چیت سنگھ از شامتِ کردار واعمالِ خویش از ملکِ خود اخراج شدہ، عدالت دیوانیٔ آں ملک بمعہ عدالت فوجداری بوے تفویض نمودہ بعنایتِ خلعتِ فاخرۂ مختاری وحکمرانیٔ بلدۂ بنارس وے را مباہی ساختہ۔ اکنوں دراں ضلع مرجعِ خاص وعام ملجاے انامِ آں مقام است" (ص ص ۷۲ و ۷۳)

شیخ معین الدین معینؔ بدایونی سوداؔ کے ممتاز شاگردوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ میر حسنؔ پہلے تذکرہ نگار ہیں جنھوں نے ایک ہم عصر شاعر کی حیثیت سے ان کا ذکر کیا ہے لیکن ان کی یہ تحریر معینؔ کے سوانح حیات کی تلاش میں زیادہ دور تک ہمارے ذوقِ جستجو کا ساتھ نہیں دیتی۔ اس کے برخلاف امراللہ کے یہ بیانات ہماری معلومات میں نہایت اہم اور گراں قدر اضافہ کرتے ہیں:

"زادگاہش بداؤنست، اما نشو ونما در دہلی یافتہ۔ وقتے کہ بلدۂ الہ آباد مخیّمِ سراوقاتِ سلطانی بود، برفاقتِ بعضے امرا بسر می برد واز جانبِ وے اعانتِ ضروریات می شد۔ چوں امدادِ فیضِ الٰہی معینِ حال او بود، در ایامے کہ نواب عنایت خاں پسر حافظ رحمت خاں جہت ملاقاتِ وزیر الممالک نواب

شجاع الدولہ مرحوم آمدہ، وے مخمس در تعریفِ اسپ و اظہارِ بے اسپی خود نظم نمودہ بہ وسیلۂ بعضے رفقایش بہ خان مذکور گزرانیدہ۔ خان قدرداں حکم خواندن نمود۔ چوں تمام کرد، اسپے خاص مع ساز بوے عنایت نمود ..... بعد ازاں کہ حضرت جہاں پناہ بسمتِ دہلی نہضت فرمود، وے در رفاقتِ نواب منیر الدولہ ناظمِ الہ آباد در آمد۔ چندے در نگذشتہ بود کہ نواب برحمتِ حق پیوستہ، صوبہ الہ آباد در عملِ نواب شجاع الدولہ مرحوم آمدہ از برہمیٔ روزگار پریشاں و مفلوک شدہ در لکھنؤ رسیدہ لیکن بایں ہمہ لیاقت و قابلیت خود و قدردانیٔ اہلِ آں دیار ہیچ ترقی بوے نشدہ۔ بہر حال زمانہ را بخوشی بسر می برد۔" (ص ۲۰۲ تا ص ۲۰۵)

میر ماشاء اللہ خاں مصدر، ایک اوسط درجے کے شاعر تھے لیکن انشا جیسے جلیل القدر فنکار سے نسبتِ پدری کی بنا پر انھوں نے اپنے لیے حیاتِ جاوداں کی سند حاصل کرلی ہے۔ چنانچہ انشا کے خانگی ماحول اور حالاتِ زندگی کا علم حاصل کرنے نیز ان کی ہمہ جہت شخصیت کے تعمیری عوامل کو پوری طرح سمجھنے کے لیے مصدر کے حالاتِ زندگی سے واقفیت کسی قدر ضروری ہو جاتی ہے۔ اس سلسلے میں جب ہم تذکروں کی طرف رجوع کرتے ہیں تو وہاں عام طور پر چند مجمل و مختصر جملوں کے علاوہ کوئی کام کی بات نظر نہیں آتی۔ مسرت افزا اس روشِ عام سے مستثنیٰ ہے۔ اس تذکرے میں ان کے حالات جس تفصیل سے لکھے گئے ہیں، وہ درجِ ذیل اقتباس سے ظاہر ہے:

"مصدرِ فضائلِ پسندیدہ و معدنِ خصائلِ سنجیدہ در نکتہ فہمی و حاضر جوابی یگانۂ زمانہ ..... چہرۂ استعدادش بہ زیورِ علم و ہنر پیراستہ، در علمِ طبابت مہارتِ کلی دارد ..... جرعہ کشِ مصطبہ زبان آوریست و بادہ نوشِ محفل لسانی و سخنوری لیکن حیف غبارِ زیادہ گوئیش آئینۂ جمالِ کمالش را مکدر ساختہ و از خود نمائی کہ دارد سخنش از پایۂ ایقانِ اعتقاد افتادہ ..... اکثر از جودتِ طبیعت اشعارِ نامربوط منتظم می سازد و بیتِ ہزاری و دو ہزاری و چہار و پنج و علیٰ ہذا القیاس نام می گزارد ..... مدتے در بنگالہ در سرکارِ ناظمانِ آں جا بکمال عمدگی می بود۔

بعدِ برہمی وضعِ بنگالہ بطرفِ ہندوستان رفت و در سرکارِ نواب وزیر الممالک شجاع الدولہ مرحوم اقتدار کلی و تقرب بحدے رسانید مدتِ حیاتِ نواب مرحوم باوے بکمال تقرب بسر می برد۔ بعد وفاتِ نواب چندے در سرکارِ خلف وے نواب آصف الدولہ مرحوم نیز زمانہ را گذرانید۔ آخر الامر امسال کہ سنہ یک ہزار و یک صد و نود و چار ہجریست، کشیدہ خاطر شدہ روبہ لشکرِ نواب ذوالفقار الدولہ مرزا نجف خاں بہادر کہ قدر شناسِ اہل فضل و کمال است، آوردہ۔" (ص ۲۱۱ تا ص ۲۱۳)

ان اقتباسات میں جو مشتے نمونہ از خروارے کا حکم رکھتے ہیں، متعلقہ سنین کی نشان دہی صرف دو جگہ کی گئی ہے، لیکن ایسے قرائن بکثرت موجود ہیں جن کی مدد سے بہ آسانی زمانے کا تعین کیا جا سکتا ہے۔ اس کے باوجود امراللہ کے منفرد اندازِ سوانح نگاری کی نمائندگی ایسی کچھ مثالیں پیش کیے بغیر مکمل نہ ہوگی جن میں وضاحت کے ساتھ اہم واقعات کے سنہ متعین کیے گئے ہیں۔ تذکرے کے بالکل ابتدائی اوراق سے اس قسم کے کچھ بیانات اور اہم جملے سطورِ ذیل میں نقل کیے جاتے ہیں:

امیر خاں انجام:۔

"در سالِ ہزار و صد و پنجاہ و نہ ملعونے از ملازمانش غافل نمودہ در صحنِ دولت خانۂ بادشاہ بہ زخمِ کٹار شربتِ شہادت بچشانیدہ۔ انجامش بخیر گردید۔ شخصے تاریخِ شہادتِ وے "غمِ عمدہ" یافتہ و چوں بہ وضعِ زنان مشہور بود، ظریفے، تاریخِ وے بطرزِ وے "اوہ لوگو امیر خاں موا" گفتہ و دادِ سخنوری دادہ۔" (ص ۹)

خان آرزو:۔

"ولادتِ او در سنہ یک ہزار و یک صد و یک ہجری واقع شدہ ....
.... در سنہ یک ہزار و یک صد و شصت و چہار تذکرۃ الشعرا مسمّٰی بہ "مجمع النفائس" تالیف نمودہ ..... در سنہ یک ہزار و یک صد و سی و دو

از گوالیار بدار الخلافت شاہجہان آباد آمدہ ..... در اواخر محرم سنہ یک ہزار و یک صد و شصت و ہشت ہجری ..... بہ بلدۂ اودھ کہ وطنِ اصلِ جدِّ او شیخ کمال الدین است، رسید ..... چوں وقتِ انتقال قریب رسید در بلدۂ لکھنؤ آمدہ بست و سوم ربیع الآخر سنہ یک ہزار و یک صد و شصت و نہ بجوارِ رحمتِ حق پیوست۔" (ص ص ۱۰ و ۱۱)

اجملؔ الہ آبادی :۔

"سنِ شریفش از سی و دو سال تجاوز نہ کردہ چنانچہ روزے یکے از دوستانش تفحصِ تاریخِ تولدِ وے می کرد۔ از طریقِ انبساط فرمود "خورشیدم" چوں حساب کردند، ہمیں تاریخ تولدش بود۔" (ص ۱۲)

قزلباش خاں امیدؔ :۔

"در سنہ یک ہزار و یک صد و پنجاہ و نہ ہجری جہانِ فانی را پدرود نمود۔" (ص ۱۸)

غلام یحییٰ انصافؔ :۔

"در سنہ یک ہزار و یک صد و ہشاد و ہفت در گذشت۔" (ص ۱۹)

غلام علی اظہرؔ :۔

"در سنہ یک ہزار و یک صد و نود و دو رحمتِ حق پیوست۔" (ص ۲۲)

یہ مثالیں جو صرف ردیف الف سے ماخوذ ہیں، شعرائے اردو کے تذکروں کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کرتی ہیں اور اس خیال کی تائید و توثیق کے لیے کافی ہیں کہ امراللہ تذکرہ نگاری کے مقاصد اور مطالبات سے بخوبی واقف تھے۔ انھوں نے ترجمہ نگاری کے سلسلے میں جن پہلوؤں پر بطور خاص توجہ دی ہے، ان کی اہمیت کو اگر عام طور پر محسوس کیا گیا ہوتا تو آج تاریخ ادب کے بہت سے بے ربط سلسلوں کو جوڑنے میں وہ دشواریاں پیش نہ آتیں جن سے بصورتِ موجودہ قدم قدم پر واسطہ پڑتا ہے۔

بعض شعرا کے ذکر میں امراللہ نے عام حالات زندگی کے ساتھ ساتھ ان کے

معاملات عشق و محبت کی تفصیلات بھی سپردِ قلم کر دی ہیں۔ متعلقہ افراد کی افتادِ طبع، مزاج کی ساخت، ذہنی و فکری میلانات اور ان کے زمانے کے تہذیبی و معاشرتی ماحول کو سمجھنے کے لیے اس قسم کے واقعات کی اہمیت مسلم ہے۔ اس لحاظ سے "مسرّت افزا" کے اوراق میں ان کی موجودگی اس کے سوانحی پہلو کی وقعت میں کچھ اور اضافہ کر دیتی ہے۔ ذیل کی مثالوں سے ان واقعات کی نوعیت کا اندازہ ہوگا۔

رستم علی رستم الہ آبادی کے ذکر میں عشقِ خانہ خراب کے ہاتھوں ان کی خانماں ویرانی کی داستان بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"جہتِ تلاشِ روزگار عزیمتِ دکھن نمود۔ در آں جا در سرکارِ یکے از راجہا نوکر شد۔ چندیں در نہ گذشتہ بود کہ از بوقلمونیٔ روزگار ہوائے عشقِ پسرِ وے کہ بہ حسنِ صورت یکتائے زماں بود، در سرش جا گرفت و فریفتۂ حسن و جمال و شیفتۂ خد و خالِ او شد۔ بفحوائے ایں کلام کہ "عشق و مشک را نتواں نہفتن" طشتِ بدنامی از بامِ افتاد و صدائے عشقِ وے بگوشِ خاص و عام داد۔ چوں پدرش ازیں خبر مطلع گشت و در صددِ قتلِ آں آوارۂ دشتِ جنوں کمرِ سعی بر بست، آں عاشقِ رستم دل نظر بر ستمیٔ خود نمودہ با معشوق ہم عناں از انجا برآمد۔ پدرش چوں ازیں خبرِ وحشت اثر خبر یافت، چندیں از جوانانِ دلاور را بہ تعاقبِ آں ناعاقبت اندیش گماشت۔ تا آں فلک زدہ را چوں زالِ ضعیف گرفتہ آوردند و در قیدِ شدید گرفتار کردند۔" (ص ص ۸۴ و ۸۵)

شیخ برکت اللہ قریبؔ بنارسی کی سرگذشتِ عشق خود انھی کے واسطے سے بلکہ انھی کے الفاظ میں اس طرح بیان کرتے ہیں:

"در دہلی ناگاہ شعلۂ عشقِ شمع فروش خرمنِ صبر و توانِ مرا بسوخت و پروانہ نمط آتشِ بے قراری در دل و جانِ من افروخت۔ مدتے چوں شمع می سوختم و بسان موم می گداختم۔ سرم باعثِ سرگرانیم بود و تنم سر تا پا از گرمیٔ ہوائے محبتِ آں شمع روگداز می شد۔ ہر شب سر فروشی شعارم بود و ہر سحر بہ خاکستر

شدن امیدوار۔ در عینِ شب ہائے وصال کہ پروانہ وار بر سرش نثار بودم، آں شمعِ محفلِ دل ربائی از صرصرِ اجل خاموش شد و من چوں پروانۂ نیم سوختہ بہ نیم جانے کہ داشتم از وصلِ او مایوس شدم۔" (ص ۱۷۵)

ہندوستان کے مختلف ادبی مراکز اور بڑے بڑے شہروں کی سیاحت کے دوران امراللہ کو جن اربابِ کمال سے ملنے کے مواقع حاصل ہوئے، ان میں ہر حیثیت اور ہر پائے کے لوگ شامل ہیں۔ اگر ایک طرف کچھ ایسی جلیل القدر ہستیاں ہیں جن کے قدموں سے اس وقت بھی شہرت و مقبولیت آنکھیں مل رہی تھی اور آج بھی اس وابستگی کو اپنے لیے باعثِ افتخار سمجھتی ہے تو دوسری طرف کچھ ایسے غیر معروف فنکار بھی ہیں جنھوں نے پردۂ گمنامی میں زندگیاں گزاریں اور ان کے فنی کمالات کو قبولِ عام کی سند حاصل نہ ہوسکی۔ اس فرقِ مراتب کے باوجود ان لوگوں کے اخلاق و عادات، سیرت و کردار، فضل و کمال اور وجاہت و ثقاہت نے امراللہ کے دل و دماغ پر جو نقوش مرتسم کیے ان کے اظہار و اعتراف میں انھوں نے کسی تفریق و امتیاز اور بخل سے کام نہیں لیا ہے اور اس خوبی کے ساتھ ان پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے کہ الفاظ کے بے جان مرقعے زندگی کی تب و تاب سے چمک اٹھے ہیں۔ مثال کے طور پر خواجہ میر دردؔ کے صاحبزادے میاں صاحب میر الم کے متعلق لکھتے ہیں:

"اخلاقِ پسندیدہ و اوصافِ حمیدہ دارد۔ از جودتِ طبعِ خود علمِ استادی برپا ساختہ و سابقانِ میدانِ سخنوری را در الم انداختہ۔ طبعِ ظریف و مزاجِ لطیف دارد۔ خاکساری و انکساری را شعارِ خود ساختہ ..... دہلی را جہتِ سیرِ دیارِ شرقی گذاشتہ۔ چندے در عظیم آباد بود۔ از مولفِ درہماں دیار تلاقیٔ جسمانی روداده۔ بارہا در فقیر خانہ تشریف می آورد۔" (ص ۱۵)

جواں سال انشاؔ کی شخصیت میں انھیں ایک اچھے انسان کے اوصاف اور ایک بڑے فن کار کی خوبیاں ایک دوسرے سے ہم آہنگ نظر آئی ہیں۔ اس تاثر کو ان

الفاظ میں قلمبند کرتے ہیں:

"جوانیست بسیار خوش خلق و خوش ظاہر، از حلاوتِ شیریں زبانی آشنا و بہ لذتِ زباں دانی طبعش رسا۔ انشاے کلام وے مربوط و طورِ اداے او بسیار مضبوط۔ انشاء اللہ تعالیٰ روز بروز فکرت وے دراز دیاد خواہد بود۔" (ص ۲۳)

حسین عطا خاں تحسین کی شخصیت کے جاذبِ نظر اور دلآویز پہلوؤں پر اس طرح روشنی ڈالتے ہیں:

"شیریں زبانیٔ او غنچہ ہاے افسردہ خاطر ہاے پریشاں را بہ شگفتگی می آرد و خوش بیانیٔ او از دل ہاے مغموم و حیراں آشفتگی و شیفتگی می رباید۔ در لطیفہ گوئی و حاضر جوابی عدیم المثال است و در گرم اختلاطی و یار باشی مثلش دریں عصر ناممکن بلکہ محال۔" (ص ۴۳)

محمد روشن جوشش اور محمد عابد دل عظیم آبادی کے حسن اخلاق اور شرافتِ نفس سے متاثر ہو کر ان کے بارے میں یہ رائے ظاہر کرتے ہیں:

"حق تعالیٰ ہر دو برادر را توفیقِ تحصیلِ حسنات رفیق گردانیدہ و چراغِ وجودِ ایشاں را از روغنِ انکسار و تواضع روشن کردہ و آب و گلِ ایشاں بجوشش و دلداری مجبول گشتہ۔ از عجز و خاکساری مقبولِ خاطر ہاے وضیع و شریف شدہ۔" (ص ۵۴)

جعفر خاں راغبؔ کے حال میں ان کی ہر دل عزیزی کے متعلق لکھتے ہیں:

"بہ قدر دانیٔ فقرا و قدر شناسیٔ علماء مخلوق است و بہ حسنِ خلق و یار باشی مجبول ..... بہ ہدایت لطفِ الٰہی در پیشہ، صداقت و محبت یک رنگ و در پیشہ، یک جہتی و یک رنگی شیرافگن است۔ حق تعالیٰ او را عزیز دل ہا ساختہ و عزتش در چشم و دلِ یار و اغیار جادادہ۔" (ص ۸۹)

مرزا سوداؔ کی شخصیت کا خاکہ اس قدر جامع اور مکمل ہے کہ اس کے مطالعے سے قلم رو ادب میں ان کے اعتبار و اقتدار کی کیفیت پوری طرح نمایاں ہو جاتی ہے۔

مولف کو ان کی خدمت میں باریابی کا شرف ۱۱۹۱ھ/۱۷۷۷ء میں حاصل ہوا تھا جب کہ وہ تحصیلِ علم اور سیر و تفریح کی غرض سے لکھنؤ میں قیام پذیر تھے۔ لکھتے ہیں:

"شاعریست رفیع الشان، خوش فکر، شیریں زباں، یار باش، سخن شناس، ظریف الطبع و حریف وضع۔ سوادِ شعرش سوادِ ہندوستان را منور گردانیدہ و غلغلۂ استادیش سخنوران را در شش در تحیر انداختہ۔ طالبانِ ایں فن را فکرِ ہمسری او در زنجیرِ سودائے خام آویختہ و در دماغِ مدعیانِ سخن طراز ریختہ اش خلطِ سودا ریختہ ..... زبان آورانِ کامل او را بہ استادی یاد می کنند و شعرائے ہند بہ آئینِ خود ملک الشعرا قرار دادہ اند ..... آتشِ دیدنش پیوستہ در کانونِ سینہ مشتعل می شد آخر چوں تلاقیٔ جسمانی بہم رسیدہ، زیادہ از شنیدہ دیدم۔ غرض از مغتنماتِ روزگار است۔" (ص ص ۹۶ و ۹۷)

جون پور کے ایک غیر معروف شاعر مولوی جان محمد ناتواں کو، جن سے عظیم آباد میں ملاقات کا اتفاق ہوا تھا، مولف نے درج ذیل اوصاف سے متصف پایا ہے:

"او تعالیٰ خاکِ او را از آلائشِ فکر و فساد مبرا آفریدہ۔ با سخن دنیا داری شناسائی ندارد۔ بجز خدا پرستی و خدا شناسی مرکوزِ خاطرش نیست۔ خود را بکمالِ فروتنی بے حد عاجز و ناتواں می داند، و از غایتِ انکسار و نفس شکنی کمترینِ خلائق می داند...

..... اوقاتِ عزیز خود را در عبادت و ریاضت بسر می برد۔" (ص ۲۸۸)

ان اقتباسات کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ امراللہ سوانح نگاری کی طرح شخصیت کی خاکہ کشی اور سیرت نگاری میں بھی بڑی حد تک کامیاب رہے ہیں۔ چناں چہ اس باب میں بھی ان کا تذکرہ معاصر تذکروں سے کسی طرح پیچھے نہیں۔ البتہ تنقیدِ کلام کے معاملے میں ان کی یہ امتیازی اور انفرادی روش برقرار نہیں رہ سکی ہے۔ اس میدان میں ان سے پہلے میر حسن اور بعض دوسرے تذکرہ نگار جو روایات قائم کر چکے تھے امراللہ ان کے اتباع سے قاصر رہے ہیں۔ غالباً ان کا یہ موقف کہ "مردمِ چشمِ ایں خاکسار در اشعار عیب جوئی را شعار ندارد۔" (ترجمۂ خاکسار ص ۷۵) انھیں

قدم قدم پر واضح اور فیصلہ کن انداز میں اظہارِ خیال سے روکتا رہا ہے، جس کے نتیجے میں انھوں نے اکثر شاعروں کے حال میں کلام کے متعلق کسی قسم کی رائے زنی کے بجائے خاموش رہنا بہتر و مناسب خیال کیا ہے اور اگر اتفاقاً کبھی اس طلسمِ سکوت کے ٹوٹنے کی نوبت آئی بھی ہے تو بات روایتی نوعیت کے چند توصیفی کلمات اور سرسری جملوں سے آگے نہیں بڑھ سکی ہے مثلاً:

سراج اورنگ آبادی :۔ "سخنِ او خالی از چاشنی نیست۔" (ص ۱۰۱)

میر فتح علی شیدا :۔ "از کلامش بوے دل سوزی و شیدائی می آید۔" (ص ۱۱۵)

شاہ محمد صلاح الہ آبادی :۔ "سخن بہ طرزِ ولی دکنی کہ خیلے دل چسپ و حلاوت انگیز است، می آراست۔" (ص ۱۲۲)

شمس الدین طالع :۔ "معانی نازک و مضامینِ تازہ در قالبِ اشعار آرد۔" (ص ۱۲۸)

عبدالولی عزلت سورتی :۔ "مضامینِ تازہ در سلکِ نظم منتظم می ساخت۔" (ص ۱۳۸)

شاہ واقف :۔ "کلامش ناخن بدل می زند۔" (ص ۲۲۵)

بعض شاعروں کے متعلق ان کی رائیں اس عام اور رسمی انداز سے کسی قدر ہٹی ہوئی معلوم ہوتی ہیں لیکن ان کی تعداد بہت کم ہے تاہم ان میں سے چند بطور مثال پیش کی جاتی ہیں:

کرم اللہ خاں درد :۔ "کلامش از چاشنیٔ درد خالی نیست۔ بسیار خوش فکر، عاشق مزاج بود۔ سخن را از آغاز تا بہ انجام بہ آئین عمدہ می آراست۔" (ص ۸۰)

فضل علی دانا :۔ "فکرِ مضمونِ تازہ می کند و وحشیانِ مطالبِ رنگین را بہ آئینِ رنگین در دام تسطیر می کشد۔" (ص ۸۱)

میر سوز :۔ "اشعارِ ریختہ را بسوز و گداز می گوید و مضامینِ تر و تازہ می جوید ..... لطافتِ طبع و شوخیٔ مزاجش از اشعار ظاہر می شود۔" (ص ۱۰۲)

کہیں کہیں کسی خاص محرک کے تحت امراللہ نے معمولی سی بات کو غیر ضروری طول دے کر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً انعام اللہ خاں یقینؔ کی موزوں طبعی کے متعلق میرؔ کے شکوک و شبہات کے علی الرغم ان کی رسائی فکر اور بلندیٔ طبع کی تعریف میں اس طرح رطب اللسان ہیں:

"شہبازِ فکرِ وے بہ صیدِ معانی چناں بلند پروازی کردے کہ طائرِ خیالِ سامعان بدریافتِ کنہ آں درنیم راہ (ماندے) و ہمائے اندیشۂ وے بر قلۂ کوہِ سخن بطورے پرفشانی نمودے کہ طبعِ رسائے سخنوران بہ امیدِ رسائی در پرتوِ سایہ اش ہرچند دویدے ولے از تیز پروازیش بجائے نرسیدے۔" (ص ۲۴۱)

تنقید کے یہ نمونے کسی خاص اندازِ فکر کی نمائندگی نہیں کرتے اور یہ "مسرت افزا" کی ایک ایسی خامی ہے جس نے اس تذکرے کو اس میدان میں میر حسنؔ کے تذکرۂ شعرائے اردو پر سبقت و فوقیت سے محروم کر دیا ہے۔

یہاں "مسرت افزا" کے بعض ایسے اندراجات کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے جو اپنی ضمنی حیثیت کے باوجود تذکرے کی افادیت و اہمیت میں اضافے کا سبب بنے ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے ہماری نگاہ احمد شاہ درّانی کے حملوں اور اس زمانے کے عام سیاسی انتشار اور سماجی بے اطمینانی کے نتیجے میں پیدا شدہ صورتِ حال سے متعلق اشارات کی طرف جاتی ہے۔ یہ حشر سامان حادثات و واقعات مصائب اور تباہیوں کے صدہا قافلے اپنے جلو میں لے کر آئے تھے مغلیہ سلطنت کی رہی سہی شان و شوکت بڑی تیزی کے ساتھ زوال کی داستانیں دہرا رہی تھی۔ اعیانِ مملکت اور امرا و رؤسا جن کی فیاضیوں کے سائے تلے علوم و فنون اور شعر و ادب نے ترقی کی منزلیں طے کی تھیں، دوسروں کے دست نگر بن چکے تھے اور ان تبدیلیوں نے اربابِ کمال کو نئی پناہ گاہیں تلاش کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ درج ذیل بیانات اس انقلاب عظیم اور عام آشفتہ حالی و پریشانیٔ روزگاری کا پتا دیتے ہیں۔

حمزہ علی رند :۔ "از برہمیٔ اطوارِ آں دیار (شاہجہان آباد) ترکِ خانماں نمودہ بتلاشِ روزگار بطرفِ بنگالہ رفت و مدتے در لباسِ سپہ گری بسر برد۔" (ص ۸۸)

جعفر خاں راغب :۔ "تا سنہ یک ہزار و یک صد و ہفتاد ہجری ..... (در شاہجہان آباد) استقامت داشت۔ از غلغلۂ آمدِ شاہ درانی ترکِ خانماں نمودہ باعثائرِ خود ازاں جا برآمدہ در بلدۂ عظیم آباد کہ بہ نسبتِ دیگر بلاد مامنِ شرفاست، توطن اختیار نمودہ۔" (ص ۸۹)

ہدایت علی خاں عاشق :۔ "تا آخرِ سلطنتِ فردوس آرام گاہ در شاہجہان آباد سکونت داشت۔ بعد تاراجیٔ شہر از آمدن احمد شاہ درّانی از زادگاہِ خود آوارہ شدہ واردِ ملکِ بنگالہ گردید۔" (ص ۱۴۰)

اشرف علی خاں فغاں :۔ "از حادثۂ مکحول شدنِ احمد شاہ کہ بہ سببِ ناحق شناسی امرائے ناعاقبت اندیش رو دادہ و تفرقۂ فرار کہ براہلِ آں دیار از آمدِ آمدِ شاہ درّانی افتادہ، ترکِ خانماں نمودہ در بلدۂ عظیم آباد رسیدہ۔" (ص ۱۵۲)

قدرت اللہ قدرت :۔ "وطنِ اصلیٔ وے دہلی است۔ از برہمیٔ روزگار و (قدر) ناشناسیٔ امرائے آں دیار ترکِ زاد بوم نمودہ در مرشد آباد وطن اختیار کردہ۔" (ص ۱۷۳)

میر مہدی مہدی :۔ "بعدِ خرابیٔ دہلی بمعہ اطفال و عیال وارد الہ آباد شدہ دست بدامنِ تقویٰ زدہ خانۂ توکل را از آلائش دنیاوی پاک رُفتہ، در مامنِ رضا بقضا انزوا گزیدہ۔" (ص ۲۲۵)

"مسرت افزا" کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس کے مولف نے انتخابِ کلام میں دوسرے تذکرہ نگاروں کی بہ نسبت تنوع اور ہمہ گیری کو زیادہ ملحوظ رکھا ہے۔

چنانچہ جن شاعروں نے غزل کے علاوہ کسی دوسری صنف میں زیادہ کامیابی کے ساتھ اپنے کمالات کا مظاہرہ کیا ہے، ان کے حالات میں اس صنف کے نمونے بھی پیش کر دیے گئے ہیں۔ مثلاً سودا کے ذکر میں جن کا معیارِ کمال متفقہ طور پر ان کی قصیدہ گوئی قرار پائی ہے، بعض قصائد پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"قصیدۂ در مدحِ سال گرۂ غازی الدین خاں بہادر بنظم آوردہ صنعت ہا بکار بردہ کہ کلام را بحد اعجاز رسانیدہ۔ مطلعش ایں است:

صبح ہوتے جو گئی آج مری آنکھ جھپک
دی خوشی نے وہیں آکر درِ دل پر دستک

وقصیدۂ کہ در ہجوِ اسپ گفتہ و دادِ سخنوری دادہ، بر السنہ وافواہِ عالم مشہور۔ آغازش اینست:

ہے چرخ جب سے ابلقِ ایام پر سوار
رکھتا نہیں ہے دست عناں کا بیک قرار

قصیدۂ در مدحِ مہربان خاں رند گفتہ بود۔ دراں ایں بیت آوردہ:

مہرباں خاں جو نہ ہوتی تری خلقت پیدا
ہوتے عنصر نہ کبھو مل کے بہم چاروں ایک

دوستانش زبانِ شماتت کشادند وگفتہ (گفتند) کہ ایں چنیں مضمون را درچنیں مقام آراستن کمالِ بے حمیتی است۔ درخود فہمیدہ آں قصیدہ را در مدح سرورِ اولیا علیہ السلام تزئین دادہ وگفتہ:

شاہِ مرداں جو نہ ہوتی تری خلقت پیدا
ہوتے عنصر نہ کبھو مل کے بہم چاروں ایک"۔ (ص ص ۹۶ و ۹۷)

میر حیدر علی حیرآن کے انتخابِ کلام میں "قصیدہ در مدح آصف الدولہ" کے سات اشعار، محمد فقیہ دردمند کے ذکر میں ان کے ساقی نامہ کے چند شعر، فضائل علی خاں فضائل دہلوی کے نام سے ان کی عشقیہ مثنوی کے کچھ حصے، اور معین بدایونی

کے حالات کے تحت ان کے دو مخمس منقول ہیں۔ حسین عطا خاں تحسین کی تخلیقات کے نمونوں میں ایک غزل اور "قصیدہ در مدح نواب وزیر الملک" سے ماخوذ اشعار کے علاوہ "نوطرز مرصع" کا ایک طویل اقتباس بھی شامل ہے۔ اردو کی اس مشہور اور اہم نثری تصنیف کا تعارف ان الفاظ میں کرایا گیا ہے:

"نسخۂ نوطرزِ مرصع مشتمل بر قصۂ چہار درویش بہ عبارتِ ہندی تالیف نمودہ۔ بلا تصنع سحر کردہ۔ موجدِ ایں ایجادِ نادرہ غیرِ وے از وقتِ آدم تا ایں دم احدے نشدہ۔ واقع کہ ہندی را با فارسی بچہ خوبی ترصیع نمودہ۔" (ص ۴۲)

امراللہ کا یہ اقدام بھی قابلِ تعریف ہے کہ انھوں نے اشعار کے اندراج میں بڑی احتیاط سے کام لیا ہے اور اس بات کی کوشش کی ہے کہ حتی الامکان کوئی انتسابی غلطی سرزد نہ ہو۔ خاتمے کے ذیل میں اس اہتمام کی وضاحت کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"در تصحیح اشعار و ترقیمِ آن تحتِ احوال ناظمانش اہتمامِ عظیم بکار بردم لے چوں اتفاقِ تطبیق از دواوینِ شاں نیفتاد، اگر شعرے کہ در ذیلِ شعرِ دیگرے مذکور شود، قصور ناقل است نہ تقصیرِ مولف۔" (ص ۲۴۷)

پھر بھی اس قسم کی لغزشوں سے یہ تذکرہ پوری طرح محفوظ نہیں۔ مثلاً قائم چاندپوری کے یہ اشعار میر سے منسوب کیے گئے ہیں:

دل پا کے اس کی زلف میں آرام رہ گیا
درویش جس جگہ کہ ہوئی شام رہ گیا

قسمت یہ جا کے دیکھو کہاں ٹوٹی ہے کمند
دو چار ہاتھ جب کہ سرِ بام رہ گیا[1]

---

[1] قائم کے دیوان اور تذکرے میں یہ شعر بادنیٰ تغیر الفاظ اس طرح درج ہے:

قسمت تو دیکھ ٹوٹی ہے جا کر کہاں کمند کچھ دور اپنے ہاتھ سے جب بام رہ گیا

(دیوان قائم مطبوعہ ص ۳ و مخزن نکات ص ۸۷)

مندرجہ ذیل شعر جو دراصل میرؔ کی تخلیق ہے[1]، خواجہ بخش منتظرؔ الہ آبادی سے منسوب کر دیا گیا ہے۔

متصل روتے ہی رہیے تو بجھے آتشِ دل
ایک دو آنسو تو اور آگ لگا جاتے ہیں (ص ۲۰۸)

درج ذیل مطلع جسے تمام تذکرہ نگار عمدۃ الملک امیر خاں انجامؔ سے منسوب کرتے رہے ہیں[2]، صفحہ ۱۰ پر انجامؔ کے کلام میں اور صفحہ ۱۸۴ پر مرزا مظہرؔ کے اشعار کے تحت نقل ہوا ہے۔

اتنی فرصت دے کہ رخصت ہو چلیں صیاد ہم
مدتوں اس باغ کے سایہ میں تھے آباد ہم

مطلع ذیل بھی بیک وقت دو شاعروں سے انتساب کی ایسی ہی مثال پیش کرتا ہے۔

الٰہی مت کسی کے پیش رنجِ انتظار آوے
ہمارا دیکھیے کیا حال ہو جب تک بہار آوے

اس مطلع کو سب سے پہلے میر حسنؔ[3] نے اور ان کے بعد غالباً انھی کی تقلید میں دوسرے کئی تذکرہ نگاروں نے ایک مجہول الاحوال شاعر محمد تقی غریبؔ سے منسوب کیا ہے[4]۔ امراللہ نے بھی اولاً اس روایت کی پیروی کی ہے۔ اس کے بعد بعینہٖ اسے مرزا مظہرؔ کے کلام میں شامل کر دیا ہے۔ چونکہ غریبؔ اور مظہرؔ دونوں ہی ایسے شاعر ہیں جن کے کلام کی تصدیق کے معتبر ذرائع مفقود ہیں، اس لیے اس سلسلے میں کسی

---

[1] انتخاب کلام میرؔ مرتبہ عبدالحق ص ۱۱۱

[2] تذکرہ شعرائے اردو از میر حسنؔ طبعِ اول ص ۴۵ و گلزارِ ابراہیم ص ۵ و گلشن ہند طبعِ ثانی ص ۱۴ و تذکرۂ عشقی ــــ دو تذکرے جلد اول ص ۶

[3] تذکرہ شعرائے اردو طبع اول ص ۱۴۱

[4] قائم اس شعر کو ایک تیسرے شاعر محمد فقیہ دردمند سے منسوب کرتے ہیں۔ (مخزن نکات ص ۴۹)

صحیح فیصلے تک پہنچنا مشکل ہے۔

تکرار کی ایک اور مثال مندرجہ ذیل مطلع کے معاملے میں سامنے آتی ہے،

بدلہ ترے ستم کا کوئی تجھ سے کیا کرے
اپنا ہی تو فریفتہ ہوئے خدا کرے

یہ مطلع مرزا محمد رفیع سوداؔ اور اشرف علی خاں فغاںؔ کے کلام میں مشترک ہے لیکن دراصل سوداؔ کی تخلیق ہے اور ان کے کلیات میں غزلیات کے علاوہ مخمسات کے ذیل میں بھی ملاحظہ کیا جا سکتا ہے[1]

گنا بیگم منتؔ زوجۂ نواب وزیر الممالک غازی الدین خاں بہادر کے حال میں ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"گویند روزے عماد الملک در خواب بود بر بالینش بیگم آمد، چوں غافل دید، برگشت۔ ناگاہ نواب بیدار شد وایں مصرع بدیہہ خواند ع آکر ہماری لاش پہ کیا یار کر چلے۔ بیگم فی الفور گفت ع خوابِ عدم سے فتنے کو بیدار کر چلے۔ بعد ازیں ریختہ را تمام کرد۔

میرے دل حزیں کو جو افگار کر چلے — اے واہ وا میاں یہ بھلا پیار کر چلے
کیا سحر تھا نہ جانیے، گلشن میں آن کر — بلبل کو گل کی شکل سے بیزار کر چلے
آباد رہیو پیرِ مغاں اب یہ مے کدہ — ہم بھی لبوں کو یاں تراب اک بار کر چلے
جاتے ہو جو بھرے ہوئے گرد و غبار سے — تعمیر کس کے دل کی یہ مسمار کر چلے

(ص ص ۲۲۰ و ۲۲۱)

یہ واقعہ کسی افسانہ طراز کی طباعی کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے کیونکہ ہمارے سامنے ایسی شہادتیں موجود ہیں جن سے اس کی عدمِ صداقت واضح ہو جاتی ہے۔ اس غزل کا مطلعِ اول (جسے باقی اشعار کی تخلیق کا سبب قرار دیا گیا ہے) اور تیسرا شعر میر حسن

---

[1] چمنستانِ شعرا کے ذیل میں اس موضوع پر تفصیل سے بحث کی جا چکی ہے

نے مرزا عظیم بیگ کے نام سے پیش کیا ہے[1] چوتھا شعر بھی انھی کے کلام میں حکیم قدرت اللہ قاسم کے یہاں موجود ہے[2] ایسی صورت میں یہ بات بعید از امکان نہیں کہ مطلعِ ثانی اور آخری شعر بھی عظیم ہی کی تخلیق ہو "تذکرہ شعرائے اردو" اور "مجموعہ نغز" کے انتخابات میں ان اشعار کے علاوہ یہ شعر بھی شامل ہے

خواہی پیالہ خواہ سبو کھینچیو کلال
ہم تجھ کو اپنی خاک پہ مختار کر چلے

چونکہ میر حسن عظیم کے ہم عصر اور قاسم ان کے دوست ہیں، اس لیے بظاہر اس انتساب کی صحت میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ میر حسن کی تحریر کے مطابق تیسرے شعر کے پہلے مصرعے میں "نہ جانیے گلشن میں آن کر" اور قاسم کی روایت کے بموجب چوتھے شعر کے مصرعِ ثانی میں "یاں تراب اک بار کر چلے" کی جگہ "یاں سے تراک بار کر چلے" ہونا چاہیے۔

ریختہ گوئی میں ولی کی اولیت کے متعلق مولف کا یہ بیان بھی محل نظر ہے کہ

"اصلِ ریختہ از دکن است و دراں دیار ولی موجد ایں طرزِ تازہ شدہ۔ بعد ازاں سخورانِ ہندوستان گفتہ گفتہ بایں روش آراستہ۔" (ذکر ولی صفحہ ۲۳۳)

تحقیقِ جدید سے یہ حقیقت پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ دکن میں ولی سے پہلے مقامی زبان میں طبع آزمائی کا آغاز ہو چکا تھا اور شمالی ہند میں بھی ان کے دہلی میں ورود سے قبل اس میدان میں کئی لوگ اپنی طباعی کے جوہر دکھا چکے تھے۔

آخر میں امراللہ کے طرزِ نگارش کے متعلق چند باتیں عرض کر دینا بے محل نہ ہوگا۔ جیسا کہ سطورِ سابقہ میں مختلف عنوانات کے تحت پیش کیے گئے اقتباسات سے ظاہر ہے، انھوں نے اظہارِ مطالب کے لیے بالعموم زبان و بیان کی سلاست و سادگی کو

---

[1] تذکرہ شعرائے اردو طبع اول ص ۳۸

[2] مجموعہ نغز جلد دوم ص ۱۰

پیشِ نظر رکھا ہے، جس کی بدولت ان کی تحریر ایہام اور اغلاق و پیچیدگی کے عیوب سے مبرا رہی ہے۔ تاہم کبھی کبھی ان کے قلم نے اس محتاط و مستحسن روش سے ہٹ کر انشا پردازی و عبارت آرائی کی راہ اختیار کر لی ہے اور نتیجے کے طور پر نفسِ مطلب، ضلع جگت صنائع اور تلازمات کے پیچ و خم میں کھو کر رہ گیا ہے۔

سید ہدایت علی خاں عاشقؔ کے حالات سے جو فن طبابت اور تجربۂ معالجات میں یگانہ و ممتاز تھے ایک مثال ملاحظہ ہو۔ کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"مضامینِ رنگینِ اشعارش مفرحِ یاران و معاجینِ خوش آئینِ بیانش مصحِ بیماران۔ نسخۂ دیوانش دل پذیر و مجرباتِ طبعش جہتِ مشتاقانِ عین تدبیر"

(ص ۱۴۰)

لیکن اس قسم کی مثالیں شاذ و نادر کا حکم رکھتی ہیں اور ان سے تذکرے کی مجموعی فضا متاثر نہیں ہوتی۔ امراللہ نے کام کی زبان میں کام کی باتیں لکھ کر اور خاص طور پر التزامِ سنین کے ساتھ اہم واقعاتِ زندگی کے انضباط کی صورت میں تذکرہ نگاری کے فن کو جس نئی جہت سے آشنا کیا ہے وہ "مسرت افزا" کو معاصر تذکروں سے ممتاز کرتے ہوئے اردو شعر و ادب سے دل چسپی رکھنے والوں کے لیے ایک مفید و معتبر ماخذ کا درجہ عطا کرتی ہے۔

گلِ عجائب

"گلِ عجائب" اسد علی خاں تمنّا اورنگ آبادی (متوفّٰی ۱۲۰۴ھ/۹۰-۱۷۸۹ء) کی تالیف ہے۔ یہ تذکرہ جسے انھوں نے اپنے ایک دوست محمد کرم بخش سالم کی فرمائش پر ترتیب دیا ہے (ص ۶۱) اکیاون[۵۱] شاعروں کے ذکر پر مشتمل ہے اور ۱۹۳۶ء میں مولوی عبدالحق کے مقدمے کے ساتھ انجمن ترقی اردو ہند کی جانب سے شائع ہو چکا ہے۔ مطبوعہ نسخہ کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد کے واحد قلمی نسخے پر مبنی ہے۔ اصل کتاب میں اردو اشعار کے ساتھ ساتھ جا بجا فارسی کلام کے نمونے بھی پیش کیے گئے ہیں لیکن فاضل مرتب نے انھیں غیر ضروری سمجھتے ہوئے متن سے خارج کر دیا ہے۔

حیدر آباد کے قلمی نسخے کے ورقِ اول کی پیشانی پر اس تذکرے کا نام "رنگ دوم گل عجائب من مقالات الغرائب" لکھا ہوا ہے۔ مولوی عبدالحق نے اس تحریر سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے:

> "تمنّا کی کوئی تالیف "مقالات الغرائب" نام کی تھی جو کئی مقالوں پر مشتمل تھی، ہر مقالے کو اس نے "گل" سے موسوم کیا ہے اور "گل" کے ذیلی باب کو "رنگ" کا نام دیا ہے یہ تذکرہ "گلِ عجائب" کا رنگِ دوم ہے۔" (مقدمۂ مرتب ص۵)

ہمارا خیال یہ ہے کہ "گل عجائب" کا رنگِ اوّل شعرائے فارسی سے متعلق تھا۔ خان آرزو کے سلسلے میں ان کے استاد میر (عبدالصمد) سخن کے بارے میں تمنّا کا یہ بیان کہ ان کا ذکر رنگِ اول میں کیا جا چکا ہے، (ص ۱) اسی جانب اشارہ کرتا ہے۔ سخن چونکہ فارسی میں طبع آزمائی کرتے تھے اس لیے ان کا ذکر شعرائے فارسی کے

ساتھ ہی کیا گیا ہوگا۔ لیکن چونکہ تمنّا نے اس رنگِ دوم میں صرف اپنے معاصرین کا ذکر کیا ہے اس لحاظ سے یہ بھی ممکن ہے کہ رنگِ اول شعرائے متقدمین کے لیے مخصوص رہا ہو۔ بہرصورت ہمیں بحالت موجودہ اپنا دائرۂ بحث رنگِ دوم تک محدود رکھنا ہے۔

تذکرے کے اوّلین صفحے پر "تاریخِ آغازِ تذکرہ" کے عنوان سے ایک قطعہ اور آخر میں "تاریخِ اختتامِ تذکرہ" کے دو قطعے درج ہیں۔ یہ تینوں قطعات مولّف ہی کے طبع زاد ہیں۔ پہلے قطعے کے مادّۂ تاریخ "آغازِ صفحہ" سے ۱۱۹۲ھ برآمد ہوتا ہے جو بظاہر اس بات کی دلیل ہے کہ تمنّا نے تذکرے کی ترتیب کا کام ۱۱۹۲ھ/۱۷۷۸ء میں شروع کیا تھا لیکن اصل قلمی نسخے کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ آغاز و اختتام کے یہ قطعات تذکرے کی کتابت کے بعد اضافہ کیے گئے ہیں اس لیے یہ ضروری نہیں کہ ان سے جو سنین برآمد ہوتے ہیں وہ حقیقتِ حال کے عین مطابق ہوں۔ کم سے کم آغازِ کار کے زمانے کے سلسلے میں تو یہی صورت نظر آتی ہے۔ ثبوت کے لیے اولاد محمد خاں ذکاؔ برادر زادۂ علامہ غلام علی آزادؔ بلگرامی کے دوبارہ دکن میں وُرود اور مستقل قیام کے متعلق تمنّا کا یہ بیان ملاحظہ ہو:

> "بانبیرۂ میر صاحب آزاد سید امیر حیدر نام عزیمتِ دکن اختیار کرد ونہم رجب ۱۱۷۹ھ قدم بوسِ عمِ او منت برلبش گذاشت۔ ایں بار نوابِ والاشان ..... میر عبدالحیٔ خان ..... بقدر دانیٔ او پرداختند و بخطاب خانی اضافہ برنام وجاگیر مبلغ پنج ہزار روپیہ از جناب رئیسِ دکن ادرا مسرور ساختند۔ چہار سال می شود کہ در حیدرآباد دکن اقامت ورزیدہ دوام حاضرباشِ خدمتِ نواب صاحب موصوف است۔" (نسخہ مطبوعہ ص ۵۲ و ۵۳)

اس بیان کی رو سے ذکاؔ کے دکن میں قیام کی چار سالہ مدت ۱۱۸۳ھ/۱۷۶۹ء پر منتہی ہوتی ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان کا حال اسی سال لکھا گیا ہے۔ ایک اور شاعر ضیاؔ برہان پوری کے متعلق تمنّا کا یہ بیان بھی اسی سنہ کی تائید میں ثبوت فراہم کرتا ہے۔ لکھتے ہیں:

"چوں ہنوز بچہل سالگی رسیدہ وامیدِ عمرِ طبعی دارد، انشاء اللہ تعالیٰ معانیِ بسیار از طبعِ وقادِ او سر می زند۔" (ص ۶۹)

خود تمنا کے بیان کے مطابق ضیا ۷ شوال ۱۱۴۳ھ (۴ اپریل ۱۷۳۲ء) کو پیدا ہوئے تھے[1] (ص ۶۸) اس حساب سے ان کی عمر کے چالیس سال ۱۱۸۳ھ/۱۷۷۰ء میں پورے ہوتے ہیں۔ لہٰذا اس میں کسی شبہے کی گنجائش نہیں کہ ان کے حالات بھی ۱۱۸۳ھ/۱۷۷۰ء میں لکھے گئے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہی تذکرے کی ترتیب کے آغاز کا سال ہے۔

قطعاتِ تاریخ اختتام میں سے ایک قطعے سے ۱۱۹۴ھ (۱۷۸۰ء) اور دوسرے سے ۱۱۹۶ھ (۱۷۸۲ء) برآمد ہوتا ہے[2]۔ اس اختلافِ سنین کی اس کے سوا کوئی توجیہ نہیں کی جا سکتی کہ ۱۱۹۴ھ اختتامِ کار کا سال ہے اور ۱۱۹۶ھ میں نقشِ اوّل پر نظرِ ثانی کی گئی ہے۔ ۱۱۹۶ھ/۱۷۸۲ء کے بعد کسی اضافے یا ترمیم کے متعلق کوئی واضح اشارہ تذکرے میں موجود نہیں۔ البتہ ضیا برہان پوری کے ذکر میں ایک جگہ علامہ آزاد بلگرامی کو جن کی تاریخِ رحلت ۲۱ ذی قعدہ ۱۲۰۰ھ (۱۵ ستمبر ۱۷۸۶ء[3]) ہے، "حضرت آزاد مغفور لکھا گیا ہے۔ (ص ۶۸) اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۲۰۰ھ/۱۷۸۶ء کے بعد بھی کچھ اضافے کیے گئے ہیں لیکن چونکہ اس تحریر کے علاوہ کسی دوسرے بیان سے اس قیاس کی تائید نہیں ہوتی اور ضیا کے حالات بہ گمانِ غالب ۱۱۸۳ھ/۱۷۷۰ء میں لکھے گئے ہیں، اس لیے اس امکان کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ ۱۱۹۶ھ/۱۷۸۲ء کے بعد علامہ آزاد کے نام کے ساتھ لفظ "مغفور" کے اضافے کے سوا کوئی اور ترمیم عمل میں نہ آئی ہو یا یہ اضافہ بھی مولف کی بجائے کاتب یا کسی دوسرے

---

[1] شفیق نے بھی تذکرۂ گل رعنا میں یہی تاریخِ ولادت بیان کی ہے۔ تین تذکرے ص ۲۴۴

[2] مطبوعہ نسخے میں آخری مصرعے کے نیچے ۱۱۹۶ھ۔ ۲=۱۱۹۴ھ تحریر ہے۔ (ص ۱۶۶) لیکن پچھلے مصرعوں میں تخریج کا کوئی قرینہ موجود نہیں اور قلمی نسخے میں بھی ۱۱۹۶ھ ہی لکھا ہوا ہے۔

[3] بحرِ زخار از وجیہ الدین اشرف۔ مخطوطہ برٹش میوزیم ص ۳۱۵

شخص کے تصرف کا نتیجہ ہو۔

تمنا نے اس تذکرے میں جن شاعروں کو شامل کیا ہے، وہ جہاں ان کے ہم عصر تھے، وہیں ان میں سے بیشتر ان کے ہم وطن بھی تھے یا پھر کسبِ معاش کے سلسلے میں سرزمینِ دکن سے وابستہ تھے۔ اس قربِ زمانی و مکانی سے انھوں نے پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے اور اکثر شعرا کے بارے میں نہایت مفصل اور اہم معلومات فراہم کی ہیں۔ ولادت و وفات اور دوسرے سوانح زندگی کی تواریخ اور سنین کے حوالے بھی ان کے ہاں بکثرت ملتے ہیں۔ مثال کے طور پر موسوی خاں جرأت کو اس طرح متعارف کرایا ہے:

"نامِ اصلیٔ او میر محمد ہاشم است و سلسلۂ نسبش بہ بیست واسطہ بسابع ائمہ ہدیٰ علیہم التحیۃ والثنا می رسد۔ پدرش میر محمد شفیع و جدش میر سید علی کہ از گیلان بہند شتافتہ، در اورنگ آباد دکن رنگِ اقامت ریختہ بود۔ ولادت خاں جرأت در سنہ ثمان و ثمانین و الف (۱۰۸۸) در شہر مذکور واقع گردید و نخلِ قابلیتش در ظلِ تربیتِ والدِ خود برومند شدہ۔ ثمر مراد از علوم برگرفت۔ اوائل در ریاستِ ساداتِ بارہہ قلعہ دارِ دھارور (دھارواڑ) من مضافات خجستہ بنیادِ دکن بود۔ در عہدِ نواب آصف جاہ طاب ثراہ بمنصبِ دو ہزار و پانصدی و خدمتِ منشی گریٔ سرکار عزِ امتیاز یافت و در زمانِ نواب نظام الدولہ ناصر جنگ شہید بمنصبِ چہار ہزاری و خطاب معز الدولہ علم افتخار برافراخت۔ بتاریخ ششم شعبان سنہ خمس و سبعین و مائۃ الف (۱۱۷۵ھ) در اورنگ آباد عندلیبِ حیاتش بغزل خوانی ممات مائل گردید۔ میر غلام علی ارشد ..... تاریخِ وفاتش چنیں یافتہ: بسیرِ جاودانی کرد جرأت"۔ (ص ۴۷)

درگاہ قلی خاں بہادر درگاہؔ (۱۱۷۵ھ) کی نسبت لکھتے ہیں:

"خلف الصدق خاندان قلی خاں۔ بست و نہم رجب سنہ اثنین و عشرین و مائۃ الف (۱۱۲۲ھ) متولد شد و در عمر چہاردہ سالگی نواب آصف جاہ غفران پناہ

بمنصب وجاگیر سرفراز فرمود۔ چونکہ بہ بستِ سالگی رسید، ہمراہِ رکاب بود واکثر خدمات لائقہ حضور داشت۔ تاحینِ حیاتِ نواب مورد عنایات بود ودر وقتِ نظام الدولہ ناصر جنگ بانواعِ مراحم وخدمات لائقہ مامور بود ودر زمانِ امیر الممالک صلابت جنگ بہ منصبِ شش ہزاری وخطاب مومتمن الدولہ وصوبہ داری خجستہ بنیاد مفتخر گردید۔ در عصر نواب آصف جاہ ثانی دام اقبالہ بمنصبِ ہفت ہزاری وماہی مراتب وخطابِ مومتمن الملک ممتاز گردید وپس از چندے بخطاب خانِ دورانِ سرِافتخار برافراخت وتاچہاردہ سال بہ صوبہ داری اورنگ آباد پرداخت۔ غرۂ رجب ۱۱۷۹ھ از صوبہ داری معزول شدہ پنجم ذی حجہ سنہ الیہ از آنجا (یہ) پرگنہ نظام آباد کہ سی کروہی خجستہ بنیاد واقعست وجاگیر او بود، رفت وہژدہم جمادی الاولیٰ ۱۱۸۰ھ بمرضِ سرسام بجنت شتافت۔ جنازہ نعش اورا از نظام آباد آوردہ در مقبرۂ پدرش دفن کردند۔ عجب قیامت بود ایں مصراعِ تاریخش میر غلام علی ارشد گفتند:

۔۔۔۔۔ "اہل عالم سینۂ چاک از ماتمِ سالار جنگ" (ص ص ۵۰ و ۵۱)

اولاد محمد خاں ذکا کے بارے میں رقم طراز ہیں:

"بہ بست وہفتم شہر رجب المرجب ۱۱۵۱ھ در مقامِ بلگرام ۔۔۔۔۔۔ قامت را بخلعتِ ہستی آراست وظلِ تربیتِ بزرگانِ خود سواد را روشن ساخت ۔۔۔۔۔۔ در ۱۱۷۲ھ حسب الطلب عم مکرم خود میر صاحب آزاد از وطن بنگل زمین اورنگ آباد دکن رسید وباستفادۂ ملازمت کثیر الاضافت میر صاحب مذکور مباہاتش دست داد ۔۔۔۔۔۔ پنج سال کامل در حضورِ عم مکرم ماند۔ ناگاہ بر مزاجش محبتِ وطن غالب آمدہ درخصت گرفتہ روانہ منزلِ مقصود شد۔ میانِ الہ آباد ولکھنؤ وغیرہ امکنہ صاحبِ کمالان (و) سخنورانِ بسیار باو ملاقات کردند۔ یکسال کامل وچند ماہ باعزیزانِ وطن محشور ماند۔ آخر در ۱۱۷۹ھ نامۂ طلب ادبارِ دوم از پیشگاہ عمش عز صدور یافت۔ در ہماں ایام بانبیرۂ میر صاحب آزاد سید امیر حیدر نام عزیمتِ دکن اختیار کردو نہم رجب ۱۱۷۹ھ قدمبوس عم او

منت بر لبش گذاشت۔ ایں بار نواب والاشان فیض رساں صمصام الملک بہادر میر عبدالحئی خاں خلف الصدق نواب صمصام الدولہ شاہنواز خاں مرحوم بقدر دانی او پرداختند و بہ خطاب خانی اضافہ برنام وجاگیر مبلغ پنج ہزار روپیہ از جناب رئیس دکن اورا مسرور ساختند۔ چہار سال می شود کہ در حیدرآباد دکن اقامت ورزیدہ دوام حاضر باش خدمت نواب صاحب موصوف است۔ با محرر سطور ربط کمال دارد واکثر بجالست باہم اوقات خوش می گذرد۔"

(ص ص ۵۲ و ۵۳)

نورالعین واقف بٹالوی کے ذکر میں ان کے اور حاکم لاہوری کے ایک مشترک سفر کی تفصیلات اس طرح بیان کرتے ہیں:

"بسبب قربِ وطن میانِ شاہ عبدالحکیم حاکم و نورالعین واقف ارتباطے بود چونکہ ارادۂ زیارتِ حرمین شریفین زادہما اللہ شرفاً داشتند، ہر دو بالاتفاق ازیں جانب روانہ گشتہ بہ بیست و نہم رجب ۱۱۶۴ھ درنجستہ بنیاد آمدند و یک ہفتہ درانجا مقام پرداختہ سرے بسمتِ سورت کشیدند۔ ازانجا حاکم سواریٔ جہاز رادرست کردہ روانۂ نیلِ مقصود گردیدہ و واقف بجہتِ غلوے امراض ہمانجا سکونت ورزید تا آنکہ حاکم حصولِ سعادت کردہ باز گردید و ہر دو باتفاق از سورت برآمدہ پانزدہم جمادی الاولیٰ ۱۱۶۵ھ بنجستہ بنیاد وارد گردیدند و در تکیہ شاہ محمود فرود آمدند۔ حاکم نوزدہم شوال سنہ الیہ بفرخندہ بنیاد (حیدرآباد) شتافت و واقف ہماں جا وقفہ نمودہ تا آنکہ نوزدہم صفر ۱۱۶۶ھ حاکم باز بہ اورنگ آباد رسید۔ چناں دوم ربیع الآخر سنہ مذکور ہر دو بارادۂ ہندوستان رختِ سفر بربستند و بعدِ صعوبتِ چند بہ اوطانِ خود رسیدہ شاد کام گردیدند۔" (ص ۱۵۹)

ان اقتباسات سے مولف کے مورخانہ شعور کی پختگی کا اندازہ ہوتا ہے ساتھ ہی یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ جہاں انھوں نے اس تفصیل کے برخلاف اجمال یا اختصار سے کام لیا ہے، وہاں تساہل یا بے اعتنائی کی بجائے بالعموم

حالات کی نامساعدت اور حصولِ معلومات کی دشواریاں دخیل رہی ہیں۔ اندازِ تعارف کا فرق خاص طور پر شمالی ہند کے شعرا کے ذکر میں جن کی تعداد محض برائے نام ہے، بہت نمایاں ہے۔ دکن کے شاعروں میں سے صرف سراج اورنگ آبادی کے بارے میں ان کی فراہم کردہ معلومات تحقیق و دریافت سے پہلوتہی کی غمازی کرتی ہے۔ اپنے وطن کے اس نامور اور ممتاز فن کار کے حالاتِ زندگی کے معاملے میں ان کی اس بے اعتنائی اور مختصر بیانی کی کوئی خاص وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ اس کے علاوہ تذکرے میں چند مقامات ایسے بھی آئے ہیں جہاں انھوں نے صرف اشعار کے انتخاب پر اکتفا کیا ہے اور شاعر کے متعلق کسی قسم کی معلومات فراہم کرنے سے اپنی معذوری ظاہر کر دی ہے مثلاً

(الف) بیدار (شاہ محمدی) کے بارے میں جن کے نمونۂ کلام کے طور پر ردیف وار ترتیب کے ساتھ ڈیڑھ سو اشعار نقل کیے ہیں، لکھتے ہیں:

"معنی بابِ خوش گفتار بیدار، احوالش تفصیلاً معلوم نشدہ ظاہرا از ہند است" (ص ۲۴)

(ب) شاہ پنجھی متخلص بہ پنجھی کا منتخب کلام ایک سو دو اشعار پر مشتمل ہے لیکن تعارف کے طور پر بجز نام اور تخلص کے کچھ اور درج نہیں۔ (ص ۳۷)

(ج) کاظم کے کلام کا انتخاب بھی کافی طویل ہے۔ ان کی مختلف غزلوں سے ردیف وار ایک سو اڑسٹھ اشعار نقل کیے گئے ہیں مگر ان اشعار سے قبل حالاتِ زندگی کے بجائے صرف ایک فقرہ "اقلیمِ سخن را ناظم، صوفی شاہ کاظم" ملتا ہے۔ (ص ۱۲۹)

ان چند شاعروں کے حالات کی کمی کی وجہ سے تذکرے میں ایک قسم کی ناہمواری ضرور پیدا ہو گئی ہے لیکن جیسا کہ گذشتہ مثالوں سے واضح ہے، تمنا کے ہاں تعارف نویسی کا عام معیار بہت بلند ہے۔ وہ شعرائے اردو کے ان تذکرہ نگاروں میں سے ایک ہیں جن کی سلیقہ مندی کسی بھی صائب نظر نقاد سے خراجِ تحسین حاصل کیے بغیر نہیں رہ سکتی۔ انھوں نے تذکرہ نگاری کے فن کو اس مقام تک لے آنے کی

کوشش کی ہے جہاں اس کے اکتسابات ادب کے مورخ کے لیے ایک نعمتِ غیر مترقبہ کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔

سوانح کے علاوہ دوسرے پہلوؤں کے لحاظ سے "گل عجائب" کو کوئی خاص درجہ نہیں دیا جا سکتا۔ تمنا جن لوگوں سے قریبی واقفیت رکھتے تھے ان کے حالاتِ زندگی تو انھوں نے کافی تفصیل کے ساتھ بیان کر دیے ہیں لیکن سیرت و شخصیت اور کلام کے بارے میں اظہارِ خیال سے عام طور پر دامن بچایا ہے۔ تاہم سات آٹھ شاعروں کے ذکر میں انھوں نے جس طرح ان کے اخلاق و عادات اور مزاج و طبیعت کے متعلق اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے، اس سے یہ بخوبی ظاہر ہے کہ وہ جوہر شناسی اور تحسینِ مکارم کی صلاحیت سے محروم نہ تھے۔ درجِ ذیل مثالوں سے اس کیفیت کا اندازہ ہوگا۔

(الف) باقر علی خاں افسر

"جوانیست بغایت رنگیں و مردیست شائستۂ تحسیں۔ دنبالہ شتابِ گرم جوشیہا و پیروِ چسپاں اختلاطی ہا۔" (ص ۱۰)

(ب) سیف اللہ انور

"در عالمِ دوستی ہا آشنائے یگانہ است و در جہانِ آشنائی ہا معجزِ زمانہ۔ مردیست مودت پیشہ و جوانے محبت اندیشہ۔" (ص ۱۴)

(ج) ابو طالب خاں آشفتہ

"جوان صالح بزیورِ قابلیت پیراستہ و بجوہرِ آدمیت آراستہ۔ دانائے مدارجِ علم مجلس و پاسداری و شناسائے مقارنِ یار باشی و غم گساری۔ با فقیر یگانگت تمام می دارد و از گرم جوشی ہائے شبا روزی سرد مہری یارانِ ناسزا دفع می سازد۔ ....." (ص ۱۷)

(د) میر انور الدین دلؔ

"جوانیست سرگرمِ اختلاط، مردیست چسپاں ارتباط۔ اشفاقِ عالیش مبذولِ ایں فقیر است و در مکارمِ اخلاق ممتاز و بے نظیر....." (ص ۵۱)

(د) نصیر اورنگ آبادی

"جوانیست سرگرم اختلاط و رنگین مزاج و یار باش و مردیست چسپاں ارتباط ..... آثار خوبی از ناصیۂ او ہویدا و لمعاتِ نور از پیشانیٔ او پیدا۔ با مخلص اخلاص درستے می دارد و در پاس آشنائی ما دستے" (ص ۱۵۶)

تنقیدِ کلام کو تمنا نے سیرت و شخصیت کے جائزے سے بھی کم اہمیت دی ہے۔ چنانچہ ان کے ہاں ایسے بیانات جن سے شاعر کے سرمایۂ فکر کی قدر و قیمت کا تعین مقصود ہو، بہت کم ملتے ہیں اور جس قدر ملتے ہیں ان کا معیار بھی کچھ زیادہ بلند نہیں۔ مثال کے طور پر مندرجہ ذیل اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

(الف) نقد علی خاں ایجاد

"غزل فارسیش چوں زلفِ خوباں مسلسل و مضامینِ تازہ ہایش از رُخسارۂ محوباں بدل۔ ریختہ اگرچہ زبانش نیست، فاما بزورِ طبیعتِ دقیقہ شناس بحُسنِ کیفیت سرانجام می دہد" (ص ۴)

(ب) افسر

"غزل فارسی را بہ بہترین آئین سرانجام می دہد و ریختۂ ہندی را بخوش ترین مضامین می گوید۔ گفتگویش بطرزِ اہلِ ہند مانوس است" (ص ۱۰)

(ج) سراج اورنگ آبادی

"فکر عالی و طبع رسا می داشت و در معنی تلاشی علمِ استادی می افراشت"

(ص ۶۰)

ان تاثرات کو تنقید کے دائرے سے خارج تو نہیں کہا جا سکتا لیکن ان میں کوئی ایسی خوبی بھی نہیں جسے مولف کے اندازِ نظر کی انفرادیت یا فن کے محاسن و معائب کے عالمانہ تجزیے سے تعبیر کیا جا سکے۔ اس کے علاوہ پورے تذکرے میں اس قسم کے اظہارِ تاثر کی بمشکل دو تین مثالیں ہی اور ملیں گی۔ اس لیے تنقیدِ فن کے نقطۂ نظر سے "گلِ عجائب" شعرائے اردو کے تذکروں میں کسی اہمیت کا مستحق

نظر نہیں آتا۔

سیرت و شخصیت اور کلام کے بارے میں تنقیدی مواد کی کمی کے باوجود "گل عجائب" کے تاریخی و سوانحی پہلو کی اہمیت اسے ممتاز تذکروں کی فہرست میں شامل کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ اس تذکرے سے دکنی شاعروں کے حالاتِ زندگی کے بہت سے گوشے ہمارے سامنے آئے ہیں اور ایسے واقعات و حقائق تک ہماری رسائی ہوتی ہے جن سے تاریخِ ادب کی ترتیب میں کافی مدد مل سکتی ہے۔

گلزار ابراہیم

گلزار ابراہیم ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانۂ عروج کی مشہور و معروف تاریخی و ادبی شخصیت علی ابراہیم خاں خلیلؔ (متوفی ۲۳ محرم ۱۲۰۸ھ/۳۱ اگست ۱۷۹۳ء) کی تالیف ہے۔ اس تذکرے کے متعدد قلمی نسخے ہند و بیرونِ ہند کے مختلف کتب خانوں میں محفوظ ہیں جن میں تعداد کے معمولی اختلاف کے ساتھ مجموعی طور پر تین سو چھبیس[۳۲۶] شاعروں کے حالات و اشعار ملتے ہیں۔ مطبوعہ صورت میں یہ تذکرہ پہلی بار ۱۹۳۶ء میں "گلشن ہند" مرتبہ ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ کے ساتھ شائع ہو کر سامنے آیا۔ لیکن یہ اشاعت صرف ان شاعروں کے تراجم پر مشتمل تھی جن کے حالات گلشنِ ہند میں شامل نہیں۔ اس کے بعد پروفیسر کلیم الدین احمد نے ۱۹۷۴ء میں اسے دائرۂ ادب، پٹنہ کے ترجمان مجلّہ "معاصر" کے دو شماروں میں شائع کر کے اس کی مکمل صورت میں علمی دنیا سے متعارف کرایا۔ یہ دوسری اشاعت پٹنہ یونیورسٹی لائبریری کے دو قلمی نسخوں کو "پیشِ نظر رکھ کر اور گلشنِ ہند سے مقابلہ کر کے" مرتب کی گئی ہے۔ ہم نے پٹنہ یونیورسٹی لائبریری کے ان دونوں نسخوں کے علاوہ کتب خانۂ خدا بخش پٹنہ کے دو اور رضا لائبریری رام پور کے ایک قلمی نسخے سے استفادے کے باوجود آئندہ سطور میں حوالے کے لیے اس دوسری اشاعت ہی کو پیشِ نظر رکھا ہے۔

مرزا علی لطفؔ مترجم گلزارِ ابراہیم کی تحریر کے مطابق اس تذکرے کی ترتیب پر بارہ سال کی مدّت صرف ہوئی ہے، لیکن علی ابراہیم نے اس سلسلے میں کسی وضاحت سے کام نہ لیتے ہوئے دیباچے میں صرف اتنا ہی لکھا ہے کہ "بسالِ یک ہزار و ہفت صد

وہشتاد وچہار عیسوی ویک ہزار ویک صد ونود وہشت ہجری از تسوید آں فراغ حاصل شد" (ص ۳) البتہ مختلف اندراجات وبیانات کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ لطف کا یہ بیان یکسر بے بنیاد وبے حقیقت نہیں۔ سطور ذیل میں کچھ اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں جن سے اس طویل زمانۂ ترتیب کے تعین میں مدد ملتی ہے۔ ملاحظہ ہوں:

محمد عابد دلؔ عظیم آبادی :۔ "ہنگام تالیفِ ایں مجموعہ مشارٌ الیہ خلاصۂ دیوانِ خود را در مرشد آباد (در) ۱۱۹۳ھ فرستادند" (ص ۱۶۲)

فضل علی دانا :۔ "الحال کہ سنہ یک ہزار ویک صد ونود وچہار ہجری باشد ..... در بنگالہ بسر می برد" (ص ۱۵۳)

اصالت خاں ثابتؔ :۔ "در نیولا کہ ۱۱۹۵ھ ہجریہ باشد باستصواب مرزا محمد علی فدویؔ تخلص فکرِ اشعار می نماید" (ص ۶۰)

میر قدرت اللہ رخصتؔ :۔ "الحال کہ ۱۱۹۶ھ یک ہزار ویک صد ونود وشش ہجریست در لکھنوی می گذراند" (ص ۱۷۵)

قلندر بخش جراتؔ :۔ "دریں ولا کہ ۱۱۹۷ھ ہجریست، مشارٌ الیہ در لکھنؤ و فیض آباد می گذراند" (ص ۶۲)

شاہ عالم آفتابؔ :۔ "تا حال کہ ۱۱۹۸ھ یک ہزار ویک صد ونود وہشت ہجری است، زینت آرائے سریرِ سلطنت اند" (ص ۴)

رام جس مغمومؔ :۔ "در سنہ یک ہزار ویک صد ونود ونہ ہجری بارا قمِ آثم در بنارس ملاقی شد" (ص ۴۳۱)

ان بیانات کی روشنی میں یہ اندازہ کرنا دشوار نہیں کہ علی ابراہیم کم سے کم ۱۱۹۳ھ/ ۱۷۷۹ء سے ۱۱۹۹ھ/ ۱۷۸۵ء تک پورے انہماک اور تسلسل کے ساتھ اس کام میں مصروف رہے ہیں۔ ۱۱۹۹ھ/ ۱۷۸۵ء کا حوالہ مخطوطۂ رام پور اور طبعِ اول میں مغمومؔ کے علاوہ خلیقؔ دہلوی کے حال میں بھی ملتا ہے جن سے مولف کے دوستانہ روابط تھے۔ اس کے علاوہ مرزا جواں بخت جہاندار شاہ جہاندار کے متعلق درج ذیل بیان بھی اس سلسلے

میں مزید تحقیق و تلاش کے مواقع فراہم کرتا ہے۔ لکھتے ہیں:

"ہنگامے کہ از ناموافقتِ امرائے دولت لوائے رفعتش از دارالخلافۂ دہلی بحرکت آمدہ در ۱۱۹۸ھ یک ہزار و یک صد و نود و ہشت ہجری زینت بخشِ لکھنؤ گردید ایں خاکسار باستصوابِ نواب عمادالدولہ امیرالممالک گورنر جنرل وارن ہشٹن جلادت جنگ بہادر شرف ملازمت حاصل نمود و در اواخرِ سالِ مذکور کہ آں جناب ظلِ حمایت بر ساکنانِ بلدۂ بنارس ارزانی داشت، راقم آثم کہ بہ حکومت بلدۂ مذکور مامور بود بسا اوقات بشرفِ تقبیلِ سدۂ علیا مشرف می شد و موردِ تفقد و الطاف و افضال و اعطافِ بے اندازہ می گردید۔" (ص ص ۶۱ و ۶۲)

جیسا کہ اس عبارت سے مترشح ہوتا ہے، اس کی تحریر کے وقت بیان کردہ واقعات کو گذرے ہوئے کافی دن بیت چکے تھے اور مولف بلدۂ بنارس سے جہاں ۱۱۹۹ھ تک ان کے قیام کا پتا چلتا ہے، کسی اور جگہ منتقل ہو چکے تھے۔ اس درمیانی عرصہ کو اگر دو یا تین سال کی کم سے کم مدت تک بھی محدود رکھا جائے تو یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ خلیل تقریباً ۱۲۰۱ھ/ ۱۷۸۷ء تک برابر اضافے کرتے رہے ہیں اور اس طرح بارہ سال میں اتمام کے متعلق لطف کا بیان بڑی حد تک پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتا ہے۔

"گلزارِ ابراہیم" کی تکمیل سے قبل شعرائے اردو کے جو تذکرے منظرِ عام پر آ چکے تھے، گمانِ غالب یہ ہے کہ بارہ سال کے اس طویل عرصے میں اور اس سے پہلے ان میں سے بیشتر خلیل کی نظر سے گذر چکے ہوں گے اور انھوں نے حسبِ ضرورت ان کے مواد سے استفادہ بھی کیا ہوگا۔ اگرچہ انھوں نے بذاتِ خود اس اکتسابِ فیض کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا ہے لیکن بعض اہم اور مشہور تذکروں کے اندراجات سے ان کے بیانات کی لفظی و معنوی مماثلت ہمارے اس قیاس کو تقویت بخشتی ہے۔ بطورِ ذیل میں صرف میر حسن کے "تذکرۂ شعرائے اردو" کو سامنے رکھ کر اس قسم کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔ ملاحظہ ہوں:

احمد گجراتی

"در زبانِ سنسکرت وبھاکا می گوید کہ تصانیف بسیار دارد چوں معاصرِ شاہ ولی اللہ ولی بود، دو سہ ریختہ نیز گفتہ احمد بتا میں کیا کروں اب راہِ عشق میں سر پہ تو سانجھ پڑ گئی اور پاؤں تھک گئے (طبع ثانی ص ۴)

"معاصرِ ولی دکھنی۔ مہارت بزبانِ سنسکرت وبھاکا داشت و گاہے ریختہ نیز می گفت، از وست احمد بتا میں کیا کروں اب راہِ عشق میں سر پہ تو سانجھ پڑ گئی اور پاؤں تھک گئے (ص ۸)

سکندر مرثیہ گو

"میاں سکندر عرف گھسیا۔ از مرثیہ گویانِ متاخرین است۔ اکثر در زبان پوربی و پنجابی و بنگالی و مارواڑی مرثیہ گفتہ و در قصہ خوانی و عرق کشی نیز ماہر است۔ یک قصۂ ملاح و ماہی و بادشاہِ دل خوار بسیار بہ آب و تاب منظوم نمودہ است۔ اگرچہ علم ندارد ولیکن بر کلام او جاے انگشت نیست۔ از شاگردانِ محمد شاکر ناجی است۔"

(طبع ثانی، ص ۹۳)

"مشہور بخلیفہ سکندر در مرثیہ گفتن کمالِ اقتدار و سلیقۂ درستے دارد۔ اکثر در زبانِ پوربی و مارواڑی و پنجابی مرثیہ گفتہ و قصۂ ملاح و ماہی و بادشاہِ دل خوار منظوم ساختہ۔ اگرچہ استعدادِ علمی ندارد، اما مرثیۂ او مقبولِ خواص و عوام است و در قصہ خوانی و عرق کشی واقف و خود را از شاگردانِ ناجی می شمارد۔"

(ص ص ۳۰۰ و ۳۰۱)

فدوی لاہوری

"مردے بود بر خود غلط برائے مباحثہ و مجادلہ بفرخ آباد پیشِ میرزا محمد رفیع سلمہ اللہ آمد، ہنگامہ برپا نمودہ۔

"مردے بود۔ بر خود غلط برائے مباحثہ از مرزا محمد رفیع سودا بفرخ آباد آمدہ و ذلت کشیدہ بوطنِ خود

بعد از ذلّتِ بسیار بوطنِ خود برگشت۔ یوسف زلیخا بزبانِ ریختہ گفتہ ..... میر فتح علی شیدا ہجو او خوب کردہ است۔ قصۂ بقال و بوم حسبِ حال درج نمودہ است۔" (طبع ثانی ص ۱۲۰)	برگشت۔ یوسف زلیخا بزبانِ ریختہ گفتہ و میر فتح علی شیدا در ہجو او قصۂ بوم و بقال ضبط نمودہ۔" ..... (ص ۳۵۱)

دو مختلف کتابوں سے ماخوذ عبارات میں مواد، پیرایۂ بیان اور الفاظ کی اس مماثلت و مطابقت کو محض اتفاق یا توارد سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا اور خصوصاً ایسی صورت میں جب کہ اس قسم کی مثالیں خاصی تعداد میں موجود ہوں۔ ہر چند کہ اخذ و اکتساب کی یہ روش تذکرہ نگاری کی تاریخ میں ایک مستقل روایت کی حیثیت رکھتی ہے اور اسے مذموم قرار دینا مناسب نہیں تاہم یہ بات ضرور قابلِ مواخذہ ہے کہ خلیل نے اپنے پیش رو تذکرہ نگاروں کے ان بالواسطہ احسانات کا اعتراف نہیں کیا۔

معاصر تذکروں کے علاوہ خلیل نے مواد کی فراہمی میں حسب موقع دوسرے ذرائع و وسائل سے بھی کام لیا ہے۔ ان کا حلقۂ احباب و تعلقات کافی وسیع تھا۔ مرشد آباد، عظیم آباد، بنارس، لکھنؤ اور الہ آباد کے اکثر شاعروں سے جن کا اس تذکرے میں ذکر کیا گیا ہے، ان کے دوستانہ مراسم تھے۔ کچھ لوگ سرکاری ملازمین کی حیثیت سے ان کی ماتحتی میں کام کر چکے تھے یا کر رہے تھے، اور کچھ لوگوں کے مقدمات بہ غرضِ تصفیہ ان کی عدالت میں آ چکے تھے۔ ایسے شاعروں کے حالات میں انھوں نے اس ربطِ رسمی کی بھی وضاحت کر دی ہے مثلاً

میر مظفر علی آزاد :۔ "راقم حقیر میر مذکور را در مرشد آباد دیدہ۔ در ہنگامے کہ بر نزاکت نام کنیزے عاشق و منازعہ با پنّا بیگم داشت، معاملہ او مرجوع بہ احقر بود۔" (ص ۹)

میر اولیا :۔ "از مدتے در مرشد آباد اقامت ورزیدہ بار اقم فقیر آشنا ست۔" (ص ۲۲)

غلام یحییٰ حضور :۔ "از احبابِ مولف حقیر است۔ ہنگام تدوینِ ایں تذکرہ منتخبِ کلامِ خود را دادہ کہ دریں صحیفہ انضمام یابد۔" (ص ۹۵)

خلیق دہلوی :۔ "در سرکارِ نظامتِ بنگالہ منسلک و با راقم آشناست۔" (ص ۱۲۴)

خادم عظیم آبادی :۔ "از منصب داران و عم زادگانِ مولفِ اوراق است۔" (ص ۱۲۵)

غلام محمد دوست بہاری :۔ "با راقمِ حقیر در مرشد آباد ملاقات کردہ ..... از اشعارِ خود قریب صد بیت وا نمود۔" (ص ۱۶۱)

شہید غازی پوری :۔ "در زمرۂ افاضلِ عالی مقدار کہ در بنارس با ایں خاکسار در عدالت مامورند، اشتغال دارد۔" (ص ۳۰۷)

میر علی نقی کافر :۔ "مولفِ اوراق مکرر اورا در مرشد آباد دیدہ و اشعارش شنیدہ است۔" (ص ۳۷۰)

جو لوگ خلیق کے وطن اور مستقر سے دور کسی اور شہر کے باشندے تھے یا جن سے کبھی ملاقات کا اتفاق نہیں ہوا تھا، ان کا کلام حاصل کرنے کے لیے جو طریقہ اپنایا گیا ہے، اس کی چند مثالیں درج ذیل ہیں :

خواجہ برہان الدین آشمی :۔ "چند بیت از میر حاجی خلف خواجہ مذکور بدست آمدہ۔"

مرزا کاظم علی جوان :۔ "اشعارِ ایشان از لکھنؤ بہ بنارس طلبیدہ تحریر پذیرفت۔" (ص ۵)

میر حسن :۔ "ابیاتِ خود را از لکھنؤ در بنارس براقمِ آثم فرستادہ۔" (ص ۱۰۱)

بھکاری داس عزیز :۔ "احوال و پارۂ اشعارِ خود را از الہ آباد بایں خاکسار فرستادہ۔" (ص ۳۲۷)

قناعت لاہوری :۔ "مشارالیہ در لکھنؤ می گذراند۔ ایں ابیات از آنجا طلبیدہ تحریر نمودہ شد۔" (ص ۳۵۹)

ان بیانات سے اندازہ ہوتا ہے کہ خلیق نے تذکرے کی ترتیب کا کام بڑی سنجیدگی اور تندہی کے ساتھ انجام دیا ہے لیکن یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ ان کی توجہ احوال کی بہ نسبت اشعار کی فراہمی پر زیادہ مبذول رہی ہے، جس کے نتیجے میں سوا تین سو

شاعروں میں سے بہت سے شعرا کے حالات روایتی قسم کے چند تعارفی جملوں سے آگے نہیں بڑھ سکے ہیں، حتیٰ کہ بعض جگہ "تاحینِ تحریر ایں اوراق احوالش معلوم نشد" یا "تا تحریرِ اوراق معلوم نشد کہ کیست و کجائیست"، جیسی معذرتیں میرؔ اور قائمؔ وغیرہ کے تذکروں کی یاد تازہ کر دیتی ہیں۔ اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ انھوں نے غیر ضروری عبارت آرائی اور انشا پردازی کے سہارے اپنے نقصِ معلومات پر پردہ ڈالنے کے مقابلے میں اختصار اور اظہارِ لاعلمی کو ترجیح دی ہے۔ ان کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ ان کی زبان تمام ظاہری و معنوی نقائص سے پاک ہے اور کہیں ایسی فضا پیدا نہیں ہونے پائی ہے جو زیرِ تبصرہ شاعر کی شخصیت کی بجائے تذکرہ نگار کے زورِ قلم اور قدرتِ بیان کی آئینہ دار ہو۔ اس وصفِ خاص کی بنا پر مختصر نویسی کی مثالوں کو نظر انداز کرتے ہوئے تذکرے کے نسبتاً طویل اور تفصیلی اندراجات سے کچھ اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں جن کے مطالعے سے مولف کے عام طرزِ تعارف کا اندازہ ہوگا۔ ملاحظہ ہوں:

احمدیؔ:۔ "اسمش شیخ وارث و موطنش قصبۂ زانیہ و نسبِ آبایش بہ حضرت قاضی شمس الدین ہروی کہ از خلفائے سلطان السالکین شاہ شرف الدین بہاری بود، می پیوندد۔ اما مشارٌ الیہ از اسلافِ خود بہ شیوۂ مال گزاریٔ پرگنۂ زانیہ و رسالہ داری اتصاف داشت۔ از تربیت یافتگانِ نواب فضل علی خاں غازی پوری است۔" (ص ۲۳)

انتظارؔ دہلوی:۔ "اسمش علی نقی خاں خلفِ علی اکبر خاں مرحوم مینگباشی است۔ در زمانِ امیر با فرہنگ نواب علی وردی خاں مہابت جنگ واردِ مرشد آباد شدہ دراں بلدہ سکنیٰ اختیار نمودہ باحکامِ آنجا بکامِ دل می گذراند۔ جوان فہمیدہ و خوش تقریر و بارا قم حقیر آشناست طبعش در ریختہ سلیقۂ نیکو آمیختہ است۔" (ص ۲۴)

حیدرؔ دکھنی:۔ "اسمش میر حیدر (علی) شاہ۔ در شمشیر زنی ہنر ور و بانکہ و زبان آور

بود، اما دلاور نبود۔ در حکومتِ نواب شجاع الدین محمد خاں شجاع الدولہ مرحوم از دہلی واردِ بنگالہ شدہ با نواب علاؤالدولہ سرفراز خاں خلفِ نواب مذکور بسر می برد و اشعار بطورِ قدما می گفت و بطرزِ خاص کہ موجب تماشائے مردم بود، اشعار می خواند۔ تمام دیوانِ ولی دکھنی را مخمس کردہ و غزلیاتِ دیوان حافظ را تضمین نمودہ۔ اما جھولنا را نیکو می گفت۔ عمرش قریب بصد سال رسیدہ۔ در عہدِ احمد شاہ ابن محمد شاہ فردوس آرام گاہ در صوبۂ بنگالہ ارتحال نمود۔"

(ص ۸۸)

رند دہلوی :۔ "اسمش شاہ حمزہ علی جوانِ خوش روے بود۔ مدتے با علی نقی خاں انتظار تخلص و محمد تقی خاں پسرانِ علی اکبر خاں مینگباشی مرحوم در زمرۂ سپاہیان معاش کردہ بچندیں لباس برآمدہ آخر بہ جذبۂ باطن ترکِ علائقِ ظاہر نمودہ در مرشد آباد سر و پا برہنہ با لنگ و گلیم می گشت و در مجمع و معرکہ حاضر شدہ بر زمین یا صفِ پائیں می نشست و اشعار می خواند و زار زار می گریست۔ راقم آثم را کہ بر اں آزادہ حال نظر افتادہ۔ خالی از حالتے و استقامتے نبود۔ الحال کہ سال یک ہزار و یک صد و نود و چہار ہجری است، شنیدہ شدہ بغایتِ وارستگی در عظیم آباد بروضۂ شاہ ارزانی و بمکان درویشانِ دیگر بلا تعین زندگانی می کند۔" (ص ۱۶۸)

"جعفر علی خاں ابن مرزا مومن بیگ بہ منصب سہ ہزاری در منصب داران محمد شاہ مرحوم سرفراز بود و در مقربانِ نواب عمدۃ الملک امیر خاں مرحوم امتیاز داشت۔ گویند بر راجہ رام سوائی عاشق بود۔ آخرِ حال بعدِ انتقالِ نواب امیر خاں مرحوم بناکامی گذرانیدہ ازیں جہاں گذشت۔" (ص ۱۷۷)

موزوں عظیم آبادی :" مشہور و موسوم بہ مہاراجہ رام نرائن۔ از جانبِ حکام بنگالہ نائب صوبہ عظیم آباد بود و نسبتِ شاگردی بجناب شیخ محمد علی حزیں داشت۔ اشعارِ فارسی می گفت و نثر رارنگین می نوشت۔ بہ عہدِ دولتِ نواب عالی جاہ میر محمد قاسم خاں مرحوم مورد تقصیر شدہ معزول و در گنگا مغروق گردید۔ گاہے ریختہ می گفت۔" (ص ۴۰۴)

یہ تعارف نامکمل اور تشنہ سہی تاہم ان کے واسطے سے بہت سی ایسی باتیں معلوم ہو جاتی ہیں جن کے ذکر سے دوسرے تذکرے خالی ہیں۔ خلیل نے جن شاعروں پر خصوصی توجہ صرف کی ہے، ان کے بارے میں بالعموم اسی قسم کی معلومات فراہم کی ہیں۔ ولدیت، وطن، جائے سکونت اور سلسلۂ معاش وغیرہ سے متعلق ان کی صراحتیں اس ضمن میں خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ علاوہ بریں اکثر و بیشتر شعرا کے ذکر میں تذکرے میں ان کے حالات کی شمولیت کا زمانہ اور دوسرے اہم واقعات کے سنین متعین کر کے انھوں نے ایک ایسا قابلِ تحسین کارنامہ انجام دیا ہے جس سے تاریخِ ادب کے طالب علموں اور وادیٔ تحقیق کے رہ نوردوں کو اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے میں مدد بھی ملتی ہے اور حوصلہ بھی۔ اگرچہ اس سلسلے میں ڈاکٹر زور کا یہ ارشاد کہ "علی ابراہیم اردو کے واحد تذکرہ نویس ہیں جنھوں نے شاعروں کے حالات اور ان کے متعلق تاریخیں جمع کرنے کی حتی الامکان کوششیں کیں" (مقدمہ ص ۳۳) اس بنا پر ناقابلِ قبول ہے کہ "گلزار ابراہیم" کی تالیف سے قبل شفیق اورنگ آبادی، شورش عظیم آبادی اور امراللہ الہ آبادی اپنے تذکروں کے ذریعے اس حسنِ التزام کی روایت قائم کر چکے تھے۔ تاہم علی ابراہیم کی مساعیٔ جمیلہ کا اعتراف ناگزیر ہے، چنانچہ اس خصوصیت کی نمایندگی کے لیے تذکرے کے مختلف اوراق سے کچھ مثالیں سپردِ قلم کی جاتی ہیں:

میر امانی :" شبے در عینِ تعزیہ ۱۱۸۷ھ ہجریہ بے ہوش گشتہ بروضۂ رضوان خرامید۔" (ص ۱۹)

میر ضاحک دہلوی :" الحال کہ سالِ ہزار و صد و نود و شش (۱۱۹۶) ہجری باشد، شنیدہ (شد) در فیض آباد بوارستگی می گذراند۔" (ص ۳۱۵)

اشرف علی خاں فغاں :۔ "در ۱۱۸۶ھ یک ہزار و یک صد و ہشتاد و شش ہجری رحلت نمودہ در عظیم آباد مدفون شد۔" (ص ۳۳۰)

فیضؔ، فرزند میرؔ :۔ "بہ سال یک ہزار و یک صد و نود و شش ہجری اشعارش در بلدۂ بنارس از لکھنؤ طلبیدہ تحریر شد۔" (ص ۳۵۱)

قائمؔ چاندپوری :۔ "الحال کہ سال یک ہزار و یک صد نود و چہار ہجریست، در ناحیہ موطن خویش بسر می بود۔" (ص ۳۵۳)

میر تقی میرؔ :۔ "ہنگام تحریر کہ سنہ یک ہزار و یک صد و نود و شش ہجریست، شنیدہ شد کہ در شاہجہان آباد بسلامت اقامت دارد۔" (ص ۴۰۲)

معینؔ بدایونی :۔ "الحال کہ سال یک ہزار و یک صد و نود و شش ہجریست، شنیدہ شد در لکھنؤ بسر می برد۔" (ص ۴۲۵)

میر قمر الدین منتؔ :۔ "الحال کہ سال یک ہزار و یک صد و نود و شش ہجریست، با ممتاز الدولہ مسٹر جانسن بہادر بسر می برد۔" (ص ۴۲۸)

یہ بیانات بظاہر سرسری معلوم ہوتے ہیں لیکن بعض دفعہ جب ایسے ہی کسی بیان کے سہارے ہمیں کسی خاص نتیجے تک پہنچنے میں کامیابی حاصل ہوتی ہے تو ان کی جامعیت و معنویت کا اندازہ ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ۱۱۹۶ھ (۱۷۸۲ء) میں میرؔ کے دہلی میں قیام اور فیضؔ کے اشعار لکھنؤ سے طلب کرنے کے بارے میں مندرجہ بالا اطلاعات سے یہ پتا چلتا ہے کہ فیضؔ اپنے والد (میرؔ صاحب) سے پہلے لکھنؤ پہنچ چکے تھے۔ اس دریافت کے بعد ۱۱۹۷ھ (۱۷۸۳ء) میں میرؔ صاحب کے لکھنؤ پہنچ کر سرائے میں ٹھہرنے کے متعلق آبِ حیات کی روایت محلِ نظر قرار پاتی ہے۔ خصوصاً ایسی صورت میں جب کہ باہمی تعلقات میں خرابی کا کوئی ثبوت موجود نہیں، باپ کا اجنبی شہر میں بیٹے کے گھر کی بجائے کسی دوسری جگہ قیام کرنا تقاضائے فطرت کے خلاف ہے۔ اسی طرح میر غلام حسین ضاحکؔ کے متعلق جن کے صحیح سنین ولادت و وفات اب تک معلوم نہیں ہو سکے ہیں، یہ اطلاع کہ ۱۱۹۶ھ (۱۷۸۲ء) میں بمقام

فیض آباد آزادانہ زندگی بسر کر رہے تھے، اس سال تک ان کے بقیدِ حیات ہونے کا ثبوت فراہم کرتی ہے اور ان کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے میر حسن کی قیام گاہ پر تعزیت کی غرض سے سودا (متوفی ۱۱۹۵ھ/۱۷۸۱ء) کی حاضری اور دوسرے واقعات کے بارے میں شمس العلماء آزاد کے بیانات کی تردید کرتی ہے۔

خلیل جس زمانے میں گلزار ابراہیم کی ترتیب میں مصروف تھے، اس وقت تمام ملک خصوصاً شمالی ہندوستان میں ہر طرف اضطراب و انتشار کا دور دورہ تھا۔ احمد شاہ ابدالی کے پے در پے حملوں نے دہلی اور اس کے گرد و نواح میں اقتصادی زبوحالی اور سیاسی و سماجی بے اطمینانی کی ایک عام فضا پیدا کر کے اربابِ کمال کے لیے عرصۂ حیات تنگ کر دیا تھا چنانچہ اہلِ علم اور اہلِ ہنر منتخبانِ روزگار کے اس ملجا و مامن سے برسوں پرانے روابط توڑ کر نئی پناہ گاہوں کی تلاش میں مصروف و سرگرداں تھے۔ خلیل نے کہیں کہیں ترکِ وطن اور غربت نصیبی کے ان واقعات کی طرف بھی اشارے کیے ہیں مثلاً

صاحب میر الم: "الحال کہ ۱۱۹۴ھ یک ہزار و یک صد و نود و چہار ہجریست وارد مرشد آباد شدہ از دوستیٔ راجہ دولت رام قیام دارد۔" (ص ۶۱ الف)

اشرف علی خاں فغاں: "از دہلی پیش عمِ خویش موسوم بہ محمد ایرج خاں واردِ مرشد آباد شدہ باز بہ دہلی رفت و بعدِ چند سال مراجعت کردہ در عظیم آباد برفاقت مہاراجہ شتاب رائے اقامت ورزید۔ مشارٌ الیہ کوکۂ احمد شاہ بادشاہ بود۔" (ص ۳۳۰)

غلام علی حیدر دہلوی: "بہ سببِ برہمیٔ اطوارِ روزگار ترک وطن قدیم ساختہ (طرح) اقامت در عظیم آباد انداختہ۔" (ص ۹۰)

میر شاہ علی خاں دہلوی: "پریشان حال واردِ مرشد آباد گشتہ با حصولِ مراد مدتے بشادمانی گذراند و بعدِ انقراضِ دولت نواب سراج الدولہ آوارہ از مرشد آباد شدہ بسمتِ لکھنؤ افتاد و بعہد دولتِ نواب

عالی جاہ میر محمد قاسم خاں بعظیم آباد آمدہ در زمرۂ ملازمانِ نواب مذکور انسلاک یافت و از انجا بدکھن رفتہ۔" (ص ۳۰۲)

حسن رضا نجاتؔ دہلوی:۔ "بعدِ ویرانیِ شاہجہان آباد کہ بر دست احمد شاہ درانی اتفاق افتادہ، واردِ عظیم آباد گردید۔" (ص ۴۴۳)

حالاتِ زندگی کے ضمن میں اگرچہ خلیلؔ نے سیرت و شخصیت کے متعلق بہت کم اظہارِ خیال کیا ہے پھر بھی بعض جگہ ان کے قلم سے ایسے جملے نکل گئے ہیں جن کی روشنی میں زیرِ بحث شعرا کے اخلاق و عادات، لیاقت و صلاحیت اور طبعی رجحانات و میلانات کے بارے میں ایک رائے قائم کی جا سکتی ہے۔ اس قسم کے جملوں میں ذاتی تجربات و مشاہدات کی بنیاد پر رائے زنی، افراط و تفریط سے احتراز اور صداقت و صاف گوئی کی جھلک نمایاں ہے۔ چند مثالیں درج ذیل ہیں:

احسن اللہ احسنؔ :۔ "بوارستگی و حسن پرستی اتصاف داشت۔" (ص ۱۱)

میر اثرؔ دہلوی :۔ "دانائے علم تصوف و ماہرِ فنِ شعر است۔ بر و تیرۂ اسلاف فقر و انزوا اختیار کردہ از برادرِ خویش اکتسابِ کمال می نماید۔" (ص ۱۴)

میر ضاحکؔ :۔ "در ہزالی و بذلہ گوئی اقتدار و در فہم موسیقی مناسبتے دارد۔" (ص ۲۱۵)

عزلتؔ سورتی :۔ "با وصفِ فضیلت اطوار و اقوالش خالی از سبکی و ہزالی نبود۔" (ص ۳۲۰)

نواب اسد اللہ غالبؔ دہلوی:۔ "در فتوت و مروت یگانۂ آفاق و در اخلاق و استقامتِ حال ممتازِ عصر اند۔" (ص ۳۲۹)

قدرؔ دہلوی :۔ "از دامِ ننگ و نام رستہ دل بہ اوباشی و بے قدری بستہ بود۔" (ص ۳۵۸)

مرزا مظہرؔ جانجاناں :۔ "در حسنِ بیان و اندازِ گفتگو نادرۂ زمانِ خود بود ..... در قناعت و استقامتِ طبع و مہارتِ علمِ فقہ شہرت و بحسن پرستی رغبت داشت۔" (ص ۴۰۳)

میر قمرالدین منت :۔ "طبعش مائل بعشق افتادہ۔ رغبتے وافر بحسن صوت و حسن صورت دارد۔" (ص ۴۲۹)

جن لوگوں کے سرمایۂ کلام میں غزل کے علاوہ کسی دوسری صنفِ سخن کو نسبتاً نمایاں حیثیت حاصل تھی، ان کے حالات میں خلیلؔ نے اس کے تذکرے کو خاص اہمیت دی ہے۔ اس سلسلے میں ان کے بیانات ایک طرف تو مختلف اصناف کی ارتقائی تاریخ قلمبند کرنے میں مفید و مددگار ثابت ہو سکتے ہیں اور دوسری جانب ڈاکٹر زورؔ کے الفاظ میں ان کے مطالعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ "۱۲۰۰ھ (۱۷۸۶ء) سے قبل شمال میں اردو شاعری کہاں تک ترقی حاصل کر چکی تھی۔ اس میں کون کون سی اصنافِ شاعری کس حد تک رائج تھیں اور شاعروں کا خزانہ کہاں تک وسیع ہو گیا تھا۔" (مقدمہ ص ۳۹) زیادہ تفصیل میں نہ جاتے ہوئے یہاں صرف چند مرثیہ گو شاعروں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

آشمیؔ دہلوی :۔ "از مشاہیر مرثیہ گویانِ دہلی است۔" (ص ۱۰)

اسد یار خاں انسانؔ :۔ "بیشتر بہ مرثیہ گفتن رغبت داشت۔" (ص ۱۱)

میر محمد علی صبرؔ فیض آبادی :۔ "بیشتر مرثیہ می گوید۔" (ص ۳۱۰)

علی قلی ندیمؔ دہلوی :۔ "مرثیہ سید الشہدا علیہ السلام اکثر می گفت۔" (ص ۴۴۱)

حسن رضا نجاتؔ دہلوی :۔ "مرثیہ سید الشہدا علیہ السلام بیشتر و دیگر اقسام نظم را کمتر می گوید۔ بدیں جہت فکرش مرتبۂ تمامی حاصل نہ کردہ۔"

(ص ۴۴۴)

مرزا اسحاق وصلؔ لکھنوی :۔ "اکثر مرثیہ می گوید و گاہے بغزل ریختہ می پردازد۔" (ص ۴۵۵)

میر محمد اعظم ہوؔیدا دہلوی :۔ "اکثر مرثیۂ امام حسین علیہ السلام می گوید و بسببِ نومشقی کمتر فکرِ ریختہ می کند۔" (ص ۴۶۲)

نجاتؔ اور ہوؔیدا کے بارے میں مندرجۂ بالا بیانات سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت تک مرثیہ گوئی ایک باقاعدہ صنفِ سخن کی حیثیت سے اردو میں کوئی امتیازی مقام حاصل نہیں کر پائی تھی، بلکہ اس صنف میں طبع آزمائی کو خام کاری اور عجزِ طبیعت

کی دلیل سمجھا جاتا تھا اور قبولِ عام کی سند حاصل کرنے کے لیے غزل اور دوسری فکر آزما اصنافِ سخن میں مظاہرۂ کمال ضروری خیال کیا جاتا تھا۔ یہی وہ تصور تھا جس کی بنا پر مرثیہ نگار بگڑے ہوئے شاعروں کے زمرے میں شمار کیے جاتے تھے اور جس نے مولف کو مرثیے کے اشعار شاملِ انتخاب کرنے سے باز رکھا۔ جب کہ غزلیات کے ساتھ رباعیات اور قصاید کے اقتباسات انھوں نے بکثرت نقل کیے ہیں۔

اب تک "گلزارِ ابراہیم" کے جن پہلوؤں سے بحث کی گئی ہے، ان کی روشنی میں خلیلؔ ایک ایسے تذکرہ نگار کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتے ہیں جو اپنے زمانے اور ماحول کے مطابق اپنی ذمہ داریوں کی تکمیل میں پوری طرح سرگرم رہے ہیں اور جنھوں نے اپنے مقصد میں بڑی حد تک کامیابی بھی حاصل کی ہے۔ اس کے برخلاف تنقیدِ شعر کے باب میں ان کی کوششیں نسبتاً محدود اور مایوس کن ہیں۔ یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ وہ دیدہ وری و ژرف نگاہی کے ان اوصاف سے محروم تھے جو ایک ناقد کے لیے بدرجۂ اولیٰ درکار ہیں یا انھیں معاصرین و متقدمین کے کلام پر حسبِ ضرورت عبور حاصل نہ تھا البتہ یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ انھوں نے اپنی صلاحیتوں کے استعمال میں بخل سے کام لیا ہے۔ یہ بخل ایجاز و اختصار کی اس فضا سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ جو تذکرے کے ایک بڑے حصے پر محیط ہے۔ عام صورتِ حال کی اس وضاحت کے بعد خلیلؔ کے بعض ایسے بیانات نقل کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے جن میں کسی حد تک تنقید کا عنصر موجود ہے اور جن کی مدد سے اس اندازِ نظر کا احاطہ کیا جاسکتا ہے جو پوری طرح بروے کار نہ آسکا۔ ملاحظہ ہوں:

سید فضائل علی بیقیدؔ: "مثنوی ..... بزبانِ قدما در بیانِ عشقِ خود با یکے از اربابِ طرب گفتہ اما بے نمک واقع است۔" (ص ۴۱)

جوششؔ عظیم آبادی: "چاشنی در دراز کلامش ظاہر۔ می توان گفت کہ شیوۂ میر درد را بخوبی ورزیدہ۔ فقیر را اسلوبِ بیانِ ایشان نہایت مرغوب و پسندیدہ است۔" (ص ۶۸)

حیدر دہلوی :۔ "نومشق است اما طرزِ گفتارش روانی دارد" (ص ۹۰)
جعفر علی خاں زکی :۔ "طبعش در فکرِ ریختہ رسا و نظمِ کلامش بطرزِ قدما است مثنوی
او کہ اکثر رعایتِ ایہام کردہ شہرت تمام دارد" (ص ۱۷۷)
سجاد اکبر آبادی :۔ "ایہام در کلامش بسیار است" (ص ۲۹۷)
سکندر مرثیہ گو :۔ "در مرثیہ گفتن کمالِ اقتدار و سلیقہ درستے دارد ۔۔۔۔۔۔
اگرچہ استعدادِ علمی ندارد اما مرثیۂ او مقبولِ خواص و عوام
است" (ص ۳۰۰ و ۳۰۱)
میر محمدی شرف :۔ "در ریختہ گوئی متبعِ طرزِ نازک خیالان است" (ص ۳۰۸)
علی نقی کافر :۔ "آں قدر مایۂ سخنوری نداشت کہ تعریفش تواں نگاشت"
(ص ۳۷۰)

بعض شاعروں کے کلام پر اس روشِ عام سے ہٹ کر کسی قدر تفصیل کے ساتھ تبصرہ کیا گیا ہے لیکن اول تو ایسے شاعروں کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے۔ دوسرے یہ وہ لوگ ہیں جن کے بارے میں خلیل سے قبل دوسرے تذکرہ نگار بہت کچھ لکھ چکے ہیں۔ اس لیے بنظرِ اختصار صرف سودا اور میر کے حالات سے دو اقتباس بطور نمونہ پیش کیے جاتے ہیں۔

سودا :۔ "تشبیہاتِ تازہ و مضامینِ غریب و معانیٔ بیگانہ ۔۔۔۔۔۔ در دیوانش بسیار است در جمیع اقسامِ نظم خاصہ قصائد داد تلاشِ معنوی دادہ و از میان اقرانِ خود تازہ گوئی را بر طاقِ بلندے نہادہ کہ دستِ دیگراں بآں نمی رسد۔ آتش را باگرمیٔ زبانش از ہجومِ شرار جوشِ قطراتِ عرق انفعال است و آب را از شرمِ طبع روانش بخاک فرو رفتن در خیال۔ از انجا کہ رتبۂ معانیٔ شاعرِ مذکور بس بلند افتادہ است، تلفظ بہ محاورات ہندی قدر و شانِ آں را پست نساختہ، چہ نزد جمہور مقرر است کہ تار پودِ الفاظِ شاہد معانی را بمنزلہ لباس و پیرایہ است" (ص ۱۸۱)

میر:۔ "درستیٔ سلیقۂ نظم و استقامتِ ذہن و صافیٔ فکر از کلامش ظاہر است...
..... میرِ مذکور را باریختہ گویانِ اقرانِ خود فرقِ بعید درمیان است...
..... سحر کاریٔ سخن در طلسم سازیٔ خیال و جادو طرازیٔ بیان در شیوۂ مقالِ اوست۔ اگرچہ در ہمہ اقسامِ نظم ناطقہ ساز است لیکن بہ اتفاقِ اداسنجانِ سخن نغمۂ دیگر بہ آہنگِ غزل ہا یش سامعہ نواز نیست۔"

(ص ۳۷۳)

ان سرسری اور وضاحت طلب اشاروں کی بنیاد پر اگر خلیل کو ناقدینِ شعر و ادب کے درمیان کوئی نمایاں مقام نہیں دیا جا سکتا تو انھیں اس صف سے خارج کر دینا بھی آسان نہیں۔ کم سے کم اتنا ضرور ہے کہ انھوں نے بے بنیاد اور بعید از کار لفاظی و عبارت آرائی سے اجتناب کر کے تذکرے کو غیر ضروری اور لایعنی طوالت سے محفوظ رکھا ہے۔

بنیادی مباحث و مسائل کے اس جائزے کے بعد "گلزارِ ابراہیم" کے بعض ایسے ضمنی و ذیلی اندراجات کی طرف نظر جاتی ہے جو اہم بھی ہیں اور دل چسپ بھی۔ ان میں میر حسن اور میر سوز کے خطوط کے دو اقتباسات بھی شامل ہیں جو ان لوگوں کے حالات میں نقل ہوئے ہیں۔ یہ خطوط حالات اور کلام کی فراہمی کے متعلق مولف کی درخواست کے جواب میں لکھنؤ سے لکھے گئے تھے۔ میر حسن لکھتے ہیں کہ:

"از سائرِ اقسامِ اشعار ابیاتِ مدونۂ من قریب ہشت ہزار بیت است و تذکرہ در ریختہ نوشتہ و اصلاحِ سخن از میر ضیا گرفتہ ام و مدتیست کہ از دہلی وارد لکھنؤ گشتہ با نواب سالار جنگ و خلفِ ایشان ملقب بہ مرزا نوازش علی خاں سردار جنگ می گذرانم۔" (ص ۱۰۱)

اس تحریر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ میر حسن ۱۱۹۶ھ/۱۷۸۲ء کے قریب تک مختلف اصناف میں تقریباً آٹھ ہزار اشعار کہہ چکے تھے اور انھوں نے اپنے کلام پر صرف میر ضیا سے اصلاح لی تھی۔ اس طرح یہ خط سودا سے استفادے کے متعلق شورش، عشقی،

قاسم، ذکا اور شمس العلماء آزاد وغیرہ کے بیانات کی تردید میں "تذکرہ شعرائے اردو" کے بعد دوسری معتبر شہادت فراہم کرتا ہے۔

میر سوز کی تحریر ان کی شخصیت کے ایک اہم رُخ کو بے نقاب کرتی ہے۔ فرماتے ہیں:

"میر سوز شخصے است کہ ہیچ کس را از وحلاوتے جز سکوت واکراہ حاصل نہ شود۔ ایں نیز از قدرتِ کمالِ الٰہی است کہ ہر یکے بلکہ خار و خسے نیست کہ بکارِ چند نیاید۔ پس اگر منکرے سوال کند کہ ناکارۂ محض نیفتادہ است ایں است کہ نامش سوختنی است۔" (ص ۲۸۴)

ولی کی وطنیت اردو ادب کی تاریخ میں ایک نزاعی مسئلہ ہے۔ خلیل اس گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جو انھیں گجراتی الاصل اور گجرات کو دکن کا ایک حصہ قرار دیتا ہے۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ ولی دکنی کے نام سے ابتدائی تعارف کے بعد رقم طراز ہیں کہ

"اصلش گجرات۔ در شعرائے دکن مشہور و ممتاز است ..... اول کسے است کہ دیوانش در دکھن مشتہر و مدون گشتہ۔" (ص ۴۴۶)

مرزا مظہر جانجاناں کے حال میں ان کے سانحۂ شہادت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"بسببِ تعصبِ مذہب منع تعزیۂ سید الشہدا علیہ السلام می نمود۔ بدیں جہت بر دستِ یکے از ساکنانِ دہلی در سنہ یک ہزار و یک صد و نود و چہار ہجری کہ عرش قریب بصد رسیدہ بود مقتول شد۔" (ص ۴۰۳)

اس بیان کو پیشِ نظر رکھ کر مولف کے مذہبی عقائد کے بارے میں ایک قرینِ صحت رائے قائم کی جا سکتی ہے۔ یہاں یہ وضاحت بھی بے محل نہ ہوگی کہ مرزا صاحب کے زمانۂ شہادت کے متعلق منقولۂ بالا اطلاع صحیح نہیں۔ یہ حادثہ ۱۱۹۴ھ کی بجائے محرم ۱۱۹۵ھ کے عشرۂ اوّل میں پیش آیا تھا، جیسا کہ مشہور مادۂ تاریخ "عَاشَ حَمِیْدًا مَاتَ شَہِیْدًا" اور مصحفی کے درج ذیل شعر سے ظاہر ہے

شبِ ہفتمِ ماہ عاشورہ بود آں کہ از خون شدش سرزمین کربلائی

اس تذکرے کی خوبی یہ بھی ہے کہ یہ اپنے زمانے کی ایک ایسی وقیع ادبی دستاویز ہے جس کے اوراق بارھویں صدی ہجری کے اختتام تک مشرقی ہندوستان میں اردو شاعری کی مقبولیت اور ترقی کی مکمل داستان اپنے سینے میں چھپائے ہوئے ہیں، اسی لیے زور صاحب نے اسے پہلی بار اہلِ علم سے روشناس کراتے ہوئے تحریر فرمایا تھا کہ "عظیم آباد اور مرشد آباد کے علم و فضل یا شعر و سخن پر جو کچھ بھی آئندہ لکھا جائے گا اس کی تکمیل اس وقت تک نہیں ہو سکے گی جب تک گلزار ابراہیم کے مواد سے مدد نہ لی جائے" (مقدمہ مرتب ص ۴۱) دورِ جدید کی کئی تحقیقی تصانیف اور ادبی تاریخوں نے اس پیش گوئی کی صداقت پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی ہے۔ یہی متنوع خوبیاں خلیل کی اس قابلِ قدر کوشش کو نقشِ دوام کی حیثیت عطا کرتی ہیں۔

گلشن سخن

گلشن سخن مرزا کاظم مخاطب بہ مردان علی خاں مبتلا لکھنوی کی تالیف ہے۔ اس تذکرے کو پہلی بار پروفیسر سید مسعود حسن رضوی نے ماہنامہ "ہمایوں" لاہور کے دسمبر ۱۹۳۳ء کے شمارے میں ایک مضمون کے ذریعے روشناس کرایا تھا۔ اس کے بعد ۱۹۶۵ء میں موصوف ہی کی ترتیب و تصحیح اور مقدمے کے ساتھ انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ کی جانب سے اس کی اشاعت عمل میں آئی ہے۔ یہ اشاعت دو قلمی نسخوں پر مبنی ہے جن میں سے ایک رضوی صاحب کے ذاتی کتب خانے میں اور دوسرا رضا لائبریری رام پور میں محفوظ ہے۔ پہلا نسخہ ناقص الطرفین ہے یہ میر اثر کے انتخابِ کلام سے شروع ہو کر میر حمایت علی مجنوں کے اشعار پر ختم ہو جاتا ہے۔ دوسرا مخطوطہ بظاہر مکمل ہوتے ہوئے بھی اس اعتبار سے ناقص ہے کہ اس کے کاتب نے کتاب کے ثلث آخر میں بڑی آزادی کے ساتھ جا بجا تحریف کر کے مولف کی اصل عبارات کو تا بحدِ امکان مختصر کر دیا ہے چنانچہ اس نسخے میں قائم چاند پوری، میر تقی میر، مرزا مظہر جانجاناں اور مصحفی جیسے نامور شعرا کے تراجم صرف نام اور تخلص یا ایک ایک جملے تک محدود ہیں جب کہ رضوی صاحب کے نسخے میں ان میں سے بعض لوگوں کے متعلق کافی تفصیل سے لکھا گیا ہے۔ اس صورتِ حال کی بنا پر رضوی صاحب کے نسخے سے غیر حاضر آخر کے اسی (۸۰) شاعروں سے متعلق تذکرے کا متن استناد و اعتبار کے لحاظ سے مشکوک ہو گیا ہے۔

تذکرے کے مولف میرزا کاظم مبتلا کو بقولِ خود شعر و ادب اور تصنیف و تالیف

کے کام سے گہری دل چسپی تھی۔ "گلشن سخن" کی تالیف سے قبل وہ اپنے کلام فارسی کا ایک انتخاب اور شعرائے فارسی کا ایک تذکرہ "گلدستۂ معانی" مرتب کر چکے تھے۔ زیرِ بحث تذکرہ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے چنانچہ دیباچے میں لکھتے ہیں کہ

"مولف از آغازِ شباب ..... اوقاتِ گرامی خود را ..... بگفتن و خواندن کلام فارسی ..... صرف نمودہ، ہنگامے کہ سنینِ عمر از بست تجاوز کردہ، نو بادہ ہائے معینے از گلزارِ فکر چیدہ دیوانے منظم ساخت و ہم دراں ایام تذکرہ مسمّٰی بہ "گلدستۂ معانی" کہ مشتمل بر انتخاب اشعارِ فارسی سخن پردازانِ قدیم و جدید با اختصار بیان احوال آنہاست، ترتیب داد۔ معہذا اکنوں چناں بخاطر رسید کہ از کلام ریختہ گویانِ سابق و حال کہ دریں زمانہ کمالِ اشتہار در قلمروِ ہندوستان دارند، ..... صحیفۂ جمع نماید تا از مطالعۂ آں شیفتگانِ محبوبانِ معانی حظے وافر بردارند۔ الحمد لواہب العطایا کہ دراندک زماں کامیاب گردیدہ و بمقصد رسیدہ۔ چوں عقدۂ خاطر را بناخنِ حسنِ انجامِ تالیف کشود، مسمّٰی بہ "گلشن سخن" نمود۔" (ص ۴۹ و ۵۰)

اس عبارت کے فوراً بعد مندرجہ ذیل قطعۂ تاریخ درج ہے جس کے آخری مصرعے سے اس تذکرے کا سالِ ترتیب (۱۱۹۴ھ) برآمد ہوتا ہے:

آب و رنگ اس کا ہے جوں باغِ ارم — نہیں اس کے مقابل گلشن
سالِ تاریخ میں پوچھا ان سے — جو تھے اس فن کے سخن سنج کہن
سب لگے کہنے کہ اک عمر کے بعد — آج پھولا ہے سخن کا گلشن

اس قطعے کے علاوہ تذکرے کے دوسرے متعدد اندراجات سے بھی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مبتلا (۱۱۹۴ھ/۱۷۸۰ء) کے دوران اس کی ترتیب میں مصروف تھے۔ مندرجہ ذیل مثالوں میں "تاحال"، "الحال"، "تا ایں زماں" اور "تا حالتِ تحریر" کے ساتھ ۱۱۹۴ھ کے حوالے اسی صورتِ حال کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

(۱) مرزا جعفر علی حسرت: "تاحال کہ ۱۱۹۴ھ ہجری نبوی است، در قیدِ حیات است۔" (ص ۱۱۳)

(۲) میر حمزہ علی رند :۔ "الحال کہ ۱۱۹۴ھ یک ہزار و یک صد و نود و چار است، در عظیم آباد بوارستگی تمام ..... زندگی می کند۔" (ص ۱۳۲)

(۳) شاہ رکن الدین عشق :۔ "تا ایں زماں کہ سال ہزار و یک صد و نود و چہار ہجری است ..... بشغلِ وجد و حال اکثر می باشد۔" (ص ۱۷۴)

(۴) میر تقی میر :۔ "در شاہجہان آباد تا حالتِ تحریر ایں گلشنِ سخن کہ سنہ یک ہزار و یک صد و نود و چہار ہجری است، بہ سلامت استقامت دارد۔" (ص ۲۰۵)

عرشی صاحب نے "دستور الفصاحت" کے مقدمے میں اسی قسم کے متواتر بیانات کی بنیاد پر یہ رائے قائم کی ہے کہ "مبتلا سالِ مذکور کے اندر ہی کارِ تالیف سے فارغ ہو گئے تھے۔"[1] رضوی صاحب نے بھی اپنے مقدمے میں تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ اسی خیال سے اتفاق کیا ہے۔ چنانچہ عرشی صاحب کے قول پر تبصرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں :

"یہ تذکرہ تین سو اکیس (۳۲۱) شاعروں کے حالات اور ان کے منتخب اشعار پر مشتمل ہے۔"[2]

---

[1] دیباچہ دستور الفصاحت ص ۳۷

[2] رضوی صاحب کی مرتب کردہ اس ۳۲۱ رکنی فہرست میں متین کا نام زائد ہے جس کا متن میں ذکر نہیں اور میر مدد اللہ کا نام غلطی سے دو جگہ لکھا گیا ہے اس کے علاوہ میر محمد باقر کا ذکر حزیں اور ظہور تخلص کے تحت، پاکباز کا ترجمہ شاہ کلمو اور میر صلاح الدین کے نام سے اور سوز کا حال میر سید محمد سوز اور خواجہ محمد میر میر کے زیرِ عنوان مکرر شاملِ تذکرہ کیا گیا ہے۔ نور خاں آگاہ کا ترجمہ آگاہ کے تعارف اور الف خاں افغاں کے نمونۂ کلام کا مجموعہ ہے۔ میر محمدی مائل کے بعد میر ہدایت علی مائل کا تعارف قلم انداز ہو گیا ہے لیکن ان کے پانچ اشعار اول الذکر مائل کے دو شعروں کے فوراً بعد شاملِ تذکرہ ہیں۔ ٹیک چند بہار کے انتخابِ کلام میں آخری دو شعر دلاور خاں بے رنگ کے ہیں۔ یہاں بھی سہوِ کتابت کے نتیجے میں بیرنگ کا تعارف قلم انداز ہو گیا ہے۔ انھی بیرنگ کا ذکر آگے چل کر نیرنگ تخلص کے تحت کیا گیا ہے جو درست نہیں۔ ان مکررات و متروکات کی تفریق و جمع کے بعد شعرا کی صحیح تعداد تین سو اٹھارہ (۳۱۸) قرار پاتی ہے۔

اتنے شاعروں کے حالات، وہ مختصر ہی سہی فراہم کرنے اور ان کے کئی ہزار اشعار منتخب کرنے میں ایک سال سے زیادہ صرف ہوا ہوگا۔ مواد فراہم کرنے کے بعد اس کو مرتب کرنا ایک سال کے اندر ممکن ہے۔ گمانِ غالب ہے کہ ۱۱۹۴ھ مواد کی فراہمی کا نہیں اس کی ترتیب کا سال ہے۔" (ص ص ۱۶ و ۱۷)

قطع نظر اس سے کہ رضوی صاحب کی یہ تاویل مبتلا کے اس واضح بیان کے بعد کہ "در اندک زماں کامیاب گردیدہ و بمقصد رسیدہ" بالکل بے معنی ہو جاتی ہے۔ تذکرے کے بعض اندراجات اس سے بالکل مختلف صورت حال کا پتا دیتے ہیں اور ان کو پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ تذکرہ ۱۱۹۴ھ (۱۷۸۰ء) میں نہیں بلکہ اس کے بعد لکھا گیا ہے۔ مثلاً:

(۱) مرزا مظہر جانجاناں کے ذکر میں جن کی شہادت قطعی طور پر محرم ۱۱۹۵ھ (جنوری ۱۷۸۱ء) کا واقعہ ہے لکھتے ہیں:

"قبل ازیں مسموع شد کہ یکے از ساکنانِ دہلی وے را کشت و بسزائے کردارش رسانید۔" (ص ۲۱۹)

(۲) صاحب میر آلم کے متعلق جن کے بارے میں صاحبِ "گلزارِ ابراہیم" کا بیان ہے کہ "الحال کہ سنہ یک ہزار و یک صد و نود و چہار است، واردِ مرشد آباد شدہ از دوستیٔ راجہ دولت رام قیام دارند"، مبتلا لکھتے ہیں:

"از چند سال در مرشد آباد بسببِ دوستیٔ راجہ دولت رام استقامت دارد۔" (ص ۶۳)

(۳) صاحبِ مسرت افزا کے مطابق ستورش کا انتقال عشرۂ اولیٰ شعبان ۱۱۹۵ھ (جولائی اگست ۱۷۸۱ء) میں ہوا ہے[1]۔ مبتلا ان کا ذکر صیغۂ ماضی (بود) کے تحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

---

[1] مسرت افزا ص ۱۱۲

"خواہرزادۂ ملّا وحید و شاگردِ میر باقر کہ حزیں و ظہور تخلص می کرد، بود۔" (ص ۱۶)

۱۱۹۴ھ کے بعد کے ان واقعات کی موجودگی کے باوجود جا بجا سالِ رواں کے طور پر صرف ۱۱۹۴ھ کا تذکرہ اور اس سے قبل یا بعد کے کسی سنہ کے حوالوں کا فقدان دراصل اخفائے حال کی اس منصوبہ بند کوشش کا غماز ہے جو تذکرے کے اصل ماخذ کو قارئین کے دائرۂ توجہ سے باہر رکھنے کے لیے کی گئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ تذکرہ "گلزارِ ابراہیم" کا نہایت ہوشیاری اور سارقانہ مہارت کے ساتھ تیار کیا ہوا چربہ ہے۔ ۱۱۹۴ھ کے حوالے خاص طور پر اس لیے دیے گئے ہیں کہ "گلزارِ ابراہیم" اس زمانے میں ترتیب و تسوید کے ابتدائی مراحل میں تھا اور اس کے مولف علی ابراہیم خاں مرشد آباد میں مقیم تھے جب کہ مبتلا کا قیام بنارس میں تھا۔ صاحب "مسرت افزا" کے بیان کے مطابق اس کے اگلے سال یعنی ۱۱۹۵ھ/۱۷۸۱ء میں علی ابراہیم بنارس آچکے تھے اور ۱۱۹۸ھ/۱۷۸۴ء میں "گلزار ابراہیم" کی تکمیل کے وقت علی ابراہیم اور مبتلا دونوں بیک وقت بنارس میں موجود تھے۔ مبتلا نے خود کو سرقے کے الزام سے محفوظ رکھنے کے لیے نہ صرف سنین کے غلط حوالے دے کر "گلزارِ ابراہیم" پر اپنے تذکرے کا تقدم ثابت کرنے کی کوشش کی ہے بلکہ ایک شاعر کی حیثیت سے اس کے مولف کو نظر انداز کر کے اس سلسلے میں اپنی مکمل لاعلمی کا بہانہ بھی تراشا ہے حالانکہ ان کے روشناس خلق ہونے کا ثبوت خود اس تذکرے کے اوراق میں خادم حسین خادمؔ کے حالات (ص ۱۱۸) میں موجود ہے جنھیں "از منصب داران و عم زادگانِ علی ابراہیم خاں" کی حیثیت سے متعارف کرایا گیا ہے۔ اس کے برخلاف "گلزارِ ابراہیم" (مرتبہ پروفیسر کلیم الدین احمد) میں مبتلا کا ترجمہ ان الفاظ میں موجود ہے:

"مبتلا تخلص موسوم بہ مردان علی خاں خلف نواب محمد علی خاں ہندوستان زا۔ اصل اجدادِ عوالی مقدارش مشہدِ مقدس است نوابِ مذکور در سرکارِ نواب برہان الملک مغفور و نواب وزیر الممالک صفدر جنگ مبرور اقتدار بسیار داشت، امّا مبتلائے مذکور بعدِ انقلابِ روزگار در بنارس سکنیٰ اختیار نمود۔ الحال کہ سال یک ہزار و

یک صد و نود و ہشت ہجری است، با نرواسرمی برد۔ بہ متانت و لطافت و حسنِ سلیقہ اتصاف دارد۔" (ص ۴۳۶)

"گلزارِ ابراہیم" اور "گلشن سخن" میں سے کسی ایک کے مولف نے دوسرے کی معلومات سے سرقے کی حد تک استفادہ کیا ہے، یہ بات دونوں تذکروں کے سرسری تقابلی مطالعے ہی سے سامنے آجاتی ہے۔ بظاہر اس کا مرتکب علی ابراہیم کو قرار دیا جائے گا کیونکہ ان کا تذکرہ "گلشن سخن" کے بینہ سال ترتیب (۱۹۴ھ) سے چار برس بعد ۱۹۸ھ میں مکمل ہوا ہے لیکن حقیقتِ حال جو اس کے برخلاف ہے، مندرجہ ذیل شواہد سے ظاہر ہوتی ہے۔

(۱) شاہ اجمل اور مرزا الف بیگ فرصت نے الہ آباد سے اور شاہ احمد وارث احمدی نے زمانیہ ضلع غازی پور سے ۱۹۶ھ (۱۷۸۲ء) میں اپنا منتخب کلام "گلزار ابراہیم" میں شامل کرنے کے لیے بھیجا تھا، مبتلا نے ان تینوں شاعروں کے انتخاب کلام میں جو اشعار نقل کیے ہیں وہ انھی انتخابات سے ماخوذ ہیں۔

(۲) مرزا کاظم علی جوان، مرزا جعفر علی حسرت، میر حسن، موتی لال حیف، میر قدرت اللہ رخصت، میر فیض علی فیض، صاحب رائے فریاد، مرزا محمد بیگ قناعت، نواب محبت خاں محبت، شاہ مجنوں اور مرزا اسحاق وصل کے تراجم میں علی ابراہیم نے واضح طور پر لکھا ہے کہ ان کا کلام ۱۹۶ھ میں لکھنؤ سے طلب کر کے شاملِ تذکرہ کیا جا رہا ہے۔ "گلشن سخن" میں ان شعرا کے انتخابات میں ایک شعر بھی ایسا نہیں جو گلزار ابراہیم میں موجود نہ ہو۔

(۳) مرزا جہاندار شاہ جواں بخت سے علی ابراہیم نے اوّلاً ۱۱۹۸ھ/۱۷۸۴ء میں لکھنؤ میں ملاقات کی تھی۔ اس کے بعد اسی سال کے آخر میں جب وہ بنارس میں وارد ہوئے تو اکثر ملاقاتیں ہونے لگیں۔ اندازہ یہ ہے کہ "گلزار ابراہیم" میں ان کے جو اشعار منقول ہیں، وہ انھی ملاقاتوں میں سنے گئے ہوں گے۔ مبتلا نے انھی میں سے چار شعر اپنے ہاں نقل کیے ہیں۔

(۴) مرزا ظہور علی خلیق کے بارے میں علی ابراہیم کا بیان ہے:

"اسمش مرزا ظہور علی خلف مرزا ہوشدار، در موسیقیٔ ہندی و مرثیہ خواندن بغایت مہارت دارد ..... از عہدِ محمد شاہ ..... حسب الطلب نواب نوازش محمد خاں شہامت جنگ واردِ مرشد آباد شدہ دراں بلدہ سکنیٰ اختیار کردہ۔ تاحال کہ ۱۱۹۸ھ ہجریہ باشد، در سرکارِ نظامتِ بنگالہ منسلک و بارا قم آشنا ست۔"

(طبع ثانی ص ۱۲۴)

مبتلا نے یہی معلومات اس طرح اپنے تذکرے میں منتقل کی ہے:

"نامش مرزا ظہور علی خلفِ مرزا ہوشدار۔ در علم موسیقی و مرثیہ خواندن دستگاہِ تمام دارد۔ در عہد محمد شاہ مغفور حسب الطلبِ شہامت جنگ واردِ بنگالہ شدہ بالفعل در سرکار نظامتِ مرشد آباد منسلک۔" (ص ۱۱۷)

(۵) رام جس مغموم کے بارے میں علی ابراہیم لکھتے ہیں:

"از دل برشتگانِ سمومِ عشق و منسلکانِ سرکارِ ممتاز الدولہ مسٹر جانسن بہادر است در سنہ یک ہزار و یک صد و نود و نہ ہجری بارا قم آثم در بنارس ملاقی شدہ و اشعارِ خود را بیادگار دادتا در تذکرہ اثبات یابد۔" (ص ۴۳۱)

مبتلا نے علی ابراہیم کے بیان کے آخری حصے کو جس کا تعلق زمانۂ تحریر کے تعین سے ہے، نظر انداز کر کے ابتدائی ایک جملہ الفاظ کے معمولی ردو بدل کے ساتھ اس طرح اپنے ہاں نقل کر لیا ہے۔

"از منسلکانِ مسٹر جانسین و جگر سوختگانِ آتش عشق است۔" (ص ۲۳۰)

یہ شہادتیں واضح طور پر اس بات کا ثبوت فراہم کرتی ہیں کہ "گلشن سخن" گلزارِ ابراہیم کے ۱۱۹۹ھ/۱۷۸۵ء یا اس کے ایک دو برسوں میں نظرِ ثانی شدہ نسخے کی بنیاد پر مرتب کیا گیا ہے۔ اس کے بعد "گلشن سخن" پر "گلزارِ ابراہیم" کا تقدم ثابت کرنے کے لیے مزید دلائل کی ضرورت باقی نہیں رہتی، لیکن مبتلا کے استفادے کی کیا نوعیت ہے یہ واضح کرنے کے لیے دونوں تذکروں سے کچھ اقتباسات پیش کر دینا ضروری معلوم

ہوتا ہے اس سلسلے میں مندرجہ ذیل مثالیں قابل غور ہیں۔

گلزار ابراہیم	گلشن سخن
(۱) حیدری دہلوی	
"اسمش شیخ غلام علی۔ پدر بزرگوارش در پیشۂ عمالی مصروف و بصلاح و سداد موصوف بود۔ بسبب برہمیٔ اطوار روزگار ترکِ وطنِ قدیم ساختہ اقامت در عظیم آباد انداختہ۔ نومشق است اما طرزِ گفتارش روانی دارد۔" (طبع ثانی ص ۹۰)	"نامش شیخ غلام علی۔ پدرش مدام در پیشۂ عالی مالوف و بہ تقویٰ و صلاح موصوف بود۔ بسببِ گردشِ زمانہ جلاے وطن اختیار نمودہ در عظیم آباد مقیم شد ہرچند نومشق سخن است، اما روشِ کلامش روانی دارد۔" (ص ۱۱۴)
(۲) شیخ فضل علی دانا	
"اسمش شیخ فضل علی از معتقدانِ شاہ برہان الدین و از شاگردانِ میاں مضمونؔ دہلوی است۔۔۔۔۔ الحال کہ سنہ یک ہزار و یک صد و نود و چہار ہجری باشد، در لباسِ فقر و وارستگی و مسکنت در بنگالہ بسر می برد۔۔۔۔۔ گفتارش باطوار مضمونؔ مذکور بطرزِ ایہام است۔" (ص ۱۵۳)	"اسمش شیخ فضل علی از معتقدان شاہ برہان الدین و از شاگردانِ مضمونؔ دہلوی است۔ دریں ولا بہ لباس فقر و وارستگی در بنگالہ بسر می برد گفتار بیشتر بطرزِ ایہام است۔" (ص ۱۲۹)
(۳) حمزہ علی رندؔ	
"اسمش شاہ حمزہ علی۔ جوانِ خوش روے بود۔ مدتے با علی نقی خاں انتظارؔ تخلص و محمد تقی خاں پسران علی اکبر خاں مینگباشی مرحوم در زمرۂ سپاہیاں معاش کردہ بچندیں لباس برآمدہ۔	"اسمش میر ہمزہ علی (کذا) ترک علائق دنیوی نمودہ در مرشد آباد چندے سروپا برہنہ می گشت و اشعارِ خود می خواند و می گریست۔ الحال کہ ۱۱۹۴ھ یک ہزار و یک صد و نود و چہار است،

آخر بجذبۂ باطن ترکِ علائقِ ظاہر نمودہ
در مرشد آباد سر و پا برہنہ بالنگ و گلیم
می گشت و در مجمع و معرکہ حاضر شدہ
بر زمین یا صفِ پائیں می نشست و
اشعارِ خود می خواند و زار زار می گریست
راقم آثم را مکرر بران آزادہ حال نظر
افتادہ ..... الحال کہ سال یک
ہزار و یک صد و نود و چہار ہجری است،
شنیدہ شد کہ بغایت وارستگی در عظیم آباد
بروضۂ شاہ ارزانی و بمکان درویشانِ
دیگر بلا تعین زندگانی می کند"۔ (ص ۱۳۵)

در عظیم آباد بوارستگی تمام بلا تعین مکان
زندگانی می کند" (ص ۱۲۲)

(۴) شاہ رکن الدین عشق دہلوی

"موسوم بشاہ رکن الدین و معروف
بشاہ گھسیٹا نوادۂ شاہ فرہاد۔ از عمدہ
مشائخِ شاہجہان آباد است۔ بعالمِ
شباب از دہلی بمرشد آباد افتادہ در لباسِ
دنیا با خواجہ محمدی خاں مرحوم روزگارے
باحترام داشت بعد ازاں بر وطیرۂ آبائے
خود لباسِ فقیر در بر کردہ رحلِ اقامت
در عظیم آباد انداخت و تا حال کہ سال
یک ہزار و یک صد و نود و پنج ہجریست
آں صاحبِ حال بارشادِ طالبانِ اشتغال
دارد ..." (ص ۳۲۳)

"شاہ رکن الدین متخلص بہ عشق
دہلوی مشہور بشاہ گھسیٹا نوادۂ شاہ فرہاد
نقش بندیست۔ از دہلی بمرشد آباد رسیدہ
در لباسِ دنیا چندے با خواجہ محمدی خاں
روزگار بعزت و حرمت گذرانید و بعد ازاں
بطریقِ آبائے خود لباس درویشی در بر
نمودہ رحلِ اقامت در عظیم آباد انداخت
تا ایں زماں کہ سال یک ہزار و یک صد
و نود و چہار ہجری است، در بلدۂ مذکور
بشغلِ وجد و حال اکثر می باشد"

(ص ص ۱۷۳ و ۱۷۴)

(۵) میر جیون قربان

"نامش میر جیون از شاگردانِ مرزا محمد رفیع سودا نوجوانے بود۔ در زمرۂ سپاہیان معاش می کرد۔ ناگاہ در فیض آباد میانِ فوجِ انگریزی افتادہ از بدعتِ آں جماعہ غیر از جاں دادن چارہ ندانستہ مردانہ خود را بکشتن داد۔"

(ص ۳۵۹)

"نامش میر جیون نوجوانے بود از شاگردان مرزا محمد رفیع سودا۔ در فرقہ سپاہیاں معاش می نمود۔ گویند در فیض آباد میانِ فوج انگریزی افتاد۔ از بدعتِ آں قوم غیر از جاں دادن چارہ ندیدہ بہ دلاوری کشتہ شد۔"

(ص ۱۹۸)

(۶) حسن رضا نجات دہلوی

"اسمش شیخ حسن رضا۔ بعدِ ویرانیٔ شاہجہان آباد کہ بر دست احمد شاہ درّانی اتفاق افتادہ، وارد عظیم آباد گردید و مدتے در جوارِ عاطفتِ عمّی حاجی احمد علی قیامت تخلص بسر بردہ والحال از چند سال در دہے از دہات سرکارِ سارن مضاف صوبہ بہار سکنیٰ اختیار کردہ بغایتِ سلیم الطبع و سنجیدہ اطوار و از دوستانِ ایں خاکسار است مرثیۂ سید الشہدا علیہ السلام بیشتر و دیگر اقسامِ نظم را کمتر می گوید۔" (ص ص ۲۴۳ و ۲۴۴)

"نامش شیخ حسن رضا بعد ویرانیٔ شاہجہان آباد وارد عظیم آباد گشت و مدتے با حاجی احمد علی قیامت تخلص بسر بردہ۔ از چند سال الحال در دہے از دہاتِ سرکار سارن سکنیٰ اختیار نمود۔ مرثیہ سید الشہدا علیہ السلام بیشتر می گوید۔" (ص ۲۴۵)

"گلشن سخن" اور "گلزارِ ابراہیم" میں دو سو چھیاسی (۲۸۶) شاعر مشترک ہیں۔ یہی نہیں بلکہ بعض اوقات کسی خاص ردیف کے تحت دونوں تذکروں میں شعرا کی سلسلہ وار ترتیب بھی تقریباً یکساں ہے۔ ان میں سے معدودے چند شاعروں کو چھوڑ کر باقی

سبھی کے تعارف میں "گلزارِ ابراہیم" سے اخذ و اقتباس کی تقریباً یہی نوعیت نظر آتی ہے۔ حتیٰ کہ وہ تمام خلاف واقعہ بیانات بھی جو مولف کی غلط فہمی، سہوِ قلم یا نقصِ معلومات کا نتیجہ کہے جا سکتے ہیں، بعینہٖ اس تذکرے میں بھی موجود ہیں۔ ان میں سب سے نمایاں مرزا مظہر جانجاناں کی وفات سے متعلق وہ بیان ہے جس کا حوالہ گذشتہ سطور میں دیا جا چکا ہے۔ علی ابراہیم نے کسی غلط فہمی کی بنا پر اس واقعے کو ۱۱۹۴ھ سے متعلق قرار دیا تھا۔ مبتلا نے حسبِ معمول اس روایت کو صحیح تصور کرتے ہوئے "قبل ازیں مسموع شد" کے ساتھ اپنے ہاں نقل کر کے یہ ثابت کر دیا ہے کہ انھیں مطلقاً اس بات کا احساس اور اندازہ نہ تھا کہ کسی دوسرے کی متاعِ قلم کی یہ بے دریغ دست برد کسی بھی وقت سارق کے کفِ دست کا چراغ بن سکتی ہے۔

"گلزارِ ابراہیم" کے بعد "تذکرۂ شورش" دوسرا اہم ماخذ ہے جس سے مبتلا نے دل کھول کر استفادہ کیا ہے چنانچہ ان بتیس[۳۲] شاعروں میں سے جو "گلزارِ ابراہیم" سے غیر حاضر اور "گلشنِ سخن" میں موجود ہیں۔ چند کے علاوہ سبھی کے حالات میں اور بعض دوسرے شعرا کے تراجم میں بھی اس استفادے کے نقوش واضح طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں دونوں تذکروں کے ان ہم موضوع اقتباسات کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

تذکرۂ شورش	گلشنِ سخن
(۱) شاہ مبارک آبروؔ	
"نجم الدین عرف شاہ مبارک آبروؔ تخلص از فرزندانِ محمد غوث گوالیاری است۔ در شاہجہان آباد آمدہ شاگردِ سراج الدین علی خاں آرزو شدہ ۔۔۔۔ در شاعری طور خاصے دارد و رعایتِ لفظی بسیار می نماید ۔۔۔۔	"شیخ نجم الدین آبروؔ مشہور بہ شاہ مبارک از فرزندان شاہ غوث گوالیاری۔ در اوائلِ سلطنت محمد شاہ غفران پناہ بہ شاہجہان آباد آمدہ سکونت ورزید۔ در شیوۂ شاعری طرز خاصے دارد و در رعایتِ لفظی و ایہام بسیار

کلیاتش قریب یک ہزار و سہ صد شعر بہ نظر در آمدہ۔" (دو تذکرے جلد ا ص ۹)

می نماید۔ کلیاتش یک ہزار و پانصد بیت دیدہ شد۔" (ص ۵۱)

شورش نے آبرو کے انتخابِ کلام میں کل اڑسٹھ ۶۸ شعر نقل کیے ہیں جب کہ مبتلا کے نقل کردہ اشعار کی تعداد تیئس ۲۳ ہے۔ ان میں سے پچیس ۲۵ شعر بالیقین "تذکرۂ شورش" سے منقول ہیں۔ باقی پانچ اشعار میں سے دو ۲ شعر "گلزار ابراہیم" سے نقل کیے گئے ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ اشعار "گلزار ابراہیم" یا "تذکرۂ شورش" کے کسی ایسے نسخے میں موجود ہوں جو مبتلا کے پیش نظر تھا اور فی الوقت ہماری دسترس سے بعید ہے۔

(۲) مفتی غلام مخدوم ثروت

"مفتی غلام مخدوم ثروت تخلص متوطن قصبہ پھلواری، شاگرد مولوی آیت اللہ جوہری است۔ از چندے بخدمتِ افتاے عظیم آباد مفوض گشتہ۔ قوتِ ذہنی و استعدادِ قابل تحسین و آفریں دارد۔" (دو تذکرے جلد ا، ص ۱۰۹)

"سروت (کذا) اسمش مفتی غلام مخدوم متوطن قصبہ پھلواری، شاگرد مولوی آیت اللہ جوہری تخلص۔ از چندے بخدمت افتاے عظیم آباد مفوض گشتہ۔ ذہن درست دارد۔" (ص ۱۵۸)

(۳) میر منوحیرآن

"وطنش عظیم آباد ..... از مغتنمانِ روزگار بودہ۔ در سنِ سی سالگی ودیعتِ حیات نمودہ داغ بر دل دوستاں گذاشتہ۔ در فنِ مرثیہ گوئی مہارت تمام داشت و مظلوم تخلص می نمود۔ اشعارش اگرچہ کم است لیکن فصاحت و بلاغت تمام دارد ..... از زادہاے طبعش قریب سی صد شعر بدست آمدہ۔" (دو تذکرے ص ۱۹۹ ج ۱)

"وطنش عظیم آباد۔ از مغتنمانِ روزگار بودہ۔ در سنِ سی سالگی ودیعتِ حیات نمود۔ در مرثیہ مہارتِ خوب داشت و مظلوم تخلص می کرد۔ اشعارش باوصف کم بودن (فصاحت) زیادہ و بلاغت بے اندازہ دارد۔ سہ صد شعر ازو دیدہ شد۔" (ص ۱۱۲)

شورش نے ان کے کلام میں ردیف وار ترتیب کا خیال رکھے بغیر اٹھہتر[۷۸] اشعار اور دو[۲] رباعیاں نقل کی ہیں۔ مبتلا کے ہاں ان میں سے اکتیس[۳۱] اشعار اور ایک رباعی بقید ترتیب منقول ہے۔

(۴) مرزا علی رضا تمنا

"مولدش عظیم آباد، جوانے است اہلِ استغنا، وارستہ مزاج رو بسوے اختلاط مردم دنیا نمی آرد... ...کلامش خیلے آبدار و اندازِ گفتارش بسیار مزہ دار..... بسبب بیماریٔ خفقان طبع نازکش تاب ہجوم فکر نمی آرد۔ بنا بر گاہ گاہ بطریق تفنن شعر می گوید۔ سہ صد شعر دیدہ شد...."

(دو تذکرے جلد ا ص ۹۵)

"مولدش عظیم آباد، وارستگیٔ مزاج و استغنا از اہل دنیا بسیار دارد۔ طرز گفتارش بفصاحت تمام است۔ بسبب بیماریٔ خفقان طبع نزاکتِ شعارش تاب ہجوم فکر نمی آرد۔ گاہے گاہے غزلے انشا می کند۔ متفرق اشعارش دیدہ شد۔"

(ص ۸۴)

شورش کے ہاں ان کا انتخابِ کلام ستر[۷۰] اشعار پر مشتمل ہے جو بلا قیدِ ترتیب نقل کیے گئے ہیں۔ مبتلا نے انھی میں سے تینتیس[۳۳] شعر ردیف وار ترتیب کے مطابق اپنے ہاں نقل کر لیے ہیں۔

شورش کا ترجمہ "گلشن سخن" میں موجود ہے لیکن اس سے ان کے تذکرے سے مبتلا کی واقفیت کا پتا نہیں چلتا بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اس کے وجود سے بالکل بے خبر تھے۔ جب کہ اوپر کی مثالوں سے قطع نظر اس ترجمے کے ذیل میں بھی "دیوانش چہار ہزار بیت از قصیدہ و مثنوی و غزل است..... از خلاصۂ دیوان اوست" لکھ کر جو اشعار نقل کیے گئے ہیں، وہ سب کے سب ترتیب کے معمولی سے فرق کے ساتھ "تذکرۂ شورش" ہی سے ماخوذ ہیں۔ "گلزارِ ابراہیم" اور "تذکرۂ شورش" کے سلسلے میں اپنے اس رویے کے برخلاف جنوں دہلوی (ص ۱۸) کے ذکر میں ان کے

اشعار کے متعلق یہ لکھ کر کہ "ایں ابیات از تذکرۂ میر محمد تقی نقل نمودہ بہ تحریر می آرد"۔ مبتلا نے "نکات الشعرا" سے استفادے کا پوری وضاحت کے ساتھ اعتراف کیا ہے۔ بظاہر اس بیان کو غلط سمجھنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ یہ تذکرہ ان کی نظر سے نہیں گزرا تھا اور انھوں نے اس کا ذکر محض ماخذ کی نشاں دہی کے سلسلے میں اپنی دیانت اور ایمان داری کا سکہ بٹھانے کے لیے کیا ہے، کیوں کہ اول تو جنوں کا ذکر "نکات الشعرا" کے چار دریافت شدہ نسخوں میں سے کسی میں بھی موجود نہیں اور دوسرے ان کے نمونۂ کلام میں جو پانچ اشعار نقل کیے گئے ہیں، ان میں سے آخری دو شعر ایک دوسرے ہم تخلص شاعر غلام مرتضیٰ جنوں سہسرامی کے ہیں[1]۔ باقی تین اشعار میں سے دوسرا شعر "گلشنِ سخن" اور "گلزار ابراہیم" دونوں میں مشترک ہے۔ دو دو اشعار دونوں تذکروں میں مختلف فیہ ہیں لیکن ان کا تعلق ایک ہی غزل سے ہے جو ممکن ہے اس زمانے میں زبان زدِ خلائق ہو۔ "گلشن سخن" کی تالیف کے وقت "نکات الشعرا" کے پیش نظر نہ ہونے کا ثبوت مبتلا کے ایک اور بیان سے بھی ملتا ہے، جو میر مستعد ذہین سے متعلق ہے۔ ذہین کے حالات کا اولین ماخذ گردیزی کا "تذکرۂ ریختہ گویاں" ہے جس میں انھیں "از دوستان مولف" کی حیثیت سے متعارف کرایا گیا ہے (ص ۶۳) علی ابراہیم نے اپنے تذکرے میں ان کا ذکر اسی حوالے کے ساتھ کیا ہے لیکن وہ مولف کا نام سہواً میر فتح علی کے بجائے میر محمد علی لکھ گئے ہیں۔ مبتلا نے اسے از روے قیاس میر محمد تقی کی تصحیف سمجھ کر اپنے ہاں اس کی تصحیح کر دی ہے، لیکن اگر "نکات الشعرا" ان کے پیش نظر ہوتا تو وہ یہ غلطی ہرگز نہ کرتے کیونکہ جنوں دہلوی کی طرح ذہین کا ذکر بھی اس تذکرے کے کسی دریافت شدہ نسخے میں شامل نہیں۔

"گلزار ابراہیم" اور "تذکرۂ شورش" سے استفادے کی جو مثالیں اوپر کی

---

[1] خلیل نے جنوں سہسرامی کے کل چار شعر انتخاب کیے ہیں۔ مبتلا کے ہاں ان میں سے دو شعر ان کے کلام میں اور دو جنوں دہلوی کے انتخاب میں شامل ہیں۔

سطور میں پیش کی گئی ہیں وہ اس تذکرے کے انفرادی کردار کی نفی کرتی ہیں گویا متذکرہ شاعروں کے متعلق قارئین کے ذخیرۂ معلومات میں اضافے کے نقطہ نظر سے اس کا وجود وعدم وجود برابر ہے۔ حتیٰ کہ جن شاعروں سے مبتلا کے دوستانہ مراسم تھے اور جنھیں دہلی، مرشد آباد، عظیم آباد اور بنارس میں قیام کے دوران قریب سے دیکھنے کے مواقع ملے تھے، ان کے بارے میں بھی انھوں نے ایسی معلومات شاذ و نادر ہی فراہم کی ہے جو انکشافات کی حیثیت رکھتی ہو۔ تاہم ان کی جن تحریروں کو اس قسم کے مستثنیات میں شمار کیا جا سکتا ہے، وہ یہ ہیں

(۱) محمد روشن جوشش:

"از فرزندانِ جسونت رائے ناگر است ..... مشارٌ الیہ از صغرِ سن رغبت بہ اسلام داشت۔ چوں بحد تمیز رسید، بشرف دینِ احمدی مشرف گشت۔ فقیر احوال ایشاں مفصل از بھگونت رائے خلفِ جسونت رائے کہ فیما بین خصوصیت و دوستی ہاست، معلوم نمود۔ مرد لیست قابل ..... در نظم و نثر صاحبِ استعداد۔ دیوانش دو ہزار بیت دیدہ شد۔" (ص ۸۷)

(۲) میر حسین دوست ذاکر:

"ابن میر علی دوست، متوطن مراد آباد سنبھل۔ چند سال در شاہجہان آباد میرِ مسطور مدرس خسرو پورہائے راقم مرزا محمد رفیع خاں و بدیع الزماں خاں بود۔ مردِ ظریف و شعر فہم خوب و در صرف و نحو فی الجملہ مہارت داشت۔" (ص ۱۳۱)

(۳) اشرف علی خاں فغاں:

"..... در اواخر سلطنتِ احمد شاہ از دہلی برآمدہ بصوبۂ اودھ رسید و چندے دراں دیار توقف ورزیدہ در اوائلِ عشرۂ سابعہ بعد مائۃ والف بہ عظیم آباد شد و سالے آں شہر اور اگرامی داشتند و خان مذکور جاگیر و آں تمغا حاصل نمودہ بفراغت می گذرانید و در مزاجِ راجہ شتاب رائے ناظم عظیم آباد دخلِ تمام داشت و بوساطتِ راجہ، مسطور خطاب ظریف الملک بنام خود گرفت۔ و در سنہ یک ہزار

ویک صد وہشتاد وشش رحلت نمود ودر عظیم آباد مدفون گردید۔ کلیاتِ ریختہ اش دو ہزار بیت دیدہ شد۔" (ص ۱۷۹)

(۴) میر غلام نبی بلگرامی:

"خواہر زادۂ میر عبدالجلیل۔ در علم سنسکرت بے مثلِ وقت خود بود۔ دو ہزار پانصد دوہرہ وکبت تصنیف کرد ورسم لین تخلص داشت با مولف رابطۂ دوستی بدرجۂ اتم بود و ہر روز در دہلی اتفاقِ ملاقات می شد۔ در جنگ احمد خاں افغاں برفاقتِ والا (والد) مغفور بدلاوری کشتہ شد۔" (ص ص ۲۴۳ و ۲۴۴)

(۵) علی قلی ندیم:

"۔۔۔۔۔۔ اکثر مرثیہ وسلام سید الشہدا بزبانِ ریختہ می گفت و دریں فن خود را از شاگردانِ میر عبداللہ مسکین می شمرد۔ راقم در دہلی ایشاں را اکثر دیدہ بود۔" (ص ۲۴۴)

(۶) شاہ واقف:

"نامش میاں عاشوری۔ از صغرِ سن با مادرِ خود از منسلکانِ خسرو پورایں مولف بدیع الزماں خاں وہم مکتبِ ایشاں بود و در ہماں خانہ پرورش یافت۔ بحسنِ تربیتِ میر حسین دوست مراد آبادی کہ معلّمِ خان مذکور بود، بہرۂ از علومِ رسمیہ برداشت۔ و در فیض آباد وحشتے پیدا کردہ و ترک لباس نمود لیکن شب و روز نزدِ بدیع الزماں خان می بود۔" (ص ۲۵۴)

ان چند بیانات کے پہلو بہ پہلو ایک اور اہم اور قابلِ لحاظ اضافہ آبرو اور ناجی وغیرہ کے ہم عصر ایہام گو شاعر احسن اللہ احسن کے کلام کا ہے جن کے انتخاب میں مبتلا نے یہ بتانے کے بعد کہ "در دیوانش شعرے یافتہ نمی شود کہ خالی از ایہام باشد۔ دریں صنف دستگاہِ تمام داشت۔" (ص ۵۳) انچاس اشعار نقل کیے ہیں جب کہ ان کا دیوان نایاب ہے اور دوسرے تذکروں میں متفرق طور پر ان کے کل چھ سات شعر ہی ملتے ہیں۔

اوپر کی سطور میں مختلف شاعروں کے حالات سے جو مثالیں پیش کی گئی ہیں، انھیں "گلشن سخن" کی کل کائنات کہا جا سکتا ہے۔ انتخابِ کلام کے سلسلے میں چند قابلِ لحاظ اضافوں سے قطع نظر کر کے اگر انتہائی رعایت اور احتیاط سے کام لیتے ہوئے اس قسم کے متفرق و منتشر جملوں کو یکجا کر دیا جائے تو ان کے لیے مطبوعہ نسخے کے زیادہ سے زیادہ دو صفحات کافی ہوں گے۔ اس اجمالی تبصرے کے بعد اس تذکرے کی اہمیت و افادیت پر مزید اظہارِ خیال کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

تذکرۂ ہندی، ریاض الفصحا اور معاصر تذکرے

اس باب کے تحت ہم نے تذکرۂ ہندی، ریاض الفصحا، گلشن ہند، تذکرہ عشقی، طبقات سخن اور تذکرۂ بے جگر کو اپنے مطالعے کے لیے منتخب کیا ہے۔ یہ تذکرے ۱۱۹۷ھ/ ۱۷۸۳ء اور ۱۲۴۲ھ/۱۸۲۶ء کی درمیانی مدت میں مرتب ہوئے ہیں۔ "تذکرہ ہندی" ۱۱۹۷ھ/۱۷۸۳ء اور ۱۲۰۹ھ/۹۵-۱۷۹۴ء کے مابین، ریاض الفصحا ۱۲۲۱ھ/۱۸۰۶ء اور ۱۲۳۶ھ/۱۸۲۱ء کے درمیان اور گلشنِ ہند ۱۲۱۵ھ/۱۸۰۱ء میں ترتیب دیا گیا ہے۔ تذکرۂ عشقی کی تالیف کا زمانہ قطعی طور پر متعین نہیں۔ قرائن سے پتا چلتا ہے کہ اس کا آغاز ۱۱۸۸ھ/۱۷۷۴ء کے قریب ہوا اور کم سے کم ۱۲۳۰ھ/۱۸۱۵ء تک اس میں وقتاً فوقتاً اضافے اور ترمیمیں کی جاتی رہیں۔ لیکن اس کا نقش اول یقیناً ۱۲۲۰ھ/۱۸۰۵ء سے قبل تیار ہو چکا تھا۔ طبقاتِ سخن اپنے نام سے حاصل شدہ اعداد کے بموجب ۱۲۲۲ھ (۱۸۰۷ء) کی تالیف ہے۔ تذکرۂ بے جگر کا زمانہ ۱۲۳۷ھ/۱۸۲۱ء اور ۱۲۴۲ھ/۱۸۲۶ء کے درمیان قرار پاتا ہے۔ سنینِ ترتیب سے متعلق اس تفصیل کی روشنی میں ریاض الفصحا کا ذکر اصولاً طبقات سخن کے بعد کیا جانا چاہیے لیکن چوں کہ تذکرۂ ہندی اور یہ تذکرہ دونوں ایک ہی شخص (مصحفی) کی تالیف ہیں اور مختلف خوبیوں اور خامیوں کے لحاظ سے دونوں میں کافی مماثلت پائی جاتی ہے، اس لیے مطالعے کی آسانی کی غرض سے ان دونوں تذکروں کو یکے بعد دیگرے جگہ دی گئی ہے۔ اس زمانے کے کچھ اہم تذکروں پر جو اپنی ضخامت اور جامعیت کی وجہ سے زیادہ تفصیلی مطالعے کے مستحق ہیں آئندہ اوراق میں ایک علیحدہ باب کے تحت بحث کی جائے گی۔

تذکرۂ ہندی

تذکرہ نویسی کی تاریخ میں مصحفی اس اعتبار سے امتیازی حیثیت کے حامل ہیں کہ انھیں تین تذکروں ـــ عقد ثریا، تذکرۂ ہندی اور ریاض الفصحا کا مولف ہونے کا فخر حاصل ہے۔ ان میں سے پہلے دو تذکرے بالترتیب شعرائے فارسی اور شعرائے اردو کے احوال واشعار کے لیے مخصوص ہیں۔ تیسرے تذکرے میں فارسی واردو دونوں زبانوں کے شاعروں کو جگہ دی گئی ہے۔ یہ تینوں تذکرے مولوی عبدالحق کے مقدمے[1] کے ساتھ انجمن ترقی اردو (ہند) اورنگ آباد، دکن سے شائع ہو چکے ہیں۔ تذکرۂ ہندی جو اس سلسلے کی دوسری کڑی ہے اور جس کا جائزہ یہاں مقصود ہے، ۱۹۳۳ء میں جامع برقی پریس دہلی سے چھپ کر شائع ہوا ہے۔ یہ اشاعت ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے کتب خانے کے قلمی نسخے پر مبنی اور ایک سو ترانوے (۱۹۳) شاعروں کے ذکر پر مشتمل ہے۔ متن کی تصحیح اور مقابلے کے لیے مرتب نے رضا لائبریری رام پور اور خدا بخش اورنٹیل پبلک لائبریری پٹنہ کے قلمی نسخوں سے بھی استفادہ کیا ہے۔

تذکرۂ ہندی کا دوسرا ایڈیشن ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری نے "تذکرۃ الشعرا معروف بہ تذکرۂ ہندی" کے نام سے جنوری ۱۹۸۰ء میں محمدی پبلشرز لکھنؤ سے شائع کیا ہے۔ اس ایڈیشن کی ترتیب کتب خانۂ ندوۃ العلماء، لکھنؤ کے قلمی نسخے کی بنیاد پر عمل میں آئی ہے۔ متن کے بعض اہم اختلافات کے علاوہ اس نسخے کی ایک قابلِ ذکر خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں باقی سبھی نسخوں کی بہ نسبت تین شاعروں کا حال زیادہ ہے یعنی شعرا کی مجموعی تعداد ایک سو ترانوے (۱۹۳) سے بڑھ کر ایک سو چھیانوے (۱۹۶)

---

[1] عقدِ ثریا، تذکرۂ ہندی اور ریاض الفصحا تینوں تذکروں کے ساتھ ایک ہی مقدمہ شامل ہے جو ۸ر نومبر ۱۹۳۳ء کو حیدر آباد میں لکھا گیا تھا۔

ہو گئی ہے۔ ان تین شاعروں میں میر سلیم متخلص بہ سلیم پٹنوی، مشہور ایہام گو میر سجاد سجاد اور شرف الدین شرف شاگرد سودا شامل ہیں۔ سجاد کا ذکر تیسرے تذکرے ریاض الفصحا میں بھی موجود ہے، باقی دو شاعروں کا ذکر مصحفی کے ہاں کسی دوسری جگہ نہیں ملتا۔

"تذکرۂ ہندی" کی ترتیب کا کام مصحفی نے بقولِ خود تذکرۂ فارسی کی تالیف سے فراغت کے بعد شروع کیا تھا۔ اس کی تحریک انھیں اپنے عزیز شاگرد اور میر حسن کے فرزندِ رشید میر مستحسن خلیق سے ملی تھی۔ دیباچے میں ان امور سے متعلق اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"چوں ایں فقیر ..... از تالیفِ تذکرۂ فارسی فراغت حاصل کردہ مہمِ تالیفِ تذکرۂ ہندی در پیش آمد۔ اگرچہ از علوِ ہمتِ خداداد سرو دماغ آں نبود کہ اوقات عزیز خود را باشتغالِ چنیں امرِ لاطائل کہ دیگراں بفخر بگردنِ خود شں بستہ اند مصروف سازد، اما بتکلیفِ میر مستحسن خلیق خلف میر حسن کہ باشارۂ پدرِ بزرگوارِ خود از نظرِ فقیر می گذراند و شوقِ شعرِ ہندی دامنِ دلش را محکم فراگرفتہ طوعاً و کرہاً قدم دریں بادیۂ پُرخار گذاشت و بقیدِ حروفِ تہجی (بر تحریر) اسامی قدیم شعرائے عہدِ فردوس آرام گاہ تا شعرائے زمانۂ شاہ عالم بہادر بادشاہِ غازی ..... ہمت گماشت۔"

(ص ص ۳ و ۴)

"عقدِ ثریا" کا سالِ اتمام ۱۱۹۹ھ/۱۷۸۵ء ہے۔ مصحفی کے اس اندازِ بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے "تذکرۂ ہندی" کی ترتیب کا آغاز اسی سال یا زیادہ سے زیادہ سالِ آئندہ یعنی ۱۲۰۰ھ/۱۷۸۶ء میں کیا ہوگا اور تھوڑے ہی دنوں میں اس کام سے فارغ ہو گئے ہوں گے، لیکن خاتمۂ کتاب اس سے بالکل مختلف کیفیت کی نشان دہی کرتا ہے۔ تفصیل مصحفی کے اپنے الفاظ میں حسبِ ذیل ہے:

"مولفِ ایں تذکرہ ..... از تشتتِ حواس و پریشانیٔ خاطر و نامساعدیٔ زمانہ کجا فرصتِ آں داشت کہ بہ تصحیحِ احوال و اشعارِ شعرائے سابق و حال پرداختہ نقشۂ ایں جریدہ را بروے کار آرد، اما اکنوں کہ بہ رہبریٔ بختِ سعید در حضورِ پُرنور

مرشدزادۂ آفاق مرزا محمد سلیمان شکوہ بہادر ..... باریافتہ ہمیشہ موردِ گوناگوں مہربانیٔ آں سپہرِ خلافت وجہاں داری می باشد، فرصت را غنیمت شمردہ، مسودۂ مغشوشِ تذکرہ را کہ از چند سال بہ طاقِ نسیان افتادہ بود، صاف نمودہ و درست ساختہ ..... امید کہ بنظرِ قبولِ آں والاجناب درآمدہ مقبولِ دل ہا گردد ..... تاریخ

چوں کہ از فضلِ خدا ساختہ شد — جلدِ ایں تذکرہ مانندِ بہشت
سالِ او چوں ز خود پرسیدم — یک ہزار و دو صد و نہ بنوشت ....."

(ص ۲۸۲)

اس قطعے کے علاوہ ایک اور قطعے سے بھی جس کا مادۂ تاریخی "جلدِ بے نظیر" ہے، یہ بات تو واضح ہو جاتی ہے کہ اس تذکرے کی تکمیل ۹-۱۲۰۸ھ/ ۹۵-۱۷۹۴ء میں ہوئی ہے لیکن دو مسئلے اس کے بعد بھی حل طلب رہ جاتے ہیں۔ ایک یہ کہ اس کی ترتیب کا آغاز فی الواقع کس سنہ میں ہوا۔ دوسرا یہ کہ اس کا پہلا مسودہ کب تیار ہوا اور تکمیل سے قبل کتنے دنوں تک طاقِ نسیاں کی زینت بنا رہا؟ ان مسائل کے تصفیے کے لیے مندرجہ ذیل شہادتوں سے مدد لی جا سکتی ہے:

(الف) نسخۂ ندوہ "تذکرۂ ہندی" کے دستیاب نسخوں میں سب سے قدیم ہے۔ متعدد شواہد اس کے نسخۂ مولف ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔ اس سلسلے کی سب سے اہم شہادت یہ ہے کہ اس کے متن میں جو ترمیمیں اور حاشیوں پر جو اضافے کیے گئے ہیں، وہ دوسرے نسخوں کے اصل متن میں شامل ہیں۔ اس نسخے میں شاہ حاتم کا جو حال ترمیم سے قبل لکھا گیا تھا، اس میں مصحفی نے لکھا تھا:

"..... باکمالِ آزادگی می گزراند ..... با فقیر آشناست۔ حق تعالیٰ سلامتش دارد۔" (طبع ثانی ص ۲۱)

بعد میں اس تحریر کو قلمزد کر کے حاشیے پر مزید تفصیل کے ساتھ ان کے جو حالات لکھے گئے ہیں، ان میں یہ اطلاع بھی موجود ہے کہ "سہ سال است کہ در شاہجہان آباد ودیعتِ حیات سپردہ۔" (ص ۸۱) حاتم نے خود مصحفی کی تحریر کے مطابق ماہ رمضان

۱۱۹۷ھ (جولائی ۱۷۸۶ء) میں وفات پائی تھی[۱]۔ اس لیے یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ ابتدائی مرحلے میں ان کا حال ۱۱۹۷ھ/۱۷۸۶ء سے قبل لکھا گیا ہوگا اور ترمیم کے بعد جو ترجمہ قلمبند ہوا ہے، وہ ۱۲۰۰ھ/۱۷۸۹ء کی تحریر ہے۔

(ب) نسخۂ ندوہ میں خواجہ میر دردؔ کے ترجمے میں ابتداءً یہ اطلاع فراہم کی گئی تھی:

"حقائق و معارف آگاہ، خواجہ میر دردؔ سلمہ اللہ ..... از چندے باشارۂ والدِ بزرگوار ..... بکمالِ فقر و قناعت می گزراند ....." (طبع ثانی ص ۲۱)

اس کے برخلاف ترمیم یافتہ متن میں ان کے متعلق یہ بتایا گیا ہے کہ

"..... یک سال است کہ دردِ مہجوریش شفا یافتہ و بہ شافیٔ علی الاطلاق واصل گشتہ۔" (ص ۹۳)

دردؔ کی تاریخِ وفات مسلّمہ طور پر جمعہ ۲۴ صفر ۱۱۹۹ھ مطابق ۷ جنوری ۱۷۸۵ء ہے[۲]۔ اس بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ پہلی بار ان کا حال ۱۱۹۹ھ/۱۷۸۵ء سے قبل اور دوبارہ ۱۲۰۰ھ/۱۷۸۶ء میں لکھا گیا ہے۔

(ج) مرزا جواد علی احقرؔ (ص ۲۱) اور میر محمد یار خاکسارؔ (ص ۸۸) کے حالات میں ضمناً میر حسنؔ کا ذکر بھی آیا ہے۔ ان دونوں مقامات پر انھیں "سلمہ اللہ تعالیٰ" کے دعائیہ کلمے کے ساتھ یاد کیا گیا ہے جس سے ان کا بقیدِ حیات ہونا ظاہر ہوتا ہے اور میر حسنؔ نے خود مصحفی کے بقول محرم ۱۲۰۱ھ (نومبر ۱۷۸۶ء) میں وفات پائی ہے (ص ۶۹)، اس لیے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ احقرؔ اور خاکسارؔ دونوں کے حالات محرم ۱۲۰۱ھ مطابق نومبر ۱۷۸۶ء سے قبل لکھے جا چکے تھے۔

(د) شاہ عالم آفتابؔ کے بارے میں لکھتے ہیں:

"پس از فراغتِ اوقاتِ معہودِ تلاوتِ قرآن و نوشتنِ آں اشہبِ فکر را

---

[۱] عقدِ ثریا ص ۲۲

[۲] نشترِ عشق مخطوطۂ رام پور ورق ۲۵۴ ب و تذکرۂ بے جگر ورق ۶۶ ب

درمیدانِ شعر ہندی و فارسی و کبت و دوہرہ وغیرہ نیز جولاں می دہند۔" (ص ۴)

شاہ عالم کو غلام قادر روہیلہ نے ذی قعدہ ۱۲۰۲ھ/اگست ۱۷۸۸ء میں بینائی سے محروم کر دیا تھا۔[1] اس کے بعد کلام اللہ کی کتابت کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان کا حال اس واقعے سے پہلے قلمبند کیا جا چکا تھا۔

پیش کردہ تفصیلات کی روشنی میں یہ حقائق بخوبی واضح ہو جاتے ہیں کہ "تذکرۂ ہندی" کی ترتیب کا کام "عقد ثریا" کی تکمیل (۱۱۹۹ھ/۱۷۸۵ء) سے کم از کم دو سال قبل ۱۱۹۷ھ/۱۷۸۳ء میں شروع ہو چکا تھا اور اس کا نقشِ اول جسے مصحفی نے میر مستحسن خلیق کی فرمائش کا رہینِ منت قرار دیا ہے، ۱۲۰۰ھ/۱۷۸۶ء میں مکمل ہوا۔ اس کے بعد میر حسن کے ترجمۂ احوال کے علاوہ جو بگمانِ غالب ان کی وفات کے چند دنوں ہی کے اندر اور ۱۲۰۰ھ سے بالکل متصل زمانے یعنی محرم ۱۲۰۱ھ (نومبر ۱۷۸۶ء) میں لکھا گیا ہے، ۱۲۰۹ھ/۱۷۹۴-۹۵ء سے قبل کسی شاعر کا تعارف قلمبند کیے جانے یا سابقہ عبارات میں جزوی ترمیم و تغیر کا کوئی قطعی ثبوت نہیں ملتا۔ ۱۲۰۹ھ میں جن شاعروں کے ناموں کا اضافہ ہوا یا جن کے تراجم جزوی ردوبدل کے بعد دوبارہ لکھے گئے، ان میں سے انشاء اللہ خاں انشا، میر اکبر علی اختر، جسونت سنگھ پروانہ، نعیم بیگ جواں، عنایت اللہ حجام، شاہ حسین حقیقت، سعادت یار خاں رنگین، مرزا زین العابدین سرتبر، مرزا سلیمان شکوہ، میر صادق علی صادق، طالب حسین طالب، فدا حسین خاں فدا، قائم چاندپوری، شمس الدولہ قسمت، میر محمد حسین منشی، لالہ کنور سین مضطر، میر قمر الدین منت، ولی اللہ محب، نور الاسلام منتظر، میر نظام الدین ممنون اور علی نقی محشر کے حالات میں اس کے واضح شواہد موجود ہیں۔ تفصیلات حسب ذیل ہیں:

(الف) انشا کی شعر گوئی پر تبصرے کے ذیل میں ان کی "مثنوی شیر و برنج در جواب نان و حلوائے مولانا بہاء الدین آملی" کی تعریف کی گئی ہے۔ یہ مثنوی اپنی تاریخِ اتمام

---

[1] نادرات شاہی۔ مقدمۂ مرتب ص ۲۹

"خروشِ موج یم" کے مطابق ۱۲۰۵ھ کی تصنیف ہے[۱]۔ قرائن سے اندازہ ہوتا ہے کہ انشا کا حال یا کم از کم اس کا یہ حصہ اس کے بعد ۱۲۰۹ھ میں لکھا گیا ہے۔

(ب) میر اکبر علی اختر کے ذکر میں مصحفی نے اپنے روزگار کی برہمی اور وحشتِ مزاج میں زیادتی کا ذکر ماضی کے واقعات کے طور پر کیا ہے۔ یہ بالیقین سلیمان شکوہ کی سرکار سے وابستگی کے قبل کی بات ہے۔ لہٰذا ان کے حالات بھی ۱۲۰۹ھ میں یعنی سلیمان شکوہ کی ملازمت کے دوران لکھے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔

(ج) جسونت سنگھ پروانہ کے بارے میں لکھتے ہیں:

"در روز ہائے کہ مولف از شاہجہان آباد بہ لکھنؤ رسید ..... از ہماں ایام عطفِ عنانِ فکرِ شعرِ فارسی بطرف ریختہ کردہ ..... تا الی الیوم کہ عرصۂ دوازدہ سال شدہ باشد، مشقِ او بسیار رسا و پختہ گردیدہ۔" (ص ۴۶)

مصحفی بقولِ خود ۱۱۹۸ھ میں لکھنؤ پہنچے تھے۔ اس حساب سے تقریباً بارہ سال کی یہ مدتِ مشق ۱۲۰۹ھ میں پوری ہوئی ہوگی۔

(د) عنایت اللہ حجام کے ترجمے کے خاتمے پر ان کی وفات کا ذکر چھ برس قبل کے واقعے کے طور پر کیا گیا ہے۔ نسخۂ ندوہ میں ان کے تعارف کا یہ حصہ حاشیے پر درج ہے۔ اس سے پہلے کے حالات ان کی زندگی میں مشہور صوفی بزرگ حضرت شاہ فخر الدین چشتی کی وفات کے بعد لکھے جا چکے تھے۔ چوں کہ شاہ صاحب موصوف کی تاریخِ رحلت ۲۷ جمادی الثانیہ ۱۱۹۹ھ[۲] اور حجام کا سالِ وفات ۱۲۰۳ھ ہے[۳]، اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ تذکرۂ ہندی میں ان کا حال ۱۲۰۰ھ میں لکھا گیا تھا اور آخری چند جملوں کا اضافہ ۱۲۰۹ھ میں کیا گیا ہے۔

---

[۱] کلیاتِ انشا ص ۱۸۲

[۲] تذکرۂ ماہ و سال ص ۲۹۲

[۳] تذکرۂ بے جگر ورق ۶۲ ب و ۶۳ الف

(ھ) میر شاہ حسین حقیقتؔ کے حال میں امام بخش خاں کشمیری کے بڑی منت و سماجت کے ساتھ اس تذکرے کا "مسودۂ خام" مانگ کر لے جانے اور اس سے شعرائے دہلی کے احوال و اشعار نقل کرا کے حقیقتؔ سے ایک تذکرہ مرتب کروانے کا واقعہ پوری شرح و بسط کے ساتھ منقول ہے۔ نسخۂ ندوہ میں دو سطر کے مختصر تعارف کے بعد اسے حاشیے پر بطور اضافہ درج کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ اندراج ۱۲۰۹ھ میں اس "مسودۂ خام" کو آخری شکل دینے کے وقت عمل میں آیا ہوگا۔

(و) زین العابدین خاں سرسبزؔ کے ذکر میں لکھتے ہیں کہ "فقیر پیش ازیں مدتِ چار سال بصیغۂ شاعری ملازم و رفیق ایشاں ماندہ۔" (ص ۱۱۸) اس ملازمت کا تعلق مرزا سلیمان شکوہ کے ورودِ لکھنؤ سے قبل کے زمانے سے معلوم ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے سرسبزؔ کا حال بھی سلیمان شکوہ کی سرکار سے توسل کے دوران تذکرے کی تکمیل کے وقت یعنی ۱۲۰۹ھ ہی میں لکھا گیا ہے۔

(ز) مرزا سلیمان شکوہ ۱۲۰۵ھ (۹۱-۱۷۹۰ء) میں لکھنؤ وارد ہوئے تھے۔[1] مصحفیؔ نے ان کا تعارف اس سنہ کے بعد ان کے دربار سے اپنی وابستگی کے ایام میں سپردِ قلم کیا ہے۔ نعیم بیگ جوانؔ، سعادت یار خاں رنگینؔ میر صادق علی صادقؔ، طالب حسین طالبؔ اور میر محمد حسین منشیؔ کے حالات بھی اسی زمانے میں لکھے گئے ہیں کیوں کہ ان سبھی شاعروں کو مصحفیؔ نے مرشدزادۂ آفاق کی سرکار سے متوسل بتایا ہے۔

(ح) ولی اللہ محبؔ کا حال نسخۂ ندوہ میں نسبتاً مختصر تھا۔ بعد کے نسخوں میں ان کے متعلق ان دو اہم اطلاعات کا اضافہ کیا گیا ہے کہ (۱) "از چند سال بصیغۂ شاعری در حضورِ مرشدزادۂ آفاق ..... امتیازِ تمام داشت" اور (۲) "دو سال است کہ بمرضِ مزمنِ ناسورِ پا وداعِ جہانِ فانی کردہ۔" (ص ۲۳۱) ظاہر ہے کہ یہ دونوں واقعات ۱۲۰۹ھ کا اضافہ ہیں۔

---

[1] سوانحاتِ سلاطینِ اودھ جلد اول ص ص ۳۸۰ تا ۳۸۲

(ط) ندوہ، رام پور اور پٹنہ کے قلمی نسخوں میں مرزا فدا حسین خاں فدا کے حال میں ان کی عمر بیس سال بتائی گئی ہے۔ ایشیاٹک سوسائٹی کے نسخے کے ترقیمے میں خود فدا نے ۲۰ جمادی الثانیہ ۱۲۱۹ھ کو اپنا عمر کی تیسویں منزل میں ہونا ظاہر کیا ہے۔ اس اعتبار سے ان کا ترجمہ بھی ۱۲۰۹ھ ہی کی تحریر قرار پاتا ہے۔

(ی) قائم چاندپوری کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "اجلش در رام پور رسید و خبرِ وفاتش شہر بشہر انتشار یافت۔" (ص ۱۸۰) قائم کا انتقال ۱۲۰۸ھ (۹۴-۱۷۹۳ء) میں ہوا ہے[۵۱]، اس لیے ان کا حال بھی ۱۲۰۹ھ ہی میں لکھا گیا ہوگا۔

(ک) نواب شمس الدولہ قسمت کو جعفر علی حسرت کے انتقال کے بعد سے اپنے زمرۂ تلامذہ میں شامل بتاتے ہیں۔ حسرت کا سالِ وفات ۱۲۰۶ھ (۹۲-۱۷۹۱ء) ہے[۵۲]۔

(ل) کنور سین مضطر ندوہ اور رام پور کے مخطوطات کے مطابق تذکرے کی تالیف کے وقت عمر کی بیسویں منزل سے گزر رہے تھے۔ "عقدِ ثریا" میں مصحفی نے انھیں ۱۲۱۳ھ میں "جوانِ بست و پنج سالہ" کی حیثیت سے متعارف کرایا ہے[۵۳]، اس لحاظ سے یہ بیان بھی ۱۲۰۹ھ کی تحریر قرار پاتا ہے۔

(م) میر قمر الدین منت کے ذکر میں ان کی وفات کو دو سال پہلے کا واقعہ بتاتے ہوئے اپنا نظم کیا ہوا ایک قطعۂ تاریخ بھی نقل کیا ہے جس کے آخری مصرعے سے ۱۲۰۷ھ برآمد ہوتا ہے۔

(ن) نور الاسلام منتظر کے بارے میں رقم طراز ہیں کہ "از ہشت سال برائے مشورۂ کلام خویش پیشِ فقیر آمد و شد دارد ..... عمرش تا امروز بست و پنج سالہ باشد۔" (ص ۳۴) آٹھ سال کی اس مدت شاگردی کے حدود ۱۲۰۱ھ اور ۱۲۰۹ھ کے درمیان ہی متعین کیے جا سکتے ہیں۔

---

۵۱ مجمع الانتخاب مخطوطہ کتب خانۂ انجمن ترقی اردو (ہند) ورق ۲۲۰ ب و مخزنِ نکات مقدمۂ مرتب ص ۴

۵۲ تفصیل آئندہ سطور میں پیش کی جائے گی۔

۵۳ عقد ثریا ص ۵۷

(س) میر نظام الدین ممنونؔ کا تعارف ان کے والد میر قمر الدین منتؔ کی وفات کے بعد سپردِ قلم کیا گیا ہے اور منتؔ کا سالِ وفات اس سے قبل اسی تذکرے میں ۱۲۰۷ھ بتایا جا چکا ہے۔

(ع) مرزا علی نقی محشرؔ کے حال میں عشرۂ محرم ۱۲۰۸ھ کے دوران ان کے قتل کا واقعہ مذکور ہے۔ (ص ۲۴۴) ظاہر ہے کہ یہ تحریر ۱۲۰۹ھ ہی کی ہو سکتی ہے۔

عرشیؔ صاحب نے ان میں سے بعض شہادتوں کی روشنی میں یہ رائے قائم کی ہے کہ مصحفیؔ نے ۱۲۰۹ھ کے بعد بھی اس تذکرے میں کچھ اضافے کیے ہیں۔ موصوف نے اس سلسلے میں سب سے پہلے جسونت سنگھ پروانہ کے بارہ سال سے حلقۂ تلمذ میں داخل ہونے کے متعلق ان کے بیان کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے:

"اگر ان (مصحفیؔ) کے (لکھنؤ میں) سالِ آمد ۱۱۹۸ھ (۸۴-۱۷۸۳ء) پر ۱۲ برس بڑھائے جائیں تو ۱۲۱۰ھ (۹۶-۱۷۹۵ء) حاصل جمع ہوگا۔"[1]

لیکن تخمینے میں غلطی کے احتمال کے پیشِ نظر وہ اپنے اخذ کیے ہوئے اس نتیجے کی صحت پر زیادہ زور نہیں دیتے اور شمس الدولہ قسمتؔ کے ترجمے سے جعفر علی حسرتؔ کے انتقال کے بعد اصلاحِ کلام کے لیے مصحفیؔ کی طرف ان کے رجوع سے متعلق عبارت نقل کر کے اس استدلال کے ساتھ سلسلۂ بحث کو آگے بڑھاتے ہیں:

"حسرتؔ نے ۱۲۱۰ھ (۹۶-۱۷۹۵ء) میں رحلت کی ہے لہٰذا اس حصے کو اس سنہ یا اس کے کچھ بعد کا ہونا لازم ہے۔"[2]

اس کے بعد عرشیؔ صاحب نے اپنے مدعا کے اثبات کے لیے آخری اور فیصلہ کن دلیل کے طور پر الٰہی بخش خاں معروفؔ کے ترجمے سے مصحفیؔ کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ

"در ایامے کہ فقیر تذکرہ با تمام رسانیدہ، از شاہجہان آباد بہ لکھنؤ گزرافگندہ۔"

(ص ۲۴۵)

---

[1] [2] دستور الفصاحت۔ مقدمۂ مرتب ص ۸۶

ان دلائل میں سے پہلی دلیل تو خود عرشی صاحب کی نگاہ میں کمزور ہے، اس لیے اس پر کسی بحث کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ دوسری دلیل کی کیفیت یہ ہے کہ اس کی بنیاد جس واقعے پر رکھی گئی ہے، وہ ۱۲۱۰ھ کی بجائے ۱۲۰۶ھ سے تعلق رکھتا ہے۔ ہماری مراد جعفر علی حسرت کے سانحۂ وفات سے ہے جس کی تاریخ جرأت نے اس طرح کہی ہے ؎

خلاقِ معانی جو رحلت فرمائے — ہر اہلِ سخن کو کیوں نہ حسرت رہ جائے
جرأت نے کہی یہ رو کے تاریخِ وفات — یوں جاوے جہاں سے حسرت ارمان ہائے

اس رباعی کے آخری مصرعے سے ۱۲۰۶ھ برآمد ہوتا ہے[1]۔ شاہ کمال کی تحریر کے مطابق بھی یہی حسرت کا سالِ وفات ہے۔ وہ اپنے تذکرے میں جس کا سالِ ترتیب ۱۲۱۸ھ (۱۸۰۳ء) ہے، ان کے حالات قلمبند کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"عرصۂ دوازدہ سال می شود کہ از قضائے الٰہی انتقال فرمودہ[2]۔"

عرشی صاحب کی تیسری دلیل کسی حد تک قابلِ لحاظ ہے لیکن چوں کہ یہ بات ہمارے علم میں نہیں کہ مصحفی ۱۲۰۹ھ کے کس حصے میں تذکرے کی ترتیب سے فارغ ہوئے تھے، اس لیے معروف کے ترجمے کو قطعی طور پر ۱۲۱۰ھ یا بعد کے کسی سال کی تحریر نہیں کہا جا سکتا۔ بہت ممکن ہے کہ انھوں نے سال کے آغاز یا وسط میں اپنا کام مکمل کر لیا ہو اور یہ چند سطریں آخر کے کسی مہینے میں اضافہ کر دی گئی ہوں۔

راقم السطور کو اپنے مطالعے کے دوران ۱۲۰۹ھ/۹۵-۱۷۹۴ء کے بعد اس تذکرے

---

[1] عرشی صاحب نے بھی اس رباعی کے مادۂ تاریخی سے ۱۲۰۶ھ برآمد ہونا تسلیم کیا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ان کا یہ بھی خیال ہے کہ اگر پہلی بیت کے الفاظ "فرمائے" اور "رہ جائے" کی مطابقت اور کتب خانۂ رام پور کے تمام قلمی نسخوں کے اندراج کے اتباع میں "جاوے" کو بدون واؤ یعنی "جائے" پڑھا جائے تو اس مادے سے ۱۲۰۰ھ حاصل ہوگا (دستور الفصاحت حاشیہ ص ۷۳) یہاں انھوں نے موخر الذکر نتیجے ہی کو مرجح قرار دیا ہے۔ موقف کے اس اختلاف کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔

[2] مجمع الانتخاب مخطوطہ کتب خانۂ انجمن ترقی اردو (ہند)، ورق ۲۶۰ الف

کے متن میں کسی قسم کے اضافے یا ردوبدل کے صرف دو ثبوت ملے ہیں جو لالہ ٹیکا رام تسلی اور مرزا فدا حسین فدا کے تراجمِ احوال سے متعلق ہیں۔ تسلی کے بارے میں مصحفی کا بیان ہے کہ

"سن عمرش از بست و پنج متجاوز خواہد بود ..... دیوانِ اولِ فقیر را در عالمِ مکتب نشینی کہ فقیر دراں روزہا نووارد ایں شہر بود ..... بدست خود در عرصۂ قلیل نقل گرفتہ۔" (ص ۵۶)

تسلی نے "مجموعۃ الشعرا" میں لکھا ہے کہ ۱۱۹۹ھ ہجری میں جب ان کے والد رائے گوپال رائے کو آصف الدولہ بہادر کی سرکار سے بخشی گری کا منصب عطا ہوا تو وہ بارہ سال کے تھے۔[1] اس حساب سے ان کا سالِ ولادت ۱۱۸۷ھ قرار پاتا ہے اور سن عمر کے پچیس برس سے متجاوز ہو جانے کے بعد اس تذکرے میں ان کا حال ۱۲۱۲ھ میں قلمبند کیا گیا ہوگا۔

فدا کی عمر ایشیاٹک سوسائٹی لائبریری کے قلمی نسخے میں باقی تینوں نسخوں کے برخلاف "بست و دو سال" بتائی گئی ہے۔ (طبع اول ص ۱۶۹) جیسا کہ اس سے قبل بھی لکھا جا چکا ہے، ۲۰ جمادی الثانیہ ۱۲۱۹ھ کو نسخۂ کلکتہ کی کتابت سے فراغت کے وقت وہ عمر کی تیسویں منزل میں تھے۔ اس اعتبار سے ان کے ترجمۂ احوال میں یہ ترمیم ۱۲۱۱ھ میں کی گئی ہوگی۔

ان تفصیلات کا ماحصل یہ ہے کہ مصحفی نے "تذکرۂ ہندی" کی تسوید کا کام بزمانۂ قیامِ دہلی شاہ حاتم کی زندگی میں یعنی رمضان المبارک ۱۱۹۷ھ/اگست ۱۷۸۳ء سے قبل شروع کر دیا تھا۔ ۱۱۹۸ھ/۸۴-۱۷۸۳ء میں جب وہ لکھنؤ آ گئے تو پہلے انھوں نے شعرائے فارسی کے تذکرے "عقد ثریا" کو آخری شکل دے کر ۱۱۹۹ھ/۸۵-۱۷۸۴ء میں اس کی ترتیب سے فراغت حاصل کی۔ بعدازاں میر مستحسن خلیق کے اصرار پر "تذکرۂ ہندی" کی تالیف کی طرف راغب ہوئے اور جمع کردہ مواد کو منظم و مرتب کر کے

---

[1] مجموعۃ الشعرا، مخطوطہ ٹیگور لائبریری، لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ ص ۲

۱۲۰۰ھ/۸۶-۱۷۸۵ء اس کا ابتدائی مسودہ تیار کر لیا لیکن حالات کی نامساعدت اور ذہنی یکسوئی کے فقدان کی وجہ سے یہ "مسودۂ خام" آٹھ برس تک تصحیح و تکمیل کا منتظر رہا۔ تا آں کہ ۱۲۰۹ھ/۹۵-۱۷۹۴ء میں جب انھیں کچھ آسودگی اور فرصت میسر ہوئی تو انھوں نے موقعے کو غنیمت جانتے ہوئے اس "مسودۂ مغشوش" کو ضروری ترمیم و تنسیخ اور اضافوں کے بعد صاف کر کے اسے پایۂ اختتام تک پہنچایا۔ اس کے بعد دو چار مقامات پر معمولی ردوبدل اور ایک دو اضافوں کے علاوہ متن میں کسی بڑی تبدیلی کا کوئی پتا نہیں چلتا۔

تذکرے کی ترتیب میں مصحفی کو سب سے زیادہ مدد اپنی یادداشت اور مشاہدے سے ملی ہے۔ ان کی پرورش و پرداخت اور شخصیت کی تشکیل ایسے زمانے میں ہوئی تھی جسے دو مختلف ادوار کا نقطۂ اتصال کہا جا سکتا ہے۔ ایک طرف تو وہ اس دور کی آخری یادگار ہیں جسے مرزا مظہر، شاہ حاتم، مرزا سودا، خواجہ میر درد اور میر تقی میر جیسے کاملینِ فن کی قیادت سے بہرہ مندی کا شرف حاصل ہے اور دوسری طرف ان کا سلسلہ اربابِ سخن کے اس قافلے سے ملتا ہے جس کی رہنمائی آتش و ناسخ جیسے اساتذہ کے ہاتھ میں تھی۔[1] پھر ان کا بچپن امروہے میں، عنفوانِ شباب کا کچھ زمانہ آنولے اور ٹانڈے میں، پھر جوانی کے تقریباً بارہ برس (۱۱۸۷ھ/ ۱۷۷۳ء تا ۱۱۹۸ھ/۱۷۸۴ء) دلی میں[2] اور عمر کے باقی بیالیس[42] سال (۱۱۹۸ھ/۱۷۸۴ء

---

[1] مصحفی نے دیوانِ ششم کے دیباچے میں آتش، ناسخ اور ان کے ایک نسبتاً غیر معروف معاصر طالب علی عیشی کے "رویۂ شعر گوئی" کی تقلید کا خود اعتراف کیا ہے۔

[2] مصحفی جمادی الثانیہ ۱۱۷۰ھ (مارچ ۱۷۵۸ء) میں بلبھ گڑھ میں پیدا ہوئے (تفصیل کے لیے دیکھیے راقم الحروف کا مضمون "مصحفی کا سنہ ولادت" مطبوعہ ہفتہ وار "ہماری زبان" علی گڑھ شمارہ ۸/اپریل ۱۹۶۶ء) اور کم سنی ہی میں اپنے والدین کے ساتھ امروہہ چلے آئے۔ ۱۱۸۶ھ سے قبل ان کا دہلی پہنچنا کسی مستند ذریعہ سے ثابت نہیں۔

تا ۱۲۴۰ھ/ ۲۵-۱۸۲۴ء) لکھنؤ میں بسر ہوئے۔ جہاں گردی و جہاں بینی کی اس خاصی طویل مدت میں انھوں نے بہت سے بزرگ اساتذہ کی صحبتوں سے فیض اٹھایا، متعدد نامور معاصرین کی خلوت و جلوت کے شریک رہے، تتبع کے قریب شاگردوں کو زبان و فن کے رموز و نکات اور فصاحت و بلاغت کے مقتضیات سے آشنا کیا[1] اور بے شمار مشاعروں کی ترتیب و تنظیم کے فرائض انجام دیے۔ اپنی شخصیت کی اس ہمہ گیری اور ہمہ جہتی کی بنا پر انھیں تذکرہ نویسی کے لیے جتنے بہترین مواقع حاصل تھے وہ کم ہی لوگوں کو میسر آسکے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ انھوں نے اپنی لیاقت اور استعداد کے مطابق ان مواقع سے پورا پورا فائدہ بھی اٹھایا۔ ان کے تصنیفی و تالیفی کارناموں کی فہرست میں تین تذکروں کی موجودگی اس حقیقت پر شاہد ہے۔ ان تذکروں میں انھوں نے زیادہ تر انھی شعرا کا ذکر کیا ہے جن سے وہ ذاتی طور پر واقف تھے۔ "تذکرۂ ہندی" کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

> "بیشتر دراں ذکرِ معاصرین است کہ احوال ہر یکے بچشمِ خود دیدہ و بہ حسن و قبح مراتبِ سخنِ ہر کس وا رسیدہ و کم کم احوالِ بعضے متقدمین نیز بطریقِ تیمن صورتِ اندراج یافتہ۔" (ص ۴)

تعارف میں تفصیل یا اختصار کا انحصار انھوں نے اسی ذاتی واقفیت یا عدم واقفیت پر رکھا ہے۔ چنانچہ خاتمے کے ذیل میں رقم طراز ہیں کہ

> "احوال اکثرے در و بہ شرح و بسط مسطور است و احوال بعضے از متقدمین کہ کما ینبغی آگاہی بر اوقاتِ آنہا حاصل نبود، بطورِ بیاض سمتِ تحریر یافتہ۔" (ص ۲۸۲)

مصحفی کی بیان کردہ اس صورتِ حال کی وضاحت کے بعد یہاں یہ بتا دینا

---

[1] "در زبانِ اردوے ریختہ قریب صد کس امیر زادہا و غریب زادہا بحلقۂ شاگردیٔ من آمدہ باشند و فصاحت و بلاغت را از من آموختہ۔" ریاض الفصحا ص ۲۸۷

بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے کسی حد تک گردیزی، قائم چاندپوری اور میر حسن کے تذکروں سے بھی استفادہ کیا ہے[1]۔ گردیزی کے تذکرے کا حوالہ بقاءاللہ بقا کے حال میں[2] (ص ۴۳)، قائم کے تذکرے کا ذکر میر محمد سجاد سجاد (طبع ثانی ص ۱۶۳)، محمد حسین کلیم (طبع اول ص ۱۹۷) اور میر قمرالدین منت (ایضاً ص ۲۳۰) کے ترجموں میں اور میر حسن کے تذکرے کے حوالے محمد یار خاکسار (طبع اول ص ۸۸)، سلیم پٹنوی (طبع ثانی ص ۱۶۳) عبدالرسول نثار (طبع اول ص ۲۵۵) اور عسکری نالاں (ایضاً ص ۲۶۰) کے حالات میں موجود ہیں۔ مولوی قدرت اللہ قدرت (وشوق) کو بھی انھوں نے "مولفِ تذکرۂ ہندی گویان" کی حیثیت سے متعارف کرایا ہے (ص ۱۷۵) لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ تذکرہ (طبقات الشعرا) ان کی نظر سے گزرا بھی تھا یا نہیں۔

دریافت احوال کی ان تمام سہولتوں کے باوجود جن کی طرف سطورِ بالا میں اشارہ کیا گیا ہے، مصحفی نے شعرا کے سوانح حیات کی تفصیل کو بہت کم اہمیت دی ہے۔ انھوں نے اپنے لیے مورخ یا سوانح نگار کی بجائے نقادِ سخن کا منصب پسند کیا ہے۔ اس مناسبت سے ان کی گفتگو ایک مخصوص دائرے میں محدود ہوتی ہے۔ ان کی توجہات زیادہ تر اس پس منظر اور ماحول کی بازآفرینی اور ان واقعات و واردات کے بیان پر مرکوز رہتی ہیں جن کے زیرِ اثر فن کار کی شخصیت نشو و نما پاتی ہے اور اس کی تخلیقی صلاحیتوں کو ابھرنے کے مواقع ملتے ہیں۔ وہ ایسے تمام واقعات کو جن کا شاعر کے فن سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں ہوتا، یکسر نظر انداز کر جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ سالہائے ولادت و وفات کی تحقیق پر سنینِ عمر کے اندازے کو ترجیح دیتے ہیں، کیونکہ ان کے طریق کار کی روشنی

---

[1] میر کے تذکرے سے بھی مصحفی یقیناً ناواقف نہ ہوں گے لیکن نہ تو ان کے ہاں اس کا کوئی حوالہ ملتا ہے اور نہ کہیں انھوں نے اس سے اپنی واقفیت ظاہر کی ہے۔

[2] مصحفی کا بیان ہے کہ "شیخ مذکور در تذکرۂ فتح علی خاں حسینی ۔۔۔۔ بطوع و رغبتِ خود، خود را شاگردِ میر و درد نویسانیدہ" لیکن اس تذکرے کے مطبوعہ نسخے میں بقا کا ذکر نہیں۔

میں شعور کی بالیدگی اور فن کی پختگی کے باہمی رشتے کی تلاش کے لیے یہی کافی ہے مثال کے طور پر اپنے بعض تلامذہ کے متعلق ان کے یہ بیانات ملاحظہ ہوں:

(الف) تنہا:۔ "محمد عیسیٰ نام دارد۔ وطنِ بزرگانش شاہجہاں آباد وخودش در لکھنؤ تولد یافتہ۔ عمرش قریب بست وہفت رسیدہ۔ جوانِ صلاحیت شعار، خوش اطوار۔ از ابتدائے عمر بسبب موزونیٔ طبع چیزے موزوں می کرد۔ حالا آنچہ گفتہ و می گوید از نظرِ فقیر می گذراند ..... شوقِ مرثیہ خوانی و گفتنِ سلام ہم دارد و روزگار در فرقہ سیاہ گری بسر نماید۔" (ص ۵۱)

(ب) تسلّی:۔ "لالہ ٹیکا رام پسر گوپال رائے بخشی برادرِ خورد لالہ بھولا ناتھ کہ خدمتِ دیوانیٔ کچہری بخشی گریٔ فوجِ نواب وزیر بکلی تعلقِ بایشاں دارد۔ جوانے است مہذب الاخلاق۔ خصوصاً بہ اہلِ کمال ہر فن بہ تواضع و تعظیم پیش می آید۔ وطنِ بزرگانش موضع کرہل قریب بہ اٹاوہ وخودش در لکھنؤ نشو ونما یافتہ۔ چوں از ابتدائے عمر ذوقِ موزونیٔ شعر دل نشینِ خاطر بود، حالا کہ بفضلِ الٰہی سن عمرش از بست و پنج متجاوز خواہد بود، شعر ہندی و فارسی بہ سلیقہ تمام می گوید۔ اما در بندِ شہرت نیست۔ اکثر مثنوی ہا و دواوینِ اساتذہ جمع ساختہ و انتخاب زدہ نویسانیدہ۔ چنانچہ فقیر ہم یک دیوانِ فارسی و دو دیوانِ ہندیٔ خود مع تذکرہ فارسی حسب الارشاد نوشتہ دادہ و دیوانِ اولِ فقیر را در عالمِ مکتب نشینی کہ فقیر دراں روزہا نو واردِ ایں شہر بود، از کمالِ اشتیاق آدم فرستادہ طلبیدہ بدستِ خود در عرصۂ قلیل نقل گرفتہ اگرچہ ذہانتِ طبعش چنداں محتاجِ شنوہ نیست اما احتیاطاً اشعارِ فارسی را از نظر مرزا محمد فاخر مکین می گذراند و دہ پانزدہ غزل ہندی کہ گفتہ مشاطگی آں موقوف برائے

فقیر داشتہ۔" (ص ص ۵۵ و ۵۶)

(ج) خلیق :۔ "میر مستحسن خلیق برادر خورد میر احسن (خلق) از شانزدہ سالگی شوقِ شعر پیدا کردہ چیزے بخیالِ خویش موزوں می کرد و درست و نادرستش را والدِ بزرگوارش (میر حسن) ..... درست کردہ می داد اما آن ہم در عالمِ خوردی زیادہ از ذہنش معلوم می شد۔ چوں دراں ایام فقیر تازہ واردِ ایں شہر بود، مشارٌ الیہ (میر حسن) بعد ملاقاتِ چند بسیار محظوظ شدہ برائے ازدیادِ بنائے خلت و وداد آں عزیز را پیشِ من فرستاد و آموختہ کرد کہ ایشاں دریں فن نظیر ندارند۔ اکنوں کہ فرصتِ وقت است، تا می توانی چیزے از ایشاں بیاموز۔ مومی الیہ انقیادِ امرِ والدِ ماجد را واجب شمردہ، برہنمونیٔ شوقِ روز افزوں اکثر حاضر می ماند و مشورۂ شعر از من می گرفت۔ بندہ مناسبت طبعش بہ شعر دریافتہ درہماں ایام گفتہ بودم کہ اگر زمانہ فرصت خواہد داد، خوب خواہد گفت۔" (ص ۹۰)

(د) رنگین :۔ "سعادت یار خاں رنگین پسرِ طہماسپ بیگ خاں تورانی کہ مشارٌ الیہ در عہد نواب نجف خاں مرحوم اقتدار کلی داشت جوانِ فہمیدہ و سنجیدہ ..... ہر چند چنداں بہرۂ از علم ندارد، اما ذکاوتِ طبعش بر صاحب علمان غالب۔ در ایامِ آغازِ شوقِ شعر تا در دہلی بود، شعرِ خود را از نظرِ شاہ حاتم علیہ الرحمہ می گذرانید۔ حالا کہ بفضلِ الٰہی در نظم کلام ترقی و امتیازِ تمام پیدا کردہ، از راہ انصاف دیوانِ خود را از اول تا آخر بہ نظر مولف در آوردہ۔ کلامش بسیار کم اصلاح برآمدہ و چوں مزاجش عشق باز افتادہ، اکثر قطعہائے خوب و غزل و نامہ ہائے نغز نغز بہ سلکِ نظم کشیدہ۔ ہمہ بہ حضورِ مرشد زادۂ آفاق مرزا محمد سلیمان شکوہ بہادر دام اقبالہ حاضر می باشد و تقرب و امتیازِ

تمام دارد۔" (ص ۱۰۱)

(۷۸) صبا :۔" لالہ کانجی مل صبا تخلص، قوم کایستھ۔ وطن بزرگانش فیروز آباد خودش در لکھنؤ نشو و نما یافتہ۔ فقیر در ایامے کہ واردِ ایں شہر بود، چندے حسبِ اتفاق بر مکانِ ایشاں اقامت داشت۔ مشارٌالیہ دراں ایام بمقتضائے موزونیٔ طبع شوقِ شعر پیدا کردہ چیزے کہ بزبانِ خود می گفت، آں را از نظرِ فقیر باعتقاد تمام می گذرانید تا ایں کہ در عرصۂ قلیل دیوانِ مختصرے درست ساخت۔ طبعش بخیالِ شعر بسیار مناسب افتادہ بود۔ اگر عمرش وفا می کرد، زیادہ ازیں قدم بر جادۂ ترقی می نہاد۔ اما حیف کہ بہ عمر بست و پنج سالگی در عینِ جوانی مذوق شدہ درگذشت۔" (ص ص ۱۴۱ و ۱۴۲)

(۷۹) منتظر :۔" میاں نورالاسلام منتظر تخلص ولد شاہ فیض علی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ جوانِ صلاحیت شعار و وارستہ مزاج و شوریدہ سر است۔ تحصیلِ عربی تا صرف و نحو دارد و اکثر کتبِ درسیٔ نظم و نثرِ فارسی ہم بخوبی خواندہ۔ از دہ دوازدہ سالگی طبعِ موزوں داشت۔ چوں شعر و سخن تواماں است، در ہماں ایامِ شباب جائے تعلقِ خاطر بہم رسانیدہ تا دہ دوازدہ سالِ دیگر خود را بہ تقاضائے دل فریبیٔ محبوب مصروفِ فکر شعر داشتہ، اوقات شبان روزی را مثلِ مجنونان صرف می کرد۔ از ہشت سال برائے مشورۂ کلامِ خویش پیش فقیر آمد و شد دارد۔ ہرگز دریں عرصہ باوجودِ کم ملاقاتی و فصل سال و ماہ مثلِ دیگراں رجوع بطرف دیگر نکردہ۔ اگرچہ بعض اشخاص ذہانتِ طبعش را دیدہ بسیار خواستند کہ او را بہ طریقے بہ حلقۂ بیعتِ خویش کشند، ہرگز التفات نکردہ تا آں کہ بر کتبِ راسخ الاعتقادی خویش بمقامِ والائے شاعری رسیدہ حالا برائے کلہ شکنی آنہا برابر من

موجود است ..... غرض کہ از شاگردانِ رشید ایں خاکسار بے مقدار
است عمرش تا امروز بست و پنج سالہ باشد۔" (ص ۲۳۴)

ہر استاد کو اپنے لائق اور با صلاحیت شاگردوں کے ساتھ ایک قسم کی جذباتی وابستگی ہوتی ہے جس کے تقاضوں کو وہ ان سے متعلق گفتگو کے وقت نظر انداز نہیں کر سکتا۔ مصحفی کے یہ بیانات بھی اس تعلق خاطر کے اثرات سے خالی نہیں۔ لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ جس خصوصی توجہ کی کارفرمائی یہاں نظر آتی ہے، وہ دوسرے مقامات پر معدوم ہے۔ مصحفی نے ان تمام لوگوں کے ذکر میں جن کے حالات سے وہ کماحقہٗ واقف اور مرتبۂ سخن سے پوری طرح آگاہ تھے، اسی مفصل بیانی کا ثبوت دیا ہے۔ ہم یہاں اس قسم کی صرف تین مثالیں پیش کریں گے۔

(الف) میر حسنؒ "میر غلام حسن، حسنؔ تخلص ولد میر غلام حسین ضاحکؔ وطن بزرگانش ہرات است و خودش در شاہجہان آباد تولد یافتہ و بہ عمرِ دوازدہ سالگی قضا اورا بطرفِ پورب افگندہ۔ بقیہ عمر در فیض آباد و لکھنؤ گذرانیدہ۔ در سرکارِ نواب سالار جنگ بہادر یعنی بہ رفاقتِ سردار جنگ بہادر خلفِ نواب موصوف ممتاز بودہ۔ چوں از اوائل عمر طبعش موزوں بود، اکثر خود را مشغول بایں شغلِ خطیر می داشت و شعرِ خود از نظر میر ضیاء الدین ضیاؔ کہ دراں ایام ایشاں از مستعدانِ زمانہ دریں دیار بودند، می گذرانید۔ بعد ازاں کہ دورِ دورِ مرزا رفیع شد و زبانِ ریختہ چناں کہ بود زیادہ براں دریں دیار رواج یافت، بحکمِ قوتِ ممیزہ قدم بر جادۂ مستقیمِ اساتذۂ مسلم الثبوت یعنی خواجہ میر درد، مرزا رفیع سوداؔ و میر محمد تقی میرؔ گذاشتہ کلامِ خود را بمرتبۂ پاکیزگی و شستگی رسانیدہ۔ دیوان ضخیم و مثنوی ہائے متعددہ در سلک نظم کشیدہ ..... تا زندہ بود با فقیر بسیار رابطہ دوستی درست داشت۔

در عشرۂ ماہِ محرم رحلت اوست۔ عمرش از شصت متجاوز خواہد
بود۔ فقیر تاریخِ رحلتش چنیں یافتہ۔ تاریخ

چوں حسنؔ آں بلبلِ خوش داستاں
رو ازیں گلزار رنگ و بو بتافت
بس کہ شیریں بود نطقش مصحفی
"شاعرِ شیریں زباں" تاریخ یافت"

(ص ص ۶۸ و ۶۹)

(ب) شاہ حاتم:۔ "شیخ ظہور الدین حاتم کہ شاہ حاتم گفتہ می شد، مولدش شاہجہان آباد
است۔ تاریخ تولدش بقولے از حرفِ "ظہور" برمی آید۔ ہمیشہ
عمدہ معاش بودہ و اوقات بخوبی گذرانیدہ۔ مردِ سپاہی پیشہ از
ہندوستان زایانِ قدیم بود۔ روزے پیشِ فقیر نقل می کرد کہ در سنِ
دویم فردوس آرام گاہ دیوانِ ولی در شاہجہان آباد آمدہ و اشعارش
بر زبان خورد و بزرگ جاری گشتہ۔ با دو سہ کس کہ مراد از ناجیؔ و
مضمونؔ و آبروؔ باشد، بنائے شعرِ ہندی را بہ ایہام گوئی نہادہ دادِ
معنی یابی و تلاشِ مضمون تازہ می دادیم۔ غرض کہ از شعرائے
متقدمین است۔ در ایامے کہ فقیر در شاہجہان آباد طرح مشاعرہ
انداختہ، اکثر بعد مغرب در مشاعرہ قدم رنجہ می فرمود و در مجلس نشستہ
زمانۂ سابقِ خود را می ستود۔ الحال کہ در دورۂ ما زبانِ ریختہ بسیار
بپاکیزگی و عمدگی رسیدہ، مشارٌ الیہ ہم مرتبہ سخنِ تازہ گویاں فہمیدہ
دیوانِ قدیم خود را از طاقِ دل افگندہ دیوانِ جدید بزبان ریختہ
گویانِ حال ترتیب دادہ و "دیوان زادہ" نامش گذاشتہ۔ اما بسببِ
طوالتِ عمر بعض مردمِ دور دست را اشتباہِ حاتم دویم می افتاد،
برطرف کرد و بحورِ اشعار را ہم جدا جدا از سرخی بر سرِ ہر غزل نوشتہ

وایں ایجادِ اوست۔ وازیں کہ در درازیٔ عمر و قدامتِ شعر از ہمہ پیشتر است، نغمہ سنجانِ حال و وضیع و شریف اورا استادِ مسلم الثبوت می دانند، بلکہ او خود اسامیٔ کسانے کہ از اول تا آخر استفادہ شعر ازو گرفتہ اند، بر دو سہ ورق بطریق فہرست بر پشتِ سرلوحِ دیوانِ خود نوشتہ چسپانیدہ تا معلوم کساں گردد کہ حاتم ایں قدر شاگرد داشت و در آں جملہ اسم مرزا رفیع سودا ہم کہ باتفاقِ ہمہ یکے از سرآمدِ شعرائے ہندی گویانِ ایں دیار گذشتہ، مسطور است، والحق کہ دروغ نیست۔ قیاسِ استادیش ازیں جا باید کرد و نیز بنابراں میر محمد تقی میرؔ کہ شاعرے است جادو کار، اکثر اورا در مشاعرہ بطریقِ ظرافت "داہ الشعرا" می گفت۔ چوں دو چار جزو مسودۂ شعرِ فارسی ہم بطور صائبؔ داشت، لہٰذا پیشتر ازیں در تذکرۂ فارسی احوالِ او معہ تاریخ رحلتش صورت تحریر یافتہ۔"

(ص ص ۸۰ و ۸۱)

(ج) قائمؔ چاندپوری:۔ "قیام الدین علی (عرف محمد قائم) قائمؔ تخلص، اگرچہ وطنش قصبہ چاندپور است اما بسببِ توسل نوکریٔ بادشاہی اکثر در شاہجہان آباد می بود و دراں روزہا در توپ خانہ ہم اسامی داشت بمقتضائے موزونیٔ طبع و استعدادِ درست آں چہ کہ موزوں می کرد، از نظرِ مرزا رفیع می گذرانید و بخواجہ میر درد نیز اعتقاد داشتہ، فقیر اورا در ایام ذوموی بہ لباسِ درویشی در سرکارِ نواب محمد یار خاں کہ دراں روزہا تازہ وارد بود، دیدہ ۔۔۔۔۔۔۔ دراں ایام باعثِ قصیدہ خواندن و نوکر شدن مولف در سرکارِ نواب موصوف ایں بزرگ شدہ بود۔ با فقیر در عرصۂ قلیل بسببِ سلیم مزاجی و نسبت تامِ شاعری رابطۂ شدید بہم رسانیدہ۔ کاغذ ہائے

مسودۂ اشعارِ نواب راکہ برائے اصلاح پیشِ او می آمد، ازکم دماغی
بدستِ مشورۂ فقیر می داد۔ چنانچہ سہ ماہ بہمیں طور یکجا گذرانیدہ ایم
وشام وچاشت بہ یک سفرہ کردہ ..... الحاصل بعد برہم
خوردن آبادیٔ کٹھیر وصورت گرفتنِ کارِ فیض اللہ خاں رام پور
والا بہ سرکارِ نواب احمد یار خاں پسرِ نوابِ موصوف دخیل شدہ
چیزے موافقِ زمانہ تقرر داشت۔ اما اوقاتش دراں بفراغت
نمی گذشت۔ لہذا برائے رہا کردنِ دیہاتِ قدیم ملک ویومیہ
وغیرہ قصبۂ مذکور در لکھنؤ گذرافگندہ واز راجہ ٹکیت رائے بہادر
شقہ جات وپروانہ جات بنامِ عاملِ آنجا درست کنانیدہ
بردہ بود کہ بعدِ فائز شدن برمطلب اجلش در رام پور رسید وخبرِ
وفاتش شہر بشہر انتظار یافت۔" (ص ص ۱۷۹۔۱۸۰)

پچھلے صفحات میں نقل کیے ہوئے تعارفی خاکوں کے برخلاف ان میں سے پہلے دو اقتباسات میں تواریخ وسنین کے حوالے دینے کی بھی کوشش کی گئی ہے۔ "تذکرۂ ہندی" میں اگرچہ اس قسم کے حوالوں کی تعداد بے انتہا قلیل اور ناقابلِ لحاظ ہے لیکن اس قلت کی بنا پر تذکرے میں خالص تاریخی نوعیت کی معلومات کے فقدان کا شکوہ درست نہ ہوگا۔ کیونکہ مصحفی کے بیانات میں ایسے قرائن بہرحال کثرت سے موجود ہیں جن کی روشنی میں تھوڑی سی کدوکاوش کے بعد بہ آسانی زمانے کا تعین کیا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ تاریخ صرف سنین کے التزام کے ساتھ بیان کیے ہوئے واقعات کا مجموعہ نہیں ہوتی، اس فضا اور ماحول کا مطالعہ بھی جس کے جلو میں ادب وزندگی کا تیز گام قافلہ آگے بڑھتا ہے، اس کے حدود میں شامل ہے۔ اس لحاظ سے ہماری نگاہ میں مصحفی کا وقار کچھ اور بلند ہوجاتا ہے کیونکہ انھوں نے اپنے دور کی ادبی فضا کو جس خوش اسلوبی کے ساتھ اپنے تذکروں میں سمویا ہے، اس کی مثال ان سے قبل کے تذکرہ نگاروں کے ہاں کم نظر آتی ہے۔

مصحفی پر ایک اعتراض یہ بھی کیا جا سکتا ہے کہ بعض شعرا کے بارے میں ان کے بیانات حد درجہ مختصر اور تشنہ ہیں۔ اس خیال سے کسی حد تک ہم کو بھی اتفاق ہے لیکن اس کے ساتھ ہی اس امرِ واقعہ کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ ان کے ہاں جا بجا جس اختصار یا تشنگی کا احساس ہوتا ہے وہ کلیتہً بے سبب نہیں۔ یہ بات تو مصحفی پہلے ہی بتا چکے ہیں کہ انھوں نے اس تذکرے میں کچھ شاعروں کے نام محض "بطریقِ تیمن" شامل کیے ہیں۔ اس لیے کم از کم ایسے شعرا کے سلسلے میں ہمیں ان سے قطعاً کسی تفصیل کی توقع نہ رکھنا چاہیے۔ دوسری بات جس کا لحاظ رکھے بغیر ہم ان کے ساتھ انصاف نہیں کر سکتے، یہ ہے کہ "تذکرۂ ہندی" میں ایک خاصی تعداد ان مشہور و معروف شعرا کی بھی ہے جنھیں وہ پہلے ہی شعرائے فارسی کی حیثیت سے تذکرہ "عقدِ ثریا" میں متعارف کرا چکے تھے۔ انھوں نے ان کے متعلق ان تمام باتوں کا جو وہاں لکھی جا چکی تھیں، اس تذکرے میں دوبارہ ذکر کرنا ضروری نہ سمجھا۔ شاہ حاتم، مرزا محمد رفیع سودا، میر تقی میر اور مرزا مظہر کے نام اس ضمن میں خصوصیت کے ساتھ بطور مثال پیش کیے جا سکتے ہیں۔ ان چاروں اساتذہ کے بارے میں "عقدِ ثریا" اور "تذکرۂ ہندی" کے مندرجات کو یکجا کر لیا جائے تو صنفِ تذکرہ کے محدود تقاضوں کے مطابق چند بہترین خاکے مرتب ہو سکتے ہیں۔

تیسری قابلِ لحاظ بات یہ ہے کہ مصحفی حسنِ فکر کے پرستار اور ندرتِ بیان کے قدر شناس تھے۔ وہ کسی ایسے شعر کو جو ان کی نگاہِ انتخاب میں جگہ پا چکا تھا محض اس کے مصنف سے ناواقفیت کی بنا پر نظر انداز نہیں کرنا چاہتے تھے۔ بعض شعرا کے اشعار انھیں مکتب نشینی کے زمانے سے یاد تھے، بعض لوگوں کا کلام کسی مشاعرے یا نجی صحبت میں سننے کا اتفاق ہوا تھا۔ ان تمام صورتوں میں انھیں لامحالہ اختصار سے کام لینا پڑا اور اس کے نتیجے میں ان کے تعارفی بیانات میں تشنگی باقی رہ گئی، جس کا انھیں خود بھی احساس تھا۔ تذکرے کے آخر میں ان کا یہ بیان کہ "احوال بعضے از متقدمین کہ کما ینبغی آگاہی بر اوقاتِ آنہا حاصل نبود، بطورِ بیاض سمتِ تحریر یافتہ" اس

حقیقت کا آئینہ دار ہے۔ اس کے علاوہ بھی انھوں نے متعدد مقامات پر اپنی مختصر نگاری کے اسباب کی طرف اشارے کر دیے ہیں۔ مثال کے لیے درج ذیل اقتباسات ملاحظہ ہوں:

(الف) بیتاب: "نمی دانم کہ بود، ایں قدر دانم کہ شاگردِ محمد قائم است۔ مقطعش کہ از زبانِ ایشاں شنیدہ بودم بیاد ماندہ۔" (ص ۴۱)

(ب) صفا: "ہیچ از نام و نشانش خبر ندارم۔ مطلعے از و بسمع رسیدہ۔" (ص ۱۴)

(ج) عشقی مرادآبادی: "فقیر او را در آنولہ دیدہ بود، شعرے از و بخاطر است۔" (ص ۱۵۲)

(د) محشر بدایونی: "ہیچ از احوالش خبر ندارم۔ یک غزلش بر بیاض کہنہ کہ از مدتے پیش فقیر است، مسطور بود۔ چوں اندکے در سلیقۂ سخن درست می نماید، حوالہ کاغذ کردہ شد۔" (ص ۲۲۸)

(ہ) نجف: "ہیچ از نام و نشانش خبر ندارم۔ دو سہ غزلش بر بیاضے نوشتہ دیدم چوں رہ بدرستی داشت، نقل گرفتہ شد۔" (ص ۲۶۲)

مصحفی کی بعض تحریروں سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے کچھ نو مشق شاعروں کے نام محض ہمت افزائی کی غرض سے اس تذکرے میں شامل کر لیے تھے، درحقیقت ان کا مفصل تعارف مقصود نہ تھا۔ اس ضمن میں ہم "ریاض الفصحا" سے صرف ایک قول کا حوالہ دیں گے جو میر سعادت علی تسکین سے متعلق ہے۔ لکھتے ہیں:

"دو شعر ایشان حسبِ اتفاق در تذکرۂ ہندی اول بقلم آمدہ بودند دراں روزہا ایں قدر نشو و نما نمی داشت۔" (ص ۵۸)

شاعر کی افتادِ طبع، اس کے عادات و خصائل اور سیرت و کردار کا اس کے فن پر خاصا اثر پڑتا ہے، مصحفی اس رمز سے بخوبی واقف ہیں۔ چنانچہ انھوں نے شخصیت کے ان پہلوؤں کے مطالعے پر کافی زور دیا ہے۔ بالخصوص مزاج و طبیعت کی ان حاوی خصوصیات کے متعلق اظہارِ خیال میں انھوں نے کوئی کوتاہی نہیں کی ہے جن کی روشنی میں کسی خاص صنفِ سخن یا نئی تحریک سے شاعر کی دل چسپی کے

اسباب وعلل کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ سطورِ ذیل میں اس قسم کی کچھ مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

(الف) بقا اکبر آبادی: "جوانِ سراپا خلق وظریف مزاج وقانع دیدمش۔ طبعِ شوخش بطرفِ ہجو بسیار مائل افتادہ۔ در شاہجہان آباد بامیر درد لکھنؤ بامرزا معرکہ گیری ہا کردہ۔" (ص ۴۳)

(ب) محمد پناہ خاں حکیم: "جوانِ خوش خلق وخوش اختلاط وعاشق پیشہ ودل بدرد رسیدہ دیدمش۔" (ص ۸۴)

(ج) خواجہ میر درد: "جامع جمیع فنونِ غریبہ بود ودر فقر وتوکل واستغنا نظیر نداشت۔ شمۂ بیانِ بے پروائیش ایں کہ روزے حضرت ظل سبحانی برائے زیارتِ ایشاں آمدہ بودند۔ بعدِ نشستن در مجلس عذرِ درد بہ میاں آوردہ اند کے پا را دراز ساختند۔ مشارٌ الیہ از مشاہدۂ ایں حالت ایں منغض شدہ ایں قاعدہ را خلاف معمول دانستہ خود ہم بطرفِ بادشاہ پا دراز ساخت۔" (ص ص ۹۲ و ۹۳)

(د) مرزا عظیم بیگ عظیم: "چند روز در فرخ آباد کسوتِ قلندری برخود راست (کردہ بود) حالا باز در لباسِ دنیائی آمدہ۔ فقیر اورا در شاہجہان آباد دیدہ ..... اکثر در مشاعرہ ہا می آمد وبر صدرِ مجلس می نشست۔ دعوائے شاعری خیلے در دماغش جا داشت۔ ہیچ کس را بخاطر نمی آورد۔ وخود را از ہمہ ممتاز می دانست، باآں کہ ہیچ علم وفن ندارد۔"

(ص ص ۱۴۹ و ۱۵۰)

(ہ) فدوی لاہوری: "دعوائے شاعری خیلے در دماغش جا داشت وزیادہ از مرتبۂ شاعری قدم در راہِ امرد پرستی می گذاشت۔ چند جا

خانہ جنگی ہم کردہ و بہ کودکانِ حسین تعشق ورزیدہ۔ اکثر
اعضایش دیدم کہ مجروح بودند۔ در ایامے کہ از شاہجہان آباد
در کٹھیر آمد، در اروزہا فقیر در آنولہ بود کہ شورش او بسمع رسیدہ۔
آخر روزے برائے دیدنش رفتم۔ او باشے چند گردِ او نشستہ
دیدم۔" (ص ص ۱۶۶ و ۱۶۷)

(و) نواب محبت خاں محبت: "جوانیست بزیورِ فضل و کمال و حلم و حیا آراستہ و در
علم آداب و طریقِ سلوک و تہذیبِ اخلاقِ بہ اعالی و ادانی
ظاہر و باطنش بہ یکتائی پیراستہ ۔۔۔۔۔ بندہ اورا در لکھنؤ
دیدہ۔ بسیار بخوبی پیش می آید۔" (ص ۲۱۳)

ان بیانات میں مصحفی کے حسن وصفِ خاص کی جھلک شروع سے آخر تک نمایاں ہے وہ ان کی حق گوئی اور راست بازی ہے۔ انھوں نے بیجا تعریف اور بے سبب تنقیص دونوں ہی سے اپنا دامن بچائے رکھا ہے۔ وہ جہاں محاسن سیرت و اخلاق کے اعتراف میں فراخ دلی کا ثبوت دیتے ہیں وہیں ان کے اندر شخصیت کے ناپسندیدہ پہلوؤں کے محاسبے کی جرأت بھی موجود ہے۔ لیکن نہ تو ان کی ستائش قصیدہ سرائی کے حدود میں داخل ہوتی ہے اور نہ ان کے احتساب کا لہجہ درشت اور زہرناک ہوتا ہے۔

تنقید کلام کے معاملے میں بھی مصحفی نے اپنی دیانت داری، احتیاط پسندی اور اصابت رائے کا بھرم قائم رکھا ہے۔ وہ ان لوگوں کی شاعری کے بارے میں جن کے سرمایۂ فکر پر ان کی نگاہ پوری طرح حاوی نہ تھی بالعموم کوئی رائے ظاہر نہیں کرتے لیکن جن شاعروں کے دواوین یا دوسری منظوم تصانیف ان کی نظر سے گزر چکی تھیں یا مشاعروں یا نجی ملاقاتوں میں بار بار ان کے اشعار سننے کا موقع ملا تھا، ان کی فنی کاوشوں کے حسن و قبح اور مرتبہ و معیار سے اپنے قارئین کو ضرور آگاہ کرتے ہیں۔ نقد و نظر کے اس میدان میں ان کی آمد بڑی پر اعتماد اور پر وقار

ہوتی ہے۔ وہ اساتذہ کی خدمات کا پوری وسیع القلبی کے ساتھ اعتراف کرتے ہیں لیکن ان کی عظمت سے مرعوب نہیں ہوتے۔ احباب اور معاصرین کے کلام کے متعلق صحیح رائے دیتے ہیں، صرف دوستی کا حق نہیں نبھاتے۔ نوجوان تلامذہ اور نومشق فنکاروں کے کمالات کو بنظر استحسان دیکھتے ہیں مگر ان کی تعریف و توصیف میں مبالغے سے کام نہیں لیتے۔ مختصر یہ کہ مصحفی صرف سخن فہم ہیں، ان کی تنقید ذاتیات کی سطح سے بلند اور ان کی تحسین و تنقیص ٹھوس بنیادوں پر مبنی ہوتی ہے۔ مندرجہ ذیل مثالوں سے ان کی ان خصوصیات کا اندازہ ہوگا۔

(الف) بقا اکبرآبادی:۔ "در غزل وغیرہ تلاشِ بسیار می کند، اما در قصیدہ خیلے یدِ طولیٰ دارد۔ ہرچہ می گوید بسیار بتلاش و علو می گوید۔ اما در گفتنِ غزل بطی است۔۔۔۔۔" (ص ۴۳)

(ب) میر حسن:۔ "قدم بر جادۂ مستقیم اساتذۂ مسلم الثبوت یعنی خواجہ میر درد و مرزا رفیع سودا و میر محمد تقی میر گذاشتہ کلام خود را بمرتبۂ پاکیزگی و شستگی رسانیدہ۔ دیوانِ ضخیم و مثنوی ہائے متعددہ در سلکِ نظم کشیدہ۔ خصوصاً در مثنوی آخر کہ سحر البیان نام دارد، یدِ بیضا نمودہ۔ الحق کہ کارِ کارِ اوست۔ قطع نظر از بلاغت شاعری زبانش بسیار بامزہ و شیریں و عالم پسند افتادہ۔"

(ص ۶۸)

(ج) سودا:۔ "در عصرِ خویش سرآمد شعرائے ریختہ گو گذشتہ۔ بعضے او را دریں فن بہ ملک الشعرائی پرستش می کنند۔ بعضے بسببِ دریافتِ اغلاطِ صریح و توارد صاف در بعضے اشعارش بہ جہل و سرقہ نیز نسبت می دہند۔ غرض ہرچہ بود در روانیٔ طبع نظیرِ خود نداشت۔ غزل ہائے آبدار و قصیدہ ہائے سحر کار و ہجوہا و مثنوی ہائے متعددہ و غیرہم نگاشتۂ خامۂ خیالش

بر صفحۂ روزگار یادگار است ۔۔۔۔۔۔۔ اگر در مثال بندی اشعارِ غزل صائبؔ و قتش گویم بجاست و اگر در علوِ مراتبِ معانیٔ ابیاتِ قصیدہ خاقانیؔ (عصرش) گویم روا۔ نقاشِ اولِ نظمِ قصیدہ در زبانِ ریختہ اوست۔ حالا ہر کہ گوید پیرو و متبعش خواہد بود۔" (ص ۱۲۵)

(د) قائمؔ چاندپوری:۔ "در رنگینیٔ کلام و چستیٔ مصراع غزل در رویۂ قصیدہ و مثنوی وغیرہ موافقِ رواجِ زمانہ دوش بدوشِ استاد (مرزا سوداؔ) راہ می رود بلکہ در بعض مقام غلبہ می جوید۔" (ص ۱۷۹)

(ہ) مرزا مظہرؔ:۔ "در دورِ ایہام گویان اول کسے کہ شعرِ ریختہ بہ تتبع فارسی گفتہ اوست ۔۔۔۔۔۔ در تمام دیوانش فصاحت و بلاغت زبانِ استاد جلوۂ ظہور می دہد۔ فی الحقیقت نقاشِ اولِ زبانِ ریختہ بایں وتیرہ باعتقادِ فقیر مرزا است بعدہٗ تتبعش بدیگراں رسیدہ۔" (ص ۲۰۳)

(و) میر تقی میرؔ:۔ "اکثرے در فنِ ریختہ اورا در پلۂ مرزا رفیع سوداؔ گرفتہ اند و اکثر در غزل و مثنوی بہتر از مرزا قیاس می کنند و مرزا را در ہجو و قصیدہ برو فضیلت می دہند۔ غرض ہر چہ ہست، استادیٔ ریختہ برو مسلم است ۔۔۔۔۔۔ ہمہ ریختہ گویانِ ہند سند از کلامش می آرند و اورا دریں فن مستثنیٰ می دانند و الحق کہ چنیں است۔"

(ص ۲۰۴)

(ز) کنور سین مضطرؔ:۔ "در طبیعتش روانی بسیار معلوم می شود اما از بے اطلاعیٔ طرزِ شعر و محاورۂ زبان ناچار است۔ اگر چندے مشقِ سخن بہ سلیقۂ شاعری خواہد کرد، البتہ بجائے خواہد رسید۔"

(ص ۲۲۴)

(ح) صغیر علی مروت:۔ "گاہ گاہے کہ فکرِ شعر می کند، دراں تلاشِ معنی ہائے تازہ منظور می دارد۔ اکثر غزلش قصیدہ طور است و یک دو قصیدہ کہ گفتہ، خیال بندی را در و بطورِ سلیم وسعت دادہ۔ دریں کار رویۂ مرزا رفیع پیش نہادِ خاطرِ اوست ..... یک دو داستان (ہم) برویۂ مثنوی میر حسن در سلکِ نظم کشیدہ۔" (ص ۲۴۵)

(ط) نوا بدایونی:۔ "قصیدہ را بسیار بمتانت و سنگی بسر انجام می رساند۔ معہذا طرزِ نظمِ قصیدہ اش بسببِ اندراجِ لغاتِ عربی و فارسی از ابنائے زماں جدا است و بسیار فرق دارد و الحق کہ دریں کار ہر کہ باو در افتادہ، شکست فاحشہ خوردہ۔" (ص ۲۶۳)

(ی) یقین:۔ "در دورۂ ایہام گویان اول کسے کہ ریختہ را شستہ و رفتہ گفتہ ایں جواں بود۔ بعد ازاں تتبعش بدیگراں رسیدہ۔" (ص ۲۷۵)

تذکرۂ ہندی کی ایک اور خصوصیت جو ہمیں اپنی جانب متوجہ کرتی ہے، یہ ہے کہ اس کے مطالعے سے اٹھارویں صدی عیسوی کے اواخر کے ادبی ماحول کا ایک واضح نقشہ ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ اس زمانے میں نوابین و سلاطین کے درباروں اور امرا و رؤسا کی ڈیوڑھیوں کو سیاست و حکومت کی طرح ادب و تہذیب کے میدان میں بھی مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ اکثر و بیشتر ادبی سرگرمیوں کا محور یہی دربار اور ڈیوڑھیاں ہوتی تھیں۔ یہیں سے مشاق اور با صلاحیت سخنوروں کے جوہر چمکتے تھے اور یہیں تمام معاصرانہ چشمکوں اور حریفانہ معرکوں کا آتش فشاں تیار ہوتا تھا۔ ہر نواب اور رئیس کی سرکار سے چند شاعروں کی وابستگی ایک لازمی امر تھی۔ شعرا و امرا یا ادب اور دربار کے اس قریبی تعلق کا سبب صرف یہ نہ تھا کہ اہلِ ہنر اپنی معاشی فارغ البالی اور سماجی اعزاز کے لیے اہلِ دول کی دست نگری پر مجبور تھے بلکہ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ صاحبِ اقتدار افراد شعرا کی پرورش اور سرپرستی کو شانِ امارت

کا ایک جز اور شہرت و بقائے نام کا ایک ذریعہ تصور کرتے تھے۔ مصحفی کے ہاں درباری زندگی کے اس پہلو کی جھلک جگہ جگہ نمایاں ہے۔ نواب محمد یار خاں امیر رئیسِ ٹانڈہ (ضلع رام پور) کے ذکر میں لکھتے ہیں:

"در ایامے کہ بترغیب حکیم سنبھلی شوقِ شعرِ ہندی دامنِ دلش را بسوے خود کشید۔ خطے بطلبِ میر سوز و مرزا محمد رفیع نوشتہ روانہ کرد۔ چوں دراں ایام ایں ہر دو بزرگ در سرکارِ مہربان خاں رند تخلص بصیغۂ شاعری عزو امتیاز داشتند از فرخ آباد آمدنِ ایشان بہ ٹانڈہ کہ موضع بود و باشِ نواب بود، اتفاق نیفتاد۔ آخر کار میاں محمد قائم کہ دراں ایام در بسولی بودند، حسب الاشارہ آمدہ شرفِ ملازمتِ آن والاجناب دریافت و بدرماہۂ یک صد روپیہ عزو امتیازش دادہ بہ استادیش برداشت۔ و علیٰ ہذا القیاس دیگر سخن سنجان مثل فدوی لاہوری و میر محمد نعیم نعیم تخلص و پروانہ علی شاہ پروانہ مراد آبادی و میاں عشرت ہزال و حکیم کبیر صاحب کہ از قدیم در سرکارش بود و فقیر حقیر مصحفی از حاضرانِ مجلسِ او بود و ہر وقت کہ غزل طرح می فرمودند بسر انجام می رسانید۔۔۔۔۔" (ص ۱۳)

شہزادہ سلیمان شکوہ کے ذکر میں بھی مصحفی نے زیادہ تر زورِ قلم ان کی ادب نوازی اور ہنر پروری کی تعریف پر ہی صرف کیا ہے۔ مندرجہ ذیل بیان سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس غریب الدیار شہزادے کے دربار میں مرکزِ سلطنت سے دوری اور دولت و اقتدار سے محرومی کے باوجود اربابِ سخن کے لیے کس قدر سامانِ کشش موجود تھا لکھتے ہیں کہ

"بمقتضائے موزونیٔ طبع ..... اکثر رخش خیال را در میدانِ فصاحت می تازند و شعرِ خوب را از ہر کہ باشد دوست می دارند در ایامے کہ حکمِ ترتیبِ مجلسِ مشاعرہ شدہ بود، اکثرے از کاردانانِ ایں فن در حضور آمدہ حاضر می شدند۔ ایں فقیرِ حقیر ہم چوں نسبتِ دیگراں باوصفِ گوشہ نشینی دریں کار زیادہ رسوائی داشت، بگفتۂ میر انشاء اللہ خاں حسب الطلبِ حضور باوصف کم بغلی و شکستہ حالی شریک

مجلس یاراں شدہ بود چنانچہ درہماں تاریخ بحلقۂ ملازمانِ حضور درآمد و بعدِ چندے از کلامِ فقیر محظوظ شدہ درجائزۂ قصائدِ مدحیہ کہ مشتمل بر تہنیتِ عیدین بودند، بانعام تبریک مکرر سرِ احقر را از حضیض خاک باوجِ افلاک رسانیدند و ہم چنیں قلندر بخش جرأت کہ پس از فقیر بعدِ سہ چہار ماہ دولتِ ملازمتِ حضور حاصل نمودہ بنوازشِ خسروانہ درآمدہ و نیز نوکر شدہ و میر سوز ..... دراوائلِ مشاعرہ بہ انعام یک دوشالہ و یک پٹو سرفرازی یافتہ ..... و میر انشاء اللہ خاں کہ بہ نائب و مختارِ حضور یعنی خاں صاحب و قبلہ خان زاد (خانہ زاد) خان بہادر کہ ایشان در شعر فہمی و نثر نویسی نظیرِ خود ندارند، صیغۂ اخوت خواندہ اند، ہمیشہ موردِ گوناگوں الطافِ خسروی می باشند و چند بار بہ انعامِ لائقہ قبا و گوشوارۂ سرمباہات برافراختہ اند۔ حق تعالیٰ ایں قدر شناسِ شعراء را کہ دریں زمانۂ دوں قدرِ سخن با خاک یکساں شدہ بر تختِ سلطنت و جہاں بانی زد و مسلط گرداناد ....."۔ (ص ۱۲۱)

درباروں سے باہر عام اربابِ ذوق اور اہلِ سخن کی بزم آرائیاں خدمتِ زبان و ادب کا ایک ذریعہ اور شعر و شاعری کی مقبولیت کا ایک نشان تھیں۔ مصحفی نے ایسی متعدد محفلوں کا ذکر کیا ہے۔ دہلی کے زمانۂ قیام میں وہ خود اپنے مکان پر ایک مجلسِ مشاعرہ منعقد کرتے تھے[۱] ثناء اللہ خاں فراق کو بھی اس قسم کی مجلسوں کے اہتمام سے کافی دل چسپی تھی[۲] لکھنؤ میں مصحفی کی آمد کے بعد سب سے پہلے مرزا رضا قلی آشفتہ نے مشاعرہ منعقد کیا[۳]۔ ان مشاعروں کو جہاں بہت سے نامور اساتذہ اپنی موجودگی سے رونق بخشتے تھے وہیں ان کے شرکاء میں ایک بڑی تعداد بساطِ سخن کے تازہ واردین

---

[۱] مصحفی نے میر امانی اسد (ص ۱۶) امین الدین خاں امین (ص ۱۹ و ۲۰) غلام اشرف افسر (ص ۲۸) اور دوسرے کئی شاعروں کے حالات میں اس مشاعرے کا ذکر کیا ہے۔

[۲] "اکثر بانیٔ صحبتِ مشاعرہ ہا او بود" (ص ۱۵۷)

[۳] "در ایامے کہ فقیر از شاہجہان آباد در لکھنؤ آمدہ، اول طرح مشاعرہ او نداختہ" (ص ۱۸ و ۱۹)

کی بھی ہوتی تھی۔ تہذیبِ فکر و فن کے نقطۂ نظر سے قدیم و جدید کا یہ اتصال جو اہمیت رکھتا ہے، وہ شرح و بیان کی محتاج نہیں۔

"تذکرۂ ہندی" کا یہ جائزہ نامکمل رہے گا اگر ان خامیوں اور فروگذاشتوں کا ذکر نہ کیا جائے جو اس تذکرے میں بعض جگہ نظر آتی ہیں۔ مصحفی نے چونکہ زیادہ تر ذاتی معلومات اور چشم دید حالات و واقعات کے بیان سے سروکار رکھا ہے، اس لیے ان سے بہت کم لغزشیں ہوئی ہیں پھر بھی کہیں کہیں ان کے بیانات صحت اور صداقت کے معیار پر پورے نہیں اترتے، یا ان کی تحقیق و تلاش کی کمی واضح طور پر محسوس ہوتی ہے مثلاً:

(الف) جوشش عظیم آبادی کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

"محمد عابد جوشش تخلص ..... فقیر اورا ندیدہ دو شعر از وبہم رسیدہ۔

ایں است

تمھارے در پہ جو درباں نے آستیں پکڑی
برنگِ نقشِ قدم ہم نے بھی زمیں پکڑی

جوں آئینہ یہ ستم رسیدہ رہتا ہے مدام آبدیدہ" (ص ۶۰)

محمد عابد اور جوشش دو مختلف شخصیتیں ہیں۔ اول الذکر کا تخلص دلؔ اور ثانی الذکر کا نام محمد روشن ہے[1]۔ یہ دونوں حقیقی بھائی تھے۔ مصحفی نے جس طرح کسی غلط فہمی کی بنا پر ان دونوں بھائیوں کے نام و تخلص کو باہم مخلوط کر دیا ہے، اسی طرح ان سے اشعار کے انتساب میں بھی غلطی ہوئی ہے۔ ان کے نقل کیے ہوئے ان دو شعروں میں سے پہلا شعر محمد عابد دلؔ کا ہے[2] اور دوسرا محمد روشن جوشش کی تصنیف ہے[3]۔

---

[1] مصحفی نے "ریاض الفصحا" میں خود بھی محمد روشن جوشش اور محمد عابد دلؔ کو دو مختلف شاعروں کی حیثیت سے روشناس کرایا ہے (ص ۶۸ و ص ۹۳)

[2] تذکرۂ شورش۔ دو تذکرے جلد اول ص ۳۰۴، گلزار ابراہیم ص ۸۷، و تذکرۂ عشقی۔ دو تذکرے جلد اول ص ۲۸۴

[3] دیوانِ جوشش مرتبہ قاضی عبدالودود ص ۱۴۸، تذکرۂ شورش ص ۱۷۱ و گلزار ابراہیم ص ۱۶۴

(ب) حزیں کے بارے میں مصحفی کا بیان ہے :

"از نامش خبر ندارم۔ از دورِ فردوس آرام گاہ کسے خواہد بود سہ شعرش از عالمِ مکتب نشینی بیاد ماندہ است

اس بے وفا کے عشق میں کچھ ہم کو حبس نہیں — پاؤں تلک بھی اس کے ہمیں دسترس نہیں
ویراں ہوا خزاں سے چمن یاں تلک کہ ہم — چاہیں کہ جل مریں تو کہیں خار و خس نہیں
اس فصلِ گل میں کیوں نہ گریباں کو کیجے چاک — جاتی ہے یوں بہار حزیں ہائے بس نہیں"

(ص ۷۹)

یہ اشعار میر محمد باقر حزیں اکبر آبادی شاگردِ مرزا مظہر کی تصنیف ہیں۔ مصحفی کی ان کے نام و نشان سے بے خبری لاعلمی سے زیادہ بے توجہی پر مبنی معلوم ہوتی ہے کیونکہ ان کا مفصل ذکر گردیزی اور میر حسن کے تذکروں میں مع ان اشعار کے موجود ہے[1] اور یہ تذکرے "تذکرۂ ہندی" کی ترتیب سے قبل مصحفی کی نظر سے گزر چکے تھے۔

(ج) شاہ حاتم کی نسبت رقم طراز ہیں :

"عمرش قریب بصد رسیدہ بود۔ سہ سال است کہ در شاہجہان آباد وداعِ حیات سپردہ" (ص ۸۱)

مصحفی کے اپنے بیان کے مطابق حاتم کا سالِ تولد لفظِ "ظہور" کا ہم عدد یعنی ۱۱۱۱ھ ہے[2] اور ان کی وفات رمضان المبارک ۱۱۹۷ھ میں ہوئی ہے[3]۔ اس حساب سے انتقال کے وقت ان کی عمر ۸۶ - ۸۷ برس کے درمیان قرار پاتی ہے جسے "قریب بصد" کہنا کسی طرح درست نہیں۔

---

[1] گردیزی کے یہاں صرف پہلے دو اشعار شاملِ انتخاب ہیں (ص ۴۶) لیکن میر حسن نے ان تین شعروں کے علاوہ اس غزل کے مزید دو شعر نقل کیے ہیں۔ (طبع ثانی ص ۴۸)

[2] عقدِ ثریا ص ۲۳ و تذکرۂ ہندی ص ۸۲

[3] عقدِ ثریا ص ۲۳

(۵) فدوی لاہوری کے ذکر میں لکھتے ہیں کہ

"گویند بقال پسرے بود نومسلمان شدہ و بہ غلامیٔ مرزاے نام برآوردہ۔۔۔۔ ۔۔۔۔مرزا محمد رفیع در ہجو او کہ مذکورِ بقال و بوم آوردہ، ایں کنایہ دلیلِ ساطع بر مقولۂ مولف است ۔۔۔۔۔۔ بعد شکستِ ضابطہ خاں در سکرتال ۔۔۔۔۔۔ بہ اجل طبعی در قصبہ مرادآباد درگذشت۔" (ص ص ۱۶۶ و ۱۶۷)

"طبقات سخن" میں مبتلا میرٹھی نے فدوی سے اپنی ملاقات اور دوستانہ تعلق کا ذکر کرنے کے بعد ان کے بارے میں مصحفی کے اس بیان کو کہ وہ ایک بقال کے بیٹے اور کسی مغل کے غلام تھے، "غلط محض" قرار دیا ہے[1] ان کی اطلاع کے مطابق وہ (فدوی) برلچ مغلوں کی نسل سے تعلق رکھتے تھے[2] اس کے علاوہ ان کے بیان سے مصحفی کے اس قول کی بھی تردید ہوتی ہے کہ فدوی نے اجل طبعی سے مرادآباد میں وفات پائی لکھتے ہیں کہ

"آخر در بریلی آمد و بریکے از افغان پسر فریفتہ شدہ از دستِ رقیب بہ تیغ بے دریغ شہید گشت[3]۔"

مولوی قدرت اللہ شوق مولف طبقات الشعرا بھی آنولہ (ضلع بریلی) میں دو ایک مرتبہ فدوی سے مل چکے تھے۔ ان کے بیانات بھی مصحفی کے اقوال کی تائید نہیں کرتے۔ مبتلا کے برخلاف اگرچہ انھوں نے فدوی کی موت کا سبب "بیماریٔ تپ لرزہ" کو ٹھہرایا ہے[4] تاہم جاے وفات کے سلسلے میں دونوں تذکرہ نگاروں کے درمیان کوئی اختلاف نہیں۔

"مثنوی بوم و بقال" کے متعلق بھی اب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی کہ یہ سودا

---

[1] "آں چہ مصحفی اورا در تذکرۂ خود بقال پسر و غلام مغل نوشتہ، محض غلط است۔" طبقات سخن ص ۱۸۸

[2] و [3] ایضاً طبقاتِ سخن ص ۱۸۸

[4] "قریب دو ماہ شد کہ از بیماریٔ تپ و لرزہ در بریلی فوت شد۔" طبقات الشعرا ص ۲۷۴

کی نہیں ان کے شاگرد میر فتح علی شیدا کی تصنیف ہے[1]۔ اس لیے سودا سے اس کے انتساب کو بھی مصحفی کے حقائق سے بے خبری پر محمول کیا جائے گا۔

(۷) قمر الدین منت کی تاریخِ وفات مصحفی نے درج ذیل مصرعے سے نکالی ہے

"منت کجا و زمزمۂ شاعری او" (ص ۲۳۰)

اس مصرعے سے ۱۲۰۷ھ برآمد ہوتا ہے لیکن منت کے فرزند میر نظام الدین ممنون کے مستخرجہ مادۂ تاریخ "غروب" کے مطابق ان کا سالِ رحلت ۱۲۰۸ھ ہے۔ ممنون نے اپنے نظم کردہ قطعۂ تاریخ میں ان کے سنینِ ولادت و وفات اور عمر کی تفصیل اس طرح بیان کی ہے:

"کہا میں نے ممنون سے اے خوش بیاں — نہ گردِ سخن تیرے پھٹکیں عیوب
قمر مطلعِ دیں پہ منت جو تھا — ضیا بخش بہر چراغِ قلوب
ولادت، سن عمر، رحلت کا سال — بیاں کر تو اس کی، وہ بولا کہ خوب
ولادت کو "خورشید والا" سے دیکھ — "کواکب" سنِ عمر، رحلت "غروب"[2]

یہ اور ان جیسی دوسری غلطیاں تاریخی اعتبار سے اتنی اہمیت ضرور رکھتی ہیں کہ حقائق و واقعات پر نظر رکھنے والا کوئی شخص بھی ان سے بہ آسانی صرفِ نظر نہیں کر سکتا۔ اس کے باوجود چونکہ "تذکرۂ ہندی" میں ان کا تناسب اس قدر کم ہے کہ غائر تجزیے کے بعد بھی ایسی تمام لغزشوں یا غلطیوں کی تعداد دس بارہ سے آگے نہ بڑھ پائے گی۔ اس لیے ان کی بنا پر نہ تو مصحفی کی احتیاط پسندی پر ہی انگلی اٹھائی جا سکتی ہے اور نہ ان کے تذکرے کی مجموعی قدر و قیمت کو کم کر کے دیکھا جا سکتا ہے۔

زبان کی سادگی اور اندازِ بیان کی صفائی کے لحاظ سے بھی مصحفی اکثر تذکرہ نگاروں پر فوقیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے قافیہ بندی اور تشبیہات و استعارات کے خارزار میں نہ اُلجھ کر نہایت سلیس و سادہ مگر دل کش زبان میں اپنے مشاہدات و معلومات کا اظہار کیا ہے۔ تذکرہ نویسی کے لیے ان کا یہ اسلوبِ تحریر ایک معیار اور مثال کی حیثیت رکھتا ہے۔

---

[1] مرزا محمد رفیع سودا ص ۲۸۹ و ص ۲۹۹۔ [2] کلیات ممنون مملوکہ مولانا آزاد سنٹرل لائبریری بھوپال ورق ۲۰۴ ب

ریاض الفصحا

یہ مصحفی کا تیسرا اور آخری تذکرہ ہے۔ پہلے دو تذکروں کی طرح یہ تذکرہ بھی ۱۹۳۴ء میں جامع برقی پریس دہلی ہی سے چھپ کر شائع ہوا ہے۔ اس سبب تالیف کے ذیل میں مصحفی کا بیان ہے:

"روزے نظر بر کثرتِ موزوں طبعانِ حال کردہ بخاطر گذرانیدم کہ اگر یک تذکرہ دیگر تالیف نمائی، اغلب کہ اسامیٔ ایں گروہ نیز حروف تہجی را وفا کند۔ ایں بگفتم و کمیتِ قلم را در عرصۂ تحریر احوال و اشعارِ شعرا جولاں دادم۔ آناں کہ در تذکرۂ ہندی و فارسیٔ من نیستند، آن ہر دو فریق را در جلدِ ثانی در آوردم تا جامع جمیع اسما باشد۔" (ص ۳)

گویا یہ تذکرہ "عقدِ ثریا" اور "تذکرۂ ہندی" کے تکملے کی حیثیت رکھتا ہے۔ مصحفی نے اس میں حروف تہجی کی ترتیب کے مطابق تین سو بائیس (۳۲۲) شاعروں کا ذکر کیا ہے[1] جن میں سے دو سو بہتر (۲۷۲) خالصتاً ریختہ گو ہیں۔ سینتیس (۳۷) شاعروں کا صرف فارسی کلام پیش کیا گیا ہے اور تیرہ (۱۳) شاعروں کے انتخاب میں اردو اور فارسی دونوں زبانوں کے اشعار شامل ہیں۔ ان میں سے بعض شاعروں کا ذکر سابقہ

---

[1] مطبوعہ نسخے میں تین سو اکیس (۳۲۱) شاعروں کا ذکر ہے۔ رائے بھگوان داس ہندی کا ترجمہ اس میں شامل نہیں لیکن خدا بخش اورنٹیل لائبریری پٹنہ کے مخطوطے میں جس پر اس نسخے کا متن مبنی ہے، ان کا مختصر حال مع ایک فارسی شعر کے موجود ہے (ملاحظہ ہو ورق ۱۳ ب)

تذکروں (عقد ثریا اور تذکرۂ ہندی) میں بھی آچکا ہے۔ یہاں جن حالات کے تحت انھیں دوبارہ شاملِ تذکرہ کیا گیا ہے، ان کی نوعیت لطف علی بیگ آذرؔ اور شاہ نصیرؔ دہلوی کے متعلق درج ذیل بیانات سے ظاہر ہے۔ آذرؔ کے حال میں لکھتے ہیں:

"غالب احوال ایشاں در تذکرۂ فارسی نوشتہ باشم۔ دریں روز غزلے از مرزاے مذبور بہم رسید۔ چوں عاشقِ کلامِ اہلِ ولایتم، دو شعر ازو انتخاب کردہ ہم نوشتم۔" (ص ۱۷)

شاہ نصیرؔ کے ذکر میں رقم طراز ہیں:

"در تذکرۂ اول (تذکرۂ ہندی) بسبب بہم نہ رسیدنِ کلامش دو شعر سماعی نوشتہ بودم لہٰذا چوں دریں نزدیکی دو سہ بار مشارٌ الیہ بہ ایں دیار آمدہ در غزل ہاے طرحی شریکِ مجلسِ یاران شد، انچہ از کلامش بیادِ فقیر ماندہ، آن را بنوکِ قلم دادم۔" (ص ۳۳۷ و ۳۳۸)

"ریاض الفصحا" اس تذکرے کا تاریخی نام ہے جس سے ۱۲۲۱ھ برآمد ہوتا ہے۔ یہ نام مصحفی نے لالہ چنی لال حریفؔ کے قطعے سے اخذ کیا ہے۔ حریفؔ مصحفی کے "راسخ الاعتقاد" شاگرد تھے اور اس تذکرے کی ترتیب میں ان کی خواہش بھی شامل تھی۔ دیباچے کے آخر میں ان کا قطعۂ تاریخ نقل کرتے ہوئے مصحفی نے لکھا ہے:

"تاریخِ ایں تذکرہ لالہ چنی لال حریفؔ کہ آغازش بہ تکلیف مومی الیہ بود، چنیں یافتہ ؎

صد شکر کہ ایں ذخیرۂ اہلِ سخن — شد انجمنِ سپہر را رشک افزا
از خامۂ فکرِ خود برآورد حریفؔ — سالِ تاریخ او "ریاض الفصحا" ۱۲۲۱ھ (ص ۳)

تذکرے کے خاتمے پر زمانۂ تالیف سے متعلق مزید دو قطعات اس طرح پیش کیے گئے ہیں:

"تاریخِ خاتمہ (کہ) تازہ گفتہ شد، ایں است ؎

در سوادِ اعظم ایں تذکرہ — ماند از رفتار چوں پاے قلم

یافتم تاریخ ختمش مصحفی　　یادگارِ خامۂ جادو رقم

قطعۂ تاریخ دیگر کہ شاگردم مرزا رمضان بیگ طپاںؔ[1] ..... گفتہ نیز دریں فرخندہ دفتر نوشتہ شد ایں است ؎

طپاںؔ چوں از پئے تاریخ ایں جلد　　در معنی بہ سلکِ نظم سُفتہ

نمودہ قطع پائے ہندِ والا گاہ　　طلسماتِ خیالِ ہند، گفتہ

۱۲۴۰-۴=۱۲۳۶ھ

(ص ۳۷۸)

ان دونوں قطعات کے مادہ ہائے تاریخی سے ۱۲۳۶ھ برآمد ہوتا ہے۔ چوں کہ یہ دونوں قطعے تذکرے کے آخر میں منقول ہیں اور ان سے حاصل شدہ سنہ ابتدا میں نقل کیے ہوئے قطعے سے مستخرجہ سنہ سے مختلف ہے، اس لیے عام طور پر یہ رائے قائم کر لی گئی ہے کہ "ریاض الفصحا" کا آغاز ۱۲۲۱ھ میں اور اتمام ۱۲۳۶ھ میں ہوا[2]۔ ہمارے نزدیک یہ خیال محض سرسری اندازے پر مبنی ہے۔ کم از کم تذکرے کے ان اندراجات سے جو گذشتہ سطور میں نقل کیے گئے ہیں، کسی طرح اس کی تائید نہیں ہوتی بلکہ اس کے برخلاف دیباچے کے اس جملے میں کہ "آغازش بہ تکلیف مومی الیہ (لالہ چنی لال حریفؔ) بود" لفظِ "بود" اس جانب اشارہ کرتا ہے کہ دیباچہ یا اس کا زیر بحث آخری حصہ کام کے پایۂ تکمیل کو پہنچنے کے بعد لکھا گیا ہے۔ حریفؔ کے قطعے کے پہلے مصرعے سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ جس وقت انھوں نے تاریخ کہی ہے یہ "ذخیرۂ اہلِ سخن" ایک مکمل کتاب کی صورت اختیار کر چکا تھا۔ جہاں تک آخر کے دو قطعات کا تعلق ہے، ان میں سے بھی مصحفیؔ کے اپنے قطعے کے ساتھ "تازہ گفتہ شد"

---

[1] کتب خانہ خدا بخش پٹنہ کا قلمی نسخہ انھیں رمضان بیگ طپاںؔ کا لکھا ہوا ہے۔ اس نسخے کا سالِ کتابت ۱۲۳۷ھ ہے۔ مختصر ترقیمہ یہ ہے: کتبہٗ رمضان بیگ طپاںؔ ۱۲۳۷ھ

[2] مثال کے لیے ملاحظہ ہو مقدمۂ دستور الفصاحت از جناب امتیاز علی عرشیؔ ص ۸۷ اور "مصحفیؔ کے تذکرے" از جناب نثار احمد فاروقی، مشمولہ سہ ماہی اردو ادب علی گڑھ شمارہ جون ۱۹۵۵ء ص ۱۱۴

کی صراحت اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ یہ نظرِ ثانی سے فراغت کی تاریخ ہے، نقشِ اول کی تاریخِ تکمیل نہیں۔ ان تمام پہلوؤں پر غور و فکر کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ "ریاض الفصحا" کا ابتدائی مسودہ ۱۲۲۱ھ/۱۸۰۶ء ہی میں تیار ہو گیا تھا۔ ۱۲۳۶ھ/۱۸۲۱ء میں صرف چند شاعروں کے حالات کا اضافہ کر کے اسے آخری شکل دی گئی ہے۔ اس خیال کی تائید ان قرائن سے بھی ہوتی ہے جن کی روشنی میں مختلف شاعروں کے تراجم کا زمانۂ تحریر متعین کیا جا سکتا ہے۔ ۱۲۲۱ھ/۱۸۰۶ء اور ۱۲۳۶ھ/۱۸۲۱ء کے درمیانی عرصے میں اگر کچھ اضافے کیے بھی گئے ہیں تو وہ نمایاں نہیں۔ ہم کو کافی تلاش و جستجو کے بعد اس قسم کی صرف ایک مثال بھیروں داس تمنا کے حالات میں ملی ہے جن کے بارے میں مصحفی نے لکھا ہے کہ:

"بعد از نوزدہ سالگی خیالِ موزوں کردنِ شعرِ ہندی در سرش افتاد اول مشورۂ سخن بہ میاں محمد عیسیٰ تنہا کہ خدایش بیامرزد، می کرد بعد چندے مشارٌ الیہ ایشاں را در حینِ حیات خود پیشِ فقیر حاضر ساختہ بحلقۂ تلامذہ دیگر در آوردہ باعثِ فزونی اعتبار کردہ ..... عمرش تا امروز بست و شش سالہ خواہد بود۔"

(ص ص ۶۲ و ۶۳)

محمد عیسیٰ تنہا کا انتقال ۱۲۲۲ھ/۱۸۰۷ء میں ہوا ہے[1] تمنا اس سے پہلے ہی مصحفی کے شاگرد ہو چکے تھے اور اس وقت ان کی عمر انیس[19] سال سے متجاوز تھی لیکن جس زمانے میں "ریاض الفصحا" میں ان کا حال لکھا گیا ہے، وہ تقریباً چھبیس[26] برس کے تھے۔ اگر

---

[1] تاریخ وفات ناسخ کے اس مصرعے سے نکلتی ہے۔ ع

آج تنہا گیا دنیا سے عدم کو تنہا = ۱۲۲۲ھ

کلیات مصحفی نسخۂ پنجاب یونیورسٹی میں بھی ایک قطعۂ تاریخ ہے جس کا آخری شعر یہ ہے ؎

از سرِ آہ ایں نوا بکشید گنج معنی بخاک پنہاں شد = ۱۲۷۸ + ۱ - ۵۷ =

۱ ۵۷ ۱۲۷۸ ۱۲۲۲ھ

۱۲۲۲ھ/۱۸۰۷ء میں تنہا کی وفات کے وقت ان کی عمر کم از کم بیس سال فرض کر لی جائے تو ان کا یہ ترجمہ ۱۲۲۸ھ/۱۸۱۳ء کی تحریر قرار پائے گا۔

مصحفی نے اس تذکرے میں اپنے مآخذ کا کوئی حوالہ نہیں دیا ہے گمانِ غالب یہ ہے کہ انھیں دوسرے تذکروں سے استفادے کی ضرورت بھی کم ہی پیش آئی ہوگی کیوں کہ یہاں انھوں نے جن لوگوں کو متعارف کرایا ہے ان میں ایک بڑی تعداد ان شعرا کی ہے جو ان کے سلسلۂ تلمذ میں منسلک یا ان کے احباب اور معاصرین کے شاگرد تھے[1] اس کے علاوہ بہت سے شاعر وہ ہیں جن کو پہلی مرتبہ کسی تذکرے کے صفحات پر جگہ ملی ہے۔ مثال کے طور پر خواجہ حیدر علی آتش، مرزا محمد رضا برق، مظفر حسین ضمیر (مرثیہ گو) طالب علی عیشی، منور خاں غافل، مہدی علی مہدی (ملک الشعرا مہدی علی خاں زکی)، شیخ محمد بخش مہجور، سعادت خاں ناصر (صاحب تذکرہ خوش معرکۂ زیبا)، شیخ امام بخش ناسخ اور خواجہ وزیر جیسے اساتذہ پہلی بار اسی تذکرے کے ذریعے اردو تنقید و تاریخ کے افق پر نمودار ہوئے ہیں۔ دریافتِ احوال اور حصولِ معلومات میں دوسروں کی مدد سے بے نیازی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ متذکرہ شاعروں میں سے بیشتر کسی نہ کسی اعتبار سے لکھنؤ سے تعلق رکھتے ہیں جہاں اس تذکرے کی تکمیل تک مصحفی اپنی عمر کے تقریباً اڑتیس سال (۱۱۹۸ھ/۱۷۸۴ء تا ۱۲۳۶ھ/۱۸۲۱ء) گزار چکے تھے۔ شعر و ادب اور بزم آرائی سے انھیں جو دل چسپی تھی اس کے پیش نظر اپنے ان ہم مشربوں سے ان سے زیادہ اور کون واقف ہو سکتا ہے۔

شاملِ تذکرہ شعرا سے اتنی قریبی واقفیت کے باوجود مصحفی کی توجہات حالاتِ زندگی کے بیان سے زیادہ اشعار کے انتخاب پر مرکوز رہی ہیں۔ اس سلسلے میں اگرچہ

---

[1] متذکرہ شعرا میں ستر (۷۰) شاعر براہ راست مصحفی کے شاگرد ہیں اور ۱۴ شاعروں کا سلسلۂ تلمذ ایک واسطہ سے ان تک پہنچتا ہے۔ تقریباً اتنی ہی تعداد ان کے احباب اور معاصرین کے تلامذہ کی بھی ہے۔

ان کا قول یہ ہے کہ

"احوال ہر یک را بقدرِ لیاقتِ ہر کس چناں کہ رسمِ تذکرہ نویسان است، بنگاشتم۔" (ص ۳)

لیکن عملاً انھوں نے اس اصول پر کاربند رہنے کا ثبوت کم ہی دیا ہے۔ چنانچہ جابجا "بقدرِ لیاقتِ ہر کس" کی شرط "حسبِ خواہشِ خود" سے بدلی ہوئی نظر آتی ہے۔ بعض شاعروں کے کلام کے طویل انتخابات بھی اس جانب اشارہ کرتے ہیں کہ مولف کا اصل مقصد پسندیدہ اشعار کا انتخاب اور ان کی تدوین و ترتیب ہے۔ تعارفی تفصیلات ان کی نظر میں ثانوی حیثیت رکھتی ہیں۔ یہاں ہم صرف تین شاعروں کے تراجم بطورِ مثال پیش کریں گے، جن کی روشنی میں اشعار و احوال کے درمیان اس عدمِ تناسب کی بنیادی وجہ یا حالات سے بے خبری کے باوجود کلام کی پیش کش کے محرکات کو بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔

(الف) میر کلو شاعر:۔ "چوں کلامِ ایشاں دراں روزہا کہ تذکرہ اول (تذکرۂ ہندی) می نوشتم بہم نہ رسید، لہٰذا مرفوع القلم ماندند۔ حالا از جائے شعرے بہم رسیدہ، برائے یادگار بطریقِ ندرت نوشتہ شد۔"

(ص ۱۴۵)

(ب) آغا محمد عاشق:۔ "خیلے خوش فکر گذشتہ۔ مطلعے از و در تذکرۂ فارسی نوشتہ ام۔ غزلے دریں روزہا ہم بہم رسیدہ، بنوکِ قلم دادم۔" (ص ۲۱۰)

(ج) وارفتہ:۔ "جوانے دیدم در مشاعرہ میاں صدرالدین از قوم کایتھ۔ تخمیناً عمرش سی سالہ خواہد بود۔ وارفتہ تخلص می نمود۔ کاغذِ اشعارش بدست آمدہ، از و چیزے نقل گرفتہ شد۔" (ص ۳۵۴)

کلام سے عشق کی یہ کیفیت جس کا اظہار ان بیانات سے ہوتا ہے، "عقدِ ثریا" اور "تذکرۂ ہندی" میں بھی کارفرما ہے لیکن وہاں مصحفی نے حالات اور اشعار کے درمیان جو تناسب برقرار رکھا ہے، وہ اس تذکرے میں تقریباً مفقود ہے۔ یہاں

سوانحِ حیات سے متعلق جو معلومات فراہم کی گئی ہیں، وہ بالعموم تشنہ اور ناکافی ہیں۔ ان کے مطالعے سے نہ تو شاعر کی شخصیت کا کوئی بھرپور نقش ابھرتا ہے اور نہ اس ماحول اور پس منظر کو سمجھنے میں بقدرِ ضرورت مدد ملتی ہے جس کے زیرِ اثر فنکارانہ صلاحیتیں نشوونما پاتی ہیں۔ اس عمومی صورتِ حال کا اندازہ مندرجہ ذیل مثالوں سے کیا جاسکتا ہے:

(الف) برقؔ:۔ "مرزا محمد رضا برقؔ تخلص خلف الصدق مرزا کاظم علیٔ سرآمدِ صلحاے فرقۂ اثنا عشریہ، جوانِ شجاع و مہذب اخلاق و موزون الطبع و شائقِ فن و مداحِ سخن دیدمش۔ بشاگردیٔ شیخ امام بخش ناسخ عزِ امتیاز دارد۔ عمرش تخمیناً قریب بہ سی خواہد بود۔"
(ص ۵۲)

(ب) جوانؔ:۔ "مرزا کاظم علی جوان تخلص، سکنۂ شاہجہاں آباد۔ جوانِ بسیار خلیق است۔ در مشاعرہ کمتر گذاشتہ۔ چندے رفیقِ مرزا سیف علی نیز بود، چندے بفیض آباد بسر بردہ، حالا در کلکتہ رفتہ است" (ص ۱۷۱)

(ج) شرفؔ:۔ "میر محمدی شرفؔ تخلص کہ حالِ درویشی بر خود درست داشت۔ شخص سنجیدہ و فہمیدہ دیدمش۔ دو بار بنائے مشاعرہ در شاہجہاں آباد گذاشتہ و یارانِ موزوں طبع را خواندہ۔ بندہ ہم در مشاعرۂ ایشاں رفتہ بود۔" (ص ۱۴۵)

(د) شوقؔ:۔ "مولوی قدرت اللہ مرحوم، شوقؔ تخلص ساکن رام پور فاضلِ متبحر بود، بمقتضاے موزونیٔ طبیعت فکر شعر ہم می نمود و آنجا نظیرِ خود نداشت۔ اکثر مردم آں نواح بحلقۂ شاگردیش آمدند[1]۔" (ص ۱۵۰)

---

[1] شوقؔ کا اصل وطن "موضع موئی (من) توابع سنبھل ضلع مراد آباد" تھا۔ مصحفی انھیں مولوی قدرت اللہ قدرتؔ مولفِ تذکرہ ہندی گویاں کے نام سے تذکرۂ ہندی میں بھی متعارف کرا چکے ہیں (ص ۱۷۵) وہاں انھوں نے ٹانڈہ (ضلع رام پور) میں ان سے اپنی ملاقات کا بھی ذکر کیا ہے۔

(ہ) عشرتؔ :۔ "میر غلام علی عشرتؔ تخلص، ساکنِ صوبۂ بریلی۔ جوانِ کثیر الکلام است۔ دیوان ہا و مثنوی ہائے متعددہ دارد۔ عمرش تخمیناً قریب چہل سال خواہد بود۔" (ص ۲۲۸)

(و) غفلتؔ :۔ "احمد خاں غفلتؔ، قوم افغان یوسف زئی، ساکن رام پور، شاگرد مولوی قدرت اللہ شوقؔ مصنف تذکرۂ ریختہ گویانِ قدیم۔ جوان مہذب الاخلاق است۔ ازاں شہر خود محض برائے ملاقاتِ فقیر در لکھنؤ آمدہ بود۔ در قصائد و مثنوی دادِ معنی بندی می دہد۔ ودو (غزل) طرحیٔ مشاعرۂ اینجاکہ (= کہ ایں جا) گفتہ بود انتخابِ آں بنوکِ قلم می دہد۔۔۔۔" (ص ص ۲۴۲ و ۲۴۳)

(ز) مہدیؔ :۔ "مہدی علی مرادآبادی قوم شیخ سکنۂ مرادآباد، جوانِ قابل و دانا است۔ در فارسی و ہندی ہر دو زبان فکر می کند و بر شاعریٔ خود غرورِ کمال دارد۔ روز ہائے کہ از شہر خود در لکھنؤ گذرا فگند، بملاقاتِ فقیر ہم آمدہ بود۔ عمرش تخمیناً از سی متجاوز خواہد بود[1]۔" (ص ص ۲۷۳ و ۲۷۴)

یہ مثالیں تعارف نگاری کے جس معیار کی نمائندگی کرتی ہیں، "ریاض الفصحا" میں اس کے نمونے غالب اکثریت کے حامل ہیں۔ اس عام روش کے برخلاف اگر مصحفی نے بعض شعرا کے ذکر میں کسی قدر تفصیل سے کام لیا ہے تو ان سے کہیں زیادہ تعداد ان شاعروں کی ہے جن کے بارے میں وہ کسی بھی قسم کی معلومات فراہم کرنے سے یکسر قاصر رہے ہیں[2]۔ اس غیر معمولی اختصار یا حالات سے عدم واقفیت کی مثالیں

---

[1] یہ مہدی علی خاں زکیؔ مرادآبادی کا ذکر ہے۔ ممکن ہے ابتدا میں وہ مہدیؔ تخلص کرتے ہوں لیکن مصحفی نے جن غزلوں کے اشعار نمونۂ کلام میں نقل کیے ہیں، دیوانِ مطبوعہ میں ان کے مقطعوں میں بطور تخلص زکیؔ ہی ملتا ہے۔ ملاحظہ ہو کلیاتِ زکیؔ مرتبہ زین العابدین خاں (ص ۱۰۴ و ۲۰۹)

[2] ایسے شاعروں کی تعداد ننانوے 99 یعنی ۳۰ فی صدی کے قریب ہے۔

بعض اوقات اس تواتر کے ساتھ سامنے آتی ہیں کہ تذکرے پر بیاضِ اشعار کا گمان ہونے لگتا ہے۔ مثلاً ردیف جیم میں کل آٹھ شاعروں کا ذکر ہے جن میں سے پہلے پانچ شعرا کے تراجم حسب ذیل ہیں:

(۱) جوہر :۔ "میرزا احمد علی جوہر تخلص از وست

شاید کہ پہنچے واں تک واماندہ ہم سا کوئی
آوارۂ بیاباں اے گردِ کارواں ہو" (ص ۶۷)

(۲) جنوں :۔ "شاہ غلام مرتضیٰ جنوں تخلص از وست

آفتِ جاں ہو گئی آخر یہ بینائی مجھے
جو بلا کہیے سو ان آنکھوں نے دکھلائی مجھے

جنوں کا یاں تلک تھا گرم بازار کہ پتھر بھی ہوا اس کا خریدار"
(ص ۶۷)

(۳) جرأت :۔ "میر شیر علی جرأت تخلص، از قدماست۔ از وست۔

نہ اپنے چھوٹنے کی کس طرح تدبیر میں رہیے
بہار آئی ہے کیوں کر خانۂ زنجیر میں رہیے" (ص ۶۸)

(۴) جوشش :۔ "میاں محمد روشن جوشش تخلص، از قدماست۔ از وست

تعلقات جہاں خبر نہیں رکھتا ہزار شکر کہ میں دردِ سر نہیں رکھتا

دل میں ہے اب قرب میں آئینہ ساں پیدا کروں
وہ مجھے دیکھا کرے اور میں اسے دیکھا کروں

ہم چشم کیوں کہوں میں اسے لالہ زار کا
عالم ہی کچھ جدا ہے دل داغدار کا" (ص ۶۸)

(۵) جریح :۔ "جریح تخلص، شاگردِ مذنب است۔ از وست

ہوا ہوں دیکھ کر کشتہ میں یاں خوردہ دہن اس کا
مرے مرقد پہ رکھیو جائے گل بدخشاں کو

سمجھتا ہی نہیں عاشق کو اپنے جاں فشاں ہرگز
بھلا کس طرح سمجھاوے کوئی اس طفل نادان کو
کہا مجنوں نے آوے گا ادھر گر ناقۂ لیلیٰ
مژہ سے صاف کر دوں گا میں کوسوں تک بیاباں کو
شریکِ حال میرے کیوں نہ ہو دیں رنج میں اکثر
قرابت نالۂ دل سے ہے میری آہِ سوزاں کو" (ص ۲۶۸)

ردیف میم سے اسی قسم کے اختصار کی کچھ اور مسلسل مثالیں ملاحظہ ہوں:

(۱) مشتاق:۔ "میر احسن مشتاق تخلص از دست

اپنی ہم بندگی پہ بھولے تھے پر جو دیکھا وہاں خدائی ہے"
(ص ۲۷۸)

(۲) مشتاق:۔ "مرزا ابراہیم بیگ مشتاق تخلص از دست

موئے دامِ محبت میں تو اپنی داد کو پہنچے
نہ کر افسوس اے صیاد ہم فریاد کو پہنچے" (ص ۲۷۸)

(۳) منتظر:۔ "خواجہ[1] منتظر تخلص، از متوسطین است۔ از دست

تیرے تھے میاں خواہ برے خواہ بھلے ہم
لے یار تو خوش رہ کہ ترے در سے چلے ہم
بے خود اتنا ہے نہ کچھ ایمان نہ کچھ تقریر ہے
منتظر کے ہاتھ میں شاید تری تصویر ہے" (ص ۲۷۹)

(۴) مجنوں:۔ "میر حمایت علی مجنوں تخلص

ڈرنا ہی مناسب تھا خونخوار کی آنکھوں سے
مارا نہ مجھے آخر کس پیار کی آنکھوں سے" (ص ۲۷۹)

---

[1] منتظر کا نام خواجہ بخش تھا یہاں خواجہ کے بعد بخش غالباً سہو کتابت کی بنا پر قلم انداز ہو گیا ہے۔

(۵) محسنؔ :۔ "محمد محسن، محسنؔ تخلص

مرا رنگِ رو اس قدر زرد ہے
کہ یاں زعفراں زار بھی گرد ہے" (ص ۲۷۹)

(۶) مخلص :۔ "میر باقر عرف مخلص علی خاں مخلصؔ تخلص

آئینہ رو کے دل میں کوئی راہ کیا کرے
دم مارنے کی بات نہیں آہ کیا کرے" (ص ۲۷۹)

(۷) مستمندؔ :۔ "یار علی خاں مستمندؔ تخلص

لگی ہے جس طرح میرے دلِ بیتاب میں آتش
نہ دیکھی ہوگی تو نے ایسی شمع خواب میں آتش" (ص ص ۲۷۹ و ۲۸۰)

(۸) ممتازؔ :۔ "حافظ علیؔ[1] ممتازؔ تخلص

ہزار مرتبہ دیکھا ستم جدائی کا
ہنوز حوصلہ باقی ہے آشنائی کا" (ص ۲۸۰)

(۹) مقبولؔ :۔ "مقبول نبی، مقبولؔ تخلص

پھیرے خدا رقیبوں سے جی میرے یار کا
اتنا ہی مدعا ہے دلِ بے قرار کا" (ص ۲۸۰)

جن لوگوں کے تعارف میں مصحفی نے کسی قدر شرح وبسط کے ساتھ قلم بند کیے ہیں، ان کے حالاتِ زندگی کے بیان میں بھی ان کے ہاں کسی تاریخی نظم وضبط کی پابندی نظر نہیں آتی کیونکہ چند مقامات کے علاوہ انھوں نے عام طور پر نہ تو واقعات کے ذکر میں سنین کے حوالے دیے ہیں اور نہ ہر جگہ ابتدائی قسم کی ضروری معلومات کی فراہمی کا اہتمام کیا ہے۔ تاہم تذکرے کے ان حصوں کو ان کی کوششوں

---

[1] ممتازؔ کا پورا نام حافظ فضل علی ہے۔ وہ مرزا سوداؔ کے شاگرد تھے۔ یہاں ان کے نام میں حافظ اور علی کے درمیان سے فضل غالباً سہو کتابت کی بنا پر حذف ہوگیا ہے

کا ماحصل کہا جا سکتا ہے۔ نمونے کے طور پر چند ایسے شاعروں کے بارے میں جو اُن کے دامنِ فیض کے تربیت یافتہ تھے، ان کے یہ بیانات ملاحظہ ہوں۔ "ریاض الفصحا" سے سوانح نگاری کی اس سے بہتر مثالیں پیش نہیں کی جا سکتیں۔

(الف) طپاں: "مرزا رمضان بیگ طپاں تخلص ولد مرزا رجب بیگ ابن مرزا مدار بیگ قوم مغل چغتہ، ساکن آسیون من مضافاتِ صوبۂ اودھ سرکارِ لکھنؤ کہ بزرگانش در عہدِ سلاطین ماضیہ از مرو در ہندوستان جنت نشاں شاہجہان آباد آمدہ شرفِ آستاں بوس بادشاہی دریافتہ بخدمتِ چکلہ داری پرگنہ مذکور و معافی بعضے قریات متعاقبہ آں سرمباہات برافراختہ دراں قصبہ توطن اختیار کردند وخودش در بانگرمئو بخانۂ جدِ مادرِ خود تولد ونشو و نما یافتہ و در آسیون بہ سنِ تمیز رسیدہ ..... در ۱۲۱۸ھ از موطنِ خود برائے تلاشِ معاش واردِ لکھنؤ گردیدہ۔ چوں قوتِ علمی داشت، خودرا بمقتضائے موزونیٔ طبع بگفتنِ شعرِ فارسی و ہندی و نثر نویسی سلیس و عاشقانہ وغیرہ مصروف ساخت و رجوع برائے اصلاح بفقیر آوردہ و در مدتِ ہفت سال ہر دو زبانِ نارسی و ہندی را بلد شدہ۔ بالفعل در مشاعرہ ہا کلامش رونقِ تمام پیدا می کند و موردِ تحسین و آفرینِ ہمسران می گردد ..... عمرش بست و پنج سالہ خواہد بود۔" (ص ص ۱۸۲ و ۱۸۳)

(ب) عیاش: "میر محمد یعقوب عیاش تخلص ولد میر محمد انور .....
خودش در لکھنؤ نشو و نما یافتہ۔ بزرگانش متوطنِ شاہجہاں آباد و ہمیشہ نوکریٔ خانۂ بادشاہ کردہ اند۔ چوں از ابتدائے جوانی بحکمِ موزونیٔ طبع شوقِ شعر گفتن در سر داشت، ملاقاتِ اساتذہ و صحبتِ ایشاں غنیمت می شمرد۔ چنانچہ اکثر بخدمتِ میر محمد تقی صاحب

فائدۂ صحبت برداشتہ و شعرِ خود را در اوائل بمیر سوز مرحوم و در
اواسط بمیر قمرالدین منت مغفور مبرور نمودہ و دریں ایام اواخرِ
مشق بفقیر رجوع مشورہ آوردہ است ..... عمرش از
چہل متجاوز خواہد بود۔" (ص ص ۲۱۲-۲۱۳)

(ج) غافل :۔"منور خاں غافل تخلص ولد صلابت خاں افغان یوسف زئی
بزرگانش سکنۂ فیض آباد بودند بسرکارِ فیض آبادِ (= فیض آثارِ)
نواب شجاع الدولہ بہادر بفرقۂ سواران عز امتیاز داشتند۔ خودش
در لکھنؤ تولد یافتہ نشو و نمائے پیدا کردہ ..... از ابتدائے موزونیٔ
طبع در عالمِ مکتب نشینی چیزے بجائے (خود) موزوں می کرد۔ آخر
(معرفتِ) شاہ مظہر حق عشاق تخلص ..... بحلقہ شاگردانِ
جدید در آمد۔ چندے رنگِ طرحِ مجلسِ مشاعرہ ہم ریختہ بود۔
..... ہر روز برائے استفادہ (و) دریافتِ اصلاحِ شعر
از حضارانِ مجلسِ فقیر می باشد و بفقیر نسبتِ دیگر شاگردان بسیار
اعتقاد داشتہ بودہ است۔ عمرش بست و پنج سال خواہد بود۔"
(ص ص ۲۳۳ و ۲۳۴)

(د) قاصر :۔"مرزا ببر علی بیگ قاصر تخلص ولد مرزا رستم بیگ۔ مولد و موطنش
شاہجہاں آباد و اصلِ بزرگانش سمرقند۔ جدِّ ماجدِ او در عہدِ
فرخ سیر واردِ دہلی شدہ بمنصبِ لائقہ و بخطابِ مغل خاں سرفرازی
یافتہ۔ چوں مشارٌ الیہ از ابتدائے سنِ بلوغ موزونیٔ طبع داشت،
دراں ایام چیزے کہ موزوں می کرد، آں را بہ ثناء اللہ خاں فراق
می گذرانید۔ در ہنگامے کہ از دہلی بہ لکھنؤ رسیدہ و او را فراقِ
استاد بمیاں آمد، بسبب سابقہ معرفت و اتحادے کہ میانِ من
و ایشاں بود ..... خواہشِ مشورۂ کلامش بفقیر آورد

واعتقادے کہ بہ استادِ خویش داشت، آں را بپلۂ دوم نہادہ
غائب و حاضر مداحِ عاصی است۔ معاش گاہے بہ تجارت و
گاہے بفنونِ سپہگری کردہ۔ عمرش بست و پنج سالہ خواہد بود۔"

(ص ص ۲۵۶ و ۲۵۷)

(۷) مسرور:۔ "شیخ پیر بخش مسرور تخلص ولد حکیم حیات اللہ متوطن قصبہ کاکوری
نواسۂ حکیم خیر اللہ ۔۔۔۔۔۔ پیشِ جد مادری خود در لکھنؤ پرورش
یافتہ و فنِ طب آموختہ۔ از ابتدائے سنِ بلوغ طبعش بہ اشعارِ اساتذہ
بیشتر میل می نمود و دراں ایام خود ہم چیزے موزوں می کرد۔ کلام
منظوم خود را بجائے خود نگاہ می داشت و در پے ایں بود کہ
کدام استاد را بنظر بگذرانم تا دبہ (؟ شوم) آخر حسبِ اتفاق در سنہ ۱۲۳۰ھ رجوع بفقیر آوردہ حالا
کہ مشق او بدوازدہ سال رسیدہ ۔۔۔۔۔۔ دریں فن از معاصرین
خود پائے کمے نمی آرد ۔۔۔۔۔۔ عمرش تا امروز سی و یک سالہ
خواہد بود۔" (ص ص ۳۱۰ و ۳۱۱)

یہ خاکے اپنی تکمیل کے لیے مزید رنگ آمیزی کے محتاج سہی پھر بھی ان کا مطالعہ قارئین تذکرہ کو زیرِ بحث شعرا کی زندگیوں کے متعدد اہم پہلوؤں سے متعارف کرا دیتا ہے، اس لیے ہم انھیں پست از معیار یا بے نتیجہ نہیں کہہ سکتے لیکن "ریاض الفصحا" میں اس قسم کے خاکوں کی مجموعی تعداد بیس بائیس سے زیادہ نہیں۔ اس لحاظ سے ان کو بہر حال مستثنیات میں شمار کیا جائے گا۔

مختصر نگاری کے اس رجحان کے باوجود جس کے نتائج و اثرات سے گذشتہ صفحات میں بحث کی گئی ہے، مصحفی نے جس معاملے میں کوتاہی یا بخل سے کام نہیں لیا ہے، وہ سیرت و شخصیت کے اوصاف و محاسن کی قدر شناسی ہے۔ شرافتِ نفس، حسنِ اخلاق، تہذیب و شائستگی، متانت و سنجیدگی اور تعظیم و تواضع ان کے نزدیک

وہ اعلیٰ انسانی اوصاف اور برگزیدہ قدریں ہیں جن کی داد نہ دینا ان کی شریعت میں ناانصافی اور حق تلفی کے مترادف معلوم ہوتا ہے۔ یہاں بھی اگرچہ وہ حسبِ معمول اختصار سے کام لیتے ہیں اور اپنے مشاہدات و محسوسات کو خواہ مخواہ طول دینا پسند نہیں کرتے تاہم اس اختصار میں جامعیت اور مصورانہ دقتِ نظر پائی جاتی ہے۔ چند الفاظ کے ذریعے وہ اکثر ایسی تصویر کھینچ دیتے ہیں جو شاہد و مشہود کے درمیان سے زمان و مکان کے تمام حجابات اٹھا دیتی ہے۔ درج ذیل مثالوں سے اس کیفیت کا اندازہ ہوگا

(الف) آتش:۔ "جوان وجیہ و مہذب الاخلاق است۔" (ص ۴)

(ب) امداد علی خاں امداد:۔ "جوانے ست مجموعۂ قابلیت و اہلیت، معدن سخاوت و شجاعت۔" (ص ۲۹)

(ج) مظفر علی بریاں:۔ "جوانے وجیہ و مہذب الاخلاق است۔ ظاہر و باطنش بصلاح و سداد آراستہ دیدم و اخلاقِ کریمانہ و حالاتِ بزرگانہ در ایامِ شباب از ایشاں بملاحظہ درآمد۔ از بسکہ در فہم و فراست طبعِ وقادِ ایشاں بے نظیر افتادہ، گاہ گاہے کہ ارادہ بطرفِ نظم کردنِ شعر آوردند، در بدایتِ کار نہایت نمودہ اند۔ با ایں ہمہ خود را شاعر نمی گیرند۔ ایں ہم از بلند ہمتی ایشان است۔" (ص ص ۴۲ و ۴۳)

(د) عبدالرحیم زیبا:۔ "جوانِ مہذب الاخلاق و غریب و با صلاح و سداد دیدمش۔" (ص ۱۰۷)

(ہ) میر کلو شاعر:۔ "مرد بزرگ و سنجیدہ و فہمیدہ بود ..... کمال کسرِ نفسی در خود داشت۔" (ص ۱۴۴)

(و) صفدر علی صفدر:۔ "جوان صلاحیت شعار و مہذب الاخلاق است۔" (ص ۱۷۳)

(ز) ظہور محمد ظہور:۔ "جوانے حلیم و سلیم و خود بین و مہذب الاخلاق است۔" (ص ۱۹۳)

(ح) ناسخ :۔ "جوانِ سیمیں (سیم تن) وسپاہی و منعم، حلیم الطبع و مہذب الاخلاق دیدمش" (ص ۳۳۴)

(ط) نوازش حسین خاں نوازش :۔ "جوانِ مہذب الاخلاق و خود بین و خوش اختلاط است" (ص ۳۳۹)

(ی) مستقیم خاں وسعت :۔ "جوانے قابل وطباع و ذہین وخلیق ومتواضع است" (ص ۳۵۷)

سوانح زندگی سے متعلق معلومات کی طرح "ریاض الفصحا" میں کلام کی فنی و لسانی خصوصیات کے بارے میں تنقیدی مواد کی کمی نمایاں طور پر محسوس ہوتی ہے۔ بظاہر اس کی وجہ یہ ہے کہ مصحفی نے اس تذکرے میں زیادہ تر ان شاعروں کا ذکر کیا ہے جو سن وسال اور مشقِ سخن کے اعتبار سے تجربات کے بالکل ابتدائی مراحل میں تھے اور پختگی کی منزل تک پہنچنے کے لیے انھیں ریاض کے کتنے ہی آتشکدوں سے گزرنا باقی تھا۔ اس لیے ان کی کاوشوں کے معیار ومنہاج کے متعلق کسی قطعی اور فیصلہ کن رائے کا اظہار نہ تو ممکن تھا اور نہ مناسب۔ البتہ بعض لوگوں کے ذوق وشوق اور ذہانت و طباعی کو دیکھتے ہوئے ان کے مستقبل سے کچھ توقعات وابستہ کی جاسکتی تھیں۔ مصحفی نے بھی ایسے معاملات میں یہی کیا ہے۔ چند مثالیں درج ذیل ہیں :

(الف) خواجہ آتش :۔ "در زبانِ نظم ریختہ ..... معاصرینش (را) سبقت برد جستن دشوار می نماید۔ اگر عمرش وفا کردہ وچند سال برہمیں وتیرہ رفت وفکر متینش را مانعے در پیش نیامد، یکے از بے نظیرانِ روزگار خواہد شد" (ص ۵)

(ب) الٰہی بخش الٰہی :۔ شعر بسیار شستہ وسادہ وعاشقانہ وعارفانہ می گوید۔ ..... در طبعش رسائی کمال معلوم می شود۔ اغلب ..... درچندے گو از معاصرین خواہد برد و شعرِ نشتر بدل زنش خوں از دیدہ ہا خواہد ریخت" (ص ۹)

(ج) عبدالرؤف شعورؔ :۔ "ذہنے رسا و طبعے ممیزہ دارد۔ اگر چندے مشق نمود، دریں فن (ریختہ گوئی) از بے نظیرانِ روزگار خواہد شد۔"

(ص ۱۶۱)

(د) مرزا مغل فریادؔ :۔ "از رسائی ذہنش معلوم می شود کہ اگر زمانہ فرصت داد، آخر کار بجائے خواہد رسید۔" (ص ۲۴۸)

کہیں کہیں شاعر کے مخصوص رنگ یا رجحانِ طبیعت اور معیارِ کلام کے بارے میں واضح اور واشگاف رائیں بھی مل جاتی ہیں۔ مثلاً:

(الف) سیف علی خاں شگفتہؔ :۔ "در فصاحت و بلاغت و معنی بندی و سادہ گوئی وامثالِ زنانہ و مردانہ نظیر خود ندارند۔" (ص ۱۵۵)

(ب) بینی پرشاد ظریفؔ :۔ "شعر بمتانت و فصاحت می گوید و مسدس و مخمسِ عاشقانہ و آبدار کہ بسلکِ نظم کشیدہ، ناخن بدل می زنند۔"

(ص ۲۰۲)

(ج) عاصیؔ ردولوی :۔ "بمقتضائے موزونیٔ طبع چیزے شکستہ بستہ موزوں می کند ۔۔۔۔۔۔ اگرچہ زبانش درست است، اما از محاورۂ ریختہ بلد نیست۔" (ص ۲۲۳)

(د) منور خاں غافلؔ :۔ "شعر بطور سادہ و پرکاری گوید و معنی تازہ نیز اگر می خواہد، می یابد، و در غزل سلامت کلامش مثل سلکِ گوہر است۔" (ص ۲۳۴)

(ہ) مرزا علی نظرؔ :۔ "شعر را بفصاحت و بلاغتِ تمام می گوید و مرتبۂ ریختہ برابرِ فارسی رسانیدہ۔ طرزِ عاشقانہ و معنی بند ہر دو بسیار خوب می گوید۔ کلامش از غلطی پاک است۔" (ص ۳۴)

(و) محمد بخش واجدؔ :۔ "بدایتِ شعرش علی الرسم زمانہ بود۔ آخر بطور شوکت بخاری سمندِ خیالش بطرفِ معنی بندی و نازک خیالی

عطفِ عناں نمودہ۔" (ص ۳۵۸)

شمالی ہند اور بالخصوص لکھنؤ کے ادبی ماحول، تہذیبی سرگرمیوں اور عوام و خواص میں اردو زبان اور اس کی شاعری کے نفوذ و اثر کی ترجمانی کے نقطۂ نظر سے اس تذکرے کا درجہ کسی طرح "تذکرۂ ہندی" سے کمتر نہیں۔ اس زمانے کے تہذیبی و معاشرتی نظام میں شاعروں کو جو مقام حاصل تھا اور صاحبانِ جاہ و ثروت جس طرح ان کی سرپرستی اور قدر افزائی میں فیاضی اور فراخ دلی کا ثبوت دیتے تھے، اس کا اندازہ ذیل کے بیانات سے کیا جا سکتا ہے

(الف) اسد الدولہ رستم الملک میرزا محمد تقی خاں بہادر ترقی خلف میرزا محمد امین نیشاپوری، کے متعلق لکھتے ہیں:

"از ابتدائے شوقِ موزوں طبعی تا الی الآن رجوع از تہ دل بہ اہلِ کمال (دارد) و صاحبانِ سخن از عطیۂ دستِ او زر بدست می آرند۔ ہر کس و ناکس را محروم نمی گذارد۔" (ص ۵۴)

(ب) نواب ہلال الدولہ مہدی علی خاں بہادر شجاعت جنگ متخلص بہ مہدی خلفِ نواب سعادت علی خاں بہادر کی نسبت رقم طراز ہیں:

"در سرکار دولت مدارِ ایشاں بعضے از صاحب کمالانِ ایں فن بصیغۂ شاعری عزو امتیاز دارند۔ دراں جملہ فقیر ہم داخل است پیش ازیں در حینِ حیات نواب (سعادت علی خاں) مغفور ہم با شعرائے چند ملازم ایشاں ماندہ۔"

(ص ۲۸۳)

عوام کی ادبی دلچسپیوں اور شعر و شاعری سے شغف کا اندازہ شعری محفلوں کے ذکر سے ہوتا ہے۔ شہر میں موقع بہ موقع مختلف لوگوں کے ہاں طرحی مشاعرے منعقد ہوتے رہتے تھے۔ تذکرے کی ترتیب کے آغاز سے چند سال قبل خود مصحفی نے اپنے ایک عزیز شاگرد محمد عیسیٰ تنہا (متوفی ۱۲۲۱ھ/۱۸۰۷ء) کے ایما پر تلامذہ کی تربیتِ ذوق اور طبیعت کی جلا کاری کے لیے شہر سے باہر ایک "ویرانے" میں مشاعرے کی بنیاد

ڈالی تھی[1]۔ یہ مشاعرہ جس کی رونق تمام تر مصحفی کے شاگردوں کی رہینِ منت ہوتی تھی، دو تین برس جاری رہا۔ بالآخر میاں نورالاسلام منتظر کی ناگہانی موت (۱۲۱۷ھ/۱۸۰۲-۰۳ء) کے بعد اس کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ مرزا محمد تقی ہوس بھی اکثر مشاعروں کے انعقاد میں بڑا اہتمام کیا کرتے تھے۔ ہمدم کے ذکر میں مصحفی نے ان کے ایک مشاعرے کی "شہر آشوبی" کا تذکرہ کیا ہے (ص ۳۷۳) اور اس کی طرحی غزلوں کے اشعار کئی شاعروں کے انتخاب میں نقل کیے ہیں[2]۔ مرزا محمد علی بیگ نامی کسی شخص نے ان غزلوں کا ایک مجموعہ بھی ترتیب دیا تھا (ص ۳۷۴) حسین علی خاں اثر، حکیم سید محمد، میر صدرالدین صدر، غلام اشرف، منور خاں غافل، مہراللہ خاں غیور، میر مہدی کوثر، لالہ موتی رام، میرزا حاجی قمر اور مرزا محمد جان نالاں کو بھی مشاعروں کے انعقاد سے دل چسپی تھی۔ تذکرے میں مختلف مقامات پر ان لوگوں کے یہاں منعقد ہونے والے مشاعروں کا ذکر ملتا ہے۔

شعر و سخن کی متعدد محفلوں کے پہلو بہ پہلو مصحفی نے اس تذکرے میں ایک مجلسِ مشاعرہ کا بھی ذکر کیا ہے جس کی بنا نثر نگاری و انشا پردازی کے رجحان کو فروغ دینے کی غرض سے ڈالی گئی تھی۔ اس مجلس کی سرگرمیوں میں ہندو اہلِ قلم خاص طور پر پیش پیش رہتے تھے لیکن مصحفی اور ان کے تلامذہ کی شرکت کے نتیجے میں آہستہ آہستہ رنگِ محفل بدلنا شروع ہوا اور بالآخر بات نظم کی فتح مندی پر ختم ہوئی۔ مرزا مغل فانی کے ذکر میں جو اس محفل کے بانی تھے، مصحفی نے اس سلسلے کی بعض تفصیلات اس طرح بیان کی ہیں:

---

[1] مصحفی نے اس مشاعرے کی بعض تفصیلات تذکرے کے دیباچے میں بیان کی ہیں (ص ۲) اس کے علاوہ میر علی محمد راحم (ص ۱۰۰) اور بندہ علی (بندہ علی) شفق (ص ۱۵۲) کے حالات میں بھی اس کا ذکر کیا ہے۔

[2] اس مشاعرے کی طرحی غزل کے پانچ شعر مصحفی نے اپنے کلام میں بھی نقل کیے ہیں (ص ۲۹۳) مطلع یہ ہے:

زبانِ نالہ کش کس کی ہوئی تھی گرم شیون پر ۔۔۔ گدازِ موم کا عالم نظر آتا ہے آہن پر

"بانیٔ مجلسِ مشاعرہ دریں شہر او شدہ۔ اول جماعتے از ہنودان (ہندوان) وغیرہ بتقریب نثر نویسی، چہ در زبان اردوے ریختہ وچہ در زبانِ فارسی، دراں مجلس حاضری شدند۔ چوں حسبِ اتفاق روزے گذرِ فقیر دراں مقام افتاد، برائے شریک شدنِ منشیانِ انشا پرداز آں روز ہا نثرے کہ در وصفِ دکانِ تنبولی بہ تتبع ظہوری بر مشتری (= ترشیزی) گفتہ بودم، بمعرض بیان آوردم ..... رفتہ رفتہ مجلس مناثرہ اش بمشاعرہ تبدیل یافت ..... یعنی از رفتن عاصی دراں مجلس بکثرت (و) مجمعِ کثیر شاگردان شود (شور) غزل خوانی از سامع سبحان و سامع سکان، ملاء اعلیٰ در گذشت۔" (ص ۳۰۵)

زبان کی سلاست و سادگی اور انتخاب کی پاکیزگی و نفاست جسے ہم نے "تذکرۂ ہندی" کے اوصاف میں شمار کیا ہے، اس تذکرے میں بھی بدرجۂ اتم موجود ہے۔ ہم طرح غزلیں اور اشعار بھی مصحفی نے بکثرت نقل کیے ہیں۔ جن کی مدد سے مختلف مشاعروں کے طرحی کلام کی دریافت اور زمانۂ تصنیف کے تعین کا مرحلہ بھی کسی حد تک آسان ہو جاتا ہے۔ شعرا اور منتظمینِ مشاعرہ کی عمر اور مدتِ مشق سے متعلق بیانات تحقیق کی اس منزل میں کافی دور تک ہماری رہبری کرتے ہیں۔

حاصل کلام یہ کہ "ریاض الفصحا" سوانح نگاری اور تنقیدِ کلام کے نقطۂ نظر سے تذکرہ نویسی کا کوئی بلند معیار پیش نہیں کرتا لیکن لکھنؤ کے ادبی ماحول، اردو زبان اور شاعری کی روز افزوں مقبولیت اور صاحبِ تذکرہ کی شخصیت اور اس کے دائرۂ اثر کے مطالعے میں اس کی اہمیت اور افادیت کا اعتراف ناگزیر ہے۔ اس کے ساتھ ہی تنقیدِ سیرت کے سلسلے میں مصحفی کی کوششوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

گلشن ہند

اردو ادب اور بالخصوص اردو نثر کے نشو و نما میں فورٹ ولیم کالج نے جو گراں قدر خدمات انجام دی ہیں وہ کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ اس ادارے کے زیرِ اہتمام فارسی، عربی اور سنسکرت کی بہت سی کتابیں اردو میں ترجمہ ہوئیں، جن سے ایک طرف تو اس زبان کے سرمایۂ ادب میں مفید اور قابلِ قدر اضافہ ہوا اور دوسری طرف سلیس و سادہ اسالیب بیان کی بنیاد پڑی۔ مرزا علی لطفؔ کا تذکرہ "گلشن ہند" بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ لطفؔ باقاعدہ طور پر کالج سے منسلک تو نہ تھے لیکن گلگرسٹ کی نگاہِ مردم شناس نے اس کارِ خاص کے لیے ان کا انتخاب کر کے علی ابراہیم خاں خلیلؔ کے تذکرے "گلزارِ ابراہیم" کو اردو زبان میں منتقل کرنے کی خدمت ان کے سپرد کی اور انھوں نے اسے نہایت حسن و خوبی کے ساتھ انجام دیا۔ حیدر بخش حیدریؔ کے "گلشن ہند" کے بعد شعرائے اردو کا یہ دوسرا تذکرہ ہے جس میں اظہارِ مطالب کے لیے اردو زبان کو اپنایا گیا ہے۔

"گلشن ہند" مترجم کی صراحت کے مطابق ۱۲۱۵ھ مطابق ۱۸۰۱ء میں مکمل ہوا۔ فورٹ ولیم کالج کا قیام ۱۰ر جولائی ۱۸۰۰ء مطابق ۱۷ر صفر ۱۲۱۵ھ کو عمل میں آیا تھا[1]۔ ترجمہ و تصنیف کا سلسلہ اس کے بعد شروع ہوا۔ اس بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس تذکرے کی ترتیب و تدوین صرف چند ماہ کی سعیٔ مسلسل کا نتیجہ ہے۔

---

[1] گلگرسٹ اور اس کا عہد ص ۱۳۷

"گلشن ہند" پہلی مرتبہ ۱۹۰۶ء میں رفاہِ عام اسٹیم پریس لاہور سے مولانا شبلی کی تصحیح اور مولوی عبدالحق کے مقدمے کے ساتھ چھپ کر شائع ہوا تھا۔ دوبارہ ۱۹۳۴ء میں علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ پریس سے "گلزارِ ابراہیم" کے ساتھ اس کی اشاعت عمل میں آئی۔ یہ ایڈیشن ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ نے ترتیب دیا ہے اور اشاعتِ اول کی بہ نسبت زیادہ مروّج ہے۔ اس تذکرے میں صرف اڑسٹھ شاعروں کے حالات و اشعار درج کیے گئے ہیں۔ لطفؔ کے بیان کے مطابق یہ اصل تذکرے کی پہلی جلد یا مجوزہ کام کا ایک حصہ ہے۔ دیباچے کے اختتام پر لکھتے ہیں کہ

> "حسبِ ارشاد صاحبِ عالی شان مرقوم الصدر (گلگرسٹ) کے گلشنِ ہند کی دو جلدیں کی ہیں۔ جلدِ اوّل جو تحریر کی جاتی ہے، اس میں عرش پردازیان سلاطین نامدار کی اور گوہر باریان امرائے عالی مقدار کی اور سخن تراشیاں شعرائے صاحبِ وقار کی جو کہ نام آور صاحبِ دیوان تھے، بیان کی گئی ہیں اور جلد دوم میں مذکور کیے گئے ہیں شعرائے گمنام و غیر مشہور یا وہ نو مشق کہ ہنوز نہیں تمام کر چکے ہیں کہانی شمع و پروانہ اور بلبل و گل کی۔" (اشاعت اول ص ۶)

دوسری جلد مکمل ہوئی یا نہیں، اس سلسلے میں کوئی سراغ نہیں ملتا۔ بصورتِ تکمیل اس کی ضخامت جلد اول کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہی رہی ہوگی کیوں کہ گلزارِ ابراہیم میں مذکور تین سو چھبیس شعرا میں سے پہلی جلد میں صرف اڑسٹھ ممتاز اربابِ کمال اور قدر دانانِ شعر و سخن ہی کا ذکر کیا گیا ہے۔ باقی شعرا کو یقیناً جلد دوم میں جگہ دی گئی ہوگی۔

یہ تذکرہ چونکہ فورٹ ولیم کالج تحریک کے سلسلے کی ایک تالیف ہے، اس لیے اس میں خاص توجہ زبان و بیان کی صحت و سلاست پر صرف کی گئی ہے۔ لطفؔ نے اپنے دوسرے شرکائے کار کی طرح دقیق الفاظ، مشکل عربی و فارسی تراکیب اور پیچیدہ طرزِ بیان سے احتراز کرتے ہوئے سلیس و سادہ اندازِ نگارش اختیار کیا ہے۔ ان کا بیان ہے کہ:

"مدعائے دِلی اس صاحبِ عالی تدبیر (گلکرسٹ) کا یہ معلوم ہوا ہے کہ ان فارسی کتابوں کے ہندی نثر کرنے سے مراد ہمیں یہ ہے کہ صاحبانِ انگریز تازہ ولایت سے جو آتے ہیں، ہم ان کی تربیت کے لیے یہ سارا خون جگر کھاتے ہیں تاکہ ان کے ذہن میں آسانی سے یہ عبارت آوے اور ان کی طبیعت اس سے بخوبی مزا اٹھاوے۔ تو بس لازم ہے کہ اس عبارت میں لفظِ عربی اگر آوے تو ایسا جس کو مبتدی دیکھ کر کہیں سبحان اللہ اور لفظِ فارسی جگہ پاوے تو ویسا جس کو نو مشق پڑھ کر کہیں واہ واہ ۔۔۔۔۔" (اشاعت اول ص ۳)

تحریر کی جن خصوصیات کو اس بیان میں مطلوب و مقصود قرار دیا گیا ہے، لطف نے حتی الامکان ان کا خیال رکھنے کی کوشش کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گلشن ہند کی زبان عام طور پر حد درجہ عام فہم اور روزمرہ سے بہت قریب ہے۔ البتہ قافیہ بندی کا شوق جا بجا اپنا رنگ دکھاتا ہوا نظر آتا ہے۔ چنانچہ تذکرے میں اس قسم کی مقفیٰ عبارتیں خاصی تعداد میں موجود ہیں:

(الف) نواب آصف الدولہ:۔

"بسکہ اس بلند نظر کا اہلِ کمال کی طرف میلانِ خاطر تھا، ایک ایک کمال کا ہزار ہا آدمی حاضر تھا۔ عمارت کی تعمیر پر طبیعت نہایت مصروف تھی اور خواہش شکار کی مزاج سے بشدت مالوف تھی۔ ہر روز لازم تھا ایک عمارتِ تازہ کی بنا دھرنا اور ہر سال میں واجب تھا واسطے شکار کے دو مرتبہ سفر کرنا۔" (ص ۱۳)

(ب) رضا قلی خاں آشفتہ:

"پرورش انھوں نے لکھنؤ میں پائی ہے اور کیفیت زندگی کی وہیں اٹھائی ہے۔ ۱۲۰۸ھ میں لکھنؤ سے مرشد آباد میں آئے، نواب مبارک الدولہ ناظم صوبۂ بنگالہ مرض الموت میں گرفتار تھے۔ اگرچہ معالجے میں انھوں نے رنگ مسیحائی کے دکھائے لیکن قضا و قدر سے لاچار تھے۔ بعد نواب مبارک الدولہ کی وفات کے خلف الصدق سے ان کے یعنی نواب عضد الدولہ ناصر الملک سید پیر علی خان بہادر

دلیر جنگ سے نہایت موافقت آئی اور صحبت نے بشدت یک رنگی پائی۔ چنانچہ سات برس کامل ان کی خدمت میں رہے اور قریب دو لاکھ روپیے کے بنگالہ میں پیدا کیے لیکن خرچ کرنے والے بھی ایسے بلائے روزگار تھے کہ جس دن مرشد آباد سے نکلے تو قرض دار تھے۔" (ص ۵۱۔۵۲)

(ج) نواب محبت خاں محبت:

"جوان خوش ظاہر و خوش رو ہیں اور خوش اختلاط و خوش خو۔ حسن خلق سے معمور اور مروت و جواں مردی کے ساتھ مشہور۔ فقط خوش مزاجی خلقی کے باعث انھوں نے شیوہ سخنوری کا اختیار کیا اور خوش استعدادی طبعی کے سبب طبعِ بیگانہ خو کے تئیں لطافت معنی سے یار کیا۔ جمیع اقسامِ نظم میں انھوں نے طبع آزمائی کی ہے اور اصلاح سخن کی مرزا جعفر علی حسرت سے لی ہے۔ معاصرین میں اپنے مشہور ہیں ساتھ خوش بیانی کے اور روشن طبعوں میں شہرت رکھتے ہیں ساتھ روشن زبانی کے۔" (ص ص ۱۶۶ و ۱۶۷)

یہ طرزِ تحریر قوافی کے التزام کے باوجود اس دور کے ابھرتے ہوئے رجحان اور بدلتی ہوئی قدروں کے عین مطابق ہے اور اردو کے اسالیبِ بیان کی تاریخ میں اپنا ایک مقام رکھتا ہے جس کی اہمیت کا اعتراف ناگزیر ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ "گلشن ہند" میں جابجا ایسی مثالیں بھی موجود ہیں جہاں لطف اپنی اس سلیس و سادہ روش کو برقرار نہیں رکھ سکے ہیں اور قافیہ پیمائی کی دھن انھیں سیدھے راستے سے ہٹا کر کبھی اغلاق و تعقید کے خارزار میں گھسیٹ لے گئی ہے اور کبھی فصاحت و بلاغت کے منصبِ بلند سے نیچے اتار لائی ہے۔ سطور ذیل میں اس قسم کی کچھ مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

(الف) قلندر بخش جرأت: "گو کہ آنکھوں سے کچھ نہیں سوجھتا ہے لیکن مضمونِ رنگین سوجھتا ہے۔" (ص ۴۷)

(ب) جعفر علی حسرت: "اکثر نو مشق لکھنؤ کے مع جرأت دم شاگردی کا مارتے

ہیں اور یا استاد کہہ کر پکارتے ہیں۔ (ص ۸۴)

(ج) حیدر علی حیرانؔ :۔ "ساکن شاہجہان آباد کے، شاگرد رائے سرپ سکھ دیوانہ تخلص استاد کے۔" (ص ۸۵)

(د) شاہ گھسیٹا عشقؔ :۔ "جہاں بیاں ہوتی ہے شاہ فرہاد کی حالتِ سکر و مستی ہے تو کہتے ہیں کہ اس عالم میں تعظیم بادشاہ کی نہیں کی ہے۔" (ص ۱۲۶)

(ہ) شرف الدین مضمونؔ :۔ سنخ مذکور علت سے نزلے کی منھ میں ایک دانت نہیں دھرتے تھے۔ تو خان آرزو انھیں شاعر بیدانہ کہا کرتے تھے۔ دلی میں نظمِ وجود کو اکھوا نے نامور میں بوجھا ہے اور مضمون عالی انھیں سیر عدم کا دیکھا سوجھا ہے۔ (ص ۱۶۱)

بعض اوقات محض قافیہ پیمائی اور عبارت آرائی کی خاطر لطفؔ نے "گلزارِ ابراہیم" کی صاف و سادہ عبارتوں کو توڑ مروڑ کر خواہ مخواہ پیچیدگی پیدا کر دی ہے۔ اسی طرح کئی جگہ غور و فکر کی کمی کے باعث ان کا ترجمہ اصل سے بہت دور جا پڑا ہے۔ سطور ذیل میں دونوں تذکروں کے کچھ اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں جن کے مطالعے سے ان کیفیات کا اندازہ ہو گا۔

گلزار ابراہیم	گلشن ہند
میر غلام حسین شورشؔ	
"میر غلام حسین مشہور بمیر بھینا" خواہرزادۂ ملا میر وحید و شاگرد میر باقر حزیںؔ است۔ باایں خاکسار آشنا بود۔ بحض پندار التفات بقباحتِ افکارِ خود نمی نمود۔ تذکرۂ در ریختہ تالیف نمودہ۔	"میر غلام حسین نام، متوطن عظیم آباد کے۔ مشہور میر بھنا کر کے تھے۔ بھانجے تھے میر ملا وحید کے اور مشورہ سخن کا کیا تھا میر باقر حزیںؔ تخلص سے۔ علی ابراہیم خاں مرحوم نے گلزارِ ابراہیم

خالی از دردے وحالتے نبود۔ درسنہ یک ہزار و یک صد و نود و پنج ہجری رحلت کردہ۔" (ص ۳۰۳)

میں لکھا ہے کہ میرے آشنا تھے اور بیماری میں غرور کی مبتلا تھے۔ فقط اپنے خیالِ فاسد سے انھوں نے اپنے کلام کی قباحتوں پر التفات نہیں کیا ہے۔ اس سبب سے سخن ان کا ہمیشہ موردِ اعتراض سخن گیروں کا رہا ہے۔ ایک تذکرہ شعرائے ہند کا زبان ریختہ میں انھوں نے لکھا ہے لیکن وہ بھی بسبب ان کی خود پسندی کے خالی خلل اور زلل سے نہ تھا ۱۱۹۵ھ میں اس سرائے فنا سے جادہ نوردِ منزل بقا ہوئے۔" (ص ۱۲۱)

صانع بلگرامی

"ازدوستانِ ایں خاکسار و محبانِ مرزا محمد رفیع سودا است۔ اشعارِ فارسی مدون دارد و ریختہ کمتر می گوید۔ از خواندنِ اشعارِ خوب بسیار متاثر می شود۔ بعالمِ اخلاص مستثنیٰ و ذہنش بفہمِ اشعار رساست۔ الحال بسال بست و دویم شاہ عالم بادشاہ در مرشد آباد و کلکتہ بسر می برد۔"
(ص ۳۱۰)

"علی ابراہیم خاں مرحوم نے لکھا ہے کہ محبانِ قدیم سے مرزا محمد رفیع سودا کے اور دوستانِ صمیم سے اس خاکسار کے تھے۔ بڑے صاحب درد و تاثیر اور طبیعت کی گدازی میں بے نظیر۔ اچھا شعر کسی سے سنتے تو گھڑیوں روتے اور بے چین رہتے۔ عالمِ اخلاص اور دوستی میں زمانے کے افتخار، استقامتِ طبع اور رسائی ذہن میں مستغنی روزگار تھے۔ سنہ بائیسویں تک جلوسِ شاہ عالم بادشاہ غازی کے ہمیشہ مرشد آباد

اور کلکتہ میں ایام زندگی کے بسر کرتے
تھے۔" (ص ۱۲۲)

سید عبدالولی عزلت

"باوصفِ فضیلت اطوار و
اقوالش خالی از سبکی و ہزالی نبود۔ در
زمانِ دولتِ نواب محمد علی وردی خاں
مہابت جنگ مغفور واردِ مرشد آباد و
موردِ مہربانیٔ نوابِ مذکور گردیدہ وبعدِ
انتقالِ نواب بدکن رفت۔ اشعارش
مدون بنظر ایں خاکسار در آمد۔"
(ص ۳۲۰)

"باوصف تمکنت وفضیلت
کے اوضاع واطوار اس عزیز کے خالی
سبکی اور بے مغزی سے نہ تھے۔ نواب
علی وردی خاں مہابت جنگ مغفور
کے عہدِ دولت میں وارد مرشد آباد کے
ہوئے اور موردِ عنایات وامداد کے
ہوئے۔ حرکات ان سے خلاف ان کے
منصب کے عمل میں آتے تھے اور
آنکھوں میں اربابِ تمیز کی کیفیت کو
اعتبار کی گھٹاتے تھے۔ نواب مرحوم الصدر
کی وفات کے بعد سرزمینِ دکن نورجہاں
سے اپنے منور کی اور بقایائے عمر اسی
مملکت میں بسر کی۔ دیوان ان کا مدت
سے پاچکا انتظام ہے اور یہ ان کا منتخب
کلام ہے۔" (ص ۱۲۴)

ولی دکنی

"اصلش گجرات۔ در شعرائے
دکن مشہور وممتاز است۔ گویند در
زمانۂ عالمگیر بادشاہ بہندوستان آمدہ
مستفید از شاہ گلشن گردید۔ از مشاہیرِ

"وطن بزرگوں کا اس کے
گجرات ہے۔ شاعرِ بلند مقام تھا۔
اول زبان ہندی میں دیوان اس عزیز
نے جمع کیا ہے اور نظمِ ریختہ کو سرزمینِ دکن

ریختہ گویان است و اول کسے است
کہ دیوانش در دکن مشتہر و مدون گشتہ"
(ص ۴۴۶)

میں رواج اس نے دیا۔ شعرائے
دکن میں مشہور و ممتاز ہے اور اپنے
معاصروں میں سربلند اور سرفراز۔
عالمگیر بادشاہ کی سلطنت میں ہندوستان
کی طرف آیا اور میاں گلشن کے فیضِ
خدمت سے فائدہ انواع و اقسام کا
اٹھایا۔ خوب خوب داد تلاشِ معانی
کی دی۔ آخر اس بیتِ بے معنیٔ وجود
سے راہ کاشانۂ عدم کی لی۔" (ص ۱۷۵)

لطفؔ نے غیر ضروری عبارت آرائی کا اور نفسِ مضمون سے تجاوز کے پہلو بہ پہلو بعض اوقات خلیلؔ کے بیانات پر اپنی طرف سے کچھ مفید اضافے بھی کیے ہیں۔ بالخصوص حکمراں طبقے سے تعلق رکھنے والے افراد کے حالات میں لطفؔ نے ذاتی معلومات یا تلاش و جستجو کی بنیاد پر جو تفصیلات فراہم کی ہیں، ان کی وجہ سے گلشنِ ہند کی وقعت و اہمیت کافی بڑھ گئی ہے۔ مثال کے طور پر شاہ عالم کے بارے میں خلیلؔ کے ہاں رسمی قسم کے چند جملے اور نمونۂ کلام میں صرف دو شعر ملتے ہیں جب کہ لطفؔ نے ان کے سوانح حیات کے لیے تقریباً چار صفحات وقف کر کے تمام اہم حالات اور تاریخی واقعات قلم بند کرنے کی کوشش کی ہے اور آخر میں انتخابِ کلام کے ذیل میں نو اشعار کی ایک غزل اور ایک دو شعری قطعے کے علاوہ وہ مشہور فارسی نظم بھی منظوم اردو ترجمے کی صورت میں شامل کر دی ہے جس میں شاہ عالم نے اپنی برگشتہ طالعی اور زوالِ سلطنت پر خون کے آنسو بہائے ہیں۔ نواب آصف الدولہ، عمدۃ الملک امیر خاں انجامؔ، قزلباش خاں امیدؔ، ابوالحسن تاناشاہ اور شہزادہ جہاں دار شاہ جوانبختؔ کے حالات میں بھی یہی صورت نظر آتی ہے۔ سراج الدین علی خاں آرزوؔ کے ذکر میں صاحب گلزارِ ابراہیم نے صرف ڈھائی سطر پر اکتفا کیا ہے، اس کے برخلاف لطفؔ

نے ان کی زندگی کے اہم گوشوں اور علمی و ادبی اکتسابات پر نہایت تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور ان کی شخصیت و سیرت کے متعلق ان الفاظ میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے :

"شاعرِ زبردست و صاحبِ استعداد تھا کہ اکثر مضمون میں سے مضمون کرنا ایجاد تھا۔ لطیفہ گوئی اور ظرافت میں بشدّت مشتاق، خوش طبعی اور رنگین مزاجی میں شہرۂ آفاق تھا۔" (ص ۴۴)

میر شیر علی افسوس مرزا علی لطف کے قریبی دوستوں میں سے تھے، اس لیے ان کے خاندانی و ذاتی حالات کے بیان میں بھی لطف تمام اہم پہلوؤں کا احاطہ کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔ دوران گفتگو علی ابراہیم کی ایک غلط فہمی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "علی ابراہیم خاں نے شاگرد ان کو میر حسن حسنؔ تخلص کا لکھا ہے، اس کی سند اپنے تئیں نہیں پہنچی اور یہ خبر اپنے گوش زد نہیں ہوئی۔" (ص ۴۸) آخر میں ان کی نسبت اپنے تاثرات اس طرح پیش کرتے ہیں :

"ذات ان کی زمانے کے انتخاب سے ہے۔ عجب جوانِ خلیق اور اہلِ دل ہیں۔ فروتنی اور انکساری میں فردِ کامل ہیں۔ منطق و معانی کے بیان میں صاحبِ استعداد ہیں۔ کلیات و معالجات فنِ طبابت کے بھی بخوبی یاد ہیں۔ شعرِ عاشقانہ بہت مزے سے کہتے ہیں۔" (ص ۴۹)

مرزا رضا قلی آشفتہؔ کے ذکر میں علی ابراہیم خاں لکھتے ہیں کہ "تا حینِ تحریر ایں اوراق احوالش معلوم نشد۔ ظاہرا در لکھنؤ می گذراند" لطفؔ نے ان کا تعارف کافی شرح و بسط کے ساتھ قلم بند کیا ہے۔ اس سلسلۂ کلام میں ان کی افتادِ طبع، اخلاق و عادات اور رنگِ سخن پر تبصرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ :

"جوانِ آزاد وضع اور خوش اختلاط، وارستہ مزاج اور مایۂ ارتباط ہیں۔ محبت اور یک رنگی میں خلاصے اور آشنائیوں کے بہت خاصے۔ حسن پرستی میں خود لیلیٰ و شیریں کی تصویر اور عشق بازی میں قیس و فرہاد کے پیر ہیں۔ مشورہ سخن کا انھوں نے

میر سوز صاحب سے کیا ہے لیکن شاگردوں میں ان کے اتنا کوئی نہیں ہوا ہے۔ میر صاحب مذکور کے طرزِ ادائیہ میں انھوں نے رنگینی کچھ اور بھی زیادہ کی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ رنگین ادائی کی داد دی ہے۔" (ص ۵۱)

سودا کے حالات میں لطف نے اگر کچھ زیادہ اضافے نہیں کیے ہیں، تاہم ان کے بڑھائے ہوئے یہ چند جملے کافی اہم ہیں لکھنؤ میں ورود کے بعد کے واقعات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"نواب آصف الدولہ مرحوم نے بہت قدر و منزلت کی اور چھ ہزار روپیہ سالانہ کی جاگیر مقرر کر دی۔ چنانچہ بیشتر قصیدے نواب آصف الدولہ مرحوم کی تعریف میں کہے ہیں اور کیا کیا تر و تازگی کے ساتھ مضامین عالی باندھے ہیں...
.....آغا باقر کا امام باڑہ اس محب امام علیہ السلام کا مدفن ہے۔" (ص ۱۰۴)

قائم چاندپوری کے کلام کی نسبت علی ابراہیم کے خیالات کی ترجمانی کے ساتھ ساتھ اپنی رائے ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں:

"اگرچہ اقسامِ نظم میں کوئی قسم اس شیریں کلام سے نہیں رہی ہے لیکن رغبتِ طبیعت کے ساتھ غزل اور مثنوی بیشتر کہی ہے۔ دیوان ان کا بھرا ہوا اشعارِ آبدار سے ہے۔" (ص ۱۳۴)

علی ابراہیم نے جس زمانے میں "گلزار ابراہیم" میں میر صاحب کا حال سپردِ قلم کیا ہے وہ (میر صاحب) دہلی میں مقیم تھے لیکن "گلشن ہند" کی تالیف کے وقت ان کے ترکِ وطن اور لکھنؤ میں سکونت کو تقریباً انیس (۱۹) سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔ اس درمیانی مدت میں حالات نے جو رخ بدلے، لطف کے بیانات سے بڑی حد تک ان کی کیفیت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ مثلاً نواب آصف الدولہ کی خدمت میں باریابی اور ان کی قدر شناسی کے سلسلے میں رقم طراز ہیں کہ:

"سنہ گیارہ سو ستانوے (۱۱۹۷ھ) ہجری میں رایاتِ عزم اس صاحبِ لشکر مضامینِ تازہ کے حرکت میں آئے اور خود بدولت لکھنؤ میں تشریف لائے۔

نواب آصف الدولہ مرحوم نے روز ملازمت خلعتِ فاخرہ دیا اور تین سو روپیہ مشاہرہ مقرر کر کے تحسین علی خاں ناظر کے سپرد کیا۔ اگرچہ گرفتہ مزاجی سے ان کی روز بروز صحبت نواب مرحوم سے بگڑتی گئی لیکن تنخواہ میں کبھی نہ قصور ہوا۔"

(ص ۱۵۳)

میرؔ کے کلام کے بارے میں بھی ایسی جامع اور مانع رائے دی ہے جو ایک طرف ان (لطفؔ) کے ادبی شعور اور ناقدانہ بصیرت کی آئینہ دار ہے اور دوسری طرف میرؔ اور مرزاؔ کے فرقِ مراتب کی وضاحت کرتی ہے۔ لکھتے ہیں کہ:

"اقسامِ نظم میں یہ صدر نشینِ بارگاہِ سخن دانی ہر قسم چکیدۂ خامۂ معجز نما رکھتا ہے لیکن سچ تو یہ ہے کہ نظم غزل میں یدِ بیضا رکھتا ہے۔ قصیدہ تو ختم مرزا محمد رفیع سوداؔ پر ہوا۔ ہاں طرز مثنوی کی بھی ان کی بہت خوب ہے۔ خصوصاً دریاے عشق جو ان کی مثنوی ہے اک جہاں کو مرغوب ہے۔" (ص ۱۵۳)

مرزا علی لطفؔ کا یہ وصف بھی قابلِ تعریف ہے کہ انھوں نے اپنے مشاہدات کے بیان اور ذاتی رایوں کے اظہار میں بڑی جرأت اور صاف گوئی سے کام لیا ہے وہ بعذرِ مصلحت حقائق کے بیان میں تامل کے قائل نہیں۔ بطور مثال نواب آصف الدولہ کے ذکر میں ان کی سخاوت و شجاعت کی تعریف کے ساتھ ساتھ وہ اس امر کا اظہار بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ

"ملک کی طرف سے غفلت تھی۔ نائبوں کے ہاتھ میں اصالتاً ملک کا سرانجام رکھا۔ آپ فقط سیر اور شکار سے کام رکھا۔ مشیر کوئی لائق اور کام کا نہ پایا۔ اس واسطے ساتھ عزم کے رتبہ نام کا نہ پایا۔" (ص ۱۴)

سراج الدین علی خاں آرزوؔ کے فضل و کمال اور ذوقِ شعر و ادب کی دل کھول کر داد دیتے ہیں۔ لیکن جہاں شیخ علی حزیںؔ سے معارضے اور اس کے نتیجے میں "تنبیہ الغافلین" کی تصنیف کا ذکر آیا ہے وہاں صاف صاف یہ لکھ دیا ہے کہ:

"عوام کی طبیعت تو ان اعتراضوں سے البتہ تشویش میں پڑتی ہے

نہیں تو صاف نزاع معلوم ہوتی ہے، جب باریک بینوں کی نگاہ اس سے جا لڑتی ہے۔" (ص ۲۳)

محمد حسین کلیم کے حالات بعینہٖ "گلزارِ ابراہیم" کا ترجمہ ہیں۔ لطفؔ نے صرف ایک جملہ کا اضافہ کیا ہے اور وہ یہ ہے:

"باوصف اس خوش گوئی کے کلامِ مشہور کم رکھتا ہے۔" (ص ۱۴۵)

لطفؔ نے بعض جگہ ضمناً اپنے زمانے کے معاشی و معاشرتی حالات کی طرف بھی اشارے کیے ہیں۔ ان کے بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانے میں لکھنؤ میں جو آصف الدولہ کے دورِ حکومت کی ابتدا کے ساتھ ہی شعر و ادب کا ایک توانا مرکز بن گیا تھا، متاعِ ہنر کی کساد بازاری عام ہوتی جا رہی تھی۔ اربابِ کمال دولت و ثروت کی فراوانی کے باوجود قدر ناشناسی اور مالی مشکلات سے نبرد آزما تھے۔ حتّٰی کہ بعض اکابر شعرا بھی کس مپرسی اور تنگ دستی کی زندگی گزار رہے تھے۔ میر تقی میرؔ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ

"ناقدردانی سے اغنیا کی اور نا سمجھی سے اہل دنیا کی اب بازارِ سخن سازی اس درجہ کاسد ہے اور ہوائے شہرستان معنی طرازی اس مرتبہ فاسد ہے کہ میر سا شاعر جو کہ سحر کاریٔ سخن میں طلسم ساز ہے خیال کا اور جادو طرازیٔ بیان میں معانی پرداز ہے مقال کا، وہ نانِ شبینہ کا محتاج ہے اور کوئی نہیں پوچھتا جو حالت اس کی آج ہے۔ جن ایام میں کہ درخواست صاحبان عالی شان کی زباں دانانِ ریختہ کے مقدمے میں کلکتہ سے لکھنؤ کو گئی تو پہلے کرنل اسکاٹ صاحب کے روبرو تقریب میر کی ہوئی لیکن علت پیری سے یہ بیچارے مجہول کے محمول ہوئے اور جوانانِ نو مشق مربی گری سے قوت بدنی کی مقبول ہوئے۔" (ص ۱۵۲)

مصحفیؔ کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

"بالفعل کہ ۱۲۱۵ھ بارہ سو پندرہ ہجری میں ایک چودہ برس سے اوقات لکھنؤ میں بسر کرتا ہے۔"[1]

---

[1] لکھنؤ میں مدت قیام کے متعلق لطفؔ کا یہ بیان ترمیم طلب ہے۔ مصحفیؔ ۱۱۹۸ھ/۱۷۸۴ء میں وہاں پہنچے تھے۔ (عقد ثریا ص ۱۳ و ۱۴) اس لحاظ سے یہاں چودہ کی بجائے سترہ برس ہونا چاہیے۔

ضیقِ معاش تو وہاں ایک مدت سے نصیبِ اہلِ کمال ہے، اسی طور پر درہم و برہم اس غریب کا بھی احوال ہے۔" (ص ۱۶۶)

جیسا کہ ابتدا میں عرض کیا جا چکا ہے "گلشنِ ہند" فورٹ ولیم کالج تحریک کے سلسلے کی ایک کڑی اور اردو کے عوامی و جمہوری کردار کی بنا پر اس سے نووارد انگریز حکام کے شغفِ خاص کی ایک دستاویز ہے۔ اس حقیقت سے قطع نظر کر کے بھی اس تذکرے سے انگریزوں کی اردو زبان اور اس کے شعری ادب سے دل چسپی کے بارے میں کافی معلومات حاصل ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر میر شیر علی افسوس کے متعلق لطف کا بیان ہے کہ

"ایک مدت سے بہ توکل و قناعت ہمراہی ہیں نواب سرفراز الدولہ بہادر کی دن زندگی کے بسر کر رہے تھے کہ صاحب والا مناقب عالی شان بارلو صاحب نے مشورہ سے عالی قدر سخن آفریں مسٹر گلکرسٹ صاحب کے زبان دانِ ریختہ لکھنؤ سے طلب کیے۔ بڑے صاحب نے لکھنؤ کے نام نامی اس معدنِ رافت کا ہر صاحب (؟) سے بعزت تمام ان کو بلوا کے اور مشاہرہ دو سو روپیہ کا ٹھہرا کے، پانچ سو روپیہ خرچ راہ دیا اور کلکتے کی طرف روانہ کیا۔۔۔۔۔۔ بالفعل کہ ۱۲۱۵ھ بارہ سو پندرہ ہجری ہیں بلدۂ کلکتہ میں صاحبان عالی شان کے ساتھ میر مذکور ملاقاتیں بعزت تمام رکھتے ہیں اور گلستان کے ترجمے کا کمپنی کی طرف سے کام رکھتے ہیں۔" (ص ۴۹)

حافظ رحمت خاں کے صاحبزادے نواب محبت خاں محبتؔ کے ذکر میں رقم طراز ہیں کہ

"قصۂ سستی پنو کا فرمانے سے ممتاز الدولہ مسٹر جانسین بہادر کے انھوں نے نظم کیا ہے اور نام اس مثنوی کا اسرارِ محبت رکھا ہے۔" (ص ۱۶۷)

میر قمر الدین منتؔ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

"مربی گری سے میر۔۔۔۔۔۔ (محمد حسین لکھنوی) کی ممتاز الدولہ مسٹر جانسین بہادر کی سرکار میں توسل انھوں نے حاصل کیا اور رفاقت میں صاحبِ مذکور کی کلکتہ آ کر عماد الدولہ گورنر مسٹر ہیسٹین (وارن ہسٹنگز) جلادت جنگ بہادر کی اعانت کے

باعث پیش گاہِ نظامت سے صوبہ بنگ کی خطاب ملک الشعرا کا لیا۔" (ص ۱۷۱)

"گلشن ہند" میں علی ابراہیم کے بیانات کے ترجموں کے پہلو بہ پہلو لطف کی اپنی تحریروں میں بھی سنین کے حوالے خاصی تعداد میں موجود ہیں۔ بالخصوص ان لوگوں کے ذکر میں جو "گلزار ابراہیم" کی تالیف کے بعد وفات پا چکے تھے، لطف نے عام طور پر زمانۂ رحلت کی صراحت کر دی ہے۔ لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ اس سلسلے میں ان کے بیشتر بیانات خلافِ واقعہ اور ناقابلِ اعتبار ہیں۔ ہم ان میں سے یہاں چند مثالیں پیش کرتے ہیں:

(الف) عمدۃ الملک امیر خاں انجام کے حال میں لکھتے ہیں:

"سنہ ۱۱۶۹ھ گیارہ سو انہتر ہجری میں ایک نمک حرام نے ..... اس روشن زبان کی زندگی کے چراغ کو ایک ہی جھونکے میں کٹاری کے بجھا دیا۔" (ص ۱۶)

انجام کا سال شہادت سنہ ۱۱۶۹ ہجری نہیں سنہ ۱۱۵۹ھ ہے۔ علی ابراہیم نے بھی ان کی شہادت کو اسی سال (۱۱۵۹ھ) کا واقعہ قرار دیا ہے[1] امراللہ الہ آبادی نے اپنے تذکرے میں اس واقعے کو اس طرح بیان کیا ہے:

"در سالِ ہزار و یک صد و پنجاہ و نہ (۱۱۵۹ھ) ملعونے از ملازمانش غافل نمودہ در صحنِ دولت خانۂ بادشاہ شربتِ شہادت بچشانید و انجامش بخیر گردید۔"[2]

(ب) میر حسن کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

"انھوں نے سنہ ۱۲۰۵ھ میں سیر روضۂ رضوان کی کی ہے۔" (ص ۹۲)

حسن کا انتقال محرم سنہ ۱۲۰۱ھ کے عشرۂ اول میں ہوا ہے، مصحفی جو ان کے قریبی دوست تھے اپنے تذکرے میں لکھتے ہیں کہ:

"در عشرۂ ماہِ محرم رحلت اوست ..... فقیر تاریخ رحلتش چنیں یافتہ۔ تاریخ:

---

[1] گلزار ابراہیم ص ۵ [2] مسرت افزا ص ۹

چوں حسنؔ آں بلبل خوش داستاں　　رو ازیں گلزارِ رنگ و بو بتافت
بس کہ شیریں بود نطقش، مصحفیؔ　　"شاعرِ شیریں زباں" تاریخ یافت[1]

(ج) خواجہ میر دردؔ کی نسبت رقم طراز ہیں کہ:

"سنہ ۱۲۰۲ھ بارہ سو دو ہجری میں اس بلبلِ گلشنِ آزاد نے دامِ ہستی سے نکل کر شاخسار کو چمنِ عدم کے آباد کیا۔" (ص ۹۹)

حسین قلی خاں عاشقیؔ عظیم آبادی اور خیراتی لال بےؔ جگر نے دردؔ کی تاریخِ وفات "بست و چہارم صفر روز جمعہ سنہ یک ہزار و یک صد و نود و نہ ہجری" بیان کی ہے[2]۔ میر اثرؔ (برادرِ خواجہ میر دردؔ) کے مستخرجہ مادۂ تاریخ "وصلِ خواجہ میر دردؔ" سے بھی یہی سال (۱۱۹۹ھ) برآمد ہوتا ہے۔

(د) میر شمس الدین فقیرؔ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

"سنہ ۱۱۷۰ھ گیارہ سو سترہ ہجری میں واسطے حج و زیارت کے تشریف لے گئے اور بعد حصولِ سعادت کے جب کہ پھرے تو کشتیٔ حیات اس آشنائے بحرِ معانی کی گردابِ ممات میں تباہ ہو کر ڈوبی۔" (ص ۱۲۹)

حسین قلی خاں عاشقیؔ کے بیان کے مطابق فقیرؔ سنہ ۱۱۸۱ھ میں زیارتِ عتباتِ عالیات کے لیے تشریف لے گئے تھے اور سنہ ۱۱۸۳ھ میں اس سفر سے واپسی کے وقت بصرہ کے قریب ان کی کشتی غرق ہوئی تھی[3]۔ حکیم وحید اللہ بدایونی کا بیان بھی اس روایت سے مطابقت رکھتا ہے۔ انھوں نے اس سلسلے میں علامہ آزادؔ بلگرامی کی درج ذیل تاریخی رباعی بھی نقل کی ہے:

---

[1] تذکرۂ ہندی ص ۶۹

[2] نشترِ عشق مخطوطہ رضا لائبریری رام پور ورق ۲۵۴ ب۔ تذکرہ بےؔ جگر مخطوطہ انڈیا آفس لائبریری لندن ورق ۶۶ ب

[3] عاشقیؔ کا مکمل بیان تذکرہ میر حسنؔ کے زمانۂ ترتیب پر بحث کے ذیل میں گذشتہ اوراق میں نقل کیا جا چکا ہے

رفت از عالم سخن و رشیریں ہائے　　خوابیدہ بخاک شاعرِ رنگیں ہائے
آزاد نوشت مصرعۂ تاریخش　　کو آہ فقیر میر شمس الدیں ہائے[1]

۱۱۸۳ھ

(۸) مرزا مظہر جانجاناں کی شہادت کا سنہ صاحبِ "گلزارِ ابراہیم" نے ۱۱۹۴ھ قرار دیا ہے۔ (ص ۴۰۳) لطف بھی اپنے ترمیم کردہ ترجمے میں یہی سنہ نقل کرتے ہیں (ص ۱۶۰) لیکن واقعہ یہ ہے کہ مرزا صاحب شب ہفتم ماہِ محرم ۱۱۹۵ھ کو طپنچے کی گولی سے زخمی ہوئے اور اسی حادثے کے نتیجے میں عاشورہ کے دن ان کا انتقال ہوا۔ مصحفی لکھتے ہیں:

"شخصے ..... شبِ ہفتم محرم الحرام سنہ یک ہزار و یک صد و نود و پنج او را بہ گولۂ طپانچہ مجروح ساخت ..... چوں زخم بہ پہلوے دل رسیدہ بود، بروزِ عاشورہ طائرِ روحش از قفسِ عنصری پرواز کرد۔"[2]

میر قمر الدین منت کی کہی ہوئی تاریخ "عاش حمیدًا، مات شہیدًا" اور مرزا سودا کی درج ذیل رباعی کے آخری مصرعے سے بھی ۱۱۹۵ھ ہی برآمد ہوتا ہے۔ قطعہ

مرزا کا ہوا جو قاتل اک مرتدِ شوم　　اور ان کی خبر ہوئی شہادت کی عموم
تاریخ از روے ورد یسن کے کہی　　سودا نے کہ "ہائے جانجاناں مظلوم"

۴　　۱۱۹۱+۴ = ۱۱۹۵ھ

(۹) قمر الدین منت کے ذکر میں رقم طراز ہیں:

"۱۲۰۶ھ بارہ سو چھ ہجری میں نواب سرفراز الدولہ مرزا حسن رضا خاں بہادر اور مہاراجہ ٹکیٹ رائے ..... لکھنؤ سے کلکتہ جو تشریف لائے تو میر قمر الدین منت بھی ساتھ آئے۔ ایک تین چار روز تپِ محرق ان کو عارض ہوئی اور بغیر جان کے لیے وہ تپ نہ گئی چنانچہ کلکتہ اس سید غریب الدیار کا مدفن ہوا۔" (ص ۲۷۱)

---

[1] مختصر سیر ہندوستان ص ۹۱　　[2] عقد ثریا ص ص ۵۵ و ۵۶

منت کا انتقال ۱۲۰۸ھ میں ہوا ہے۔ ان کی تاریخ وفات "مردِ شمعِ بزمِ عرفاں آہ حیف" اور لفظ "غروب" سے نکلتی ہے[1]

واقعات کے بیان میں اس قسم کی غلطیوں کی وجہ سے "گلشن ہند" کی استنادی حیثیت کمزور ہوگئی ہے پھر بھی اس تذکرے میں مفید اور معلومات افزا مواد کافی مقدار میں موجود ہے۔ خصوصاً لکھنؤ، عظیم آباد اور کلکتے سے متعلق شعرا کے بارے میں ہمیں اس سے بہت سی اہم اور کارآمد باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ اردو ادب کی تاریخ میں اس اعتبار سے بھی اس تذکرے کی اہمیت کبھی کم نہ ہوگی کہ اپنے موضوع سے متعلق یہ پہلی کتاب ہے جس میں شعرائے اردو کے تعارف کے لیے اردو زبان استعمال کی گئی ہے۔

---

[1] زیرِ نظر باب کے ابتدائی صفحات میں "تذکرۂ ہندی" کے بیانات پر تنقید کے ذیل میں اس حادثے کے سالِ وقوع پر مفصل بحث کی جا چکی ہے۔

تذکرۂ عشقی

شیخ وجیہ الدین عشقی عظیم آبادی صوبۂ بہار کے اہلِ قلم میں ایک ممتاز حیثیت کے مالک ہیں۔ زیرِ بحث تذکرہ ان کی وہ گراں قدر علمی یادگار ہے جس نے انھیں اردو ادب کی تاریخ میں حیاتِ دوام عطا کر دی ہے۔ یہ تذکرہ پروفیسر کلیم الدین احمد کی کوشش سے "تذکرۂ شورش" کے ساتھ "دو تذکرے" کے عنوان سے دو جلدوں میں شائع ہو کر منظرِ عام پر آ چکا ہے۔ یہ دونوں جلدیں لیبل لیتھو پریس پٹنہ کی مطبوعہ ہیں۔ پہلی جلد ۱۹۵۹ء میں اور دوسری ۱۹۶۳ء میں چھپ کر شائع ہوئی ہے۔

مطبوعہ متن بعد بودلین لائبریری آکسفورڈ کے مخطوطے پر مبنی ہے جس کے چند درمیانی اوراق ضائع ہو گئے ہیں۔ یہ ضائع شدہ اجزا ایک دوسرے قلمی نسخے سے جو قاضی عبدالودود صاحب مرحوم کی ملکیت تھا، نقل کر کے دوسری جلد کے آخر میں بطور ضمیمہ شامل کر دیے گئے ہیں۔ موخر الذکر نسخے کے مطابق اس تذکرے میں چار سو اڑتیس[۴۳۸] شاعروں کے حالات و اشعار درج ہیں۔ ان دو نسخوں کے علاوہ "تذکرۂ عشقی" کا ایک ناقص الطرفین نسخہ لکھنؤ یونیورسٹی کی ٹیگور لائبریری میں بھی موجود ہے۔ ان تینوں نسخوں سے تذکرے کے نام، زمانۂ ترتیب اور ان کے سنینِ کتابت کے بارے میں کوئی واضح اور فیصلہ کن معلومات حاصل نہیں ہوتی، کیوں کہ نہ تو ان میں سے کسی کے آغاز میں کوئی مقدمہ یا دیباچہ ہے اور نہ آخر میں ترقیمہ۔ اشپرنگر کی فہرست میں سالِ ترتیب ۱۲۱۵ھ مرقوم ہے[۱]۔ اس کے برخلاف قاضی عبدالودود صاحب اسے ۱۲۰۵ھ اور

[۱] بحوالہ یادگار شعرا ص ۶

۱۲۳۰ھ کے درمیانی عرصے کی تالیف قرار دیتے ہیں[۱]۔ ہمارے نزدیک پہلا خیال قطعاً بے بنیاد اور دوسری رائے کسی قدر ترمیم طلب ہے۔ صحیح صورت حال کا اندازہ درج ذیل تفصیلات کی روشنی میں کیا جا سکتا ہے۔

(الف) محمد یار خاں امیرؔ کے متعلق عشقیؔ کا بیان ہے کہ:

"مرد یست خوش خلق و قدر دان و جوانیست جوہر شناس سخنوران مشقِ سخن باستصواب محمد قائم قائمؔ تخلص می کند۔" (جلد اول ص ۵۶)

امیرؔ کی تاریخِ وفات غرہ ذی قعدہ ۱۱۸۸ھ/۳ر جنوری ۱۷۷۵ء ہے[۲] اس لحاظ سے ان کے حالات یقیناً ذی قعدہ ۱۱۸۸ھ/جنوری ۱۷۷۵ء سے قبل لکھے جا چکے ہوں گے۔

(ب) میر بہادر علی وحشتؔ کے متعلق لکھتے ہیں کہ

"از یارانِ میر جعفر علی حسرتؔ و منسلکانِ سرکارِ نواب شجاع الدولہ بہادر است۔" (جلد دوم۔ ص ۳۱۹)

شجاع الدولہ کا انتقال ذی قعدہ ۱۱۸۸ ہجری کے عشرۂ ثالث (جنوری ۱۷۷۵ء) میں ہوا ہے[۳] اور موت کے بعد ان کی سرکار سے وابستگی کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ وحشتؔ کا حال بھی ۱۱۸۸ھ/۱۷۷۵ء سے قبل یا زیادہ سے زیادہ ۱۱۸۸ھ/۱۷۷۵ء میں قلم بند کیا گیا ہوگا۔

(ج) شاہ سعد اللہ شاہ عظیم آبادی کی نسبت رقم طراز ہیں کہ

"بر راقم آثم توجہ و اشفاق بسیار می فرماید۔ خدایش سلامت باکرامت دارد۔"

(جلد دوم۔ ص ۲۵)

ڈاکٹر ممتاز احمد کی تحقیق کے بموجب شاہؔ نے ۲۴ر ذی قعدہ ۱۱۹۹ھ (۲۸ر ستمبر ۱۷۸۵ء)

---

[۱] مقدمۂ دیوانِ جوشش ص ۱۵

[۲] اخبار الصنادید جلد اول ص ۵۶۰ و تذکرہ کاملانِ رام پور ص ۲۴۸

[۳] تاریخ اودھ از نجم الغنی جلد دوم ص ۲۹۴

کو وفات پائی ہے[1]۔ باہمی تعلقات کے پیشِ نظر اس واقعے سے عشقی کی لاعلمی بعید از قیاس ہے اس لیے ان کے حالات یقینی طور پر اس تاریخ سے قبل معرضِ تحریر میں آئے ہوں گے۔

(۷) سرپ سکھ دیوآنہ کے بارے میں لکھتے ہیں:

"اکثرے از موزوں طبعانِ لکھنؤ بصلاح وصوابدیدِ آں ذی استعداد بمشقِ سخن می پردازند وبصحبتش ہنگامۂ قیل وقال گرم می سازند"

(جلد اوّل۔ ص ۳۱۸)

دیوآنہ کی تاریخِ وفات رائے بھگوان داس ہندی نے اس طرح نظم کی ہے:

بچار شنبۂ ماہِ صیام، نوزدہم — برفت رائے سرپ سکھ سوے بہشت بریں
"بہشت یافتہ" تاریخِ رحلتش باشد — دلیلِ مغفرت او ہمیں بود بہ یقیں[2]

"بہشت یافتہ" سے ۱۲۰۳ھ برآمد ہوتا ہے۔ قاضی عبدالودود صاحب تقویم کی روشنی میں اس سنہ سے اتفاق نہ کرتے ہوئے ۱۲۰۴ھ (۱۷۹۰ء) کو سالِ وفات قرار دیتے ہیں[3]۔ بہر دو صورت دیوآنہ کے حالات ۱۲۰۴ھ/۱۷۹۰ء سے قبل لکھے گئے ہیں۔

(۸) میر حسن کے بارے میں لکھتے ہیں:

"قریب چار سال است کہ ..... بعالمِ جاودانی رحلت نمود"

(جلد اول۔ ص ۲۱۴)

مصحفی کی تحریر کے مطابق میر حسن کا انتقال محرم ۱۲۰۱ھ (نومبر ۱۷۸۶ء) کے عشرۂ اول میں ہوا ہے[4] اس لیے اندازہ یہ ہے کہ ان کے حالات ۱۲۰۴ھ کے اواخر

---

[1] مثنویات راسخ ص ۳۱

[2] سفینۂ ہندی ص ۷۳

[3] نوائے ادب بمبئی شمارہ

[4] تذکرہ ہندی ص ۶۹

(۱۷۹۰ء) میں سپردِ قلم کیے گئے ہوں گے۔

(و) محمد علی تمنّا عظیم آبادی کے حالات میں لکھتے ہیں:

"از چند سال بسررشتۂ منشی گری در عدالتِ فوجداریٔ شہر بنارس برفاقت عزیز الملک امین الدولہ علی ابراہیم خاں بہادر نصیر جنگ المتخلص بہ حال می گذرانند"

(جلد دوم، ضمیمہ نمبر ۱۔ ص ۷)

علی ابراہیم خاں کے متعلق عشقی نے آئندہ صفحات میں خود ہی یہ معلومات فراہم کی ہے کہ ۱۲۰۸ھ میں محرم کی تیئیسویں[۲۳] تاریخ (۳۱ اگست ۱۷۹۳ء) کو ان کا انتقال ہوگیا۔[۱] جرأت کے مستخرجہ مادۂ تاریخ "لو آہ مٹا مطلعِ دیوانِ عدالت" سے بھی اس سنہ کی تائید ہوتی ہے، لہٰذا ان کی رفاقت میں بنارس کی عدالتِ فوجداری سے تمنّا کی وابستگی کے متعلق یہ بیان محرم ۱۲۰۸ھ اگست ۱۷۹۳ء سے قبل کی تحریر قرار پاتا ہے۔

(ز) آصف الدولہ کے بارے میں رقم طراز ہیں:

"بالفعل در شہر لکھنؤ کوسِ ناموری و کرم گستری می نوازد" (ج ۱، ص ۵۳)

یہ عبارت آصف الدولہ کی تاریخِ وفات یعنی ۲۸ ربیع الاوّل ۱۲۱۲ھ[۵۲] ۲۰ ستمبر ۱۷۹۷ء سے قبل معرضِ تحریر میں آئی ہے۔

(ح) محمد علی وہمؔ کے ذکر میں لکھتے ہیں:

"از منسلکانِ سرکار نواب آصف الدولہ بہادر است" (ج ۲۔ ص ۳۰۷)

اس بیان سے پتا چلتا ہے کہ عشقی نے وہمؔ کے حالات بھی آصف الدولہ کی زندگی میں یعنی ۲۸ ربیع الاول ۱۲۱۲ھ / ۲۰ ستمبر ۱۷۹۷ء سے قبل تحریر کیے ہیں۔

(ط) خواجہ میر درد کے فرزند صاحب میر الم کی نسبت لکھتے ہیں:

"بالفعل در شاہجہان آباد بطریقِ بزرگانِ خود درویشانہ زندگی می گذرانند"

(ج ۱۔ ص ۵۰)

---

[۱] دو تذکرے۔ جلد اول ص ۲۴۳

[۵۲] تاریخ اودھ از نجم الغنی جلد سوئم ص ۳۵۰

الم کا انتقال ۲۱ر جمادی الاخریٰ ۱۲۱۵ھ (۹ر نومبر ۱۸۰۰ء) کو ہوا ہے[1] اور یہ عبارت ان کے بقید حیات ہونے کی نشان دہی کرتی ہے۔ اس لیے اسے ۱۲۱۵ھ/۱۸۰۰ء سے قبل کی تحریر ہونا چاہیے۔

(ی) میر شیر علی افسوس کے بارے میں یہ معلومات فراہم کرتے ہیں:

"الحال از چند سال در شہر کلکتہ بسرکار دولت مدار کمپنی انگریز بہادر بعہدۂ منشی گری نثر ہندی سرفراز گردیدہ بفراغ بالی و خوش حالی می گذراند۔"

(ج ۱۔ ص ۵۴)

افسوس ۱۲۱۵ھ/۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج کے ملازم کی حیثیت سے کلکتہ پہنچے[2] اور ۱۲۲۴ھ (۱۹ر ستمبر ۱۸۰۹ء) میں وہیں ان کا انتقال ہوا۔[3] اس لحاظ سے تذکرۂ عشقی میں ان کا حال ۱۲۱۵ھ/۱۸۰۰ء اور ۱۲۲۴ھ/۱۸۰۹ء کے درمیان کسی سال میں لکھا گیا ہوگا

(ک) میر محمد رضا کے متعلق لکھتے ہیں:

"مدتے در شہر عظیم آباد طرح استقامت افگندہ۔ آخر در شہر مرشد آباد بسرکار نواب مبارز الدولہ بہادر بکام دل گذرانیدہ وہما نجا وفات یافت۔" (ج ۱۔ ص ۳۵۵)

رضا کی وفات کے سلسلے میں خیراتی لال بے جگر کا بیان ہے کہ:

"در سنہ یک ہزار و دو صد و شانزدہ رشتۂ حیاتش بمقراض اجل قطع شد۔۔۔۔۔ آغا حسین قلی خاں عاشقی ازیں مادہ کہ "افسوس از رضا" تاریخ وفاتش برآوردہ۔"[4]

اس شہادت کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ رضا کا حال بھی ۱۲۱۶ھ/۱۸۰۱ء

---

[1] خواجہ میر درد۔ ذکر اور فکر ص ۱۹۳

[2] گلکرسٹ اور اس کا عہد ص ۲۲۰ و بنگال کا اردو ادب ص ۱۰۰

[3] دستور الفصاحت ص ص ۲۰۱ و ۲۰۳ و بنگال کا اردو ادب ص ۱۱۸

[4] تذکرۂ بے جگر مخطوطۂ لندن ورق ۸۹ ب

کے بعد تذکرے میں شامل کیا گیا ہے۔

(ل) محمد قلی خاں مشتاق کے حال میں لکھتے ہیں:

"بود مشتاق لقائے حیدر، تاریخ وفات اوست۔" (ج ۲۔ص ۲۲۷)

اس مادۂ تاریخ سے ۱۲۱۶ھ برآمد ہوتا ہے اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ مشتاق کے حالات ۱۲۱۶ھ/۱۸۰۱ء کے بعد لکھے گئے ہیں۔

(م) مفتی غلام مخدوم ثروت کے بارے میں لکھتے ہیں:

"از مدتے در شہرِ عظیم آباد طرحِ اقامت انداختہ بدرس و تدریس می پرداخت ..... ناگاہ بہ اجلِ طبعی جہانِ فانی را پدرود نمود۔"

(ج ۱۔ص ۱۱۰)

پروفیسر اختر اورینوی نے مفتی صاحب کا سنہ رحلت ۱۲۱۹ھ (۱۸۰۴ء) متعین کیا ہے[1] اس روشنی میں ان کا تعارف ۱۲۲۰ھ/۱۸۰۵ء یا زمانۂ مابعد کی تحریر قرار پاتا ہے۔

(ن) آیت اللہ جوہری کی نسبت رقم طراز ہیں:

"عرصہ پانزدہ سال می شود کہ ازیں دارِ فانی بعالمِ جاودانی انتقال فرمود۔" (ج ۔ص ۱۱۸)

اختر اورینوی اور ممتاز احمد نے "تذکرۃ الصالحین" کے حوالے سے جوہری کی تاریخِ رحلت یکم رجب ۱۲۱۰ھ (۱۱ر جنوری ۱۷۹۶ء) بیان کی ہے[2] عشقی کی تحریر کے بموجب ان کے حالات اس تذکرے میں وفات کے پندرہ سال بعد یعنی ۱۲۲۵ھ/۱۸۱۰ء میں قلم بند ہوئے ہیں۔

(س) مرزا جان طپش کی زندگی کے آخری ایام کی تفصیلات اس طرح بیان

---

[1] بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا ص ۲۸۸

[2] بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا ص ۲۳۸ و مثنویات راسخ ص ۳۷

کرتے ہیں:

"بمقدمۂ نواب شمس الدولہ بہادر بحکمِ صاحبانِ عالی شانِ کونسل بشہر کلکتہ اسیر و محبوس گشتہ اوقات بہ تلخ کامی بسر بردہ ..... بعد چند سال ازیں بلائے ناگہانی بنجات یافتہ ..... بہ اجلِ طبعی ازیں دار رحلت فرمود۔" (ج ۲۔ ص ۵۵)

طپش ۱۲۲۱ھ (۱۸۰۶ء) میں قید سے رہا ہوئے (طپش از قیدِ الم یافت رہائی) اور "بیاضِ طپش" کی ایک تحریر سے جس میں انھوں نے اپنے ہاں بیٹے کی ولادت کی اطلاع دی ہے، سہ شنبہ ۸ر شعبان ۱۲۲۹ھ (۲۶ر جولائی ۱۸۱۴ء) تک ان کے بقیدِ حیات ہونے کا ثبوت ملتا ہے[1]۔ میر غلام حسین شائق کے مستخرجہ مادۂ تاریخ "حالا بکسوف آمد ماہے سخنِ اردو" سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی وفات ۱۲۳۰ھ میں واقع ہوئی[2]۔ اس لیے "تذکرۂ عشقی" کے صفحات پر ان کے متعلق یہ معلومات ۱۲۳۰ھ (۱۸۱۵ء) میں یا اس کے بعد فراہم کی گئی ہوں گی۔

(ع) ظہور اللہ خاں نوا کے بارے میں لکھتے ہیں:

"چندے در شہر بنارس ..... بفراخیٔ حال گذرانیدہ آخر ازیں جا بسمتِ لکھنؤ رفتہ ودیعتِ حیات سپرد۔ خدایش بیامرزد۔"

(ج ۲۔ ص ۲۹۴)

نوا کے پوتے قربان حسن جعفری اور حکیم وحید اللہ بدایونی کے بیانات کے مطابق نوا کا سالِ وفات ۱۲۴۶ھ (۳۱۔۱۸۳۰ء) ہے[3] لہٰذا عشقی نے ان کے حالات اس سنہ کے بعد ہی سپردِ قلم کیے ہوں گے۔

ان تفصیلات کا ماحصل یہ ہے کہ عشقی نے تذکرے کا آغاز ۱۱۸۸ھ سے قبل اور اختتام ۱۲۴۶ھ کے قریب کیا ہے۔ قاضی عبدالودود صاحب نوا کی

---

[1] مطالعات ص ۲۷۴

[2] مطالعات ص ص ۳۰۲ و ۵۶۹

[3] مثنوی وامق و عذرا۔ مقدمہ ص ۲ و مختصر سیر ہندوستان ص ۹۳

کے بعد اختتامِ کار سے متفق نہیں۔ انھوں نے اس سلسلے میں عشقی کے منقولۂ بالا بیان کو ان کی بے خبری پر محمول کیا ہے[1]۔ نواب ۱۲۳۱ھ/۱۸۱۶ء کے قریب اصفہان میں مقیم تھے[2] اور اس سے تقریباً دس برس قبل حج بیت اللہ اور زیاراتِ عتباتِ عالیات کی غرض سے ہندوستان کو خیرباد کہہ چکے تھے[3]۔ نیز ان کا انتقال عشقی کے بیان کے برخلاف لکھنؤ کے بجائے بدایوں میں ہوا ہے[4]۔ اس لیے قاضی صاحب کی رائے کو قرینِ صحت تسلیم کرتے ہوئے طپش کی وفات کے قریبی زمانے یعنی ۱۲۳۰ھ مطابق ۱۸۱۵ء کو ترتیب و ترمیم کی آخری حد کہا جا سکتا ہے۔ البتہ ابتدائے کار کے زمانے سے متعلق ہمارے اندازے میں جو قاضی صاحب کے اندازے سے مختلف ہے، اس لیے کسی غلطی کی گنجائش نہیں کہ اس کا انحصار ایسے اشارات پر ہے جن سے شجاع الدولہ کے بقیدِ حیات ہونے کا ثبوت ملتا ہے اور شجاع الدولہ کی موت سے عشقی کا لاعلم رہنا کسی طرح قرینِ قیاس نہیں۔

تذکرے کی ترتیب میں عشقی کی مصروفیات کا یہ طویل دور جس کی نشاندہی سطورِ بالا میں کی گئی ہے، تذکرہ نگاری کے عروج و ارتقا کا زمانہ ہے۔ اس وقت تک شعرائے اردو کے جتنے تذکرے مرتب ہو کر منظرِ عام پر آ چکے تھے، عشقی کی تحریریں ان میں سے نکات الشعرا، تذکرۂ میر حسن اور گلزارِ ابراہیم سے ان کی براہِ راست واقفیت کا پتا دیتی ہیں۔ قدرت اللہ شوق کے متعلق یہ بیان کہ "صاحبِ دیوان و تذکرۂ اشعارِ شعرائے ہندی است" (ج ۲۔ ص ۳) طبقات الشعرا سے بھی ان کی واقفیت کا ثبوت فراہم کرتا ہے لیکن ان کے ہاں ایسی کوئی شہادت موجود

---

[1] مجلہ نقوش لاہور۔ شمارہ اکتوبر ۱۹۵۸ء ص ۲۱۴

[2] صحائف شرائف ورق ۲۹۴

[3] طبقاتِ سخن ص ۱۵۵

[4] مختصر سیرِ ہندوستان ص ۹۳

نہیں جسے اس تذکرے کے مطالعے اور اس کے اندراجات سے استفادے کی دلیل ٹھہرایا جاسکے۔ اس کے برخلاف میرؔ، میر حسنؔ اور خلیلؔ کے تذکروں سے اخذ و اقتباس کا جا بجا انھوں نے اعتراف بھی کیا ہے اور ان کے بعض بیانات بھی ان تذکرہ نگاروں کی معلومات پر اعتماد و انحصار کی نشان دہی کرتے ہیں۔ مثلاً سید امام الدین مظلومؔ کے بارے میں میر حسنؔ نے لکھا ہے:

"سید امام الدین خاں ولد معین الدین خاں سرچوکیٔ رسالۂ والاشاہی بود در وقت محمد شاہ۔ او ہم تذکرہ مختصر معاصرینِ خود نوشتہ است۔"

(تذکرہ شعرائے اردو طبع دوم، ص ۱۴۹)

عشقیؔ انھی باتوں کو ان الفاظ میں دہراتے ہیں:

"سید امام الدین خاں خلفِ سید معین الدین خاں در عہدِ سلطنت محمد شاہ بادشاہ غازی سرچوکیٔ رسالۂ والاشاہی بود۔ گویند کہ تذکرۂ مختصر مشتمل بر احوال و اشعار ریختہ گویانِ معاصرِ خود مرتب ساختہ۔" (ج ۲۔ ص ۲۶۵)

شیخ احمد وارث احمدیؔ کے متعلق صاحبِ گلزارِ ابراہیم کا بیان ہے:

"احمدیؔ تخلص، اسمش شیخ احمد وارث و موطنش قصبہ زمانیہ و نسبِ آبایش بحضرت قاضی شمس الدین ہروی کہ از خلفائے سلطان السالکین شاہ شرف الدین بہاری بود من پیوندد۔ اما مشارٌ الیہ از اسلافِ خود بشیوۂ مال گذاریٔ پرگنۂ زمانیہ و رسالہ داری اتصاف داشت۔ از تربیت یافتگانِ نواب فضلِ علی خاں غازی پوری است۔" (ص ۲۳)

عشقیؔ نے ان سے متعلق اپنی معلومات کو اس طرح پیش کیا ہے:

"احمدیؔ تخلص اسمش شیخ احمد وارث متوطن قصبۂ زمانیہ است۔ از تربیت یافتگانِ نواب فضلِ علی خاں غازی پوری است و با حضرت قاضی شمس الدین ہروی کہ از خلفائے شاہ شرف الدین بہاری بود، سلسلۂ نسبت دارد و بزرگانِ او از قدیم بشیوۂ مال گذاریٔ ضلع مسطور اشتغال داشتند۔" (ج ۱۔ ص ۵۶)

اس قسم کے اکتسابِ فیض کی مثالیں عشقی کے ہاں جا بجا نظر آتی ہیں، لیکن انھوں نے صرف دوسرے تذکرہ نگاروں کے بیانات پر اکتفا کر کے اپنے قوائے عمل اور ذوقِ جستجو کو مفلوج نہیں کیا ہے بلکہ معلومات کے تمام ذرائع و وسائل سے پوری پوری مدد لینے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ ان کے تذکرے سے ایسے متعدد شاعروں کے متعلق نہایت مفید اور کارآمد معلومات حاصل ہوتی ہے جن کے بارے میں میرؔ، میر حسنؔ اور علی ابراہیم وغیرہ نے بالعموم مطلق خاموشی اختیار کی ہے۔ علی ابراہیم کے متعلق درجِ ذیل بیان اسی قسم کی مثالوں میں سے ایک ہے:

"حالؔ تخلص موسوم و ملقب بہ عزیز الملک امین الدولہ علی ابراہیم خاں بہادر، نصیر جنگ۔ مردے عزیز الوجود و ذیشان از مشاہیر دانشمندان و فطانت پیشگان روزگار بود ..... بزرگانش از قدیم بہ قصبۂ شیخ پورہ ضلع صوبۂ بہار مسکن و ماوٰی اختیار نمودند۔ بالجملہ آن والا منزلت در آغازِ حال بزمرۂ منسلکانِ میر محمد قاسم خان بہادر المخاطب بہ عالی جاہ سرفرازی یافتہ، رشدے و عزتے بہم رسانیدہ و بعد از شکستِ بکسر چندے در مرشد آباد بہ نیابتِ نواب مظفر جنگ بہادر معزز و ممتاز گردیدہ۔ در آخر از جانب کمپنی انگریز بہادر بعہدۂ عدالتِ شہر محمد آباد عرف بنارس مامور شدہ بحکومتِ تمام می گذرانید۔ شیوۂ انشا پردازی و نثر نویسی را بسلاست و روانی ادا می کرد۔ گاہ گاہ بحسبِ جولانیٔ طبع سمندِ فکر را در مضمارِ نظم فارسی ریختہ نیز جولاں می داد و در مقطعِ اشعار فارسی خلیلؔ و در مقطعِ غزلیات ہندی حالؔ تخلص می آورد[1] بقضائے الٰہی بسالِ یک ہزار و دو صد و ہشت ہجری بتاریخ بست و سوم شہر محرم الحرام شربتِ ممات چشید۔ فقیر مولف تاریخ وفاتش

---

[1] یہ تفریق درست نہیں حقیقت یہ ہے کہ علی ابراہیم پہلے حالؔ تخلص کرتے تھے۔ بعد میں غالباً اپنے نام کی رعایت سے خلیلؔ انھوں نے تخلص اختیار کیا چنانچہ شورشؔ کا بیان ہے کہ "قبل ازیں حالؔ تخلص می فرمودند الحال خلیلؔ تخلص می فرمایند۔" (دو تذکرے ج ۱ ص ۲۴۳)

چنیں بسلک ارقام کشید

خانِ ذی قدر، صاحبِ دانش — کرد رحلت چو در ریاض نعیم

گفت سالِ وفاتِ او رضواں — شد بجنت مقیم ابراہیم۔"

(ج ۱۔ ص ۲۴۴)

مرزا عبدالقادر بیدلؔ کے ذکر میں عشقیؔ کے پیشرو عام طور پر یہ عذر پیش کر کے مختصر نویسی سے کام لیتے رہے ہیں کہ ان کے مفصل حالات شعرائے فارسی کے تذکروں میں مرقوم ہیں، اس لیے تفصیل میں جانا ضروری نہیں۔ اس کے برخلاف عشقیؔ نے ان کے سوانح حیات نہایت شرح وبسط کے ساتھ قلم بند کیے ہیں۔ لکھتے ہیں:

"بیدلؔ تخلص اکبرآبادی، اسمش مرزا عبدالقادر خلف مرزا عبدالخالق از قبیلۂ ارلان تورانی الاصل ..... بود واز چاشنیٔ فقر وتصوف بہرہ وافی حظے کافی داشت۔ در اوائل حال از ملا کمال تکمیل فن شعر وسخن پرداختہ بہ ارشاد آں رمز شناسِ اسرارِ کمال رمزی تخلص قرار داد۔ وقتے کہ بسن شباب رسید، شرفِ ملازمت شاہزادۂ عالی جاہ محمد اعظم شاہ دریافتہ بمنصبِ پانصدی ذات و داروغگیٔ کوفتگر خانہ عزِّ امتیاز یافت۔ چنانچہ بیست سالِ کامل دریں کاروبار بکامِ دل گذرانید۔ در ہماں ایام بیدلؔ تخلص نامزد نمودہ، نتائج ذہن صافیٔ خود را بنظرِ شیخ عبدالعزیز عزتؔ تخلص کہ از مشاہیر شعرائے آں عہد بودند، جلوہ افروز می ساخت۔ دریں اثنا برہنمونیٔ خضرِ توفیق قطعِ علائقِ دنیائے فانی وترکِ منصب و خدمت سلطانی کردہ رہ نورد سمت بنگالہ وبہار گردید۔ بعد چندے بحسبِ آب خورد وتکلیفِ بعضے از ہواخواہاں باز بہندوستان مراجعت فرمودہ پائے بدامنِ صبر وقناعت پیچید۔ آخر الامر بتاہل رغبت نمودہ سی وشش سال دیگر بااہل وعیال بسر برد۔ بالجملہ مرزائے عالی مرتبت در جمیع اقسام نظم ونثر فارسی خاصہ در شیوۂ غزل داد معانی پروری می داد۔ کلیاتِ دیوانش تخمیناً دو لک بیت باشد۔ در سالِ یک ہزار یک صد وسی (و دو) در عہد محمد شاہ جنت آرامگاہ

چہارم ماہ صفر بروضۂ رضوان خرامید و "چہارم از شہر صفر" تاریخ وفات آں مبرّو مغفور است۔" (ج ۱۔ ص ص ۸۰ و ۸۲)

ان ترجموں میں جس طرح زیرِ بحث شعرا کی زندگی کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی گئی ہے، اس سے مولف کی سلیقہ مندی اور ذوقِ جستجو کا پتا چلتا ہے۔ لیکن ہر چھوٹے بڑے شاعر کے بارے میں اس قدر تفصیلات فراہم کرنا نہ تو عملاً ممکن ہے اور نہ ضرورتاً مناسب۔ اس لیے ان کے ہاں وسعت بیان کی یہ کیفیت عام نہیں تاہم ایک نمایاں عنصر کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس معاملے میں تاریخی شعور کے ساتھ ہی فنِ تاریخ گوئی سے عشقی کی طبعی مناسبت بھی ایک فعال محرک کے طور پر کارفرما رہی ہے۔ چنانچہ بعض جگہ سنینِ وفات کے تعین کی غرض سے انھوں نے اپنے کہے ہوئے تاریخی قطعات بھی نقل کیے ہیں۔ مثلاً:

(الف) غلام حسن حسنؔ عظیم آبادی:

"در عین جوانی وفات یافت۔ راقم آثم تاریخ وفاتِ او چنیں منظوم ساخت:

حیف سفر کرد جواں صورتے — جانبِ فردوس ز دارِ کہن
خامۂ عشقی ز پئے یادگار — کرد رقم "وائے غلامِ حسنؔ"..... ۱۲۰۶ھ"

(ج ۱۔ ص ۲۳۴)

(ب) طالب علی طالبؔ:

"در عین آغازِ جوانی ازیں سرائے فانی رہگرائے عالم جاودانی گردید۔ راقم آثم تاریخ رحلتش بدیں گونہ در سلک نظم کشید۔ تاریخ:

کرد رحلت زیں جہاں در عینِ آغازِ شباب — طالبِ دیدارِ حقؔ آں نوجوانِ خوش لقا
بہرِ تاریخِ وفاتِ او چو کردم جستجو — گفت دل "طالب علی در قربِ احمد یافت جا"۔

(ج ۲۔ ص ص ۵۳ و ۵۵)

(ج) شاہ رکن الدین عرف مرزا گھسیٹا عشقؔ:

"وفاتش در سال یک ہزار و دو صد و سہ ہجری اتفاق افتاد۔ فقیر مولف

تاریخِ رحلتش بدیں گونہ منظوم ساخت:

حق شناس درویشے زیں جہانِ بے بنیان
بہرِ دیدنِ مولا جانبِ جناں بشافت
از خرد چو تاریخش خواست طبع موزونم
عقل گفت: "رکن الدین قرب با محمدؐ یافت....."

(ج ۲۔ ص ۶۷)

(د) حسن رضا نجات:

"در سال یک ہزار و دو صد و ہفت ہجری عنانِ عزیمت بریاضِ جاودانی برتافت..... فقیر مولف تاریخ رحلتش بدیں گونہ انجام دادہ:

نجات، آں مردِ خوش اخلاق مومن — سفر کردہ بملک جاوداں رفت
چو سالِ رحلتش از عقل جستم — خرد گفتہ: "نجات آہ از جہاں رفت"

(ج ۲۔ ص ۲۸۱)

حالات نویسی کے ضمن میں احتیاط پسندی بھی عشقی کا ایک قابل ذکر وصف ہے۔ اس خصوصیت کا اندازہ ان مقامات پر ہوتا ہے جہاں انھوں نے تذکرہ نگاروں کے باہمی اختلافات کی بنا پر ایک ہی شاعر کی شخصیت کے دو مختلف مرقعوں میں داخلی وحدت کی گرفت سے محروم رہنے کے باوجود اپنے شبہات ظاہر کر دیے ہیں اور قارئین کو درجِ تذکرہ بیانات پر اکتفا سے باز رکھ کر دوسرے ذرائع سے تحقیق و تصدیق کی جانب متوجہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ مثال کے طور پر بیتاب الہ آبادی سے متعلق درجِ ذیل بیانات ملاحظہ ہوں:

(الف) "بیتاب تخلص الہ آبادی، اسمش شاہ محمد علیم برادر قاضی مفخر۔ از جوانانِ موزوں طبع بود۔ ایں مطلع منسوب بہ اوست۔

رفتہ رفتہ بت خوش قد مرا آفت ہو گا
قدم آگے جو رکھے گا تو قیامت ہو گا" (جلد اول۔ ص ۸۹)

(ب) "بتاب تخلص اسمش شاہ علیم اللہ، مرد فاضل از متوطنان شہر الہ آباد است۔ بیشتر فکر فارسی می کند۔ گاہ گاہ بحسبِ اتفاق جہتِ تفریحِ طبعِ دوستان مطلعے و غزلے بزبانِ ریختہ می گوید ....." (جلد اول۔ ص ۸۹)

سات اشعار پر مشتمل انتخاب کلام کے بعد یہاں عشقی نے تخلص کے اشتراک اور نام کی مماثلت کے پیش نظر ان تراجم کے سلسلے میں اپنے شکوک کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے:

"مخفی نماند کہ در بعضے از سفاین ..... شش شعر اخیر بنام میر محمد علیم و شاہ علیم اللہ شخصِ واحد باشند۔ واللہ اعلم۔" (جلد اول۔ ص ۹۰)

میر محمد حسن حسنؔ اور میر ابوالحسن وحشتؔ کے سلسلے میں بھی عشقی کو اختلاف و اشتراک کے اسی مرحلے سے گزرنا پڑا ہے۔ چنانچہ اس موقع پر بھی انھوں نے ان دو بظاہر مختلف شاعروں کے حالات علٰحدہ علٰحدہ سپردِ قلم کر کے آخر میں صورت حال کی وضاحت کر دی ہے۔ دونوں بیانات درجِ ذیل ہیں:

(الف) حسنؔ: "نامش میر محمد حسن، از شاگردانِ مرزا رفیع سوداؔ۔ احوالش بوجہِ احسن معلوم نیست اما از تذکرہ میر محمد تقی میرؔ تخلص کہ دو مطلع از وارداتِ طبعِ او دراں مندرج است، مطلعے دریں مقام حسن ارقام می پذیرد۔ از وست

قاتل اگر کہے کہ سسکتا ہی چھوڑیو
خنجر تو ایک دم کے لیے منھ نہ موڑیو۔" (جلد اول۔ ص ۲۳۴)

(ب) وحشتؔ: "میر ابوالحسن متوطنِ دار الخلافت شاہجہان آباد۔ جوانے اہلیت شعار، سپاہی پیشہ از نبائرِ تیر انداز خاں بود۔ مشق سخن بمشورتِ مرزا رفیع السودا می نمود۔ کلامش سلاست و پاکیزگی دارد۔ از وست۔

کہیں یہ جھوٹ دیکھا ہے، تجھے جب میں بلاتا ہوں
صریحًا تو چلا جاتا ہے اور کہتا ہے آتا ہوں

لگتا ہے آج مجھ کو یہ سارا جہاں خراب | شاید کہ مرگیا ہے کوئی خانماں خراب

مخفی نماند کہ از تذکرۂ میر غلام حسن و گلزار ابراہیم چنیں متحقق می گردد کہ میر ابوالحسن وحشت ہمون محمد حسن، حسنؔ تخلص است کہ میر محمد تقی ذکرش در تذکرۂ خود کردہ۔ اغلب کہ وحشت و حسنؔ ہر دو تخلص داشتہ باشد و شاید کہ ابوالحسن را بہ اسم محمد حسن نیز ملقب کردہ باشند ۔۔۔۔" (جلد دوم۔ ص ۳۰۹)

تذکرہ نگاروں کو شعرا کے حالات کی دریافت و تحقیق کے دوران قدم قدم پر اس قسم کے متنازعہ فیہ مسائل سے واسطہ پڑتا ہے۔ ظاہر ہے کہ مطالعے کی غیر معمولی وسعت حاضر دماغی اور امعانِ نظر کے بغیر ان سے عہدہ برآ ہونا دشوار ہے، اس لیے ضروری نہیں کہ انتہائے احتیاط کے بعد بھی کسی شخص کا دامن لغزشوں سے قطعی طور پر محفوظ رہ سکے۔ عشقی کے تذکرے سے جو مثالیں اوپر کی سطور میں نقل کی گئی ہیں ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حتی الامکان وہ اپنے بیانات میں کوئی واقعاتی نقص یا تضاد نہیں چھوڑنا چاہتے اور اس بات کی پوری کوشش کرتے ہیں کہ ان کی تحریروں سے کوئی الجھاؤ یا خلطِ مبحث پیدا نہ ہو۔ پھر بھی بعض اوقات وہ اپنی اس خصوصیت کو برقرار رکھنے میں ناکام رہے ہیں اور ایک ایسے شاعر کو جس کا تذکرہ پہلے بھی کیا جا چکا ہے دوبارہ متعارف کراتے ہوئے اس تکرار کی گرفت نہیں کر پائے ہیں۔ شاہ محمدی بیدارؔ کے بارے میں درج ذیل بیانات ایسی ہی ایک مثال پیش کرتے ہیں۔

(الف) "بیدارؔ تخلص، اسمش محمد علی، از شاگردانِ مرتضیٰ قلی بیگ فراقؔ تخلص۔ مردِ وارستہ مزاج در عہدِ محمد شاہ فردوس آرام گاہ بود۔ در شاہجہان آباد بہ لباس فقر و شائستگیٔ حال می گذرانید۔" (جلد اول ص ۷۸)

(ب) "بیدارؔ تخلص، اسمش میر محمدی ساکن شاہجہان آباد (از یاران) و تربیت یافتگانِ خواجہ میر دردؔ است کلامش سلاست و روانی دارد۔"

(جلد اول۔ ص ۹۱)

(ج) "بیدارؔ تخلص، اسمش محمدی شاہ از مریدانِ مولوی فخر الدین، مردے مستعد

صاحبِ دیوانِ فارسی و ہندی بود و در اکبرآباد بعزت و فراغت اوقات
عزیزِ خود بسر می برد۔ در سنہ یک ہزار و دو صد و دوازدہ ہجری ازیں
سرائے فانی بملکِ جاودانی رحلت نمود ....." (جلد اول ص ۹۲)

ان بیانات میں اعادے کی جو صورت پیش آئی ہے، وہ اپنی قسم کی واحد مثال ہے کیونکہ دوسرے دو تین مقامات پر جہاں عشقی کا قلم ایسی ہی لغزش سے دوچار ہوا ہے نہ تو یہ نقص اس قدر نمایاں ہے اور نہ اس درجہ قابلِ التفات۔ بحیثیت مجموعی تلاش و جستجو کے ذریعے حقائق و واقعات تک رسائی کی لگن ایک بنیادی عنصر کی حیثیت سے عشقی کے مزاج میں دخیل رہی ہے۔ اس لیے اعادہ و تکرار کی ان چند مثالوں کو تذکرے کی ترتیب و تدوین کی طویل مدت اور شعرا کی کثرت تعداد کے پیش نظر صرف ایک اتفاقی امر اور خلافِ معمول سہوِ نظر ہی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

اب تک تذکرۂ عشقی کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے، اس کا ماحصل یہ ہے کہ عشقی کے ہاں چند خامیوں کے باوجود تذکرہ نگاری کی محدود ضروریات کے مطابق ایک اچھے سوانح نگار کی تمام خوبیاں موجود ہیں۔ لیکن ایک تذکرہ نویس کے لیے صرف یہی کافی نہیں کہ وہ مختلف شعرا کے حالاتِ زندگی کو یکجا کر کے مطمئن ہو جائے۔ اپنے انتخاب کیے ہوئے فن کاروں کی شخصیات کے دوسرے پہلوؤں کا جائزہ بھی اس کے فرائض میں داخل ہے۔ عشقی کی کوششوں کا یہ دوسرا رخ اول الذکر کے برخلاف بہت ہی کمزور اور بے جان ہے۔ انھوں نے جن شاعروں کے اخلاق و عادات اور ذہنی و فکری سطح کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے، ان کی تعداد اتنی قلیل ہے کہ ہم ان کے نام انگلیوں پر گن سکتے ہیں تاہم ان میں سے چند مثالیں یہاں پیش کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ملاحظہ ہوں:

(الف) محمد روشن جوشش: "مردے خوش اخلاق و گرم جوش ..... است۔
..... احوالِ جوہر ذاتی و صفاتی او بر جمیع صغیر و کبیر
روشن و ہویدا ست۔" (جلد اول ص ۱۱۸)

(ب) غلام یحییٰ حضور: "مردے قابل وقابل دوست ..... طبعش بشیوۂ خلق وآشنا پرستی چالاک وچست ومزاجش در حضور وعیب با جمیع اخلاص کیشاں درست" (جلد اول۔ ص ۲۰۸)

(ج) حمزہ علی رند: "مردے وارستہ مزاج وآزاد مشرب است واز شیوۂ خاکساری ودردمندی کہ طریقۂ خاصِ رندانِ درد آشام حقیقت است، چاشنیٔ معقول بہم رسانیدہ واز حظوظِ فانی ومستلذاتِ جسمانی تنفر گزیدہ آئینِ بے تعلقی اختیار گردانیدہ" (جلد اول۔ ص ۳۲۸)

(د) میر کلوّ شاعر: "مردے دردمند ومنصف مزاج، متصف بصفاتِ قابلیت وموصوف بحلم وآدمیت بود۔ دائماً عنانِ ہمت بر شاہراہِ صلاح وتقویٰ کہ طریقۂ بزرگ زادگان است، معطوف می داشت وقدم بر جادۂ خاکساری وفروتنی کہ بہیں شیوۂ غیر ازیں نیست، می گذاشت" (جلد دوم۔ ص ۱۹)

یہ اقتباسات جن شعرا کے ترجموں سے ماخوذ ہیں، ان سے عشقی ذاتی طور پر واقف تھے اور چونکہ عموماً ایسے فن کاروں کی تعداد بہت زیادہ نہیں ہوتی جن سے ایک عام اہلِ قلم بخوبی واقفیت رکھتا ہو، غالباً اسی لیے انھوں نے اپنے جانے پہچانے معدودے چند شاعروں کے علاوہ باقی شعرا کے عادات وخصائل اور ذہنی وفکری صلاحیتوں کے بارے میں اظہارِ خیال سے دامن بچایا ہے۔ تذکرے کا یہ نقص قابلِ لحاظ ضرور ہے لیکن یہ طریقۂ کار دوسرے تذکرہ نگاروں کے مشاہدات وتاثرات کو اپنے الفاظ یا انھی کی زبان میں دہرا دینے سے بہرحال بہتر معلوم ہوتا ہے۔

تنقیدِ فن کے نقطۂ نظر سے بھی "تذکرۂ عشقی" کسی خاص حیثیت کا حامل نہیں سیرت واخلاق کی طرح کلام کے محاسن ومعائب پر رائے زنی کے معاملے میں بھی عشقی حد درجہ بے نیاز نظر آتے ہیں۔ معمول کے برخلاف جہاں کہیں انھوں نے

کسی رائے کا اظہار کیا بھی ہے، وہاں بھی وہ نہ صرف نقد و نظر کا کوئی بلند معیار پیش کرنے ہی سے قاصر رہے ہیں، بلکہ ان کی عبارات ان کے ناقدانہ شعور کی ناپختگی اور عجزِ بیان کی دلیل بن گئی ہیں۔ گردیزی کی طرح ان کا سرمایۂ تنقید بھی "شستگی و رفتگی"، "سلاست و روانی"، "چاشنیِ درد" اور "ربط معانی و الفاظ" جیسے چند لفظوں میں محدود ہے۔ انھی الفاظ کو بہ ادنیٰ تغیر وہ بار بار استعمال کرنے کے عادی ہیں۔ درجِ ذیل مثالیں اس کا واضح ثبوت ہیں:

۱۔ سنتو کھ رائے بیتاب :۔ "کلامش از شگفتگی و رفتگی خالی نیست۔"

(جلد اول۔ ص ۹۰)

۲۔ شاہ قدرت اللہ قدرت :۔ "کلامش از شستگی و رفتگی خالی نیست۔"

(جلد دویم۔ ص ۱۴۹)

۳۔ شاہ واقف :۔ "کلامش از شستگی و رفتگی خالی نیست۔"

(جلد دویم۔ ص ۳۱۱)

۴۔ وارث علی نالاں :۔ "کلامش از شستگی خالی نیست۔"

(جلد دویم۔ ص ۲۸۳)

۵۔ ثناء اللہ فراق :۔ "کلامش از شستگی و روانی خالی نیست۔"

(جلد دویم ص ۱۳۹)

۶۔ نظر علی گمان :۔ "کلامش بے گمان شستگی و روانی دارد۔"

(جلد دویم ص ۱۷۳)

۷۔ محمد تقی ہوس :۔ "شیوۂ ریختہ را بطریق مشاقانِ ایں فن بشستگی و روانی انجام می دہد۔" (جلد دویم۔ ص ۳۲۸)

۸۔ میر محمدی بیدار :۔ "کلامش سلاست و روانی دارد۔" (جلد اول ص ۱۷۳)

۹۔ شاہ گھسیٹا عشق :۔ "کلامش از طرزِ سلاست و روانی خالی نیست۔"

(جلد دویم۔ ص ۶۷)

۱۰۔ محمد محترم خاں محترم :۔ "شیوۂ ریختہ را بسلاست و روانی ادا می ساخت۔"
(جلد دویم۔ ص ۲۱۵)

۱۱۔ ہدایت اللہ ہدایت :۔ "شیوۂ ریختہ را بسلاست و روانی ادا می سازد۔"
(جلد دویم۔ ص ۳۲۳)

۱۲۔ کرم اللہ خاں درد :۔ "کلامش از چاشنیٔ درد خالی نیست۔"
(جلد اول۔ ص ۲۸۰)

۱۳۔ مظہر علی زار :۔ "کلامش از چاشنیٔ درد خالی نیست۔"
(جلد اول۔ ص ۳۷۸)

۱۴۔ حمایت علی مجنوں :۔ "کلامش از چاشنیٔ درد خالی نیست۔"
(جلد دویم۔ ص ۲۵۵)

۱۵۔ حسن علی شوق :۔ "کلامش از لذتِ درد خالی نیست۔"
(جلد دویم۔ ص ۱۵)

۱۶۔ کرامت اللہ خلیق :۔ "کلامش از مربوطیٔ الفاظ و معانی خارج نیست۔"
(جلد اول۔ ص ۲۴۸)

۱۷۔ میر غلام حسین شورش :۔ "کلامش از ربطِ معانی و درستیٔ الفاظ خالی نیست۔"
(جلد دویم۔ ص ۳)

۱۸۔ میر مہدی شورش :۔ "ریختہ را بدرستیٔ الفاظ و انجام می دہد۔"
(جلد دویم۔ ص ۲۹)

۱۹۔ فتح محمد دل :۔ "فکرِ ریختہ بطرزِ ایہام می کرد۔" (جلد اول ص ۳۱۶)

۲۰۔ عبدالوہاب یک رو :۔ "مشقِ ریختہ بطرزِ ایہام می کرد۔" (جلد دویم ص ۳۳۷)

انتخاب کلام کے تحت عشقی نے بیشتر غزلیات کے اشعار پیش کیے ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر اشعار دوسرے تذکروں سے منقول ہیں۔ البتہ جن شعرا کے دواوین ان کی نظر سے گزر چکے تھے، ان کے کلام کا انتخاب انھوں نے خود ہی کیا

ہے۔ یہ انتخابات نہ تو بالعموم بہت زیادہ طویل ہیں اور نہ بہت مختصر۔ شعرا کے مخصوص رنگِ سخن اور فنی استعداد کا ان سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اشعار کے غلط انتساب کی مثالیں بھی اس تذکرے میں شاذ و نادر ہی نظر آتی ہیں۔ مختصر یہ کہ اگرچہ عشقی کے ہاں تنقیدِ سیرت اور تنقیدِ کلام سے متعلق مواد کی غیر معمولی کمی محسوس ہوتی ہے، تاہم ان کے تذکرے کا سوانحی پہلو بہت روشن اور جاندار ہے، اس لیے اردو کی ادبی تاریخ کے مطالعے میں اس تذکرے کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

طبقاتِ سخن

"طبقاتِ سخن" شیخ غلام محی الدین عشقؔ و مبتلاؔ میرٹھی (متوفی ۱۲۴۱ھ/۱۸۲۶ء) کی تالیف ہے۔ اہلِ علم سے اس تذکرے کا پہلا باقاعدہ تعارف پروفیسر محمد حسن کی مرتب کی ہوئی اس کی تلخیص کے ذریعے ہوا جو ہفت روزہ "ہماری زبان" علی گڑھ کے ۱۵ر جنوری سے ۸ر اپریل ۱۹۶۰ء تک کے بارہ مسلسل شماروں میں شائع ہوئی ہے اور فضل الرحمٰن خاں لائبریری، گاندھی فیض عام کالج، شاہجہاں پور کے قلمی نسخے کی بنیاد پر تیار کی گئی ہے۔ اس نسخے کی کتابت کا کام رام سروپ ولد روشن رائے دہوسر ساکن باغبت (ضلع میرٹھ) نے بروز پنجشنبہ، ۱۴ر ماہِ دسمبر ۱۸۱۵ء مطابق ۱۲ر محرم ۱۲۳۱ھ مکمل کیا تھا۔ یہ نسخہ موجودہ صفحات نمبر ۱۰۴ و ۱۰۵ کے درمیان سے ایک ورق (نمبر ۵۳) کے بقدر ناقص ہے اور آب رسیدگی و کرم خوردگی کی وجہ سے لفظ بلفظ قابلِ قرأت نہیں۔ اس تذکرے کا دوسرا قلمی نسخہ برلن کے قومی کتب خانے میں محفوظ ہے۔ اس میں شروع کا ایک ورق موجود نہیں اور آخر کے کئی اوراق کے آب رسیدہ ہو جانے کی وجہ سے اس کے زمانۂ کتابت سے متعلق تفصیلات نامعلوم ہیں۔ تیسرا نسخہ جو ناتمام یا ناقص الآخر ہے، دہلی میں پروفیسر گوپی چند نارنگ کی ملکیت ہے۔ یہ نسخہ ردیف میم پر ختم ہو جاتا ہے اور داخلی شواہد کے مطابق اس تذکرے کا اولین یا قدیم ترین نسخہ ہے۔ ڈاکٹر نسیم اقتدار علی نے ۱۹۹۱ء میں نسخۂ شاہجہاں پور کا عکس اور تینوں دستیاب نسخوں کی تمام ضروری تفصیلات ایک مبسوط تحقیقی مقالے کی صورت میں شائع کر کے اس تذکرے کے متن کو عام کر دیا ہے۔

آئندہ سطور میں حوالوں کے لیے اسی اشاعت کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔

نسخۂ شاہجہاں پور بحالتِ موجودہ ایک سو چھیانوے[196] شعرا کے احوال و اشعار پر مشتمل ہے[1] جب کہ نسخۂ برلن میں شاعروں کی کل تعداد ڈاکٹر نسیم صاحبہ کی فراہم کردہ تفصیلات کے مطابق ایک سو ستانوے ہے۔ ان میں سے ایک سو ترپن[153] شاعر دونوں نسخوں میں مشترک ہیں یعنی نسخۂ شاہجہاں پور کے تینتالیس[43] شاعر نسخۂ برلن سے اور نسخۂ برلن کے چوالیس[44] شاعر نسخۂ شاہجہاں پور سے غیر حاضر ہیں۔ اس طرح دونوں نسخوں کے تمام شعرا کو شامل کر کے اس تذکرے کے شاعروں کی مجموعی تعداد دو سو چالیس[240] ہو جاتی ہے[2]۔ نسخۂ نارنگ میں کل ایک سو چار شاعروں کے تراجم شامل ہیں۔ ان میں کوئی ایسا شاعر نہیں جو سابق الذکر دونوں نسخوں میں سے کسی میں موجود نہ ہو۔

"طبقاتِ سخن" اس تذکرے کا تاریخی نام ہے جس سے اس کا سالِ ترتیب ۱۲۲۲ھ برآمد ہوتا ہے۔ علاوہ بریں مولف کا یہ بیان بھی موجود ہے کہ انھوں نے اس میں "شعرائے عہدِ سلطنتِ محمد شاہ بادشاہ غازی تا زمان جلوس سنہ احد محمد اکبر شاہ ..... مطابق سنہ ہزار و دو صد (و) بست (و) دو ہجری" کے نتائجِ طبع کو جگہ دی ہے۔ نسخۂ شاہجہاں پور میں مولوی قدرت اللہ شوق سے متعلق ایک بیان کے علاوہ ایسا کوئی اشارہ موجود نہیں جس سے یہ اندازہ ہو سکے کہ اس میں ۱۲۲۲ھ/۱۸۰۷ء کے بعد بھی کوئی اضافہ ہوا ہے۔ شوق کے بارے میں مبتلا نے گنگا پرشاد رند شاگرد جرأت کا یہ بیان نقل کیا ہے:

---

[1] ورق نمبر ۵۳ کے ضائع ہو جانے کی وجہ سے خواجہ میر درد کے کلام کے آخری حصے اور روشن شاہ روشن کے تعارف اور چند اشعار کے علاوہ دو شاعروں (خوب چند ذکا اور ذوقا شاہ) کے مکمل تراجم اس نسخے سے غائب ہیں۔ ہم نے ان دونوں شاعروں کو اس شمار میں شامل نہیں کیا ہے۔

[2] شعرا کی تعداد کا یہ مکمل حساب ہم نے خود لگایا ہے جو ڈاکٹر نسیم صاحبہ کے لگائے ہوئے حساب سے کسی قدر مختلف ہے۔

"ہر گاہ در خدمتش وارد شدم، استفسارِ احوالِ من کردہ پرسید کہ فیضانِ سخن از صحبتِ کدام کس حاصل کردہ؟ گفتم: چندے غزل را از میاں جرأت صاف نمودہ ام باقی فیضانِ صحبتِ نذیر الدین حسن شائق است۔ او بجواب ناصواب در حقِ جرأت پیش آمد و بر من بد گذشت۔ آخرش شوخی کردہ بعض ابیات غزلیاتش را اعتراضاتِ صحیحہ برداشتم کہ ہم دریں عرصہ مشارٌ الیہ بہ اجلِ طبعی بمرد۔" (ص ص ۱۴۵ و ۱۴۶)

حکیم احمد خاں فاخر کے قطعۂ تاریخ کی رو سے شوق کا انتقال ۱۲۲۴ھ (۹-۱۸۰۹ء) میں ہوا ہے[1] اگر حکیم صاحب موصوف سے شوق کے سالِ وفات کے تعین اور رند سے اس واقعے کے بیان میں کوئی غلطی نہیں ہوئی ہے تو "طبقات سخن" میں شوق کا حال یقیناً ۱۲۲۴ھ/۹-۱۸۰۹ء کے بعد لکھا گیا ہوگا۔

نسخۂ شاہجہاں پور کے برخلاف نسخۂ برلن میں ایسے متعدد شواہد موجود ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس میں ۱۲۲۲ھ/۷-۱۸۰۷ء کے بعد بھی وقتاً فوقتاً اضافے ہوتے رہے ہیں یا کسی خاص زمانے میں بڑے پیمانے پر نظر ثانی کی گئی ہے۔ شاہ نصیر کے ذکر میں خود مولف نے اس طرف اشارہ کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"بعدِ چند سال از تحریرِ ایں تذکرہ کہ آں عزیز برمیز بتقریبِ وصولِ زرِ سالیانۂ درگاہِ میر ممدوح (میر صدر جہاں) از سرکار صاحب کلکٹر در میرٹ (میرٹھ) آمد، از مولف ہم ملاقات نمود۔" (مقدمۂ مرتب ص ۱۷۰)

ایک اور اشارہ لالہ جھنولال طرب کے حال میں ملتا ہے جن کے متعلق بتلا کا بیان ہے:

"آخر بہ اقتضائے محبت ائمہ واردات صادق مشرف بہ اسلام گشت۔"

(مقدمہ ص ۱۴۴)

طرب کے بارے میں سعادت خاں ناصر نے لکھا ہے کہ "سالِ یک ہزار و دو

---

[1] طبقات الشعرا۔ مقدمۂ مرتب ص ۳۹

صد و سی ہجری میں شرفِ اسلام سے مشرف اور شیعۂ امیر المومنین سے ہم طرف ہوا۔[1]
اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ "طبقاتِ سخن" میں ان کے حالات حتمی طور پر ۱۲۳۰ھ/ ۱۸۱۵ء کے بعد لکھے گئے ہیں۔

ظہور اللہ خاں نوآ کے متعلق اس نسخے میں سابقہ معلومات پر اس اطلاع کا اضافہ کیا گیا ہے:

"چند سال در حضورِ بادشاہِ ایران (ماند)۔ دراں جا بخطاب سعدیٔ ہند مخاطب بود۔ حالا در وطن آمدہ۔" (مقدمہ ص ص ۱۶۵ و ۱۶۶)

محمد عسکری بلگرامی نے "صحائفِ شرائف" میں جس کا سالِ ترتیب اس کے تاریخی نام "درالمنثور" کے مطابق ۱۲۳۱ھ ہے، نوآ کے بارے میں لکھا ہے کہ "الحال در اصفہان بظلِّ مرحمت و رافتِ سلطان آں جا بوزارتِ ہرات روزگار خوش می دارد۔"[2] اس بیان کی رو سے نوآ کی سفرِ ایران سے واپسی اور وطن میں آمد ۱۲۳۱ھ/ ۱۸۱۶ء کے بعد کا واقعہ قرار پاتی ہے، اور یہ شہادت اس امر کا ثبوت فراہم کرتی ہے کہ "طبقاتِ سخن" پر نظرِ ثانی کا کام ۱۲۳۱ھ کے بعد کسی وقت ہوا ہے۔ بعد کے اس زمانے کی آخری حد کے تعین میں خیراتی لال بے جگر کے تذکرے سے مدد لی جا سکتی ہے۔ اس تذکرے میں تقریباً پچاس مقامات پر "طبقاتِ سخن" کے حوالے موجود ہیں جو تمام تر اس کے نظرِ ثانی شدہ ایڈیشن پر مبنی ہیں۔ چوں کہ بے جگر کا یہ تذکرہ ۱۲۳۷ھ/۱۸۲۲ء میں زیرِ ترتیب تھا، اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ مبتلا نے "طبقاتِ سخن" پر نظرِ ثانی ۱۲۳۱ھ/۱۸۱۶ء اور ۱۲۳۷ھ/۱۸۲۲ء کے درمیان کسی وقت کی ہے۔

تذکرے کی ابتدا حمد و نعت سے ہوتی ہے۔ اس کے بعد نثر کے مقابلے میں نظم کی برتری سے بحث کرتے ہوئے عربی و فارسی اور دوسری زبانوں میں شعر گوئی کے

---

[1] خوش معرکۂ زیبا جلد اول ص ۲۲۹

[2] صحائف شرائف ورق ۱۹۴ ب

آغاز سے متعلق مختلف مقبول و رائج روایات کے حوالے دیے گئے ہیں۔ فارسی میں شاعری کی ابتدا کے بارے میں منقول دو روایتوں میں سے پہلی روایت یہ ہے:

"قول بعضے آنست کہ در زبان فارسی اول شعر بہرام گور گفتہ و سببش آں بود کہ او محبوبۂ داشت دل آرام ..... ہر سخن کہ بہرام گفتہ (گفتے) او جواب دادے۔ روزے بہرام بحضورِ او با شیرے در آویخت و آں شیر را ہر دو گوش گرفتہ (بر پشتش) نشست و از غایتِ تفاخر گفت مصرع: "منم آں پیلِ ژیان و منم آں شیرِ یلہ" دل آرام جواب داد مصرع: "نام بہرام ترا و پدرت بوجبلہ"۔ (ص ۵)

ہندوستان کی مختلف علاقائی زبانوں اور بولیوں کے ذکر میں بتلا نے ہندی (اردو) کو سرِ فہرست رکھا ہے۔ وہ امیر خسرو کو غزل ہندی کا موجد قرار دیتے ہیں۔ اس ضمن میں انھوں نے شیخ سعدی شیرازی کی سیاحتِ گجرات اور ہندوستانی زبان میں طبع آزمائی کے متعلق مشہور روایت بھی نقل کی ہے۔ بعد ازاں ولی کی شاعری اور بعد کے شعرا پر اس کے اثرات کا حوالہ دیتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ

"اگرچہ زبانش بر محاورۂ عصر اوست لیکن در استعدادِ شاعری قصورے ندارد۔" (ص ۶)

اس کے بعد دوسری ہندوستانی زبانوں اور بولیوں کی شعری روایات کے تقابلی مطالعے کی غرض سے پوربی، مارواڑی، برج بھاشا اور پنجابی کی شاعری کے کچھ نمونے پیش کیے گئے ہیں جن میں آنند گھن (= گھنانند) بیراگی ساکن متھرا کا یہ قطعہ بھی شامل ہے:

گرچہ ہندو بچۂ کمرہ (= طرفہ) بلا حسن دھریچہ — در حالتِ گفتار ز مکھ پھول جھریچہ
گفتم کہ پری لال یکے بوسہ بمن دہ — گفتا کہ ہرے رام ترک (= ترس) ظلم کریچہ

اس قسم کی مثالیں مولف نے اس امر کی وضاحت کے لیے پیش کی ہیں کہ جیسے جیسے زمانہ آگے بڑھتا جاتا ہے اور زبانیں ترقی کی منزلیں طے کرتی جاتی ہیں۔ ارباب سخن کے اندازِ فکر اور اظہار و بیان کے اسالیب میں بھی تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی

ہیں۔ تدریجی ارتقا کے اس عمل کو سمجھنے کے لیے اسلاف کے کارناموں سے واقفیت بہت ضروری ہے۔ "طبقات سخن" کی ترتیب اسی ضرورت کو پورا کرنے کی غرض سے عمل میں آئی ہے۔

تذکرے کی ترتیب میں مبتلا نے ذاتی واقفیت اور مختلف شاعروں سے وقتاً فوقتاً ملاقاتوں کے ذریعے حاصل شدہ معلومات کے علاوہ خان آرزو، قائم، میر حسن اور مصحفی کے تذکروں سے بھی مدد لی ہے۔ چنانچہ شرف الدین علی، محمد عیسیٰ تنہا، شاہ حاتم، محمد یار خاکسار، میر قمر الدین منت، فدوی لاہوری اور محمد عسکری نالاں وغیرہ کے حالات میں ان تذکروں کے براہِ راست حوالے موجود ہیں لیکن یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ اس استفادے کے باوجود مبتلا کے بعض بیانات ان تذکروں کی متفق علیہ روایات سے مطابقت نہیں رکھتے۔ آئندہ سطور میں اس موضوع پر مفصل بحث کی جائے گی۔

حالات کی ترتیب میں مبتلا نے حروفِ تہجی کی رعایت ملحوظ رکھی ہے لیکن اس سلسلے میں وہ کسی طے شدہ اصول پر کاربند نہیں۔ چنانچہ بعض شاعروں کو انھوں نے بغیر کسی خاص سبب کے تخلص کے حرف اول کی بجائے نام کے پہلے حرف کی مناسبت سے جگہ دی ہے۔ مثال کے طور پر میر کا ذکر ردیف میم کی بجائے ت کی ردیف میں، شاہ ولی اللہ اشتیاق دہلوی اور شرف الدین (پیام) کا ذکر ردیف ش کے تحت اور ظہور اللہ خاں نوا کا ذکر ردیفِ ظ کے ذیل میں ملتا ہے۔ اس بے نظمی و بے ترتیبی کے لیے کوئی وجہِ جواز پیش نہیں کی جا سکتی کیونکہ عملاً اس سے دامن بچانا کچھ دشوار نہ تھا۔

شعرا کے تعارف میں مبتلا نے بیشتر اجمال و اختصار سے کام لیا ہے۔ نام، تخلص اور سکونت کی صراحت پر اکتفا کی جو مثالیں ابتدائی زمانے کے تذکروں میں علی العموم نظر آتی ہیں، اس تذکرے میں بھی خاصی تعداد میں موجود ہیں۔ سطور ذیل میں کچھ اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں جن سے مولف کی اس کوتاہ قلمی اور مختصر بیانی

کا اندازہ ہو گا۔

۱۔ اشرف :۔ "اشرف خاں خلف حکیم شریف خاں دہلوی عالم شاہی۔ عالی طبع، بلند فکر است۔" (ص ۱۹)

۲۔ افغان :۔ "امام علی خاں نام لکھنوی است۔" (ص ۲۴)

۳۔ برکت اللہ خاں دہلوی :۔ "از لواحقان اسد یار خاں است کہ او مرثیہ خوب می گفت و خوب می خواند و انسان تخلص می کرد۔"

(ص ۲۷)

۴۔ رنج :۔ "میر محمد نصیر رنج تخلص، نواسۂ حضرت خواجہ میر، بزرگ زادۂ والا گوہر است۔" (مقدمۂ مرتب، ص ۱۴۰)

۵۔ زار :۔ "میر مظہر علی نام در سرکار احمد علی خاں شوکت جنگ سلسلہ روزگار درست داشت۔" (ص ۱۱۵)

۶۔ شرف الدین علی تخلص :۔ "احوالش داخل تذکرۂ فارسی خان آرزو است۔"

(ص ۱۴۶)

۷۔ محمد عارف عارف :۔ "مردے رفوگر بود در عصر محمد شاہ۔" (ص ۱۷۶)

۸۔ فصیح :۔ "مرزا جعفر فصیح لکھنوی۔ شاعرِ مرثیہ گو است۔" (مقدمۂ مرتب، ص ۱۴۶)

۹۔ محشر :۔ "متوطن بلدۂ بداؤں، اکرام اللہ نام دارد۔ (ص ۲۱۹)

۱۰۔ میر سجاد :۔ "جوانِ مستعد، متوطن شاہجہاں آباد بودہ۔" (ص ۲۲۴)

۱۱۔ محمد محسن محسن :۔ "خواہر زادۂ خان آرزو بود۔" (ص ۲۲۸)

۱۲۔ وحشت دہلوی :۔ "نام او میر ابو الحسن بود۔" (ص ۲۵۱)

درجۂ دوئم و سوئم کے تمام معروف و غیر معروف شعرا کے حالات میں طبقاتِ سخن میں بالعموم اختصار کی یہی کیفیت نظر آتی ہے۔ البتہ ان شعرا کے ذکر میں جو اس وقت تک ادب میں اپنا ایک مقام پیدا کر چکے تھے اور جن کے تعارف سے اس طرح سرسری گزر جانا آسان نہ تھا کسی قدر تفصیل سے کام لیا گیا ہے۔ صفِ اول

کے ان فنکاروں کے علاوہ ان شاعروں کے تراجم بھی جن سے مولف کے خصوصی تعلقات یا خط و کتابت کی حد تک رسم و راہ تھی، عام روش سے مستثنیٰ ہیں۔ لیکن بجز دو ایک مقامات کے ان مستثنیات میں بھی سنین کے حوالے کسی جگہ نہیں ملتے۔ تاہم ان بیانات سے ہماری سابقہ معلومات میں کچھ نہ کچھ اضافہ ضرور ہوتا ہے اور غور و فکر کے لیے بعض نئے پہلو سامنے آتے ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

(الف) جرأت: "خوش باش لکھنؤ، بہ اعتبارِ محض عمر او شصت سالہ۔ از آبائش یحییٰ مان بود کہ متصل چاندنی چوک در شاہجہان آباد مقام داشت۔ از گردشِ زمانہ کہ ساز و برگِ افلاس لاحقِ احوالِ او گردید، بعمر دہ دوازدہ سالگی در لکھنؤ رسیدہ مشقِ ریختہ از جعفر علی حسرت تخلص صاف ساخت۔ بسیارے از شاگردان دارد۔ و تا حینے کہ مرزا رفیع السودا و بعضے دیگر از شعرائے پائے تخت در سرکارِ نواب وزیر بودند، اشعارش شہرت کم یافت۔ بعدِ وفات آن ہا کہ مشقِ او صاف شد خودش قانونِ استادی نواخت۔ بارہا از حضورِ مرشد زادۂ مرزا سلیمان شکوہ ہم بہ عطیہ دو شالہ وغیرہ در صلۂ سخن امتیاز یافتہ واز سرود سرائے عشرت کدۂ سخن بہ نورس سرابستانِ حال کارِ کام و زبان ساختہ۔۔۔" (ص ۵۶)

(ب) میر حسن: "از شعرائے عالم شاہی است پسر میر غلام حسین ضاحک تخلص کہ مرزا سودا (اکثرے) از ہجایا در حقِ او نوشتہ۔ بزرگانش را وطن ہرات بودہ۔ بعد از استفادۂ تربیت در شاہجہان آباد در ایامِ شباب بطرف پورب رفتہ بود۔ در فیض آباد و لکھنؤ در سرکار نواب سالار جنگ ممتازی داشت۔ مشقِ شعر از میر ضیاء الدین صاف نمودہ ۔۔۔۔۔ چوں ملازمِ سرکار نواب آصف جاہ (= آصف الدولہ) گردید، وقتے مزاجِ آصف جاہ از طرف او آزردہ

شد واز لکھنؤ بدر کردند۔ بعد چندے کہ (مثنوی) سحر البیان را
بفصاحتِ تمام در زبانِ محل طرح دادہ بحضور آوردہ، بسیارے
از صلہ واکرام سرافرازی یافت۔ چنانچہ امروز آن قصہ اشتہار
تمام دارد۔" (ص ۸۲)

(ج) فدوی لاہوری: "نامش مرزا فدائی بیگ، قوم مغل برلاس، شاگردِ صابر علی شاہ
صابر تخلص۔ زاد بوم او خطۂ لاہور، تربیت یافتۂ شاہجہان آباد۔
مردے آزاد، بے تعلق، سپاہی وضع، بانکہ طور، امامیہ مذہب بود۔
در عین شباب از دار الخلافہ بسبیل سیاحت در اصفہان رفت وچہار
سال با سخنورانِ آنجا صحبت داشت۔ ازاں جا باز بہ ارادۂ
ہندوستان در ضلع کٹھیر آمدہ بحضورِ یکے از سلاطین زادۂ صاحب
جمال چندے چشمِ صورت بین را نورے داد۔ چوں دریں ضلع
آمدہ، در سرکارِ نواب ضابطہ خاں خلف الصدق نواب نجیب الدولہ
مرحوم بروزگار شاعری ملازم گردید وحسب الامر قصۂ یوسف
زلیخا را در زبانِ ہندی طرح داد۔ اتفاقاً ہم دراں عرصہ دائرہ
گاہِ نواب نواحِ میرٹھ شد کہ از مولف ملاقات نمود۔ باہم سلسلۂ
محبت چنداں منضبط شد کہ ہر روز ملاقی گشتہ در یک مجلس طرح
غزل می کردیم۔ ہر گاہ روزگار آں سرکار را گذاشت، بہ لکھنؤ
رفت واز مرزا رفیع وغیرہ شعرائے حضور نواب وزیر معارضہ اش
افتاد وہم غزل گردید۔ آخر در بریلی آمد وبریکے از افغان پسر
فریفتہ شدہ از دستِ رقیب بہ تیغ بے دریغ شہید گشت۔ اِنَّا
لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔ وآنچہ مصحفی او را در تذکرۂ خود بقال پسر و
غلام مغل نوشتہ، محض غلط است۔" (ص ۱۸۸)

(د) قائم چاندپوری: "مخزنِ اسرارِ ظہور، قائم متوطن قصبہ چاند پور، قوم شیخ از

اعزۂ آنجا و صاحبِ منصبانِ حضور معلّٰی بودہ است۔ بامرزا رفیع السودا وغیرہ مدتے در شاہجہان آباد ہم متفق ساخت (کذا) و کو بکوے معروف و مشہور ماندہ، تا حینِ حیات اوقات بخوبی گذراند۔ از دفترِ طبع رقم ہاے تازہ بدیوانِ روزگار رسانیدہ و بہدایتِ ازلی در علم سخن گوئی استادِ وقت گردیدہ۔ جامے از خمخانۂ عرفان نیز می پیمود و علی الدوام طالبِ صحبتِ اہل اللہ (می) بود۔۔۔ ۔۔۔۔ مولف در خدمتِ ایں قائم الصراطِ یکتائی ربط آشنائی داشت۔ چنانچہ اکثر از اشعارِ ہندی منِ ہیچمداں بقیدِ احوال در تذکرہ اش ثبت است۔ سالے چند شد کہ ازیں سراے فانی رو بجہان جاودانی نہادہ۔۔۔۔" (ص ۲۰۸)

ان تراجم کی اہمیت کے سلسلے میں یہاں صرف اتنا بتا دینا کافی ہوگا کہ ان میں دہلی سے ترک وطن کے وقت اور اس کے بعد ترتیب تذکرہ کے زمانے میں جرأت کی عمر، میر حسن سے نواب آصف الدولہ کی ناراضگی، ان کے شہر سے اخراج اور چند سال کے بعد مثنوی "سحر البیان" کی تصنیف کے صلے میں دوبارہ دربار تک رسائی اور انعام و اکرام سے سرفرازی، فدوی لاہوری کے حسب و نسب اور قائم چاند پوری کے تصوف کی طرف رجحان اور اہل اللہ سے تعلقِ خاطر کے بارے میں جو باتیں کہی گئی ہیں، وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے بالکل نئی ہیں اور ان کے مطالعے سے متعلقہ سمتوں میں تحقیق و تلاش کی نئی راہیں کھلتی ہیں۔ اسی قسم کے معلومات افزا بیانات بعض اور شاعروں کے حالات میں بھی موجود ہیں لیکن ان کی تفصیلات میں جانا طوالت کا موجب ہوگا۔ اس لیے ہم ان چند مثالوں پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔

مبتلا نے اپنے حالات بھی کافی شرح و بسط کے ساتھ قلم بند کیے ہیں۔ انھوں نے اوّلاً عشق تخلص کے تحت ردیف العین میں، دوبارہ دوسرے تخلص کی رعایت سے ردیف "م" میں اور تیسری مرتبہ تذکرے کے خاتمے پر خود کو قارئینِ تذکرہ سے

متعارف کرایا ہے۔ ان تینوں بیانات میں تیسرا بیان سب سے مفصل اور اہم ہے جسے ادب کے ایک سرگرم خدمت گزار کی حیثیت سے ان کی اہمیت واضح کرنے کے لیے بیان نقل کیا جاتا ہے۔ لکھتے ہیں کہ :

"الحمد للہ العزیز المتعال ..... کہ ایں ہیچمدانِ دبستان دانش از زمانِ شعور تا الی الآن بہ استفادۂ صحبتِ صاحب طبعانِ سخن سرا انجامِ ہر کارے وخدمتے راکہ کمرِ خدمتِ برمیانِ جان چست بستہ، صورتِ شاہدِ مقصود در آئینہ خیال بخوب ترین نمود جلوہ گر گشتہ بدو ابتدائے سنِ وقوف کہ سالِ عمر بہ دوازدہ بود، حضرت ابوی مغفور و مبرور ..... بنا بر جودتِ ذہن و عبور بر اوزانِ بحور خدمتِ ترتیبِ دیوانِ فارسیٔ خویش کہ مردف نبود، بنام مستہام مقرر فرمودند تا آں کہ در چند روز بتاثیرِ کلامِ افاضت انجام آشنائے طرز گشتہ گاہے بیتے و رباعی فکر کردن گرفت و بہ یمنِ اصلاحِ آں مقتدائے ایں طریق در مرورِ ایام دیوانے بتخلص مبتلا طرح یافت۔ ازاں پس بتاثیر صحبتِ بعض اعزہ شوقِ تیر اندازی دامنِ دل کشید و ازیں علم ہم بہرۂ برداشت۔ ہم دریں عرصہ اوقاتِ بہجت آیات نحوے بخواندنِ علم صرف و نحو مصروف بود کہ دفعتہً عارضۂ نزلہ و سرفہ مانع تحصیلش گردید حتّٰی کہ تا حال در ہماں بیماری گاہے بشفا و گاہے بمرض گذارہ می گردد۔ چوں شناختِ مزاج منحصر بر علم طب است، خیلے از فضائلِ آں نیز بہرہ ور شد۔ گذارشِ تدبیرش بہ از استقدام در تقریرش۔ خود را صحتے و دیگراں را راحتے ازو حاصل ساخت۔

چوں اوقاتِ عمر اکثر در نثر طرازی و نظم پردازی بسر (می) برد (وقتے) کہ حضرتِ ارم مقام شاہ عالم بادشاہ با فوجے جرار از ضلع پٹنہ دار الخلافۂ شاہجہان آباد را زیب و زینت بخشیدند و بایکے از مرزایانِ ہمراہی بخف خاں کہ اسمش ابراہیم بیگ الم تخلص بود، صحبتم افتاد، تخلص دیگر عشق ساختہ دیوانے ترتیب دادہ و نسخۂ "فسونِ عشق" در بحرِ مثنوی متضمنِ قصۂ شہ رخ و مہ رخ قریب یک ہزار و

ہفت صد بیت فارسی در ہماں ایام طرح کردہ واز تالیفِ تذکرہ فارسی مسمّٰی "مجموعہ عشق" وملقب بہ التزام تاریخ "باغِ گل ہائے حسن" (۱۱۸۷ھ) مشحون بہ اقسامِ فنون قریب ہشاد جزو الفراغی (کذا) گشت۔ ازاں پس منشاتے (چند) بضخامتِ سیزدہ چہاردہ جزو بہ اقسام صنائع و بدائع ہم رنگین وہم متین فراہم آمد و بہ "صادِ دفترِ اشواق" (۱۱۸۷ھ) از التزامِ تاریخ نامزد گردید" ونسخۂ "سوائر" (۱۱۸۶ھ) بہ التزامِ تاریخ در فن تاریخ طرح کردکہ مبتدیان را بکار آمد والحال انقضاے دو سال است کہ تالیفے تازہ موسوم (بہ) "مجارِ تشریح" ورسالۂ دیگر درعلمِ تصوف مسمی بہ "اشعات العشق" بعد فراغ ایں تالیف بروے کار آمدہ، چنانچہ اندک اندک از تصنیف وتالیفِ خود در طبقۂ دوم بسبیل تفنّن طبع احبا تحریر خواہد یافت۔ واز اشعارِ فارسی حضرتِ ابوی نیز زینتِ کتاب خواہد نمود۔ بالفعل از تالیفِ ایں تذکرہ ہندی مفروغ (کذا) گردیدم۔

کس جوہرِ من نمی شناسد جز من مانند گہر در گرۂ خویشتنم"

(ص ۲۶۴)

مشاہیر شعرا اور اپنے دوستوں اور ملاقاتیوں میں سے جن لوگوں کے تعارف پر مبتلا نے خاص توجہ دی ہے ان کی شخصیت و سیرت کے مختلف پہلوؤں کے متعلق اپنے تاثرات ومشاہدات کے بیان میں بھی انھوں نے بالعموم کوئی کوتاہی نہیں کی ہے۔ وہ الفاظ کے ذریعے مصوری کے ہنر اور دریا کو کوزے میں سمو دینے کے فن سے بخوبی واقف ہیں۔ چنانچہ کہیں تو انھوں نے زیر بحث شاعر کی زندگی کے بعض کوائف اور معمولات کے ذکر میں وہ انداز بیان اختیار کیا ہے کہ قاری کو الفاظ کے پردوں سے اس کی شخصیت اپنے تمام خط وخال کے ساتھ منعکس ہوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے اور کہیں براہِ راست اظہار وابلاغ کے پیرائے میں مختصر طور پر شخصی اوصاف کے سارے نمائندہ پہلوؤں کا احاطہ کرکے ایک واضح تصویر پیش کردی ہے۔ سطورِ ذیل میں اس قسم کی چند مثالیں نقل کی جاتی ہیں:

(الف) خواجہ میر درد :۔ "خلاصہ خاندانِ مصطفوی و نقادۂ دودمانِ مرتضوی
است۔ حقیقت کیش، معرفت اندیش۔ دیدہ حق بین
وسینہ وحدت آگیں۔ در دارالخلافہ سجادۂ طاعت بکنجِ
قناعت گستردہ داشت۔ صوفی مشرب، صافی مذہب،
متصوف کامل، مانند اسم شریفِ خود ہمہ درد دل۔
۔۔۔۔۔۔ ہشتم ہر ماہ در خانۂ وحدت نشانہ بزم مشاعرہ
وسرود آراستہ می فرمود۔ صاحب طبعان وسرود سرایانِ
دہلی ہمہ حاضر می گشتند۔ خود ہم دریں فن مہارتِ کلی
داشت۔" (ص ۹۶)

(ب) مرزا مظہر :۔ "شیخ کامل، مقتدائے اہل زماں، ہوشیار باطن، بیدار
مغز، صاحب نسبت بود و در سلسلۂ نقشبندیہ تلقینِ
فیض می نمود۔ از بس دوام بہ آبِ شریعت شست و
شوے کدورتِ دلہا داشت، جہانے او را چشمہ فیض و
خضرِ طریقت می پنداشت۔ فی الواقع آئینہ حقیقت
از تمثالِ بے مثالش جلا دید و بحرِ ناپیدا کنارِ معرفت را
بضمیرِ صفا تصویرِ خود موج بخشید۔ کلاہِ سرش از تخشیۂ
ارجمندی با تاج سربلندیٔ خورشید ہم پیوند و بندجبۂ
او را کشادِ حرف لی مع اللہ در سوگند۔ از اعاظم مستعدان
واکابرِ عالی فطرتانِ عصر بودہ است۔" (ص ۲۱۸)

(ج) خیراتی خاں دل سوز :۔ "از بس میلِ خاطر او بجانبِ شراب بسیار بود، ہر گاہ
مئے گل رنگ می کشید، بیخود گشتہ ہر چہ از نقد و پارچہ نزد
خود می داشت، بے فروش می بخشید و اکثر بہ اندیشۂ
عتابِ نواب (ظفر یاب خاں صاحب تخلص مربی حق

از قصبہ سردھنہ روپوش گشتہ در میرٹھ آمدے و در
مقامِ مولف جاگرفتے و بزم مشاعرہ می آراست۔
خدا آبروے ایں بنت العنب بریزد کہ خاکسارے
را آتشِ مذلت در اسبابِ اوقات انداختہ برباد ساختہ
بود ۔۔۔۔۔۔۔" (ص ۹۱)

(د) ضیاء الدین ضیاؔ :۔ "شاعرے آشفتہ مزاج، عاشق طور بودہ است کہ روز
وشب با شاہدان بازاری محشور بود و بمعشوق پرستی
مشہور ۔۔۔۔۔۔" (ص ۱۵۱)

(ہ) ظہور اللہ خاں نوآؔ :۔ "در مکارم اخلاق و محاسنِ اشفاق و لطافت طبع و
ظرافتِ مزاج و استقامتِ عقل ۔۔۔۔۔ و رزانتِ
رائے ۔۔۔۔۔۔ مرد لیست دانشمند ۔۔۔۔۔"

(ص ص ۱۵۴ و ۱۵۵)

(و) نظام الدین ممنونؔ :۔ "موصوف بصفاتِ حمیدہ و اخلاق پسندیدہ و ہوشیار
باطن، بیدار مغز، عالی طبع، والا تبار است ۔۔۔۔۔"

(ص ۲۲۴)

کہیں کہیں مبتلاؔ نے شعرا کے فنی کمالات اور خصوصیات کلام کے بارے میں بھی اپنے خیالات و تاثرات کا اظہار کیا ہے لیکن اس سلسلے میں ان کے زیادہ تر بیانات تنقید کی بہ نسبت تقریظ سے قریب تر ہیں۔ چنانچہ صاف و سادہ الفاظ کی بجائے تشبیہات و استعارات کے پیرائے میں گفتگو کا جو انداز تقریظ کے ساتھ مخصوص ہے، تذکرے کے مندرجہ ذیل اقتباسات میں اس کی جھلک واضح طور پر دیکھی جا سکتی ہے :

(الف) جرأتؔ :۔ "چاشنیٔ نعت ہائے شکرین معنی در رگ و پے نے قلم
دوانیدۂ دست قدرتِ اوست و حلاوتِ مضامین تازہ

بتازہ بسازد برگِ الفاظ رسانیدۂ زورِ طبیعت او۔
پری رویانِ بزمِ تازہ خیالی را پرستاران۔ خانہ زادِ حسنِ
فکر خود می پنداشت و خود فروشانِ بازارِ خوش مقالی
را کنیزکان آزادِ بندِ طبعِ خویش می انگاشت۔ جلوہ
گریٔ سادہ رویانِ نازک بندی در آئینہ خانہ رائے
روشنش پیدا و ہم بستریٔ نازنینانِ معنی بخلوت گاہِ
بلندیٔ فکر او ہویدا۔" (ص ص ۵۶ و ۵۷)

(ب) خواجہ میر درد:۔ "دیوانِ تصوف سامانِ او ۔۔۔۔۔۔ از پرتوِ تجلیاتِ
الفاظِ وحدت با اوراقِ مہر و ماہ برابر و مضامینِ
ہدایت آگینِ نثرش از غایتِ فروغِ معنی با سبعہ
سیارہ ہم سر ۔۔۔۔۔۔ شاہدانِ مضامین نالۂ دردش
از شورِ چسپانی نمک بر جراحتِ دل ہا می پاشند و معشوقانِ
معنی آہِ سروش بچاشنیٔ شیریں کلامی قوامِ شربتِ شوق
می گردانند۔" (ص ۹۶)

(ج) سعادت یار خاں رنگین:۔ "برشتگی الفاظ و شیفتگی معانی از وضعِ آشفتہ اش
پیداست و پری چہرگانِ مضامین او را باغازۂ تازگی
و گل گونۂ نازِ حسنِ دو بالا۔ ایجادِ ریختی بزبان محل از
نتائجِ طبعِ حسن سرشارِ اوست و نیک ورزیٔ محاورات
دراں کلام بزورِ بازوئے عشق گفتارِ او۔ چسپانی
کلمات تازہ پیراہنے است بر قامت معشوقانِ شعارش
دوختہ و برجستگیٔ سخن ہائے دل فریبِ عاشق شکیب
شمع در محفلِ گفتار برافروختہ۔" (ص ۱۰۷)

(د) مرزا رفیع سودا:۔ "فارسِ مضمار سخندانی او، پہلوانِ عرصۂ معانی (است)

۔۔۔۔۔ درطرحِ قصائدِ مدائح و پروازِ مثنویاتِ ہجو
مثلِ او از خاکِ دارالخلافہ احدے برنخاستہ۔۔۔۔۔
مانندِ او بسیار گو و خوش گو کم پیدا شدہ۔۔۔۔۔ ہرچند
درہم عصرانِ خود زبانے صاف پیدا کردہ، امایارانِ
حال بر اکثر محاورات حرف می گیرند و کرخت می گویند
۔۔۔۔۔ دریں سخن سخن است۔ او معنی یاب تازہ گو
بود۔ ایں ہا صرف گفتگوے دارند۔" (ص ص ۱۲۱ و ۱۲۲)

(۵) قائم چاندپوری :۔" رباعیاتش چوں ترکیبِ عناصر از چہار مصرعہ بہم مختلط
و مثنویاتِ دلآویزِ او مانندِ زلف و گیسو با یک دیگر مرتبط۔
قصائدش در چمنستانِ فکر ریحانِ بوستانِ دل پذیری
و غزلیاتِ او را نظیرے بانظیری۔ شاہدانِ معنی در زیرِ
نقابِ الفاظش چہرہ۔۔۔۔۔ برافروختہ اند و آئینہ
رویانِ الفاظ بخال و خطِ دل بستنی خود را بانازِ یوسفی
فروختہ۔ پیچ و تابِ مضامین چوں طرۂ دلآویزِ مسلسل
مویاں روکش سنبلستانِ بہار و رنگینیٔ کلام عندلیبانِ
چمن استعداد را سرمشقِ گفتار۔ کرسی نشینیٔ استعارات
اوعرشِ فصاحت را کنگرہ ایست بلند و سجع گز بینیٔ
کلماتش در عرضِ جوہرِ مدعا دل پسند۔ آئینہ داری
یوسفِ طلعتانِ معنی از کلامش پیدا و شانہ چینیٔ عنبریں
مویانِ سخن بزنجیرۂ الفاظش ہویدا۔" (ص ۲۰۸)

(۶) میر نظام الدین ممنون :۔" قافیہ سنجانِ قادر سخن را کہ عمرے دریں فن صرف
کردہ اند، بہم رسانیدنِ جنسِ کلام بمنزلۂ افکارش
دشوار۔ حبذا جودتِ طبعِ آں سحر آفریں کہ گوہر شاہوارِ

معنیٔ آبدار از محیطِ طبع برمی آرد و مرحبا بلند پروازیٔ شہبازِ
فکرِ آن اعجاز مکیں کہ بسر پنجۂ قدرت عنقائے خیال می
شکارد۔" (ص ص ۲۲۴ و ۲۲۵)

(ز) نصیر دہلوی: "در نازک بندی برہم عصرانِ خود ممتاز۔ معنی ہائے
جستہ جستہ اش با الفاظِ دل پسند مانندِ جسم و جان مرتبط
واز روائحِ فوائحِ طرزِ تازۂ او دماغ و جانِ ہنروران
منبسط۔ از اقسامِ شعر در طرحِ مطلع و قطعہ ممتنع الجواب
است و بہ نتائجِ افکارِ تازہ بتازہ گل سرسبدِ انتخاب۔
تازگیٔ مضامین او بارنگینیٔ الفاظ غیرتِ بہارستانِ عدن
و بلندیٔ فکر (او) با شرفۂ عرش ہم سخن۔ جدولِ دیوانش
را (ہ با) خطوطِ شعاعی ہمسر است و نقطۂ انتخابِ
او از نقاطِ ماہ و پرابر۔" (ص ۲۴۶)

ان عبارتوں میں معانی پر الفاظ کے غلبے یا استعاراتی انداز بیان کی وجہ سے کسی حد تک پیچیدگی یا ابہام کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے تاہم ان کے مطالعے سے شاعر کی فنی استعداد، اس کی طبیعت کے رجحان، کلام کے رنگ ڈھنگ اور زبان و بیان کی خوبیوں اور خامیوں کے بارے میں ابتدائی نوعیت کی معلومات ضرور حاصل ہو جاتی ہے۔ اس لیے ان کو لایعنی اور بے مصرف کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

انتخابِ کلام کے سلسلے میں "طبقات سخن" کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ میر حسن کے تذکرہ شعرائے اردو کی طرح اس تذکرے میں بھی صرف صنفِ غزل ہی کو نمایندگی نہیں دی گئی ہے بلکہ موقع اور محل کے مطابق جا بجا دوسری اصنافِ سخن کے نمونے بھی پیش کیے جاتے رہے ہیں اس تنوع کی بنا پر اگرچہ حجم میں کسی قدر اضافہ ہوگیا ہے لیکن اس کے نتیجے میں کچھ ایسے ادبی نوادر بھی دستبردِ حوادث سے محفوظ رہ کر ہم تک پہنچ گئے ہیں جن کا دوسرے ذرائع سے حاصل کرنا دشوار ہے۔ نظم کے ان

گراں مایہ انتخابات کے پہلو بہ پہلو تذکرے میں نثر کے کچھ قابلِ قدر نمونے بھی ملتے ہیں۔ یہ نثر پارے جنھیں بلاشبہ اردو کے اسالیب بیان کی تاریخ میں نمایاں اہمیت کا حامل کہا جا سکتا ہے، حسین عطا خاں تحسین کی "نوطرزِ مرصع" کے ایک طویل اقتباس، رائے ٹیکا رام تسلی کے قلم بند کیے ہوئے دو لطائف اور مولف تذکرہ کے نام حسین علی مرزا پوری کے ایک خط اور اس کے جواب پر مشتمل ہیں۔ تحسین کی نوطرز مرصع شائع ہو چکی ہے، اس لیے اس کے اقتباس کے بارے میں یہاں کسی قسم کا اظہار رائے غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ البتہ ٹیکا رام تسلی، حسین علی مرزا پوری اور مولف تذکرہ کے رشحاتِ قلم ان کی اہمیت کے پیش نظر ضروری توضیحات کے ساتھ سطورِ ذیل میں نقل کیے جاتے ہیں۔

تسلی کے متعلق مبتلا کا بیان ہے کہ:

"وطنِ بزرگانش اٹاوہ است و او در لکھنؤ تربیت یافتہ۔ اشعارِ فارسی را از نظر مرزا فاخر مکین می گذراند۔" (ص ۳۰)

اس کے بعد اس تمہید کے ساتھ کہ "دو نقل پارہ بزبان اردو کہ بنظر در آمدہ، دریں جا بتحریر می آرد" درج ذیل لطائف نقل کیے گئے ہیں:

۱۔ "نقل ہے کہ نادر شاہ جب شاہجہاں آباد میں داخل ہوا تو اوس کی فوج میں سے کئی مغل شہر کی سیر کو آئے۔ ایک ان میں بھوکھا تھا۔ اتفاقاً کسی سابن گر کی دوکان میں سابن کے بڑے بڑے ڈلے نظر آئے۔ کہنے لگا "ازیں چکدی ہائے پنیر یکے زود بمن دہ کہ بسیار گرسنہ ام" سابن گر بولا "آغا صاحب یہ سابن ہے پنیر نہیں"۔ تب جھنجلا کر مغل نے کہا کہ "قرم ساق غلط می گوئی، بیار" جب اس نے دیکھا کہ یہ عقل کا اندھا مانے گا نہیں، ایک ڈلا سابن کا حوالے کیا۔ اس نے ایک بڑا سا ٹکڑا توڑ کر منھ میں ڈال لیا۔ سارے ہونٹ پھٹ گئے، جیب تڑک گئی۔ تب گھبرا کے کہنے لگا "اے وائے وائے، دہنم سوختہ شد۔ سب بازاری ہنسنے لگے اور ان سے کہا: مرزا صاحب اس پنیر کا مزہ تو

خوب چکھا۔ بڑا شرمندہ ہو گردن نیچی کیے چلا گیا۔" (ص ۳۰)

۲۔ "ایک مغل تازہ ولایت ہندوستان میں آیا تھا۔ اتفاقاً کہیں سبزی منڈی میں جا نکلا۔ وہاں ایک کنجڑی ٹوکری میں جامنیں بیچتی تھی۔ مغل نے پوچھا: "اے کنجڑی! ایں میوہ چہ نام دارد؟" بولی "مرزا جی ان کو جامنیں کہتے ہیں۔" مغل کے پاس پیسا نہ تھا جو لے کر کھاوے۔ صورت ان کی یاد رکھی۔ پھرتے پھرتے کسی باغ میں آنکلا۔ یک جامن کے درخت کے نیچے کئی یک جامنیں پڑی تھیں اور دو چار بھونرے تھے۔ یہ لگا چن چن کھانے، ساتھ ہی بھونروں کے (کذا: کو) لگا چباتے۔ جب منھ میں کچر کچر لگے کرنے، مغل بولا، تم چیں کرو خواہ پیں، کالا کالا ایک بی (= بھی) نہ چھوڑوں گا۔" (ص ص ۳۰ و ۳۱)

میر امتن کی "باغ و بہار" جسے سلیس اردو نثر کی پہلی باقاعدہ تصنیف ہونے کا فخر حاصل ہے، ۱۲۱۷ھ/۱۸۰۲ء میں لکھی گئی ہے۔ یہ لطائف اگر اس سے قدیم نہیں تو کم از کم اسی زمانے کی تحریر ضرور ہیں لیکن ان میں جو زبان استعمال ہوئی ہے، وہ باغ و بہار کی زبان سے بھی زیادہ صاف اور روزمرہ سے قریب تر ہے۔ اس اعتبار سے اردو کے لسانی ارتقا اور اس کے مختلف اسالیب کے مطالعے سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ان نثر پاروں کی اہمیت مسلم ہو جاتی ہے۔

حسین علی مرزا پوری اور مبتلا کے خطوط کی زبان مرصع اور پر تکلف ہے اور سادگی و صفائیِ بیان کو مرتبۂ علمی کے منافی سمجھنے والے گروہ کے اسلوب کی نمائندگی کرتی ہے۔ کاتب کی غلط نویسی، خط کی خرابی اور املا کے فرق کی وجہ سے اگرچہ ان خطوط کے بعض جملے صحیح طور پر نہیں پڑھے جا سکے ہیں تاہم ان کا یہاں نقل کر دینا دلچسپی اور افادیت سے خالی نہیں۔ ملاحظہ ہوں:

"سوادِ خط حسین علی"

"واقفِ موافقاتِ سخن کے، کاشفِ مکاشفاتِ اس فن کے، باریکیوں کے اشعار کی شناسا، میاں صاحب متخلص بہ عشق و مبتلا۔ ایک روز تخت

اقتضائے وقت کے اتفاق مخزن محبت و وفاق شاہ آفاق کا بیچ غریب خانہ اس منزل شناسِ مطارحاتِ آشنا و بیگانہ کے پڑا تھا اور ہر قسم کے اشعارِ آبدار زبانِ معنی ترجمان شاہ اوسکی (کذا) گوہر فشان ہوئے (؟) نتائجِ خیال بے نظیر مرزا جلال الدین اسیر کے سے ذکر ایک بیت کا درمیان آیا۔ جو معنی اوس کے جانے تلاش سے نہیں، حاضران صحبت کے غور اوس کے میں غواص دریائے فکر کے ہوئے لیکن مطلع صاف نہ دیکھا اور بیت وہ یہ ہے۔ فرد

بوے گل و روے ماہ دارد　　آئینہ ہزار آہ دارد

آخرش رائے سب کی اس پہ آئی کہ آگے اوس موشگافِ زلف معشوقانِ سخن کے بھیجئے۔ امید کہ شانہ کاری غور کی سی پیچ کا کلِ معنی کا کھولنا کر کے یارانِ صحبت کو سرور بخشیں اور مجھ کو بند فکر کی سی سے آزاد کریں۔ زیادہ ہم بستر معشوقہ مراد کے ہو کر سب کو آرزومندِ ملاقات جانیں اور سلام۔" (ص ۸۱)

"جواب خط از مولف"

"عاشق معشوق حسین کے میاں علی حسین (کذا: حسین علی) سلمہٗ گلدستا گلزارِ کرم کا یعنی رنگین نامۂ بہار کی خاتمہ اوس وقت کہ چشم انتظار کی شاہراہِ آرزو پر نرگس وار چار تھی، بات (ہاتھ) قاصدِ صبا رفتار کے اوتر نا اشفاق کا کر کے آنکھوں کو نور اور دماغ کو طیب اور سرور بخشا۔ اگرچہ تقریرِ معنیِ مطلعِ اسیر کی جانی فکر سے مہین لیکن واسطے تسکین خاطر نزہت آفریں کے کچھ صورت نمائے تحریر گر ہوں کہ آئینہ صاف طینتی سے وہ لطافت رکھتا ہے کہ جس وقت محاذی روے معشوق کے ہو، تماشائے صفائی بہارِ چہرہ کی سی کہ بوے گل اور روے ماہ دونوں وہاں موجود ہیں، اور اوس دونوں کی خو ضمیرِ آئینہ تاثیر برودت کی سی رنگِ کلفت پکڑی، نہ وہ شفافی اور وہ صافی کہ اوس کو موجود رہتی ہے قائم نہ رہی بلکہ دامان حسنِ آئینہ کا گرد آلودِ کدورت ہوا۔ یہی تلاش کی۔ ایک شعر نتائجِ طبع اپنے سے یہ ناقص لکھتا ہے شعر:

گشت زاں نرگسِ خواب آلودہ　　دیدۂ آئینہ آب آلودہ

معنی اوس کے یوں کہ جب لگ چشمِ معشوق مائل بہ بیداری تھی، آئینہ بھی گلچینِ بہارِ تماشا تھا و قتیکہ وہ درخواب آئی، یہ بیکار پڑا۔ اس واسطے چشم پرآب ہے۔ صاحب بندہ! اگر معنی دو نوبیت وقت پسند تمھاری کے آویں، مجھ کو ممنون اشفاق جانیں (؟) زیادہ دعا۔۔۔۔۔" (ص ص ۸۱ و ۸۲)

آخر میں مبتلا کے بعض ایسے بیانات کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے جو خلافِ واقعہ ہیں اور ان کے نقصِ معلومات پر دلالت کرتے ہیں۔ یہ بیانات نہ تو ان تذکروں کی روایات سے مطابقت جن سے مبتلا نے بالاعلان استفادہ کیا ہے اور نہ دوسرے مستند ذرائع ہی سے ان کی تائید ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر

(الف) کسی تذکرہ نگار یا مورخ نے نواب آصف الدولہ کو آصف جاہ کے لقب سے یاد نہیں کیا۔ یہ خطاب دکن کے صوبیداروں اور فرماں رواؤں کے لیے مخصوص رہا ہے لیکن مبتلا ہمیشہ آصف الدولہ کی بجائے آصف جاہ لکھتے ہیں۔

(ب) شاہ محمدی بیدار کو مبتلا نے میر محمد علی شاگرد مرزا غنی بیگ فراق لکھا ہے (ص ۲۶) بیدار کے نام کے سلسلے میں تذکرہ نگاروں کے بیان میں کسی قدر اختلاف ہے۔ قائم کی تحریر کے مطابق ان کا نام میر محمدی[۱] اور میر حسن کے بیان کے بموجب میر محمد علی ہے[۲]۔ مصحفی نے ان دونوں ناموں کو صحیح قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ "میر محمد علی نام دارد و بمیر محمدی بیدار مشہور است[۳]" لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان عام روایات کے برخلاف بیدار کا اصل نام عماد الدین اور شاہ محمدی یا میاں محمدی ان کا لقب تھا اور وہ نسباً سید نہیں فاروقی شیخ تھے[۴] نام و نسب کے معاملے میں اس اختلاف سے

---

۱ مخزنِ نکات ص ۶۳　　۲ تذکرہ شعرائے اردو طبع ثانی ص ۳۱

۳ تذکرۂ ہندی ص ۳۱

۴ چمنستانِ رحمتِ الٰہی ص ۳ و ۴، تذکرۃ الفقرا ص ۵۳ و اکمل التاریخ حصہ اول ص ۱۲۸

قطع نظر اس بات پر تمام تذکرہ نگار متفق ہیں کہ وہ مرتضیٰ قلی بیگ فراق کے شاگرد تھے۔ غنی بیگ ایک بالکل مختلف شخصیت ہیں۔ وہ کشمیر کے رہنے والے تھے اور قبول تخلص کرتے تھے۔ بیدار کا ان کی شاگردی سے کوئی تعلق نہیں۔

(ج) میاں تجلی دہلوی کے متعلق لکھتے ہیں:

"میر غلام علی نام خلفِ میر طالب حسین کلیم و ہمشیر زادہ میر تقی۔ قصہ لیلیٰ مجنوں نام بزبانِ ہندی در عشق زنے برہمنہ کہ برو فریفتہ شدہ در حبالۂ نکاح آوردہ بود، بسیار دل چسپ گفتہ۔" (ص ۳۲)

تجلی کے مندرجہ بالا نام (غلام علی) کی تائید میں قطب الدین باطن اکبرآبادی کے "گلستانِ بے خزاں" کے علاوہ کسی دوسرے تذکرے کی شہادت موجود نہیں[۱] سید محمد فاروق شاہ پوری کے خیال کے مطابق یہ روایت مثنوی لیلیٰ مجنوں کے مندرجہ ذیل شعر کی غلط تعبیر کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے ؎

زباں پر رہے ورد نامِ علی　　لقب میرا ٹھہرے غلامِ علی[۲]

دوسرے تذکرہ نگاروں نے انھیں عام طور پر ان کی عرفیت میاں حاجی یا میر محمد حسن کے نام اور میر محمد حسین کلیم کے فرزند کی حیثیت سے یاد کیا ہے۔ البتہ لالہ سری رام "میر حسین عرف میر حاجی دہلوی پسر محمد حسن کلیم" لکھتے ہیں[۳]۔ فاروق صاحب نے موخر الذکر روایت کو قرینِ صحت قرار دیتے ہوئے تجلی کی مثنوی کا یہ شعر سند کے طور پر پیش کیا ہے ؎

زبانِ عرب میں وہ آشفتہ حال　　پکارا مجھے یا حسینی تعال

اس دلیل کو جو یقیناً دوسرے تمام دلائل سے زیادہ قوی ہے صحیح مان لینے

---

[۱] گلستانِ بے خزاں ص ۵۶

[۲] "میر تجلی اور مثنوی لیلیٰ مجنوں" مشمولہ ماہنامہ "نگار پاکستان" شمارہ ستمبر ۱۹۶۳ء

[۳] خم خانہ جاوید جلد دوم۔ ص ۳۶

کے بعد لالہ سری رام کے بیان کے دوسرے جز یعنی کلیم کے نام کی صحت کا اقرار بھی لازم آتا ہے ورنہ باپ اور بیٹے کے ناموں میں کوئی فرق باقی نہ رہے گا۔ ہمارے خیال میں یہ دونوں نام لفظ محمد کے اضافے کے ساتھ جو اکثر یمن و برکت کی غرض سے اصل نام کی ابتدا میں بڑھا دیا جاتا ہے میر محمد حسین اور میر محمد حسن کی شکل میں بھی صحیح مانے جا سکتے ہیں۔ طالب حسین عیار الشعرا کے نسخہ لندن کے علاوہ کسی اور تذکرے میں نہیں ملتا[۱]۔ اور بظاہر مبتلا کا ماخذ بھی یہی تذکرہ ہے۔ کلیم کے نام کی اس خلاف واقعہ روایت کی طرح کسی "زن برہمنہ" پر فریفتگی کا افسانہ بھی بے بنیاد معلوم ہوتا ہے، کیونکہ مثنوی لیلیٰ مجنوں میں مبتلا کے بیان کے برخلاف وہی مشہور داستانِ عشق بیان کی گئی ہے جو روایتی طور پر ان دونوں ناموں سے وابستہ ہے[۲]۔

(۵) میر عبدالحئی تاباں کے حال میں رقم طراز ہیں:

"وقتے کہ گردِ خط از آئینۂ رخسارش پیدا شد، دست بر عارض گردانید"

ایں بیت بدیہۃً برخواند و جان بجاناں سپرد۔ بیت:

اس خط نے تو حسن سب گنوایا　　یہ سبز قدم کہاں سے آیا" (ص ۵۲)

تاباں کے متعلق یہ بات تو تقریباً تمام ہی تذکرہ نگاروں نے لکھی ہے کہ انھوں نے عنفوانِ شباب میں وفات پائی لیکن یہاں ان کی موت کا جو پس منظر بیان کیا گیا ہے، اس کی کسی دوسرے ذریعے سے تصدیق نہیں ہوتی۔ بظاہر یہ روایت کسی افسانہ طراز کی طباعی کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے کیونکہ اس کی بنیاد جس شعر پر رکھی گئی ہے وہ تاباں کا نہیں ان کے استاد محمد علی حشمت کا ہے[۳]۔

(۶) میر حسن کو مبتلا نے "میر غلام علی" کے نام سے متعارف کرایا ہے (ص ۸۲)

---

[۱] عیار الشعرا مخطوطہ انڈیا آفس لائبریری لندن ص ۱۱۸

[۲] تفصیل کے لیے دیکھیے "اردو مثنوی شمالی ہند میں" از ڈاکٹر گیان چند ص ۳۸۲ تا ۳۸۵

[۳] نکات الشعرا طبعِ ثانی ص ۱۰۷، مخزنِ نکات ص ۲۷ و تذکرہ شعرائے اردو طبع ثانی ص ۴۹

یہ بیان بھی خلاف واقعہ ہے۔ حسنؔ خود اپنا نام میر غلام حسن لکھتے ہیں[1]۔ دوسرے تذکرہ نگاروں میں ان کے قریب ترین ہم عصر اور دوست مصحفی کا بھی یہی بیان ہے[2]۔

(و) حاتم کے ذکر میں اس اعتراف کے باوجود کہ "مولف ..... شرح احوالش ..... بموجب عبارتِ تذکرۂ میر غلام ہمدانی مصحفی تخلص کہ اورا از حاتم بسیار صحبت ہا افتادہ، بقلم آوردہ است" مصحفی کے بیان کے برخلاف مبتلا نے ان کے نام کے ساتھ مرزا کا اضافہ کر دیا ہے (ص ۷۸) اور دوسرے مقامات پر بھی جہاں کہیں ان کا ذکر آیا ہے "مرزا شاہ حاتم" ہی لکھا ہے۔ مصحفی کے علاوہ دوسرے تمام معاصر تذکرہ نگار بھی اس پر متفق ہیں کہ شاہ حاتم نسباً شیخ تھے[3] ایسی صورت میں انھیں "مرزا حاتم" لکھنا صریحاً غلط ہے۔

(ز) میر تقی میرؔ کے بارے میں فرماتے ہیں:

"سید عالی نسب والاحسب است کہ خواہر سراج الدین علی خاں آرزو در حبالۂ نکاحش بود۔" (ص ۳۴)

میر صاحب کی سیادت کے معاملے میں محققین کے اختلاف سے قطع نظر یہ بات کہ آرزو کی بہن ان سے منسوب تھیں، قطعاً غلط ہے۔ یہ خاتون میرؔ کے والد کی زوجۂ اول اور میاں محمد حسن کی والدہ تھیں۔ ان کے انتقال کے بعد زوجۂ ثانی کے بطن سے میرؔ تولد ہوئے تھے[4] گویا آرزو اور میرؔ کے درمیان نہ کوئی خونی رشتہ تھا اور نہ کوئی نسبتی تعلق۔ میاں محمد حسن کے صاحبزادے میاں محمد محسن محسنؔ کے سلسلے میں بھی مبتلا

---

[1] تذکرہ شعرائے اردو طبع ثانی ص ۲

[2] تذکرۂ ہندی ص ۶۸

[3] مصحفی کے تذکرہ ہندی (ص ۸۰) اور عقد ثریا (ص ۲۳) کے علاوہ ملاحظہ ہو تذکرہ شعرائے اردو طبعِ ثانی ص ۴۶، نکات الشعرا طبع ثانی ص ۷۵، عمدہ منتخبہ ص ۲۰۹ و مجموعہ نغز ص ۱۷۹

[4] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو دلّی کالج میگزین میرؔ نمبر (ص ۴۶ و ۴۷)

سے ایسی ہی غلطی ہوئی ہے۔ وہ انھیں "خواہرزادۂ خان آرزو" لکھتے ہیں (ص ۲۳۱) حالانکہ یہ نسبت آرزو اور میاں محمد حسن (محسن کے والد) کے باہمی رشتے کو ظاہر کرتی ہے۔

(ح) محتشم علی خاں حشمت کے حالات میں انھیں میر عبدالحئی تاباں کا استاد بتایا ہے (ص ۷۸) جب کہ تاباں کے استاد ایک دوسرے ہم تخلص شاعر محمد علی حشمت تھے، جن کا ذکر دیوانِ تاباں میں کئی جگہ موجود ہے[۱]

(ط) مصحفی کے تعارف کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے:

"مصحفی بداؤنی، نامِ او میر غلام علی ہمدانی است۔" (ص ۲۲۱)

اس مختصر سے بیان میں کئی خلافِ واقعہ باتیں جمع ہوگئی ہیں۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ مصحفی کا بدایوں سے کوئی تعلق نہ تھا، ان کے آبا و اجداد موضع اکبرپور متصل امروہہ کے رہنے والے تھے[۲] دوسرے ان کے نام کے ساتھ میر کا اضافہ بھی غلط ہے کیونکہ نہ تو وہ خود سیادت کے مدعی ہیں اور نہ مبتلا کے علاوہ کسی اور شخص نے انھیں میر لکھا ہے۔ ان کے اپنے بیان کے مطابق ان کے مورثِ اعلیٰ ایک نومسلم خاندان سے تعلق رکھتے تھے[۳] تیسرے یہ کہ خود مصحفی اور دوسرے ہم عصر تذکرہ نگاروں کی تحریر کے بموجب ان کا نام غلام علی ہمدانی نہیں، غلام ہمدانی ہے[۴] خود مبتلا نے دوسرے مقامات پر انھیں میر غلام ہمدانی (ص ۴۸) یا صرف میر غلام ہمدانی (ص ص ۵۱ و ۷۹) کے نام سے یاد کیا ہے۔

---

[۱] دیوانِ تاباں ص ص ۲۷۴ و ۲۷۶ و دیگر صفحات

[۲] تفصیل کے لیے دیکھیے سید یحییٰ حسن کا مضمون "مولد مصحفی" مشمولہ سہ ماہی "اردو ادب" علی گڑھ شمارہ مارچ ۱۹۵۵ء و سہ ماہی "اردو" کراچی شمارہ اکتوبر ۱۹۵۹ء

[۳] مجمع الفوائد مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لاہور بحوالہ تحقیقی مطالعے ص ص ۶۳ تا ۶۸

[۴] عقدِ ثریا ص ۱۰، ۵۷، تذکرہ ہندی ص ۳۰، ۲۴۷، ریاض الفصحا ص ۱۰ و ۲۸۶، طبقات الشعرا ص ۳۶۵ و مجموعۂ نغز جلد ۲ ص ۱۸۸

(ی) انعام اللہ خاں یقینؔ کے بارے میں لکھتے ہیں:

"حمید الدین خاں ملقب بہ نیچہ صبیہ' خود را بہ آں بزرگوار نامزد کردہ بود۔ منصبِ ہزار و پانصدی داشت۔ پدرش را نام اظہر الدین خاں است"

(ص ۲۶۲)

اس عبارت میں آخری جملہ "پدرش را نام اظہر الدین خاں است" پہلے دو جملوں سے پیشتر آنا چاہیے تھا۔ کیونکہ حمید الدین خاں کی صاحبزادی یقینؔ سے نہیں' ان کے والد سے منسوب تھیں[1] اور ہزار و پانصدی منصب بھی نواب مبارک جنگ بہادر کے خطاب کے ساتھ محمد شاہ بادشاہ دہلی کے دربار سے انھی کو عطا ہوا تھا[2] پھر یقینؔ نے عین عالمِ جوانی میں وفات پائی[3] اس لیے انھیں "بزرگوار" کہنا بھی کسی لحاظ سے درست نہیں۔

(ک) مندرجہ ذیل دو تراجم دراصل ایک ہی شاعر سے متعلق ہیں:

(۱) "عارفؔ۔ مردے رفوگر بود در عصرِ محمد شاہ

زلف کے رشتے سے دل اپنے کو سو آرام ہے　　چاک سینے کے رفو کرنا اسی کا کام ہے

ہزاروں معنیٔ باریک آویں دل میں اے عارفؔ

اگر زلفِ سیہ کا پیچ منھ پر اس کے کھل جاوے۔" (ص ۱۷۶)

(۲) عابدؔ۔ از احوالِ او، ہیچ معلوم نیست۔ ہمیں یک بیت او بسماعت درآمدہ

دخترِ رز سے کہو کہ آئے شتاب　　ورنہ عابدؔ افیم کھاتا ہے۔" (ص ۱۷۶)

دوسرے ترجمے کے تحت منقول شعر میرؔ، قائمؔ، گردیزی اور مصحفیؔ کے تذکروں میں

---

[1] مخزنِ نکات ص ۴۹ و دیباچۂ دیوانِ یقینؔ ص ۱۱

[2] دیباچۂ دیوانِ یقینؔ ص ۱۴

[3] طبقات الشعرا ص ۷۷، و تذکرۂ ہندی ص ۲۷۵

عارف کے انتخاب کلام میں شامل ہے۔[1]

(ل) محسن برادر زادہ میر کا حال بھی بہ تفصیل ذیل دو جگہ لکھا گیا ہے:

(۱) "محمد محسن۔ خدا داند کیست و از کجاست۔

اس کے کوچے میں ہے کچھ نالۂ شب کا چرچا — دیکھیو کوئی میاں میر اتو مذکور نہیں
اور یہ عاجز تمھارا کچھ نہیں رکھتا مگر — جانِ برلب آمدہ حاضر ہے گر درکار ہے"

(ص ۲۲۰)

(۲) "محمد محسن، محسن تخلص، خواہر زادۂ خان آرزو بود۔ ازوست

حرف تیرے عقیق لب کا شوخ — زندہ کرتا ہے نام عیسیٰ کا
تعزیت دارِ حسرتِ دل تھا — یہ جو گریہ کا جامہ آبی ہے"۔

(ص ۲۲۸)

اول الذکر محسن کے نام سے منقول دونوں شعر میر، گردیزی اور قائم کے تذکروں میں ثانی الذکر محسن کے منتخب کلام میں شامل ہیں۔[2]

امور واقعہ کے معاملے میں مولف کی بے خبری یا عدم اعتنا کی ان مثالوں کی وجہ سے "طبقاتِ سخن" کی استنادی حیثیت مشکوک ہو گئی ہے تاہم مبتلا نے اپنے بعض ایسے معاصرین، احباب اور ملاقاتیوں کے بارے میں جن سے ان کے ذاتی مراسم تھے، جو بیش قیمت معلومات فراہم کی ہے، اس کی اہمیت اور اس کی بنا پر تذکرے کی افادیت بہرحال مسلم ہے۔

---

[1] نکات الشعرا (طبع ثانی) ص ۱۳۰، مخزنِ نکات ص ۶۲، تذکرۂ ریختہ گویان ص ۱۰۶ و تذکرہ ہندی ص ۱۴۹

[2] نکات الشعرا (طبع ثانی) ص ۱۴۰، تذکرۂ ریختہ گویاں ص ۱۳۹ و مخزنِ نکات ص ۵۹

تذکرہ بے جگر

بعض کتابیں اپنے مصنفین کے ناموں سے زندہ رہتی ہیں جب کہ بعض مصنف اپنی کسی خاص تصنیف کی وجہ سے تاریخ ادب میں شہرتِ دوام حاصل کر لیتے ہیں۔ خیراتی لعل بے جگر ایسے ہی اربابِ قلم میں سے ایک ہیں جن کا نام صرف ان کے تذکرۂ شعرائے اردو کی وجہ سے زندہ ہے۔ آج ان کے بارے میں ہماری معلومات صرف اس حد تک محدود ہے کہ وہ سکندر آباد ضلع بلند شہر کے ایک ذی علم کایستھ خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور بحیثیت تھانیدار محکمہ پولیس سے وابستہ تھے۔ شعرائے اردو کے تمام تذکرے حتیٰ کہ کریم الدین کا "طبقات شعرائے ہند"، منشی دیبی پرشاد بشاش کا "آثار الشعرائے ہنود"، لالہ سری رام کا "خمخانۂ جاوید" اور بابو شیام سندر لال برق سیتاپوری کا "بہار سخن" بھی ان کے ذکر سے خالی ہے۔ اس سے زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ انھوں نے خود بھی دوسرے بے شمار شاعروں کے حالات میں تواریخ وسنین کے التزام کے ساتھ اہم واقعاتِ زندگی کے انضباط کے برخلاف اپنے بارے میں صرف چند انکسار آمیز جملوں پر اکتفا کیا ہے جن سے ان کے سوانح حیات سے متعلق کوئی اہم اور نتیجہ خیز معلومات حاصل نہیں ہوتی۔

"تذکرۂ بے جگر" ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔ اب تک اس کا صرف ایک ہی قلمی نسخہ دستیاب ہو سکا ہے جو انڈیا آفس لائبریری لندن میں محفوظ ہے۔ یہ واحد نسخہ بھی اس اعتبار سے ناقص الوجود ہے کہ اس کے شروع کے چار اوراق، درمیان سے تیرھواں ورق اور آخر سے ردیف "ی" کے پہلے شاعر انعام اللہ خاں

یقین کے حالات واشعار پر مشتمل تین صفحات کے بعد کے باقی تمام اوراق ضائع ہو چکے ہیں۔ اس نقص کی وجہ سے نہ تو اس نسخے سے تذکرے کے نام اور زمانۂ کتابت کے بارے میں کوئی معلومات حاصل ہوتی ہے اور نہ واضح طور پر یہ پتا چلتا ہے کہ یہ کب اور کتنے عرصے میں مکمل ہوا، البتہ متن میں بکثرت ترمیم و تنسیخ اور تصحیح و اصلاح کے عمل سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ نسخہ غالباً مولف کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے یا کم از کم ان کی ملکیت میں رہ چکا ہے۔ بحالتِ موجودہ اس نسخے میں مکمل یا نامکمل صورت میں تین سو اکسٹھ (۳۶۱) شاعروں کے حالات واشعار ملتے ہیں تخلص کے حرفِ اول کی رعایت سے حروف تہجی کی ترتیب کے مطابق قلم بند کیے گئے ہیں۔

تذکرے کے زمانۂ تالیف کی دریافت میں ہمیں سب سے زیادہ مدد مولف کے درج ذیل بیان سے ملتی ہے۔ منشی مہر چند فرخ آبادی کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

"تولدار جمندش ..... در سنہ یک ہزار و یک صد و ہشتاد و دو ہجری (۱۱۸۲ھ) بروزِ یکشنبہ در کوڑہ جہان آباد رو نمودہ ..... و ..... تا حال عمرِ شریفش بہ پنجاہ و پنج (۵۵) سال رسیدہ۔" (ورق ۶۳ الف)

اس بیان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بے جگر ۱۲۳۷ھ (۱۱۸۲ + ۵۵) / ۱۸۲۱ء کے قریب تذکرے کی ترتیب میں مصروف تھے لیکن مہر کے تعارف سے قبل وہ واضح طور پر رادھا کشن شکر مراد آبادی (ورق ۱۰ ب) سے میرٹھ میں اپنی ملاقات کے ذکر میں ۱۲۳۸ھ کا، راسخ عظیم آبادی (ورق ۹۱ الف) اور مصحفی (ورق ۱۵۹ ب) کی تواریخ رحلت کے سلسلے میں ۱۲۴۰ھ کا اور غلام محی الدین عشق و مبتلا میرٹھی (ورق ۱۲۴ ب) کے سال وفات کے طور پر ۱۲۴۱ھ کا حوالہ دے چکے ہیں۔ اس کے علاوہ ابتدائی متن کی کتابت کے بعد حاشیوں پر جو اضافے کیے گئے ہیں ان میں ۱۲۴۰ھ اور ۱۲۴۱ھ کے بعض واقعات کے پہلو بہ پہلو ایک جگہ ۱۲۴۲ھ کے ایک واقعے کا بھی ذکر ملتا ہے۔ (حاشیہ ورق ۱۵۰ الف)۔ ان تفصیلات کی روشنی میں یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ زیرِ نظر نسخے کی کتابت ۱۲۴۱ھ/۱۸۲۶ء میں ہوئی ہے اور اضافہ و ترمیم کا سلسلہ کم از کم ۱۲۴۲ھ/۲۷-۱۸۲۶ء

یا اس کے بعد کے قریبی زمانے تک جاری رہا ہے۔

بے جگر نے اس تذکرے کو زیادہ سے زیادہ جامع اور مفید بنانے کی غرض سے اپنے پیش رو تذکرہ نگاروں کے سرمایۂ معلومات سے ضرورت کے مطابق پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے۔ اس سلسلے میں انھیں سب سے زیادہ مدد مصحفی کے "تذکرۂ ہندی" اور مبتلا میر ٹھی کے "طبقاتِ سخن" سے ملی ہے۔ چنانچہ ان کے ہاں ننو سے کچھ زائد شعرا کے حالات میں اول الذکر تذکرے سے اور تقریباً پچاس مقامات پر مبتلا کے بیانات سے اکتساب فیض کے حوالے ملتے ہیں۔ ان دو تذکروں کے علاوہ کہیں کہیں حسین قلی خاں عاشقی عظیم آبادی کے "نشترِ عشق"، آزاد بلگرامی کے "خزانۂ عامرہ"، شفیق اورنگ آبادی کے "گلِ رعنا" والہ داغستانی کے "ریاض الشعرا" اور شرف الدین مسرور میر ٹھی کے "تذکرۂ شعرا بزبانِ اردو" سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ قائم چاند پوری، میر حسن، خوب چند ذکا، قدرت اللہ قاسم اور اعظم الدولہ سرور کے تذکروں سے بھی بے جگر نے اپنی واقفیت کا اظہار کیا ہے، لیکن یہ تذکرے غالباً ان کی نظر سے نہیں گزرے تھے۔

اوپر کی سطور میں جن تذکروں کے نام آئے ہیں ان میں سے "نشترِ عشق"، "خزانۂ عامرہ" اور "گل رعنا" کے مولفین نے صنف تذکرہ کے دوسرے عناصرِ ترکیبی کی بہ نسبت سوانح کو زیادہ اہمیت دی ہے۔ یہ لوگ پوری توجہ کے ساتھ تذکرہ نگاری سے قریب تر لے آنے کے لیے کوشاں رہے ہیں۔ بے جگر نے اگرچہ مواد کی فراہمی میں ان تذکروں سے نسبتاً بہت کم مدد لی ہے لیکن معنوی طور پر وہ سب سے زیادہ انھی سے متاثر ہوئے ہیں چنانچہ عام طور پر ان کی یہ کوشش رہی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو، انضباطِ سنین کے ساتھ ہر شاعر کی زندگی کے سارے اہم واقعات کا احاطہ کر لیا جائے اور اس کی شخصیت کے تمام اہم پہلو نمایاں کر دیے جائیں۔ اس سلسلے میں ان کی یہ روش بھی خاص طور پر قابلِ تحسین ہے کہ اس دور میں جب کہ مآخذ اور دوسرے ذرائع معلومات کی نشاں دہی کو غیر ضروری خیال کیا جاتا تھا، انھوں نے پیش نظر تذکروں سے اپنے افادات کو باقاعدہ حوالوں کے ساتھ پیش کیا ہے۔ تذکروں کے

علاوہ بے جگر نے بشرطِ سہولت شعرا کے احباب و اعزّہ سے بھی استفسارِ حالات میں مدد لی ہے۔ اپنی اسی تن دہی، ذوقِ جستجو اور طریقِ کار کی باقاعدگی کے نتیجے میں وہ سوانح نگاری کے معاملے میں اپنے تمام معاصر اور پیش رو تذکرہ نگاروں سے زیادہ کامیاب رہے ہیں۔ مثال کے طور پر خواجہ میر دردؔ سے متعلق اس تذکرے کے درجِ ذیل اقتباس میں ان کی ولادت، وفات اور مدفن کے بارے میں جو معلومات فراہم کی گئی ہیں وہ اس سے قبل کے کسی تذکرے سے حاصل نہیں ہوتیں۔ لکھتے ہیں:

"در سنہ یک ہزار و یک صد و سی و سہ (۱۱۳۳ھ) شعشعۂ جمالِ باکمالش کاشانۂ ولادت را بر افروختہ۔ چنانچہ مورخے ہندو بیدار تخلص از شاگردانِ مقبولش کہ بیشتر اورا بخطابِ بیدار دل می نواخت، تاریخ ایلادِ خجستہ بنیاد برنگاشتہ۔

قطعہ:

از حضرتِ میر، عارفِ یزدانی — گہوارۂ آفاق چو شد نورانی
بیدار نویدِ سالِ تاریخش گفت — آمد بوجود نقشِ بندِ ثانی

..... آخر بتاریخ بست و چہارم صفر روز جمعہ سنہ یک ہزار و یک صد و نود و نہ (۱۱۹۹ھ) ایں جہانِ پر ہوان را بگذاشت ..... برادر میر سید محمد مرحوم متخلص بہ اثر در سالِ انتقالش فرمودہ۔

وصل باشد چوں وصال اولیا — "وصلِ خواجہ میر دردؔ" آمدندا

..... جسدِ مبارکش در شاہجہاں آباد بیرونِ ترکمان دروازہ بمقبرۂ آبائی او کہ فی الحال بباغچۂ میر دردؔ شہرت دارد، مدفون گردید۔" (ورق ۶۶ الف و ب)

مرزا مظہر جانجاناں کے حالات میں ان کی شہادت کا واقعہ کئی اردو تذکرہ نگاروں نے بیان کیا ہے لیکن ان کی ولادت، حسب و نسب، خاندانی ماحول اور دوسرے اہم واقعات کے بارے میں ان میں سے کسی تذکرے سے کوئی معلومات حاصل نہیں ہوتی۔ بے جگر پہلے شخص ہیں جنھوں نے شعرائے فارسی کے بعض تذکروں اور بالخصوص والہ داغستانی کے "ریاض الشعرا" کی طرف رجوع کر کے اس سلسلے کی کافی تفصیلات

قلم بند کی ہیں۔ ان کا بیان ہے :

"نسب او بہ بست و ہشت واسطہ بہ محمد بن حنفیہ ابن علی مرتضیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام می رسد۔ یکے از اولادش امیر کمال الدین کہ از خطۂ طائف بود، در ترکستان آمدہ بفرماں روائی بعضے ازاں ممالک گذرانیدہ و اولاد کثیر از وے دراں سرزمین پیدا آمد۔ از آنہا امیر مجنوں و امیر بابا ہمرکابِ ہمایوں بادشاہ از ایران بہندوستان رسیدند و بملازمتِ سلاطینِ گورگانیہ صرفِ اوقات نمودند و مرزا جان (والدِ مرزا مظہر) کہ در ششم مرتبہ از امیر بابا و در جۂ دوازدہم از امیر کمال الدین مستور (مسطور) واقع شدہ، از حضورِ عالمگیر بادشاہ تارکِ مناصبِ دنیا شدہ بہ اکبرآباد سکونت گرفت و بسببِ قرابت از خاندانِ گورگانیہ تیموریہ با عزت و اعتبارِ تمام منازلِ عمر را طے می کرد و ظہورِ با سعادتِ مظہر از بطونِ ولادت آخرِ شبِ جمعہ، یازدہم رمضان المبارک سنہ یک ہزار و یک صد و دہ (۱۱۱۰ھ) وقتے کہ پدرش از ملکِ دکن بہ اکبرآباد می آمد، در سرزمین مالوہ گردید۔ نشو و نمائے ظاہری در وطنِ آبائی خود آگرہ یافتہ، مگر چوں برائے تربیتِ باطنی در خدمتِ پیر نور محمد بداؤنی نقشبندی مجددی اقامتِ شاہجہاں آباد ورزیدہ، مشہور بہ دہلوی گشت و علی قلی خاں والہ داغستانی در تذکرۂ مولفۂ خود "ریاض الشعرا" می نگارد کہ اصلش از ساداتِ علوی است اما چوں اہلِ سنت اولادِ حضرت امیر المومنین علی علیہ الصلوٰۃ را سید نمی دانند، مرزا مذبور نیز خود را داخلِ سادات نمی شمرد۔ در عمر ہشتاد و پنج سال و چند ماہ فی سنہ یک ہزار و یک صد و نود و پنج (۱۱۹۵ھ) روزِ چہار شنبہ کہ تاریخ ہفتم محرم الحرام بود، در مکان بالاخانہ دوکانینِ بزازانِ واقع متصلِ مسجدِ جامعِ شاہجہان آباد بہ اختلافِ مذہب شخصے اورا بہ نیشِ افعیٔ قرابین مسموم گردانیدہ و روزِ شنبۂ ماہِ مذکور بتاریخ نہم و شب دہم بوقتِ مغرب از ہمانِ زخم کاری کارش بہ آخر رسید۔"

(ورق ۱۶۱ ب و ۱۶۲ الف)

"گلشنِ سخن" کے مولف مرزا کاظم مبتلاؔ کے ذکر میں اگرچہ بے جگر نے ان کے سوانح حیات زیادہ شرح وبسط کے ساتھ بیان نہیں کیے ہیں لیکن ان کے والد اور جدا مجد کے حالات اور خاندانِ مغلیہ سے توسل کے متعلق جو تفصیلات بہم پہنچائی ہیں، ان کی روشنی میں وہ پس منظر پوری طرح ہمارے سامنے آجاتا ہے جس میں مبتلاؔ نے تعلیم وتربیت اور نشوونما کے مراحل طے کیے اور جسے ان کی شخصیت کو بنانے اور سنوارنے میں موثر ترین عامل کی حیثیت حاصل ہے۔ یہ معلومات زیادہ تر "نشترِ عشق" سے ماخوذ ہیں۔ لکھتے ہیں:

"جدِّ ماجدش مرنا محمد کہ در مشہدِ مقدس مسکنت (کذا) داشت، ہمراہ نواب برہان الملک سعادت خاں نیشاپوری بہ عصر فرماں روائی محمد معزالدین بن شاہ عالم بہادر شاہ خلد منزل از خراسان بشاہجہان آباد آمدہ در حضور محمد فرخ سیر ملازم گردید وایام حیات را بخوبی گذرانیدہ در عہدِ محمد شاہی.....
ازیں جہانِ بے بقا درگذشت۔ پسرش محمد علی خاں بہادر والدِ مبتلاؔ کہ از سابق امورِ مرجوعۂ منشی گریٔ سرکارِ نواب برہان الملک مذکور را منصرم بود از قدردانیٔ نواب منصور خاں صفدر جنگ، دامادِ نوابِ ممدوح در ہنگامِ تفویضِ خدمتِ صوبۂ اودھ بنامِ وے از پیش گاہِ سلطنت بہ ثروت وعزتِ کثیر رسید وبہ بجا آوریٔ خدماتِ لائقہ واظہارِ فتوحاتِ فائقہ بزورِ بازوے خود در افسرانِ فوجِ نشانِ ناموری برافراخت و نواب مشارٌ الیہ بمشاہدہ حسنِ خدمتی ومستعدی وے از حضور احمد شاہ بن حضرت فردوس آرام گاہ بدہانیدنِ منصب پنج ہزاری وخطاب بہادری محمود اماثل واقران وبہ نیابتِ خود وصوبہ داریٔ الہ آباد مفتخر ہم چشمان گردانید۔ آخر چوں ارتحالِ آن وزیرِ قدرشناس او نمود، محمد علی خاں مستور (مسطور) خود را جانبِ بنگالہ کشیدہ در سرکارِ نواب میر جعفر علی خاں و نواب عالی جاہ قاسم علی خاں والیٔ ملکِ بنگالہ معزز ومحترم شد۔ تا (آں) کہ سیزدہم جمادی الاولیٰ سنہ یک ہزار ویک صد وہفتاد وشش (۱۱۷۶ھ)

بعالمِ بالا توجہ نمود و درگاہِ شاہ ارزاں ..... مدفن یافت ..... مبتلا .....
در لکھنؤ از بطن بطون بظہور رسیدہ موسوم بمرزا کاظم گردید و وزیرِ مغفور مخاطب
بمردان علی خاں فرمود۔ استفادۂ علمِ رسمی بخدمتِ مولوی وجیہ الدین نظام آبادی
نمودہ۔ در فقہ و نحو زیادہ تر امتیاز بہم رسانید و نیز نظم و نثرش بہ اصلاحِ آں جناب
رو بہ پختگی آورد۔ خطِ نستعلیق راہ بزیبائی و خوش ادائی می نگاشت و اکثر
مبتلائے سیرِ دواوینِ اساتذہ می ماند۔ تذکرۃ الشعرائے فارسی مسمّٰی بہ "نظمِ معانی"
کہ بالتزامِ تاریخِ اتمام نام دارد، از تالیفات اوست ..... بعد چندے
از لکھنؤ بہ عظیم آباد رفتہ بعدِ انقضائے ایامِ معہودہ ودیعتِ جاں را بجانِ آفریں
سپرد۔" (ورق ۱۶۶۔ الف و ب)

ذاتی مراسم اور خصوصی تعلقات کی بنا پر بے جگر نے جن شعرا کے تعارف میں کافی تفصیل سے کام لیا ہے، ان میں حسین قلی خاں عاشقی مولف "نشترِ عشق" بھی شامل ہیں۔ عاشقی سے ان کی ملاقات اپنے وطن سکندر آباد میں ہوئی تھی جب کہ وہ بحیثیت تحصیلدار وہاں پہنچے تھے۔ بے جگر نے ان کے بارے میں مندرجہ ذیل معلومات فراہم کی ہیں:

"ایلادِ سعادتِ بنیاد عاشقی در سنہ یک ہزار و یک صد و نود و چہار (۱۱۹۴ھ) در بلدۂ عظیم آباد پٹنہ رو نمودہ۔ چنانچہ در تاریخ میلاد خود می گوید:

جمعہ و ہفتم محرم را کردم از عالم نہفتہ طلوع
چون بجستم سنِ ولادتِ خویش گفت ہاتف کہ "اے خجستہ طلوع"

بسببِ انقضائے اوقاتِ عمرش بسیر و سفر ہمراہِ پدر عالی قدرِ خود از عمر چہاردہ سالگی سوائے علمِ فارسی و تواریخ دانی و صرف و پارۂ نحو قسمے کہ شاید از تحصیلِ عربی ہم بقولش بہرہ دانی باو نرسیدہ والحال از مدتِ ہفتدہ سال کف توسل بدامنِ اولیائے دولتِ سرکارِ کمپنی انگریز زدہ بہ تحصیلداری محالات می گذراند ....."

(ورق ۱۲۱ الف)

"طبقات سخن" کے مولف غلام محی الدین عشق و مبتلا میرٹھی کے متعلق مندرجۂ ذیل معلومات بہم پہنچانے کا فخر بھی شعرائے اردو کے تذکرہ نگاروں میں صرف بے جگر ہی کو حاصل ہے:

"فی سنہ یک ہزار و دو صد و چہل و یک (۱۲۴۱ھ) در شہر رمضان روزِ پنجشنبہ از ایں جہاں گذراں درگذشت و در درگاہِ حضرت گنجِ علم واقع بیرونِ شہر میرٹھ پہلوے والدِ بزرگوارِ خود جا یافت۔ لالہ ہرگوپال خستہ تاریخِ وفاتش بہ تخلص مبتلا نوشتہ۔ قطعہ:

خاک بر سر چسپاں نیفشانیم — شیخِ ما ہائے از جہاں رفتہ
خستہ بنوشتِ سالِ رحلتِ او — مبتلا ہائے از جہاں رفتہ"

(ورق ۱۲۴ ب)

ان اقتباسات کو پیش کرنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ بے جگر نے شروع سے آخر تک اپنے تذکرے کی ترتیب انھیں خطوط پر کی ہے۔ ان کے ہاں بھی اس روایتی اختصار اور غیر ضروری عبارت آرائی کی مثالیں خاصی تعداد میں موجود ہیں جو صنفِ تذکرہ کا ایک عام نقص خیال کی جاتی ہے۔ لیکن بحیثیت مجموعی انھوں نے جس طرح سوانح نگاری کے آداب و مطالبات سے باخبری کا عملی ثبوت پیش کیا ہے وہ قابلِ داد ہے۔ ان کا یہ کارنامہ کچھ اہم نہیں کہ انھوں نے ایک کثیر تعداد میں شاعروں کے سنینِ وفات اور بعض اوقات سنینِ ولادت بھی متعین کر کے تاریخی معلومات کا ایک ایسا ذخیرہ محفوظ کر دیا ہے جس کی مثال کسی دوسری جگہ نہیں ملتی۔ شعرائے اردو کے تذکروں میں ہمیں انھی کے تذکرے کے ذریعے پہلی بار اس بات کا علم ہوتا ہے کہ شاہ مبارک آبروؔ نے ۱۱۴۶ھ میں وفات پائی، قلندر بخش جرأتؔ کا انتقال ۱۲۲۴ھ میں ہوا، میر تقی میرؔ ۱۲۲۵ھ میں فوت ہوئے اور مصحفی کا سالِ رحلت ۱۲۴۰ھ ہے۔ سنین کے التزام کی اس کوشش میں فن تاریخ گوئی سے ان کے شغف خاص کو بڑا دخل رہا ہے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے اور دوسروں کے کہے ہوئے تاریخی قطعات بھی

کثرت سے نقل کیے ہیں۔ ان قطعات کی ایک مشترک اور قابلِ لحاظ خصوصیت یہ ہے کہ ان کے مادہ ہائے تاریخ میں شاعر کے نام یا تخلص کی شمولیت کا خاص طور پر خیال رکھا گیا ہے۔ اس سلسلے کی کچھ مثالیں گذشتہ سطور میں سامنے آچکی ہیں اور کچھ یہاں نقل کی جاتی ہیں:

۱۔ شاہ ولی اللہ اشتیاق:۔

"فی سنہ یک ہزار و یک صد و پنجاہ ۔۔۔۔۔ بہ اشتیاقِ سیر فردوس رختِ عزیمت بربست۔ راقمِ آثم در سالِ وفاتش بہ تعمیۂ یک عددِ دل چاک کہ مراد از الف باشد ایں قطعہ بہم رسانید۔

دہ چہ سازیم شاہ ولی اللہ — دست بر زندگیٔ خود افشاند
با دلِ چاک بے جگر تاریخ — گفت: صد حیف اشتیاق نماند۔" (ورق ۹)

۲۔ قلندر بخش جرأت:۔

"در سنہ یک ہزار و دو صد و بست و چہار ہجری رختۂ قضا تارِ زندگانیش را از ہم گسیخت، شاگردش لالہ گنگا پرشاد رنداں از "جرأت ہائے جرأت" سالِ انتقالش برآوردہ وایں بے جگرِ کم استعداد نیز قطعۂ نوشتہ کہ ہر چہار مصرعہ اش موضحِ سنہ وفات اوست:

نمود جرأتِ موزونِ ما سفر ہے ہے — چہ سال کنیم نہ زیں رنج گریہ شام و پگاہ
سنِ وفات وے ار سائلے بہ پرسد گو — چگویم آہ نماند آں سخنورِ آگاہ

و نیز قطعہ ایضاً بصنعتِ صوری و معنوی فکر کردہ:

وحیدِ عصر، سخن آفریں، قلندر بخش — گذشتہ از سرِ جاں ہائے زیرِ خاک بخفت
دل حزیں بدو آئیں سنِ وفاتِ او — "ہزار و دو صد بست و چہار ہجری" گفت

و لالہ ہرگوپال خستہ ازیں قطعہ تاریخِ ارتحالش برآوردہ:

خود از جہاں بگذشت و مرا بحلقۂ غم — نشاند جرأتِ رنگیں کلام واویلا
نوشتہ مصرعۂ تاریخ او دلِ خستہ — نماند جرأت رنگیں کلام واویلا"
(ورق ۳۵ ب ۵)

۳۔ مصحفی امروہوی :۔

"در لکھنؤ فی سنہ یک ہزار و دو صد و چہل ہجری (۱۲۴۰ھ) نقدِ جاں بمقتضایانِ اجل سپردہ، چنانچہ لالہ ہرگوپال خستہ تاریخِ وفاتش نظم کردہ :

کہ در رحلت غلام ہمدانی — اے دلِ تفتہ نالہ باید کرد
کس چو تاریخ پرسد از تو بگو — مصحفی رفتہ نالہ باید کرد"

(ورق ۱۵۹ ب)

۴۔ میر تقی میرؔ :۔

"بعد تقطیع مراحلِ نود و شش از سنینِ عمر در سال یک ہزار و دو صد و بست و پنج ہجری (۱۲۲۵ھ) بوصالِ جانانِ حقیقی پیوست ۔۔۔۔۔۔۔ لالہ ہرگوپال خستہ تاریخِ وفاتش نوشتہ :

بجہاں شور در افتاد چو ناگاہ بمرد — نکتہ داں، سحر بیاں، فخرِ زماں میر تقی
چہ بلا ہا کہ نیامد بسرِ اہلِ سخن — چوں سوے ملکِ عدم گشت رواں میر تقی
خستہ بنوشت سنِ او زحروفِ منقوط — چوں ننالیم برفتہ زجہاں میر تقی

(ورق ۱۷۳ الف)

۵۔ انعام اللہ خاں یقینؔ :۔

"لالہ لچھمی نرائن شفیقؔ، صاحبِ تذکرہ "گلِ رعنا" ۔۔۔۔۔ از زبانِ شاہ عبدالحکیم حاکم تخلص لاہوری نقل کردہ کہ یقینؔ را در شاہ جہان آباد (دہلی) سنہ تسع وستین و مأتہ والف (۱۱۶۹ھ) ۔۔۔۔۔۔ پدرش او را بعلتِ جریمۂ از دستِ خود کشت۔ ایں قطعۂ تاریخ فکر کردہ شفیقؔ است :

شاعرِ نازک سخن و خوش خیال — کرد سفر جانبِ ملکِ عدم
سال وفاتش خردِ نکتہ سنج — گفت، یقیں رفت بسوے ارم

واز طبعِ دریا بارِ خستہ چنیں گوہر آبدار تراویدہ:

بعینِ شباب آہ آں تیز فہم — بجاں آفریں جانِ خود را سپرد

جزایں پس چہ گویم سن رحلتش　　یقینِ سخن یاب ہے ہے بمرد

وفکرِ نارسائے ایں خاکسار ایں قطعہ بہم رسانیدہ:

آں خسروِ ملکِ سخن واں مقبلِ اہلِ زمن
چوں رفت زیں دارِ کہن تاریخ او گفتم چنیں
فخرِ وذکاو دانش وغور و کمال و امتیاز
شد بے سر و بے پا ہمہ اے آہ از فوت یقین

(ورق ۲۰۸ ب)

مختلف معروف و غیر معروف شعرا کی تواریخ رحلت کے علاوہ "تذکرۂ بے جگر" سے بعض ایسے واقعات بھی معلوم ہوتے ہیں جو تاریخی اعتبار سے غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں اور اس سے قبل کسی تذکرے میں بیان نہیں ہوئے ہیں۔ میر حسن اور ان کی مثنوی "سحر البیان" کے متعلق درج ذیل بیان اسی ضمن میں آتا ہے:

"نوبتے حسن بہ تقریبے کہ آئندہ مذکور می شود معاتبِ حضور شدہ از شہر آوارگی اختیار کرد و پس از چندے مثنوی سحر البیان ..... طرح دادہ بنظر نواب قدر دان گذرانید مگر جنابِ ایشاں بریں مصرعش ع "کہ اک دن دوشالے دئے سات سے" چنداں مسرور نشدند وہم مشہور است کہ اگرچہ مثنوی مذکور بمرتبۂ پسندِ خاطرِ نوجوانانِ روزگار افتادہ کہ سوداگرانِ دیار بقید تصاویر وجداولِ زرکار مرتب کراندہ بجوانب وامطار می برند لیکن اگر روزے چند علی التواتر بخوانند، در مجمع یارانِ متفق انتشار رو نماید و باہم دگر مفارقت افتد امادر نظرِ راقم السطور سببِ اشتہار نخاستِ مثنوی ہذا سوائے ایں نباشد کہ در مصروفیت ایں شوق روح افزائے عشاق عدم متوجگیٔ ایشان از طرفِ دیگر می تواند بود بنا ءً علیہ دانایانِ زمانہ آں را منحوس قرار دادہ تا کسے متوجہ بر خواندنش نگردد۔ مگر محروم ماندن مصنف او بقولِ بعضے از صلہ وانعام نمایاں باوصفِ ایں قدر خوردنِ خونِ جگر و کاوش جان گفتارِ عوام را بپایۂ صداقت

می رساند۔ حاصلِ کلام کہ عتابِ نواب وزیر را نسبتِ بجستن بریں طور بیاں کردہ آید ..... درایام کہ وے زاد بوم خود شاہجہاں آباد را خیرباد گفتہ ہمراہِ زائرانِ میندی (کذا: مہندی) کہ جمعے بود کثیر در لکھنؤ رسید، مثنوی بضخامت پنج چہار جزو مشتمل بر کوچ و مقام آن از دہام و حال پر اختلالِ خود چہ از حسرتِ واگذاشتِ وطن مالوفہ بزرگانِ نوشتہ وچوں مذمت لکھنؤ و تعریف فیض آباد ہم بجدے کہ احد راز اہلِ حرفہ در قدح و مدح نگذاشتہ، ضمیمہ آں بود، مزاج والائے ملازمانِ حضور ازیں حرکتِ ناشائستہ اش کہ ایں چنیں شہر مینو سواد را مذموم دانستہ کمال رنجید ....." (ورق ۵۶)

اسی طرح مرزا محمد رفیع سودا کے متعلق یہ روایت بھی بے جگر سے پہلے شعرائے اردو کے کسی تذکرہ نگار نے نقل نہیں کی ہے کہ

"سراج الدین علی خاں آرزو کہ در آغازِ حال تلاشِ فارسیش را اصلاح می داد، روزے باوے بایں گفتگو پیش آمدہ کہ ایرانیاں بزبانِ خاصِ خود کلامِ فارسی را بپایۂ اعلیٰ رسانیدہ وزبانِ ما وشما ہرچند کہ فارسی دانی را بمدارجِ ارتفاع فائز گردانند، مانند چراغ پیش آفتاب قدرنمی آرد بنابراں اگر ازیں تقلید درگذشتہ بزبان خود کہ عبارت از ریختہ گوئی باشد، مشقِ سخن نمائید، یقین کہ بفیضانِ طبیعت گوے سبقت از ہم چشمان ببرید چرا کہ ہنوز کسے در نامورانِ ایں فن جانیافتہ۔ چوں صلاح با صواب بود، ازاں روز بگفتنِ شعرِ ریختہ طبع درداد، چنانچہ در اندک مدت کوس استادی بر بامِ سخن نہادہ۔ گاہ گاہ در حدیقۂ فارسی ہم بگل چینیٔ اشعارِ رنگین دامنِ فکر را تختۂ گلزار می کرد۔" (ورق ۹۴)

حالات و واقعاتِ زندگی کے بیان میں بے جگر نے جس قدر کار آگاہی اور ذمہ داری کا ثبوت دیا ہے، اخلاق و عادات، مزاج و طبیعت، وضع قطع اور دوسرے اوصاف ذاتی و صفاتی کے متعلق اظہارِ خیال میں بھی وہ اتنے ہی محتاط رہے ہیں۔ وہ ہر اس شخص کے ذکر میں سیرت اور شخصیت کے موضوع پر لب کشائی سے

گریز کرتے ہیں جس سے نہ وہ ذاتی طور پر واقف ہیں اور نہ دوسرے قریبی اور باوثوق ذرائع سے انھیں اس کے بارے میں کوئی قابلِ اعتبار معلومات حاصل ہوئی ہے۔ لیکن جہاں ذاتی مشاہدات یا راوی کی ثقاہت ان کے ذوقِ جستجو کو مطمئن کر دیتی ہے، وہاں وہ خاموش بھی نہیں رہتے۔ درج ذیل اقتباسات ان کے اس دستورالعمل پر شاہد ہیں:

(الف) جوالا پرشاد آذر لکھنوی:۔

"راقم الحروف فی سنہ یک ہزار و دو صد و سی و شش ہجری (۱۲۳۶ھ) در میرٹھ از و ملاقاتی شدہ ..... سوائے وجاہتِ ظاہری کہ مقتضائے شباب است، بحسنِ معانی ہم موصوفیت داشت یعنی باہر کسے کہ دری خورد در اولِ ملاقات بے تکلف شدے و بہ اخلاقِ حسنہ پیش آمدے۔ غرض اوقاتِ عمر را بخوش مزاجی و ظریف الطبعی بسر می آرد۔" (ورق ۱۷ ب)

(ب) میر سوز:۔

"مصحفی کہ باوے ..... ملاقاتِ دوستانہ داشت در تذکرۂ خود او را کمال ستودہ کہ سوائے کمالِ شاعری و درویشی در تیراندازی و سواری اسپ و نازک بندی و نزاکت فہمیٔ شعر و آدابِ صحبتِ ملوک و ظریف الطبعی و خندہ روئی و ندامت پیشگی و تحصیلِ وجہ معاش و گفتنِ کلمۃ الخیر در حقِ دیگرے با ایں ہمہ استغنا مزاجی کہ شعارِ شعراست، نظیر خود ندارد۔" (ورق ۹۸ الف)

(ج) رادھا کشن شکر مرادآبادی:

"در ایامِ قیام بمیرٹھ فی سنہ یک ہزار و دو صد و سی و ہشت ہجری (۱۲۳۸ھ) ..... دیدمش کہ جوانیست انیق و عمدہ روزگار و انسانے خلیق و ستودہ شعار ....." (ورق ۱۱۱ الف)

(د) عاشقی عظیم آبادی:۔

"در ایامِ مامور بودنش بہ تحصیل داریٔ سکندرآباد ..... دیدمش کہ سوائے وجاہتِ ظاہر بحسنِ معنی ہم آراستہ یعنی باہر کسے بخلق و مدارا پیش

می آید وخصوص اہلِ سخن را بجانِ عزیز دارد۔" (ورق ۱۲۱ الف)

(۷) سید قاسم علی خاں قاسم لکھنوی :۔

"شخصے است کہ قاسم الحقیقی از روز ازل دولت دینی و دنیاوی بقسمتش دادہ وکسے است کہ منعمِ بے احسان تا ابد نعمتِ صوری و معنوی بر خوانِ زندگی اش نہادہ۔ ہم دریں عمر بست و پنج سالگی بقدر مقسوم از اقسام ہر علم کمالے بہم رسانیدہ کہ گویا علم برائے او یا بجا در رسیدہ واو را برائے علم آفریدہ۔ ازاں جملہ علم موسیقی کہ مقام شناسانِ ایں فن را با او مشابہ کردن از مقامِ عقل خارج و دور است و پختہ کارانِ زمن را باوے برابر شمردن مخبر از خام خیالیٔ اہل شعور وہم در ستار نوازی بقانونے دل نوازی بکار می برد کہ ہر ترانۂ شور انگیزش پردۂ گوشِ سامعان را بناخنِ رقت می درد۔ دیگر بمقتضائے عالی دماغی ہا کہ شعارِ ہنر وار یست، ہر یکے را دمسازِ ایں محفلِ عیش منزل نمی گرداند۔ لالہ مہر چند مہر ..... بتقاضائے دوستیٔ خود ترجمۂ احوالش ..... معرفتِ لالہ ہرگوپال خستہ فرستادہ کہ بعینہٖ در عبارت خود بر زبانِ قلمِ سوانح نگار رسیدہ۔" (ورق ۱۴۵ ب)

"راقم الحروف را نیز فی سنہ یک ہزار و دو صد و چہل ہجری (۱۲۴۰ھ) بمقام قصبہ مراد نگر ..... اتفاق ملاقات وہم نشینی ..... تا چند روز دست دادہ۔ در وجاہتِ ظاہر و باطن و خوش اخلاقی و رسائی طبع و ذکاوت فہم و شناسائی علم موسیقی وغیرہ او را یکتا یافتم بلکہ روبرویم دو سہ غزل بدیہہ گفتہ کہ یک قلم مرغوبِ طبائع شد۔" (حاشیہ ورق ۱۴۷ ب)

بے جگر کے یہاں شاعری سے متعلق تنقیدی مواد کی مقدار نسبتاً بہت کم ہے۔ ان کی تحریروں سے ان گنے چنے شاعروں کے کلام کی خصوصیات اور قدر و قیمت کے بارے میں تو کچھ باتیں ضرور معلوم ہو جاتی ہیں جن کی فن کارانہ عظمت و شہرت یا دواوین و کلیات کے مطالعے نے ان کے ذہن پر گہرے نقوش چھوڑے ہیں

لیکن عام شعرا کی متاعِ فکر کے حسن و قبح اور مرتبہ و معیار کی دریافت انھوں نے مطلقاً قارئین کی سخن شناسی اور ذوقِ نظر پر موقوف رکھی ہے یا پھر دوسرے تذکرہ نگاروں کی رائیں نقل کر کے براہِ راست ذمہ داری سے اپنا دامن بچا لیا ہے۔ تذکرہ نویسی کے ایک اہم تقاضے کی طرف مناسب توجہ کی یہ کمی انھیں اس منصب بلند سے نیچے لے آتی ہے، جو انھوں نے اپنی کامیاب سوانح نگاری کی بدولت حاصل کیا ہے۔ بہر حال بعض شاعروں کے کلام کے متعلق اپنی رائے یا تاثرات کے اظہار کے لیے انھوں نے جو اندازِ گفتگو اختیار کیا ہے اس کے چند نمونے درج ذیل ہیں :

(الف) مرزا محمد رفیع سوداؔ :-

"اگرچہ در اقسام سخنوری استاد مسلم الثبوت بود، در ایجادِ قصائدِ قدح و مدح اعجاز می نمود کہ اگر ملا عرفی شیرازی تا وقتِ او زندہ ماندے، خود را باز بوطن خود رساندے۔ غزل لمولفہ :

وصف سوداؔ نمودن آں داند — بر سرِ آبِ کوفرس راند
بود طبعش بشعرِ معنیٔ ابر — مثلِ نیساں کہ گوہر افشاند
در قصائد بجاست کز طرزش — روحِ عرفی بوام بستاند
در دہم نسبتش بہ خاقانی — ذرہ و آفتاب را ماند
الغرض در ستائشِ سوداؔ — بے جگر چوں زباں بجنباند
سر کند گر قصیدہ وصفش — فکرِ او جز گریز نتواند

خلاصۂ مدعا کہ ہنوز دریں دیارِ دل خواستہ مانند وے بانیٔ زباں دانیٔ ریختہ بسیار کم خاستہ دہر کہ دریں (راہ) قدم گذاشتہ، اول بخوشہ چینیٔ خرمنش زادِ راحلہ برداشتہ ..... برخے از شاعران بملک الشعرائیش مقر بودہ اند و جمعے بدریافتِ اغلاطِ صریح و توارد اوصاف در بعض اشعارش بہ تجہل و سرقہ منسوب می گردانند بل بر طرزِ کلام او بہ تشتتِ زبانِ خود متعرض می فسوند مگر پیش راقم السطور کہ کلیات ذخیمے اش (ضخیمش) را بچشم خود دیدہ، انصاف

مقتضی بر آنست کہ روانیٔ طبع معنی بارش چہ در مثنوی ہائے متعددہ وغزلیاتِ آبدار وچہ در دیگر اقسامِ شعر وقصائدِ سحر کار مدلل بہ بے نظیر لیست۔ الّا از محاورۂ شعرائے زمانِ حال البتہ مخالفتے دارد۔" (ورق ۹۳ الف و ۹۴ الف)

(ب) قائم چاند پوری :۔

"در پختگی طرز و شستگی کلام و چستی الفاظ و درستیٔ معنی و پیوستگیٔ مصراعِ غزل و (خوش) اسلوبیٔ رویۂ قصیدہ و مثنوی وغیرہما دوش بدوشِ استادِ خود (مرزا سودا) می رفت بل بقولِ مصحفی در اکثر مقام غلبہ می جست ..... و در تحریرِ مثنویاتِ عجیب و تنظیم حکایاتِ غریب فصاحت بسیار بکار بردہ ....."

(ورق ۱۴۱ ب و ۱۴۲ الف)

(ج) ظہور اللہ خاں نوا :۔

"صفائیٔ طبع آئینہ وارش بشیریں زبانی ہا طوطیانِ سخن را بکلام آوردہ و گلفشانیٔ سراپا بہارش برنگیں خیالی ہا بلبلانِ ایں چمن را رام کردہ۔ شعرے کہ می گفت، چوں نالۂ رقت افزائے نوائے نے بہ آتش افروزیٔ اضطراب عاشقانِ سوختہ دل را نعل در آتش می گردانید و غزلے کہ می خواند، مانندِ حسرتِ دیدارِ جاناں بہ استیلائے دردِ اشتیاق دل دادگانِ نیم بسمل را بر خاک و خوں می طپانید۔ الغرض کہ در ہمہ اقسامِ شاعری تلاشِ دل چسپ بخوبی و پختگی می فرمود مگر در تنظیمِ قصیدہ بسبب اندراجِ لغات عربی و فارسی کہ خلاف محاورۂ زباں دانانِ حال است، بقول مصحفی ..... شکستِ فاحشہ خوردہ۔ حالانکہ بسیار بتانت و درستگی می گوید۔" (ورق ۱۸۸ الف)

(د) ولی دکنی :۔

"از کارگاہِ طبعِ جوادش قامتِ زیبائے شاہدانِ فارسی بخلاعِ ہندی زیب پذیرفتہ و در بارگاہ فکرِ نقادش لعلِ گراں بہائے کان فارسی بر اطباقِ ہندی جا گرفتہ۔ در حقیقت کسے کہ (پیشتر از ہمہ) اسپ در میدانِ ہندی

دوانید، آں بود و فی الواقع شخصے کہ آبِ رفتہ باز در جوے ایں زبانِ ہندی رسانید، ہماں بودہ ..... رفتہ رفتہ شعرائے متاخرین بہ تبدلِ محاورات و تکلفِ استعارات و صفائی زبان و شستگیٔ بیان ایں کلام را بجائے رسانیدند کہ بہ نسبتِ فارسی صد درجہ مطبوعِ اہلِ روزگار است و ہزار مرتبہ مرغوبِ مردم ایں دیار.. ..... اگرچہ آن شاہِ ولایتِ معنی پروری در مضمون یابی و بلاغت گستری دادِ عالی تلاشی ہا می داد، مگر بسببِ اختلاف محاورۂ اسلاف فی الحال مطبوعِ سخن سنجانِ ایں زماں و مرغوبِ شاعرانِ ایں زبان نمی شود۔" (ورق ۲۰۱)

بے جگر کے ایک بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے دور کے اہل علم شاعری کو فنِ شرفا تصور کرتے تھے، اس لیے کسی ایسے شخص کو جو اپنی خاندانی نسبت یا پیشے کے لحاظ سے شرافت کے معیار پر پورا نہ اترتا ہو، نہ تو شعر و سخن کی محفلوں میں "فصحاے صحیح الحسب" کے پہلو بہ پہلو جگہ مل سکتی تھی اور نہ تذکرۂ شعرا ہی میں اس کی شمولیت کو مناسب خیال کیا جاتا تھا۔ بے جگر نے اگرچہ اپنے ہاں آگرے کے ایک بخشی نامی قوال کا ذکر کر کے بظاہر ادنیٰ اور اعلیٰ کی اس تفریق کو ختم کرنے کی کوشش کی ہے لیکن ان کی گفتگو کا معذرت خواہانہ انداز ان کے ذہن کے کسی گوشے میں اس تصور کی موجودگی اور اثر و نفوذ کی غمازی کر رہا ہے۔ لکھتے ہیں:

"اگرچہ ادخالِ ایں چنیں سفیہاں در محفلِ رنگینِ فصحاے صحیح الحسب محض بے ادبی است، اما ازیں جا کہ دربارگاہِ والاجاہِ سخن شاہ و گدا بیک جا می نشینند و ادنیٰ و اعلیٰ را بیک نظر می بینند، شمولِ ایں کسان نیز واجب افتادہ و علاوہ بران چوں مدعاے خود فقط از اجتماعِ موزون الطبعانِ فصیح البیان است، دریں بزمِ دل نشیں حسب و نسب را دخلے نیست۔ پس چہ ضرور کہ شرفا را بر نگارم و بر نامِ اجلاف قلم از دست گذارم۔" (ورق ۲۴ الف)

مفید اور دل چسپ معلومات کے گراں قدر سرمائے کے ساتھ ہی اس تذکرے میں ایسے بیانات اور روایتیں بھی خاصی تعداد میں موجود ہیں جو حقائق سے صریح

انحراف اور واقعات سے عدم مطابقت کی مثالیں پیش کرتی ہیں اور اردو ادب کی تاریخ، اس کے وسیع پس منظر اور دوسرے متعلقات پر نظر رکھنے والے کسی بھی شخص کے لیے قابلِ قبول نہیں ہو سکتیں۔ یہ روایات یاران خوش فکر کی قیاس آرائیوں پر یقین، مناسب غور و فکر کی کمی اور درایت کے تقاضوں سے بے اعتنائی کی غماز ہیں۔ سطور ذیل میں ان میں چند مقامات و مطالب کی نشاندہی کی جاتی ہے۔

(الف) شاہ عالم آفتاب کے متعلق لکھتے ہیں:

"تا چہل و سہ سال آفتابِ جمال با کمالش جہاں افروزِ سلطنت ماند...
..... ہر گاہ فی سنہ یک ہزار و یک صد و چہل و سہ شقیٔ بد انجام غلام قادر خاں روہیلہ نمک حرام آمادۂ بے ادبی با نسبتِ آں جناب شدہ، ذخائر خسرانِ حال و قال برائے خود انداخت..... شخصے تاریخ بے ادبیٔ آں کمبخت خسران مآب نسبت بجنابِ کیوان انتساب ازیں کلمۂ عربی برآوردہ" فَاعْتَبِرُوْا یَا اُولِی الْاَبْصَار" یعنی پس عبرت گزینید اے صاحبانِ بینش۔" (ورق ۶ ب)

شاہ عالم ۴ جمادی الاولیٰ ۱۱۷۳ھ (۲۴ دسمبر ۱۷۵۹ء) کو اپنے والد سلطان عزیز الدین عالمگیر ثانی کی جگہ تختِ سلطنت پر رونق افروز ہوئے۔ ذی قعدہ ۱۲۰۲ھ (اگست ۱۷۸۸ء) میں غلام قادر نے انھیں بینائی سے محروم کیا اور اڑتالیس سال چند ماہ کی حکمرانی کے بعد ۷ رمضان المبارک ۱۲۲۱ھ (۱۸ نومبر ۱۸۰۶ء) کو انھوں نے وفات پائی۔[1] ان شواہد کی بنیاد پر جو تاریخ کی کتابوں میں اپنی پوری تفصیلات کے ساتھ محفوظ ہیں، بے جگر کی بیان کردہ مدت حکم رانی (چہل و سہ سال) بصارت سے محرومی کے زمانے (۱۱۴۳ھ) اور متعلقہ مادہ تاریخ (فاعتبروا یا اولی الابصار) کا مبنی بر سہو اور بعید از حقیقت ہونا کسی مزید دلیل کا محتاج نہیں۔

---

[1] وقائع عالم شاہی ص ۵، تاریخ ہندوستان۔ جلد نہم ص ص ۳۱۱ و ۳۴۰ و نادرات شاہی۔ ..... دیباچہ مرتب ص ص ۱۴، ۲۹ و ۳۲

(ب) ولی اللہ اشتیاق کے ذکر میں رقم طراز ہیں:

"شاہ ولی اللہ محدث از نبائرِ مجدد الف ثانی ..... شاعرِ عصرِ محمد شاہی است ..... فاضلِ کامل و محدثِ بے نظیر ..... فخرش ہمیں بس کہ مثلِ مولوی شاہ عبدالعزیز صاحب ..... فرزندے دارد۔ چنانچہ نسخۂ مولفۂ او فصولِ تفسیرِ کلام اللہ رائج و مشتہر است ..... فی سنہ یک ہزار و یک صد و پنجاہ در مسکنِ خود کوٹلہ فیروز شاہ کہ یکے از محلاتِ دہلی است، بہ اشتیاقِ سیر فردوس رختِ عزیمت بر بست۔" (ورق ۹ الف)

ولی اللہ اشتیاق اور شاہ ولی اللہ محدث دو مختلف شخصیتیں ہیں، بے جگر نے ان دونوں کو ایک سمجھ کر ایک قسم کا خلط مبحث پیدا کر دیا ہے۔ اشتیاق کے مسکن اور سالِ وفات کے بارے میں ان کا بیان اپنی جگہ بالکل صحیح ہے لیکن یہ قول کہ وہ شاہ عبدالعزیز دہلوی کے والد اور اپنے زمانے کے مشہور محدث اور عالم تھے درست نہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے اشتیاق کی وفات کے تقریباً سترہ سال بعد ۱۱۶۷ھ (۱۷۵۴ء) میں رحلت فرمائی[1]

(ج) عبدالحئی تاباں کے حال میں لکھتے ہیں کہ

"شاہ حاتم دہلوی آں ..... را از شاگردانِ خود نوشتہ مگر درحقیقت از خدمتِ محمد علی حشمت ..... استفاضۂ تلمذ برداشتہ۔ چنانچہ می گوید۔ بیت

کرے تو کس طرح تاباں غلط الفاظ میں معنی
کہ تیرے پاس حشمت سا ترا استاد بیٹھا ہے" (ورق ۱۲۸ الف)

بے جگر کا یہ بیان بھی جزوی طور پر غلط ہے۔ معاصر تذکروں سے قطعِ نظر خود تاباں کے دیوان میں حاتم اور حشمت دونوں سے اکتسابِ فیض کی شہادتیں

---

[1] شاہ ولی اللہ دہلوی اور ان کی سیاسی تحریک ص ص ۳۰ و ۵۷ و اورنٹیل کالج میگزین لاہور شمارہ نومبر ۱۹۲۵ء ص ۴۲

موجود ہیں۔ چنانچہ جہاں منقولۂ بالا شعر میں انھوں نے حشمت کے فیضانِ صحبت کا اعتراف کیا ہے، وہیں مندرجہ ذیل اشعار میں وہ حاتم کے یمن تربیت کا بھی اقرار کرتے ہیں:

اور ہی رتبہ ہوا ہے تب سے اس کے شعر کا
جب سے حاتم نے توجہ کی ہے تاباں کی طرف[1]

ریختہ کیوں نہ میں حاتم کو دکھاؤں تاباں
اس سوا دوسرا کوئی ہند میں استاد نہیں

(د) شیخ غلام علی راسخ عظیم آبادی کے بارے میں لکھتے ہیں:

"فی سنہ یک ہزار و دو صد و چہل ازیں جہانِ فانی بعالم جاودانی شتافت" (ورق ۹۱ الف)

ڈاکٹر اختر اورنیوی نے راسخ کی تاریخ وفات ان کے ایک شاگرد یاس آروی کے حوالے سے ۲۰ جمادی الاولیٰ ۱۲۳۸ھ (۲ فروری ۱۸۲۲ء) تحریر کی ہے[2]۔ عبدالغفور نساخ کے مستخرجہ مادۂ تاریخ "راسخ شیوا زبان" سے بھی یہی سنہ برآمد ہوتا ہے[3]۔ اس لیے اس سلسلے میں بھی بے جگر کا بیان خلافِ واقعہ ہے۔

(ہ) مرزا محمد رفیع سودا کے حالات میں "قصر اللطائف" مولفہ سید بہادر علی ترمذی کے حوالے سے یہ واقعہ نقل کرتے ہیں:

"در ہنگامے کہ نواب آصف الدولہ مرحوم زیب فرمائے وسادۂ وزارت

---

[1] تاباں کے اس شعر کے ساتھ حاتم کا یہ شعر بھی ملاحظہ طلب ہے

ریختے کے فن میں ہیں شاگرد حاتم کے بہت
پر توجہ دل کی ہے ہر آن تاباں کی طرف

ایک اور غزل کے مقطعے میں اس خصوصی توجہ کے کامیاب نتائج پر اس طرح اظہارِ فخر کرتے ہیں

فیضِ صحبت کا تری حاتم عیاں ہے ہند میں
طفلِ مکتب تھا سو عالم پیچ تاباں ہو گیا

[2] بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا۔ ص ۳۰۱

[3] بحوالہ تاریخ لطیف مخطوطہ رضا لائبریری رام پور

گردیدند، چوں دراں ایام مزاجِ اوشاں از عہدِ صاحبزادگی بطرف ہزل ومزاح نہایت راغب ومصروف بود ودراں ضمن ہر کہ کلماتِ ہزل ومزاح باوشاں یا بدیگرے می نمود، کمال منبسط گردیدہ بہ انعام بیکرانش معزز فرمودند۔ لہٰذا نظر ہم بریں معنی مرزا محمد رفیع سودا آن قطعۂ تاریخِ جلوس شاں برمسند وزارت گفتہ بودند کہ مادۂ تاریخ ایں بود ..... (فحش) ..... ازاں جاکہ مثل مشہور است کہ سلاطین وامرا گاہے بسلامے برنجند وگاہے بدشنامے خلعت دہند، نواب ممدوح بہ اصغائے ایں تاریخ خیلے برہم گردیدہ حکم بہ بے عزتی مرزا موصوف فرمودند۔ چنانچہ معروف است کہ سودا بہمیں غیرت دروزے چند جہانِ فانی را پدرود کرد ....."

نواب آصف الدولہ ۱۱۸۸ھ/۱۷۷۵ء میں مسند وزارت پر متمکن ہوئے۔ سودا نے اس کے تقریباً سات برس بعد ۱۱۹۵ھ/۱۷۸۱ء میں وفات پائی۔ اس لیے ان پر آصف الدولہ کے عتاب اور اس کے نتیجے میں "چند روز" کے اندر ان کی موت کے متعلق یہ بیان بالکل بے بنیاد معلوم ہوتا ہے۔

حالات وواقعات کے ضمن میں امورِ مسلمہ سے اختلاف کے علاوہ تذکرۂ بے جگر کے مطالعے کے دوران تعارف کے اعادے اور اشعار کے غلط انتساب کی کچھ مثالیں بھی سامنے آتی ہیں۔ لیکن گذشتہ سطور میں ہم نے جس قسم کی واقعاتی غلطیوں سے بحث کی ہے ان کے مقابلے میں یہ کوتاہیاں بہت معمولی نوعیت کی ہیں اس لیے یہاں ان کی تفصیل نظر انداز کی جاتی ہے۔

اس تذکرے کا ایک اور عیب یا نقص جو بعض اوقات بری طرح کھٹکتا ہے، اس کے اسلوب نگارش کی ناہمواری ہے۔ اگرچہ بے جگر نے عام طور پر اظہارِ مطالب کے لیے سادہ وسلیس پیرایۂ بیان اختیار کیا ہے، تاہم کہیں کہیں رنگین نگاری ومرصع کاری کے شوق میں تشبیہات واستعارات اور صنائع لفظی ومعنوی کے سلسلے ملاتے ہوئے وہ اس جادۂ مستقیم سے بہت دور بھی نکل گئے ہیں اور محض عبارت آرائی کی

خاطر معمولی معمولی باتوں کو غیر ضروری طول دے کر پیش کیا ہے۔ الفاظ کے اس انبوہ میں قاری کے لیے گوہر مقصود کی تلاش کس قدر دشوار ہو جاتی ہے، اس کا اندازہ ذیل کی مثالوں سے ہو گا:

(الف) عبدالحئی تاباںؔ:

"پرتو افگنیِ فکر روشنش عرشِ سخن را بود آفتابے تاباں و ظل گستریِ خیالِ نور مسکنش آسمانِ ایں فن را ماہے درخشاں۔ نے نے، تابندگیِ آفتابِ آسمانی پیشِ درخشانیِ آفتابِ فکرش در روزِ روشن چوں ماہ است و درخشندگیِ ماہِ جہان تاب مقابلِ تابانیِ ماہِ خیالِ او مانندِ آفتاب در ابرِ سیاہ۔ ہر مصرعہ اش بسانِ ابروئے ہلالِ روشن خیالی را اشارہ فرما و ہر بیتش مثالِ خانۂ آفتاب از نورِ فصاحت متجلّی۔" (ورق ۲۸ الف)

(ب) قائمؔ چاندپوری:۔

"قیامِ دینِ سخن وابستہ بفکرِ مستقیم اوست و استحکامِ قوانینِ ایں فن پیوستہ بہ رائے قویم او۔ کاخِ رفیعِ بلند خیالی بہ استقامتِ ستونِ قلمِ نگارینش تا ابد قائم و بنائے منیعِ عالی مقالی بہ پشت دستیِ بیانِ تمینش مستحکم بدائم۔ سنگینیِ تلاشِ سنگینِ او بگفتارِ رنگیں از لعلِ بدخشانی ہم سنگ و رنگینیِ گفتارِ رنگین وے بتلاشِ سنگینِ باعقیق یمنی ہم رنگ۔" (ورق ۱۴۱ ب)

(ج) نظیرؔ اکبرآبادی:

"رسائیِ حافظۂ رسایش را اگر بہ حافظۂ رسائے رسائی برابر نکنم چہ کنم وجودتِ طبعِ جوادش را اگر بطبعِ جوادِ جودت مطابقت ندہم چہ دہم۔"

(ورق ۱۹۲ الف)

تلازمہ بندی اور عبارت آرائی کی یہ کیفیت اگرچہ بے جگر کی تحریروں میں عنصرِ غالب کی حیثیت نہیں رکھتی پھر بھی اسے ان کے تذکرے کے نقائص ہی میں شمار کیا جائے گا لیکن اس قسم کی تمام خامیوں کے باوجود تذکرہ نگاری کے بعض بنیادی

تقاضوں کی تکمیل میں انھوں نے جس قدر کامیابی حاصل کی ہے وہ ان کے امتیاز اور انفرادیت کی ضامن ہے۔ شعرائے اردو کے بہترین تذکروں کی کوئی فہرست اس تذکرے کا نام شامل کیے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔

طویل اور جامع تذکرے

یہ باب عیار الشعرا، عمدۂ منتخبہ، مجموعۂ نغز اور گلشنِ بے خار کے مطالعے پر مشتمل ہے۔ یہ چاروں تذکرے ۱۲۰۸ھ/۱۷۹۳ء اور ۱۲۵۰ھ/۱۸۳۵ء کے درمیانی عرصے میں مرتب ہوئے ہیں۔ ظاہری اعتبار سے جو خصوصیت ان تذکروں کو اس عہد کے دوسرے تذکروں سے ممتاز کرتی ہے وہ ان کی وسعت و جامعیت ہے۔ عام تذکرہ نگاروں کے برخلاف ان تذکروں کے مولفین نے زیادہ سے زیادہ شاعروں کے حالات معلوم کرنے اور ان کا منتخب کلام بہم پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ عیار الشعرا کے مولف نے اس کی ترتیب پر لگ بھگ چالیس سال صرف کیے ہیں اور کم و بیش ساڑھے آٹھ سو شاعروں کو روشناس کرایا ہے۔ عمدۂ منتخبہ میں نو سو چھیانوے (۹۹۶) شاعروں کا ذکر ہے۔ اس تذکرے میں بھی ابتدائی ترتیب کے بعد تقریباً تیس سال تک اضافے ہوتے رہے ہیں۔ مجموعۂ نغز جو نسبتاً کم وقت میں مکمل ہوا ہے، چھ سو چورانوے (۶۹۴) شاعروں کے حالات و کلام پر مشتمل ہے۔ اسی طرح گلشن بے خار میں شعرا کی شمولیت کلام کی دل کشی کے ساتھ مشروط ہونے کے باوجود چھ سو چھیاسٹھ شاعروں کا ذکر ملتا ہے۔ اس سے قبل ان تذکروں کے علاوہ کسی تذکرے میں شاعروں کی اتنی تعداد نظر نہیں آتی۔ تذکرہ نگاروں کے دائرۂ کار کی یہ وسعت نسبتاً زیادہ وسیع مطالعے کا تقاضا کرتی ہے، اسی لیے ہم نے ان تذکروں کو ایک علٰحدہ باب کے تحت جگہ دی ہے۔

عیارالشعرا

"عیارالشعرا" انیسویں صدی کے ممتاز ادیب و شاعر خوب چند ذکاؔ دہلوی (متوفی ۱۲۶۲ھ/۱۸۴۶ء) کی تصنیف ہے اور مشرقی علوم و ادبیات کے میدان میں غیر مسلم اربابِ قلم کے گرانمایہ کارناموں کے سلسلے کی ایک ناقابلِ فراموش یادگار کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ تذکرہ ہنوز غیر مطبوعہ ہے اور اب تک اس کے صرف دو قلمی نسخے دستیاب ہو سکے ہیں جو انجمن ترقی اردو (ہند)، نئی دہلی اور انڈیا آفس لندن کے کتب خانوں کی ملکیت ہیں۔ انجمن کے مخطوطے سے ورق ۸۷ کے بعد کے ۲۳ اوراق اور آخر کے کم از کم دو تین صفحات غائب ہیں[1]۔ انڈیا آفس کا نسخہ مکمل ہے لیکن اس کے اختتام پر سنہ کتابت وغیرہ درج نہیں۔ اس لیے دونوں میں سے کسی ایک کا بھی زمانۂ کتابت واضح طور پر متعین نہیں کیا جا سکتا البتہ بعض قرائن سے اندازہ ہوتا ہے کہ اول الذکر نسخہ ۱۲۱۸ھ/۱۸۰۳ء کے قریب اور دوسرا ۱۲۴۷ھ/۱۸۳۱ء کے بعد لکھا گیا ہے۔

گارساں دی تاسی کا بیان ہے کہ ذکاؔ نے یہ تذکرہ اپنے استاد میر نصیر الدین نصیرؔ عرف میر کلو (شاہ نصیرؔ دہلوی) کی فرمائش پر ترتیب دیا تھا[2]۔ ذاتی حالات کے سلسلے میں

---

[1] ترجمۂ دسم سری بھاگوت بزبانِ اردو مصنفہ خوب چند ذکاؔ کا ایک قلمی نسخہ (مملوکہ آغا جمیل کاشمیری) محررِ سطور کے پیشِ نظر ہے۔ ترقیمے کے مطابق یہ نسخہ خود ذکاؔ کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ چونکہ عیارالشعرا کے نسخۂ انجمن کا خط اس نسخے کے خط سے بعینہٖ مماثل ہے۔ اس بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ عیارالشعرا کا یہ نسخہ بھی ذکاؔ کے قلم کی تحریر ہے۔

[2] خطبات گارساں دی تاسی۔ خطبہ پنجم ص ۹۱

مولف کی مندرجہ ذیل تحریر اس قول کی تائید کرتی ہے :

"روزِ اوستادِ صاحب تدبیر، میر نصیر الدین نصیر مدظلہ کہ توجۂ اوستادانہ و نوازشِ بزرگانہ بر حال من زیادہ از حد دارند، از زبان فیض بیان ارشاد فرمودند کہ در زمرۂ شاگردانِ خود شمارا شاگردِ رشید خواندہ ام، آیا چہ خوش باشد کہ نسخۂ جان فزائے تذکرہ بسعیٔ شما مرتب گردد و زورِ قابلیت و مذاق شاعری ایشان (شاگردان نصیر) و ملکۂ سخن گوئی تمامی شاعرانِ ہند و شیراز و دیگر امصار و بلاد و قریات از ہنگامِ احداثِ زبان ریختہ بہ امتحان در آید و ہر گاہ خاطر از عوارض وصوارم دنیوی منتشر و مکدر گردد، بسیرِ ایں نسخۂ دل آویز شگفتگی پذیرد و بمطالعۂ ہر قسم اشعار فرحتِ تازہ و نشاطِ بے اندازہ پدید آید۔ ازاں جا کہ عنایتِ ایزدِ کارساز و اعانتِ اوستاد شاملِ حال بود بدرستیٔ ایں امر کہ فی الحقیقت کارِ ہر کدام نیست و بدونِ اعانتِ الٰہی انصرام نمی یابد، پرداختم۔" (نسخۂ لندن ص ۲۷۵)

لیکن یہ عجیب بات ہے کہ ابتدائی اوراق میں دیباچے کے تحت جو وجہِ تالیف بیان کی گئی ہے وہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ وہاں انھوں نے تذکرے کی ترتیب کو خود اپنی طبیعت کی ایک ہنگامی تحریک کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ لکھتے ہیں :

"شبے کہ شبِ قدر را بہ بیعا نگیش و روزِ نوروز را بروئے نمائیِ آن تواں داد، بخاطرِ بے حضور چناں پرتو افگند کہ سطرے چند بطورِ تذکرۂ شعرائے ہم عصر و سلف بقلم دادہ بیادگار گذارد کہ چاشنی خوارانِ مائدۂ سخن را کیفیتے و لذتے حاصل آید۔ در کمتر مدتے اشعار برجستہ و منتخبِ سخنورانِ دور و نزدیک آں قدر کہ بہم رسید، فراہم آوردہ بدستیاریٔ استعداد برشتۂ تحریر کشیدہ بہ عیار الشعرا موسوم گردانید۔" (نسخۂ لندن صفحہ ۳ و ۴ و نسخۂ انجمن ورق ۲ الف)

اصل صورتِ حال کچھ بھی رہی ہو لیکن بیانات کے اس اختلاف کی روشنی میں بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں مولف کے ذہن میں از خود ایک مختصر تذکرہ تالیف کرنے کا خیال پیدا ہوا جس کے لیے انھوں نے تھوڑی سی مدت میں ضروری مواد

فراہم کرلیا۔ اسی دوران میں شاہ نصیر نے انھیں ایک مفصل اور جامع تذکرہ ترتیب دینے کا مشورہ دیا جس پر عمل کرتے ہوئے وہ بارہ تیرہ سال کی کوشش و محنت کے بعد "عیار الشعرا" کو ایک مبسوط تذکرے کی حیثیت سے منظر عام پر لانے میں کامیاب ہو گئے۔ اس درمیانی مدت کا تعین مادۂ تاریخ ترتیب کے اس لفظی اختلاف کی بنا پر کیا گیا ہے جو مذکورہ نسخوں کے درمیان پایا جاتا ہے۔ نسخۂ لندن میں دیباچے کے اختتام پر رقم طراز ہیں:

"تاریخ تذکرہ کہ بدیہہ بخاطر گذشتہ، نیز درج نمودہ۔ باللہ التوفیق۔ ابیات

اے ذکا ہو چکا جس روز یہ نسخہ تیار | آگے ہاتف کے کیا پیر خرد نے مذکور
منصفی کر کے وو ہیں اس نے یہ تاریخ کہی | آفریں کہہ کہ کیا نام سبھوں کا مشہور"

(نسخۂ لندن ص ۴)

آخری مصرعے سے ۱۲۰۸ھ ہجری برآمد ہوتا ہے جسے تذکرے کی ابتدائی ترتیب و تشکیل سمجھنا چاہیے۔ نسخۂ انجمن میں یہی قطعہ بعض تبدیلیوں کے ساتھ اس طرح درج ہوا ہے:

"اے ذکا ہو چکا جس روز یہ نسخہ تیار | آگے ہاتف کے کیا پیر خرد نے مذکور
منصفی کر کے وو ہیں اونے یہ تاریخ کہی | آفریں کہہ کہ کیا اسم سبھوں کا مشہور"

(ورق ۲ ب)

یہاں مادۂ تاریخ میں لفظ "نام" کی جگہ "اسم" کے اندراج نے زمانۂ تالیف کو دس سال آگے بڑھا کر ۱۲۰۸ھ ہجری کا سلسلہ ۱۲۱۸ھ سے ملا دیا ہے[1]۔ لیکن "عیار الشعرا"

---

[1] نسخۂ انجمن میں نقل کردہ قطعے کے بالمقابل بائیں طرف سرخ روشنائی سے "۱۲۱۳ھ" لکھا ہوا ہے۔ یہ سنہ صرف اسی صورت میں نکل سکتا ہے کہ "سبھوں" کا املا ہائے مخلوط کے بغیر یعنی "سبوں" لکھا جائے، لیکن چوں کہ نسخۂ لندن میں بھی اس کا املا "سبھوں" ہی ہے اس لیے املا کا متذکرہ فرق قرین قیاس نہیں۔ ان حالات میں ۱۲۱۳ھ کا اندراج بظاہر سہوِ قلم کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔

کو نقشِ آخر کی حیثیت ۱۲۱۸ھ/۱۸۰۳ء میں بھی حاصل نہ ہو سکی اور ذکا اندازاً ۱۲۴۷ھ/۱۸۳۱ء کے کچھ بعد تک اس میں برابر اضافے اور تبدیلیاں کرتے رہے۔ زیر بحث مخطوطات کے سنینِ ترتیب سے قبل اور بعد کی اس طویل مدت کے تعین میں مولف کے جن بیانات سے مدد ملتی ہے ان کی تفصیل یہ ہے:

(الف) میر قمر الدین منت کے متعلق نسخۂ انجمن میں ورق ۲۰۳ کے حاشیے پر مندرجہ ذیل اطلاع فراہم کی گئی ہے:

"در سنہ یک ہزار و دو صد و ہشت ہجری ہمرکاب راجہ ٹکیٹ رائے بہادر بکلکتہ رسیدہ راہیِ شہرِ آخرت گردید۔"

متن کی بجائے حاشیے پر اس جملے کے اندراج سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ذکا منت کا حال ۱۲۰۸ھ/۹۴-۱۷۹۳ء سے قبل تحریر کر چکے تھے۔

(ب) احسن الدین خاں بیان کے بارے میں رقم طراز ہیں:

"حالا از چندے بہ حیدرآباد رفتہ در سرکارِ نواب مشیر الملک بہادر بر شاعری و ہم علاقہ دیگر عزّ امتیاز اندوختہ دارد۔"

(نسخۂ انجمن ورق ۳۰ب و نسخۂ لندن صفحہ ۸۳)

بیان کا انتقال ۱۲۱۳ھ/۹۹-۱۷۹۸ء میں ہوا ہے۔ معتبر روایات کے بموجب وہ اس سے کئی سال قبل دہلی کو خیرباد کہہ کر دکن کی طرف چلے گئے تھے۔ اس لیے جہاں یہ بات یقینی ہے کہ ذکا نے ان کا حال ۱۲۱۳ھ سے قبل لکھا ہے وہیں یہ امر بھی بعید از امکان نہیں کہ یہ ترجمہ ۱۲۰۸ھ سے بھی پہلے کی تحریر ہو۔

(ج) میر صاحب کے حال میں لکھتے ہیں:

"دو سرکارِ فیض آثارِ نواب وزیر الملک آصف الدولہ ... شرفِ اختصاص دارد۔" (نسخۂ انجمن ورق ۲۴۱)

نواب آصف الدولہ کا انتقال ۲۸ ربیع الاول ۱۲۱۲ھ/۲۱ ستمبر ۱۷۹۷ء کو ہوا ہے لہٰذا یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ میر صاحب کی ان کے دربار سے وابستگی کے متعلق مندرجہ بالا

تحریر اس تاریخ سے قبل کے زمانے سے تعلق رکھتی ہے۔

(د) میر سوز کی نسبت جن کے حالات شروع سے آخر تک صیغۂ حال میں لکھے گئے ہیں، رقم طراز ہیں کہ

از چندے بہ لکھنؤ اقامت ورزیدہ ..... بہ نظر عمدہ ہائے قدر شناس خیلے معزز و محترم است۔ آں جا بحرمت می گذراند۔"

(نسخۂ انجمن ورق ۱۲۵ ب و نسخۂ لندن صفحہ ۳۹۲)

میر سوز نے ۱۲۱۳ھ/۹۹-۱۷۹۸ء میں وفات پائی ہے اور ان کی شہرت و مقبولیت کے پیشِ نظر یہ بعید از قیاس ہے کہ ان کے انتقال کی اطلاع بروقت مولف تک نہ پہنچ پائی ہو، اس لیے یقینی طور پر ان کے حالات ۱۲۱۳ھ سے پہلے ہی لکھے گئے ہوں گے۔

(ہ) "مجمع الانتخاب" کے مولف شاہ کمال کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

"در لکھنؤ قیام دارد و بزہد و ورع اوقاتِ شریفِ خود بسر می برد۔"

(نسخۂ انجمن ورق ۲۰۴ ب)

کمال اپنے بیان کے مطابق ۱۲۱۵ھ/۱۸۰۰ء میں لکھنؤ سے ترکِ سکونت کر کے حیدرآباد جا چکے تھے[1] لہٰذا قیامِ لکھنؤ کے بارے میں یہ صراحت یقیناً اس سنہ سے پہلے عمل میں آئی ہوگی۔

(و) نواب اعظم الدولہ سرور کے بارے میں لکھتے ہیں:

"از چندے اشتیاقِ فراہمیِ اشعارِ سخنوران و تالیفِ تذکرہ بہ گوشۂ خاطرِ دریا مقاطرش جاگرفتہ، اغلب کہ بظہور آید[2]۔" (نسخۂ انجمن ورق ۱۲۷ ب)

نظام الدین ممنون کے مستخرجہ مادۂ تاریخ "یہ ہے معیارِ نقدِ سخن" کی رو سے سرور کے تذکرے "عمدۂ منتخبہ" کا نقشِ اول ۱۲۱۵ھ/۱۸۰۰ء میں تیار ہو چکا تھا اور

---

[1] مجمع الانتخاب مخطوطہ کتب خانہ انجمن ترقی اردو (ہند)، نئی دہلی، ورق ۴ ب

[2] یہ جملہ انڈیا آفس لائبریری کے نسخے میں موجود نہیں۔

چوں کہ ذکا اور سرور دونوں ہی دہلی میں مقیم اور ایک دوسرے سے متعارف تھے،[۱] اس لیے بظاہر اس تذکرے کی تکمیل سے مولف کی بے خبری کا کوئی امکان نہیں۔ ایسی صورت میں سرور کے حالات کو ۱۲۱۵ھ/۱۸۰۰ء سے پہلے کی تحریر ہونا چاہیے۔

(ذ) میر جواد علی خاں ہادی کے ذکر میں ان سے اپنے خصوصی مراسم کا حوالہ دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

"از وفورِ بندہ پروری اکثر بہ غریب خانۂ ایں بندہ ذکا قدم رنجہ می فرماید۔"
(نسخہ انجمن ورق ۲۹۵)

سرور اور شیفتہ کے بیانات کے مطابق ہادی کی وفات ۱۲۱۵ھ میں ہوئی ہے[۲] اور ذکا باہمی تعلقات کی بنا پر یقیناً اس حادثے کے زمانۂ وقوع سے بے خبر نہ رہے ہوں گے، لہٰذا یہ تسلیم کر لینے میں کوئی عذر مانع نہیں کہ ان کے حالات ۱۲۱۵ھ/۱۸۰۰ء سے پہلے لکھے جا چکے تھے۔

(ح) میر شیر علی افسوس کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ وہ اس وقت لکھنؤ میں قیام پذیر ہیں۔[۳] یہ بیان بھی ۱۲۱۵ھ/۱۸۰۰ء سے قبل کے زمانے سے تعلق رکھتا ہے کیونکہ افسوس اپنی تحریر کے مطابق ۲۷ جمادی الاولیٰ ۱۲۱۵ھ/۱۷ اکتوبر ۱۸۰۰ء کو کرنل اسکاٹ کے حکم کے بموجب فورٹ ولیم کالج کے لیے منتخب ہو گئے تھے اور اس کے کچھ ہی دن بعد وہ لکھنؤ کو خیرباد کہہ کر کلکتہ پہنچ چکے تھے۔[۴]

(ط) مظہر علی خاں ولا کے متعلق یہ اطلاع فراہم کی گئی ہے:

---

[۱] ذکا کی درخواست پر سرور نے تذکرے میں شامل کرنے کی غرض سے اپنے اشعار اپنے ہاتھ سے لکھ کر دیے تھے۔ (نسخہ لندن ص ۴۰۱)

[۲] عمدہ منتخبہ ص ۸۱۹ و گلشن بے خار طبع اول ص ۳۳۶

[۳] "در لکھنؤ قیام دارد۔" (نسخہ لندن ص ۲۲)

[۴] دیباچہ باغ اردو بحوالہ گل کرسٹ اور اس کا عہد ص ۲۲۰

"دریں ولا از لکھنؤ بکلکتہ رفتہ نوکر شدہ آں جا بعزت و وقار می گذراند"

(نسخۂ انجمن ورق ۲۸۰ ب)

ولا جمادی الثانیہ ۱۲۱۵ھ/نومبر ۱۸۰۰ء میں بمقام لکھنؤ فورٹ ولیم کالج کے لیے منتخب ہوئے تھے اور شعبان ۱۲۱۵ھ (جنوری ۱۸۰۱ء) تک کلکتے پہنچ کر اپنی ذمہ داریاں سنبھال چکے تھے[۱] منقولہ بالا جملے کے انداز بیان سے ایسا مترشح ہوتا ہے کہ اس کی تحریر کے وقت انھیں لکھنؤ چھوڑے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔ اس لیے یہ قیاس غلط نہ ہوگا کہ ان کا حال ۱۲۱۵ھ کے اواخر یا زیادہ سے زیادہ ۱۲۱۶ھ کے اوائل (۱۸۰۱ء) میں داخل تذکرہ کیا گیا ہے۔

(ی) شیخ ابراہیم ذوق کے بارے میں لکھا ہے کہ اکثر مشاعروں میں شریک ہوتے رہتے ہیں اور میر نصیر سے قواعد شعریہ کے اکتساب میں مصروف ہیں[۲]۔ ذوق کی ولادت ایک قول کے مطابق ۱۲۰۳ھ/۱۷۸۹ء میں[۳] اور دوسری روایت کے بموجب ۱۱ ذی الحجہ ۱۲۰۴ھ (۲۲ اگست ۱۷۹۰ء) کو ہوئی تھی[۴] اور یہ بیان بظاہر ان کی مشق کے ابتدائی زمانے سے متعلق معلوم ہوتا ہے جسے عمر کی چودھویں یا پندرہویں منزل سے پیچھے لے جانا کسی طرح مناسب نہ ہوگا۔ اس اعتبار سے اسے ۱۲۱۸ھ کے قریب کی تحریر تسلیم کر لینے میں کوئی عذر مانع نہیں۔

مندرجہ بالا شہادتیں ۱۲۰۸ھ/۱۷۹۴ء سے ۱۲۱۸ھ/۱۸۰۳ء تک تسلسلِ تحریر کا پتا دیتی ہیں۔ اس سال کے بعد جس قدر اضافے ہوئے ہیں ان کا اندازہ دونوں

---

[۱] گلکرسٹ اور اس کا عہد ص ۱۶۰

[۲] "اکثر در مجالس مراختہ وارد می گردد و فوائدِ قواعدِ شعریہ از خدمتِ سراپا برکت محمد نصیر الدین نصیر می رباید" (نسخۂ انجمن ورق ۸۶ ب و نسخہ لندن ص ۲۷۰)

[۳] ذوق۔ سوانح اور انتقاد، ص ۲۵

[۴] دیباچۂ دیوانِ ذوق مرتبہ شمس العلما آزاد ص ۲

نسخوں کے باہمی مقابلے کے ذریعے بہ آسانی کیا جا سکتا ہے کیونکہ ان میں سے اکثر نسخہ انجمن کے متن میں جگہ نہیں پا سکے ہیں۔ اس کے علاوہ بعد کے زمانے کی ان تحریروں میں بعض جگہ سنین کے حوالے بھی موجود ہیں مثلاً:

(الف) ہدایت اللہ خاں ہدایت:۔

"در سنہ یک ہزار و دو صد و نوزدہ ہجریہ مقدسہ رختِ حیات بعالمِ جاودانی بربست[1]" (نسخۂ انجمن ورق ۳۸۳ ب و نسخہ لندن ص ۸۷۷)

(ب) میر نثار علی تمکین:۔

"در ۱۲۳۸ھ ہجری ہم رکابِ فیض انتسابِ شوکت جنگ بہادر از فرخ آباد بدہلی تشریف آورد" (نسخہ لندن ص ۱۱۷)

(ج) رسول بخش حشر بدایونی:۔

"در سنہ یک ہزار و دو صد و چہل ہجری از سفر دارالامارت کلکتہ بدہلی آمدہ در مشاعرہ وارد شد و غزلِ طرحی نیز خواند۔ عاصی ذکا با او ہم مجلس و ملاقی گشتہ" (نسخۂ لندن ص ۱۹۳)

(د) اپنے استاد بھائی مقبول کے متعلق لکھتے ہیں کہ

"در ۱۲۴۷ھ ہجری از ضلع باندہ در دہلی وارد شدہ بود" (نسخۂ لندن ص ۲۳۴)

ان تمام مباحث کا ماحصل یہ ہے کہ "عیار الشعرا" ۱۲۰۸ھ/۹۴-۱۷۹۳ء یا اس سے کچھ دن پہلے سے ۱۲۴۷ھ/۳۲-۱۸۳۱ء کے کچھ بعد تک مولف کی خصوصی توجہات کا مرکز بنا رہا[2] اور وہ چالیس سال کے اس طویل عرصے میں برابر اسے زیادہ سے زیادہ جامع

---

[1] نسخۂ انجمن میں یہ جملہ بعد میں اضافہ کیا گیا ہے۔ اس سے بھی ہمارے اس قیاس کی تائید ہوتی ہے کہ اس نسخے کی کتابت ۱۲۱۹ھ سے قبل مکمل ہو چکی تھی۔

[2] اس فیصلے کی روشنی میں نگار پاکستان "تذکروں کا تذکرہ نمبر" کے مرتب جناب فرمان فتح پوری کا یہ دعویٰ کہ عیار الشعرا کا سالِ تکمیل و تاسی کے بیان (۱۲۰۸ھ تا ۱۲۴۷ھ) کے برخلاف (حاشیہ جاری)

اور مفید بنانے کی کوشش میں مصروف رہے۔ تذکرے کے اختتام پر اپنے اس غیر معمولی اور طویل المیعاد انہماک کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"بعدِ تالیفِ تاریخِ نسخۂ ہذا کہ بر دیباچہ مرقوم یافت اشعارِ ہر کدام کہ بہم رسید بقدرِ خاطر پسندِ خود بقلم در دادم۔ پیداست کہ انتخابِ اشعار و بہم رسانیدنِ دوانین شاعرانِ سلف و حال از صغار تا کبار و جوانب و اطراف و استدراک احوال ہر کدام را چہ قدر عرصہ و مشقت و تلاش می باید و چہ قدر خونِ جگر خوردہ می شود۔ سالے چند بہ تصنیف ایں نسخہ کہ جگر کاوی کہ نمودم و از امورِ دینی و دنیوی باز ماندہ محنتے کہ بکار بردہ ام از فرطِ وضوح محتاج بگذارش نہ۔ در زمانۂ ناقدر دان کہ احدے شنوائے و داد رسِ کلام نیست، عمرے بفراہمی دگر و آوریٔ اشعار بسر بردم و رنج لاطائل و محنتِ لاحاصل برداشتم۔ ازیں انفعال کلی دامن گیر است کہ اگر تا ایں عرصۂ سالہا سال ریاضت خدائے کریم می کردم، ہمانا از پایہ می گذشتم۔ چونکہ خود کردہ را درمان نیست، بہ لحاظِ ایں معنی کہ ع آغاز کردۂ بر سانش بانتہا، مدد از جنابِ ناصرِ مطلق خواستہ ہمت بہ اختتام گذاشتم۔"

(نسخہ لندن ص ۹۴۴ و ۹۴۵)

اشپرنگر نے "فہرست کتب خانہ شاہانِ اودھ" میں اس تذکرے کو تقریباً ڈیڑھ ہزار شاعروں کے حالات پر مشتمل قرار دیا ہے[1]۔ اس ضمن میں گارسین دی تاسی اور

(حاشیہ گذشتہ سے پیوستہ) ۱۲۱۳ھ ہے، غلط قرار پاتا ہے۔ فرمان صاحب نے یہ رائے نسخۂ انجمن میں شامل قطعۂ تاریخ کے آخری مصرعے کے ساتھ مرقوم سنہ (۱۲۱۳ھ) کی روشنی میں قائم کی ہے جس کے بارے میں پہلے ہی بتایا جا چکا ہے کہ یہ سہوِ کتابت پر مبنی ہے۔ جناب عرشی رام پوری کا یہ ارشاد بھی کہ "یہ تذکرہ ۱۲۱۳ھ (۱۷۹۸ء) میں شروع ہوا اور تقریباً ۱۲۴۸ھ (۱۸۳۲ء) تک اس میں اضافے ہوتے رہے، (دیوانِ غالب۔ نسخہ عرشی ص ۳۹۲) اسی ضمن میں آتا ہے۔

[1] بحوالہ "یادگارِ شعرا" ص ۷ [2] خطبات گارسین دی تاسی (خطبۂ پنجم) ص ۹۱

ڈاکٹر سید عبداللہ[1] کے تائیدی بیانات اسی قول کی صدائے بازگشت ہیں[2]۔ جہاں تک اصل حقیقت کا تعلق ہے، موجودہ مخطوطات کے مطابق یہ تعداد کسی طرح ساڑھے آٹھ سو سے متجاوز نہیں۔ ذکا نے ان شاعروں کے متعلق ضروری مواد کی فراہمی میں جن ذرائع و وسائل سے مدد لی ہے، ان میں مجموعہ ہائے کلام کے علاوہ پیش رو مصنفین کے تذکرے بھی شامل ہیں۔ چنانچہ پیام اور گرامی کے حالات میں واضح طور پر والہ داغستانی اور خان آرزو کے تذکروں (ریاض الشعرا و مجمع النفائس) کے حوالے ملتے ہیں۔ مبتلا میر تھی کا "طبقات سخن" بھی ان کی نظر سے گزر چکا ہے[3] اور میر کے "نسخۂ تذکرہ مختصر" (نکات الشعرا) قدرت (شوق) کے "تذکرہ شاعرانِ ریختہ گو" (طبقات الشعرا)، مصحفی کے "تذکرۂ فارسی" (عقد ثریا) اور "تذکرۂ ہندی" سے بھی انھوں نے اپنی واقفیت کی طرف اشارے کیے ہیں۔ اس لیے ان تذکروں سے استفادے کے امکانات بھی نظر انداز نہیں کیے جا سکتے۔ اس کے علاوہ بعض شاعروں کا کلام تذکرے میں درج کرنے کے لیے بطورِ خاص انھی سے حاصل کیا گیا تھا جیسا کہ درج ذیل بیانات سے ظاہر ہوتا ہے:

(الف) میر شجاعت علی تسلی:۔

"بعضے از اشعار مولفہ اش کہ بخطِ خود نوشتہ بہ بندہ ذکا لطف فرمودہ، در تذکرۂ ہذا ثبت ساختہ۔" (نسخہ لندن۔ ص ۱۳۳)

(ب) رسول بخش حشر بدایونی:۔

"بجہتِ ادخالِ تذکرہ استدعائے شعر نمودہ چنانچہ بعطائے غزلِ طرحیٔ مشاعرہ بنواخت۔" (نسخہ لندن۔ ص ۱۹۳)

---

[1] شعرائے اردو کے تذکرے صفحات ۴ و ۴۸

[2] لالہ سری رام نے یہ تعداد چار پانچ ہزار کے قریب بتائی ہے (خمخانۂ جاوید جلد سوم ص ۲۴۶) جو بالیقین نادیدہ اندازے یا کسی شنیدہ روایت پر مبنی ہے۔

[3] "تذکرۂ ہندی ..... از و ترتیب یافتہ و بنظرِ احقر ہم گذشتہ۔" (نسخۂ لندن ص ۷۹۸)

(ج) اعظم الدولہ سرورؔ:۔

"اشعارِ چند بحسبِ استدعائے ایں کمترین بخطِ خود نوشتہ داد۔"

(نسخۂ لندن ص ۴۰۱)

(د) مرزا فدا حسین خاں فداؔ:۔

"بتکلیفِ ایں خیر طلب چند غزلیات و اشعار منتخب از دیوان مروف بخطِ خود نوشتہ لطف فرمود۔" (نسخۂ لندن۔ ص ۵۷۴)

غیر معروف اور گمنام شعرا کے کلام کی تحصیل و جستجو میں ذکاؔ نے جس محنت اور تن دہی سے کام لیا ہے اس کا اندازہ ایک قدیم شاعر لطفیؔ کے بارے میں ان کے اس بیان سے کیا جا سکتا ہے۔

"بکمالِ تلاش کہ مصنف تذکرہ را لازم و واجب است، ایں اشعار بکمترین بہم رسید۔" (نسخۂ لندن۔ ص ۶۴۹)

یہ تلاش اور جستجو اس لیے اور بھی زیادہ ملحوظ رکھی گئی ہے کہ ان کے نزدیک معیار کی بلندی و پستی سے قطعِ نظر ہر معلوم شاعر کا کلام لازمی طور پر تذکرے میں شامل ہونا چاہیے تاکہ آئندہ نسلیں اس کے وجود سے بے خبر اور اس کے نتائجِ فکر سے ناواقف نہ رہیں چنانچہ درجۂ سوئم کے ایک شاعر عابدؔ کے حال میں رقم طراز ہیں کہ:

"چوں در تذکرہ اشعارِ رطب و یابس ہر کدام نوشتن لازم آمدہ، لہٰذا بعضے از غزلیاتش کہ بتلاش کاملہ بہم رسید، شعرے بقیدِ قلم می دہد۔"

(نسخۂ انجمن۔ ورق ۶۶ الف)

شہوتؔ ایک فحش گو شاعر ہے جس کا کلام تمام تر رکاکت و ابتذال سے مملو ہونے کی بنا پر اس قابل نہیں کہ تذکرے میں درج کیا جائے اس کے باوجود ذکاؔ اس کے ساتھ کسی امتیازی سلوک کو اصول تذکرہ نویسی کے منافی تصور کرتے ہوئے اس کا ذکر کرتے ہیں لیکن اپنی اس جسارت پر ان الفاظ میں معذرت خواہ بھی ہیں:

"اگرچہ دریں کتاب ذکر و سخنِ آن نوشتن نامناسبِ محض است الاچوں

ازیں خیال گذشتن شعارِ تذکرہ نویسی نیست و رطب و یابس ہر کدام بنوشتن
می آید، لہٰذا درج نمودہ شد۔ تقصیر معاف۔" (نسخۂ انجمن۔ ورق ۱۴۴ الف)

جعفر زٹلی اور امام علی صاحب قران وغیرہ کو بھی اسی اصول کے تحت تذکرے میں جگہ دی گئی ہے ورنہ اس قسم کے شعرا اور ان کے کلام کے متعلق مولف کا ذاتی نقطۂ نظر منقولۂ بالا بیان سے بخوبی ظاہر ہے۔ اسی طرح ہجویہ شاعری کو بھی وہ بنظرِ استحسان نہیں دیکھتے اور تذکرے کے صفحات پر اس کے نمونے پیش کرنا آئینِ تہذیب و متانت کے خلاف سمجھتے ہیں۔ اسی لیے پیر خاں کمترین کے حال میں انھیں اس وضاحت کی ضرورت محسوس ہوئی ہے کہ

"ایں عاصی دریں نسخہ ہجو کسے ننوشتہ الا بمقتضائے ضرورت ولاچارگی۔
از شاعر ہذا ایں قسم اشعار بر روے کار آمدہ (لہٰذا) دریں امر مبادرت نمود۔"
(نسخہ انجمن ورق ۲۰۵ ب)

تذکرے کی ترتیب کے سلسلے میں اپنے مقرر کردہ معیار اور مخصوص اصول و ضوابط کے ضمن میں ذکا نے مختصر نگاری اور غیر ضروری تفصیل و اطناب سے گریز کو بھی کافی اہمیت دی ہے۔ حالات و واقعات کی بحث ہو یا کلام کے انتخاب و اندراج کا معاملہ، وہ ہر جگہ طول نویسی کو آدابِ تذکرہ نگاری کے منافی اور معیوب خیال کرتے ہیں[1]۔ ان کے نزدیک تذکرہ وہ صنفِ ادب ہے جس کی وساطت سے اہلِ ذوق زیادہ سے زیادہ شاعروں سے ابتدائی تعارف حاصل کر سکیں اور منتخب کلام کی روشنی میں ان کے معیارِ فکر اور ادبی مقام سے واقف ہو جائیں۔ چنانچہ غالب علی خاں سیّد کے حال میں لکھتے ہیں:

"طول نویسی معیوب دانستہ بر سمِ تذکرہ اشعارے چند منتخب از تالیفِ
آن صاحبِ طبع عالی وقار بزبانِ خامۂ نیاز فرسودہ۔" (نسخۂ انجمن ورق ۱۲۴ ب)

---

[1] عیار الشعرا میں اس کلیے سے استثنا کی مثالیں بھی موجود ہیں لیکن ان کی تعداد قابلِ لحاظ نہیں۔

مشہور ریختہ گو شاعر سعدی کے کلام سے متعلق درج ذیل بیان میں بھی اسی خیال کا اعادہ کیا گیا ہے کہ

"بحسبِ رواج تذکرہ بمختصر نویسی پرداختہ ہمیں دو شعر تبرکاً بروے قلم آوردہ۔" (نسخۂ انجمن۔ ورق ۱۳۳ ب)

میر صاحب کا منتخب کلام سپردِ قلم کرنے سے قبل ایک بار پھر اپنے اس دستور العمل کی وضاحت کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"از تصانیفِ پاکیزہ تلاشِ او قریب یک ہزار بیتِ انتخابی قابلِ نوشتنِ تذکرہ برآمدہ بود۔ ازاں جاکہ مختصر نویسی شعار تذکرہ سازی است لہذا عمداً بطوالتِ کلام نپرداخت و برہمیں قدر اختصار نمودہ، ایں گوہرہائے اشعارِ آبدار ..... برشتۂ تحریر کشید۔" (نسخۂ انجمن۔ ورق ۱۴۱ ب)

طریقِ کار سے متعلق ان بیانات کے بعد ہدایت اللہ خاں ہدایت کے حال میں ذکا نے اپنا یہ موقف بالکل واضح طور پر بیان کر دیا ہے کہ

"ایں اضعف العباد بمختصر نویسی شعار دارد۔" (نسخۂ انجمن ورق ۲۸۳ ب)

ہمہ گیری اور مختصر نگاری کے اس امتزاج کی بدولت اگر ایک طرف ذکا کے ہاں رنگارنگی اور جامعیت کی شان پیدا ہو گئی ہے تو دوسری طرف وہ تذکرے کے دامن کو اس تشنگی سے نہیں بچا سکے ہیں جسے بجا طور پر شعرا کے حالاتِ زندگی کے بیان میں اجمال کا نتیجہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انھوں نے پہلی بار ایک تذکرے کی بساط پر شاعروں کی اتنی بڑی محفل سجا کر قارئین کو اردو کے شعری سرمائے کی وسعت اور تنوع سے آشنا کیا ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی ایک روشن حقیقت ہے کہ وہ مجمع کی اس فراوانی کی وجہ سے اکثر شرکائے محفل کے ساتھ پوری طرح انصاف نہیں کر سکے ہیں۔ عام طور پر ان کے ہاں تعارف کا جو انداز کارفرما نظر آتا ہے اس کی کچھ مثالیں یہ ہیں:

میر شیر علی افسوس:۔ "متوطنِ نارنول ابنِ میر علی مظفر خاں داروغۂ توپ خانۂ

عالی جاہ، شاگردِ رشید میر حیدر علی حیرانؔ است۔ در لکھنؤ قیام دارد۔ از کلام بہجت التیامش بوے فصاحت بمشامِ جاں می رسد۔" (نسخۂ لندن۔ ص ۲۲)

میاں صاحب میر آلمؔ :۔

"خلفِ رشید حضرت خواجہ میر دردؔ انار اللہ برہانہٗ بسیار متواضع و حلیم الطبع و نیک ذات، ستودہ اطوار ۔۔۔۔ بموجبِ رویۂ خاندانِ عالی صدر نشینِ فقر و افتقار است و سررشتۂ سخن سنجی از دست ندادہ۔ بغایتِ خوش فکر و صاف گو۔ طرزِ کلام بعنوانِ والدِ ماجد و عموے بزرگوارِ خود پیدا کردہ۔"

(نسخۂ لندن ص ۴۷)

شاہ کمال الدین حسین کمالؔ :۔

"ساکن قصبہ مانک پور۔ بزرگانش بمنصب داریٔ حضورِ معلّٰی سرفراز بودند۔ از شاگردانِ رشیدِ میاں قلندر بخش جرأتؔ است۔ در لکھنؤ قیام دارد و از تعلقات دنیوی درگذشتہ بزہد و ورع اوقات می گذارد۔" (نسخۂ لندن ص ۲۳۶)

مرزا غالبؔ :۔

"مرزا اسد اللہ خاں عرف مرزا نوشہ المتخلص بہ غالبؔ، ولد مرزا عبد اللہ خاں عرف مرزا دولہ، نبیرۂ مرزا غلام حسین خاں کمیدان، ساکنِ بلدۂ اکبر آباد، شاگرد مولوی محمد معظم، شاعرِ فارسی و ہندی است۔" (نسخۂ لندن۔ ص ۵۴۲)

یہ ان ممتاز معاصرین کے حالات ہیں جو ۱۲۴۷ھ/۱۸۳۱ء سے قبل ہی کسی نہ کسی حیثیت سے شہرت و امتیاز کے منصبِ اعلیٰ پر فائز ہو چکے تھے اور جن کے بارے میں مزید معلومات کی فراہمی حدِ امکان سے باہر نہ تھی لیکن اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز صورتِ حال اس وقت پیش آتی ہے جب ہم آتشؔ، ناسخؔ اور ذوقؔ کے بارے میں مولف کے دائرۂ معلومات کو اس سے بھی محدود تر پاتے ہیں۔ ذوقؔ ان کے ہم وطن اور استاد بھائی یعنی شاہ نصیرؔ کے شاگرد تھے اور آتشؔ و ناسخؔ کی شہرت بھی تذکرے کی ترتیبِ جدید سے پہلے پرِ پرواز حاصل کر کے ملک کے دور دراز گوشوں

تک پہنچ چکی تھی۔ اس کے باوجود ذکاؔ نے ان تینوں شاعروں کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ یہ ہے:

آتشؔ:۔ "وے از باشندہ ہائے قدیم بلدۂ لکھنؤ ست۔ شعرِ ہندی و فارسی می گوید کلامش گرمی دارد۔" (نسخۂ لندن۔ ص ۶۰)

ناسخؔ:۔ "شیخ امام بخش قوم سید (کذا) باشندۂ لکھنؤ، طرز کلام گوئی او بسیار مرغوب و مطبوعِ دل ہا ست۔" (نسخۂ لندن۔ ص ۸۵۱)

ذوقؔ:۔ "از ساکنینِ دار الخلافہ شاہجہان آباد، اکثر در مجلسِ مراختہ وارد می گردد و فوائدِ قواعدِ شعریہ از خدمتِ سراپا برکتِ محمد نصیر الدین نصیرؔ می رباید۔" (نسخۂ لندن۔ ص ۲۷۲)

"عیار الشعرا" میں کہیں کہیں اس روشِ عام سے استثنا کی مثالیں بھی مل جاتی ہیں لیکن ان کی تعداد بہت کم ہے۔ ان مستثنیات میں کسی نہ کسی حد تک وہ خصوصیات موجود ہیں جو تذکرے کو بیاضِ اشعار سے ممتاز کرتی ہیں۔ چنانچہ ذیل کے اقتباسات سے اندازہ ہوگا کہ ذکاؔ جب کبھی "شعارِ مختصر نگاری" کو خیرباد کہہ کر اپنے محدود دائرے سے باہر نکلتے ہیں تو اکثر انھوں نے ان فرائض کی ادائیگی میں کامیابی کی حدوں کو چھو لیا ہے جو ایک تذکرہ نویس کی حیثیت سے ان پر عائد ہوتے ہیں۔ انشاء اللہ خاں انشاؔ کے بارے میں رقم طراز ہیں کہ:

"خلفِ حکیم ماشاء اللہ خاں مرحوم، عالم و فاضل، شاعرِ پر زورِ ہندی و فارسی، مصنف چند نسخہ مثنویات و دواوین (کذا) و قصائد منقوط و غیر منقوط و رباعیات و مدح و ہجو وغیرہ۔ نیاکانش از بزرگ زادہ ہائے نجف اشرف۔ والدِ ماجدش در ایامِ ثروت و حشمت امیر الامرا نواب ذوالفقار الدولہ بہادر از ضلعِ مشرق بجمعیتِ دو زنجیر فیل وارد خطۂ پاکِ دہلی شدہ بود۔ گویند کہ خیلے جواں مرد و پر فتوت بودہ است۔ حکیم انشاء اللہ خاں انشاؔ در فنِ بے نظیرِ طبابت مہارتِ کلی دارد۔ مولدش مرشد آباد لیکن از چند سال در لکھنؤ بر فاقتِ شاہزادۂ

جم جاہ مرزا سلیمان شکوہ بہادر دام اقبالہٗ محترم و مفتخر است۔ از مشاہیرِ سخن پردازانِ آن ضلع واقع گشتہ۔ بزورِ طبیعت شعرِ خود را بپایۂ اعلیٰ رسانیدہ و شہرۂ آفاق گردیدہ۔" (نسخۂ لندن ص ۲۱)

شاہ حاتم کے حال میں لکھتے ہیں کہ

"شیخ ظہور الدین عرف شاہ حاتم المتخلص بہ حاتم، درویشے متعبد و مرتاض بود در دہلی۔ سخن خوب می گفت بلکہ اوستادِ وقت بودہ است.... ..... اول پیشہ سپاہ گری می نمودہ و در ایامِ نوکریٔ نواب عمدۃ الملک امیر خاں بہادر شراب و بنگ وغیرہ بکثرت می نوشید و در آخر ترکِ مسکرات و منہیات ساختہ از تعلقاتِ دنیاداری دل برداشت و در ریاضتِ شبانہ روزی اختیار نمود۔ شاعر فارسی و ہندی و گفتگویش بطورِ زباں دانانِ سلف حال بود۔ در دیباچۂ دیوانِ خود اسمِ چہل و پنج کس شاگردان مندرج کردہ۔ دیوانے کلاں مشتمل بر اقسامِ کلام و دیوانِ دویمی خرد کہ دیوان زادہ اش نام نہادہ، از و بر صفحۂ گیتی یادگار است۔ عجب خلیق و اہل محبت و صاحب دل، سراپا شفقت بود کہ دریں ایام ہیچو او مردے بزرگ و زیرک، متصف بہ اقسامِ کرم و خوبی ہا بہم رسیدن اشکال است۔ خدا ش مغفرت بخیر و نیکی کردہ باشد۔" (نسخۂ لندن۔ ص ۷۰)

سعادت یار خاں رنگین کا ترجمہ ان تفصیلات پر مشتمل ہے:

"خلف الصدق نواب محکم الدولہ طہماس بیگ خاں رومی اعتضاد جنگ بہادر کہ اول در دار السلطنتِ لاہور بسلکِ ملازمانِ خاصِ نواب عالی جناب معین الملک بہادر عرف میر منو پسرِ وزیر الممالک، اعتماد الدولہ بہادر انتظام داشت، بعدہٗ بجمعیتِ چند سوار بعلاقۂ رسالہ داری در سرکارِ دولت مدارِ امیر الامرا نواب نجیب الدولہ بہادر و نواب ذوالفقار الدولہ بہادر بہ ثروت و تمکنت تمام بسر برد۔ خودش نیز بعزتِ تمام و امتیازِ مالا کلام ملازم شاہزادہ ہائے عالی اقتدار ماندہ۔ نہایت خوش خلق و یار باش، پاکیزہ سیرت، خجستہ معاش

واقع شدہ۔ ظاہر حالش بصلاح آراستہ و باطنش بفلاح پیراستہ۔ طبع رنگین دارد و سخن انواع و اقسام از و بخوبی انصرام یافتہ۔ اشعارِ ندرت طراز خود را بنظرِ اوستادان وقت مثل شیخ ظہور الدین حاتم و محمد امان خاں نثار شاگردِ رشید حاتم گذرانیدہ و مدام با فضلا و حکما و سخنورانِ کامل فن صحبت داشتہ۔ چہار دیوان مردف یکے بقید غزل در غزل و دوئمی بزبانِ ہزل و ضحک با قصائد چند کہ بیشتر از گفتگوے نسواں مناسبت دارد، طرح دادہ و دو دیوان از غزلیاتِ طرحی و طبعی و رباعی و مخمسات و قطعات و مستزاد وغیرہ تالیف فرمودہ۔ سوائے ازیں رسالۂ نثر کہ بہ "مجالسِ رنگین" موسوم است، از طبعِ او تراوید مناسبتِ کلی از شاعری و سحر پردازی دارد۔ بسا مغتنم است۔ از چندے دامنِ حال از تلاش معاش واکشیدہ زاویہ نشینِ گوشہ فقر است و بہ ترکِ لباس ظاہر دنیا پرداختہ بیادِ ایزدِ غفار مصروف گشتہ۔" (نسخۂ لندن۔ ص ص ۳۵۲ و ۳۵۳)

ان بیانات کا مقابلہ اگر گذشتہ صفحات میں نقل کیے ہوئے آتش، ناسخ، ذوق اور غالب وغیرہ کے مختصر تراجم احوال سے کیا جائے تو زمین آسمان کا فرق محسوس ہوگا لیکن یہ تفصیلات بھی اس اعتبار سے ناقص و نامکمل ہیں کہ ان کے مطالعے سے نہ تو ہمیں زیرِ تبصرہ شاعروں کے زمانہ ہائے ولادت و وفات ہی کا علم ہوتا ہے اور نہ دوسرے اہم واقعاتِ زندگی کے سنین متعین کرنے میں کوئی خاص مدد ملتی ہے۔ البتہ خاندانی شرافت و وجاہت، سیرت و اخلاق، علمی مرتبے، سماجی حیثیت اور ادبی کارناموں کے متعلق کچھ باتیں معلوم ہو جاتی ہیں جن کے مفید اور کارآمد ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ موخر الذکر ذاتی و صفاتی خصوصیات کو وہ کبھی مختصر الفاظ اور چھوٹے چھوٹے جملوں میں بھی اس حسن و خوبی کے ساتھ ادا کر جاتے ہیں کہ مزید تفصیل و تشریح کی حاجت باقی نہیں رہتی مثلاً:

شیخ قلندر بخش جرأت:

"بیشتر نو مشقان را بہ اصلاحِ خود شاگردِ رشید گردانیدہ۔ بہرہ از علمِ نجوم

ہم دارد۔ شاگردِ میر جعفر علی حسرتؔ و در حقیقت از اوستادِ خود فائق است۔
۔۔۔۔۔۔ تا حالتِ تحریر ہم چو او شاعرِ زبردست و قادرِ سخن از خطۂ پاک
لکھنؤ برنخاستہ۔" (نسخۂ لندن۔ ص ص ۱۴۶ و ۱۴۷)

جعفر علی خاں ذکیؔ :۔

"بسیار صاحبِ حشم و اہل حمیت و خلیق و نیک زندگانی کشادہ پیشانی و
ستودہ اطوار، حمیدہ کردار بود۔" (نسخۂ لندن ص ۲۷۰)

اعظم الدولہ میر محمد خاں سرورؔ :۔

"بسیار خلیق و شفیق و اہل توفیق و قدر شناس، صاحبِ مروت، نیک
اساس، عمدہ معاش، خجستہ قماش است۔ از جدت ذہنِ رسا و جودتِ طبعِ
معنی زا و کثرتِ محاورۂ اردوے معلّٰی صدہا اشعار چیدہ و منتخب از بر دارد۔"
(نسخۂ لندن۔ ص ۴۰۱)

میر عزت اللہ عشقؔ :۔

"مردِ صالح است ۔۔۔۔۔۔۔۔ جوہرِ صلاحیت از ناصیۂ حالش پیدا و
از آثارِ نجابت از صفحۂ جمالش ہویدا ۔۔۔۔۔۔۔۔ انسانِ بامروت و پر حیا و
دوستِ یک رنگ و باوفاست۔ بعمرِ شباب لیاقت و شائستگیٔ مزاج بسیار
دارد۔" (نسخۂ لندن ص ۴۹۶)

یہ بیانات تصویر کے ایک ہی رخ کو نمایاں کرتے ہیں لیکن انھیں تحسینِ بے جا کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ وہ جہاں محاسنِ اخلاق و شخصیت کے اعتراف کو ایک خوشگوار فریضے کے طور پر انجام دیتے ہیں، وہیں معائبِ سیرت و کردار کی تنقید سے بھی گریز نہیں کرتے۔ شہوتؔ کے بارے میں یہ بیان اس خصوصیت کے ثبوت میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ لکھتے ہیں کہ

"شخصے (است) بد اطوار، نکوہیدہ کردار، زشت اعمال قبیح خصال،
از بس کہ بوے نخوت بدماغش جاگرفتہ بود، اندرز و نصائح را خیر باد

می گفت و تمسخر و تضحیک را شعارِ خود گردانیدہ اوقات بحرکاتِ لغو و ناشائستہ می گذاشت۔ از پیش گاہِ خلافت بہ تمنائے تمام مسخرۃ الدولہ قرم ساق خاں بہادر پھکڑ جنگ خطاب گرفتہ ۔۔۔۔۔۔ برخود (می) بالید و خود را در فرقۂ ہم اطوارانِ خویش معزز (می) انگاشت۔" (نسخۂ انجمن ورق ۱۴۴ الف)

ان کی بالغ نظری اور آزاد خیالی کا اندازہ اس بات سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ اس دور میں جب کہ نظیر اکبر آبادی جیسے شعرا کو ممتاز فن کاروں کے زمرے میں شامل کرنا اپنے مذاقِ سخن کی رسوائی اور تشہیر کو دعوت دینے کے مترادف تھا، انھوں نے نظیر کی قدر پہچانی، ان کے لیے ان کے حسبِ حیثیت الفاظ استعمال کیے اور ان کے سارے سرمایۂ فکر کو سوقیانہ اور ساقط المعیار قرار نہ دے کر اس کے انتخاب سے تذکرے کے اوراق کو زینت بخشی۔ مندرجہ ذیل جملے اردو کے اس عظیم عوامی شاعر کی شخصیت کے خط و خال کو بڑی خوبی اور خوبصورتی کے ساتھ نمایاں کرتے ہیں:

"ولی محمد خاں نظیر شخصے است معلّم، ساکنِ مستقر الخلافہ اکبر آباد، مشاق قدیم است۔ خطِ نستعلیق درست می نویسد و طبع رسا دارد و در آں ضلع کوسِ اوستادی می زند۔ اکثر نو مشقان و تازہ گویان را اصلاحِ سخن می فرماید۔ دراں دیارِ فرحت آثار در زمرۂ سخن گویانِ حال ہم چو او اوستادِ قابل و سخن طرازِ کامل تا حال پیدا نشدہ۔" (نسخۂ لندن۔ ص ۵۲۸)

نقدِ کلام کے نقطۂ نظر سے ذکا کے ہاں کوئی امتیازی خصوصیت نظر نہیں آتی۔ وہ بالعموم تاثراتی انداز اور مختصر الفاظ میں کلام کی مجموعی فضا کی طرف اشارے کرتے ہوئے اشعار پیش کر دینے کے عادی ہیں۔ اس ضمن میں کہیں کہیں ان کے قلم سے اس قسم کے مکمل جملے بھی نکل جاتے ہیں۔

افسوس: ـــــ "از کلامِ بہجت التیامش بوے فصاحت بمشامِ جاں می رسد۔"
(نسخۂ لندن۔ ص ۳۲)

خیراتی خاں دل سوز: "کلامش رتبۂ پیدا کردہ و خالی از کیفیت و برجستگی

نیست ۔" (نسخۂ لندن ۔ ص ۲۵۲)

جعفر علی خاں ذکی :۔ "شعرش مطابقِ رویۂ آن وقت وگفتگوے آں زماں سرانجام می یافت ومتانت وفصاحتِ تمام داشت۔"
(نسخۂ لندن ۔ ص ۲۷۰)

سید الشعرا غالب علی خاں سید :۔ "غزلیاتِ طویل ..... بکمال متانت و خوبی سرانجام می فرماید۔" (نسخۂ لندن ص ۳۸۹)

ہدایت اللہ خاں ہدایت :۔ "شعرش مستغنی از تکلف است وخالی از کیفیت نہ ۔" (نسخۂ انجمن ۔ ورق ۲۸۳)

شاہ گھسیٹا عشق :۔ "کلامش تصوف آمیز ونہایت دردآگیں وفصیح وبلیغ است ۔" (نسخۂ لندن ۔ ص ۴۸۴)

حکیم قدرت اللہ قاسم :۔ "سررشتۂ متانتِ کلام از دست نمی دہد وتلاشِ کامل بکار می برد ۔" (نسخۂ لندن ۔ ص ۶۱۴)

اس عمومی روش کے برخلاف بعض اوقات ذکا نے مجموعی تاثرات کے مختصر بیان پر اکتفا نہ کرتے ہوئے کسی قدر واضح الفاظ میں اظہارِ خیال کیا ہے اور شعرا کے انفرادی رنگ اور امتیازی کارناموں کی نشان دہی پر مناسب توجہ مرکوز کی ہے۔ ان کے یہ فرمودات تنقید کا نسبتاً بہتر معیار پیش کرتے ہیں۔ مندرجہ ذیل مثالوں سے اس کا اندازہ ہوگا :

میاں حاجی تجلی :۔

"فکرِ شعر بطرزِ میر می کند۔ مثنوی لیلیٰ مجنوں بسیار خوب گفتہ وتلاش نمایاں بکار بردہ ..... اشعارے کہ از فکرِ بلندش تراویدہ، ازاں بوے اوستادی می آید وناخن بدل است ۔" (نسخۂ لندن ۔ ص ۱۱۸)

قلندر بخش جرأت :۔

"شعرش بسیار برجستہ وپر مضمون، طورِ ادائے کلام روزمرہ ومحاورہ ازو

بخوبی وصفائی تمام جلوۂ نمایش می پذیرد ..... شعرش رتبہ پیدا کردہ"
(نسخۂ لندن۔ص ۱۴۷)

مرزا رفیع سودا:۔

"سخنش از پایہ گذشتہ ..... زبانِ ریختہ را آب و تاب دادہ و محاورۂ اردوے معلّٰی را خوب رونق بخشیدہ بلکہ بمنزلۂ فارسی رسانیدہ۔ خصوصًا در ہجو و قصیدہ گوئی یدِ طولیٰ داشت" (نسخۂ لندن۔ص ۳۷۵)

مرزا عظیم بیگ عظیمؔ دہلوی:۔

"در قصائد گوئی ..... وحید العصر و یگانۂ دوراں بودہ است۔ در خیال بندیٔ معنی بے نظیر بود۔ کلامش بفصاحت وجودت از و بر صفحۂ روزگار ناپائیدار ثبت افتادہ۔ فی الحقیقت شاعری کردہ بل ساحری نمودہ"
(نسخہ لندن صفحات ۴۸۵ و ۴۸۶)

مصحفی امروہوی:۔

"قصائدِ چند بکمالِ خوبی و متانتِ کلام ..... از و سرانجام یافتہ ..... تصانیفِ بسیار دارد۔ باایں ہمہ صحتِ محاورہ و استخوان بندیٔ الفاظ کما حقہٗ دراں یافتہ می شود۔ از کلامش بوے متانت بمشامِ جاں می رسد و ہواے سخنش بے اختیار دامنِ دل می کشد" (نسخۂ لندن۔ص ۴۹۰)

ہر چند کہ اس قسم کی تنقیدیں اس تذکرے میں "اَلنَّادِرُ کَالْمَعْدُوْمِ" کے حکم میں داخل ہیں اور نقد و نظر کے اس معیار تک نہیں پہنچتیں جو مصحفی اس سے قبل "تذکرۂ ہندی" میں پیش کر چکے ہیں، پھر بھی انھیں دائرۂ تنقید سے خارج کر دینا اردو تنقید کو معشوق کی موہوم کمر یا اقلیدس کے فرضی نقطے سے تعبیر کرنے کی طرح بعید از انصاف ہو گا۔ اس لیے اشپرنگر کے اس خیال سے کہ "اس تذکرے میں تنقید کا نام نہیں[1]" پوری طرح اتفاق نہیں کیا جا سکتا۔

---

[1] بحوالہ "یادگارِ شعرا" ص ۷، و خطبات گارسین دی تاسی (خطبہ پنجم) ص ۱۱

اس تذکرے پر اشپرنگر کا ایک اور اعتراض ان مکررات و اغلاط سے متعلق ہے جن کو انھوں نے مولف کی بے احتیاطی کے نتائج سے تعبیر کیا ہے[1]۔ یہ اعتراض بڑی حد تک صحیح ہے اور اس حقیقت کو تسلیم کر لینے کے باوجود کہ اس دور کے محدود ذرائع و وسائل کے پیش نظر ایک ایسی ضخیم و جامع کتاب میں بعض نقائص اور خامیوں کا باقی رہ جانا لازمی اور بدیہی امر تھا، اس کی وقعت و واقعیت میں کوئی کمی نہیں آتی، کیونکہ کہیں کہیں غلطیاں اس قدر صریح اور واضح ہیں کہ ادنیٰ غور و فکر اور تحقیق و تفحص کے بعد انھیں دور کر دینا زیادہ دشوار نہ تھا۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے حالات کے اعادہ و تکرار کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

نسخۂ لندن صفحہ ۱۰۰ پر کاظم حسین بیقرار کے بارے میں لکھتے ہیں:

"میر کاظم حسین بیقرار ساکن دہلی ہمشیرہ زادۂ نواب سیف الدولہ سید رضی خاں بہادر صلابت جنگ سلمہٗ۔ انسان بامروت و سعادت مند و خوش خوست۔ کلام خود را بگوشِ معنی نیوش سخن سنج بے نظیر محمد نصیر الدین نصیر گذرانیدہ۔ سخنش برجستگی دارد۔"

صفحہ ۱۰۹ پر دوبارہ انھی بیقرار کا ذکر ان الفاظ میں موجود ہے:

"مرزا کاظم حسین بیقرار شاگردِ رشید میاں نصیر خلف نواب قلندر علی خاں، خیلے صاحبِ طبع و خوش فکر و ..... ذہین و جوانِ خوش خلق، مروت اساس تودد شناس است۔ درا صلاح چند روزہ بہ برکتِ فیضِ اوستاد سخن را بجائے رسانیدہ۔ خداش خوش دارد۔"

اس تکرار کی کوئی معقول وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ مزید برآں ایک ہی شخص کو ایک جگہ میر اور دوسری جگہ مرزا لکھنا بالخصوص ایسی حالت میں جب کہ اس سے رشتہ ہم وطنی کے علاوہ خواجہ تاشی کی نسبت بھی ہو، تعجب خیز ہے۔ ذکا اور بیقرار

---

[1] بحوالہ "یادگار شعرا" ص، و خطبات گارسین دی تاسی (خطبہ پنجم) ص ۱۱

دونوں ہی دہلی میں مقیم اور شاہ نصیرؔ کے شاگرد تھے اس لیے ایک کا دوسرے سے واقف نہ ہونا خلافِ قیاس ہے۔ چونکہ مولانا محمد حسین آزادؔ نے "آبِ حیات" اور دیباچۂ دیوانِ ذوقؔ میں ہر جگہ بیقرارؔ کو میر کاظم حسین کے نام سے یاد کیا ہے، اس لیے اس سلسلے میں ذکاؔ کا پہلا بیان قابلِ ترجیح قرار پاتا ہے۔

متذکرۂ بالا نسخۂ لندن ہی میں حزیںؔ تخلص کے تحت بہ تفصیلِ ذیل دو شاعروں کا ذکر ملتا ہے۔

(الف) "شیخ محمد علی حزیںؔ، از نصیریانِ مرزا جانجاناں مظہرؔ، بسیار سیر مشق و مناسبت کلی از شعر و سخن داشت و ہمت بتلاشِ کامل می گماشت دیوانِ مختصرش بہ ایں حقیر سراپا تقصیر بہم رسید۔ ازاں اشعارِ انتخابی برآوردہ بسلکِ تحریر منسلک گردانید۔" (ص ۱۹۹)

(ب) "میر باقر حزیںؔ شاعرِ خوش کلام، صاف گو۔ نسبتِ تلمذ بیکے از سخن پردازانِ لکھنؤ دارد۔ کلامِ برجستہ و مربوط می گوید۔" (ص ۲۲۶)

محمد علی مشہور فارسی ادیب و شاعر حزیںؔ اصفہانی کا نام ہے جو نہ مرزا مظہرؔ کے شاگرد تھے اور نہ اردو کے شاعر۔ ذکاؔ نے جس دیوانِ مختصر کو ان سے منسوب کیا ہے وہ دراصل موخر الذکر شاعر میر محمد باقر حزیںؔ کے کلام کا مجموعہ ہے جو دہلی کے باشندے اور مرزا جانجاناں کے شاگرد تھے۔ چونکہ مرزا صاحب موصوف کے علاوہ کسی دوسرے استاد سے ان کے اکتسابِ فیض کے متعلق کوئی روایت موجود نہیں اس لیے ذکاؔ کا یہ قول بھی کہ "نسبتِ تلمذ بیکے از سخن پردازانِ لکھنؤ دارد" خلافِ واقعہ قرار پاتا ہے۔ انجمن کے نسخے میں ان دو مقامات کے علاوہ تیسری جگہ بھی ایک مجہول الاحوال شاعر کی حیثیت سے انھی حزیںؔ کا تعارف ان الفاظ میں سپردِ قلم کیا گیا ہے:

"حزیںؔ تخلص شاگردِ مرزا مظہر۔ شاعرے در عہدِ سلطنتِ فردوس آرام گاہ بود۔ اکثر بہ تصنیفِ کلامِ دلآویز متوجہ می شد۔" (ورق ۶۵ ب)

تکرار در تکرار سے زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ یہاں جو اشعار نمونۂ کلام کے طور پر

نقل کیے گئے ہیں، وہی اس سے قبل محمد علی حزیں کے نام سے پیش کیے جا چکے ہیں۔

تذکرۂ "طبقات سخن" کے مولف غلام محی الدین مبتلا میرٹھی کے حالات بھی چند صفحات کے فرق سے دو جگہ لکھے گئے ہیں اور دونوں خاکے ظاہری و معنوی طور پر ایک دوسرے سے اس قدر قریب اور مماثل ہیں کہ بیک نظر تکرار کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ ملاحظہ ہوں:

(الف) "غلام محی الدین مبتلا، وے ساکن میرٹھ واز شعرائے قدیم است۔ (از) اکثر اشعارش کہ بسمع رسیدہ، جوہر استعدادِ باطنیٔ آن بر مرآتِ ضمیرِ نیاز پذیر عکس انداز گشت۔ اگرچہ ایں نحیف بہرۂ از فیضِ ملاقاتِ فرحت سماتش نبرداشتہ و ہنوز مشتاق است، الا ایں افراد از تصنیفش بہم رسانیدہ۔"

(ص ص ۴۰۷ و ۴۱۷)

"شیخ غلام محی الدین مبتلا، عشق ہم تخلص می کند۔ او ساکنِ میرٹھ خیلے مستعد و فاضل و شاعرِ فارسی و ہندی و مصنفِ مثنوی ہا و تذکرہ ہندی از عہدِ محمد شاہ بادشاہ تا سنہ احدِ جلوس اکبر بادشاہ غازی از و ترتیب یافتہ و بنظرِ احقر ہم گذشتہ۔ بہر حال در قصبہ میرٹھ از مغتنمات است۔"

(ص ۷۹۸)

نوا بدایونی کے معاملے میں بھی ذکا اسی قسم کی تکرار کے مرتکب ہوئے ہیں۔ پہلی مرتبہ ان کو اس طرح متعارف کرایا گیا ہے:

"شیخ محمد ظہور اللہ خاں نوا، شخصے است طالبِ علم در بلدۂ لکھنؤ، شاگردِ محمد بقا خاں بقا اکبر آبادی از حضورِ فیض گنجور مرشد زادۂ آفاق مرزا جہاندار شاہ بہادر مغفور مبرور خوش فکر خاں خطاب داشت۔ بعضی قصائد و ہم غزلیات بکمالِ متانت وجودتِ طبع از و سرانجام یافتہ۔ فی الجملہ تلاشے دارد۔"

(ص ۵۳۸)

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

"ظہوراللہ خاں نوآ شاعرِ شیریں (بیان) فصیح زبان است۔" (ص ۸۴۹)

شیخ شرف الدین الہآم اور شاہ شرف الدین ملوّل، خداوردی خاں بیتاب اور خدابردی خاں ظریف، اسد علی خاں تمنّا اور میر اسد علی تمنّا دکنی، میر صادق علی صادق اور میر صادق علی خاں صادق، میر عبدالواسع عزلت اور سید عبدالولی عزلت کے تراجم بھی ظاہری اختلاف اور باطنی وحدت کی ایسی ہی مثالیں پیش کرتے ہیں۔

بعض جگہ دو مختلف شاعروں کے حالات کچھ اس طرح آپس میں خلط ملط ہو گئے ہیں کہ ایک عام قاری کے لیے ان کے درمیان فرق کرنا دشوار ہے۔ یہ صورتِ حال نسبتاً کم پیش آئی ہے، اس لیے صرف دو مثالیں جو زیادہ اہم اور نمایاں ہیں بطور نمونہ پیش کی جاتی ہیں۔

محمد روشن جوشش اور محمد عابد دلؔ عظیم آباد کے دو مشہور شاعر ہیں۔ یہ دونوں حقیقی بھائی اور راجہ ناگر مل کے نومسلم بیٹے تھے[1]۔ ذکاؔ نے ان دونوں کے بارے میں ایک ہی تخلص جوشش کے تحت مندرجہ ذیل معلومات فراہم کی ہیں:

(الف) "محمد روشن جوشش، شخصے بضلعِ لکھنو ست۔ از مشاہیرِ سخنورانِ آں ضلع واقع شدہ و دریں فن عمرے صرف نمودہ۔ جوشش طبعش از کلامش روشن۔

دل میں ہے اب قرب میں آئینہ ساں پیدا کروں
وہ مجھے دیکھا کرے اور میں اسے دیکھا کروں

چوں آئینہ یہ ستم رسیدہ رہتا ہے مدام آب دیدہ" (ص ۱۴۳)

(ب) "محمد عابد جوشش ساکنِ عظیم آباد است۔ از خوش گویانِ آں ضلع واقع شدہ۔ عاصی ذکا را اتفاقِ ملاقات نیفتادہ مگر ازیں مطلع طبعزادش واقفیت دارد۔

---

[1] مسرت افزا ص ۵۴

تمھارے در پہ جو درباں نے آستیں پکڑی　　برنگِ نقشِ قدم ہم نے بھی زمیں پکڑی

(ص ص ۱۶۴ و ۱۶۵)

پہلے اقتباس میں نام اور تخلص کی حد تک کوئی غلطی نہیں لیکن لکھنؤ سے شاعر کی نسبت اور وہاں قیام کی بات صریحاً خلافِ واقعہ ہے۔ دوسرے اقتباس میں نام صحیح اور تخلص غلط ہے۔ یہاں جوشش کی بجائے دلؔ ہونا چاہیے۔

محمد علی حشمتؔ اور محتشم علی خاں حشمتؔ کے حالات بھی اسی قسم کی بعض واقعاتی غلطیوں سے معمور ہیں۔ دونوں کے تراجم کے اقتباسات درج ذیل ہیں:

(الف) "میر محمد علی خاں حشمتؔ از کہنہ مشقانِ بودہ است مگر دیوانش مروج نیست۔ عابد یار خاں و مراد علی خاں برادرانِ وے بعلاقۂ خدماتِ جواہر خانۂ حضور حضرت فردوس آرام گاہ نوراللہ برہانہٗ منسلک بودند۔ مردِ عمدہ روزگار، صاحبِ مروت زردار بود۔ بتلاشِ خطیر دواوینِ وے بہم رسانیدہ بریں قرطاس ثبت می گرداند۔ میر عبدالحئی تاباںؔ اشعارِ خود بنظرِ ہمیں اوستاد می گذرانید چنانچہ صیتِ سخنش شہرۂ عام است۔

خط نے ترا حُسن سب گنوایا　　یہ سبز قدم کہاں سے آیا

نکہتِ گل نے ستایا کسے زندان کے بیچ

پھیرِ زنجیر کی جھنکار پڑی کان کے بیچ" (ص ص ۱۹۶ و ۱۹۷)

(ب) "میر محتشم علی خاں حشمتؔ ساکن شاہجہاں آباد واصلِ وے بدخشاں۔ مردِ عمدہ روزگار، خوش کردار، عمدہ معاش، نیک تلاش بود۔ شعرِ فارسی و ہندی بمتانت و فصاحتِ تمام می گفت مگر بہ نسبت ریختہ مزاجِ او بطرف فارسی گوئی بسیار رغبت داشت۔ سخنِ میر عبدالحئی تاباںؔ و دیگر شاگردان را بہ اصلاحِ خود رونق بخشیدہ۔ مردے قابل بود، سخنِ خوب سرانجام می داد۔

خط نے ترا حسن سب گنوایا　　یہ سبز قدم کہاں سے آیا

بہار آئی، دوانے کی خبر لو — اگر زنجیر کرنا ہے تو کر لو
ہم نے نجف میں جا کے کیا خوش مقام ہے — کعبہ کو دور ہی سے ہمارا سلام ہے
برقع کو اٹھا چہرے سے وہ بت اگر آوے — اللہ کی قدرت کا تماشا نظر آوے
اے ناقۂ لیلیٰ دو قدم راہ غلط کر — مجنونِ زخود رفتہ مگر راہ پر آوے"

(ص ۲۱۱)

عبدالحئی تاباںؔ محمد علی حشمتؔ کے شاگرد تھے[1] ذکاؔ نے انھیں محتشم علی خاں کے زمرۂ تلامذہ میں بھی شامل کرلیا ہے۔ بہ الفاظ دیگر وہ ان دونوں شاعروں کے درمیان کوئی حدِ فاصل قائم نہیں کر سکے۔ اس اشتراک والتباس کا دوسرا ثبوت پہلا شعر ہے جو دونوں کے کلام میں مشترک ہے اور درحقیقت اول الذکر حشمتؔ کے سرمایۂ فکر سے تعلق رکھتا ہے۔ آخری دو اشعار جنھیں محتشم علی خاں سے منسوب کیا گیا ہے، میرؔ صاحب کے نتائجِ فکر ہیں اور ان کے کلیات اور اس کے اکثر انتخابات میں شامل ہیں۔

انشاؔ کا یہ مطلع بھی جسے ذکاؔ نے شاہ عالم آفتابؔ کے انتخابِ کلام میں نقل کیا ہے انتساب کی غلطی کی ایسی ہی ایک مثال پیش کرتا ہے۔

چھیڑنے کا تو مزا جب ہے کہو اور سنو
بات میں ہم سے خفا ہو گئے لو اور سنو (ص ۹)

---

[1] ایک غزل کے مقطع میں تاباںؔ نے اس طرح اپنے استاد کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے ؎

نہ مانے جو کوئی حشمتؔ کو تاباںؔ — وہ دشمن ہے محمدؐ اور علیؓ کا

مثنوی "در مدح اوستادِ خود" کے یہ اشعار اس مسئلے میں اس سے بھی زیادہ واضح طور پر ہماری رہنمائی کرتے ہیں

کسی کو کہاں اس سے ہے برتری — کہ ہے نام اس کا محمد علی
تخلص بھی حشمتؔ ہے اس کا بجا — وہ اہلِ سخن ہیچ ہے بادشا

(دیوانِ تاباںؔ مرتبہ مولوی عبدالحق ص ۲۶۰)

یہ مطلع مکمل غزل کے ساتھ انشاؔ کے دیوان میں موجود ہے[1]، اس لیے اسے ان کی ملکیت قرار نہ دے کر شاہ عالم آفتابؔ سے منسوب کرنا درست نہیں، خاص طور پر ایسی حالت میں جب کہ کسی مستند ماخذ سے اس کی تائید بھی نہیں ہوتی۔ اس کے برخلاف درج ذیل رباعی جو انشاؔ کے نام سے نقل کی گئی ہے، اصل میں میر عبدالحئی تاباںؔ کی تصنیف ہے۔ رباعی:

میخانہ میں کیا پھرے ہے مٹکی مٹکی — نت شیخ و برہمن سے ہے پھٹکی پھٹکی
قاضی سے ڈرے، نہ محتسب سے کافر — یہ دخترِ رز ہے جس سے اٹکی، اٹکی[2]

(ص ۲۱)

میر صاحب نے نکات الشعرا (طبع ثانی ص ۴) میں مندرجہ ذیل مطلع مرزا معز فطرتؔ کے نمونۂ کلام کے تحت درج کیا ہے ؎

از زلفِ سیاہِ تو بدل دھوم پڑی ہے
در خانۂ آئینہ گھٹا جھوم پڑی ہے

ذکاؔ نے اس شعر کو بہ ادنیٰ تغیر اولاً خان آرزوؔ سے اور بعد ازاں فطرتؔ سے منسوب کیا ہے۔ ہمارے خیال میں انتسابِ اول اس بنیاد پر غلط ہے کہ اگر یہ مطلع فی الواقع خان آرزوؔ کی تصنیف ہوتا تو میرؔ اس حقیقت سے بے خبر رہتے ہوئے محض شہرتِ عام کی بنا پر اسے فطرتؔ سے ہرگز منسوب نہ کرتے۔ "نکات الشعرا" (ص ۱۳۶) میں حسنؔ شاگردِ سوداؔ کے نام سے جو اشعار منقول ہیں ان میں یہ شعر بھی شامل ہے۔

قاتل اگر کہے کہ سسکنا ہی چھوڑیو — خنجر تو ایک دم کے لیے منھ نہ موڑیو

ذکاؔ نے شاعرِ مذکور کو میر حسنؔ صاحبِ سحر البیان خیال کرتے ہوئے یہ مطلع ان کے

---

[1] کلام انشاؔ مرتبہ مرزا محمد عسکری ص ۱۷۳

[2] دیوانِ تاباںؔ شائع کردہ انجمن ترقی اردو ہند (ص ۲۰۵) میں اس رباعی کا دوسرا مصرع بہ ایں الفاظ درج ہے ع "زاہد عابد سے دور بھٹکی بھٹکی"

کلام میں درج کر دیا ہے اور انھیں مرزا سوداؔ، میر ضیاؔ اور میر سوزؔ کا شاگرد بتایا ہے[۱]۔ لیکن میر حسنؔ کے سوداؔ یا سوزؔ سے مشورۂ سخن کی کوئی مستند شہادت موجود نہیں۔ انھوں نے اپنے تذکرے میں صرف میر ضیاؔ دہلوی سے اکتسابِ فیض کا اعتراف کیا ہے[۲]۔ اس کے علاوہ اس تذکرے میں زیرِ بحث مطلع میر ابوالحسن وحشتؔ سے منسوب ہے[۳]۔ ان حالات میں حسنؔ شاگردِ سوداؔ کو میر حسنؔ سے ممیز کرنے کے لیے کسی مزید ثبوت کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

درجِ ذیل شعر عیار الشعرا کے نسخۂ انجمن میں شرف الدین علی خاں پیامؔ کے کلام میں نقل ہوا ہے لیکن معتبر روایات کے بموجب احسن اللہ احسنؔ کی تصنیف ہے۔

لام نستعلیق کا ہے اُس بُتِ خوش خط کی زلف
ہم تو کافر ہوں اگر بندے نہ ہوں اسلام کے

اشعارِ ذیل اس تذکرے میں اولاً قدرت اللہ قدرتؔ سے اور اس کے بعد شاہ واقفؔ سے منسوب کیے گئے ہیں۔

ہوا ہے عشق سے آکر مقابلہ دل کا — بھڑا پہاڑ سے جا، بل لے حوصلہ دل کا
سرشک و آہ ہے شورِ جنوں ہے، وحشت ہے — عجب شکوہ سے جاتا ہے قافلہ دل کا
کہاں ہے شیشۂ مے، محتسب خدا سے ڈر — مری بغل میں جھلکتا ہے آبلہ دل کا

قدرت اللہ شوقؔ نے ان اشعار میں سے دوسرے اور تیسرے شعر کو مراد علی حیرتؔ مراد آبادی کے نام سے نقل کیا ہے اور انھیں یہ اشعار منجملہ دوسرے کلام کے خود حیرتؔ ہی سے حاصل ہوئے تھے جیسا کہ ان کے اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے:

---

[۱] "اشعارِ خود بنظرِ اکسیر اثر مرزا محمد رفیع سوداؔ و میر ضیاء الدین ضیاؔ و محمد میر سوزؔ گذرانیدہ"۔ (نسخۂ لندن ص ۱۹۴)

[۲] "تذکرہ شعرائے اردو" طبع ثانی ص ۵۴

[۳] "تذکرہ شعرائے اردو" طبع ثانی ص ۱۸۶

"چند غزلیاتِ متفرقات از راہِ مہربانی از دستِ خاص بہ ایں راقمِ حروف نوشتہ دادہ بود، انتخاب نمودہ نوشتہ می شود"[1]

دوسرا شعر مصحفی کے یہاں بھی حیرت ہی کے کلام میں درج ہے[2] اور تیسرے شعر کی ملکیت کے سلسلے میں قائم چاند پوری[3]، میر حسن[4] اور عشقی[5] کے تذکروں سے شوق کے انتساب کی تائید ہوتی ہے۔

بے احتیاطی کی ان مثالوں کے علاوہ اس تذکرے میں جزوی و ثانوی نوعیت کی ایسی متعدد غلطیاں بھی موجود ہیں جو مولف کے نقصِ معلومات کی غمازی کرتی ہیں لیکن ان کے کام کی وسعت اور دقت طلبی کے پیشِ نظر زیادہ اہمیت نہیں رکھتیں۔ اس تذکرے کی امتیازی حیثیت کو برقرار رکھنے کے لیے ان لغزشوں اور کوتاہیوں کے باوجود یہ وصف کچھ کم نہیں کہ اس کے ذریعے پہلی بار بہت سے ایسے شاعروں کو منظرِ عام پر آنے کا موقع ملا ہے جنھیں پچھلے تذکرہ نگار نظر انداز کر چکے تھے۔ ان نئے شاعروں کی فہرست میں غیر مسلم فن کاروں کے نام بھی دوسرے تذکروں کی بہ نسبت بہت زیادہ ہیں۔ اس اعتبار سے "عیار الشعرا" اردو زبان و ادب کے جمہوری کردار کی وضاحت کے نقطۂ نظر سے دوہری اہمیت کا حامل ہے۔

---

[1] "طبقات الشعرا" ص ۲۵۴

[2] "تذکرۂ ہندی" ص ۸۰

[3] "مخزنِ نکات" نسخہ آفس لائبریری لندن طبع ثانی ص ۱۹۸

[4] "تذکرہ شعرائے اردو" طبع ثانی ص ۴۹

[5] "تذکرۂ عشقی"۔ دو تذکرے جلد اول ص ۲۴۰

عمدۂ منتخبہ

"عمدۂ منتخبہ" شعرائے اردو کے ان تذکروں میں شامل ہے جو دوسرے متعدد تذکروں کے مآخذ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ برصغیر ہندو پاک میں اس تذکرے کا صرف ایک قلمی نسخہ پایا جاتا ہے جو بابائے اردو مولوی عبدالحق کے ذخیرۂ مخطوطات سے انجمن ترقیٔ اردو پاکستان کے کتب خانے میں منتقل ہوا ہے[1]۔ اس کے علاوہ ایک نسخہ پیرس کے قومی کتب خانے میں اور ایک انڈیا آفس لائبریری لندن میں محفوظ ہے۔ مارچ ۱۹۶۱ء میں ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی نے موخرالذکر مخطوطے کی بنیاد پر اس تذکرے کو دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کی جانب سے شائع کر دیا ہے۔ لیکن یہ ایڈیشن چوں کہ دوسرے دستیاب نسخوں سے مقابلے کی اہمیت کو یکسر نظر انداز کر کے مرتب کیا گیا ہے، اس لیے ترتیب و تحقیقِ متن کے موجودہ معیار پر پورا نہیں اترتا۔

شیفتہ کے قول کے مطابق تذکرے کے مولف نواب اعظم الدولہ میر محمد خاں سرورؔ (متوفّٰی شوال ۱۲۵۰ھ/ فروری ۱۸۳۵ء) اعاظمِ امرائے عالی نہاد" اور اجلّۂ اراکینِ جہان آباد" میں سے تھے[2]۔ شعر و سخن سے انھیں بے حد دل چسپی تھی اور شاعری

---

[1] یہ نسخہ بہ اعتبار ظاہر مولف کا اصل مسودہ ہے جس کی کتابت ۱۲۲۴ھ میں پایۂ اختتام کو پہنچی ہے۔ زمانہ مابعد کے اضافے اس کے حاشیوں پر درج ہیں۔ متن میں بھی بعض جگہ لفظی ترمیم و تنسیخ کی گئی ہے۔ بعض اشعار یکسر قلم زد کر دیے گئے ہیں اور بعض جگہ ان کے بجائے دوسرے شعر لکھے گئے ہیں۔ موخرالذکر دونوں نسخے اسی سے منقول ہیں۔

[2] گلشنِ بے خار، طبع اول۔ ص ۱۲۷

کی محفلوں میں بڑے ذوق وشوق کے ساتھ شرکت کیا کرتے تھے۔ شعروادب سے یہی تعلقِ خاطر شعرائے معاصرین ومتقدمین کا تذکرہ مرتب کرنے کا محرک ہوا جس کے نتیجے میں "عمدۂ منتخبہ" عالمِ وجود میں آیا۔ اس تذکرے میں حروفِ تہجی کے اعتبار سے نوسو چھیانوے (۹۹۶) شاعروں کا ذکر کیا گیا ہے۔ مولف کا مطمحِ نظر جامعیت ہے۔ اس لیے اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ اختصار وتفصیل کا خیال کیے بغیر زیادہ سے زیادہ شاعروں کا حال اور کلام درج کر دیا جائے۔

"عمدۂ منتخبہ" تذکرے کا تاریخی نام ہے جس سے ۱۲۱۶ھ برآمد ہوتا ہے۔ یہ نام سید الشعرا سید غالب علی خاں سیّد کا تجویز کردہ ہے جیسا کہ ان کے طبع زاد قطعۂ تاریخ کے درج ذیل اشعار سے ظاہر ہوتا ہے۔

عمدۂ اہلِ سخن، میر محمد خاں وہ — اعظم الدولہ، سرورِ خیلِ امرا
تذکرہ ریختہ گویوں کا بطرزِ عمدہ — منتخب کر کے کلامِ شعرا اس نے لکھا
اور تاریخ کا اس منتخبِ عمدہ کی — حکم اس منتخبِ عمدۂ دوراں نے کیا
"عمدۂ منتخبہ" اس کی دو ہیں سیّد نے — لکھی تاریخ، وہی نام بھی اس کا رکھا

اس تاریخی نام اور منقولہ اشعار کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ تذکرہ ۱۲۱۶ھ/ ۲-۱۸۰۱ء میں یا اس سے کچھ پہلے مرتب ہو چکا تھا۔ نظام الدین خاں ممنونؔ کے مصرعے "یہ ہے معیارِ نقدِ سخن" اور ثناء اللہ فراقؔ کے مستخرجہ مادۂ تاریخ "سفینۂ اعظم" سے بھی جو علی الترتیب ۱۲۱۵ھ اور ۱۲۱۶ھ کی نشان دہی کرتے ہیں، اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔ لیکن سرورؔ کے بعض بیانات سے اندازہ ہوتا ہے کہ متن میں ترمیم و تنسیخ کا سلسلہ ابتدائی ترتیب کے اس زمانے سے کئی سال بعد تک جاری رہا ہے۔ مثلاً مکرم الدولہ بہادر بیگ خاں غالبؔ کے حالات اس جملے پر ختم ہوتے ہیں کہ:

"در سنہ یک ہزار و دو صد و ہژدہ ہجری (۱۲۱۸ھ) بہ آزار ..... درگذشت۔" (ص ۴۴۶)

میر ہدایت علی کیفیؔ کے متعلق لکھا گیا ہے کہ انھوں نے ۱۲۱۹ھ میں وفات پائی۔ (ص ۵۳۴)

ہدایت اللہ خاں ہدایتؔ کا سالِ وفات بھی ۱۲۱۹ھ ہی بتایا گیا ہے۔ (ص ۸۱۳) سنہ

مذکور کا تیسرا حوالہ "مجموعۂ نغز" کے مولف حکیم قدرت اللہ قاسم کے متعلق مندرجہ ذیل جملے میں ملتا ہے کہ

"در ینولاکہ ۱۲۱۹ ہجری است، بسببِ مطالعۂ ایں مجموعہ خود ہم ذوقِ تالیف نمودنِ تذکرہ پیدا کردہ۔ چنانچہ از مولفِ مسودہ را گرفتہ، انتخاب اشعار نمودہ تذکرہ تالیف کردہ است۔" (ص ۵۱۱)

ان داخلی شواہد کے علاوہ سیف الدولہ سید رضی خاں بہادر رضیؔ اور بھولا ناتھ عاشقؔ کی تاریخوں سے ۱۲۱۷ھ میں، قلندر بخش آفرینؔ کی تاریخ "مفتاح بوستانِ نعیم" سے ۱۲۱۸ھ میں اور عبدالرحمٰن خاں احسانؔ کے مصرعے "سرورِ دل شاعرانِ زماں" سے ۱۲۲۰ھ میں ترتیب و تکمیل کا پتا چلتا ہے۔ مرتبِ تذکرہ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی کے نزدیک اس سلسلے کی آخری شہادت خاتمے کی درج ذیل عبارت ہے، جو "عمدۂ منتخبہ" کے مذکورہ بالا تینوں نسخوں میں مشترک ہے۔

"الحمدللہ کہ بفضلِ ایزدِ متعال ایں نسخہ (بتاریخ) نہم محرم الحرام ۱۲۲۴ھ موافق سنہ (سویم) جلوس مبارک ..... محمد اکبر بادشاہ غازی خلد اللہ ملکہٗ وسلطانہٗ (و) افاض علی العالمین برہٗ واحسانہٗ صورتِ اختتام پذیرفت۔"

(ص ۸۳۴ و ۸۳۵)

ڈاکٹر صاحب کے خیال میں "اسے اتمامِ تذکرہ کی تاریخ سمجھنا چاہیے۔" (مقدمہ ص ۱۵) انھی امور کے پیشِ نظر اس سلسلے میں آخری فیصلہ دیتے ہوئے آپ نے ۱۲۱۵ھ (۱۸۰۰ء) یا ۱۲۱۶ھ (۱۸۰۱ء) کو آغازِ تالیف اور ۱۲۲۴ھ (۱۸۰۹ء) کو اختتامِ تذکرہ کی تاریخ قرار دیا ہے (مقدمہ ص ۱۸) لیکن خواجہ صاحب کا یہ فیصلہ درست نہیں کیونکہ تذکرے کے اسی نسخے میں میر فرزند علی موزوںؔ کے ذکر میں نہایت واضح طور پر اس کے بعد کے ایک سنہ کا حوالہ موجود ہے لکھتے ہیں کہ:

"در (ینولاکہ) سنہ یک ہزار و دو صد و بست و نہ ہجری است ....

.... بدارالبقا رحلت نمود۔" (ص ۶۵۲)

تذکرے میں ۱۲۲۹ھ (۱۸۱۴ء) کے بعد کا کوئی سنہ وضاحت کے ساتھ مذکور نہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہ سمجھنا چاہیے کہ یہ اضافہ و ترمیم کا آخری سال ہے۔ یہ سلسلہ اس کے بعد بھی کئی سال تک جاری رہا ہے۔ سطورِ ذیل میں پیش کردہ تفصیلات اس دعوے کی تائید کے لیے ثبوت فراہم کرتی ہیں۔

سرورؔ اپنے مجموعہ مثنویات "سبعہ سیارہ" کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ:

"چوں دریں ایام از تدوینِ طبع زادِ خود و تالیفِ تذکرۂ ریختہ گویان فراغ حاصل شد، چناں بخاطرِ فاتر خطور کردہ کہ اگر ہفت حکایاتِ منظومہ در بحور مختلف ..... موزوں شوند، یادگارے خواہد ماند"[1]

ذوقؔ کی کہی ہوئی تاریخ "دریائے اعظم" کی رو سے اس مجموعے کا سالِ تصنیف ۱۲۳۶ھ قرار پاتا ہے۔ مندرجہ بالا عبارت میں "دریں ایام" کا التزام اس بات کا پتا دیتا ہے کہ سرورؔ اسی زمانے میں تذکرے کی تالیف سے فارغ ہوئے ہوں گے۔

حکیم مومن خاں مومنؔ کس سنہ میں پیدا ہوئے، یہ بات باوثوق طور پر معلوم نہیں، تاہم محققین نے انھی کے بعض بیانات اور دوسری مختلف شہادتوں سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ان کی ولادت ۱۲۱۵ھ (۱۱-۱۸۱۰ء) میں ہوئی ہوگی[2]۔ سرورؔ نے انھیں نوجوانوں میں شمار کیا ہے، اس لیے بعید از امکان نہیں کہ ان کا حال بھی ۱۲۳۶ھ کے قریب ہی لکھا گیا ہو۔ یہ بات بہر صورت طے شدہ ہے کہ یہ اضافہ ۱۲۲۴ھ/۱۸۰۹ء کے بعد کیا گیا ہے۔

نواب الٰہی بخش خاں معروفؔ کے کلام میں دیوانِ غزلیات سے منقول اشعار کے علاوہ "تسبیح زمرد"[3] کے تتو مطلعے بھی شامل ہیں۔ (صفحات ۶۹۲ تا ۷۰۰) ذوقؔ کے

---

[1] بحوالہ ہفت روزہ "ہماری زبان" شمارہ یکم نومبر ۱۹۶۰ء

[2] تفصیل کے لیے دیکھیے: مومنؔ صفحات ۱۰ تا ۱۲

[3] یہ مجموعہ ایک سو ایک مطلعوں پر مشتمل ہے اور ہر مطلعے میں کسی نہ کسی عنوان سے سبزی کا مضمون نظم کیا گیا ہے۔ نام کے انتخاب میں یہی رعایت ملحوظ رکھی گئی ہے۔

مستخرجہ مادۂ تاریخ "طرفہ تسبیح زمرد آورد"[1] سے اس مجموعے کا سالِ تصنیف ۱۲۳۶ھ (۱۸۲۱ء) برآمد ہوتا ہے، لہٰذا معروف کا حال یا کم از کم یہ اشعار اس سنہ کے بعد ہی داخلِ تذکرہ کیے ہوں گے۔

شیخ پیر بخش مسرور کا کوروی کے بارے میں سرور کا بیان ہے:

"در سنہ بست و سہ جلوسی قبلۂ عالم ..... مرزا محمد اکبر شاہ غازی ..... ہنگام مراجعتِ مرشد زادۂ عالمیاں مرتبۂ ملازمی حاصل نمودہ۔"

(ص ۶۶۰)

اکبر شاہِ ثانی ۷ رمضان المبارک ۱۲۲۱ھ ہجری مطابق ۱۸ نومبر ۱۸۰۶ء کو شاہ عالم ثانی کے انتقال کے بعد اسی مہینے میں مسند نشینِ سلطنت ہوئے تھے۔ اس حساب سے ان کے جلوس کا تیئسواں[23] سال رمضان المبارک ۱۲۴۴ھ ہجری/مارچ ۱۸۲۹ء میں شروع ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں مسرور کا حال ۱۲۴۴ھ/۱۸۲۹ء کے بعد ہی لکھا گیا ہوگا۔

ان داخلی شہادتوں کے علاوہ ایک خارجی شہادت بھی زمانے کے تعین کی اس کوشش میں ہماری مدد کرتی ہے۔ مرزا غالبؔ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہؔ کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

"مرزا احمد بیگ خاں ابنِ ہادی بیگ خاں ..... ریختہ می گفت و تپاں تخلص می کرد ..... ہنگامے کہ من بکلکتہ بودم، چوں از من شنود کہ اعظم الدولہ نواب میر محمد خاں سرورؔ تخلص تذکرۂ ریختہ گویاں انشا می کند، جزوے از نتائجِ طبعِ خود بمن می دہد تا چوں بدہلی برسم، بنامہ گرد آور یعنی نواب میر محمد خاں سرورؔ بدہم۔ من ہم چناں می کنم و چوں اعظم الدولہ بدیدنِ من می آید، آں سفینہ پیش می کشم و پیام آشنا می گذارم[2]۔"

---

[1] دیوانِ ذوقؔ (مرتبہ شمس العلما مولانا محمد حسین آزاد) ص ۲۴۵

[2] پنج آہنگ۔ طبع ثانی، ص ص ۲۴۲ و ۲۴۳

غالبؔ ۴ر شعبان ۱۲۴۳ھ مطابق ۱۹ر فروری ۱۸۲۸ء کو کلکتے میں وارد ہوئے تھے اور وہاں سے یکم جمادی الثانیہ ۱۲۴۵ھ مطابق ۲۹ر نومبر ۱۸۲۹ء کو دہلی واپس پہنچے تھے[1]۔ ظاہر ہے کہ تپاںؔ کو انھوں نے تذکرۂ سرورؔ کے زیرِ ترتیب ہونے کی اطلاع شعبان ۱۲۴۳ھ (فروری ۱۸۲۸ء) میں یا اس کے بعد کسی وقت دی ہوگی اور ان کا کلام جمادی الثانیہ ۱۲۴۵ھ کے بعد تذکرے میں اندراج کے لیے سرورؔ کے حوالے کیا ہوگا۔ چوں کہ "عمدۂ منتخبہ" میں تپاںؔ کا ذکر موجود نہیں، اس لیے خیال ہوتا ہے کہ سرورؔ غالباً اس سے پہلے ہی تذکرے کو آخری شکل دے چکے تھے۔

ان شواہد کا ماحصل یہ ہے کہ اگرچہ "عمدۂ منتخبہ" کا نقشِ اول ۱۲۱۶ھ/۱۸۰۱ء کے قریب تیار ہو چکا تھا لیکن کم سے کم ۱۲۴۴ھ/۱۸۲۹ء تک اس کے متن میں وقتاً فوقتاً ضروری ترمیمیں اور اضافے کیے جاتے رہے ہیں۔

اس تذکرے کی ترتیب میں سرورؔ نے میر حسنؔ کے "تذکرۂ شعرائے اردو" اور مصحفیؔ کے "تذکرۂ ہندی" سے کافی استفادہ کیا ہے جس کا وہ جا بجا اعتراف بھی کرتے رہے ہیں۔ بعض بیانات اور غلطیوں کے اشتراک سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ خوب چند ذکاؔ کے تذکرۂ "عیار الشعرا" سے بھی خاصی مدد لی گئی ہے بلکہ اگر مشہور مستشرق ڈاکٹر اشپرنگر کے الفاظ میں یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ "عمدۂ منتخبہ عیار الشعرا کا ایک حد تک ترقی یافتہ ایڈیشن ہے"[2]۔ اس کے علاوہ میر تقی میرؔ[3]، قدرت اللہ قدرتؔ رام پوری[4]، غلام محی الدین مبتلاؔ میرٹھی[5] اور مرزا علی لطفؔ[6] کے

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیے: غالبؔ ــ احوال و آثار صفحات ۵۷ تا ۸۷

[2] فہرست کتب خانہ شاہانِ اودھ ص ۱۸۶

[3] ترجمہ میرؔ۔ ص ۵۵۴

[4] ذکر قدرتؔ ص ۵۱۷

[5] ذکر مبتلاؔ بہ تخلص عشقؔ۔ ص ۴۳۳ [6] ذکر لطفؔ۔ ص ۵۵۰

تذکروں سے بھی مولف نے اپنی واقفیت کا اظہار کیا ہے۔ ممکن ہے کہ ان سے بھی حسبِ ضرورت استفادہ کیا گیا ہو۔ دی تاسی کا خیال ہے کہ "یہ تذکرہ قاسم کے تذکرے کے بعد کا ہے اگرچہ سالِ تالیف وہی ہے مگر شیفتہ کے تذکرے سے پہلے لکھا گیا ہے اور شیفتہ نے اس سے اسی طرح استفادہ کیا ہے جس طرح سرور نے قاسم کے تذکرے سے"[1]۔ تذکرۂ قاسم کے بارے میں سرور کا بیان جو تعینِ زمانہ کی بحث کے ضمن میں گذشتہ سطور میں نقل کیا جا چکا ہے "مجموعہ نغز" کی اولیت اور "عمدۂ منتخبہ" پر اس کے اثرات کے متعلق فاضل مستشرق کے اس دعوے کی نفی کرتا ہے۔ علاوہ بریں قاسم کے کہے قطعۂ تاریخ سے بھی جو "عمدۂ منتخبہ" کے آخر میں شامل ہے، یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ تذکرہ ان کے تذکرے سے کئی سال قبل ۱۲۱۶ھ میں مکمل ہو چکا تھا۔ البتہ شیفتہ کے اکتسابِ فیض کے بارے میں ان کی رائے بالکل صحیح ہے۔ "گلشن بے خار" کے مرقعے صاف طور پر "عمدۂ منتخبہ" کے قائم کردہ خطوط کی پیروی کا پتا دیتے ہیں۔

جیسا کہ ابتدا میں عرض کیا جا چکا ہے سرور نے اس تذکرے میں زیادہ سے زیادہ شاعروں کو شریک کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں ممتاز و غیر ممتاز اور معروف و غیر معروف کی کوئی تخصیص نہیں اور نہ حالات کی کمیابی کی وجہ سے کسی شاعر کو نظر انداز کیا گیا ہے حتیٰ کہ بہت سے ایسے شعرا بھی اس بزم میں جلوہ افروز ہیں جن کے متعلق صاحبِ تذکرہ کا علم صرف تخلص سے واقفیت تک محدود ہے۔ شرکا کے دائرے کو اس عمومیت کے ساتھ وسیع کرنے کا نتیجہ یہ ہے کہ تذکرے کی ضخامت و جامعیت پر ایجاز و اختصار کا عنصر غالب آ گیا ہے اور ایسے شاعروں کو اکثریت حاصل ہو گئی ہے جن سے ابتدائی تعارف کے لیے بھی دوسرے ذرائع و وسائل اختیار کرنے کی ضرورت باقی رہتی ہے۔ یہ "عمدۂ منتخبہ" کا ایک نمایاں نقص ہے لیکن اس کے باوجود اس تذکرے میں ایسے شاعروں کی تعداد بہت سے دوسرے تذکروں کے مقابلے میں کہیں

---

[1] گارساں دتاسی کے تمہیدی خطبے۔ مرتبہ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی ص ۶۷

زیادہ ہے جن کے حالات قدرے تفصیل سے لکھے گئے ہیں۔ یہ مفصل اجزا زیرِ بحث شاعروں کے بارے میں جو معلومات فراہم کرتے ہیں اس کے سہارے ان کی زندگیوں کے مختلف مراحل سے آگاہ ہونے اور ان کی سیرت و شخصیت کی تعمیر میں کارفرما عوامل کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ انشا کے متعلق سرور کا یہ بیان اسی قسم کی ایک مثال پیش کرتا ہے:

"حکیم انشاءاللہ خاں خلف میر ماشاءاللہ خاں۔ اصلش از نجف اشرف. خود در مرشد آباد تولد یافتہ۔ از ابتدا عمدہ معاش ماندہ۔ در فنِ طبابت مہارتِ کلی دارد ..... در ایامے کہ بسرکارِ مرشد زادۂ آفاق میرزا سلیمان شکوہ بہادر در لکھنؤ ملازم بودہ، قصیدہ در تہنیتِ سال گرہ مرشد زادہ دام عمرہٗ (عزۂ) موزوں نمودہ۔ ہمہ پر از مضامینِ عالی است کہ مطلعش این است:

صبح دم میں نے جو لی بسترِ گل پر کروٹ
جنبشِ بادِ بہاری سے گئی نیند اُچٹ

ہنگامے کہ در اقتدارِ نواب ذوالفقار الدولہ مرحوم خان مذکور (میر ماشاءاللہ خاں) واردِ شاہجہاں آباد (شدہ بود) در مشاعرہ امین الدولہ معین الملک ناصر جنگ بہادر عرف مرزا میڈھو صاحب المتخلص بہ امیر خلف وزیر الممالک نواب شجاع الدولہ مغفور انشاءاللہ خاں با حکیم قدرت اللہ خاں قاسم و ثناءاللہ خاں فراق و میرزا عظیم بیگ عظیم و شیخ ولی اللہ محب کہ ہر چہار شخص سخن سنج و سخن داں و سخن فہم و سخن گوئے عصر خود اند، معارض وطرف شدہ بود و در مجلسِ مشاعرہ غزل ہائے تلاشیہ از جانبین بزبان عربی و فارسی و ترکی و ریختہ برائے امتحانِ طبائع بگفتار آمد ..... اکنوں در لکھنؤ با غلام ہمدانی مصحفی ..... (معارض شدہ) سقم در غزلیاتش برآوردہ بنا براں فی مابین ناخوشی کمال بمیاں آمد و بعد ردو بدل بسیار منجر بہ ہجو گوئی شد۔" (ص ص ۲۴ و ۲۵)

میر قمر الدین منت کے حالات بھی اس تذکرے میں کافی تفصیل کے ساتھ لکھے

گئے ہیں جن سے ان کی علمی استعداد، ادبی ذوق، امرا و روسا کے درباروں سے توسل، مختلف شہروں کی سیر و سیاحت اور مقام و زمانۂ وفات سے متعلق کافی باتیں معلوم ہو جاتی ہیں لکھتے ہیں:

"سید عالی نسب از قصبۂ سونی پت۔ خودش (بہ) دارالخلافہ شاہجہاں آباد نشو و نما یافتہ۔ بعد انفراغ تحصیل علوم عربی و فارسی دست بیعت بخدمتِ حضرت مولوی محمد فخرالدین صاحب قدس اللہ سرہ العزیز گشتہ واز جنابِ اوشانِ فوائدِ باطنی حصول نمودہ و یکے از خلفائے ایشان گشت ..... تصانیف بسیار در نظم و نثر از طبعِ وقادش بہ نہایت بلاغت و کمالِ قوتِ شاعری یادگارِ دہر ماندہ۔ مثنوی در جوابِ "سحر حلال" تصنیف مولانا اہلی شیرازی ..... بخوبی تصنیف ساختہ۔ ماسوائے ایں اقسام اشعار بکمالِ فصاحت از و موزوں گشتہ است۔ از نواب نظام الملک ناظم صوبۂ حیدرآباد پنج ہزار روپیہ نقد در صلۂ قصیدۂ تہنیت یافتہ۔ حد و حصرِ قابلیتِ او آں قدر نیست کہ بشرح و بسط در آید .....
از دارالخلافہ شاہجہاں آباد طرفِ دکن و پورب و کلکتہ سیر نمودہ آخرش در لکھنؤ رسیدہ استقامت اختیار کردہ و راجہ ٹکیٹ رائے کہ دیوان نواب وزیر الممالک مرحوم و سردارِ کثیر الاقتدار بود، بسببِ بزرگیٔ کمالات ایشان نزدِ خود داشتہ کفافے موافقِ اخراجاتِ ایشان معین گردانیدہ بود و بسیار اعزاز می کرد و معتقداً پیش می آمد۔ آخرش بہمراہیٔ راجہ موصوف باز بکلکتہ رسیدہ در ۱۲۰۸ھ سفرِ آخرت گزید و ہماں جا در مقامے کہ بکر بلا مشہور است، دفن یافت۔"

(ص ص ۵۸۵ و ۵۸۶)

مصحفی کے ذکر میں بھی یہی ہمہ گیری نظر آتی ہے۔ مولفِ تذکرہ کو انھیں بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تھا اور غالباً ان کی بعض تصانیف بھی نظر سے گذر چکی تھیں لکھتے ہیں کہ

"اصلش از قصبۂ امروہہ۔ بزرگانش در سرکارِ والا ملازم بودند۔ از ابتدائے

شباب در دارالخلافہ بودو باش اختیار کردہ ..... صاحبِ تصانیفِ بسیار است۔ یک دیوانِ فارسی و شش دیوانِ ریختہ موزوں نمودہ و دو رسالہ تذکرہ یکے فارسی و دویمی ہندی تالیف ساختہ۔ کلامش بسیار صحت محاورہ دارد۔ از مدتے بسمتِ لکھنؤ رفتہ ہمانجا اقامت گزیدہ، در سرکارِ مرشدزادۂ آفاق میرزا سلیمان شکوہ بہادر دام اقبالہٗ سلسلہ نوکری بصیغۂ شاعری درست نمودہ۔ اکثر قصائد در مدح مرشدزادہ بکمالِ قوتِ فہم وجودتِ طبع تصنیف کردہ .....
درایامے کہ مشارٌ الیہ در دارالخلافہ بود، مجلسِ مشاعرہ در خانہ اش منعقد می شد... ..... دراں وقت اورا راقم دیدہ است۔ بسیار خلیق و متواضع و کم گو بنظر رسیدہ۔"

(ص ص ۵۸۹ و ۵۹۰)

ہدایت اللہ خاں ہدایت کا ترجمہ ان تفصیلات پر مشتمل ہے:

"قومِ افغان، عموے ثناء اللہ خاں فراق۔ متوطنِ دارالخلافہ شاہجہاں آباد۔ مشاقِ قدیم و شاعرِ زبردست۔ شریک دورۂ میر و مرزا، مریدِ خواجہ میر درد صاحب قدس سرہٗ۔ مرد متواضع و متورع و خلیق۔ در فن ریختہ گوئی نہایت ماہر..... اوستادِ وقت خود بود۔ در سنہ یک ہزار و دو صد و نوزدہ ازیں دارِ فانی بعالمِ جاودانی انتقال نمودہ۔ خدایش بیامرزد۔ تصانیف بسیار مثلِ مثنوی و دیوان غزلیات و مراثی و سلام وغیرہ و قصائد موزوں نمودہ۔ اکثر اہلِ ایں فن دم از شاگردی او می زنند۔" (ص ۸۱۳)

یہ اقتباسات سوانح نگاری کے جو نمونے پیش کرتے ہیں وہ تذکرہ نویسی کے تقاضوں کے مطابق بڑی حد تک جامع اور مکمل ہیں۔ اگر شروع سے آخر تک تمام شاعروں کے حالات اسی تفصیل سے لکھے جاتے تو یقیناً "عمدۂ منتخبہ" ایک تذکرے کی بجائے مختصر تاریخِ ادب کی صورت اختیار کر لیتا لیکن اس وقت کی روایات اور محدود ذرائعِ معلومات نیز شعرا کی کثرتِ تعداد کے پیشِ نظر ایسا ممکن نہ تھا۔ اس لیے اس سلسلے میں سرور کو کوتاہ قلمی کا مرتکب قرار دینا بعید از انصاف ہوگا۔

ادبی خدمات کا جائزہ اور تصنیفی و تالیفی کارناموں کا تذکرہ بھی سوانح نگاری کا ایک جز ہے، چنانچہ سرور نے جہاں تفصیل سے کام لیا ہے، اس پہلو کو بھی بطورِ خاص مدِ نظر رکھا ہے۔ سطورِ بالا میں پیش کردہ اقتباسات کے مطالعے سے اگرچہ اس سلسلے میں ان کی کوششوں کا ایک خاکہ سامنے آجاتا ہے تاہم کچھ اور مثالیں پیش کر دینا بے محل نہ ہوگا۔ سعادت یار خاں رنگین کے حالات میں ان کے دو اوین غزلیات اور دوسری تصانیف کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"چہار دیوان بجودتِ طبع ترتیب دادہ۔ یکے قدیمی، دوم تمامی غزل در غزل مسلسل بقیدِ حروفِ تہجی از الف تا یا۔ سیومی بمحاورۂ (زناں)، چہارمی کہ دراں ہزلیات درج است مثلِ اشعارِ صاحبقراں تخلص کہ در لکھنؤ شخصے است ہزال۔ وراے ایں دیگر اقسامِ شعر مثل قصائد و مخمس و مسدس و رباعیات و قطعات و مثنوی و نامہ ہاے منظومہ موزوں کردہ و یک رسالہ مشتمل بہ نظم و نثر کہ اعتراضات بر جمیع شعراے وقت نمودہ و بہ "مجالسِ رنگین" موسوم کردہ، بقیدِ تحریر آوردہ۔ و در دیوان ہزلیات قصیدہ در مدحِ شیطان گفتہ۔ عوض بسم اللہ در آغاز اعوذ باللہ نوشتہ۔" (ص ۲۸۷)

میر قدرت اللہ قاسم کے ذکر میں ان کی تصانیف کی نوعیت و کیفیت پر بھی سرور نے اسی تفصیل کے ساتھ تبصرہ کیا ہے۔ خصوصاً ان کے تذکرے کی تالیف کے اسباب و محرکات اور زمانہ آغاز کے متعلق ان کا بیان بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ لکھتے ہیں:

"تصانیفش اکثر برجستہ و خوش مضمون و دل چسپ۔ دیوان ضخیمے ترتیب دادہ و ہمہ اقسامِ شعر مثلِ مثنوی و واسوخت و مناقب و مراثی و مخمس و مسدس و رباعی وغیرہ کہ در سلکِ نظم کشیدہ، پسندِ خاص و عام گشتہ۔ علی الخصوص حقائقِ معراجِ جناب رسالت مآب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم بفصاحت تمام در زبانِ ریختہ موزوں ساختہ۔ دیگر مثنوی عشقیہ حسب حال خود کہ از زبانِ سحر بیانش سر زدہ، تعریفش خارج از بیان است۔ دریں ولا کہ ۱۲۱۹ ہجری است،

بسببِ مطالعۂ ایں مجموعہ خود ہم ذوقِ تالیف نمودنِ تذکرہ پیدا کردہ۔ چنانچہ از مولف مسودہ را گرفتہ، انتخابِ اشعار نمودہ تذکرہ تالیف کردہ است۔" (ص ۵۱۱)

میر صاحب کے حالات میں ان کے ادبی و شعری کارناموں کے متعلق حسبِ ذیل معلومات فراہم کی گئی ہے:

"تصانیفش بسیار چنانچہ پنج دیوانِ ریختہ و یک دیوانِ فارسی و تالیف (کذا، یک) تذکرہ ریختہ گویان و اکثر مثنویات و مدحیات و ہجویات و مخمسات و واسوخت و مسدسات و ترجیع بند و مناقب و مرثیہ وغیرہ تصنیف نمودہ۔"

(ص ۵۵۴)

سیرت و شخصیت پر رائے زنی کے معاملے میں سرورؔ مصحفی سے متاثر ہیں۔ دونوں تذکرہ نگاروں کے اظہارِ خیال کا انداز تقریباً یکساں ہے۔ اسی انداز کے مختصر مگر جامع اور پر مغز جملے جن کے ذریعے مصحفی نے معاصرین و متقدمین کی شخصیتوں کے نقش ابھارے ہیں، "عمدۂ منتخبہ" میں بھی عام ہیں۔ سرورؔ کی تحریر کی دوسری اہم خصوصیت حفظِ مراتب کا خیال ہے۔ وہ ہر شخص کے لیے اس کے مقام اور مرتبے کی مناسبت سے الفاظ انتخاب کرتے ہیں تاکہ ان کے قطع کیے ہوئے پیراہن اندازِ قد کی شناخت میں حائل نہ ہوں۔ اس خصوصیت کی وضاحت کے لیے اولاً بعض ایسے اربابِ سخن کے متعلق ان کے بیانات نقل کیے جاتے ہیں جو اس وقت نوجوان تھے اور جنھیں میدانِ شاعری میں قدم رکھے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا۔ ملاحظہ ہوں:

خداوردی خاں بیتابؔ برادرِ اصغر سعادت یار خاں رنگینؔ:۔

"جوانیست سپاہی وضع، بسیار مودب و خلیق، یار باش و فہیم و کم گو۔"

(ص ۱۵۱)

سید سعید علی ذکیؔ:۔ "جوانیست قابل و مودب۔" (ص ۳۱۰)

مرزا داؤد بیگ زورؔ:۔ "جوانیست سپاہی وضع۔" (ص ۳۱۱)

دیوالی سنگھ سخنور :۔ "جوانے خلیق و مودب و کامل است۔" (ص ۳۵۰)

مہدی علی کوثر :۔ "جوانیست مہذب، اخلاقِ حمیدہ شرفائی (کذا) از جبہش ہویدا۔" (ص ۵۳۸)

ان لوگوں کے بعد وہ اہلِ فن آتے ہیں جو شاعری کی معراجِ کمال تک پہنچنے کے لیے بہت سی منزلیں طے کر چکے تھے۔ اگرچہ ان میں کچھ لوگ جوان العمر ہیں اور کچھ سن رسیدہ لیکن شاعرانہ مرتبے کے اعتبار سے کوئی کسی سے آگے نہیں۔ ان حضرات کا ذکر بالعموم اس انداز سے کیا گیا ہے:

صاحب میر عالم :۔ "مردِ سلیم الطبع و خوش گو و خلیق و متواضع و بکمال درویشی آراستہ و بر روش و طرزِ آباواجدادِ خود قائم و مستحکم۔" (ص ۱۰)

اسداللہ خاں اسد :۔ "جوانِ قابل و یار باش و دردمند۔ ہمیشہ بخوش معاشی بسر بردہ۔" (ص ۱۱۶)

صلاح الدین تمکین :۔ "شخصے فارغ از تعلقاتِ دنیا و از اختلاطِ اہلِ عالم نفور۔ با ہیچ کس سروکار نداشت۔" (ص ۱۶۴)

سعادت یار خاں رنگین :۔ "جوانے عشق مشرب۔ شخصے بامروت، در فنِ سپاہ گری بسیار ماہر، یار باش، متواضع۔" (ص ۲۸۶)

میر عزت اللہ عشق :۔ "جوانیست بلباسِ صلاح و تقویٰ آراستہ ..... و زیورِ حلم و حیا پیراستہ۔ شخصے حلیم و متواضع و مودب است۔" (ص ۴۲۷)

نظیر اکبر آبادی :۔ "بمعلم گری اوقات بسر می برد ..... بسیار خلیق و متواضع و خوش مزاج و سلیم الطبع است۔" (ص ۷۷۷)

ان ابھرتے ہوئے فن کاروں یا نسبتاً غیر اہم شاعروں کے مقابلے میں ان لوگوں پر جو اس وقت تک اساتذہ کی صف میں جگہ حاصل کر چکے تھے، زیادہ زورِ قلم صرف کیا گیا ہے اور ان کی شخصیات کے زیادہ سے زیادہ پہلوؤں کو روشنی میں

لانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ امرا و روسا بھی جنھوں نے شعروادب کی سرپرستی کے لیے اپنی دولت اور وقت سب کچھ وقف کر رکھا تھا' اسی توجۂ خاص کے مستحق قرار پائے ہیں۔ اس ضمن میں درج ذیل مثالیں بطور نمونہ پیش کی جا سکتی ہیں :

انشاءاللہ خاں انشاؔ کے متعلق جو دہلی اور لکھنؤ میں بڑے بڑے اساتذہ سے معرکہ آرائیوں کی بنا پر اس وقت تک ایک خاص حیثیت اور کافی شہرت حاصل کر چکے تھے، صاحبِ تذکرہ کا مشاہدہ ہے کہ

"بزعم خود در عقل و قوتِ شاعری، ہیچ یکے را در ریں فن ہم سر خود نمی داند۔ فی الواقع در قوتِ شاعری او حرفے نیست لیکن بسیار ہنگامہ آرا و شوخ طبع است۔"

(ص ۲۵)

شاہ حاتم کے حال میں ان کی درویش منشی، نیک مزاجی اور استغنا پسندی کی نسبت سرورؔ نے اپنے تاثرات ان الفاظ میں سپردِ قلم کیے ہیں :

"مردِ درویش وضع، پاک طینت، مرتاضِ وقت، از قیدِ علائق واستہ و تعلقاتِ دنیاے فانی را پشت پا زدہ ..... سعی و تلاش را کہ لازمۂ اہلِ دنیاست خیر باد گفتہ بر مسندِ توکل نشست ..... خواص و عوام بہرہ یاب و فیض اندوز از انفاسِ متبرکۂ ایشان می شدند۔" (ص ۲۰۹)

خواجہ میر دردؔ کے ذکر میں ان کی جامع الکمالات اور ہمہ گیر شخصیت کا خاکا ان الفاظ میں پیش کیا گیا ہے :

"صاحبِ مقاماتِ عالیہ، جامعِ کمالاتِ باطنیہ و ظاہریہ، رونق افزاے وادیٔ مجاہدت، آشناے بحرِ زخارِ معرفت، عالم متبحر علم وحدت، سجادہ نشینِ چار بالش فقر و افتقار، تمکن گزینِ وسادۂ فخر و افتخار۔" (ص ۲۵۳)

مہدی علی خاں عاشقؔ آج شاعر کی حیثیت سے غیر معروف ہیں لیکن اس زمانے میں وہ اپنی ادب نوازی کی بنا پر فن کاروں کی صف میں ایک اہم مقام پر متمکن تھے۔ سرورؔ ان کی خاندانی وجاہت، اخلاق و عادات اور فراست و فرزانگی

کا تذکرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"شخصے از خاندانِ بزرگ بہ اخلاقِ حمیدہ موصوف و بخوش خلقی مشہور و معروف۔ با ہر کس اخلاق و محبت مرعی داشت۔ مردِ عاقل و دانا و شاعر و متواضع و مودب و حلیم بود۔" (ص ص ۴۳۱ و ۴۳۲)

اپنے دور کے ممتاز شاعر اور مشہور عالم و عارف مرزا مظہرؔ جانِ جاناں کے بارے میں فاضل مولف کا بیان ہے کہ

"تعریف و توصیفِ فراست و دانائی و رسائیِ ذہن و ذکاے ..... و علم و فضل و خوش تقریری و شعر فہمی او بیرون از تحریر است۔ الحق کہ مثلش در فصاحت و محاورہ دانی بالفعل پیدا نیست۔ کمالاتِ درویشی و صفاتِ زاویہ نشینی و توکل بہ اقصیٰ غایت داشت ..... اکثر سکنہ شہر از فیضِ باطنیٔ او مستفید و بہرہ مند بودند۔" (ص۔ ۵۵۲)

اس قسم کی مثالیں سرورؔ کے یہاں نادر و نایاب نہیں لیکن کمیاب ضرور ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جب تک کسی شاعر کو قریب سے دیکھنے کا اتفاق نہ ہوا ہو، یا اس کی سیرت و شخصیت کے متعلق لب کشائی ایک غیر ذمہ دارانہ اقدام کے مترادف ہے۔ تنقیدِ اشعار بھی اسی محتاط رویے کا مطالبہ کرتی ہے۔ یہاں بھی کلام کے براہ راست اور غائر مطالعے کے پہلو بہ پہلو شاعر کے علمی پس منظر اور ذہنی و فکری ارتقا کا علم حاصل کیے بغیر کسی قطعی اور ذمہ دارانہ رائے کا اظہار ممکن نہیں۔ اس کے برخلاف ایسی صورت میں جب کہ بیشتر شعرا کا کلام عام طور پر دستیاب نہ ہو یا محض چند اشعار تک محدود ہو، دوسرے ارباب قلم کے بیانات پر اعتماد کرتے ہوئے یا اس زمانے کی عام شعری روایات اور رجحانات کو نظر میں رکھ کر صرف مجمل تبصرے ہی سے کام لیا جا سکتا ہے اس لیے تذکرہ نگاروں کی روشِ عام کے مطابق سرورؔ کے ہاں بھی بالعموم اس قسم کے جملے ملتے ہیں۔

ا۔ "زبان و بیانش بطورِ بطرزِ پیشینیان است۔" (شہاب الدین ثاقبؔ ص ۱۷۰ و خاص ص ۲۵۲)

۲۔ "اشعارش/کلامش/شعرش خالی از کیفیت نیست۔" (اسیر ص ۹۹، زکی ص ۳۱۲، بہاری لال عزیز ص ۴۳۹، ہمت رام پوری ص ۸۲۱)

۳۔ "کلامش مطبوع است۔" (مرزا مچھو بیگ تسمل ص ۱۳۶، شائق بریلوی ص ۳۷۲، فضل لکھنوی ص ۴۸۱)

۴۔ "کلامش عاشقانہ است۔" (قدرت اللہ شوق ص ۳۷۶، میر صادق علی صفدری ص ۳۹۶، مجنوں عظیم آبادی ص ۷۱۰، نزہت ص ۷۸۰)

۵۔ "طرز/مضمونِ کلامش دل چسپ است۔" (راجہ رام ناتھ ذرہ ص ۲۷۰، مرزا علی شوکت ص ۳۷۵، امام الدین منتظر و محترم علی خاں محترم ص ۷۳۲)

۶۔ "در کلامش شوخیٔ طبع مفہوم می گردد۔" (اکبر شاگردِ حاتم ص ۹۷، اکبر علی اختر شاگردِ جرأت ص ۹۸)

۷۔ "کلامش صوفیانہ است۔" امام بخش تھانیسری ص ۱۲۷ و غلام مرتضیٰ جنوں ص ۱۸۸)

۸۔ "سخنش درد آلود و عاشقانہ است۔" (مرزا تقی خان بہادر ترقی ص ۱۶۸ و میر متقی متقی ص ۷۱۵)

۹۔ "کلامش رنگین و عاشقانہ و درد آلود۔" (غلام حسین شکیبا ص ۳۸۰)

۱۰۔ "کلامش رنگین و سخنش دل چسپ است۔" (کاظم حسین بیقرار ص ۱۴۸)

۱۱۔ "زبان و بیانش موافق رویۂ آں نواح است۔" (احمد گجراتی ص ۱۰۹)

طرزِ کلام اور زبان و بیان کے بارے میں یہ رائیں جن شاعروں کے تراجم سے ماخوذ ہیں ان میں سے بیشتر غیر معروف و غیر اہم ہیں۔ ممتاز و مستند فن کار اور اساتذہ اس عمومی اندازِ تنقید سے مستثنیٰ رہے ہیں۔ خصوصاً صاحبِ تذکرہ کو جن لوگوں کے کلام کے تفصیلی مطالعے اور ان کے فکر و فن پر مختلف زاویوں سے غور و فکر کا موقع ملا ہے، ان کی شاعری کے متعلق ان کی رائیں بڑی صائب اور فیصلہ کن ہیں مثال کے طور پر جس وقت "عمدہ منتخبہ" لکھا جا رہا تھا، مرزا غالب کی شاعری اپنی ابتدائی منزل میں تھی۔ اس دور میں وہ "رنگِ بہار ایجادیٔ بیدل" سے بے حد متاثر تھے اور

فکر آزما اور سنگلاخ زمینوں میں طبع آزمائی اور نازک خیالی و پیچیدہ بیانی کا رجحان ان کے ذہن رسا اور خلاق طبیعت پر پوری طرح حاوی تھا۔ "نکتہ سرائی" کی اس "ادائے خاص" پر سرور نے ان الفاظ میں تبصرہ کیا ہے:

"در فن سخن سنجی متبع محاوراتِ میرزا عبدالقادر بیدل علیہ الرحمہ و ریختہ در محاوراتِ فارسی موزوں می کند با جملہ موجدِ طرزِ خود است ..... اکثر اشعارش از زمینِ سنگلاخ بمضامینِ نازک موزوں گشتہ۔ رویۂ خیال بندی بیش از بیش پیش نہادِ خاطر دارد۔" (ص ۱۱۶)

غالب کے ابتدائی کلام اور رنگِ سخن کے بارے میں اس پہلی رائے کی صحت و صداقت آج بھی مسلم و معتبر ہے اور یہ تذکرہ نگار کی ناقدانہ بصیرت اور اصابتِ فکر و نظر کا ایک واضح ثبوت ہے۔

میر حسن کے حال میں ان کی مثنوی "سحر البیان" کی پسندیدگی و مقبولیت اور مثنوی نگاری کے فن میں ان کے امتیازِ خاص کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مثنوئ بے نظیر و بدرِ منیر کہ بفصاحتِ تمام موزوں ساختہ و مقبولِ طبائعِ خاص و عام گشتہ، الحق کہ نہایت دل کش و دل چسپ است در فنِ خویش قادر (کذا = نادر) زمانہ بود۔" (ص ۲۱۳)

خواجہ میر درد کے کلام کے بارے میں ان کی یہ رائے ہے:

"اشعارِ گوہر نثارش نہایت پر کیف۔ صحتِ محاورہ چنداں کہ باید در کلامش مندرج است و سخنانش چاشنئ فصاحت دارد۔ اکثر اشعار ناخن زنِ دل ہاست۔" (ص ص ۲۵۴ و ۲۵۵)

قائم چاندپوری کو بعض تذکرہ نگاروں نے میرزا رفیع سودا کا ہم رتبہ و ہم پایہ قرار دیا ہے اور بعض اس رائے کو مبالغے اور تحسینِ بے جا پر محمول کرتے ہیں۔ سرور پہلے گروہ کے ہم نوا ہیں، چنانچہ ان کا بیان ہے کہ

"آں قدر محاورہ در ریختہ گوئی بہم رسانید کہ دوش بدوشِ استادِ خود شد و

قدم بقدمِ میرزا نہاد۔ در ۔۔۔۔۔۔ الفاظ و مضامینِ دل کش و طرز بندی ترجیح بر دیگراں دارد و اکثر مثنویات و مقطعات و مدحیات و ہجویات و رباعیات وغیرہ بفصاحتِ تمام تصنیف نمودہ۔ تعریفِ اشعارش ہر قدر کہ بریں صفحہ ثبت نمایدگنجائش دارد۔ از غزلیاتِ دل چسپ دیوانش مملوست۔" (ص ۴۹۸)

میرؔ کے ذکر میں ان کی شاعری کی مجموعی کیفیت اور اس کے امتیازی اوصاف پر رائے زنی کرتے ہوئے آخر میں میرزا سوداؔ سے ان کا مقابلہ و موازنہ کیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ

"مہارتے تمام در فصیح گوئی و فنونِ شاعری دارد ۔۔۔۔۔۔ وضع دردیہ (کذا = وردیہ) شاعری بہ نہجے کہ دارد، کسے را میسر (نہ) شدہ است۔ بسیار عزیزان تلاشِ تتبع زبانِ او کردند، لیکن بہ آں نرسیدند۔ فی الواقع مرتبۂ شاعری او دریں زمانہ بسا بلند است و پایۂ او دریں فن کم از رفیع السودا نیست، بلکہ در غزل گوئی رجحان (کذا = رجحان) دارد۔" (ص ۵۵۳)

ولیؔ کی خصوصیات کلام کا تجزیہ ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

"زبان و بیانش موافق محاورہ و گفتگوے آن عہد است و اشعارش بر زبانِ خلق جاری۔ اکثر مضمونِ کلامش بسیار دل چسپ لیکن بندش و روزمرہ سخنش بالفعل رائج نیست۔" (ص ۸۰۱)

انشاؔ کے دہلوی حریف مرزا عظیم بیگ عظیمؔ کے کلام کی نمایاں خصوصیات اور قصائد کی خاص کیفیت کا تجزیہ ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

"در غزلیات و قصائد تلاشِ تتبعِ میرزا رفیع السودا منظور می داشتہ الحق کہ معانی باریک و مضامینِ نازک در اشعار مندرج می کرد ۔۔۔۔۔۔ استادِ زبان آور و خوش فکر زمانِ خود بود۔ قصائد کہ در حمد و نعت و منقبت از طبعِ رسا اے او موزون شدہ، پہلو بقصائدِ میرزا رفیع السودا می زند۔" (ص ص ۴۱۶ و ۴۱۷)

مختلف شاعروں کے رنگِ سخن، زبان اور اسلوبِ بیان کی نوعیت اور کسی خاص صنف میں ان کے کمال کے متعلق یہ اشارات اس قدر واضح اور پر از معلومات

ہیں کہ ان کی روشنی میں بہ آسانی ان کے ادبی مرتبے کا تعین کیا جا سکتا ہے۔ اس زمانے کے ماحول اور روایات کو دیکھتے ہوئے یہ اندازِ تنقید ایک امتیازی حیثیت کا حامل ہے اور تذکرہ نگاری کے تقاضوں سے سرورؔ کی باخبری نیز ان کی تکمیل کے لیے عملی اقدام کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔

"عمدۂ منتخبہ" کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس کے صفحات میں اس دور کی ادبی سرگرمیوں کے متعلق معلومات کا کافی ذخیرہ محفوظ ہے۔ مہدی علی خاں عاشقؔ کے مشاعرے کا ذکر بار بار آتا ہے۔ یہ محفل سخن اپنے مقررہ وقت پر نہایت اہتمام اور باقاعدگی کے ساتھ منعقد ہوتی تھی[۵۱] اور شعرا کی ایک کثیر تعداد پابندی کے ساتھ اس میں شرکت کرتی تھی۔ مصحفیؔ نے بھی دہلی کے زمانۂ سکونت میں اپنی قیام گاہ پر اسی قسم کی ایک محفل کا اہتمام کیا تھا[۵۲]۔ مرزا اسد بیگ رفیقؔ[۵۳]، سجاد اکبر آبادی[۵۴] اور راجہ شنکر ناتھ بہادر صباؔ[۵۵] کے حالات میں بھی ان کے مکانات پر مشاعروں کے انعقاد کا ذکر آیا ہے۔ ان کے ساتھ ہی ایک فرنگی نژاد شاعر مظفر الدولہ ممتاز الملک نواب ظفر یاب خاں بہادر نصرت جنگ متخلص بہ صاحبؔ خلف شمر و صاحب کے ہاں دہلی کے تمام شاعروں کے اجتماع اور شعر خوانی کا بھی پتا چلتا ہے[۵۶]۔ نواب آصف الدولہ کے

---

۵۱ "درخانہ اش مجلسِ مشاعرہ تا مدت دو سال بلاناغہ روزِ جمعہ منعقد می شد۔ تمام موزوں طبعانِ شہر شریکِ محفلِ مسطور می گشتند۔" (ذکر عاشقؔ ص ۴۳۲)

۵۲ "در ایامے کہ مشارٌ الیہ در دار الخلافہ بود، مجلسِ مشاعرہ درخانہ اش منعقد می شد۔" (ذکر مصحفیؔ ص ۵۹)

۵۳ "مجلس مشاعرہ در خانۂ مشارٌ الیہ ہم منعقد می گردید۔" (رفیقؔ ص ۲۹۸)

۵۴ "در ایامے کہ واردِ دار الخلافہ گشتہ، مجلسِ مشاعرہ بخانۂ خود منعقد می کرد۔" (سجاد اکبر آبادی ص ۳۵۲)

۵۵ "بخانۂ خود مجلسِ مشاعرہ منعقد می کرد۔" (صباؔ ص ۳۹۷)

۵۶ "در ایامے کہ واردِ دار الخلافہ بود، مجلسِ مشاعرہ درخانہ منعقد می نمود ..... آنجا (کذا = اجتماع) ہمہ شعرائے شاہجہاں آباد روزِ مشاعرہ درخانہ اش می شد۔" (صاحبؔ ص ۳۹۴)

چھوٹے بھائی میرزا مینڈو اسیر کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ

"درایام تشریف داشتن (بہ) شاہجہاں آباد پیش از ہنگامۂ غلام قادر نمک حرام طرحِ مشاعرہ درخانۂ خود انداختہ بود۔ ہمہ شعرائے ایں جا بمجلس مشاعرہ جمع می شدند۔" (ص ۶)

اسی زمانہ میں مکرم الدولہ بہادر بیگ خاں غالب جنگ متخلص بہ غالبؔ کے ہاں بھی ایک مشاعرہ ہوتا تھا جس کی نمایاں خصوصیت یہ بیان کی گئی ہے کہ

"بہ اقسام اغذیہ ضیافتِ شاعران می نمود و شب بہ تماشائے رقصِ ماہ رویان مع حاضرین محفل بسر می برد۔" (ص ۴۴۶)

مشاعروں کے رواج اور عام مقبولیت کے متعلق اس معلومات کے پہلو بہ پہلو سرورؔ کے بعض بیانات سے نوابین و امرا کی شعر و ادب سے دل چسپی، ان کے درباروں میں شعرا کی قدر و منزلت اور فیاضی و سیر چشمی کے ساتھ سرپرستی و قدر دانی کے بارے میں بھی بہت سی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ اودھ کے سخن سنج و سخن شناس اور فراخ دل حکمراں نواب آصف الدولہ کے حال میں لکھتے ہیں:

"پرداخت و مراعاتِ شعرا منظورِ نظرِ عاطفت اثر داشت۔ چنانچہ میر محمد تقی متخلص بہ میرؔ کہ در فنِ ریختہ گوئی سرآمد شعرائے وقت است، بصیغۂ شاعری دو صد روپیہ در ماہہ را ملازم بود۔" (ص ۵)

مرشد زادہ آفاق مرزا سلیمان شکوہ کے متعلق رقم طراز ہیں:

"چوں طبیعتِ عالی اکثر بشعر و شاعری میلان دارد، از شعرائے سرآمدِ زمان مثلِ انشاء اللہ خاں انشاؔ و غلام ہمدانی مصحفیؔ و قلندر بخش جرأتؔ و سعادت یار خاں رنگینؔ و شیخ ولی اللہ محبؔ وغیرہ در سرکارِ فیض آثارش رتبۂ ملازمی داشتند و مجلسِ مشاعرہ منعقد می شد۔ طبعِ وقارش بسیار رسا و عالی فکر و مضامین یاب و معنی فہم و قدر دانِ ہنر وران ایں فن است۔" (ص ۳۱۳)

اردو شاعری کی یہ مقبولیت و محبوبیت شمالی ہند ہی تک محدود نہ تھی۔ اس کا

جادو دکن کی اس سرزمین پر بھی چل رہا تھا جہاں اس نے اپنی نشوونما اور ترقی کے ابتدائی مراحل طے کیے تھے۔ وہاں بھی آصف جاہی دربار اور امرا و اعیانِ سلطنت کی سرکاروں میں شعرا کی پذیرائی اور قدر و منزلت کا وہی عالم تھا جس کے مظاہر سے دہلی اور اودھ کی سلطنتوں اور دیوڑھیوں کی تاریخ روشن ہے۔ منشی علی رضا مرہون کے ذکر میں ان کے سفرِ حیدرآباد اور حصولِ ملازمت کے متعلق سرور کا یہ بیان اسی طرف اشارہ کرتا ہے۔ لکھتے ہیں:

"از چندے در حیدرآباد رفتہ بصیغۂ شاعری در سرکارِ نظام الملک بدہ ماہۂ دو صد روپیہ ملازم گشتہ۔" (ص ۱۱۷)

حاکمانہ برتری کے لحاظ، معاشرتی آداب کی پاسداری اور تہذیبی روایات کے احترام سے کہیں زیادہ یہ اسی قدردانی اور فیض رسانی کا نتیجہ ہے کہ ان نوابوں اور بادشاہوں کے نام آتے ہی ہر تذکرہ نگار انتہائے عقیدت و ارادت سے اپنا سر جھکا دیتا ہے اور زبان قلم مودب ہو کر تحسین و آفریں کے پھول نچھاور کرنے لگتی ہے۔ سرور بھی اس کلیے سے مستثنیٰ نہیں۔ چنانچہ ان کی مندرجہ ذیل تحریریں جو اپنے مزاج اور رنگ و آہنگ کے اعتبار سے ان کی دوسری تحریروں سے بالکل مختلف ہیں، اسی ضمن میں آتی ہیں:

شاہ عالم آفتاب:۔

"شاہ گیتی پناہ، جم جاہ فریدوں فر، دارا مرتبت، کیخسرو شکوہ، سکندر منزلت، خدیو دوراں، خلیفۂ زماں، شہنشاہِ سلیماں مکاں، داورِ دادگر، صاحبقراں جلال الدین لقب، قبلۂ امانی و آمال، سرچشمۂ جود و نوال، ابوالمظفر مجاہد الدین، شاہ عالم بادشاہ غازی ..... آوازۂ سخاوتش شرق و غربِ عالم را فرا گرفتہ و شورِ شجاعتش زلزلہ در دلِ رستم مزاجان انداختہ۔ ذات فائض البرکاتش قدسی صفاتش باعثِ امن و آرائشِ جہاں و جہانیاں، وجودِ مسعودِ میمنت آمودش سببِ فلاح و رفاہِ زمان و زمانیاں ..... عالمے از خوانِ احسانش

بہ نعمت ہائے گوناگوں متلذذ و بہرہ یاب و خلقے از دولت بے زوالش بحصولِ انواع تیمنات مستفید و کامیاب۔" (ص ۲)

مرزا سلیمان شکوہ :۔

"مرشد زادۂ آفاق، قرۂ باصرۂ سلطنت، مہر درخشانِ آسمان خلافت، درۃ التاجِ شہریاری، اختر برجِ سعادت و کامگاری، فرزندۂ لوائے کشورستانی، طرازندۂ بساطِ ابہت و کامرانی، جوہرِ شمشیرِ حشمت و اقبال، رکنِ رکینِ ایوانِ جاہ و جلال، مربع نشینِ مسندِ جہاں داری، وارث تاج و تختِ شہریاری، بلند فطرت، عالی وقار، گرامی نسب والاتبار، میرزا سلیمان شکوہ بہادر دام اقبالہٗ وزید اجلالہٗ۔" (ص ص ۳۱۲ و ۳۱۳)

محمد اکبر بادشاہِ غازی :۔

"بادشاہ جم جاہ، گیتی پناہ، فریدون سپاہ، دارا مرتبت، سلیمان شوکت، کیخسرو منزلت، سکندر حشمت، غریب نواز، ظلم گداز، رعیت پرور، عدل گستر، عطا فرمائے زر و گوہر، دریا دل، در ہر فن کامل، واقفِ اسرارِ آسمانی، کشافِ رموزِ نہانی، اورنگ آرائے سریرِ سلطنت، رونق بخشِ دیہیم ابہت و مملکت، ہزبر میدانِ وغا، دریائے صفحۂ سخا، مقبول بارگاہِ یزدانی، منظورِ انظارِ سبحانی، ظل اللہ محمد اکبر بادشاہ غازی خلد اللہ ملکہٗ و سلطانہٗ (و) افاض علی العالمین برہٗ واحسانہٗ۔" (ص ص ۸۳۴ و ۸۳۵)

ایک ایسے دور میں جب کہ سلطنت مغلیہ کی حالت ناگفتہ بہ تھی، بابر و تیمور کی عظمت اور اکبر و جہانگیر کے جاہ و جلال کا چراغ آخری سانسیں لے رہا تھا اور سلاطین دہلی کے اختیارات روز بروز محدود سے محدود تر ہوتے جا رہے تھے، ان اعیانِ مملکت کے ناموں کے ساتھ توصیفی کلمات کی اس طلسم بندی اور پرشکوہ الفاظ کی صف آرائی کو حسن عقیدت کے مظاہرے کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے لیکن عقیدت کے اس اظہار میں تصنع اور تملق سے زیادہ پرخلوص نیازمندی

اور احسان شناسی کا جذبہ کارفرما ہے۔

انتخابِ کلام کے سلسلے میں سرورؔ نے صرف غزلوں کے اشعار پر اکتفا نہ کرتے ہوئے حسبِ موقع دوسری اصنافِ سخن کے نمونے بھی پیش کیے ہیں۔ حتیٰ کہ مزید کلام دستیاب نہ ہونے کی صورت میں انھوں نے کسی تاریخی قطعے کے اشعار نقل کر دینے میں بھی تامل نہیں کیا ہے۔ رباعیاں عام طور پر اور بکثرت نقل ہوئی ہیں۔ مسلسل قطعات اور قصائد سے ماخوذ نمونہ ہائے کلام کی بھی کمی نہیں۔ مرزا عظیم بیگ عظیمؔ دہلوی کے منتخب کلام میں "رباعی در مدح مرشدِ خود حضرت خواجہ میر دردؔ" کے ساتھ ہی وہ مشہور ہجویہ مخمس بھی شامل ہے جس میں انشاؔ کی شخصیت اور شاعری کا مضحکہ اڑایا گیا ہے۔ تذکروں کے صفحات پر اشعار کا یہ تنوع اور کلام کی رنگارنگی شاذ و نادر ہی نظر آتی ہے۔

یہ ضخیم تذکرہ جہاں بہت سی خوبیوں کا حامل ہے وہیں اس میں کچھ خامیاں بھی نظر آتی ہیں۔ یہ خامیاں زیادہ تر اعادہ و تکرار اور اشعار کے غلط انتساب کی مثالوں اور بعض شاعروں کے حالات کے غیر معمولی اختصار یا ان کی طرف حسبِ ضرورت توجہ کی کمی کی صورت میں رونما ہوئی ہیں۔ سرورؔ نے جا بجا میر حسنؔ کے "تذکرہ شعرائے اردو" کا حوالہ دیا ہے لیکن یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ وہ بہت سے ایسے شاعروں کے حالات سے بے خبر رہے ہیں جن کے متعلق میر حسنؔ کے ہاں ابتدائی قسم کی تمام ضروری تفصیلات موجود ہیں۔ مثلاً

(الف) امیر خاں انجامؔ کے بارے میں لکھتے ہیں:

"امیر خاں بہادر خلف نواب بقاء اللہ خاں، برادر زادۂ نواب عمدۃ الملک مرحوم کہ خانِ عالم خطاب داشت" (ص ۲۳)

میر حسنؔ نے ان کا حال ساڑھے چار سطروں میں لکھا ہے جس میں ان کی لطیفہ گوئی، درباری اعزاز اور شہادت کے واقعے پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

(ب) میر فتح علی شیداؔ کا تعارف ان الفاظ میں محدود ہے:

"شیدا تخلص، مولدش قصبہ مئو شاگردِ محمد رفیع السودا۔ یک شعر از تصانیفش مسموع گشتہ۔" (ص ۳۷۲)

سرور شیدا کے نام سے بھی ناواقف معلوم ہوتے ہیں جب کہ میر حسن نے ان کے نام وطن اور شاگردی کے متعلق صراحت کے پہلو بہ پہلو ان کے اخلاق و عادات، افتادِ طبع اور کلام کے بارے میں بھی اظہارِ خیال کیا ہے اور دو شعر نقل کیے ہیں جو "عمدۂ منتخبہ" میں موجود نہیں۔

(ج) میر علی نقی کافر کے بارے میں لکھتے ہیں:

"میر علی تقی نام دارد۔ مطلقاً راقم از احوالش مطلع نیست۔" (ص ۵۲۴)

میر حسن کے ہاں ان کا ذکر کسی قدر مفصل ہے۔ نام کے اختلاف کو سہوِ کتابت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

(د) محسن اکبر آبادی کے متعلق لکھتے ہیں کہ

"میر محسن برادر زادۂ میر محمد تقی میر۔ زیادہ احوالش معلوم راقم نیست۔" (ص ۷۱۳)

میر حسن نے ان کے مبلغ علم، وطن، خان آرزو سے قرابتِ قریبہ اور اکتسابِ فیض، ملکۂ شعر گوئی، نواب سالار جنگ کی سرکار سے وابستگی اور آخر عمر میں شاعری سے بے تعلقی کا ذکر کرنے کے بعد گیارہ شعر نقل کیے ہیں۔ "عمدۂ منتخبہ" میں اشعار کی تعداد صرف سات ہے، جن میں سے دو شعر "تذکرہ شعرائے اردو" میں منقول نہیں۔

(ہ) مدہوش کے بارے میں سرور کا بیان ہے کہ

"شاگردِ میر سوز مرحوم۔ از نام و نشانش واقفیت نیست۔ یک شعر ازو بہم رسیدہ، ثبت می گردد۔" (ص ۷۱۹)

میر حسن کی تحریر کے مطابق مدہوش کا نام میر نبی جان تھا۔ وہ ایک خوش رو اور نیک خو جوان تھے اور کبھی کبھی شعر کہہ لیا کرتے تھے۔

(و) سراج اورنگ آبادی کو بارھویں صدی ہجری کے اردو شاعروں میں

ایک ممتاز حیثیت حاصل ہے لیکن سرورؔ ان کے نام اور حالات سے بالکل نابلد ہیں۔ لکھتے ہیں:

"شاعرِ ہم عصرِ میاں آبرو است، از سکنائے اورنگ آباد۔ از نامش واقفیت نیست۔" (ص ۳۵۴)

صاحبِ تذکرہ کی کم اعتنائی سے متاثر شعرا کے اس زمرے میں کچھ ایسے معروف فن کار بھی شامل ہیں جو خود انھی کے زمانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر خواجہ حیدر علی آتشؔ، شیخ امام بخش ناسخؔ، حکیم مومن خاں مومنؔ اور نواب الٰہی بخش خاں معروفؔ کے متعلق جو اس وقت تک کافی شہرت حاصل کر چکے تھے، ضروری معلومات کی فراہمی زیادہ دشوار نہ تھی۔ لیکن سرورؔ نے اس ضرورت کا احساس نہ کرتے ہوئے صرف سرسری قسم کے چند جملوں پر اکتفا کیا ہے۔ آتشؔ کے بارے میں لکھتے ہیں:

"اسمش خواجہ حیدر علی خاں (کذا) ساکن بلدۂ لکھنؤ، شاگردِ غلام ہمدانی مصحفی در شعر گوئی اکثر مضامینِ نازک از طبعش می تراود۔" (ص ۱۰۴)

ناسخؔ کے کئی شاگردوں کے تراجم کافی مفصل ہیں لیکن استاد کے تعارف کے لیے صرف ان گنے چنے الفاظ کو کافی سمجھا گیا ہے:

"شیخ امام بخش شخصے است باشندۂ لکھنؤ۔ سلیقۂ شعر گوئی بطرزِ خوب بدستش افتادہ لہذا اشعارش دل کشِ سامعان است۔" (ص ۷۸۲)

مومنؔ کا تعارف آتشؔ و ناسخؔ کے مقابلے میں کسی قدر مفصل ہے اس کے باوجود اسے مکمل اور ان کی شخصیت کے شایانِ شان نہیں کہا جا سکتا ہے۔ لکھتے ہیں:

"حافظ محمد مومن، نوجوانیست ہمت بر تحصیلِ کتب عربی مصروف دارد۔ اصلش از خطۂ کشمیر۔ مولدش دار الخلافۂ شاہجہاں آباد۔ اجدادش بعزت و بزرگی بسر بردند۔ رویۂ شعر گوئیس بسیار مطبوع، شخصِ بسیار خلیق است۔" (ص ۶۵۱)

نواب الٰہی بخش خاں معروفؔ سے فاضل تذکرہ نگار کے ذاتی تعلقات تھے،

جن سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان کے کلام کے انتخاب میں انھوں نے بڑی فراخ دلی کا مظاہرہ کیا ہے لیکن حالاتِ زندگی کے بیان اور شخصیت کی مرقع کشی کے معاملے میں وہ بھی اسی بے اعتنائی کا شکار ہوئے ہیں جس کی مثالیں اوپر گزر چکی ہیں۔ سرور نے ان کے بارے میں صرف اس قدر معلومات فراہم کی ہے :

"الٰہی بخش خاں خلفِ رشیدِ عارف خاں (کذا) مرحوم برادر شرف الدولہ قاسم خاں (کذا) مغفور، از امرائے مغلیۂ عہدِ ذوالفقار الدولہ مرحوم۔ شخصِ بسیار خوش اختلاط و خوش فکر، در فنِ سپاہ گری بسیار ماہر۔ با مولف از قدیم تعارف دارد۔" (ص ص ۶۸۲ و ۶۸۳)

"عمدۂ منتخبہ" کی دوسری قابلِ ذکر خامی مختلف تخلصوں اور ناموں یا ایک ہی نام اور تخلص کے ساتھ بعض شاعروں کے حالات کا اعادہ ہے۔ تلاش و تحقیق کے بعد اس قسم کی تکرار کی کافی مثالیں فراہم کی جا سکتی ہیں لیکن یہاں بنظرِ اختصار صرف ان مقامات کی نشان دہی کی جاتی ہے جو مطالعے کے دوران بیک نگاہ سامنے آتے رہے ہیں۔

(۱) ردیف الباکے ذیل میں بیتابؔ تخلص کے تحت خداوردی خاں کا حال اس طرح لکھا گیا ہے :

"خداوردی خاں برادر کوچک سعادت یار خاں رنگینؔ تخلص کہ ذکرش در حرف الرا مذکور خواہد شد۔ جوانیست سپاہی وضع بسیار مودب و خلیق و یار باش و فہیم و کم گو۔ از راقم تعارفِ تمام دارد و شعرِ ریختہ خوب می گوید۔ شاگردِ میر نظام الدین ممنونؔ۔ (ص ۱۵۱)

اس "تعارفِ تمام" کے باوجود ردیف "ظ" کے تحت دوبارہ انھیں بیتابؔ کا ذکر ان الفاظ میں موجود ہے :

"ظریف تخلص، خداوردی خاں برادرِ کوچک سعادت یار خاں رنگینؔ بسیار خلیق در فنِ سپہ گری کما حقہ ماہر۔" (ص ۴۱۵)

قدرت اللہ قاسم نے شاعرِ موصوف کا ذکر ظریف تخلص کے ساتھ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ پہلے یہ بیتاب تخلص کرتے تھے[۱] سرور کی تحریروں میں موجود شواہد کے علاوہ قاسم کے اس بیان سے یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ بیتاب اور ظریف ایک ہی شاعر کے دو تخلص ہیں۔

(۲) تحسین کا حال معمولی سے فرق کے ساتھ ایک ہی ورق پر دو جگہ لکھا گیا ہے۔ دونوں عبارتیں درج ذیل ہیں:

(الف) "منشی حسین عطا خاں ساکنِ قصبہ اٹاوہ از اشرافِ آں ضلع است۔ روزگار بعمدگی گذرانیدہ، شوقِ ریختہ گوئی در خاطرش متمکن۔" (ص ۱۶۱)

(ب) "میر محمد حسین خاں مخاطب بخطاب مرصع رقم۔ شخصے است ساکنِ لکھنؤ۔ در سرکارِ نواب وزیر الممالک بصیغۂ خوش نویسی ملازم۔ در انشا پردازی نیز مہارتے دارد۔" (ص ۱۶۲)

یہ وہی تحسین ہیں جن کی تصنیف "نوطرزِ مرصع" اردو کے اہم نثری کارناموں میں شمار کی جاتی ہے اور جو قصبہ اٹاوہ کے باشندے اور اپنے زمانے کے مشہور خطاط تھے۔ ان کے نام کے بارے میں تذکرہ نگاروں کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔ مبتلا میر ٹھی نے میر محمد حسین عطا خاں[۲]، امراللہ الہ آبادی نے حسین عطا خاں[۳] اور خیراتی لال بے جگر نے میر عطا حسین خاں[۴] لکھا ہے از روے تحقیق امراللہ کا بیان درست ہے۔

(۳) جو شش عظیم آبادی کا نام بعض تذکرہ نگاروں نے محمد روشن کی بجائے

---

[۱] مجموعہ نغز جلد اول ص ۳۷۱

[۲] طبقاتِ سخن، مخطوطہ شاہجہان پور ص ۴۹

[۳] مسرت افزا۔ مخطوطہ آکسفورڈ یونیورسٹی لائبریری

[۴] تذکرہ بے جگر مخطوطہ انڈیا آفس لائبریری لندن ورق ۲۹ ب

محمد عابد لکھا ہے جو یقیناً غلط ہے۔ سرورؔ بھی اسی غلطی کے مرتکب ہوئے ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

"جوششؔ تخلص محمد عابد از سکنۂ عظیم آباد شاعرِ مستعد معلوم می گردد۔"

(ص ۱۸۰)

محمد عابد، جوششؔ کے بھائی تھے اور دلؔ تخلص کرتے تھے۔ سرورؔ کی دوسری غلطی یہ ہے کہ انھوں نے چند صفحات کے بعد درج ذیل الفاظ میں دوبارہ انھیں جوششؔ کا ذکر کیا ہے:

"جوششؔ تخلص عظیم آبادی۔ در علم عروض ماہر، بسیار خوش لیاقت است۔" (ص ۱۸۵)

(۴) حزیںؔ تخلص کے تحت بظاہر تین مختلف شعرا کے تراجم بہ تفصیل ذیل قلم بند کیے گئے ہیں:

(الف) "حزیںؔ تخلص۔ محمد علی حزیںؔ از تلامذۂ میرزا جانِ جاناں مظہرؔ۔ کلامش دل چسپ و نمکین معلوم می شود:

وہ کہ ہے ملک مسلّم اسے یکتائی کا
خوب لیتا ہے مزا عالمِ تنہائی کا

اس کو کچھ لذتِ شراب نہیں — جس کا دل عشق سے کباب نہیں

ان بتوں کے دیکھنے کا جو کوئی مائل نہیں
زندگانی کا اسے واللہ کچھ حاصل نہیں

رباعی

کن کن طرحوں سے جان ہم سے لے دل
کرتا ہے اب اس طرح تو ہم کو بے دل
جلنے کی قدر ہمارے اس دل کی سمجھے
ظاہر تب ہو کہ جب کسی کو دے دل۔" (ص ۲۱۶ و ۲۱۷)

(ب) "میر باقر نام شاہجہاں آبادی۔ از چندے بعظیم آباد بود و باش اختیار نمودہ۔ شاگردِ میرزا مظہر۔ ازوست:

کیوں کہ خاطر خواہ دل کے درد کی تقریر ہو
کب یہ معنی لفظ میں آئے ہیں، کیا تحریر ہو"۔ (ص ۲۲۰)

(ج) "از نام و نشانش اطلاعے نیست۔ شخصے بود در عہدِ فردوس آرامگاہ۔ ازوست:

اس بے وفا کے عشق میں کچھ ہم کو حبس نہیں
پاؤں تلک بھی اس کے ہمیں دسترس نہیں
ویران ہوا خزاں سے چمن یاں تلک کہ ہم
چاہیں کہ جل مریں تو کہیں خار و خس نہیں
اس فصلِ گل میں کیوں نہ گریبان کیجے چاک
جاتی ہے یوں بہار حزیں آہ بس نہیں"۔ (ص ۲۳۳)

ان تینوں تراجم کے تحت[1] جتنے اشعار نقل کیے گئے ہیں وہ سب کے سب مرزا مظہر کے مشہور شاگرد میر محمد باقر حزیں کی تصنیف ہیں، اس سے صاف ظاہر ہے کہ سرور نے ایک ہی شاعر کو محض بے توجہی اور عدم تحقیق کی بنا پر تین علٰحدہ علٰحدہ شاعروں کی حیثیت سے پیش کیا ہے[2]۔

(۵) خادم علی خادم تخلص کا حال بھی دو جگہ درج ہے۔ پہلے صفحہ ۲۵۰ پر اس طرح ان کا تعارف کرایا گیا ہے:

---

[1] ترجمۂ اول کے تحت منقول اشعار کے بارے میں قدرت اللہ قاسم نے لکھا ہے کہ:
"اشعارے کہ خانِ رفعت نشان اعظم الدولہ محمد میر خاں بہادر در تذکرۂ خود بنام محمد علی حزیں تخلص نوشتہ انداز آنِ میر باقر حزیں است" (مجموعہ نغز: جلد اول ص ۲۰۱)

[2] "عیار الشعرا" کے جائزے کے سلسلے میں اس موضوع پر کسی قدر تفصیل سے بحث کی جا چکی ہے۔

"خادم تخلص باشندۂ قصبہ کیتھل من مضافاتِ صوبۂ سرہند"

دوسری مرتبہ صفحہ ۲۵۳ پر لکھتے ہیں:

"خادم تخلص۔ خادم علی نام۔ متوطن قصبۂ کیتھل متعلقہ سرکارِ سرہند۔ قوم شیخ از ہندوستان زایانِ قدیم است۔ در ریختہ گوئی فکر خوبے دارد۔ دیوانِ اشعارِ فارسی و ریختہ ہر دو ترتیب دادہ"

(۶) ردیف دال کے تحت خواجہ میر درد کے فوراً بعد محمد فقیہ دردمند کا ذکر آتا ہے ان کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

"دردمند تخلص، متوطن دکن۔ از چندے در شاہجہان آباد آمدہ۔ شاگردِ میرزا جانِ جاناں مظہر" (ص ۲۵۸)

اس مجمل تعارف کے بعد سب سے پہلے ایک رباعی نقل کی گئی ہے۔ اس کے بعد غزلیات کے ۳۲ شعر اور آخر میں سات رباعیاں بطور نمونۂ کلام پیش کی گئی ہیں لیکن اس پورے انتخاب میں پہلی رباعی کے علاوہ باقی تمام اشعار خواجہ میر درد کی تصنیف ہیں[1]۔ متعلقہ ردیف کے اختتام پر بالفاظ ذیل پھر انھی دردمند کا حال درج ہے:

"دردمند تخلص۔ میر محمد فقیہ نام۔ شاگرد میرزا جانِ جاناں مظہر علیہ الرحمہ۔ ایں چند اشعار از ساقی نامہ اوست" (ص ۲۷۰)

شعرا کے حالات کے اعادے کی طرح "عمدۂ منتخبہ" میں ایک شعر کے دو یا دو سے زیادہ شاعروں کے نام سے اندراج کی مثالیں بھی خاصی تعداد میں موجود ہیں۔ زیادہ تفصیل میں نہ جاتے ہوئے یہاں اس قسم کی بعض نمایاں لغزشوں کی نشان دہی کی جاتی ہے۔

---

[1] انتساب کی یہ غلطی بظاہر اصل خطی نسخے کے اوراق کی بے ترتیبی یا کاتب کے سہوِ قلم کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے۔ ممکن ہے کہ فاضل مرتب اس نقص کی گرفت نہ کر پائے ہوں۔

گذشتہ سطور میں تذکرے کے صفحہ ۲۳۳ سے حزیں تخلص کے تحت مذکور جس "بے نام ونشاں" شاعر کا ترجمہ نقل کیا گیا ہے، اس کے منتخب کلام میں سب سے پہلے یہ شعر درج ہے ؎

اس بے وفا کے عشق میں کچھ ہم کو جس نہیں
پاؤں تلک بھی اس کے ہمیں دست رس نہیں

جیسا کہ اس سے قبل بتایا جا چکا ہے، یہ شعر میر باقر حزیں کی تصنیف ہے لیکن سرور نے اسے حزیں کے علاوہ محمد علی حشمت کے کلام میں بھی نقل کیا ہے۔ (ص ۲۲۶)

سراج الدین علی خاں آرزو کے کلام میں درج ذیل شعر بھی شامل ہے ؎

کھول کر بندِ قبا کو ملک دل غارت کیا
یہ حصارِ قلب دلبر نے کھلے بندوں لیا (ص ۸)

یہی شعر صفحہ ۵۲ پر احسن اللہ احسن کے نام سے نقل ہوا ہے۔ اگرچہ یہ دونوں انتساب مشکوک ہیں لیکن تذکرہ نگاروں کی اکثریت اسے آرزو سے منسوب کرتی ہے۔ زیرِ بحث شعر کے بعد اسی صفحے پر یہ مشہور شعر بھی کلام احسن کے نمونوں میں شامل ہے ؎

لام نستعلیق کا ہے اس بتِ خوش خط کی زلف
ہم تو کافر ہوں اگر بندے نہ ہوں اسلام کے

لیکن ۱۵۶ پر اسے شرف الدین علی خاں پیام سے منسوب کر دیا گیا ہے جو یقینی طور پر غلط ہے۔

بھورے خاں آشفتہ کے انتخابِ کلام میں یہ دو شعر بھی منقول ہیں ؎

سر رشتۂ محبت ہم سب سے توڑ بیٹھے
اپنا سر آپ اپنے زانو سے جوڑ بیٹھے
برگشتہ بخت ہم سے دیکھے ہیں کم کسو نے
جب ہم ہوئے مقابل وہ منھ کو موڑ بیٹھے

آئندہ صفحات میں یہی دونوں اشعار میرزا رضا قلی آشفتہ کے نام سے نقل

ہوئے ہیں (ص ۸۸) چونکہ ذکا[۱]، قاسم[۲]، شیفتہ[۳] اور دوسرے کئی تذکرہ نگاروں نے ان اشعار کو اول الذکر آشفتہ سے منسوب کیا ہے اس لیے یہی انتساب قابلِ ترجیح معلوم ہوتا ہے۔ اسی قسم کی ایک مثال شاہ واقف فیض آبادی (ص ۸۰۳) اور شاہ قدرت اللہ قدرت دہلوی (صفحات ۴۹۵ و ۴۹۶) کے انتخاباتِ کلام میں بھی نظر آتی ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار جو دراصل حیرت مراد آبادی کی تصنیف ہیں[۴]، ان دونوں شاعروں کے نام سے پیش کیے گئے ہیں۔

ہوا ہے عشق سے آکر مقابلہ دل کا — بھڑا پہاڑ سے جا بل بے حوصلہ دل کا
سرشک و آہ ہے، شورِ جنوں ہے وحشت ہے — عجب شکوہ سے جاتا ہے قافلہ دل کا

مکرر اندراج سے قطع نظر ایسے اشعار کی تعداد بھی کم نہیں جن کی ملکیت کے تعین میں غلطی ہوئی ہے۔ مثال کے طور پر شیخ عبداللہ آزاد کے انتخابِ کلام کے تحت جتنے اشعار درج ہوئے ہیں ان میں سے پہلے دو شعروں کے علاوہ باقی تمام شعر سید محمد میر اثر کے نتائج فکر ہیں۔ اسی طرح حافظ عبدالرحمٰن خاں احسان کے متعدد اشعار میر غلام علی احسان حیدر آبادی کے کلام میں شامل ہو گئے ہیں۔

مندرجہ ذیل اشعار جو بہ استثنائے شعرِ اول میر حسن کے "تذکرہ شعرائے اردو" میں ان کے اپنے نام سے منقول[۵] ہیں "عمدۂ منتخبہ" میں ابوالحسن حسن کاندھلوی سے منسوب کیے گئے ہیں ؎

سب نقش اس فلک کے نگینے پہ آرہے — کارِ جہاں تمام کمینے پہ آرہے

۱؎ "عیار الشعرا" مخطوطہ کتب خانۂ انجمن ورق ۱۲

۲؎ "مجموعہ نغز" جلد اول ص ۲۸

۳؎ "گلشن بے خار" طبع اول ص ۱۸

۴؎ "عیار الشعرا" کے جائزے میں اس موضوع پر تفصیل کے ساتھ بحث کی جا چکی ہے۔

۵؎ "تذکرہ شعرائے اردو" ص ۵۴ تا ۵۸

گر کیجے رقم کچھ تری وحدت کے بیاں کا
تو چاہیے خامہ بھی اسے ایک زباں کا

غیر کو تم نہ آنکھ بھر دیکھو
کیا غضب کرتے ہو، ادھر دیکھو

کہنے کی ہیں یہ باتیں کس بن نہیں گزرتی
پر ایک جان تو ہے جس بن نہیں گزرتی

دریا میں ڈوب جائے کہ یا چاہ میں گرے
اے عشق کوئی پر نہ تری راہ میں گرے

آجا کہیں شتاب کہ مانند نقشِ پا
تکتے ہیں راہ تیری سرِ راہ میں گرے

(ص ۲۱۶)

مطلعِ اول بھی دوسرے تمام شعروں کی طرح میر حسن ہی کی تصنیف ہے۔ چنانچہ مصحفی نے اسی غزل کے ایک اور شعر اور مقطعے کے ساتھ اسے ان کے انتخابِ کلام میں نقل کیا ہے[1]۔ میر حسن کے ہاں آخری دو اشعار میں "گرے" کے بجائے "پڑے" بطورِ ردیف منقول ہے۔ باقی اشعار میں کوئی لفظی اختلاف نہیں۔

ردیفِ شین کے تحت حیدر آباد کے ایک مجہول الاحوال شاعر شرف کے نمونۂ کلام میں اس صراحت کے ساتھ کہ "غزلے از تصانیفش اکثر زباں زدِ مطربانِ اہلِ نشاطِ دار الخلافہ است ..... دو شعر از غزلِ مذکور بنا بر یادگار قلمی نمودہ شد" (ص ۳۸۳) مندرجہ ذیل اشعار پیش کیے گئے ہیں ؎

خبرِ تحیرِ عشق سن نہ جنوں رہا نہ پری رہی
نہ تو میں رہا نہ تو تو رہا جو رہی سو بے خبری رہی

شہِ بے خودی نے عطا کیا مجھے اب لباسِ برہنگی
نہ جنوں کی پردہ دری رہی نہ خرد کی بخیہ گری رہی

وہ عجب گھڑی تھی کہ جس گھڑی لیا درس نسخۂ عشق کا
کہ کتابِ عقل کی طاق پر جو دھری تھی دھری رہی

یہ تینوں شعر شاہ سراج اورنگ آبادی کی ایک مشہور غزل سے ماخوذ ہیں[2] کلیاتِ سراج میں شامل ہونے کے علاوہ مختلف تذکروں میں بھی اس غزل کے متفرق اشعار انھی کے نام سے نقل ہوئے ہیں۔

---

[1] "تذکرۂ ہندی" ص ۶۹

[2] "کلیاتِ سراج ص ۵۱۹

میرزا محمد علی فدوی عظیم آبادی کا ایک مشہور شعر ہے ؎

چل ساتھ کہ حسرت دلِ مرحوم سے نکلے
عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

"عمدۂ منتخبہ" میں یہ شعر شاہ گھسیٹا عشقؔ عظیم آبادی سے منسوب ہے (ص ۴۶) جو قطعاً درست نہیں۔ مصحفی، عشقی اور شیفتہ کی تحریریں اول الذکر انتساب کی تائید کرتی ہیں[۱]۔

میر تقی میرؔ کے طویل انتخاب میں پانچواں شعر یہ ہے ؎

زلف کو کہنا پریشاں عقل کی دوری ہے یہ
ہر گرہ میں اس کی دل میں ہے گانٹھ کی پوری ہے یہ

یہ شعر مختلف شاعروں سے منسوب کیا جاتا رہا ہے۔ قائم چاندپوری، میر حسن، علی ابراہیم خلیلؔ اور عشقی اسے محمد شاہی عہد کے ایک مجہول الاحوال شاعر نادرؔ دہلوی کا طبع زاد[۲] اور حکیم قدرت اللہ قاسم شاہ پنچھا کی تصنیف قرار دیتے ہیں[۳]۔ معلوم نہیں کہ یہ انتساب کہاں تک درست ہے۔ لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے کہ کلامِ میرؔ سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

اس قسم کے نقائص تذکرہ و تاریخ کے فن سے تعلق رکھنے والی کتابوں کو ہستناد و اعتبار کے درجے سے گرا دیتے ہیں لیکن سرورؔ کے ہاں شعرا کی تعداد اور ان کے کلام کی مقدار کو دیکھتے ہوئے ان نقائص کا تناسب بہت کم ہے اور "عمدۂ منتخبہ" کی قدر و قیمت کا تعین کرتے وقت اس کی خوبیاں بہرحال ان پر غالب رہتی ہیں۔

۱؎ تذکرۂ ہندی ص ۱۶۶، تذکرۂ عشقی۔ دو تذکرے، جلد دوم ص ۱۲۵ و گلشنِ بے خار، طبع اول ص ۱۹۹

۲؎ مخزنِ نکات، طبع ثانی ص ۶۹، تذکرہ شعرائے اردو، طبع ثانی ص ۱۷۹، گلزارِ ابراہیم ص ۴۴۱ و تذکرۂ عشقی۔ دو تذکرے، جلد دوم ص ۲۷۹

۳؎ مجموعہ نغز، جلد اول ص ۱۱۲

اس تذکرے کی ایک قابل تعریف خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کی زبان نہایت سادہ و سلیس ہے اور مولف نے حتی الامکان عبارت آرائی اور رنگین بیانی سے احتراز کیا ہے۔ دوراز کار تشبیہات و استعارات اور مبالغہ آرائی کے سقم سے بھی ان کی تحریر بڑی حد تک مبرّا ہے۔

طرز نگارش کی یہ سلاست جسے بہت کم تذکرہ نویس برقرار رکھ سکے ہیں ایک ایسی خوبی ہے جو معاصر تذکروں کے مقابلے میں "عمدۂ منتخبہ" کے معیار کو بلند تر کر دیتی ہے۔ مختصر یہ کہ اس تذکرے کا مطالعہ ڈاکٹر فاروقی کے الفاظ میں "ادبِ قدیم" کے حیات افروز عناصر سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

مجموعۂ نغز

"مجموعۂ نغز" حکیم قدرت اللہ قاسم کی تالیف ہے جو اپنے دور کے ایک جید عالم اور صاحب نظر ادیب تھے۔ شاعری سے قاسم کو خاص دل چسپی تھی۔ خود بھی شعر کہتے اور دہلی میں اپنے مکان پر مشاعروں کا اہتمام بھی کیا کرتے تھے[1]۔ مرزا عظیم بیگ عظیم، نثار اللہ خاں فراق اور شیخ ولی اللہ محب کے ساتھ انشا کے خلاف معرکہ آرائیوں میں بھی ان کا نمایاں حصہ رہا تھا[2]۔ نواب اعظم الدولہ سرور نے اپنے تذکرے میں ان کا ذکر بڑے احترام کے ساتھ کیا ہے لکھتے ہیں:

"شخصے است موصوف بصلاحیت و تقویٰ۔ تحصیل کتبِ عربی بخوبی نمودہ و در علمِ طب مہارت کلی دارد۔ شاعرِ مسلم الثبوت و بشمارِ جرگۂ استادانِ ایں عصر است۔ تصانیفش اکثر برجستہ و خوش مضمون و دل چسپ۔ دیوانِ ضخیم ترتیب دادہ و ہمہ اقسام شعر مثل مثنوی و واسوخت و مناقب و مراثی و مخمس و مسدس و رباعی وغیرہ کہ در سلک نظم کشیدہ، پسندِ خاص و عام گشتہ"[3]

قاسم کا زیرِ بحث تذکرہ جو بصورتِ مطبوعہ ۱۸×۲۴½ سم سائز کے آٹھ سو اسی ۸۸۰ دس صفحات اور چھ سو چورانوے ۶۹۴ شعرا کے اشعار و احوال پر مشتمل ہے، شمس العلما

---

[1] عمدۂ منتخبہ ص ۵۱۱

[2] عمدۂ منتخبہ ص ۲۵

[3] عمدۂ منتخبہ ص ۵۱۱

مولانا محمد حسین آزاد کے ذخیرۂ نوادرات سے حاصل شدہ مولف کے اصل مسودے پر مبنی ہے اور ۱۹۳۳ء میں پروفیسر محمود شیرانی کی تصحیح و تدوین کے بعد پنجاب یونیورسٹی لاہور کی جانب سے شائع ہوا ہے[1]۔ اس نسخے کی تیاری کے دوران مشکوک اور کرم خوردگی سے متاثر الفاظ و عبارات کی تصحیح و تکمیل اور متن کے اختلافات معلوم کرنے کی غرض سے انڈیا آفس لائبریری کا نسخہ بھی مرتب کے پیش نظر رہا ہے۔ ترتیب کی دوسری خوبیوں سے قطع نظر اس نسخے کی یہ خصوصیت بطورِ خاص قابلِ ذکر ہے کہ متن میں حتی الامکان مولف کے مخصوص املا کو برقرار رکھنے کی کوشش کی گئی ہے "تاکہ ایک عالم اہلِ قلم کی خصائص املا و افشا معلوم رہیں اور اردو الفاظ کا مخصوص تلفظ جس طرح سے وہ (اس زمانے میں) بولے جا رہے تھے ہم پر روشن ہو جائے"[2]۔

تذکرے کا آغاز ایک دیباچے سے ہوتا ہے جس میں حمد و نعت کے بعد اسبابِ تالیف و زمانۂ ترتیب پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے بعد کلامِ موزوں کی ابتدا اور فنِ شاعری کی اہمیت کے متعلق ایک تفصیلی مقدمہ سپردِ قلم کیا گیا ہے۔ دیباچے کے ذیل میں اپنے ادبی اور تصنیفی و تالیفی انہماک کا ذکر کرتے ہوئے قاسم نے لکھا ہے کہ

> "از بدوِ تکوّنِ شعور و ابتدائے تیسّرِ دریافتِ امور ..... در اکثرے از احیان و بیشترے از آوان تحریر طرفے از احوالِ خجستہ مآل سخن طرازانِ ہندی زبان و تسطیر شطرے از اشعار آب دار ریختہ گویانِ جادو بیان بخاطر فاتر خطور می نمود اما بنا بر رفیق ناشدنِ توفیق و دست بہم ندادنِ اسباب مایلیق اقدام بریں امرِ خطیر نمی فرمود تا آنکہ روزے میمنت افروزے باشارۂ بابشارۂ ملہمِ غیبی ..... بحکم السعی منّی والاتمام من اللہ ..... باوصفِ تشتتِ

---

[1] مطبوعہ نسخہ دو جلدوں پر منقسم ہے۔ دوسری جلد کا آغاز مرزا عظیم بیگ کے حالات سے ہوتا ہے۔ ترقی اردو بورڈ، نئی دہلی نے اکتوبر ۱۹۷۳ء میں عکسی ایڈیشن کی صورت میں اسے دوبارہ شائع کر دیا ہے۔

[2] مجموعۂ نغز، مقدمہ مرتب ص ۲۱

بال و تفرقۂ حال کمر ہمت بہ سرانجام مکنونِ خاطرِ قدیم و انصرام مافی الضمیر دیرینہ بربست و بدستیاریٔ قلمِ جواہر رقم و پامردیٔ کلکِ لآلی سلک بہ آبیاریٔ ایں گلشن ہمیشہ بہار و سیرابیٔ ایں گلستانِ بے خس و خار شروع رفت۔" (ص ۳)

اس ذوق و شوق کے ساتھ ابتدائے کار کے باوجود عدیم الفرصتی اور حالات کی نامساعدت کے باعث مولف کا یہ خواب ایک مدتِ مدید کے بعد شرمندۂ تعبیر ہو سکا۔ اس درمیانی عرصے کا تعین تقریباً ناممکن ہے۔ تذکرے سے اس سلسلے میں صرف اسی قدر معلومات حاصل ہوتی ہے کہ

"اتفاقِ تسویدِ ایں حدیقۂ دانش و حدیقۂ بینش بسیار کم می شد و مدتِ مکث ایں جریدۂ فریدہ و دفتر گزیدہ در صندوقِ غفلت و جامہ دانِ عطلت نہایت بطول کشید۔ گاہے حسب الفرصت و حضورِ طبیعت از طاقِ نسیان بزیر آوردہ عروسانِ معانیش را بہ ایوانِ تدوین بخجا بخجا ملبس بلباسِ فاخرۂ تحریر و رواپوشِ کسوتِ تسطیر می نمودم ..... تا رفتہ رفتہ در سنہ یک ہزار و دو صد و بیست و یک ..... بہ اتمام رسید و شدہ شدہ بروزِ سعیدِ عیدالفطر ..... بہ اختتام گرائید۔" (ص ۳)

اس تفصیل سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مجموعہ نغز کی داغ بیل ۱۲۲۱ھ / ۱۸۰۶ء سے کئی سال قبل پڑ چکی تھی۔ اس ضمن میں میر اعظم الدولہ سرور کا یہ بیان غور طلب ہے کہ:

"دریں ولا کہ ۱۲۱۹ ہجری است بسبب مطالعۂ ایں مجموعہ (عمدہ منتخبہ) خود ہم ذوقِ تالیف نمودنِ تذکرہ پیدا کردہ چنانچہ از مولف مسودہ را گرفتہ انتخاب اشعار نمودہ تذکرہ تالیف کردہ است[1]۔"

ہمارے خیال میں "عمدۂ منتخبہ" کے مطالعے کے بعد ۱۲۱۹ھ / ۱۸۰۴ء میں

---

[1] عمدۂ منتخبہ ص ۵۱۱

"مجموعۂ نغز" کی بنیاد گذاری کے متعلق سرور کا یہ دعویٰ درست نہیں۔ قاسم کے بیان کی روشنی میں اندازہ یہ ہے کہ وہ اس سے بھی کچھ پہلے اس میدان میں قدم رکھ چکے تھے۔ میر جواد علی خاں ہادی متوفی ۱۲۱۵ھ (۱۸۰۰ء) کے ذکر میں "سلم الرحمٰن" اور "خداش سلامت دارد کہ بقیۃ السلف است" جیسے بیانات کی موجودگی ہمارے اس قیاس کو تقویت بخشتی ہے۔ البتہ اس بات کا قوی امکان ہے کہ سرور کے فراہم کردہ مواد سے استفادے کا موقع پاکر وہ اپنی منزل کو قریب تر محسوس کرنے لگے ہوں اور ان کے کام کی رفتار غیر معمولی طور پر تیز ہوگئی ہو۔ سرور کے حالات میں انھوں نے "عمدۂ منتخبہ" کا ذکر جس انداز سے کیا ہے اس سے بھی یہ پتا چلتا ہے کہ یہ تذکرہ ان کی نظر سے گزر چکا تھا اور وہ اس کے حسنِ ترتیب سے کافی حد تک متاثر ہوئے تھے۔ لکھتے ہیں کہ:

"تذکرۃ الشعرا بسیار خوب نوشتہ و تخم گل ہاے رنگین بہ آئین بہیں دریں گل زمیں کشتہ۔" (جلد اول ص ۲۹۵)

سالِ اختتام کے سلسلے میں میر سید علی خاں سیّد اور ثناء اللہ خاں فراق کے مستخرجہ مادہ ہاے تاریخ بھی مولف کے منقولۂ بالا قول کی تائید کرتے ہیں۔ تذکرے کا نام بھی جو دراصل سید صاحب موصوف کی تاریخی رباعی سے ماخوذ ہے، اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ لیکن اصل مسودے کی کیفیت کے بارے میں پروفیسر محمود شیرانی کے اس بیان سے کہ

"یہ مخطوطہ جگہ جگہ سے قلم زدہ ہے۔ جملے اور فقرے مختلف مقامات سے کاٹے گئے ہیں اور ان کی بجاے نئے جملے اصلاح شدہ شکل میں لکھے گئے ہیں۔ مصنف نے نظر ثانی کرتے وقت بے شمار موقعوں پر حاشیے میں نئے اضافے داخل کیے ہیں۔ الفاظ میں حک و ترمیم سینکڑوں موقعوں پر نظر آتی ہے۔

لہ عمدۂ منتخبہ ص ۸۱۹ و گلشنِ بے خار ص ۳۳۶

کئی مقام پر عین متن میں جگہ خالی چھوٹی ہوئی ہے ایک صفحہ ختم ہو چکا ہے اور بجائے دوسرے صفحے پر لکھنے کے پہلے صفحے کے حاشیے پر سلسلۂ کتابت جاری رکھا گیا ہے۔" (مقدمہ مرتب ص ۱۳)

یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ قاسم ۱۲۲۱ھ/۱۸۰۶ء کے بعد بھی موقع بموقع اور وقتاً فوقتاً متن میں حسبِ ضرورت تبدیلیاں اور اضافے کرتے رہے ہیں لیکن دوسرے کئی تذکروں کے برخلاف "مجموعۂ نغز" میں ایسے قرائن تقریباً مفقود ہیں جن کی مدد سے یہ اندازہ کیا جا سکے کہ ترمیم و تنسیخ کا یہ سلسلہ کس زمانے تک جاری رہا ہے البتہ ایک جگہ مرزا رفیع سوداؔ (متوفی ۱۱۹۵ھ/۱۷۸۱ء) خواجہ میر دردؔ (متوفی ۱۱۹۹ھ/۱۷۸۶ء) اور میر تقی میرؔ (متوفی ۱۲۲۵ھ/۱۸۱۰ء) کے ناموں کے ساتھ "علیہم الرحمۃ من اللہ السمیع البصیر" کا دعائیہ کلمہ اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ یہ عبارت میرؔ کی وفات یعنی ۱۲۲۵ھ/۱۸۱۰ء کے بعد معرضِ تحریر میں آئی ہے۔

قاسم نے "عمدۂ منتخبہ" کے علاوہ دریافتِ احوال و انتخابِ اشعار کی غرض سے دوسرے معاصر تذکروں سے بھی استفادہ کیا ہے۔ شرف الدین علی خاں پیامؔ کے حال میں لکھتے ہیں کہ "خان آرزو علی قلی خاں والہ احوالش در تذکرہ ہائے خود بشرح و بسط رقم زدۂ کلکِ حقائق سلک نمودہ۔" (ج ۱ ص ۱۳۰) میرؔ کے ذکر میں لکھا ہے کہ "در تذکرۂ خود ہمہ کس را بہ بدی یاد کردہ۔" (ج ۱ ص ۱۰) سعدی دکنی کے حال میں رقم طراز ہیں کہ "سودا در تذکرۂ خود اشعارِ ایں سعدی دکنی را ..... بشیخ شیراز ..... نسبت نمودہ۔" (ج ۱ ص ۲۹۸) ان بیانات نیز بعض دوسرے حوالوں سے پتا چلتا ہے کہ ضروری مواد کی فراہمی کے سلسلے میں خان آرزو کا "مجمع النفائس" والہ داغستانی کا "ریاض الشعرا" میرؔ کا "نکات الشعرا" اور سوداؔ کا نامعلوم الاسم نایاب تذکرہ بھی قاسم کے پیشِ نظر رہا ہے۔ اس کے علاوہ خوب چند ذکاؔ،

۱؎ مجموعۂ نغز، مقدمہ مولف ص ۱۱

قدرت اللہ قدرت رام پوری اور مصحفی امروہوی کے تصنیفی کارناموں کی تفصیلات ان شعرا کے تذکروں سے بھی ان کی باخبری کا ثبوت فراہم کرتی ہیں۔

تذکرے کا جامع اور بسیط مقدمہ جن مباحث و مسائل پر مشتمل ہے ان کے ضمن میں قاسم نے کلام موزوں کے لیے ارادے کو شرطِ اولیں قرار دیا ہے۔ چنانچہ اگر کسی شخص کی زبان یا قلم سے غیر ارادی طور پر ایسی کوئی عبارت یا جملہ معرضِ وجود میں آجائے جو وزن و بحر کے سانچے میں ڈھلا ہوا ہو تو ان کے نزدیک اسے شعر کی تعریف میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔ فرماتے ہیں:

"بہر زبانے کہ کلام موزوں بر قواعد شعریہ یا بند، شعر نامند مگر آں کہ بہ ارادۂ متکلم نباشد و گویندہ بداں شعر مراد ندارد و ازینجاست کہ کلام اللہ تعالیٰ شانہٗ مانندِ لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا ..... و سخنِ صاحب الشرع علیہ الصلوات الزاکیات ..... و ما بینا سبہا را شعر نگویند۔" (ص ۷)

تاریخی نقطۂ نظر سے فنِ شعر گوئی کی قدامت کے سلسلے میں قاسم اس روایت کے ہم خیال ہیں کہ اس کی ابتدا ابوالبشر حضرت آدمؑ کے اس مرثیے سے ہوتی ہے جو انھوں نے اپنے ایک بیٹے قابیل کے ہاتھوں دوسرے بیٹے ہابیل کی موت پر کہا تھا۔ اس کے بعد سے تاریخِ انسان کے ہر دور میں اس زمانے کے اہلِ کمال اس میدان میں اپنی طباعی کے جوہر دکھاتے رہے ہیں۔ خاص طور پر عہدِ جاہلیت کے عرب شعرا نے اپنے قصائد کے ذریعے اس فن کو منتہائے عروج تک پہنچا دیا تھا۔ طلوعِ اسلام کے بعد حسان بن ثابت نے بھی رسول اللہ کے حسب الحکم شعرائے کفار سے معرکہ آرائی کے لیے اسی مقبول عام وسیلۂ ابلاغ کا سہارا لیا۔ عرب کے برخلاف ایران میں شاعری کا آغاز بہت بعد میں ہوا۔ قاسم کے خیال میں شعر فارسی کی ابتدا مشہور روایت کے بموجب بہرام گور کے ایک فخریہ مصرعے ع "منم آن پیلِ دماں و منم آں شیرِ یلہ" پر اس کی محبوبہ دل آرام کے پہنچائے ہوئے مصرع ثانی "نام بہرام ترا و پدرت بوجبلہ" سے ہوتی ہے لیکن فارسی شاعری کا عہدِ زریں دراصل شیخ سعدی سے شروع ہوتا

ہے جنھوں نے غزل کو آب و رنگِ تازہ عطا کیا اور ایک نئے طرز کی بنیاد رکھی۔

عربی و فارسی کے شعری ادب پر گفتگو کا یہ سلسلہ اردو شاعری کے متعلق اظہارِ خیال پر منتہی ہوتا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اس زبان میں اگرچہ ایک صاحبِ دل بزرگ حضرت اویس المخاطب بہ محمد کاسہ لیس کے کچھ منظوم ارشادات بھی موجود ہیں اور بعض اشعار علی اختلاف الروایتین سعدی شیرازی یا سعدی دکنی سے منسوب کیے جاتے ہیں لیکن باقاعدہ طبع آزمائی اور تدوینِ کلام کے لحاظ سے اس میدان میں ولی کو شرفِ اوّلیت حاصل ہے۔ ان کے زمانے میں اور اس کے بعد اس سلسلے میں جو پیش رفت ہوئی اس کی رفتار اور نوعیت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"گفتنِ سخن از ہر در و تدوینِ دیوان مردف یکسر از شاعرِ شانِ جلی المتخلص بہ ولی صورت بستہ۔ بالجملہ در عہدِ آن مغفور و بعدِ زمانِ آں مبرور دکھنیاں می گفتند، آنچہ می گفتند و در حضرتِ دہلی ہم شاہ مبارک آبرو و غیرِ آں نیک خو بزبانے کہ داشتند، بیشترے بطریق ایہام می رفتند تا رفتہ رفتہ نوبت بہ نکتہ پیرائے ہنر گستر، مرزا جانِ جاں مظہر رسید۔ ولی (کذا ۔ وے) علیہ الرحمہ ایں زبان را بخراط کشید۔ اما سر آمدِ سخن سنجانِ فصاحت آما، مرزا محمد رفیع سودا و مضمارِ سخن سازی را یکہ تاز مرد، خواجہ میر درد و شاعرِ بے نظیر محمد تقی میر علیہم الرحمہ من اللہ السمیع البصیر آنچہ گفتند ع "چہ بگویم نمی تواں گفتن"۔ طرز و اندازِ سخن از سعیِ ایشان صورت بست و نقشِ سخن پرور و فصاحت طراز از نگ و دو انیان درست نشست و طریقے کہ بزبانِ مابظہور رسیدہ و بمعاملہ موسوم گردیدہ، یا آں کہ بعضے بزبانِ نسواں سخن گویند و دریں سرزمین رخشِ ہمت می پویند، آنچہ ہست ہست۔" (ص ص ۱۰ و ۱۱)

آگے چل کر "بزرگیٔ سخن آرائی و بلند پایگیٔ نکتہ پیرائی" کے زیرِ عنوان قاسم نے شاعری کو دیگر فنون سے بلند تر ثابت کرنے کے لیے مختلف دلائل پیش کیے ہیں۔ ان کے نزدیک ارشادِ ربانی "اِنَّ مِنَ الشِّعْرِ لَحِکْمَۃً" اس فن کی عظمت کا سب

سے بڑا ثبوت ہے۔ یہ حقیقت بھی کہ کلامِ رب الوریٰ کے سوا نطق و بیان کا کوئی بھی شاہکار اس کی قدر و قیمت کو کم نہیں کر سکتا، اس کے امتیاز اور برتری پر دلالت کرتی ہے۔ اس کے علاوہ اس کے تفوق کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ حضرت علیؓ، جناب فاطمہ زہراؓ اور شیخ عبدالقادر جیلانی جیسے "اساطینِ ایوانِ دین" اور "عرفائے صاحب یقین" نے اپنے افکارِ عالیہ سے اس کے دامن پر عزت و افتخار کے پھول ٹانکے ہیں۔

اس کے بعد "احترام اہل سخن" اور "بزرگ داشتِ اصحابِ فن" کا عنوان قائم کر کے بارگاہِ رسالت سے شعرا کی صلہ یابی اور عرب، ایران اور ہندوستان کے مختلف سلاطین و امرا کے درباروں میں ان کی قدر و منزلت کے بعض واقعات بیان کیے گئے ہیں۔ اسی سلسلۂ گفتگو میں اس تلخ حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ

> "ازان کہ ایں فنِ شریف بنا بر کثرتِ انعام و احسانِ بزرگان خاصہ میرزا حسین و میر علی شیر نوائی علیہم الرحمۃ والغفران بدستِ جاہلان افتاد، ہجوم عامیان مرتبۂ ایں فرقہ را شکستِ فاحش داد۔ ع ہر چیز کہ بسیار شود، خوار شود۔۔۔۔۔" (ص ۱۶)

آخر میں اپنے زمانے میں شعر و ادب کی پست معیاری، کساد بازاری اور اربابِ کمال کی ناقدری و کس مپرسی پر اظہارِ افسوس کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "از حالِ ابنِ زماں چہ بر طرازم و از قال و مقالِ ایں دوران چہ برنگارم کہ دریں ماتم خانہ سینہ چاک نمودہ جامہ سیاہ می کند و کاغذ جگر پارہ فرمودہ شکن بر پیشانی می افگند۔ بہر سو کہ می نگرم شاعرے بینم و بہر طرف کہ گوش فرا می کنم زمزمۂ شعر می شنوم و طرفہ اینست کہ با ہمہ نااہلی ہا ہر یک دم از ملک الشعرای می زند و خود را ہمسر بلکہ برتر از دانایانِ ایں فن می شمرد۔۔۔۔۔ و معہذا قدر دانی ہم بدرجۂ رسیدہ کہ اگر استاد رودکی ہشتاد ہزار کلیلہ دمنہ بر روے کار آرد، پشیزے در جائزہ نیابد و خاقانی شروانی اگر ہزاران ہزار قصائد حکیمانہ بگوناگوں صنائع بدائع در مدح کسے سرانجام دہد، دامے در صلۂ آن بدو نرسد

بلکہ موردِ تحسین و موقع آفریں ہم نگردد۔" (ص ص ۱۶ و ۱۷)

اس عبارت پر مقدمے کے اختتام کے بعد اصل کتاب اس انداز سے شروع ہوتی ہے کہ اس کے پہلے ہی صفحے کا مطالعہ ہمیں مولف کی سلیقہ مندی کے اعتراف پر مجبور کر دیتا ہے۔ تذکرے کو قارئین کے لیے سہل الاستفادہ بنانے کی غرض سے قاسم نے اسے جتنے بہتر اور باقاعدہ طریقے سے مرتب کیا ہے، اس کی مثال کسی دوسری جگہ نہیں ملتی۔ انھوں نے ایک خاص نظم کے تحت اوّلاً ان شاعروں کا ذکر کیا ہے، جن کے متعلق وہ اپنی ابتدائی کوششوں کے نتیجے میں بقدرِ ضرورت یا حسبِ خواہش معلومات کے حصول میں کامیاب ہو گئے تھے۔ اس کے برخلاف جن لوگوں کے بارے میں ان کی معلومات نامکمل اور محتاج تفصیل تھیں یا جن کے حالات و کلام تک بعد میں رسائی حاصل ہوئی تھی ان کے تراجم تکملے کے طور پر کتاب کے آخر میں شامل کیے گئے ہیں۔ شاعروں کے درمیان سلسلہ وار ترتیب حروف تہجی کی بنیاد پر قائم کی گئی ہے جن میں تخلص کے حرف اول کے ساتھ حرفِ دوئم کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے۔ قاسم کے اس طرزِ خاص کی باقی خصوصیات حسبِ ذیل ہیں:

(الف) ہر ردیف کی ابتدا میں اس کے تحت متذکرہ شعرا کی تعداد واضح کر دی گئی ہے۔

(ب) ہم تخلص شعرا کی تعداد بالتفصیل درج کی گئی ہے اور ان کا ذکر کرتے وقت یہ بتا دیا گیا ہے کہ ان میں سے کتنے اصل متن میں شمولیت کے مستحق قرار پائے ہیں اور کتنوں کو تکملے کے تحت جگہ دی گئی ہے۔

(ج) مجموعی طور پر نمونۂ کلام میں پیش کیے گئے اشعار کی تعداد اور صنفی نوعیت بیان کر دینا بھی ضروری سمجھا گیا ہے۔

(د) ضمناً غیر متعلق شعرا کے جس قدر اشعار نقل ہوئے ہیں ان کی کیفیت علٰحدہ قلم بند کر دی گئی ہے۔

اس حسنِ التزام کی وضاحت اور اس کی اہمیت وافادیت کا اندازہ کرنے کے لیے ردیف الف کی تمہید ملاحظہ ہو:

"در طے ایں حرف ذکر شصت (۶۰) سخن گو کہ سہ کس از ایشان آرائم تخلص می کنند و دو کس آشفتہ و چار عزیز بہ احمد متخلص اند و سہ بہ احسن و دو کس را ارمان تخلص است و دو را اصغر و دو شخص را افسوس تخلص اختیار افتادہ و دو را اکبر و دو بزرگ امیر تخلص گزیدہ اند و سہ امین، اندراج یافتہ و مجموعِ اشعار شعرائے شصت گانہ کہ در تحتِ اسامی ہائے شان بالذات و استقلال مندرج گشتہ، یک بندِ مخمس و دو بند ترجیع بند و یازدہ رباعی و پنج صد و ہفتاد و چار شعر متفرقہ معہ مقطعات است و یک مصرع اشرف قدیمی بہ تضمینِ شاعر شانِ جلی المتخلص بہ ولی و یک مطلعِ میر انشاء اللہ خاں انشا و یک بند مخمس مرزا عظیم بیگ و یک قطعۂ دو بیتی شیخ ولی اللہ محب بالعرض و تقریباً اندراج یافتہ۔"

(ص ۱۷)

قاسم کے آدابِ نگارش کا یہ پہلو بھی بالکل منفرد اور بطورِ خاص قابلِ ذکر ہے کہ انھوں نے بعض ممتاز شاعروں کے لیے ان کے تخلص کے ہم قافیہ فقروں کی شکل میں کچھ القاب مقرر کر دیے ہیں جن کی شمولیت کے بغیر وہ ان کا نام لینا سوءِ ادب خیال کرتے ہیں۔ چنانچہ یہ فقرے بہ ادنیٰ تغیر شروع سے آخر تک اکثر جگہ دوہرائے جاتے رہے ہیں۔ مثال کے طور پر خان آرزو بیشتر "روشن زبانِ بدیہہ گو" یا "سخن سنجِ بدیہہ گو" کے لقب سے یاد کیے گئے ہیں اور خواجہ میر درد کو "مضمارِ سخن سازی را یکہ تازِ مرد، خواجہ میر درد" یا "سخن سنجِ روشن ضمیر، حضرت خواجہ میر" کہا گیا ہے۔ اس قسم کی کچھ اور مثالیں درج ذیل ہیں:

حاتم :- استادِ اکثرے از سخن سنجانِ عالم شیخ ظہور الدین حاتم

سودا :- سرآمد شعرائے فصاحت آما، مرزا محمد رفیع سودا

سوز :- شاعرِ فصاحت افروز، محمد میر سوز

فراقؔ :۔ دوستدار سراپا وفاق، حکیم ثناء اللہ خاں فراقؔ
مظہرؔ :۔ سخن سنج ہنرگستر، مرزا جانِ جاں مظہرؔ
میرؔ :۔ سخن سنج بے نظیر، محمد تقی میرؔ
ہدایتؔ :۔ استادِ صاحبِ درایت، ہدایت اللہ خاں ہدایتؔ
ولیؔ :۔ شاعرِ شانِ جلی المتخلص بہ ولیؔ

جیساکہ اس سے قبل بھی عرض کیا جا چکا ہے، قاسم نے شعرا کے حالات و کلام کی فراہمی کے مقصد سے بیشتر قدیم اور معاصر تذکرے پیش نظر رکھے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے دوسرے تمام ذرائع و وسائل سے بھی حسبِ موقع مدد لی ہے۔ لیکن اس معاملے میں بھی وہ اس حیثیت سے اپنا امتیاز برقرار رکھنے میں کامیاب ہیں کہ نہ تو انھوں نے دوسروں کے بیانات کو بے چون وچرا قبول کر کے کورانہ تقلید کا ارتکاب کیا ہے اور نہ کسی پیشرو تذکرہ نگار کے مختتم فیصلے یا ذاتی رائے سے مرعوب یا متاثر ہو کر مزید غور و فکر کے دروازے بند کیے ہیں بلکہ بعض جگہ تحقیق اور آزادانہ رائے زنی سے کام لے کر اصل حقائق کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے مثلاً میر محمد باقر حزیںؔ کے ذکر میں سرورؔ کی ایک غلطی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"اشعارے کہ خانِ رفعت نشاں اعظم الدولہ میر محمد خاں بہادر در تذکرۂ خود بنام محمد علی حزیںؔ تخلص نوشتہ اند، از آنِ میر باقر حزیںؔ است۔"

(جلد اول ص ۲۰۱)

سعدیؔ دکنی کے بارے میں میرزا سوداؔ کے بیان پر جو ان کے متعلق پھیلی ہوئی عام غلط فہمی کا نتیجہ ہے، اس طرح تبصرہ کرتے ہیں :

"مظنۂ بیشترے از سخن پیرا خصوص سرآمد شعرائے فصاحت آمامرزا محمد رفیع سوداؔ نظر بر اتحادِ تخلص آں کہ ایں سعدیؔ ہموں سعدیؔ شیرازی است قدس سرہٗ کہ واردِ دیارِ دکن شدہ و شعرِ ریختہ از طبعِ وقادِ آں قدوۂ متغزلان ریختہ چنانچہ در تذکرۂ خود اشعارِ ایں سعدیؔ دکنی را عفی اللہ عنہ بشیخ شیراز

علیہ الرحمۃ والغفران نسبت نمودہ۔" (جلد اول، ص ۲۹۸)

یقین کے ذکر میں پورے وثوق اور جرأت کے ساتھ ان کے کلام کے بارے میں صاحبِ نکات الشعرا کے معروف بیان کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"شاعرِ بے نظیر، محمد تقی میر در تذکرۂ خود قلمی نمودہ کہ دیوانِ وے از آنِ مرزائے مغفور (مرزا مظہر جانجاناں) است، افترائے محض و کذب خالص است کہ از ممر حید از وے سرزد۔ اکثر غزل ہا بدیہہ بحضورِ سراپا سرورِ آگاہِ رموزِ خفی و جلی سید فتح علی خاں حسینی دام ظلہم گفتہ۔" (جلد دوم، ص ۳۵۵)

تذکرے کو زیادہ سے زیادہ جامع، دل چسپ اور مفید و کارآمد بنانے کی غرض سے قاسم نے شعرا کے تعارف میں حتی الامکان ان کے وطن، مقامِ پیدائش، حسب و نسب، اخلاق و عادات، مذہبی عقائد، علمی استعداد، سلسلۂ تلمذ، مشاغلِ زندگی اور تصنیفی و تالیفی کارناموں کے متعلق تمام ضروری معلومات یکجا کر دینے کی کوشش کی ہے اور اپنی اس کوشش میں وہ بڑی حد تک کامیاب بھی ہوئے ہیں لیکن ولادت و وفات اور دوسرے اہم واقعاتِ زندگی کے سلسلے میں سنین کے تعین سے بے اعتنائی کے باعث یہ کامیابیاں اس سرحدِ کمال کو نہیں چھو سکی ہیں جہاں تذکرہ نویسی تاریخِ ادب کے لیے چراغِ راہ اور نشانِ منزل بن جاتی ہے۔ بہر صورت تذکرے کے مختلف اوراق سے اس تعارف نگاری کے چند نمونے پیش کیے جاتے ہیں جن سے ان کی صحیح کیفیت کا اندازہ ہوگا۔

(الف) خواجہ احسن اللہ خاں بیانؔ کے بارے میں رقم طراز ہیں کہ:

"وے دراصل از خطۂ دل پذیر کشمیر و شاگردِ رشید سخن سنج ہنر گستر مرزا جانِ جاناں مظہرؔ علیہ الرحمۃ والغفران و مریدِ سعید قدوۃ العارفین مولانا محمد فخر الدین ..... است در آخر ہا قدرے تحصیلِ علم صرف و نحو ہم نمودہ و بخاکِ پائے طلبائے جہاں، اعنی قاسم، ہیچداں سراپا نقصان تکرارِ سبقِ خود بیشتر بلکہ بلا ناغہ می فرمود ..... ہمیشہ بعمدگی و خوبی ایام بسر کردہ۔

از چندے بہ حیدر آباد در سرکارِ ناظم آن بلاد ملازم بود۔ مدتے است کہ از احوال خیر مآلش اطلاعے نیست۔" (جلد اول، ص ص ۱۲۳ و ۱۲۴)

(ب) شاہ حاتم کے حالات ڈیڑھ صفحے کو محیط ہیں جن میں ان کی شخصیت اور زندگی کے تقریباً تمام پہلو زیر بحث آگئے ہیں۔ بعض اہم اقتباسات ملاحظہ ہوں:

"وے از سکنائے شاہجہان آباد ..... بود در اوائل حال بسپاہ گری ایام بسر می برد۔ و در آخر ہا بہدایتِ سعادتِ ازلی و رہنمونی مشیتِ لم یزلی تعلقات دنیوی را خیر باد گفتہ مشتِ خاک خود بدامانِ اہل دل بربست ..... در آخر ہائے روز مدام بہ تکیہ شاہ تسلیم کہ بر شاہراہِ راج گھاٹ زیرِ دیوارِ قلعۂ مبارک واقع است، تشریفِ شریف ارزانی می داشت۔ و بر خلافِ وضعِ آزادان نیمہ می پوشید و بسیار بانظافت و طہارت می زیست و گردِ مسکرات نمی گشت و بصوم و صلوٰۃ و سائرِ شرعیات سخت مقید بود۔ اما دستار چہ آزادانہ بر کلاہ می بست و چوبکِ باریک در دست دارد کہ شعارِ آزادان است، باخویش می داشت ..... در دیباچۂ دیوان نام چہل و پنج کس از شاگردان خود رشتۂ تحریر کشیدہ۔ سرآمدِ شعرائے فصاحت آما، مرزا محمد رفیع سودا ہم دراں سلک منسلک است۔ از انصاف گستریش چہ برطرازم استادِ سراپا درایت، ہدایت اللہ خاں ہدایت عفی اللہ عنہ می فرمودند کہ بارہا از زبان نصفت بیانِ آن استادِ دوران شنیدہ ام کہ ایں مصرع می خواند ع رتبۂ شاگردیٔ من نیست استادِ مرا، و می گفت حقا کہ ایں در حق استادیٔ من و شاگردیٔ مرزا است۔"

(جلد اول، ص ص ۱۷۹ و ۱۸۰)

میر حسن کے ذکر میں اگرچہ مرزا رفیع سودا سے اکتساب فیض کے متعلق قاسم کا بیان درست نہیں اور ان کے تذکرۂ شعرا سے بے خبری بھی باعثِ حیرت ہے تاہم دوسری تفصیلات اختصار کے باوجود تذکرہ نگاری کے بنیادی تقاضوں کی تکمیل کر دیتی ہیں۔ لکھتے ہیں:

"میر غلام حسن خلف الصدق میر غلام حسین ضاحک۔ اصلش از ایران ومولدش ہندوستانِ جنت نشان است۔ در سید واڑۂ دہلی کہنہ تولدش واقع شدہ۔ گردشِ دورِ دوّار وے را بدیارِ مشرق انداختہ۔ در فیض آباد ملازمِ سرکار سردار جنگ خلفِ رشیدِ نواب سالار جنگ گشتہ۔ شاگردِ رشید میر ضیاء الدین ضیاؔ است واز خدمتِ سرآمدِ شعرائے فصاحت آما، مرزا محمد رفیع سوداؔ ہم استفادہ نمودہ ..... مثنوی بے نظیر و بدر منیر بے نظیر گفتہ ..... بیرون ازیں مثنوی در ہجو بلدۂ لکھنؤ و مدحِ شہرِ فیض بہرِ فیض آباد بنگلہ و سرگذشت راہ کہ ہمراہِ نیز ہائے شاہ مدار قدس سرہ راہیٔ آن دیار شدہ، بسیار خوب و پاکیزہ گفتہ۔" (جلد اول، ص ص ۲۰۲ و ۲۰۳)

"عیار الشعرا" کے مولف خوب چند ذکا کے حال میں دہلی پر احمد شاہ ابدالی کی یورش کے دوران ان کے خاندان کی تباہی و بربادی اور انتشار و ابتری کے متعلق یہ تفصیلات فراہم کی گئی ہیں:

"در افراط و تفریطے کہ بہنگامۂ افاغنۂ ابدالی بحضرت دہلی روداد، اکثرے از نیا کانش بپاسِ ناموس عیالِ خود را جوہر نمودہ خود بمعرضِ ہلاک در آمدند و بعضے از نسوان بلحاظِ عصمت بچاہ افتادہ جان بجان بخش دادند و برخے از اناث و ذکور بہ پامردیٔ خود جان از مہلکۂ جان ستان بسلامت بردہ افتان و خیزاں از چور عام کہ مسکنِ ایشاں بود، بشہر نو افتادند۔ ازاں پس کہ ایں فتنۂ عام فرو نشست و آتشِ بلا کہ سر بہ بالا کشیدہ بود، پست گشت، گروہے ازاں رخت سفر بربستہ بعظیم آباد رحل اقامت افگند و شرذمہ بشاہجہاں آباد صانہا اللہ عن الشر والفساد سکونت ورزیدند۔" (جلد اول، ص ۲۶۰)

سعادت یار خاں رنگین کے حالات بھی کافی تفصیل سے لکھے گئے ہیں، جن میں ان کی زندگی اور شعری و نثری کارناموں کے متعلق مفید اور دل چسپ معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ اس ترجمے کے بعض اہم حصے یہ ہیں:

"وے رومی الاصل است اگرچہ مسقط الراسش خاکِ پاکِ ہندوستان جنت نشاں واقع شدۂ۔ پدرش محکم الدولہ حلماس خان بہادر اعتقاد جنگ.. ..... بہ ترفہ تمام وآسودگی تمام زندگی می کرد وخودش نیز بعز وامتیاز ملازم شاہزادہ ہائے والاقدر وامرازادہ ہائے ثروت بہر سرفراز ماندہ۔ اما از یک چند ترکِ ایں سودا کردہ گوشہ نشینِ زاویۂ عزلت است..... نسبت تلمذ بشیخ ظہور الدین حاتم دارد وبعد رحلتِ آں مرحوم بمیاں محمد امان نثار کہ شاگردِ رشیدِ شاہ حاتم مغفور است، توسل جستہ وبمیر انشاء اللہ خاں انشا ہم صحبت داشتہ۔ چار دیوان مردف دارد کہ من جملہ آں ہا یکے تمام غزل در غزل ویکے ہمگی ہزل ویکے بتمامہ بزبانِ زناں گفتہ۔ ودر دیوانِ ہزلیات قصیدہ در مدح شیطانِ لعیں انشاد نمودہ وبجائے تسمیہ تعوذ دراں جا ثبت فرمودہ وبیرون ازیں مثنویات چند از وے بر صفحۂ روزگار ثبت افتادہ ورسالۂ نثر کہ بہ "مجالس رنگین" موسوم ساختہ وبر اکثرے از اہلِ سخن تا بشیخ شیراز علیہ الرحمۃ والغفران بزعم خود دراں دخلِ پر بجا کردہ، تصنیف نمودہ۔" (جلد اول، ص ۲۷۸)

قاسم نے حالاتِ زندگی کی فراہمی کے پہلو بہ پہلو سیرت وشخصیت کے تجزیے اور محاسنِ عادات ومکارمِ اخلاق کی تحسین پر بھی کافی زور دیا ہے۔ وہ تہذیب و شائستگی، پاکیزگی وپرہیزگاری، نیک خلقی ونیک مزاجی، محبت ومروت، خوش کلامی وخوش اختلاطی اور خندہ جبینی وزندہ دلی کے مدّاح اور قدر شناس ہیں۔ چنانچہ جہاں بھی انھیں یہ خوبیاں نظر آئی ہیں، انھوں نے دل کھول کر ان کی تعریف کی ہے۔ ان کے برخلاف جو لوگ ان اوصاف سے عاری تھے، ان کی حالت پر اظہارِ افسوس کیا ہے۔ لیکن اس طرح اچھائی یا برائی کے ساتھ صرف انھی شاعروں کو یاد کیا گیا ہے جنھیں خلوت وجلوت میں بارہا دیکھنے اور ان کے مزاج وطبیعت کو سمجھنے کا موقع ملا ہے یا جن کے حالات تک معتبر ومستند روایات کے ذریعے رسائی حاصل ہوئی ہے۔

اس سلسلے میں ان کے یہ بیانات بطور مثال پیش کیے جا سکتے ہیں :

(الف) میر محمدی بیدار :۔

"ظاہرش بلباسِ فقراو درویشان آراستہ و باطنش بصلاح وتقویٰ پیراستہ ۔ خوش گو شیریں گفتار، پاکیزہ خو، فرشتہ کردار۔" (جلد اول، ص ۱۱۸)

(ب) خواجہ حسن دہلوی :۔

"بحلیۂ علم وحلم آراستہ و بزیورِ فضل وکمال پیراستہ، صوفی مشرب، فقیر نہاد، پاکیزہ مذہب خدا یاد، درویش باطن، تونگر ظاہر ..... بایں ہمہ شکوہ وثروت کہ دارند، بغایتِ خوش اختلاط وافتادہ افتادہ۔" (جلد اول، ص ۲۰۵)

(ج) میر اعظم الدولہ سرور :

"جوانیست خوش طبع، کشادہ پیشانی، نیک اختلاط، پاکیزہ زندگانی، شیریں گفتار، عذوبت بیان، نیکی کردار، رافت نشاں، محبت وثار، مروۃ منش، مودت شعار، فتوۃ روش، صاحبِ نفسِ سلیم، مالکِ طبعِ مستقیم، معانی فہم، نکتہ یاب، عالی طبع، خوش خطاب۔" (جلد اول ص ۲۹۴)

(د) مصحفی امروہوی :۔

"عزیزے نیک سیرت مسکین نہاد، خوش خو، خوبی نژاد، متواضع، باادب، مرتبہ شناس، مہذب، خلیق وشگفتہ پیشانی، باتمکین وپاکیزہ زندگانی واقع شدہ۔"

(جلد دوئم ص ۱۸۹)

(ہ) ہدایت اللہ خاں ہدایت :۔

"بزرگے بود درویش دل، بخدا مشتغل، سالکِ راہ، خدا آگاہ، مسکین نہاد، والانژاد، سراسر حلم، سربسر حیا، یک سر مہر، یک قلم وفا، نیک محضر، پاکیزہ سیر، محبت پرور، مروۃ گستر، صاف دل، یک رو، صافی طینت، فرخندہ خو، بر دلِ کسے از وے غبارے نہ بفخرِ احدے اورا عارے۔ قاسم، ہیچمداں سراپا نقصان باوصفِ صحبتِ مستوفی درعرضِ چہل سال تخمیناً گاہے ندیدہ

کہ ازوے کسے رنجیدہ یا بدلِ کسے از دستش آزار رسیدہ۔" (جلد دوئم، ص ۳۶)

(و) مرزا عظیم بیگ عظیمؔ:

"بسیار صاحب غیرت و عزت ۔۔۔۔۔۔۔۔ دوست نواز، دشمن گداز، مروۃ نہاد، فتوۃ بنیاد، محبت پرور، مودۃ گستر، ظریف مزاج، صاحب ابتہاج، یک رو، کشادہ ابرو بود۔" (جلد دوئم، ص ۱)

انشاؔ کے خلاف معرکہ آرائیوں میں مرزا عظیم بیگ اور قاسمؔ کی رفاقت کے پیشِ نظر ممکن ہے اس تعریف و توصیف کو حقِ دوستی کی ادائیگی سے تعبیر کیا جائے لیکن درحقیقت ایسا نہیں۔ قاسمؔ کو صرف عظیمؔ کی خوبیوں ہی کا تجربہ نہ تھا، وہ ان کی خامیوں سے بھی پوری طرح باخبر تھے اور ایک تذکرہ نگار کی حیثیت سے اپنے فرائضِ منصبی کا احساس بھی رکھتے تھے۔ چنانچہ باہمی ربط و تعلق اور محبت و اخلاص کے رشتے انھیں اس حقیقت کے اظہار سے نہیں روک سکے ہیں کہ

"خیالِ شاعری در کاخِ دماغش چناں پیچیدہ بود کہ خود را صائبِ ہندی می پنداشت و شعرِ ہیچ متنفسے در میزانِ طبعش از خود سری ہا وزنے نداشت۔" (جلد دوئم، ص ۲)

(ز) میرؔ کی حد سے بڑھی ہوئی خود بینی و کم آمیزی کے متعلق قاسمؔ نے اپنے تجربات و مشاہدات ان الفاظ میں قلم بند کیے ہیں:

"از کبر و غرورش چہ برطرازم کہ حدے ندارد و از نخوت و خود سریش چہ برنگارم کہ سینۂ قلم حقائق رقم می فگارد۔ بر شعرِ کسے گر ہمہ اعجاز باشد، سر ہم نمی جنباند تا بہ تحسین خود چہ رسد و بسخنِ احدے اگرچہ معجز طرازی بود و گفتۂ الٰہی شیرازی گوش ہم فرا نمی آرد۔ امکان چیست کہ حرف آفرین برزبانش رود ۔۔۔۔۔۔" (جلد دوئم، ص ۲۳۰)

میرؔ صاحب کی خود سری اور متکبر مزاجی کے خلاف اس اظہارِ ناپسندیدگی کے باوجود قاسمؔ نے انصاف پسندی اور اصول پرستی کے تقاضوں کے عین مطابق ان کی

استادی اور شاعرانہ عظمت کا کھلے دل سے اعتراف کرتے ہوئے انھیں شعرائے اردو کی صف میں ایک نمایاں مقام کا مستحق قرار دیا ہے۔

(ح) سراج الدین علی خاں آرزو نے اپنے دور کے نوجوان شعرا کی تربیت اور اردو زبان اور شاعری کی تہذیب و ترقی میں جو نمایاں کردار ادا کیا ہے، اس کی بنا پر وہ ہمارے ادب کی تاریخ میں ایک قدآور شخصیت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قاسم نے ان کی علمیت اور اخلاق کی تعریف کے ساتھ ساتھ اس پہلو کو بھی بطورِ خاص اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ ملاحظہ ہو:

"از جادو طرازانِ سحر بیان و استادانِ نکتہ دانِ خاکِ پاکِ ہندوستان ..... واقفِ فروع و اصول، ماہرِ منقول و معقول ..... بہ اوصافِ حمیدہ موصوف، بہ اخلاقِ پسندیدہ معروف، نکتہ سنجِ شیریں زبان، ظریف الطبع عذب البیان بود ..... نسخہ پردازِ الہام گوئی (کذا = سخن پردازِ ایہام گو) میاں آبرو و سرآمدِ سخن سنجان خوش نوا میرزا محمد رفیع سودا و مملکتِ سخن سازی را یکہ تاز مرد، خواجہ میر درد و شاعرِ بے نظیر محمد تقی میر من جملہ فیض اندوزانِ آں گیہانِ خدیوِ سخن پردازی اند۔ بمثابہ کہ علما اہلِ حق را دامت برکاتہم، عیالِ امام ہمام، قبلۂ انام ابو حنیفہ کوفی رضی اللہ عنہ می گویند، اگر شعرائے ہندی زبان را عیالِ خان آرزو گویند، می سزد۔"

(جلد اول، ص ۲۴)

(ط) ولی کو ایک مدتِ دراز تک اردو شاعری کا باوا آدم کہا جاتا رہا ہے۔ یہ بات اس حد تک آج بھی صحیح ہے کہ وہ پہلا شاعر ہے جس نے فکر کی بلندی، زبان کے جادو اور اسلوب کی لطافت سے "ایک لچر سی بات" کو ادبیات کا شاہکار بنا دیا اور ہم عصر شعرا کو اردو میں طبع آزمائی کے بے پناہ امکانات سے روشناس کر کے فکر و فن کے تیز دھارے ایک نئے میدان کی طرف موڑ دیے۔ قاسم کے نزدیک ان کی یہی قائدانہ حیثیت ان کی شخصیت کی عظمت و انفرادیت کی اصل بنیاد ہے،

چنانچہ لکھتے ہیں:

"بہ آئینے از قدوۂ متغزلانِ سخن پرداز شیخ شیراز قدس سرہٗ رویۂ غزل از کتمِ عدم بمنصۂ ظہور جلوہ گر شد، تدوینِ دیوانِ ریختۂ مردف ومملو انواعِ سخن و مشحونِ اقسام امور ایں فن از وے بصفحۂ روزگار ثبت افتاد۔ اگرچہ اشعارِ متفرقۂ ریختہ پیش از وے ۔۔۔۔۔۔ از طبعِ ۔۔۔۔۔۔۔ دیگر سخن سنجان ہم ریختہ، اما تدوین جملگی انحائے شعر از وے بظہور پیوستہ۔ مختصر کلام حقش بر جملہ سخن پردازانِ ہندی زباں ثابت است۔" (جلد دوئم، ص ۲۹۷)

ان مثالوں سے یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ قاسم نے ایک با اصول سیرت نگار کی حیثیت سے اپنی غیر جانب داری اور انصاف پسندی کو بہر صورت برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے نہ تو معاصرانہ چشمک یا ذاتی مخاصمت و پرخاش کی بنا پر کسی شاعر کے معائبِ سیرت و اخلاق کا پردہ فاش کیا ہے، نہ تنگ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کسی کے محاسن ذات و مکارمِ صفات کی تحسین و توصیف میں بخل سے کام لیا ہے اور نہ ذاتی تعلقات اور مراسم کی بنیاد پر بے جا تعریف و تحسین کو اپنا شعار بنایا ہے۔ یہ دیانت داری اور فرض شناسی قاسم کی تحریر کو ایک وزن اور وقار عطا کرتی ہے جو ان کی انفرادیت اور امتیاز کا ضامن ہے۔

سیرت نگاری اور شخصیت کی مرقع کشی کے برخلاف تنقیدِ کلام کے معاملے میں قاسم کا رویہ مایوس کن ہے۔ انھوں نے شعرا کی تخلیقی صلاحیتوں کے معیار و منہاج اور ان کے سرمایۂ افکار کی لسانی و بیانی خصوصیات کے متعلق اظہارِ خیال پر وہ توجہ صرف نہیں کی ہے جس کی ان جیسے ذی علم اور صاحب نظر ادیب سے بجا طور پر توقع کی جا سکتی ہے۔ چنانچہ اس تذکرے میں بغیر کسی رائے کے اشعار پیش کر دینے کی روش عام ہے اور اگر کسی جگہ کوئی رائے ظاہر کی بھی گئی ہے تو اس کا انداز بالعموم اس قسم کا ہے:

(الف) میر کلو شاعر:۔ "مذاقِ گفتارش بسیار شیریں، طرزِ اشعارش

تہایت دل نشیں۔" (جلد اول، ص ۳۳۵)

(ب) میر محمدی شرف :۔ "کلامش پختہ و باکیفیت است۔ خیال بندی بخیالش خیلے جا داشت۔" (جلد اول، ص ۳۴۰)

(ج) فتح علی شیدا :۔ "شعرش نہایت پختہ و باکیفیت است۔"
(جلد اول ص ۳۵۶)

(د) شاہ گھسیٹا عشق :۔ "شعرش باکیفیت و تصوف آلودہ و پر مزہ و درد آمودہ است۔" (جلد اول، ص ۳۸۴)

(ہ) انعام اللہ خاں یقین :۔ "طرزِ نوی بدستش افتادہ۔ اندازِ جدید را رونقِ تازہ دادہ۔ ہمیشہ غزلِ پنج بیتی می گفت۔ اما بطرزِ بہیں درِ معنی می سفت۔" (جلد دوئم ص ۳۵۵)

یہ مجمل و مختصر تنقیدی اشارے بھی "النادر کالمعدوم" کی حیثیت رکھتے ہیں کیونکہ شاعروں کی تعداد کے مقابلے میں ان کا تناسب نہ ہونے کے برابر ہے، البتہ صفِ اول و دوئم کے بعض نامور اساتذہ اور ممتاز فن کار جن کے نام انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں، اس امتیاز کے مستحق قرار پائے ہیں کہ ان کے کلام کی منفرد خصوصیات کو نسبتاً نمایاں اور واضح طور پر بیان کر دیا جائے۔ چنانچہ شاہ مبارک آبروؔ کے ذکر میں ان کی شاعری اور اس کے ضمن میں اس زمانے کے بعض مخصوص فنی و لسانی تصورات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"در طرزِ گفتار حسبِ رواجِ آن وقت بیشتر بہ ایہام گوئی صرفِ ہمت می نمود۔ وجودِ الفاظ منکرہ و عدمِ مبالاتِ تنگیٔ الفاظ و جوازِ قافیہ سین و صاد۔ وامثالِ آں در کلامش و کذالک در اشعارِ معاصرانش زیادہ براں است کہ بہ تحریر در آید۔ اما در شاعریٔ ایں بزرگاں علی تفاوت المراتب، ہیچ شک شبہ نیست۔ رواج یافتنِ امرے در عہدے کہ مرغوب الطبعِ اہلِ عہدِ دیگر نباشد، امرے دیگر است۔" (جلد اول ص ۲۱)

میر اثر کی شاعری کے متعلق یہ رائے ظاہر کی ہے کہ

"شعرِ ایشان نہایت با اثر و بدرجۂ اعلائے فصاحت است۔ نسخۂ درست از دیوانِ برادرِ بزرگوار برداشتہ اند۔ بہ آئینے کہ خود فنا در ذاتِ ستودہ صفاتِ برادرِ کریم بودند، شعرِ ایشان ہم فنا در شعرِ اوشان است۔ دیوانے مختصر در نہایت جودت و پاکیزگی و مثنوی خوردک در غایتِ متانت و شستگی یادگارِ ایں بزرگوار است۔" (جلد اول ص ۴۴)

شاہ محمدی بیدار کے کلام میں جو خوبیاں نمائندہ خصوصیات کا درجہ رکھتی ہیں، قاسم نے ان کو ان الفاظ میں پیش کیا ہے:

"شعرش بسیار با کیفیت و پختگی و بہ نہایتِ حلاوت و دل بستگی است۔ بندشِ الفاظ و استخواں بندیٔ آن بدرجۂ اعلیٰ دارد۔ و با ایں ہمہ نزاکتِ معنی بوجدانِ نازک خیالان خیلے می سازد۔" (جلد اول، ص ۱۱۸)

مرزا عظیم بیگ عظیمؔ دہلوی کے ذکر میں ان کے شاعرانہ کمالات اور کلام کی امتیازی خصوصیات کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"شعرش پختگی تمام دارد۔ در خیال بندی و نازک خیالی خیلے ہنر پردازی ہا بروے کار آرد۔ دریں کار استوار یدِ طولیٰ داشت و بیشتر بمعانی بندی ہمت می گماشت ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ صنائع بدائع بسیار بکار می برد۔ زورِ طبعش از قصائدِ ریختۂ طبع وقادش روشن می شود۔ قصیدۂ وے بے اغراق بقصیدہ سرآمد شعرائے فصاحت آمامرزا محمد رفیع سوداؔ می ماند ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ شعرش باوصفِ قلتِ بضاعتِ عالمِ دیگر دارد و شاعریٔ وے باوجودِ کم نظری بر کلامِ اساتذہ قدیمہ از جہان دیگر است۔" (جلد دوئم، ص ص ۱ و ۲)

اردو شاعری میں انشاؔ کی انفرادیت کا راز ان کے زورِ طبیعت کی ہمہ گیری میں مضمر ہے۔ قاسم اس وصف خاص کو ان الفاظ میں نمایاں کرتے ہیں:

"طرزِ گفتارش بشاعرِ فصاحت افروز محمد میر سوزؔ ماناست۔ ایں طرز

اگرچہ مرغوب الطبع وے افتادہ، اما بہرگونہ سخن طرازی دستے دارد۔ از قصائد و مثنویات وے خاصہ قصیدۂ کہ در تہنیت سال گرہ مرشد زادۂ شوکت پژدہ میرزا سلیمان شکوہ بہادر در ایام ملازمئ سرکارِ دولت مدارِ آن والا تبار در بلدۂ لکھنؤ گفتہ کہ مطلعش ایں است ؎

صبح دم میں نے جو لی بسترِ گل پر کروٹ
جنبشِ بادِ بہاری سے گئی آنکھ اُچٹ

زورِ طبعش معلوم می شود۔ بنا بر بضاعتے کہ از علوم شریف دارد، کلامش صحت نظام است۔" (جلد اول، ص ص ۸۰ و ۸۱)

میر کی شاعری کے متعلق بھی قاسم نے بڑی صائب رائے کا اظہار کیا ہے۔ وہ غزل گوئی میں ان کے امتیاز کے معترف ہیں لیکن بحیثیتِ مجموعی انھیں سوداؔ سے کمتر درجے کا شاعر سمجھتے ہیں جیسا کہ دونوں اساتذہ کے اس تقابلی مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے:

"زعمِ بعضے آں کہ سرآمد شعرائے فصاحت آما مرزا محمد رفیع سوداؔ در غزل گوئی سخن بوے نرسانیدہ اما حق آنست کہ ع ہر گلے را رنگ و بوے دیگر است۔ مرزا دریائے است بیکراں و میر نہرے است عظیم الشان۔ در معلومات قواعدِ فن میر را بر مرزا برتری است و در قوتِ شاعری مرزا را بر میر سروری۔"

(جلد دوم، ص ص ۲۳۰ و ۲۳۱)

بعض اوقات مشرقی تنقید کی ابتدائی روایات کے عین مطابق قاسم نے اشعار کے لفظی و معنوی اسقام سے بھی بحث کی ہے اور ان معائب کو دور کرنے کے لیے متبادل الفاظ اور مصرعے بھی تجویز کیے ہیں۔ اگرچہ اس قسم کی تنقید و اصلاح کی مثالیں پورے تذکرے میں صرف پانچ چھ مقامات پر ملتی ہیں تاہم ان سے مولف کے فنی شعور اور زبان کی لطافتوں اور نزاکتوں پر دسترس کا اندازہ ہوتا ہے، اس لیے اس سلسلۂ بحث میں ان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

میر محب علی حالؔی قاسم کے ایک غیر معروف ہم عصر تھے جو ان کے بقول

سودا اور میر جیسے اساتذہ کے کلام کو ساقط المعیار سمجھتے تھے۔ ان کے اس مطلع پر کہ ؎

عوض میں بوسے کے دے ہے گالی، سوال دیگر جواب دیگر
یہ طرز تو نے عجب نکالی، سوال دیگر جواب دیگر

قاسم نے یہ اعتراض وارد کیا ہے کہ:

"قطع نظر از لغویتِ لفظ "میں" متبادر از مصرعۂ اوّل اعطاے بوسہ بمعشوق و یافتن عاشق عوضِ آں دشنام از وے است۔ اگرچہ بدلالتِ لفظِ "سوال" المعنی الذی فی بطن الشاعر بہ تکلف ظاہر می شوند۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔
بگمانِ قاسم، ہیچ مداں سراپا نقصان اگر ایں چنیں می گفت، بہر حال خوب می شد

میں چاہوں بوسہ وہ دیں ہیں گالی سوال دیگر جواب دیگر
یہ طرز انھوں نے نئی نکالی سوال دیگر جواب دیگر"

(جلد اول، ص ۱۹۵)

مرزا قاسم علی رقت کا ایک مطلع ہے ؎

ہمارے سامنے مت ابر بار بار برس
جو ہم سے ہو سکے، تجھ سے نہ ہو ہزار برس

قاسم نے معمولی سی ترمیم کا مشورہ دے کر اس مطلع کے حسن کو دوبالا کر دیا ہے۔ کہتے ہیں کہ:

"اگر در مصرعۂ اولیٰ قافیہ "نوبہار" می نمود، خوب می بود۔" (جلد اول، ص ۲۷۵)

میر ضیا دہلوی کی ایک غزل کا مطلع ہے ؎

باؤ بھی کھائی نہ تھی دل نے کہ مرجھانے لگا
آہ یہ غنچہ تو کچھ کھلتے ہی کملانے لگا

قاسم اس شعر کے دوسرے مصرعے کی موزونی سے متفق نہیں۔ ان کا خیال ہے کہ یہ مصرع اگر اس طرح کہا جاتا تو بہتر ہوتا ؎

پہلے ہی کھلنے سے یہ غنچہ تو کملانے لگا (جلد اول، ص ۳۶۵)

ولی دکنی کے انتخابِ کلام میں ایک شعر یہ بھی ہے ؎

فصاحت کیا کہوں اس خوش دہن کی　　کسی کا واں نہیں ہوتا سخن سبز

اس شعر میں قاسم کی مجوزہ تبدیلی ہمارے نزدیک زیادہ لطیف اور برجستہ نہیں تاہم الفاظ کے معمولی سے رد و بدل کے ذریعے جو رعایت پیدا کی گئی ہے وہ اس دور کے عام شعری تصورات اور معیارِ فن کے نقطۂ نظر سے ایک خاص کیفیت کی حامل ہے۔ لکھتے ہیں کہ :

"اگر بجائے "اس خوش دہن" "پستہ دہن" می گفت، سبزی سخن می افزود۔" (جلد دوم، ص ۳۰۵)

ان بنیادی مباحث کے پہلو بہ پہلو اس تذکرے میں ضمنی طور پر کچھ ایسے اہم اور دل چسپ موضوعات بھی زیرِ بحث آئے ہیں جن سے تاریخ ادب کے مطالعے میں بعض نئے گوشوں کا اضافہ ہوتا ہے۔ ولی دکنی کے متعلق صاحبِ نکات الشعرا کی مشہور رائے اور اس کے ردِ عمل کے بارے میں قاسم کے بیانات اسی ضمن میں آتے ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے پیر خاں کمتر کے حالات میں یہ جملہ ہماری نظر سے گزرتا ہے کہ :

"بنا بر نوشتۂ میر در تذکرۂ خود شاعرِ شانِ جلی المتخلص بہ ولی را کہ "وے شاعر لیست از شیطان مشہور تر" ہجو ہائے رکیکہ بو اجبی نمود۔" (جلد دوم، ص ۱۴۳)

اس کے بعد میر صاحب کے ذکر میں یہی بات اس طرح دوہرائی گئی ہے :

"در تذکرۂ خود ہمہ کس را بہ بدی یاد کردہ۔ در حقِ شاعرِ شان جلی المتخلص بہ ولی نوشتہ کہ "وے شاعرے است از شیطان مشہور تر" و سزائے ایں کردارِ ناہنجار از کمترین شاعر بو اجبی یافتہ کہ وے ہجو ہائے متعددہ او کردہ کہ بعضے ازاں بغایت رکیک نہ پردہ در افتادہ۔" (جلد دوم، ص ۲۳۰)

تیسری جگہ ولی کے حال میں بایں الفاظ اس طرف اشارہ کیا گیا ہے :

"سخن بر سخنش ابلیس منشی و شیطنت۔ پیر خاں کمترین خداش بیامرزد،

بسیار بموقع و بجا گفتہ کہ ع

"ولی پر جو سخن لاوے اسے شیطان کہتے ہیں"۔ (جلد دوم، ص ۲۹۷)

قاسم کے یہ انکشافات ہمارے لیے غور و فکر اور تحقیق و تلاش کا ایک نیا موضوع فراہم کرتے ہیں۔ ان کی اہمیت اس اعتبار سے اور بھی زیادہ ہو جاتی ہے کہ یہ باتیں میر صاحب کی زندگی میں کہی گئی ہیں اور ان کی یا ان کے کسی ارادت مند کی جانب سے کسی جوابی یا مدافعانہ کارروائی کا کوئی ثبوت موجود نہیں۔

قاسم کا یہ تذکرہ اپنے دور کے ادبی ماحول کے بارے میں بھی بڑی اچھی معلومات فراہم کرتا ہے۔ شاعری کی تعمیم اور اربابِ کمال کی ناقدری کے متعلق ان کے اس تاثر کے باوجود جسے مقدمے پر بحث کے ضمن میں نقل کیا جا چکا ہے، ہم یہ دیکھتے ہیں کہ بیشتر ذی علم حضرات اس فن کی طرف راغب ہیں اور امرا اور روسا کا قدر شناس طبقہ اپنی حیثیت کے مطابق ان کی سرپرستی میں مصروف ہے۔ جا بجا مقررہ اوقات پر مشاعرے منعقد ہوتے ہیں اور لوگ پورے جوش و خروش کے ساتھ ان میں شرکت کرتے ہیں۔ فن کے اصول و آداب کی نگہداشت کے متعلق مباحثوں سے معرکہ آرائی تک نوبت پہنچتی ہے اور اہلِ کمال کو اپنی طبیعتوں کے جوہر دکھانے کا موقع ملتا ہے جس کے نتیجے میں رکاکت و ابتذال سے معمور ہجویہ نظموں کے پہلو بہ پہلو کچھ ایسی گراں قدر تخلیقات بھی معرضِ وجود میں آجاتی ہیں جنھیں مستقبل میں ایک قابلِ لحاظ ادبی سرمائے کی حیثیت حاصل کرنا ہے۔ اس قسم کی محفلوں میں پیش آئے ہوئے بعض اہم اور دلچسپ واقعات اور لطیفے یہاں درج کیے جاتے ہیں۔

خان آرزو کے مشاعرے میں سودا نے ایک غزل پڑھی جو دراصل قدسی کی غزل کا ترجمہ تھی لیکن سوائے خان آرزو کے کوئی اس حقیقت تک نہ پہنچ سکا یا مصلحتاً کسی نے اس کا اظہار مناسب نہ سمجھا۔ مولانا محمد حسین آزاد نے آبِ حیات میں اس واقعے کی جو تفصیلات درج کی ہیں ان کا ماخذ مجموعۂ نغز کی یہ روایت ہے کہ

"روزے در مجلسِ مشاعرہ کہ در خانہ خانِ موصوف (آرزو) انعقاد

می یافت، میرزا محمد رفیع سوداؔ غزلِ حاجی محمد جان قدسی را بطور خود مترجم ساختہ برخواندنِ آں بشد و بدِ تمام ہمت گماشت۔ اتفاقاً احدے از حضارِ مجلس براں نرسید یا از خوفِ مترجم کہ بہ ادنیٰ سبب بے محابا بہجوِ ہر کس می پرداخت، سکوت ورزید۔ خان تحسین بلیغ فرمود و در اثنائے توصیف بدیہۃً بر زبانِ روشن بیان جاری نمود کہ ؎

شعرِ سوداؔ حدیثِ قدسی ہے　　لکھ رکھیں چاہیے فلک پہ ملک

مرزا بے اختیار برخواستہ بر سینۂ خان چسپید و سخن بمزاح و طیبت کشید۔"

(جلد اول، ص ص ۲۵ و ۲۶)

جرأتؔ کی شاعری کے متعلق میرؔ کا مشہور استہزائیہ جملہ بھی اسی تذکرے کی وساطت سے مولانا آزاد تک پہنچا ہے۔ قاسم نے یہ سرگذشت اس طرح بیان کی ہے:

"روزے در مجلسِ شعرا کہ بخانۂ مرزا محمد تقی خاں ترقی انعقاد می یافت، بابسیارے از تلامذۂ خود رسیدہ غزل ہا برخواند و موردِ تحسین و آفریں خاص و عام گشت کہ شنیدنِ شعر مشکل شد تا بفہمیدن خود چہ رسد۔ اتفاقاً سخن سنجِ بے نظیر محمد تقی میرؔ ہم دراں مجلس حاضر بود۔ قلندر بخش جرأتؔ، جرأت نمودہ خود را بہ پہلوے میرؔ رسانیدہ دادِ خواہِ اشعارِ خود شد۔ میرؔ بعد ازاں کہ دو سہ بار مواساکرد، چوں ابرامش دریں امر از حد درگذشت، گفت کہ ہرگاہ ایشان بدیں جدوکد می پرسند، ناچار می گویم وایں الفاظِ ہندی بر زبان نخوت تواماں وے گذشت: کیفیت اس کی یہ ہے کہ تم شعر تو کہہ نہیں جانتے ہو، اپنی چوما چاٹا کہہ لیا کرو۔" (جلد اول، ص ص ۱۵۵ و ۱۵۶)

نواب امین الدولہ مرزا مینڈھو امیرؔ کے حالات میں لکھتے ہیں کہ ایک بار مرزا عظیم بیگ عظیمؔ نے جو بڑے آزاد وضع اور بے باک قسم کے انسان تھے، یہ کہہ کر آپ کے مشاعرے میں شرکت سے انکار کر دیا کہ مجھے خواہ مخواہ کسی امیرزادے کی

تعظیم و تکریم بجالانے اور مسندِ صدارت کی پائیں نشینی اختیار کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ جب امین الدولہ کو اس کی اطلاع ہوئی تو انھوں نے اس پیش کش کے ساتھ عظیم کو دوبارہ شرکت کی دعوت دی کہ آپ ضرور تشریف لائیں، ہم بھی آپ کے ساتھ چاندنی پر ہی بیٹھیں گے۔ اس کے بعد سے مسند پر بیٹھنے کی رسم ہمیشہ کے لیے موقوف ہو گئی۔ اس واقعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ امرا کی محفلوں میں شعرا کی کس قدر ناز برداری کی جاتی تھی۔ اسی مشاعرے کے سلسلے میں آگے چل کر لکھتے ہیں کہ:

"در ایام متبرکۂ صیام کہ برائے سخن سنجانِ اسلام سفرۂ امیرانہ می کشید و نظر بر کرم کریمانہ اش بمذاقِ شعرائے ہند و نژاد شیرینی قسم اعلیٰ می رسید۔ برخوردارِ کامگار میر عزت اللہ عشق ۔۔۔۔۔۔ چوں دریں ایام خجستہ آغازِ فرخندہ انجام بنا بر خواندنِ خیر الکلام در تراویح (در مجلسِ مشاعرہ) نمی رفت، بمبالغۂ تمام ہنگامِ افطار یاد فرمودہ گونہ گونہ عنایت دربارۂ او مبذول داشتہ نوع نوع اطعمۂ اشربۂ و فواکہِ خشک و تر بدستِ حق پرست خود لطف می فرمود۔" (جلد اول ص ۷۲)

انشا کے ترجمۂ احوال سے معلوم ہوتا ہے کہ نواب امین الدولہ اپنے مشاعروں میں ثناء اللہ خاں فراق، مرزا عظیم بیگ عظیم اور قاسم پر بطورِ خاص جو توجہات و عنایات مبذول فرماتے رہتے تھے، وہ انشا، برکت اللہ خاں برکت اور مشتاق علی خاں مشتاق کو ان کے مقتضائے طبیعت کی بنا پر شاق گزرتی تھیں۔ خاص طور پر عظیم اور انشا کے درمیان اکثر ٹھنی رہتی اور دونوں ایک دوسرے کی "تہجین و تذلیل" پر کمربستہ رہتے تھے۔ چنانچہ ایک بار کا واقعہ ہے کہ

"مرزائے مذکور غزلے طرح انداخت و بنا بر غروری کہ در سر داشت، لاابالیانہ بفکرِ مضمون و معانی افتادہ در حینِ شناوری بحر رجز غوطہ خوردہ بہ بحرِ رمل افتاد و بعدِ انصرام غزل بے آن کہ رو بروئے محبان و دوستان بخواند، بے تحاشا بحضورِ میر ماشاء اللہ خاں مرحوم کہ دوست و محسنِ مرزائے مغفور بود، برخواند۔ قضارا میر موصوف (انشا) مجلس نشینِ پدرِ بزرگوارِ خود بود، حریفانہ

تحسین بلیغ نمودہ مکرر بگوشِ ہوش شنودہ یاد گرفتہ بہ افواہِ یاران انداخت و در عین مجمعِ شعرا تکلیفِ تقطیع نمودہ مرزا را ملزم ساخت و دراں وقت بوے رسید و شنید آنچہ شنید۔ اگرچہ من بعد ایں ماجرا مخمسے در ہجوِ ملیح میر مشارٌ الیہ و در جوابِ ایں لغزش گفتہ اما مشتے کہ بعدِ جنگ یاد آید، بر کلۂ خویش باید زد۔۔۔۔۔۔۔ ازاں پس مرزا چناں متنبہ شدہ بود کہ اگر مصرعے موزوں می کرد، بے آں کہ بگوشِ ایں ہیچمداں نرساند، بر زبان نمی آورد تا بخواندن بخفو کس چہ رسد۔" (جلد اول، ص ص ۸۲ و ۸۳)

یہ واقعہ اور اس کے بعد پیش آنے والے معرکوں کی مکمل تفصیلات جو تذکرے کے کئی صفحات پر پھیلی ہوئی ہیں، مولانا آزاد آبِ حیات میں نقل کر چکے ہیں، اس لیے یہاں مزید تفصیل غیر ضروری معلوم ہوتی ہے۔

مہدی علی خاں عاشقؔ کے مشاعرے کا ذکر کئی تذکرہ نگاروں نے کیا ہے۔ اس محفل کی سب سے بڑی خصوصیت پابندیٔ وقت تھی۔ قاسم نے اس سلسلے میں یہ معلومات فراہم کی ہے:

"قریب دوازدہ سال بلا ناغہ روزِ جمعہ بہ انعقادِ مجلسِ مشاعرہ بخانۂ خود پرداخت و بہ ہیچ مانعِ قوی بل اقویٰ موقوف نساخت۔ حتیٰ کہ صبح فاتحۂ سیوم فرزندِ ارجمندِ خود نمودہ و بعدِ ظہر مجلسِ مراختہ منعقد فرمود۔"

(جلد اول، ص ۲۷۹)

مکرم الدولہ بہادر بیگ خاں غالبؔ کے حال میں لکھتے ہیں:

"یک چند مجلسِ مراختہ بدولت خانۂ خود منعقد می ساخت و بضیافتِ مجلسیان خاصہ شعرائے فصاحت بیان بہ انواعِ اطعمہ و اقسامِ اشربہ و اسنائے حلاوی و صد گونہ رقص می پرداخت۔" (جلد دوئم ص ۲۴)

مجموعہ نغز کے مطالعے سے ان مجالسِ شعر و سخن کے علاوہ دہلی میں بھورے خاں آشفتہؔ، حمید الرحمٰن انیسؔ، اسد بیگ رفیقؔ، سجاد اکبر آبادی، میر محمدی شرفؔ،

ممتاز الملک ظفر یاب خاں صاحب، راجہ شنکر ناتھ صبا اور مصحفی کی قیام گاہوں پر، لکھنؤ میں شاہزادہ سلیمان شکوہ اور مرزا رضا قلی آشفتہ کے ہاں اور رام پور میں مولوی قدرت اللہ قدرت کے مکان پر مشاعروں کے انعقاد کا بھی پتا چلتا ہے۔ مجموعہ نغز کے یہ بیانات اردو شاعری کی مقبولیت اور محافل سخن کے رواج عام کو بڑی خوبی کے ساتھ نمایاں کرتے ہیں۔

اس تذکرے کے اوراق پر ایسے اشارات بھی جا بجا بکھرے ہوئے ہیں جن سے اس دور کے تاریخی حالات، سیاسی ابتری اور سماجی انتشار کا پتا چلتا ہے اور احمد شاہ ابدالی کے حملے، اعیانِ سلطنت کے باہمی اختلافات اور اسی قسم کے دوسرے حادثات و واقعات کے نتیجے میں نظامِ مملکت کی زوال آمادگی جس طرح اربابِ فضل و کمال کا شیرازہ منتشر کر رہی تھی، سالہا سال کی کوششوں سے پروان چڑھی ہوئی تہذیب شکست و ریخت کے جس عمل سے دوچار تھی اور لوگوں کی فکری سطح اور اخلاقی معیار جس قدر پست ہو چکے تھے، اس کا اندازہ ہوتا ہے۔ عبدالحئی تاباںؔ کے حال میں ایک ثقہ اور معتبر بزرگ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"امردانِ شیریں ادا و سادہ رویانِ ملاحت آمادرخانۂ وے بزر و زیور آراستہ و پیراستہ می شدند و حسب الطلب امرائے قزل باش در محافہا نشستہ بشب مہمان می رفتند۔ از شومیٔ ایں چنیں کردار ہائے ناہنجار بحضرتِ دہلی رسید آنچہ رسید۔ نَعُوذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُورِ اَنْفُسِنا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمالِنا۔"

(جلد اول، ص ۱۳۲)

زشتیٔ اعمال و کردار کی جو تصویر اس تحریر کے آئینے میں ابھر کر سامنے آئی ہے وہ کسی فرد واحد یا چند افراد کی بجائے پورے معاشرے کی نمائندگی کرتی ہے۔ اسی طرح ایک ہزل گو شاعر شہوتؔ کے متعلق یہ بیان عام پست مذاقی اور ذہنی و اخلاقی زوال کا آئینہ دار ہے:

"وے مرد کے بود فحاش و ہزل گو، قرم ساق، نکو ہیدہ خو، خودرا

از دودمانِ شرافت می پنداشت و ہمگی ہمت بر قرم ساقی و ہرزہ درائی می گماشت۔
خود را بہ میر بکری اشتہار دادہ۔ از پیش گاہِ سلطنت بہ آرزوے تمام مسخرۃ الدولہ
قرم ساق خاں بہادر پھکڑ جنگ خطاب گرفتہ در ہم پیشگانِ خویش علمِ امتیاز
برافراشتہ" (جلد اول، ص ۳۵۴)

مجموعہ نغز کا یہ امتیاز بھی کچھ کم قابلِ تعریف نہیں کہ اس میں دوسرے طویل تذکروں کے مقابلے میں مسلمہ حقائق و واقعات سے انحراف کی مثالیں تقریباً مفقود ہیں اور اشعار کے انتساب میں بھی بہت کم غلطیاں ہوئی ہیں۔ تذکرے کو ان لغزشوں سے بڑی حد تک پاک رکھنے میں قاسم کے ذوقِ جستجو، عالمانہ نظر اور ناقدانہ بصیرت کا بڑا ہاتھ ہے۔ انھوں نے محض دوسروں کے اقوال و بیانات پر اکتفا نہ کرتے ہوئے حتی الوسع معتبر ترین مآخذ تک پہنچنے اور بالعموم ذاتی مشاہدات و معلومات کو زیادہ شرح و بسط کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اسی لیے ان کے ہاں جو تھوڑی بہت غلطیاں نظر آتی ہیں وہ یا تو بدیہی طور پر کسی اتفاق یا سہوِ نظر کا نتیجہ ہیں یا دوسرے ذرائع تصدیق کی عدم موجودگی میں پیشرو تذکرہ نگاروں کی روایات پر اعتماد و انحصار کے باعث رونما ہوئی ہیں۔ ذیل کی مثالوں سے اس صورتِ حال کی وضاحت ہوگی۔

(الف) مرزا رفیع سودا کے مشہور شاگرد معین بدایونی کے متعلق لکھتے ہیں:

"غلام معین الدین خاں مرحوم ۔۔۔۔۔۔۔ شاعرے بود از دیرینہ
مشقانِ خوش نوا ۔۔۔۔۔۔۔ گویند کہ از سکنۂ الہ آباد و بسیار مردِ نیک نہاد
بود" (جلد دوم، ص ۲۰۱)

میر حسن، امراللہ الہ آبادی اور دوسرے کئی تذکرہ نگاروں نے شاعرِ مذکور کو شیخ محمد معین الدین[1]، شیخ معین الدین[2] یا صرف معین الدین[3] کے نام سے یاد کیا ہے۔

---

[1] تذکرہ شعرائے اردو، طبع دوئم، ص ۱۶۵

[2] تذکرہ مسرت افزا ص ۲۰۲ [3] طبقات الشعرا ص ۲۷۳

بدایوں سے وطنی تعلق کا معاملہ بھی ان لوگوں کے درمیان متفق علیہ ہے۔ ایسی صورت میں قاسم کے یہ بیانات کہ ان کا نام غلام معین الدین اور وطن الہ آباد تھا، خلافِ واقعہ قرار پاتے ہیں۔ ہمارے خیال میں یہ غلطی "عیار الشعرا" اور "عمدۂ منتخبہ" کی تقلید کا نتیجہ ہے۔ ان دونوں تذکروں میں معینؔ کو علی الترتیب غلام معین الدین[۱] اور معین الدین خاں باشندۂ الہ آباد[۲] لکھا گیا ہے۔

(ب) ردیف نون میں نوآؔ تخلص کے تحت لکھتے ہیں:

"شیخ محمد ظہور ۔۔۔۔۔۔۔ طالب علمے از طلبائے بلدہ لکھنؤ ۔۔۔۔۔

۔۔۔۔ شاگردِ محمد بقاء اللہ اکبر آبادی است" (جلد دوئم، ص ۲۸۶)

اس کے بعد تکملے کے تحت اسی تخلص کے ذیل میں رقم طراز ہیں:

"عزیزے است سعادت نشان المسمیٰ بہ ظہور اللہ خاں"

(جلد دوئم، ص ۴۰۹)

ان بیانات کے ذریعے قاسم نے "شیخ محمد ظہور نوآؔ" اور "ظہور اللہ خاں نوآؔ" کے درمیان جو فرق قائم کیا ہے، وہ درست نہیں۔ یہ دراصل ایک ہی نام کی دو صورتیں ہیں جن میں سے پہلی غلط اور دوسری صحیح ہے۔ نوآؔ کا وطن بدایوں تھا اور وہ نسباً شیخ صدیقی تھے۔ لفظِ "خان" شاہزادہ جواں بخت کے دربار سے ملے ہوئے خطاب "خوش فکر خاں" کی رعایت سے ان کے نام کا جز بن گیا تھا۔[۳] "مجموعہ نغز" میں ان کے حالات بہ ادنیٰ تغیر "عمدۂ منتخبہ" سے نقل کیے گئے ہیں لیکن وہاں یہ غلطی موجود نہیں۔ سرورؔ انھیں "ظہور اللہ خاں طالب علم باشندہ لکھنؤ متوطن بداؤں"[۴] قرار دیتے ہیں۔

---

[۱] عیار الشعرا، مخطوطہ انجمن، ورق ۲۲۸ الف

[۲] عمدۂ منتخبہ ص ۶۸۰

[۳] مختصر سیر ہندوستان ص ۹۳

[۴] عمدۂ منتخبہ ص ۷۹۵

(ج) تکملے ہی کے ذیل میں محمد روشن جو شش عظیم آبادی کے فوراً بعد ان کے بھائی محمد عابد دل کا ترجمہ بھی اسی تخلص (جو شش) کے ساتھ قلم بند کیا گیا ہے (جلد دوئم، ص ۳۸۰) یہ غلطی بھی بظاہر "عیار الشعرا" یا "عمدۂ منتخبہ" کے اتباع پر مبنی ہے۔

(د) تذکرے کے اسی آخری حصے جسے تکملے کا نام دیا گیا ہے، ایک مجہول الاحوال شاعر شیخ عبدالواسع عزت کے نام سے درجِ ذیل مطلع منقول ہے ؎

بجز رفاقتِ تنہائی آسرا نہ رہا　　سوائے بیکسی اب کوئی آشنا نہ رہا

میر، قائم، میر حسن اور امراللہ الہ آبادی اس مطلع کو سید عبدالولی عزلت سورتی سے منسوب کرتے ہیں البتہ دوسرے تذکرہ نگاروں کے برخلاف میر حسن نے ان کا نام سید عبدالواسع تحریر کیا ہے[1]، جو یقیناً غلط ہے۔ تذکرہ میر حسن کی اس روایت میں مزید تحریف یعنی تخلص کی تبدیلی بظاہر سہو کتابت کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے۔

(ہ) احسن اللہ احسن کا مشہور شعر ہے ؎

لام نستعلیق کا ہے اُس بتِ خوش خط کی زلف
ہم تو کافر ہوں اگر بندے نہ ہوں اسلام کے

ذکا کی طرح قاسم نے بھی اس شعر کو اولاً احسن سے اور اس کے بعد شرف الدین علی خاں پیام سے منسوب کیا ہے۔ مستند ماخذ کے مطابق انتساب دوئم درست نہیں۔

(و) ایک مشہور رباعی ہے:

میخانے میں کیا پھرے ہے مٹکی مٹکی　　نت شیخ و برہمن سے ہے بھٹکی بھٹکی
قاضی سے ڈر ہے نہ محتسب سے کافر　　یہ دخترِ رز ہے جس سے اٹکی اٹکی

یہ رباعی بھی قاسم نے ذکا کی پیروی میں کلامِ انشا کے تحت نقل کی ہے۔ مسرت افزا اور تذکرۂ شعرائے اردو میں اسے میر علی نقی کافر سے منسوب کیا گیا ہے، لیکن جیسا کہ "عیار الشعرا" پر بحث کے سلسلے میں واضح کیا جا چکا ہے، دراصل

---

[1] تذکرہ شعرائے اردو طبعِ ثانی، ص ۱۰۷

یہ میر عبدالحئی تاباںؔ کی تصنیف ہے۔

(ز) میرؔ کی ایک غزل کے دو شعر ہیں:

برقع کو اٹھا چہرے سے وہ بت اگر آوے — اللہ کی قدرت کا تماشا نظر آوے
اے ناقۂ لیلیٰ دو قدم راہ غلط کر — مجنونِ زخود رفتہ مگر راہ پر آوے

"عیار الشعرا" کی تقلید میں "مجموعہ نغز" میں بھی یہ دونوں اشعار بیک وقت میرؔ صاحب اور محتشم علی خاں حشمتؔ کے کلام میں شامل ہیں۔ لیکن یہ غلطی صرف پنجاب یونیورسٹی کے نسخے میں پائی جاتی ہے۔ انڈیا آفس لائبریری کا نسخہ اس سے مبرا ہے[1]

(ح) درج ذیل اشعار بھی اس تذکرے میں دو شاعروں کے انتخاباتِ کلام میں مشترک ہیں:

ہوا ہے عشق سے آکر مقابلہ دل کا — بھڑا پہاڑ سے جا بل بے حوصلہ دل کا
سرشک و آہ ہے، شورِ جنوں ہے، وحشت ہے — عجب شکوہ سے جاتا ہے قافلہ دل کا
کہاں ہے شیشۂ مے، محتسب خدا سے تو ڈر — مری بغل میں جھلکتا ہے آبلہ دل کا

یہ تینوں شعر پہلے شاہ قدرت اللہ قدرتؔ سے (جلد دوئم، ص ۱۲۴) پھر واقف شاہ واقفؔ سے (جلد دوئم، ص ۲۸۹) منسوب کیے گئے ہیں لیکن دراصل ایک تیسرے شاعر مراد علی حیرتؔ مراد آبادی کے نتائجِ فکر ہیں[2]۔ قاسمؔ نے یہاں بھی شاید "عیار الشعرا" ہی کا اتباع کیا ہے۔

(ط) مندرجہ ذیل دو مطلعے بھی اعادے کی ایسی ہی مثالیں پیش کرتے ہیں ؎

آتا ہے ہر سحر اٹھ، تیری برابری کو — کیا دن لگے ہیں دیکھو خورشید خاوری کو
مرا جس ناز سے تو نے لیا دل — خدا جانے ہے اس کو یا مرا دل

مطلع اول خان آرزوؔ (جلد اول، ص ۲۵) اور ان کے شاگرد رائے انند رام

---

[1] بحوالہ نسخۂ مطبوعہ جلد اول، حاشیہ ص ۲۱۲

[2] "عیار الشعرا" کے ذیل میں اس موضوع پر تفصیلی بحث کی جا چکی ہے

مخلص (جلد دوئم، ص ۱۷۶) کے کلام میں مشترک ہے۔ مرزا علی لطف کے ہاں اس نین میں آرزو کے نام سے مکمل غزل کی موجودگی پہلے انتساب کی تائید کرتی ہے[۱]۔ دوسرا مطلع اصل متن میں سوز کے ایک شاگرد شمس الدین ہوش لکھنوی سے (جلد دوئم، ص ۳۵۳) اور تکملے کے تحت دوسرے نامعلوم الاسم شاگرد مدہوش سے (جلد دوئم، ص ۴۰۲) منسوب ہے۔ میر حسن اور سرور کے تذکرے موخرالذکر انتساب کے حق میں فیصلہ صادر کرتے ہیں اور غالباً یہی صحیح بھی ہے۔ "مجموعۂ نغز" کی دوسری روایت "عمدۂ منتخبہ" سے منقول معلوم ہوتی ہے۔ قاسم کی طرح سرور بھی شاعرِ مذکور کے متعلق سوز کی شاگردی کے علاوہ دوسری تفصیلات پیش کرنے سے قاصر رہے ہیں۔ البتہ میر حسن نے اپنے تذکرے میں "میر نبی جان" کے نام سے ان کا ذکر کرتے ہوئے بقدر ضرورت معلومات فراہم کر دی ہیں[۲]۔

"مجموعۂ نغز" چونکہ کئی سو شاعروں کے حالات اور کئی ہزار منتخب اشعار پر مشتمل ہے، اس لیے اس قسم کی معدودے چند غلطیاں اس کی استنادی حیثیت کو متاثر نہیں کرتیں۔ مجموعی طور پر اس تذکرے میں صحتِ بیان کا خاص اہتمام نظر آتا ہے۔ اس وصف کے پہلو بہ پہلو قاسم نے اپنے مشاہدات و تاثرات کے بیان میں جس غیر جانبداری، کشادہ دلی اور صاف گوئی سے کام لیا ہے اور قافیوں کی پابندی کے باوجود بالعموم سادگیِ بیان و سلاستِ زبان سے مرصع اسلوبِ نگارش کی جو مثال پیش کی ہے وہ ان کی تحریر کے وقار اور وقعت کو دوبالا کر کے "مجموعۂ نغز" کو تذکرہ نگاری کی تاریخ میں ایک نمایاں مقام عطا کرتی ہے۔

---

[۱] گلشنِ ہند طبع ثانی ص ص ۲۲ و ۲۳

[۲] تذکرۂ شعرائے اردو طبعِ ثانی ص ۱۷۵

گلشنِ بے خار

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ اردو کے ممتاز اور بلند پایہ اہلِ قلم میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ان کے زمانے کے تمام بڑے بڑے اساتذہ ان کی دیدہ وری اور اصابتِ فکر و نظر کے قائل تھے۔ حتیٰ کہ غالبؔ جیسے آزادہ و خود بیں شاعر کو بھی ان کے اظہارِ پسندیدگی کے بعد اپنی غزلیات شاملِ دیوان کرنے پر ناز تھا۔ "گلشنِ بے خار" انیسویں صدی کی اسی مشہور و معروف شخصیت کا ایک وقیع کارنامہ ہے۔ اس تذکرے میں اردو شاعری کے ابتدائی زمانے سے تیرھویں صدی ہجری کے وسط تک کے شعرا کے حالات و اشعار درج کیے گئے ہیں۔ تذکرے کے اسبابِ تالیف کی وضاحت کرتے ہوئے شیفتہ لکھتے ہیں:

> "بہ امتثالِ امر یکے از احبائے روحانی کہ آرزوے جان و جان آرزوست، دل پیشتر از زبان زبان بہ تسلیم کشاد و ایں بار ننگ و عار بر سر و گردنِ من نہاد۔" (طبع اول، ص ۵)

اس بیان سے پتا چلتا ہے کہ "گلشن بے خار" کی ترتیب کا خیال مولف کے کسی ایسے دوست کی فرمائش کا مرہونِ منت تھا جس کا نام ظاہر کرنا کسی مصلحت کی بنا پر مناسب نہیں سمجھا گیا۔ زمانۂ تالیف کے سلسلے میں اگرچہ یہ صراحت موجود ہے کہ "ابتدائے ایں کارنامہ در ابتدائے سالِ ہزار و دو صد و چہل و ہشت از ہجرت بودہ و انتہا در انتہائے ہزار و دو صد و پنجاہ" تاہم بعض داخلی شہادتوں کی بنا پر وثوق کے ساتھ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ ۱۲۵۰ھ/۱۸۳۵ء کے بعد بھی

اس میں جا بجا اضافے کیے جاتے رہے ہیں۔ مثال کے طور پر سعادت یار خاں رنگین کے حالات میں یہ جملہ بھی شامل ہے کہ

"بعدِ بپایان آمدنِ ایں تذکرہ عمرش بسر آمد۔ وکان ذالک فی شہرِ جمادی الثانیہ ہزار و دو صد و پنجاہ و یک" (ص ۱۱۵)

یہ تو سنہ اختتام سے چند مہینے بعد ہی کی بات ہے لیکن ناسخ کا حال اس سے بھی کچھ بعید تر زمانے کی نشان دہی کرتا ہے۔ لکھتے ہیں:

"بعدِ مدتے از ترتیب و تبییضِ ایں رسالہ پدید آمد کہ دیوانِ دیگر از افکارِ وقادش فراہم آمدہ و ہم در شہر رسیدہ" (ص ۳۰۹)

مزید تلاش و جستجو سے اس قسم کی کچھ اور مثالیں بھی مل سکتی ہیں جن کی روشنی میں ترتیبِ تذکرہ کے بعد کی اس مدت کا تعین کیا جا سکے لیکن اس بحث کو زیادہ طول نہ دیتے ہوئے مختصراً یہ بتا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس کی ابتدا ۱۲۴۸ھ/۱۸۳۲ء میں ہوئی اور تقریباً تین سال کی مدت میں پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ اس کے بعد بھی اس میں وقتاً فوقتاً حسبِ ضرورت اضافے اور تبدیلیاں کی جاتی رہیں، یہاں تک کہ ۱۲۵۳ھ مطابق ۱۸۳۷ء میں "مطبع لیتھوگریفک دہلی اخبار اوفس" میں بہ اہتمام مولوی محمد باقر سپرنٹنڈنٹ اس کا اولین ایڈیشن شائع ہوا اور بظاہر ترمیم و تنسیخ کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ اس کے بعد مختلف مطبعوں سے اس تذکرے کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں لیکن چونکہ یہ سبھی ایڈیشن الحاق و تصرف اور دوسرے مختلف النوع نقائص سے مملو ہیں، اس لیے یہاں ہم نے اپنے مطالعے کے لیے بطورِ خاص اشاعتِ اول کو پیشِ نظر رکھا ہے جس کی صحت میں بظاہر کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا۔

گلشنِ بے خار ایک دوست کی تحریک پر معرضِ وجود میں آیا۔ اب یہ امر قابلِ غور ہے کہ اس کی ترتیب کا مقصد کیا تھا۔ اس سلسلے میں شیفتہ کے بیان سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ ان کا اصل مطمحِ نظر صرف اچھے اشعار کا

انتخاب ہے نہ کہ عام فن کاروں کی شخصیات اور سرمایۂ افکار کا تعارف، لہٰذا اس تذکرے میں صرف وہی شعرا جگہ پا سکے ہیں جن کا کلام کلی یا جزوی طور پر مولف کی پسند کے معیار پر پورا اترا ہے۔ اس ضمن میں تذکرے کی اصل عبارت یہ ہے:

"چوں مدنگاہ ازیں تالیف و مطمحِ نظر ازیں تصنیف گردآوردنِ اشعار دل آراست، نہ شمارِ اسامیٔ شعرا، ازاں کہ سامعہ فریب بیتے بنظر نرسید، عام تر از مجاہیل و معارف و احیا و اموات، نامش دریں سفینہ چوں ابیاتش درج نگردید۔ اما از مشاہیر کم کسے است کہ شعرِ لائق نداشتہ باشد، ناگزیر ایرادِ ہمہ شان لازم آمدہ۔" (ص ۷)

اسی پابندی کی بنا پر شعر و شاعری کے اس دورِ شباب میں اس بساطِ سخن پر صرف چھ سو چھہتر (۶۷۶) شاعروں کو جگہ مل سکی ہے۔ البتہ بعض شاعروں کے کلام کے طویل انتخابات کے باعث ضخامت اس تعداد کے تناسب سے عام تذکروں کے مقابلے میں کسی قدر زیادہ ہو گئی ہے۔ شیفتہ نے اسی خصوصیت کو گلشنِ بے خار کا طرۂ امتیاز خیال کرتے ہوئے فخریہ لکھا ہے کہ

"ہر گوہرے کہ مستعد پیش کش جوہریان بازارِ سخن بنظر درآمد، در انسلاک آں صنت نہ رفت۔" (ص ۷)

اور خوش آب موتیوں کا یہ ہار تیار کرنے کے لیے انھوں نے جو طریقِ کار اپنایا ہے، اس کی تفصیل یہ ہے کہ

"دواوینِ اساتذۂ سلف و خلف بدقت و انصاف ملاحظہ و ازاں التقاط کردم و دیوان کسے کہ بنظر نرسید و دست بہم نداد، افکارش از تذکرہا و سفائن و ہر آنچہ بخاطر بود، بدستور بنقطۂ انتخاب موشح و ثبت افتاد۔" (ص)

انتخابِ اشعار کے سلسلے میں تذکروں سے استفادے کے متعلق شیفتہ کے اس اشارے کی تفصیل میں مصحفی کے "تذکرۂ ہندی" و "ریاض الفصحا"، مرزا علی لطف کے "گلشن ہند"، میر عظیم الدولہ سرور کے "عمدۂ منتخبہ" اور شرف الدین مسرور کے

تذکرۂ شعرائے اردو کے نام پورے وثوق کے ساتھ لیے جا سکتے ہیں۔ ایک جگہ مفتی صدرالدین آزردہ کے تذکرے کا حوالہ بھی موجود ہے۔ ان اردو تذکروں کے علاوہ حسین قلی خاں عاشقی عظیم آبادی کا تذکرۂ شعرائے فارسی موسوم بہ "نشترِ عشق" بھی ان کے پیش نظر رہا ہے۔ ان مآخذ سے اکتساب و اقتباس کے وسیع تر امکان کو نظر انداز کرتے ہوئے اشپرنگر نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ "یہ تذکرہ بہت حد تک "مجموعۂ نغز" سے ماخوذ ہے[1]" دی تاسی نے بھی غالباً اسی قول کی بنیاد پر اپنے ایک لکچر میں یہ بات دوہرائی ہے کہ "قاسم کے تذکرے سے ۔۔۔۔۔۔ مولف نے بہ نسبت کسی دوسرے تذکرے کے زیادہ استفادہ کیا ہے[2]" لیکن قاسم کے ذکر میں شیفتہ کی اس صراحت کے بعد کہ "تذکرۂ در حالِ فکر ریختہ نگاشتہ است و بملاحظہ نرسیدہ" (ص ۲۱۲) ان بیانات سے اتفاق کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

طرزِ ترتیب اور اندراجِ اشعار کے متعلق مولف نے اپنے اصول کی صراحت ان الفاظ میں کی ہے:

> "در ایرادِ تراجمِ شعرا بہ ترتیبِ حروفِ ہجا حرفِ اول و ثانی از تخلص و در اشعار حرفِ آخر معتبر گشت و بدیں تقدیر از سبقتِ زمان و مرتبت قطع نظر و بعلتِ قلتِ فرصت و کثرتِ اشغال غیر از اشعارِ غزل از دیگر اصناف اعراض رفت" (ص ۷)

ان بیانات کا ماحصل یہ ہے کہ "گلشنِ بے خار" کی تالیف میں شیفتہ کی تمام تر توجہات پسندیدہ اشعار کے انتخاب اور ایک خاص نظم اور سلیقے کے ساتھ ان کی ترتیب پر مرکوز رہی ہیں۔ دوسرے الفاظ میں انھوں نے تذکرہ نگاری کے دوسرے مطالبات اور تقاضوں کو بنیادی طور پر ناقابلِ اعتنا تصور کیا ہے۔ اپنے اس بنیادی

---

[1] فہرستِ کتب خانۂ شاہانِ اودھ ص ۱۸۹

[2] گارسان دی تاسی کے تمہیدی خطبے مصحہ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی ص ۷۰

نقص کے باوجود شعرائے اردو کے تذکروں میں شہرت و اہمیت کا جو منصبِ بلند اس تذکرے کو حاصل ہے، وہ "عیار الشعرا"، "عمدۂ منتخبہ" اور "مجموعۂ نغز" جیسے مبسوط تذکروں کو بھی میسر نہیں۔ پرنسپل عبدالشکور کے خیال میں اس کا سبب یہ ہے کہ

"یہ تذکرہ اور تذکروں کے مقابلے میں زیادہ اہتمام اور ذمہ داری کے جذبے کے ساتھ لکھا گیا ہے ۔۔۔۔۔ اور ۔۔۔۔۔ شیفتہ نے پوری کوشش کی ہے کہ ہر شاعر کے زیادہ سے زیادہ حالات معلوم کر کے درج کیے جائیں۔"[1]

لیکن یہ اور اسی قسم کی دوسری تمام رائیں کسی غائر مطالعے اور عالمانہ تجزیے پر مبنی نہیں بلکہ مولف کی سخن شناسی اور دیدہ وری کے بارے میں ان کے معاصرین کی عام رائے اور ارادت مندانہ تاثرات کی صدائے بازگشت ہیں۔ جن ناقدین نے اس سلسلے میں مبالغے سے کام لیتے ہوئے "گلشنِ بے خار" کو دوسرے تمام تذکروں سے ممتاز اور فائق ثابت کرنے کی کوشش کی ہے وہ یا تو اس کے مضامین و مطالب پر سرسری نظر ڈالتے ہوئے گزر گئے ہیں یا دوسرے ہم زمانہ اور قدیم تذکروں کے مطالعے سے محروم رہے ہیں ورنہ وہ اس حقیقت سے بے خبر نہ رہتے کہ بعض دوسرے تذکرہ نگاروں کی روش کے عین مطابق شیفتہ نے بھی اکثر و بیشتر تین چار تعریفی جملوں یا دو تین سطروں کے مختصر اور روایتی قسم کے تعارف کے بعد اشعار نقل کر دینے پر اکتفا کیا ہے۔ یہ عمومی کیفیت مندرجہ ذیل مثالوں سے صاف ظاہر ہے جو مجموعی صورت حال کو سمجھنے کے لیے یقیناً کافی ہوں گی۔

(۱) آرزو: "تخلص سراج الدین علی اکبر آبادی است۔ حالش از فرطِ شہرت آرزومندِ آن نیست کہ راقم متصدیٔ آں شود گاہے بنا بر تفنن بفکرِ ریختہ می پرداخت۔" (ص ۱۲)

(۲) اکبر: "تخلص اکبر خاں کہیں برادرِ داعی آتم، بہ اکثر صفاتِ حسنہ متصف

---

[1] تنقیدی سرمایہ حصہ اول، ص ۵۴

است۔ از کمتر ایام رغبتے بشعر پیدا کردہ۔ از حضرت مومن استفادہ می کند۔" (ص ۳۵)

(۳) تسکین :۔ "تخلص میر حسین، سلسلہ نسبش بمیر حیدر خاں قاتلِ وزیر فرخ سیر می رسد۔ صاحبِ فکرِ بلند و اسلوبِ گفتارش دل پسند۔ از حضرتِ مومن خاں بدرستی اشعار پرداختہ۔ ازا حباب راقم است۔" (ص ۵۹)

(۴) حشمت :۔ "تخلصِ میر محمد علی، از پیشنیان است۔" (ص ۸۶)

(۵) خلق :۔ تخلص الموسوم بمیر احسن بن میر حسن صاحبِ مثنوی سحر البیان کہ شہرہ بہ بدرِ منیر است۔ کسبِ سخن از پدرش کردہ۔" (ص ۹۳)

(۶) ذکا :۔ "تخلص خوب چند کایتھ دہلوی، شاگردِ شاہ نصیر است۔ روزے با فقیر برخوردہ بود۔ می گفت کہ تذکرہ در ریختہ نوشتہ ام۔ ملاحظہ نشد۔" (ص ۱۰۵)

(۷) سوز :۔ "تخلص محمد میر نام لکھنوی۔ در تیر اندازی دست گاہے داشت۔ خطِ شفیعا و نستعلیق زیبا می نگاشت۔ بخواندنِ اشعار بطرزِ مطبوع مشہورِ جہاں و کلامش از جادۂ مستقیمہ برکراں۔" (ص ۱۳۸)

(۸) عشق :۔ "تخلص شاہ رکن الدین معروف بشاہ گھسیٹا، از سخن پردازانِ معروف عظیم آباد است۔ بوقار زندگانی می کرد۔" (ص ۱۷۹)

(۹) فگار :۔ "تخلصِ میر حسین نبیرۂ میر فقیر الدین فقیر تخلص۔ سید بیست دل فگار، وطنش ہمیں بلدۂ خلد آثار۔ سخن را بر مرزا اسد اللہ خاں غالب گذرانیدہ۔" (ص ۲۰۵)

(۱۰) یاس :۔ "تخلص خیر الدین ساکن دہلی، طبع شگفتہ دارد۔ اکنوں بفکرِ شعر نمی پردازد۔ خوشہ چینِ خرمنِ فیضِ خدمتِ مومن خاں است۔ دریں ہنگام طبعش بہ کسبِ طب مصروف است و گویا ہمیں سبب ترکِ سخن بودہ۔ (ص ۳۴۱)

جن شعرا کے متعلق "گلشنِ بے خار" کے بیانات اور نقل کیے گئے ہیں، ان میں سے آرزو، حشمت، ذکا، سوز اور عشق کے بارے میں مصحفی، مرزا علی لطف اور بعض دوسرے پیش رو تذکرہ نگاروں کے ہاں اس سے کہیں زیادہ تفصیلات موجود ہیں۔ لہٰذا ان کے حالات کے سلسلے میں شیفتہ کی کوتاہ قلمی نظر انداز نہیں کی جا سکتی۔ اسی طرح باقی ماندہ شعرا کے بارے میں قربِ زمانی و مکانی، ذاتی تعلقات اور دوسرے ذرائع و وسائل کی موجودگی کے باوجود صرف چند تعارفی جملوں پر اکتفا کرتے ہوئے اشعار نقل کر دینا بھی ان کی سہل انگاری کا ایک بین ثبوت ہے۔ صرف مفتی صدرالدین آزردہ، قلندر بخش جرأت، خواجہ میر درد، شیخ محمد ابراہیم ذوق، سعادت یار خاں رنگین، مرزا رفیع سودا، مرزا غالب، قائم چاندپوری، مصحفی امروہوی، مرزا مظہر جانِ جاناں، حکیم مومن خاں مومن، میر تقی میر اور شیخ امام بخش ناسخ جیسے معدودے چند مشاہیر و اساتذہ اس بے اعتنائی کی زد سے محفوظ رہے ہیں۔ لیکن اس تلافیٔ مافات میں بھی مولف کا زیادہ تر زورِ قلم واقعاتِ زندگی کی شرح و تفصیل کی بجائے انشا پردازی و عبارت آرائی پر صرف ہوا ہے۔ ضمنی طور پر کہیں کہیں کچھ کام کی باتیں بھی آ گئی ہیں۔ ان کی نوعیت بھی اس قسم کی ہے:

(۱) رنگین: "تخلص سعادت یار خاں خلفِ محکم الدولہ طہماسپ بیگ خاں، لختے از فنونِ سپہ گری آگاہ است۔ اکثر بلاد را بگامِ سیاحت پیمودہ و در ایامِ جوانی عشق ہا ورزیدہ ..... تلمیذِ شاہ حاتم است۔ چند دیوان با اصنافِ سخن نظم کردہ و آن را در مجلدے فراہم آوردہ نورتن نام کردہ ..... بعد بپایان آمدنِ ایں تذکرہ عمرش بسر آمد۔ وکان ذٰلک فی شہر جمادی الثانیہ سنہ ہزار و دو صد و پنجاہ و یک۔ ہشتاد سال زندگانی کرد۔" (ص ۱۱۵)

(۲) سودا: "اصلش از کابل و مولد و منشایش جہان آباد است۔ بسنِ شباب بہ لکھنؤ رفت و ہم در انجا وفات یافت۔ وفاتش را زمانِ بسیار آمدہ۔

از مقربانِ بارگاہِ وزیر الممالک نواب آصف الدولہ بہادر بود۔" (ص ۱۳۱)

(۳) قائم :۔ "شیخ محمد قیام الدین، از سکنائے چاندپور وارشدِ تلامذۂ مرزا رفیع سودا۔ پیشتر محلِ سکونش دار الخلافہ بود ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وفاتش در ۱۲۱۰ھ ہجری اتفاق افتاد۔" (ص ۲۰۶)

(۴) مصحفی :۔ "اصلش از قصبۂ امروہہ من مضافات مراد آباد۔ در عنفوانِ جوانی بجہان آباد آمد طرحِ اقامت افگندہ۔ آخر ہا بہ لکھنؤ رفتہ و تا نفسِ آخر ہم دراں جا قرار گرفتہ۔ وفاتش را امروز دہ سال گذشتہ۔ عمر بسیار یافتہ۔ ابتدایش انتہائے دورۂ سودا بود۔ باجرأت وانشا مشاعرات ومطارحات کردہ است۔ شش دیوانِ ریختہ ودو تذکرہ تمام کردہ ودیوانے در فارسی وتذکرہ ہم دارد۔" (ص ۲۴۱)

(۵) مظہر :۔ "اسمِ شریفش مرزا جانِ جاں۔ علوی نسب است۔ بزرگانِ ایشان از اربابِ مناصب بودہ اند۔ پدر بزرگوارِ ایشان بعلتے از عالمگیر بادشاہ آزردہ ترکِ منصب گفتہ۔ مرزا در اکبر آباد نشو ونما یافتہ۔ عاقبت میانۂ جہان آباد طرحِ سکونت انداختہ کسبِ باطن از خدمتِ سید نور محمد بدایونی نقش بندی مجددی فرمودہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ در ماہِ محرم ۱۱۹۲ھ بعضے از تعصب کیشانِ بے باک وبے دردانِ سفاک شہیدش کردند واو خونش بقاتل بخشید۔ میر قمر الدین منت "عاش حمیدًا، مات شہیدًا" تاریخِ وفاتش یافتہ۔" (ص ص ۲۴۸ و ۲۴۹)

(۶) ناسخ :۔ "تمامۂ عمر بہ لکھنؤ گذرانیدہ ونوبتے از کارکنانِ دولتِ آں جانا ایمن بودہ مجالِ سکونت نیافتہ بہ الہ آباد شتافتہ وباز بکان پور عود نمود و اکنوں بسببِ تغیر وتبدیلِ دورۂ اراکین سابق رجوع بمرکز کردہ ۔ گویند کہ در ایامِ فراقِ لکھنؤ واحبابِ لکھنؤ اشعارِ درد آمیز گفتہ وقصۂ نقل وحرکتِ او دراز است کہ ایں مختصر گنجائی آں را بر نتابد۔" (ص ۳۰۹)

اس قسم کے مجمل و مختصر سوانحی اشارے اگرچہ کسی شاعر کی زندگی کے مختلف گوشوں کو پوری طرح اجاگر نہیں کر سکتے تاہم ان کے سہارے اس کے بعض پہلوؤں کو سمجھنے میں کسی قدر مدد ضرور مل جاتی ہے۔ لیکن اگر موازنے اور مقابلے کی نظر سے دیکھا جائے تو ان اساتذہ کے بارے میں تذکرۂ ہندی، طبقاتِ سخن، عیار الشعرا، عمدۂ منتخبہ اور مجموعۂ نغز کی فراہم کردہ معلومات اس سے زیادہ مفصل و معتبر ہیں۔ ایسی صورت میں یہ دعویٰ کہ شیفتہ نے ہر شاعر کے زیادہ سے زیادہ حالات معلوم کر کے درج کرنے کی کوشش کی ہے، یکسر خلافِ واقعہ اور حد درجہ مبالغہ آمیز معلوم ہوتا ہے۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ انھوں نے بیشتر شعرا کے ذکر میں ان کے سلسلۂ تلمذ کی نشان دہی کر دی ہے اور بیس اکیس شاعروں کے سنینِ وفات بھی درج کر دیے ہیں، جن کی کچھ مثالیں اوپر گزر چکی ہیں اور کچھ یہ ہیں:

(۱) میر امانی دہلوی: ــــ "وفاتش در ۱۱۷۷ھ ہجری اتفاق افتاد۔" (ص ۳۹)

(۲) محتشم علی خاں حشمت: "در سنہ یک ہزار و یک صد و شصت و سہ بمفاجا درگذشت۔" (ص ۸۶)

(۳) اعظم الدولہ میر محمد خاں سرور: "بعدِ ضبطِ ترجمۂ وے پیش ازاں کہ ایں تذکرہ بہ انجام رسد، عمرش بہ انجام رسید و کان ذٰلک فی شہر شوال سنہ خمسین و مأیتین بعد الفِ من ہجرت خیر الوریٰ علیہ الوف التحیۃ والثنا۔" (ص ۱۲۸)

(۴) الٰہی بخش خاں معروف: "در سنہ یک ہزار و دو صد و چہل و دو از ہجرتِ خیر البشر علیہ صلوات اللہ الاکبر ..... ایں جہانِ گذران را گذاشت۔" (ص ۲۵۰)

(۵) میر قمر الدین منت: "بعمر چہل و نہ سال در کلکتہ ..... داعیٔ اجل را لبیک گفت و کان ذٰلک فی سنہ ثمان و مأیتین بعد الف۔" (ص ۲۶۴)

(۶) جواد علی خاں ہادی :۔ "در ۱۲۱۵ھ بگور آرمیدہ" (ص ۳۳۶)

لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ جن شعرا کے زمانۂ وفات کے بارے میں دوسرے ذرائع سے تصدیق کی جا سکتی ہے، ان میں سے بیشتر کے متعلق شیفتہ کے بیانات غلط ہیں مثلاً :

(الف) غلام علی راسخ کے حال میں لکھتے ہیں کہ :

"در سنہ یک ہزار دو صد و چہل فوت شد" (ص ۱۱۰)

راسخ کا انتقال ۱۲۴۰ھ میں نہیں ہوا بلکہ اس سے دو سال قبل ۱۲۳۸ھ/۱۸۲۳ء میں ہوا ہے جیسا کہ ان کے شاگرد دیاس آروی کے مندرجہ ذیل بیان سے معلوم ہوتا ہے :۔

"الحال تاریخِ رحلتِ شیخ غلام علی راسخ بتلاش و تجسس کما ینبغی بدریافت رسید کہ تاریخ بستم جمادی الاولیٰ ۱۲۳۸ھ روزِ دوشنبہ بودہ است"[۱]

(ب) میر غلام حسین شورش کے بارے میں رقم طراز ہیں کہ

"وفاتش در ۱۱۹۰ھ نوشتہ اند" (ص ۱۵۲)

یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ اس سلسلے میں شیفتہ کا ذریعۂ معلومات کیا ہے لیکن اس میں شبہ نہیں کہ ان کا یہ بیان غلط ہے۔ صحیح سال وفات امراللہ الہ آبادی کے بقول ۱۱۹۵ھ/۱۷۸۱ء ہے جس کو انھوں نے دیگر تفصیلات کے ساتھ ان الفاظ میں قلم بند کیا ہے :

"در عشرۂ اولیٰ ماہِ شعبان سنہ یک ہزار و یک صد و نود و پنجم ہجری ------ جہانِ پرشور را بدرود کرد"[۲]

علی ابراہیم خلیل کے بیان سے بھی ۱۱۹۵ھ/۱۷۸۱ء ہی میں انتقال کی تصدیق ہوتی ہے۔[۳]

---

[۱] "بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا" ص ۳۰۱

[۲] "تذکرۂ مسرت افزا" ص ۱۱۲

[۳] "در سنہ یک ہزار و یک صد و نود و پنج ہجری رحلت کردہ" گلزارِ ابراہیم ص ۳۰۳

(ج) اشرف علی فغاںؔ کے متعلق لکھتے ہیں:

"در ۱۱۹۶ھ ازیں خاک داں بہ بہشتِ جاوداں نقل کرد۔" (ص ۴۰۳)

شیفتہؔ کے اس بیان کے برخلاف بعض تذکرہ نگاروں نے فغاںؔ کا سالِ وفات ۱۱۸۶ھ/۷۳-۱۷۷۲ء قرار دیا ہے اور یہی صحیح بھی ہے۔ ان کے سنگِ مزار پر کندہ تاریخِ وفات "سرورِ دلہا رفت"[1] سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

(د) میر شمس الدین فقیرؔ کے بارے میں یہ اطلاع فراہم کرتے ہیں:

"در ۱۱۷۰ھ بعدِ کسبِ سعادتِ زیارتِ حرمینِ شریفین زادہما اللہ شرفاً و تعظیماً ہنگامِ بازگشت زورقِ حیاتش طوفانی شد۔" (ص ۲۰۵)

فقیرؔ کا سنہ ۱۱۷۰ھ/۵۷-۱۷۵۶ء میں وفات پانا کسی مستند روایت کی رو سے ثابت نہیں۔ ان کا انتقال زیارتِ عتباتِ عالیات سے واپسی کے دوران ۱۱۸۳ھ/۷۰-۱۷۶۹ء میں ہوا ہے۔[2]

(ہ) مرزا مظہر جانِ جاناں کی نسبت گلشن بے خار کا جو اقتباس گذشتہ سطور میں نقل کیا گیا ہے اس کے آخری چند جملے یہ ہیں:

"در ماہِ محرم ۱۱۹۲ھ بعضے از تعصب کیشانِ بے باک و بے دردانِ سفاک شہیدش کردند و او خونش بقاتل بخشید۔ میر قمرالدین منت "عاش حمیداً، مات شہیداً" تاریخِ وفاتش یافتہ۔" (ص ۲۴۹)

شیفتہؔ کی یہ روایت بھی سابق الذکر روایات کی طرح بعید از صحت ہے اور تذکرۂ سرورؔ کی کورانہ تقلید کا واضح ثبوت فراہم کرتی ہے۔ سرورؔ نے مرزا صاحب موصوف کے حال میں لکھا ہے کہ

"در عہدِ نواب ذوالفقارالدولہ از دستِ چندے بے باکاں اکثر

---

[1] بحوالہ "بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا" ص ۲۳۰

[2] تفصیلات "گلشنِ ہند" پر بحث کے سلسلے میں پیش کی جا چکی ہیں۔

سکنۂ شہر کشتہ شدند۔ ایشاں را ہم کسے در ماہِ محرم سنہ یک ہزار و یک صد و نود و دو شہید گردانید۔"[1]

مرزا صاحب کی شہادت مسلمہ طور پر محرم الحرام ۱۱۹۵ھ/جنوری ۱۷۸۱ء کا واقعہ ہے۔[2] شیفتہ کے نقل کردہ مادۂ تاریخ "عاش حمیدًا، مات شہیدًا" سے بھی ۱۱۹۵ھ ہی برآمد ہوتا ہے۔ اگر انھوں نے اس تاریخ کو نقل کرتے وقت اس کے اعداد پر توجہ دی ہوتی تو یقیناً وہ اس غلط بیانی کے مرتکب نہ ہوتے۔

ان تاریخی غلطیوں کے علاوہ "گلشنِ بے خار" شاعروں کے نام، تخلص، تلمذ اور وطنیت سے متعلق بے شمار لغزشوں اور تھوڑے سے فرق کے ساتھ ایک ہی شاعر کے ذکر کے اعادے کی چند در چند مثالوں سے بھرا ہوا ہے۔ ان اوراق کی محدود گنجائش کے پیشِ نظر یہاں ان میں سے بعض کی جانب اشارے کیے جاتے ہیں:

(الف) لکھنؤ کے ایک شاعر شاہ شرف الدین الہام پہلے ملول تخلص کرتے تھے۔[3] شیفتہ اس حقیقت سے ناواقف ہیں۔ چنانچہ پہلے ردیف الف میں اور پھر ردیف میم کے تحت دو مختلف شاعروں کی حیثیت سے بہ تفصیلِ ذیل ان کا ذکر کرتے ہیں:

(۱) "الہام تخلص شیخ شرف الدین المعروف بہ شاہ ملول از لکھنؤ است۔ مردِ وارستہ بودہ۔ و بعلتِ درویشی بہ اعتبار می زیست۔ گویند کہ بزمرۂ اساتذہ معدود بود۔ بفارسی ہم تکلم می کرد۔ ازوست

اری بیکسی تیرے قربان ہوں — بُرے وقت میں ایک تو رہ گئی
نگہ وہ دشنہ کہ طعنہ کٹار پر مارے — مژہ وہ تیر کہ خنجر کو دھار پر مارے"

(ص ۳۶)

---

[1] عمدۂ منتخبہ، ص ۵۵۲

[2] عقدِ ثریا، ص ۵۶

[3] گلشن ہند، از مرزا علی لطف، ص ۳۴۰

(۲) "ملول تخلصِ شاہ شرف الدین، از درویشان است۔ اوراست

تری جدائی نے یاں تک ہمیں ملول کیا
کہ زندگی کے عوض مرگ کو قبول کیا۔" (ص ۲۵۴)

(ب) جوشش تخلص کے تحت ایک ہی صفحے پر بصورتِ ذیل دو مختلف الاسم شاعروں کے حالات درج کیے گئے ہیں:

(۱) "جوشش تخلصِ محمد عابد، اصحابِ تذکرہ اورا زابنائے جسونت ناگر عظیم آبادی نوشتہ اند۔" (ص ۷۳)

(۲) جوشش تخلص شیخ محمد روشن از تازہ خیالانِ عظیم آباد است۔ شعرش صاف و بیغش، فکرش دل پذیر و دل کش۔ شیوہ گزیدہ اش گزیدہ، طرزِ پسندیدہ اش پسندیدہ و معہذا در فن عروض بسیار مہارت دل خواہ داشت۔" (ص ۷۳)

جیسا کہ اس سے پہلے بھی کسی موقعے پر واضح کیا جا چکا ہے، محمد عابد اور محمد روشن دونوں حقیقی بھائی تھے۔ محمد عابد کا تخلص دلؔ اور محمد روشن کا تخلص جوشش تھا۔ شیفتہ نے ان دونوں کا ذکر ایک تخلص کے ساتھ کر کے جو خلطِ مبحث پیدا کر دیا ہے، اس سے قطعِ نظر ان دونوں تراجم کے ذیل میں پیش کردہ اشعار کے مطابق محمد عابد اور محمد روشن شخصِ واحد یعنی جوشش ہی کے دو مختلف روپ ہیں۔

(ج) سراجؔ کا ترجمہ ان تفصیلات پر مشتمل ہے:

"سراجؔ تخلصِ سراج الدین علی۔ سراجِ بزمِ علم و دانش است۔ آوردہ اند کہ روزے در رہگذرے سراجؔ پروانۂ شمع روے از طائفہ ہنود گشت۔ چوں تخالفِ مذہب درمیان بود، مدتے آں شرر بخرمن افتادہ بہیدہ می سوخت۔ آخر تاثیرِ عشقِ یک رنگی پسند، دوئی سوز رحمے در دلِ مرشدِ پدرِ آں ماہوش انداخت کہ برائے وصلتِ آں ہر دو سوختۂ آتشِ فراق پدرش را ہدایت ساخت۔ وے نظر بفرطِ اعتقاد اعراض از فرمائش

نتوانست کرد۔ در دم شمع را بہ پروانہ داد، یعنی دخترش را بہ سراجِ دیوانہ۔ چوں کارِ پروانہ از وصلِ جاناں غیر از جان دادن نیست، سراج پروانہ وار گردِ آں چراغِ محفلِ حسن گردید جان بجانِ آفریں سپرد۔ او نیز شمع کردار لختے بر سرِ نعشِ سوختۂ خویش گریستہ مرد۔ فرد

تو ہم شب را بسر کے می بری اے شمعِ کم فرصت
گرفتم سوختی پروانۂ آتش بجانے را

بالجملہ غزلے کہ شعرے ازاں ایراد کردہ می شود، از و شہرتِ تمام دارد و جزایں چیزے دیگر از مسموع نہ گشتہ

چلی دشتِ عشق میں وہ ہوا کہ چمن سرور کا جل گیا
مگر ایک شاخِ نہالِ غم جسے دل کہیں سو ہری رہی"۔ (ص ص ۱۲۶، ۱۲۷)

اس عبارت میں سراج کے معاشقے کا جو واقعہ بیان کیا گیا ہے وہ قطعاً بے بنیاد اور غلط ہے۔ مبتلا میرٹھی نے "طبقاتِ سخن" میں اور خیراتی لال بے جگر نے اپنے تذکرۂ شعرائے اردو میں مبتلا ہی کے واسطے سے اس سلسلے میں کچھ اور تفصیلات بھی بیان کی ہیں جن میں یہ اطلاع بھی شامل ہے کہ

"در ضلع پورب مزارِ آں ہر دو بے قرار بیک جا ہنوز بمرقدین عاشق و معشوق مشہور است[1]"

سراج کے مدفن سے متعلق یہ ایک خلافِ حقیقت روایت ہی اس پورے واقعے کو محض افسانہ قرار دینے کے لیے کافی ہے۔ ممکن ہے کہ شیفتہ نے یہ واقعہ مبتلا کے بیٹے شیخ شرف الدین مسرور میرٹھی کے تذکرے سے جو ان کے مآخذ میں شامل ہے، نقل کیا ہو۔ بہر حال اس کی صحت کا کوئی معتبر ثبوت موجود نہیں۔ اس سے زیادہ گمراہ کن یا حیرت انگیز امر یہ ہے کہ شیفتہ مذکور الصدر سراج اور مشہور شاعر سراج

---

[1] تذکرۂ بے جگر، ورق ۱۰۵ ب

اورنگ آبادی کو دو مختلف شخصیتیں قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ منقولۂ بالا شعر نقل کرنے کے فوراً بعد موخرالذکر سراج کے متعلق لکھتے ہیں کہ

"سراج نامش معلوم نشد۔ از اورنگ آباد است و معاصر آبرو۔ ازوست

نہیں ہے تاب مجھے تیرے سامنے جاناں کہاں سراج، کہاں آفتاب عالم تاب

نہ پوچھو خود بخود کرتا ہوں تعریف ان کے قامت کی

کہ یہ مضمون مجھ کو عالم بالا سے آتے ہیں۔" (ص ۱۲۷)

یہ تینوں شعر (بشمول شعر نمبر ۱، چلی دشت ۔۔۔۔۔ ہری رہی) ایک ہی شاعر سراج کی تصنیف ہیں جن کا پورا نام سید شاہ سراج الدین اور مولد و مدفن اورنگ آباد ہے[1]۔ ظاہر ہے کہ جس تذکرے میں اس قسم کی غیر محتاط اور بے سروپا روایتیں اور وہ بھی فراوانی کے ساتھ موجود ہوں، اسے استناد و اعتبار کے درجے پر فائز سمجھنا ایک ایسی غلطی ہے جو گمراہ کن نتائج کا سبب بن سکتی ہے۔

سوانح حیات اور ان سے متعلقہ امور کے سلسلے میں شیفتہ کے بیانات اور اندازِ نظر کا مختلف پہلوؤں سے جائزہ لیتے ہوئے جب ہم ان کے پیش کردہ سیرت و شخصیت کے مرقعوں تک پہنچتے ہیں تو وہاں بھی ڈاکٹر عندلیب شادانی کے بقول یہ کیفیت نظر آتی ہے کہ "اگر شاعر کا نام اور دوسرے حوالے حذف کر دیے جائیں تو ان عبارتوں کو پڑھ کر کوئی شخص یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ یہ کس کے متعلق ہیں"[2]۔ بالخصوص شخصیت کے خط و خال کی بازآفرینی اور تخلیقی صلاحیتوں کی تحسین کے لیے انھوں نے جو پرتکلف اور مرصع اندازِ بیان اختیار کیا ہے، وہ اس فن سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا۔ ان کی تحریروں میں نقاد کے حقیقت طراز قلم سے زیادہ انشاپرداز یا شاعر کا فلک پیما تخیل کارفرما نظر آتا ہے۔ وہ تجزیے کی بجائے حاشیہ آرائی سے کام

---

[1] تفصیلات کے لیے دیکھیے مقدمہ کلیاتِ سراج از پروفیسر عبدالقادر سروری

[2] "شیفتہ نقاد کی حیثیت سے" مشمولہ "تحقیق کی روشنی میں" ص ۵۳

لیتے ہیں اور رنگینیٔ عبارت و شگفتگیٔ تحریر کی خاطر نفس مطلب کا رشتہ تشبیہات و استعارات سے جوڑ کر ایک طلسمی کیفیت پیدا کرنے کے عادی ہیں۔ یہ طلسم بندیاں شخصیت کے تنوع اور ہمہ جہتی کے ساتھ پیچیدہ تر ہوتی جاتی ہیں۔ حتیٰ کہ بعض اوقات اصل مفہوم الفاظ کے پیچ و خم میں گم ہو کر رہ جاتا ہے۔ مثلاً:

(۱) ذوقی:۔ "آئینۂ طوطیٔ بلاغت است و طوطیٔ شکرستانِ فصاحت۔ جامۂ سحر بیانی ببالایش راست و دامنِ آتش زبانی از بادِ نفسش شعلہ افزاست۔ رنگینیٔ خیالش جلوۂ لالہ و گل بنظر می فزاید و شمعِ فکرتش پروانہ وار دل می رباید۔ اگر لفظ "بنشیں" در کلامش آید، جانفزاتر از قم عیسیٰ است و اگر حرفِ "برو" در سخنش گذرد، دلکش تر از خوش آمدیٔ شاہد زیبا۔ ہر مصرعش تیریست از ترکشِ کمان ابروان برجستہ و ہر بیتش دشتہ ایست دل باخراشیدہ و سرہا شکستہ۔" (ص ۱۰۵)

(۲) سودا:۔ "لطفِ طبعش چوں عشوۂ دلدارِ سراپا ناز از ہر رگ و پے نظمش می بارد و حلاوتِ کلامش چاشنیٔ بوسِ لبِ شکرینِ شاہدانِ شیریں شمائل می دارد۔ فکرش چمنِ جنت است کہ گلہائے کس پنجیدہ ازاں می خیزد و اندیشہ اش چشمۂ خلد است کہ جوے شیر ازاں می ریزد۔ ذوقِ کلامش ہم اثرِ شراب است امانہ شرابے کہ از رگِ تاک برآید و فروغِ ضمیرش ہم جلوۂ آفتاب است امانہ آفتابے کہ بکسوف درآید۔ طائرِ خیالش بانسرِ طائر ہم پرواز است و ہمائے فکرش برایوانِ کیوان سایہ گستر و جلوہ انداز۔" (ص ۱۳۱)

(۳) غالب:۔ "طوطیٔ بلند پروازِ چمنِ معانی است و بلبلِ نغمہ پردازِ گلشنِ شیوا بیانی۔ پیش بلندیٔ خیالش اوجِ فلک پستیٔ زمیں است و در جنب تہ نشینیٔ غورش سرفرازیٔ قارون کرسی نشین۔ شاہینِ فکرش جز بشکارِ عنقا نپردازد و اشہبِ طبعش جز بعرصۂ فلک نتازد۔ اگر امروز بتلاشِ

متاعِ نفیس شتابی جزبد کانش درنیابی۔" (ص ۱۸۶)

(۴) مومنؔ: "زبانِ جادو طرازش سحر را بمرتبۂ اعجاز رسانیدہ و سخنِ دلپذیرش طول را ہمسایۂ ایجاز گردانیدہ۔ گوہر افشانیِ طبعِ نیساں بارش دامن۔ دامن کانِ جواہر در جیب و آستینِ مفلساں انداختہ و گلریزیٔ اندیشۂ بہار نثارش چمن چمن ریاضِ جنت بچشم نظارگیان جلوہ گر ساختہ۔ در جنبِ تفردِ ذاتش ماہتاب کہ بہ یکتائیٔ علم است، مانندِ ستارگان بتعدد مشہور و بضیائے شمع فکرتش ذراتِ نامحسوس بجلوۂ خورشیدِ رخشاں مشاہد و منظور۔ در پیش چنیں نیرِ گیتی آرا انوری کم از سہا و در بارگاہِ چنیں خدیو فریدوں فرخاقانی کمینہ چاکر۔ اعشیٰ یکے از وظیفہ خوارانِ خوانِ نعمتِ اوست و بوفراس یکے از غاشیہ برداران میدانِ مکرمت او۔ دعویٰ گرانِ بلند آہنگِ ہمہ دانی در حضرتش نغمۂ ہیچمدانی می سرایند و مدعیانِ طلیق اللسان بہ پیشگاہش لب می بندند و زبانِ بہ اظہارِ لکنت می کشایند۔" (ص ۲۶۸)

اس میں کوئی شک نہیں کہ جن اساتذہ کے حالات سے یہ اقتباسات ماخوذ ہیں وہ اپنی گراں قدر ادبی خدمات کے باعث زیادہ سے زیادہ تحسین و ستائش کے مستحق ہیں لیکن ان کی شخصیات کی مرقع کشی کے لیے اس قسم کی بے سروپا عبارت آرائی اور غیر مدلل مداحی کی کوئی بھی ایسا شخص جو الفاظ و معانی کے رشتوں کی نزاکتوں کا شعور رکھتا ہے، وکالت نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ پرنسپل عبدالشکور بھی جنھوں نے "گلشنِ بے خار" کو ہر اعتبار سے منفرد اور ممتاز ثابت کرنے میں بڑے مبالغے سے کام لیا ہے، ایک دوسرے موقع پر مومنؔ کے متعلق ایسے ہی چند جملے پیش کرتے ہوئے اس اعتراف پر مجبور ہو گئے ہیں کہ:

"یہ الفاظ کا انبوہ محض عبارت آرائی ہے جو مومنؔ کے لیے اسی آسانی کے ساتھ استعمال کیے جا سکتے ہیں جیسے غالبؔ اور ذوقؔ کے لیے۔

اس عبارت میں نہ مومن کا ذاتی نقش موجود ہے اور نہ غالب کا۔ جامہ دار کی شیروانی ہے، جو چاہے زیب تن کر لے۔"[1]

مزید براں تحریر کا یہ پر شکوہ اور خطیبانہ انداز صرف فن کی دلاویزی اور شخصیت کی عظمت کے ساتھ مربوط و مخصوص نہیں، ہر وہ شخص جس سے شیفتہ کسی نہ کسی طور پر متاثر ہیں، اس کا مستحق قرار پایا ہے۔ چنانچہ دہلی کی ایک مشہور طوائف رجو متخلص بہ نزاکت کے ذکر میں بھی ان کے قلم کی گوہر افشانی کا یہی عالم نظر آتا ہے۔ لکھتے ہیں:

"شاہد یست شیریں و دلبریست نمکین۔ از شعشعۂ عذارِ تابانش خورشید خجل و از جلوۂ قامتِ زیبایش شمشاد پا در گل۔ غنچہ از لبِ خندانش طرزِ تبسم آموختہ و شمع از عارضِ رخسانش چہرہ برافروختہ۔ نسیم کویش عطر بیز تر از بادِ بہار است و شمیمِ مویش مشک ریز تر از نافِ آہوانِ تتار۔ خجستہ روے و خجستہ خوے و خجستہ کام، خوش ترکیب و خوش حرکات و خوش خرام، تازہ گلِ گلشنِ جوانی است و نورس ثمرِ باغِ زندگانی۔ در گلستانِ حسن سرویست نوخاستہ و باچنیں صفاتِ ظاہر بمحاسن باطن آراستہ۔ از حسنِ صورت چگویدکہ بمعنی صد چند ازان است۔ بصفائی فکر و جودتِ ذہن و درستی، فہم و حیدِ عالم و یکتاے زماں۔ طبعِ لطیفش بمقتضاے فطرت بکسب فنونِ کمال مالوف است و بحسبِ سرشت از اوضاع ناپسندیدہ نفور و بسجایاے مرضیہ مشغوف۔ از زیرکی و فطانت و شوخی و متانت بکلی بہرہ ور و از آئینِ دردمندی و بیدردی و وفا پروری و بے رحمی بخوبی باخبر۔" (ص ۳۱۹)

الفاظ کی اس چلن سے جس شخصیت کا نقش ابھرتا ہے، اس کا طرۂ امتیاز ادبی و شعری اکتسابات نہیں، حسن و جمال کی رعنائیاں ہیں۔ اس لحاظ سے یہ مرقع ادب کے کسی طالب علم کے لیے کوئی معنوی کشش نہیں رکھتا۔ البتہ اس سے اس احساس

---

[1] تنقیدی سرمایہ حصہ اوّل ص ۵۸

حسن اور ذوقِ جمال کا ضرور اندازہ ہو جاتا ہے جو مولف کے مزاج میں پوری طرح رچا اور بسا ہوا تھا اور جس کی موثر کارفرمائی پر اس عبارت کا ایک ایک لفظ شاہد ہے۔ ان کی شخصیت کا یہ پہلو بعض دوسری تحریروں میں بھی نمایاں ہے۔ مثال کے طور پر میر مہدی داغ کے متعلق لکھتے ہیں:

"جوانیست نیکو روے و زیبا شمائل و باوجودِ دل ربائی بہ بے دلی مائل۔ تشبیہِ گل با او بہر دو معنی درست است کہ ہم سینہ چاک است و ہم سینہ ہا بدریدن می دہد و مشابہتِ لالہ با وے بہر دو صورت موافق کہ ہم دلش داغ است و ہم داغ بر دلہا می نہد۔" (ص ۹۵)

مرزا غالبؔ کا ایک مشہور اور زبان زد مقطع ہے ؎

وحشتؔ و شیفتہؔ اب مرثیہ لکھیں شاید مر گیا غالبِ آشفتہ نوا کہتے ہیں

غالبؔ نے اس مقطعے میں جن دو شاعروں سے اپنا مرثیہ لکھنے کی توقع وابستہ کی ہے وہ دونوں اتفاقاً مومنؔ کے عزیز شاگرد، غالبؔ کے عقیدت مند اور ایک دوسرے کے بہت قریبی دوست ہیں لیکن دونوں کے ادبی مرتبے میں بڑا فرق ہے۔ ایک اپنے دور کا ممتاز فن کار ہے جس کا نام آج بھی زندہ ہے۔ اور دوسرا ایک عام شاعر جس کی شہرت اس کی زندگی کے حدود سے آگے نہ بڑھ سکی۔ اس فرق کے باوجود دوست کی نگاہ التفات اسے عام شعرا کی صف سے نکال کر خواص کے پہلو بہ پہلو جگہ دیتی ہے اور اس کا قلم اس کی تعریف میں اس طرح موتی بکھیرتا ہے:

"ماہِ منیرِ اوجِ سخن سنجی و سخن دانی است و مہرِ انورِ فلکِ مضامین و معانی۔ گلہائے فکرش دستۂ بزمِ گل رخاں را شاید و جواہرِ نظمش آویزۂ گوشِ یاقوت لباں را باید۔ زہے صولتِ کلامش کہ از زبانِ حسود بے خواست بجلے طعنہ نعرۂ احسنت خیزد و خہے ذوقِ گفتارش کہ در زہر خندِ شراب از دہانِ اعدا ریزد۔ عرصۂ نظم پامال کردۂ ترکتازِ رخش اوست۔ انصاف ایں است کہ نکوئی فنِ شعر در بخش اوست و قطع نظر ازیں باوجودِ حداثت سن و عنفوانِ

شباب در اکثر کمالات جاہے بلند و مکانتے ارجمند دارد۔" (ص ۳۳۰)

تحسین و توصیف کے اس انداز کو دوستی کا حق ادا کرنے کی کوشش کے علاوہ کوئی اور نام نہیں دیا جا سکتا، کیونکہ شیفتہ کو بہت سے مشاہیر شعرا کی شخصیتوں میں بھی کمالات کی یہ جامعیت اور اوصافِ ظاہری و باطنی کا یہ امتزاج نظر نہیں آیا ہے اور اس ضمن میں وہ ان کے متعلق سرسری طور پر دو ایک جملے سپردِ قلم کر کے آگے بڑھ گئے ہیں مثلاً:

(الف) آتش:۔ "روشِ رندانہ و وضعِ بے باکانہ دارد۔" (ص ۹)

(ب) انشا:۔ "لختے در فنونِ رسمیہ مہارت داشت و در ہر فن کوس لمن الملکی بہ آوازۂ تمام می نواخت۔" (ص ۴۲)

(ج) حاتم:۔ "تبتل و توکل شیوہ کردہ در جہان آباد آزادانہ می زیست۔ اکثر ارباب فکر از و بہرہ یافتہ اند۔" (ص ۷۷)

(د) بہادر شاہ ظفر:۔ "بہ اکثر صفات موصوف و بمجامد و مکارم معروف۔ در اکثر خطوط دستگاہِ شائستہ دارد۔ با ایں فن بسیار مالوف است۔" (ص ۱۷۳)

(ہ) شمس الدین فقیر:۔ "در دری زبان دستگاہے معقول دارد و لاسیما در عروض و قافیہ بے نظیرِ وقت خویش است۔" (ص ص ۲۰۴ و ۲۰۵)

(و) نظیر اکبر آبادی:۔ "در حلم و خلق و انکسار بے نظیرِ روزگار است۔" (ص ۳۲۳)

(ز) ہدایت اللہ خاں ہدایت:۔ "طبعش بفنون نظم قادر و از نکات و غوامضِ آن فی الجملہ ماہر۔" (ص ۳۳۷)

(ح) انعام اللہ خاں یقین:۔ "جوانیست نیکو روے و خوش خوے ..... در فنِ نظم مکانتے مطلوب با اوست۔" (ص ۳۴۲)

ناقدین نے گلشنِ بے خار کے تنقیدی پہلو کی اہمیت پر کافی زور دیا ہے۔ چنانچہ اردو تنقید کی تاریخ میں شیفتہ ایک عہدِ نو کے نقیب کی حیثیت سے یاد کیے جاتے ہیں۔ ان کی

سخن شناسی اور ناقدانہ بصیرت کی تعریف و توصیف اور ان کے تنقیدی فیصلوں کی اصابت اور بلند معیاری کا ذکر اتنی بار کیا گیا ہے اور ایسے ایسے مشاہیر اہل قلم نے کیا ہے کہ اب یہ باتیں تاریخِ ادب کے مسلمات کا درجہ حاصل کر چکی ہیں۔ بعض مشہور علمائے ادب کے یہ اقوال اسی صورتِ حال کی نشاں دہی کرتے ہیں:

(۱) ڈاکٹر رام بابو سکسینہ:۔

"گلشنِ بے خار ..... ہمارے نزدیک وہ پہلا تذکرہ ہے جس میں انصاف اور آزادی کے ساتھ اشعار کی تنقید کی گئی ہے"[۱]

(۲) پروفیسر آل احمد سرور:۔

"شیفتہ اپنے دور کے بڑے نقاد تھے ..... وہ حالی سے پہلے کے نقادوں میں سب سے اچھا تنقیدی شعور رکھتے تھے اور ان کا گلشنِ بے خار اپنے زمانے کا بہترین کارنامہ ہے"[۲]

(۳) پروفیسر نورالحسن ہاشمی:۔

"ہر شاعر کے متعلق انھوں (شیفتہ) نے بڑی جچی تلی رائیں لکھی ہیں"[۳]

(۴) پروفیسر عبادت بریلوی:۔

"شیفتہ بڑے سے بڑے شاعر کے متعلق بھی صحیح رائے دینے اور اس کی خامیوں کو اجاگر کر کے پیش کرنے سے باز نہیں آتے"[۴]

(۵) پرنسپل عبدالشکور:۔

"اس تذکرے میں جو متانت اور وزن پایا جاتا ہے، وہ اور تذکروں میں

---

[۱] تاریخ ادب اردو ص ۳۱۰

[۲] تنقید کیا ہے ص

[۳] دلی کا دبستانِ شاعری ص ۲۵۷

[۴] اردو تنقید کا ارتقا ص ۱۰۰

مشکل سے ملتا ہے۔ شیفتہ ناقد بھی بہتر ہیں اور شعرا کے بارے میں ان کی رائیں خاص اہمیت رکھتی ہیں ۔۔۔۔۔۔ (ان کے ہاں) تنقید کا پہلو زیادہ جان دار، زیادہ نمایاں اور زیادہ صحیح ہے ۔۔۔۔۔۔ مولف کو اپنے فرض کا احساس ہے اور اس نے ذاتی تعلقات سے متاثر ہو کر شاعر کے کلام کی تعریف نہیں کی ہے۔"[1]

عصر حاضر کے ممتاز دانشوروں کی یہ رائیں ایک ایسے قاری کو جو اپنے محدود علم یا فارسی زبان سے ناواقفیت کی بنا پر "گلشن بے خار" کے براہ راست مطالعے سے قاصر ہو، یہ باور کرا دینے کے لیے یقیناً کافی ہیں کہ شیفتہ نے اپنی تمام تر ناقدانہ صلاحیتوں کا استعمال کرتے ہوئے بغیر کسی تخصیص کے ہر شاعر کے کلام کے متعلق ایک قطعی اور فیصلہ کن رائے دے دی ہے اور ان کی یہ رائیں دوسرے تذکرہ نگاروں کی رایوں سے زیادہ بے لاگ، زیادہ باوقار، زیادہ جچی تلی اور زیادہ صحیح ہیں۔ لیکن ان دعووں میں کس حد تک حقیقت و واقعیت کا عنصر موجود ہے، اس کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ جن شاعروں کے کلام کے بارے میں شیفتہ نے کسی قسم کے تاثرات کا اظہار کیا ہے، ان کا تناسب شعرا کی مجموعی تعداد کے آٹھویں حصے سے کسی طرح زیادہ نہیں اور یہ تاثرات بھی بالعموم چند بندھے ٹکے لفظوں اور مجمل و مختصر جملوں میں محدود ہیں مثلاً:

(۱) شاہ مبارک آبروؔ: "از زبان آورانِ نامیٔ طبقۂ پیشین است۔ بصنعتِ ایہام مائل بود۔" (ص ۸)

(۲) رضا قلی آشفتہؔ: "شعرش شستہ و صاف و فکرش مطبوعِ طبعِ اہلِ انصاف۔" (ص ۱۸)

(۳) احسن اللہ احسنؔ: "از معاصرینِ آبروؔ و ناجیؔ و بطورِ شان غزل سراست۔" (ص ۲۹)

---

[1] تنقیدی سرمایہ حصہ اول ص ص ۵۲ و ۵۴

(۴) احسن اللہ بیان :۔ "حدیثش شیریں و دلآویز، سخنش نمکین و شورانگیز" (ص ۵۲)

(۵) سجاد اکبرآبادی :۔ "از تلامذۂ آبرو ست و متبعِ طریقۂ او" (ص ۱۲۵)

(۶) میر سوز :۔ "کلامش از جادۂ مستقیمہ برکراں" (ص ۱۳۸)

(۷) میر ضیاء الدین ضیا :۔ "از شعرائے نامی است" (ص ۱۷۱)

(۸) شرف الدین مضمون :۔ "فکرتش مقصور بر ایہام است کہ شیوۂ اہلِ زمانش بودہ" (ص ۲۴۶)

(۹) الٰہی بخش خاں معروف :۔ "خیالاتِ رنگین و مضامین دل نشین دارد" (ص ۲۵۰)

(۱۰) انعام اللہ خاں یقین :۔ "کلامش سیر نمک است۔ حلاوتِ دل خواہ دارد" (ص ۳۴۲)

اس نوعیت کے تبصروں میں ڈاکٹر عندلیب شادانی کے بقول "نہ کسی قسم کا اجتہاد ہے نہ کسی ناقدانہ صلاحیت کا اظہار"[1] بلکہ دوسرے تذکرہ نگاروں نے عام طور پر جو باتیں کہی ہیں انھی کو الفاظ کے معمولی سے ردّ و بدل کے بعد "گلشن بے خار" میں بھی نقل کر دیا گیا ہے۔ البتہ صفِ اوّل و دوئم کے چند اساتذہ اور مولف کے بعض احباب کے حالات میں کہیں کہیں ایسے جملے مل جاتے ہیں جنھیں صحیح معنی میں تنقیدِ کلام سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اپنی عددی قلت کے باوجود یہ تنقیدیں اس لحاظ سے کافی اہمیت رکھتی ہیں کہ شیفتہ نے معمول کے برخلاف ان کے اندر بڑی حد تک آزادیٔ رائے اور ناقدانہ بصیرت و ژرف نگاہی سے کام لیا ہے اور اپنی ذمہ داریوں کو نسبتاً بہتر طور پر نبھانے کی کوشش کی ہے۔ دراصل "گلشنِ بے خار" کے یہی وہ حصے ہیں جن کی بنا پر اسے اچھے تذکروں کی فہرست میں کوئی جگہ دی جا سکتی ہے۔ درج ذیل اقتباسات اس استثنائی کیفیت کی پوری پوری نمائندگی کرتے ہیں :

(۱) خواجہ میر درد :۔ "از لطافتِ طبع و شستگیٔ نظم و رشاقتِ مضمون پیداست

---

[1] تحقیق کی روشنی میں ص ۵۱

کہ خواجہ را در ریں فن نیز مانند کمالاتِ اخروی مکانتے ارجمند
و دستگاہے بلند است۔ فکرش صحیح و نظمش فصیح۔ گفتارش
از رکاکت و اغلاط پاک و در جنب گلہائے خیالش گلہائے
چمن ہم ارزِ خس و خاشاک۔ دیوانش از نظر گذشت۔ از اشعار
پرکن خالی است و اکثر ابیات با علوِ معانی و سموِ مضامین
دل کش و حالی۔" (ص ۹۷)

(۲) شیخ محمد ابراہیم ذوق: "قوتِ مشقے کہ او راست دیگرے را دیدہ نشد و معہذا
رطب و یابس کہ شیوۂ بسیار گویان است، در کلامش کمتر
و بر جمیع اصنافِ سخن قدرتِ تمام دارد۔" (ص ۱۰۶)

(۳) مرزا رفیع سودا: "با فنون شاعری مناسبتِ تام دارد و بر اصنافِ سخن قدرتِ
تمام۔ و آن کہ بین الانام شہرت پذیر است کہ قصیدہ اش
بہ از غزل است حرفیست مہمل۔ بزعم فقیر غزلش بہ از
قصیدہ است و قصیدہ اش بہ از غزل۔۔۔۔۔ از اقسامِ
شاعری در مثنوی فکرِ معقول نداشت۔ اہاجیٔ رکیکہ بسیار
گفتہ و بہ آن شیوہ داشتہ و مضامینِ دلآویز می یافتہ۔"
(ص ص ۱۳۱ و ۱۳۲)

(۴) مرزا غالب: "در اوائلِ حال بتقاضائے طبعِ دشوار پسند بطرزِ مرزا عبدالقادر
بے دل سخن می گفت و دقت آفرینی ہا می کرد۔ آخر الامر ازاں
طریقہ اعراض کردہ اندازے مطبوع ابداع نمودہ۔۔۔۔
۔۔۔ در زبان فارسی نیز دستگاہے بلند و مایۂ وافر بہم رسانیدہ
پایہ اش از فحولِ استادان کم نیست۔ غزلش چوں غزلِ نظیری
بے نظیر و قصیدہ اش چوں قصیدۂ عرفی دل پذیر۔ مضامینِ
شعری را کما ہو حقہٗ می فہمد و بجمیع نکات و لطائف پے

می برد، و ایں فضیلتے است کہ مخصوصِ بعضِ اہلِ سخن است۔" (ص ۱۸۶)

(۵) میر تقی میر:۔" بافنونِ نظمیہ ربطِ تمام دارد۔ لاسیما در غزل سرائی و مثنوی گوئی گوئے سبقت می رباید۔ پست و بلند کہ در کلامش بینی ورطب و یابس کہ در ابیاتش بنگری نظر نکنی واز نظرش نیفگنی کہ گفتہ اند فرد

شعر گر اعجاز باشد، بے بلند و پست نیست
در یدِ بیضا ہمہ انگشت ہا یک دست نیست

۔۔۔۔۔ از اقسامِ شاعری در قصیدہ فکر خوشے نداشتہ۔ چنداں کہ غزلش بلند مرتبہ تر است ہم چناں قصیدہ اش پست پایہ تر۔" (ص ۲۹۱)

ان عبارات میں زیرِ بحث شعرا کی تخلیقات اور فن کے جائزے کا جو انداز اختیار کیا گیا ہے، اس میں تذکرہ نگاری کی بنیادی ضرورت کے بقدر انفرادی غور و فکر اور آزادانہ رائے زنی کارفرما نظر آتا ہے۔ چوں کہ "گلشنِ بے خار" کی غیر معمولی شہرت و عظمت کی دیواریں نقد و نظر کی اسی متاعِ قلیل کے سہارے پر رکی ہوئی ہیں، اس لیے اس پہلو کو مزید نمایاں کرنے کی خاطر مختلف شعرا کے تراجم سے اسی قسم کی کچھ اور مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

(۱) انشا:۔" دیوانے دارد مشتمل بر اصنافِ سخن و ہیچ صنف را بہ طریقہ راسخہ شعر انگفتہ اما در شوخیٔ طبع و جودتِ ذہن او سخنے نیست۔" (ص ۴۲)

(۲) قلندر بخش جرأت:۔" دیوانِ ضخیمے مشحون بہ انواعِ سخن ترتیب دادہ۔ چوں از اصول و قوانین ایں فن بہرہ نداشتہ، نغمہ ہائے خارج از آہنگ می سرودہ و آوازہ اش کہ چوں طبل دور تر رفتہ، از آنست کہ پذیرائے خاطر و گوارائے طبعِ او باش و الواط حرف می زدہ۔ و معہذا بعض

ابیاتش بغایت خوش ادا و دل ربا آمدہ۔" (ص ۶۶)

(۳) میر حسن :۔" بر اصنافِ سخن فی الجملہ قدرتے داشتہ۔ لاسیما مثنوی نیکو می گفتہ۔ مثنوی" سحر البیان" کہ مشہور بہ بدرِ منیر است، شہرتِ تمام دارد۔ قطع نظر از پا نغزہائے شاعری بمحاورۂ عوام بد نگفتہ بلکہ دادِ بلاغت دادہ۔" (ص ۸۲)

(۴) قائم چاندپوری :۔" شاعریست خوش گفتار بلند پایہ، موزونیست عالی مقدار گراں مایہ۔ وآنچہ بعض ناشناسان سخن بمکانتِ سوداسی شمارندش، حرف در دیوانگیٔ شان از جنوں است۔ از بہرہ اندوزانِ دانش نیاید پستیٔ زمین را با فرازِ فلک یکے دانستن و ارباب بصیرت چشم از حق نتوانند بست، چگونہ ذرہ را آفتاب تواں گفتن۔ بہمہ حال قائم در سخن دستگاہے دل پسند دارد، گو بپایۂ سوداسی باش۔ احاطہ بر اصناف اورا میسر است لاسیما در قطعات و رباعیات مضامینے کہ دلالت بر شوخی فکرش کند، از طبعش تراوید۔"

(ص ۲۰۶)

(۵) مصحفی امروہوی :۔" بتقاضائے شیوۂ بسیار گویاں اکثر کلامش پر کم پایہ و از لطائف خالی است۔ اما گزیدہ اشعارِ او در نہایت رتبت والا و مرتبت عالی است۔" (ص ۲۴۱)

شیفتہ کے ان فیصلوں سے اختلاف کی گنجائش بہت کم ہے بلکہ عصر حاضر کے اربابِ نظر بھی ان مباحث میں بڑی حد تک ان کے ہم نوا ہیں لیکن اس سلسلے میں کچھ ایسے مقام بھی آئے ہیں جہاں ان کی رائے سے اختلاف ناگزیر معلوم ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر وہ آتش کو ناسخ کا ہم رتبہ و ہم پایہ تسلیم نہیں کرتے۔ حالانکہ اس میں کوئی شک نہیں کہ خالصتاً شاعری کے نقطۂ نظر سے آتش کا درجہ ناسخ سے بلند تر ہے۔ ناسخ صرف ایک ماہرِ فن اور مصلح زبان کی حیثیت سے آتش پر فوقیت رکھتے ہیں۔ آتش

کے ذکر میں شیفتہ نے اپنے اس خیال کو ان الفاظ میں پیش کیا ہے:

"مردم آن دیار آتش و ناسخ را کہ از اساتذۂ مسلم آں جاست، قریب ہم انگارند و ہر دو را ہم وزن شمارند و قباحتِ ایں تحقیق لا یخفی علیٰ من لہٗ حظ من الفہم۔" (ص ۹)

فرقِ مراتب کے متعلق اسی ذاتی رائے کے پیش نظر انھوں نے آتش کا حال تین ساڑھے تین سطروں میں لکھ کر ختم کر دیا ہے اور ان کے نمونۂ کلام میں صرف چوالیس شعر نقل کیے ہیں جب کہ ناسخ کا ترجمہ غیر معمولی طور پر طویل ہے اور ان کی غزلیات کا انتخاب بھی ایک سو ایک اشعار پر مشتمل ہے۔ آتش کی طرح نظیر اکبر آبادی کے ساتھ بھی شیفتہ انصاف نہیں کر سکے ہیں۔ ان کے بارے میں لکھتے ہیں کہ

"اشعار بسیار دارد کہ بر زبان سوقیین جاری است و نظر بہ آں ابیات در اعدادِ شعرا نشایدش شمرد۔" (ص ۳۲۳)

شیفتہ کی اس رائے سے کوئی بھی شخص جس نے نظیر کے کلام کا بغور مطالعہ کیا ہے، اتفاق نہیں کر سکتا۔ کیوں کہ ان کے ہاں فحشیات و ہزلیات کی فراوانی کے باجود ان کا غلبہ نہیں اور ایسے اشعار اور نظموں کا معتد بہ ذخیرہ موجود ہے جو ہندوستان کی تہذیب و معاشرت کی بہترین ترجمان و آئینہ دار ہیں نیز جن پر اردو شاعری بجا طور پر ناز کر سکتی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ انھوں نے عوام کی زبان میں عوام کی دل چسپی کے موضوعات اور ان کے دکھ درد کی داستانیں نظم کر کے روایت سے بغاوت کی ہے۔ سوچنے کا یہ انداز اور شعر گوئی کی یہ روش یقیناً شیفتہ جیسے روایت پسند اور ثقہ ادیب کے لیے قابلِ قبول نہیں ہو سکتی تھی۔

شیفتہ کا یہ قول ابتدائی سطور میں نقل کیا جا چکا ہے کہ تذکرے کی ترتیب کا اصل مقصد "اشعارِ دلآرا" کی فراہمی ہے چنانچہ جس شاعر کے کلام میں کوئی قابلِ انتخاب شعر نظر آیا ہے، بلا تامل نقل کر لیا گیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اکثر و بیشتر وہ اپنے اس موقف پر کاربند رہے ہیں اور انھوں نے صرف وہی اشعار انتخاب کیے ہیں جن میں

کوئی لفظی یا معنوی خوبی موجود ہے۔ تاہم بعض جگہ دوسرے تذکرہ نگاروں کی طرح وہ بھی اپنی تمام تر متانت وثقاہت اور معیار ونظر کی انفرادیت کو بالائے طاق رکھ کر مذاقِ عام کی سطح تک اُتر آئے ہیں۔ سطور ذیل میں ایسے کچھ اشعار بطور نمونہ نقل کیے جاتے ہیں جنھیں ذوقِ سلیم کسی طرح گوارا کرنے پر آمادہ نہیں۔ بہتر تھا کہ انھیں تذکرے کے صفحات پر جگہ نہ دی گئی ہوتی ؎

روز رخسار کے لیتا ہوں مزے خوبوں کے
بہتر اس شغل سے حجام ہنر کیا ہوگا (عنایت اللہ حجام)

کب حق پرست زاہدِ جنت پرست ہے
حوروں پہ مر رہا ہے، یہ شہوت پرست ہے (ذوق دہلوی)

بنے گی اس سے صحبت کس طرح کچھ کہہ نہیں سکتے
وہ ہرجائی ہے اور بن شغل ہم بھی رہ نہیں سکتے (سعادت یار خاں رنگین)

کھڑکی نکال جانبِ دشمن نہ بام پر — کوٹھے چڑھی جو بات کھلی خاص وعام پر
یاد دلوا کے جو ہم بستری یار رلائے — سو وہ تصویر نہالی ہے بغل کا دشمن
(میر محمد نصیر رنج دہلوی)

نہ ہوئی کوئی شبِ وصل میسر ورنہ — دیکھتے شوقِ محبت سے میں کیا کیا کرتا
(سہراب بیگ سہراب دہلوی)

مشکل ہے میری اس کی ہو صحبت برابر آہ — میں جلد باز ہوں وہ تغافل شعار ہے
(مرزا سیف علی شگفتہ)

جو ہم بستر نہ ہو ہم سے تو اس کی کیا شکایت ہے
نظر بھر کر ہمیں اک دیکھنا اس کا کفایت ہے (صابر شاہ صابر دہلوی)

جو ہم بستر کبھو ہم ہوں غلام اس خوبصورت کے
نہ لیں واللہ تا روزِ قیامت دوسری کروٹ
(راجہ گوپال ناتھ غلام)

اس تند خو سے بوسے میں نے بصد سماجت
جب سو پچاس مانگے تب تین چار ٹھہرے (نوازش حسین خاں نوازش)

حیرت اس پر ہوتی ہے کہ کبھی کبھی اس اعتراف کے باوجود کہ زیر بحث شاعر کا کلام از اول تا آخر عریانیت و ابتذال سے مملو ہے، شیفتہ نے محض خانہ پری کے لیے یا صرف دوسرے تذکرہ نگاروں کے اتباع میں اس کے چند اشعار نقل کر دینا ضروری سمجھا ہے۔ مثلاً امام علی صاحبقراں بلگرامی کے حال میں لکھتے ہیں:

"شرم و حجاب از دلش بمراحل دور و طبعش از آداب و اخلاق مہجور۔ ۔۔۔۔۔۔ ہمہ اشعارش از انواع ہزل مملوست۔ اگرچہ مضامینِ دل پذیر ہم دارد اما حیا مانعِ تحریر مگر از یک بیت نتواں گفت کہ در نہایت مرتبہ عالی رتبہ آمدہ و شاید کہ نوجوانانِ بیباک و شُبّانِ ہوسناک رانا نوشتن آں ابیات (کذا = بیت) موجبِ شکایت و گلہ گردد اما ناچار پذیرفتہ آمد۔" (ص ص ۱۶۶، ۱۶۷)

اور وہ ایک شعر جس کی اس قدر تعریف کی گئی ہے، یہ ہے ؎

مجھ کو شہوت ہوئی تیمم سے تھی مقرر کسی چھنال کی خاک

مقصود لکھنوی کے بارے میں رقم طراز ہیں:

"از سوقیانِ لکھنؤست۔ خرافاتش نہ سزائے آن است کہ دریں اوراق مذکور گردد۔" (ص ۳۵۴)

اس کے بعد اپنے موقف کو یکسر فراموش کرتے ہوئے اس تاویل کے ساتھ کہ "چوں نوشتہ اند، نوشتہ شد" یہ شعر نقل کرتے ہیں ؎

بوسہ لینے سے خفا ہوتے ہو کیوں مشفق من!
بوسہ وہ شے ہے کہ دونوں کو مزا دیتا ہے

گلشنِ بے خار میں عام تذکروں کی بہ نسبت ایسے اشعار کا تناسب بہت کم ہے۔ یہاں اس ضمن میں جو کچھ لکھا گیا ہے، اس کا محرک ان کا وہ بیان ہے جس میں انھوں نے اس کے برعکس دعویٰ کیا ہے ورنہ تذکروں میں اس نقص کی عمومیت کے پیشِ نظر

اسے موضوعِ بحث بنانا کوہ کندن وکاہ برآوردن کے مترادف ہے۔

تذکرے کے جتنے اقتباسات اب تک نقل کیے جا چکے ہیں، ان کو سامنے رکھ کر شیفتہ کے اسلوبِ نگارش کے متعلق بہ آسانی یہ رائے قائم کی جا سکتی ہے کہ وہ مسجع اور مقفیٰ طرزِ عبارت کے دل دادہ ہیں اور حتی الامکان قافیوں کی پابندی کرتے ہیں۔ نیز اظہارِ مافی الضمیر میں رنگینی و دل کشی پیدا کرنے کے لیے جا بجا تشبیہات و استعارات اور صنعتوں کا سہارا لیتے ہیں۔ یہ طرزِ تحریر جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا جا چکا ہے، انشائیہ نگاری کے لیے تو مناسب ہو سکتا ہے، تذکرہ جیسی صنفِ ادب کے لیے قطعاً موزوں نہیں۔ "گلشنِ بے خار" کی تحریر کا ایک اور نقص جو رنگین بیانی کے اس مظاہرے سے بھی زیادہ ناگوار محسوس ہوتا ہے، عربی فقروں اور جملوں کی بکثرت آمیزش ہے۔ مثلاً مفتی صدر الدین آزردہ کے ترجمۂ احوال کی تقریباً نصف عبارت عربی میں ہے جس کا سمجھنا ایک عام فارسی داں کے لیے ممکن نہیں اظہارِ علمیت میں انتہا پسندی کی اس مثال سے قطع نظر جہاں یہ شوق حد اعتدال میں رہا ہے۔ اس کے کچھ نمونے یہ ہیں:

(الف) خواجہ میر درد: "تاریخ ادینہ بست وچہارم صفر ندائے یَا اَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِیْ اِلٰی رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً بسمع رضا اصغا نمودہ وکان ذٰلک فی سنہ تسع وتسعین ومائۃ بعد الفٍ من ہجرت خیر الانام علیہ الوف الصلوٰۃ والسلام۔" (ص ۹۷)

(ب) مرزا محمد رفیع سودا: "قدما را مانندِ فصحاے متاخرین پیرامونِ خاطر وجاگزینِ دل نہ این بود کہ ہر شعر دل پذیر آید و ہر بیت خاطر نشیں ولہٰذا در کلامِ ایناں رقص الجمل واقع شدہ چہ در قصیدہ وچہ در غزل مع انہم اوّلون والموجدون والاحاطۃ بجمیعِ فنونہا متعذرٌ للمتقدمین ولِلّٰہ در من قال العلم للمتاخرین۔" (ص ۳۱)

(ج) حکیم مومن خاں مومنؔ: "شاعرِ حکمت پرور حکیمِ سخن گستر، فریدِ عصر، یکتائے دوراں، جامعِ فنونِ شتّی حکیم محمد مومن خاں الّذی اَعطاہُ اللہُ تعالیٰ استعداداً من الجمعِ من اَشتاتِ الکمالِ و جری فی ریاضِ قلبہٖ من ینابیع فیضہ الاقدس انہار الافضال" (ص ۲۶۷)

حیرت کی بات یہ ہے کہ شیفتہ نے اپنے طرزِ تحریر کو اس کے ان تمام لوازمات کے باوجود سادگی و سلاست کا شاہکار تصور کیا ہے۔ چنانچہ خاتمے کی عبارت میں رنگینیٔ زبان و بیان سے بمصلحت احتراز کا عذر پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"آئینِ ایں نگارِ خود از سادگی بستہ ام و از بے تکلفی طرازِ جیب و داماں کردہ و نہ ایں ازاں بود کہ نغمہ گر ساز و برگ نو انداختہ، نے اگر خواستمے زہرہ بچرخ آمدے و عطارد صفیر بے ہشانہ زدے۔ اما پیشِ نہادِ نظر دوربیں آں بود کہ ایں رنگ در تذکرۂ فارسی ریختہ شود تا ہر یکے بر رنگِ دگر جلوہ گر باشد و ہم سخن از بلاغت نگذرد و نیز فرمانِ وقت بقصر و سلاست بود، اطناب و دقت را مجال کو"

(ص ۳۴۵)

بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ شیفتہ کے اندر ایک اچھے تذکرہ نگار کی صلاحیتیں ضرور موجود تھیں لیکن یہ صلاحیتیں بہرحال عصری معیار و میلان کی تابع ہیں اور روایات کے حلقۂ کامِ نہنگ سے نکل کر مقررہ حدود سے آگے نہ بڑھ سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ بحیثیت مجموعی وہ "گلشنِ بے خار" میں کوئی ایسی بات پیدا نہ کر پائے جسے ان کا امتیازی کارنامہ قرار دیا جا سکے۔ ایسی صورت میں محض اس مفروضے کی بنا پر کہ غالبؔ نے جس شخص کی خوش ذوقی و صاحب نظری کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے، وہ ایک اچھا تذکرہ نگار بھی ہوگا، کوئی رائے قائم کر لینا درست نہیں۔

حاصل کلام

گذشتہ ابواب میں مختلف تذکروں کی خوبیوں اور خامیوں کا جس تفصیل سے جائزہ لیا گیا ہے اس کے بعد یہ حقیقت کسی مزید ثبوت کی محتاج نہیں رہتی کہ تذکرے ہمارے سرمایۂ ادب کا ایک گراں قدر حصہ ہیں جسے نظر انداز کر کے نہ تو ہم اردو شاعری کے مطالعے ہی میں کامیاب ہو سکتے ہیں اور نہ اپنے ادبی و تنقیدی شعور کے آغاز و ارتقا کی تاریخ مرتب کر سکتے ہیں۔ شعرائے فارسی کے پہلے تذکرے "لباب الالباب" کے متعلق علامہ محمد بن عبدالوہاب قزوینی کا خیال ہے کہ اگر یہ تذکرہ دستیاب نہ ہوا ہوتا تو اکثر شعرائے متقدمین گمنامی کے دھندلکوں میں کھو چکے ہوتے اور آج ان کا نام و نشان تک باقی نہ ہوتا۔[1] "مجمع الفصحا" مولفہ رضا قلی ہدایت کے مرتب آقائے مظاہر مصفا بھی فارسی تذکروں کے لسانی و بیانی معائب اور تاریخی غلطیوں پر سخت تنقید کے بعد آخر کار اسی نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اگر ماضی میں تذکرہ نگاری کی طرف اس انہماک کے ساتھ توجہ نہ دی گئی ہوتی تو ہم بیشتر بلکہ تمام تر گذشتہ شاعروں کے احوال و آثار سے بے خبر رہتے۔[2] یہی رائیں بعینہٖ اردو تذکروں پر بھی صادق آتی ہیں کیوں کہ ہم نے اکثر اپنے قدیم شاعروں کو انھی تذکروں کے ذریعے جانا اور پہچانا ہے۔ یہی نہیں بلکہ ہماری ناقدانہ بصیرت بھی انھی تذکروں کی فضا میں پروان چڑھی ہے اور انھی تذکروں سے ہمارے یہاں

---

[1] لباب الالباب مرتبہ سعید نفیسی صفحہ شانزدہم

[2] مجمع الفصحا، مقدمہ مرتب

سیرت نگاری اور تاریخ نویسی کے فن کا آغاز بھی ہوا ہے۔

تذکروں کی قدر و قیمت کے متعلق صحیح رائے قائم کرنے کے لیے یہ بات ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ تذکرہ نویسی کا فن نہ تو براہِ راست تاریخ نگاری کے ذیل میں آتا ہے، نہ اسے فنِ سیرت یا سوانح نگاری کے تحت رکھا جا سکتا ہے اور نہ اس کا دائرہ کار تنقید کی طرح صرف اچھے برے کی پرکھ تک محدود ہے بلکہ درحقیقت یہ ان تمام فنون یا اصناف ادب کا آمیزہ اور بجائے خود ایک فن یا صنفِ ادب ہے۔ تذکرہ نگار شاعر کے مختصر حالاتِ زندگی قلم بند کرتا ہے، اس کی شخصیت کی تعمیر میں کارفرما عوامل کا ذکر کرتا ہے، اس کی وضع قطع اور عادات و اخلاق کی کیفیت بیان کرتا ہے اور اس کے کلام کی خوبیوں اور خامیوں پر اجمالی انداز میں تبصرہ کرتے ہوئے آخر میں بطورِ نمونہ چند اشعار پیش کر کے اپنی ذمہ داریوں سے سبک دوش ہو جاتا ہے۔

تذکرہ نگاروں پر بالعموم یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ وہ شاعر کی زندگی کے حالات و واقعات بالتفصیل بیان نہیں کرتے۔ یہ ایک امر واقعہ ضرور ہے لیکن بحیثیت اعتراض قابلِ قبول نہیں کیونکہ اول تو بیشتر تذکرے جس زمانے میں لکھے گئے ہیں اس زمانے کے محدود وسائلِ معلومات کی بنا پر یہ ممکن ہی نہ تھا کہ کوئی شخص اپنے تمام معاصرین ہی کے حالاتِ زندگی کی فراہمی میں کامیاب ہو جائے۔ چہ جائے کہ وہ ان لوگوں کے بارے میں بھی تفصیلی معلومات بہم پہنچائے جو اس سے بہت پہلے گزر چکے ہیں۔ دوسرے یہ کہ تذکرہ نگاروں کے درمیان ایسا کوئی روایتی معاہدہ یا اصولی اتحاد نہیں کہ ایک شخص نے کسی شاعر کی زندگی کے جن واقعات کا ذکر کیا ہے دوسرے تذکرہ نگار بھی بعینہٖ انھیں واقعات کو بیان کرتے رہیں اور ان پر مزید معلومات کا اضافہ ان کے نزدیک شجرِ ممنوعہ کی حیثیت رکھتا ہو۔ بطور مثال اگر گردیزی نے میرؔ کو صرف دو ڈھائی سطر کا مستحق سمجھا ہے تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ تذکروں سے میرؔ کے بارے میں صرف اتنی ہی معلومات حاصل ہوتی ہے۔ اس لیے ہم اس مثال کو صرف تذکرۂ گردیزی کے نقائص کے ثبوت ہی میں پیش کر سکتے ہیں، اس کی بنیاد پر تمام تذکروں کو بے مقصد اور

لاحاصل قرار نہیں دے سکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان تذکروں میں اجمال و اختصار کی کیفیت عام ہوتے ہوئے بھی مجموعی حیثیت سے سوانحی معلومات کا وافر سرمایہ محفوظ ہے۔ چنانچہ آج بھی شعرائے متقدمین کے حالات زندگی کی فراہمی کے لیے ہماری نگاہ بالآخر انھیں تذکروں پر جاکر ٹھہرتی ہے۔

یہ صحیح ہے کہ اکثر تذکرہ نگار واقعات کے بیان میں سنین و تواریخ کا التزام نہیں کرتے لیکن ایسے تذکروں کی تعداد بھی کم نہیں جو اس نقص سے مبرا ہیں۔ شفیق نے "چمنستانِ شعرا" میں کتنے ہی شاعروں کے انتقال کی تاریخیں نقل کی ہیں۔ "مسرت افزا"، "گلِ عجائب"، "گلزارِ ابراہیم"، "گلشنِ ہند"، "تذکرۂ عشقی"، "تذکرۂ بے جگر" اور "گلشنِ بے خار" میں بھی جا بجا سنین کے حوالے موجود ہیں۔ "گلشنِ سخن" اور "گلزارِ ابراہیم" کے مولفین نے یہ اہتمام کیا ہے کہ حتی الامکان ہر شاعر کے ذکر میں اس کے حالات کی تحریر کے زمانے اور اس زمانے میں اس کی جائے بود و باش کی صراحت کر دی جائے۔ "تذکرۂ ہندی اور ریاض الفصحا" میں شعرا کے سنینِ عمر کے بیان پر خاص توجہ دی گئی ہے جس کی مدد سے تھوڑی سی کد و کاوش کے بعد سنینِ ولادت کا تعین کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح اگر ہمیں ایک تذکرے سے کسی شاعر کے سنہ ولادت، دوسرے سے اس کے سال وفات اور اسی طرح کچھ اور تذکروں سے دیگر واقعات کے سنین کی دریافت میں مدد ملتی ہے تو گویا ہم اپنے مقصد کے حصول میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور صنفی حیثیت سے تذکروں کی افادیت کا اس سے بڑھ کر کوئی اور ثبوت نہیں ہو سکتا۔

یہاں ہمیں یہ بات بھی نہ بھولنا چاہیے کہ سوانح نگاری صرف چند سنین اور تاریخوں کے بیان کر دینے کا نام نہیں۔ کوئی شاعر کہاں پیدا ہوا، اس کی تعلیم و تربیت کس ماحول میں ہوئی، علوم درسیہ میں کس حد تک کمال بہم پہنچایا، کن کن لوگوں سے کلام پر اصلاح لی، مروجہ اصنافِ سخن میں طبیعت کا رجحان کس صنف کی طرف رہا، کس قدر سرمایۂ شاعری اپنی یادگار چھوڑا، یہ اور اس قسم کی دوسری

بہت سی باتیں بھی اسی دائرے میں آتی ہیں اور اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ تذکرہ نگاروں نے عام طور پر شعرا کے سنینِ ولادت و وفات بیان کیے ہوں یا نہ کیے ہوں، اس قسم کی معلومات ضرور بہم پہنچائی ہیں۔ میر، قائم، گردیزی اور ابتدائی زمانے کے کچھ اور تذکرہ نگاروں نے بے شک اس طرف برائے نام توجہ دی ہے لیکن بعد کے تذکرہ نگاروں کے ہاں یہ نقص بہت کم نظر آتا ہے۔ مسرت افزا، تذکرۂ شورش، گلشنِ ہند، مجموعہ نغز، عیار الشعرا، عمدۂ منتخبہ، تذکرۂ ہندی، گلشنِ سخن وغیرہ اس ضمن میں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان تذکروں سے ہمیں شعرا کی زندگی، ان کے اکتسابات اور کارناموں کے بارے میں بہت سی مفید اور کارآمد باتیں معلوم ہوتی ہیں۔

خلاصۂ کلام یہ کہ ہمیں اپنے شعرا اور بالخصوص شعرائے متقدمین کے حالاتِ زندگی کے سلسلے میں بیشتر معلومات انھی تذکروں سے حاصل ہوتی ہے جو بظاہر ناقص اور نامکمل نظر آتے ہیں۔ البتہ ان شاعروں کو جن کے متعلق تمام تذکروں کے مطالعے کے بعد بھی ہمارا علم انتہائی محدود رہتا ہے، اس کلیے سے مستثنیٰ کیا جا سکتا ہے لیکن ان مستثنیات کو کسی فیصلے کا معیار نہیں بنایا جا سکتا۔ کیونکہ وہ شعرا جن کے حالات کو بیسیوں تذکرہ نگاروں میں سے کسی ایک شخص نے بھی شرح و بیان کے لائق نہ سمجھا، یقیناً کسی ادبی اہمیت کے حامل نہ ہوں گے اس لیے اگر ان کے متعلق تحقیق و جستجو کے دوران کسی محقق کو تذکروں کی تشنگی اور تنگ دامانی کا احساس ہوتا ہے تو یہ ایسا نقص نہیں جس کی بنا پر پوری صنف کو دفترِ بے معنی قرار دے دیا جائے۔

ہمارے تذکرہ نگاروں کی تاریخی حس زیادہ بیدار نہ تھی، پھر بھی تذکروں میں تاریخی عناصر یکسر مفقود نہیں۔ تاریخ نگاری کے لیے جس باقاعدگی، نظم و ضبط اور ربط و تسلسل کی ضرورت ہے، وہ اگر تمام تذکروں میں نہیں تو چند تذکروں میں ضرور موجود ہے۔ قائم چاندپوری اور میر حسن نے اپنے تذکروں میں متقدمین، متوسطین اور متاخرین کے لیے علٰحدہ علٰحدہ ادوار قائم کیے ہیں۔ قدرت اللہ شوق نے شعرا کو ان کے کلام کے معیار و مذاق اور فنی و لسانی خصوصیات کے لحاظ سے علٰحدہ علٰحدہ گروہوں میں تقسیم

کیا ہے۔ یہ درجہ بندی شاعری کے عہد بہ عہد ارتقا اور وقت کے ساتھ بدلتے ہوئے رجحانات و میلانات کی نمائندگی کرتی ہے۔ چنانچہ ان تذکروں کی مدد سے ہم اردو کی لسانی تعمیر و تہذیب اور شاعرانہ روایات کے رد و قبول کی تاریخ مرتب کر سکتے ہیں۔ بعض تذکرے صرف ایک مخصوص دور سے متعلق ہیں۔ ان کے مطالعے سے اس زمانے کے ادبی ماحول کا ایک مکمل نقشہ سامنے آجاتا ہے۔ اسی طرح جو تذکرے کسی خاص علاقے سے تعلق رکھتے ہیں، ان کی روشنی میں علاقائی حدود میں زبان اور شاعری کی ترقی کا مطالعہ بڑی آسانی کے ساتھ کیا جا سکتا ہے۔

تاریخی زاویۂ نگاہ سے تذکروں کا جائزہ لیتے وقت ہمیں اس حقیقت کو بھی فراموش نہ کرنا چاہیے کہ تاریخ خواہ سیاسی ہو یا ادبی، صرف چند خشک اور بے روح واقعات کا مجموعہ نہیں ہوتی۔ زندگی کے ہر سرد و گرم، اذہان و افکار کے سارے انقلابات اور تہذیب انسانی کی تمام رنگینیوں اور رعنائیوں سے مل کر اس کا خمیر تیار ہوتا ہے! اس کا دامن قبائے محبوب کی طرح تنگ نہیں ہوتا۔ وہ ہماری جد و جہدِ حیات کے ہر لمحے کو جاوداں بنا کر اپنے سینے میں جذب کر لیتی ہے۔ تاریخ کے اس وسیع مفہوم کو نظر میں رکھ کر صنفِ تذکرہ کا مطالعہ کیا جائے تو اس کے نتائج یقیناً مایوس کن نہ ہوں گے۔ اس سلسلے میں تذکروں کی جو خصوصیت ہمیں سب سے زیادہ متاثر کرتی ہے، وہ اس لسانی انقلاب کی ترجمانی و عکاسی ہے جو عالمگیر کی وفات کے بعد سے مغلوں کے سیاسی و تہذیبی نظام کی ابتری کے دوش بدوش ملک میں اور خاص طور پر اس کے شمالی حصے میں ایک سیلِ بیکراں کی طرح برابر آگے بڑھ رہا تھا۔ مغلوں کے عروج و اقبال کی بدولت ہندوستان کی بساطِ علم و سیاست پر فارسی کو جو بالادستی حاصل ہوئی تھی، اسے دیکھ کر کون یہ کہہ سکتا تھا کہ کسی دن اس کی قسمت کا ستارہ بھی غروب ہو سکتا ہے لیکن چونکہ وہ دودمانِ سلطنت کی پروردہ اور اربابِ اقتدار کی مسلط کی ہوئی زبان تھی اور اس کی ترقی اور فروغ میں ملک کے عوام کا خلوص، ان کے خونِ جگر کی مستی اور دل کی دھڑکنوں کا سوز شامل نہ تھا، اس لیے زوالِ سلطنت کے ساتھ

اس پر بھی زوال آیا۔ اہلِ ہنر، اہلِ کرم کو زمانے کے ہاتھوں اپنے سے بھی زیادہ کشتۂ تیغِ ستم پاکر اپنے کمالات کی داد کے لیے درباروں کی بجائے عوام کی طرف دیکھنے کے عادی ہوئے اور اپنی زبان میں اپنے دلوں کی ترجمانی اور جذبات کے اظہار کی خواہش نے پر و بال نکالے۔ محمد شاہ کے دوسرے سالِ جلوس (۳۳-۱۱۳۲ھ) میں ولی کا دیوان دہلی آیا تو دیکھتے دیکھتے اس کے اشعار ہر خرد و بزرگ کی زبان پر جاری ہو گئے۔[۱] رفتہ رفتہ اردو میں طبع آزمائی کا شوق اس قدر عام ہوا کہ تھوڑے ہی دنوں کی کش مکش کے بعد فارسی نے اپنی اسی نوخیز حریف کے لیے مسندِ اقتدار خالی کر دی۔ مصحفی فارسی دانی کے تمام دعووں کے باوجود مسابقت اور برتری کے اس معرکے میں اردو کی فتح مندی کا اس طرح اعتراف کرتے ہیں:

"ایں فقیر۔۔۔۔ اول از تکمیلِ نظم و نثر زبانِ فارسی و تحقیق محاورہ و اصطلاحِ آن فراغت حاصل کردہ بمقتضائے رواجِ زمانہ آخر کار خود را مصروف بریختہ گوئی داشتہ برائے ایں کہ رواج شعرِ فارسی در ہندوستان بہ نسبت ریختہ کم است و ریختہ ہم فی زماننا پایۂ اعلیٰ فارسی رسیدہ بلکہ از و بہتر گردید۔"[۲]

دوسری جگہ انھوں نے اسی صورتِ حال کا ان الفاظ میں ذکر کیا ہے:

"الحال۔۔۔۔ چوں زبانِ فارسی از بے علمیٔ صاحبانِ زمانہ رو در نقاب اختفا دارد، طبیعت ہا بیشتر متوجہ ریختہ اند۔"[۳]

یہاں "بے علمیٔ صاحبانِ زمانہ" کی شکایت ہمارے نزدیک اس احساسِ کمتری کے ایک جلوۂ بازپسیں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی جس نے صدیوں کے لسانی جبر کے زیرِ سایہ پرورش پائی تھی، ورنہ ۱۲۳۶ھ/۱۸۲۱ء تک جب کہ یہ الفاظ سپردِ قلم

---

[۱] تذکرۂ ہندی ص ۸۰

[۲] تذکرۂ ہندی ص ۲۴۸

[۳] ریاض الفصحا ص ۲۸۸

کیے گئے ہیں، ہندوستان کے طول و عرض میں اردو کی بنیادیں اس قدر مستحکم ہو چکی تھیں کہ اس سے وابستگی کسی شرمندگی کا باعث اور تاویل و توجیہ کی محتاج نہ رہی تھی۔ خود تذکروں میں شعرا کی تعداد کے اضافے کی عہد بعہد رفتار اردو شاعری کے اس قبول عام کا ثبوت فراہم کرتی ہے۔

سیاسی محاذ پر اردو کی فتوحات کا مزید ثبوت ان تذکروں سے ملتا ہے جو اردو ہی میں لکھے گئے ہیں۔ ان تذکروں میں حیدر بخش حیدری کا "گلشنِ ہند" سرفہرست ہے۔ یہ تذکرہ دو سو ۲۸۹ نواسی شعرا کے ذکر پر مشتمل ہے اور ۱۲۱۴ھ مطابق ۱۸۰۰ء میں نوابِ مرشد آباد میں مرتب ہوا ہے۔ دوسرا تذکرہ مرزا علی لطفؔ کا "گلشن ہند" ہے جس میں اڑسٹھ شعرا کے حالات و اشعار منقول ہیں۔ یہ تذکرہ کلکتے میں ۱۲۱۵ھ مطابق ۱۸۰۱ء میں جان گلکرسٹ کے حسبِ فرمائش اس مقصد کے تحت مرتب کیا گیا تھا کہ تازہ وارد انگریز حکام اس کے ذریعے اردو زبان اور اس کے شعری ادب سے واقفیت حاصل کر سکیں اور سیاسی و تجارتی معاملات میں ہندوستانی عوام سے ربط و ضبط کے مواقع پر گونگے اور بہرے ثابت نہ ہوں گویا یہ تذکرہ اردو کے اس عوامی اور جمہوری کردار کی ایک دستاویز ہے جس نے سمندر پار سے آئے ہوئے حکمراں طبقے کو بھی ملک میں اپنے اثر و رسوخ کی استواری کے لیے اس کی ضرورت و اہمیت کے اعتراف پر مجبور کر دیا تھا۔ ان دو ہم نام تذکروں کے علاوہ بھی اردو میں متعدد تذکرے مرتب ہوئے ہیں لیکن یہاں ان کا ذکر چنداں ضروری نہیں۔

اردو زبان اور اس کی شاعری اگرچہ عوام کی تمناؤں اور آرزوؤں کے آغوشِ تربیت میں پل کر جوان ہوئی لیکن اپنے اس ابتدائی دورِ ترقی میں ملک کے زوال آمادہ درباری نظام سے بھی اس نے دل کھول کر اپنی محبوبیت کا خراج وصول کیا۔ تذکروں میں اس کی اس ادائے دلبری کے نقش ان امرا اور اعیانِ سلطنت کے حالات میں ملتے ہیں جو بحرِ سخن کے غواص بھی تھے اور جواہرِ معنی کے قدر شناس بھی۔ مشاعروں کے اہتمام اور شعرا کی سرپرستی میں ان کی دلچسپیاں اربابِ سخن کے لیے ایک بڑا سہارا اور ذوقِ شعری کی تعمیم و تربیت کا ایک اہم وسیلہ تھیں۔ اس لحاظ سے شاعری کی ترقی میں ان کے

اشتراکِ عمل کا بڑا حصہ ہے۔ خواہ اس کے نتیجے میں مدحیہ قصائد کا دفترِ بے معنی ہی کیوں نہ وجود میں آیا ہو۔ کیونکہ کچھ تخلیقات بدلے ہوئے حالات کے تحت کسی زمانے میں اپنی معنوی اہمیت تو کھو سکتی ہیں لیکن ان کی لسانی و تاریخی حیثیت پر کوئی فکری و نظریاتی انقلاب اثر انداز نہیں ہو سکتا۔ بہر صورت شاعری اور دربار کے باہمی تعلق اور اس کے آثار و اثرات کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے تذکروں میں کافی سامانِ دل چسپی موجود ہے۔

تذکرہ نگاروں نے عوامی مشاعروں کا ذکر بھی بڑی کثرت کے ساتھ کیا ہے۔ یہ مشاعرے جو ابتدا میں مراختوں کے نام سے یاد کیے جاتے تھے فارسی سے مسابقت کی جد و جہد یا لسانی خود مختاری کی تحریک ہی کا ایک حصہ تھے۔ شعرا کی حریفانہ گروہ بندیاں اور ان گروہوں کے باہمی معرکے، کلام کی خامیوں پر سرِ محفل اعتراض اور ان اعتراضات کے خلاف رد و قدح، الفاظ کے محلِ استعمال اور ان کی معنوی جہتوں سے متعلق بحث و تمحیص اور اسی سلسلے میں معانی و بیان کے رموز و نکات کی تشریح ان مشاعروں کی خصوصیات تھیں۔ ان ہنگامہ آرائیوں کی بدولت اردو شاعری کی مقبولیت میں بھی اضافہ ہوا اور ادبی ذوق کے نشو و نما اور فنی شعور کی تربیت کے راستے بھی ہموار ہوئے۔ تذکرہ نگاروں نے عمل اور ردِ عمل کے ان مظاہر کی تفصیلات اگرچہ عام طور پر بیان نہیں کی ہیں تاہم بعض تذکروں میں اس سلسلے کے کچھ ایسے واقعات مذکور ہیں جن کے پس منظر میں ہم تہذیب فکر و نظر کی ان جلوہ سامانیوں کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر قدرت اللہ قاسم نے "مجموعۂ نغز" میں اور اعظم الدولہ سرور نے "عمدۂ منتخبہ" میں میر انشاء اللہ خاں انشا اور عظیم بیگ عظیم کی معاصرانہ چشمکوں کا حال بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے یا "گلستانِ سخن" مولفہ قادر بخش صابر میں شاہ نصیر دہلوی اور ان کے حریفوں کی باہمی آویزش کی ایک طویل داستان محفوظ ہے۔

تذکروں سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ اس دور میں بساطِ شعر و سخن تک رسائی ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہ تھی۔ یہاں جس طرح بزرگوں کی صحبت سے کسبِ فیض اور اساتذہ کی اصلاحوں سے استفادے کے بغیر کسی کا چراغ جلنا ممکن نہ تھا، اسی

طرح نسبی شرافت اور نجابت خاندانی بھی منجملۂ لوازمات تصور کی جاتی تھی۔ شاعری شریفوں کا فن یا تفریحی مشغلہ قرار دے دی گئی تھی اور شرفا اپنے اس کاروبارِ شوق میں سفیہوں کی شرکت گوارا نہ کرتے تھے۔ چنانچہ خیراتی لال بے جگر نے اپنے تذکرے میں آگرے کے بخشی نامی قوال کا ذکر کرتے ہوئے اس روایت سے انحراف کی تاویل پر کافی زورِ قلم صرف کیا ہے[1]۔ گور بخش ادیب کے متعلق جو قوم کے کہار تھے، مصحفی کا یہ بیان بھی اسی صورتِ حال کی جانب اشارہ کرتا ہے۔ لکھتے ہیں:

"در ابتدائے حداثتِ سنِ بلوغ ۔۔۔۔۔ بمقتضائے شوق در مکتبِ لالہ بینی پرشاد ظریف چندے زانوئے ادب ۔۔۔۔۔۔ تہ کردہ کورسوادی بہم رسانید۔ چوں موزوں طبع بود ۔۔۔۔۔ مشارٌ الیہ ۔۔۔۔۔ اورا پیش فقیر آوردہ تا آں کہ دو چار ریختہ ہندیش بنوکِ قلم اصلاح آمد و در مشاعرہ ۔۔۔۔۔ ہمہ سامع پسندیدند و آفریں ہا گفتند۔ بعدِ یک دو روز محمد عیسیٰ تنہا تخلص کہ یکے از تلامذۂ فقیر بود، تقریر در منعِ اصلاحِ نظمِ او بر زبان آورد۔ گفت کہ اے قبلہ! اگر ہم چنیں ہر کس و ناکس را جناب در محفل قریبِ خویش جا خواہند داد مرتبۂ مامردم کہ عمرے دریں فن بخدمت شریف استخوان شکستہ ایم کجا خواہد ماند۔ از استماعِ ایں سخن من ہم متامل شدہ نصیحتِ ناصح را کہ حقِ شاگردی او کثیر بود، پذیرا شدم و ازو در گذشتم[2]۔۔۔۔۔"

تذکرے ان اخلاقی تصورات اور مجلسی آداب کی بھی ترجمانی کرتے ہیں جو کسی زمانے میں مشرقی تہذیب اور تمدنی زندگی کا طرۂ امتیاز تھے۔ کئی تذکرہ نگاروں کے بیانات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی نظر میں دوسروں کی عیب جوئی بدترین عیب تھی۔ حفظِ مراتب اور بزرگوں کے لیے جذبۂ احترام ان کے نزدیک بڑی اہمیت رکھتا تھا۔

---

[1] تذکرہ بے جگر نسخہ لندن ورق ۲۴ الف

[2] ریاض الفصحا ص ۳۷

اساتذہ کی صحبتوں میں نیازمندانہ حاضری اربابِ ذوق اور نسبتاً کم عمر شعرا کے معمولات میں داخل تھی۔ اپنی علمی اور فنی صلاحیتوں کو ریاض کی آگ میں تپا کر کندن بنانے والے عام طور پر قدر و منزلت کے مستحق سمجھے جاتے تھے اور اولیاء اللہ اور صاحبِ سجادہ بزرگوں سے عقیدت کا میلان عام تھا۔ میر صاحب جن کی خود بینی اور بے دماغی مشہور عام ہے، جب خواجہ میر درد کے والد خواجہ ناصر عندلیب کا ذکر کرتے ہیں تو ان پر عقیدت و ارادت کی ایک خاص کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ احترام کا یہی جذبہ ان کے ہاں سراج الدین علی خاں آرزو، مرزا مظہر اور خواجہ میر درد کے حالات میں بھی کارفرما نظر آتا ہے۔ مصحفی کے بیان کیے ہوئے ایک واقعے سے پتا چلتا ہے کہ بزرگانِ دین کی مجلسوں میں سلاطین و امرا کے لیے بھی آدابِ محفل سے تجاوز کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ یہی نہیں بلکہ فقر کی مستی جلالِ پادشاہی سے ہم سری کی جرأت بھی رکھتی تھی۔ مذکورہ واقعہ خواجہ میر درد سے متعلق ہے اور ان الفاظ میں بیان ہوا ہے:

"روزے حضرت ظلِ سبحانی برائے زیارتِ ایشان آمدہ بودند۔ بعدِ نشستن در مجلس عذرِ درد بمیاں آوردہ اند کے پا را دراز ساختند۔ مشارٌالیہ از مشاہدۂ ایں حالت منغض شدہ ایں قاعدہ را خلافِ معمول دانستہ خود ہم بطرفِ بادشاہ پا دراز ساخت[1]"

اہلِ کمال کی ناز برداری میں بھی لوگ کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے تھے۔ مصحفی نے استغنائے مزاج کو شعرا کا خاصہ قرار دیا ہے[2]۔ یہ استغنا مختلف شکلوں میں نمودار ہوتا رہتا تھا۔ بطور مثال میر صاحب کے ہاں اس نے بے دماغی اور کم آمیزی کی صورت اختیار کر لی تھی۔ جہاں بعض تذکرہ نگاروں نے ان کے مزاج کی اس کیفیت پر سخت لہجے میں تنقید کی ہے وہیں کچھ تذکرہ نگار اسے ان کے کمالِ فن کی ایک علامت

---

[1] تذکرۂ ہندی ص ۹۳

[2] تذکرۂ ہندی ص ۱۱۱

قرار دیتے ہوئے جائز اور مناسب بھی سمجھتے ہیں۔ مثلاً میر حسن کی ان کے بارے میں یہ رائے ہے کہ "بسیار صاحب دماغ است و دماغ او را می زیبد"[۱] احد علی خاں یکتا بھی اسی دوسرے گروہ سے متعلق ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

"جناب میر بغرورِ کمال و استغنائے تصوف کہ مضمر بخاطرش بودہ، اکثر کم التفاتی و بے اعتنائی بحالِ مردم می نمود بلکہ گاہے گاہے باامراہم چنانکہ می باید، راہِ التفات و مبالغت نمی پیمود[۲]"

تذکروں سے ہم پر یہ حقیقت بھی منکشف ہوتی ہے کہ ہندوستان کے اس نظامِ معاشرت میں جس کی تشکیل ہند ایرانی روایات کی آمیزش سے ہوئی تھی، رندی و شاہد بازی خوش ذوقی کی علامت تصور کی جاتی تھی اور محبوبانِ خوش جمال و طفلان پری تمثال سے علی الاعلان اظہارِ عشق معیوب نہ تھا۔ چنانچہ خواجہ حسن دہلوی کے بارے میں صاحب گلشنِ ہند کا بیان ہے:

"بخشی نام ایک رنڈی اربابِ نشاط سے ہے، اس پر مرتے ہیں اور اکثر نام اس کا مقطع میں غزل کے داخل کرتے ہیں[۳]"

میاں عبدالحئی تاباں کے متعلق میر حسن لکھتے ہیں کہ:

"سید زادہ بود بکمالِ حسن و وجاہت۔ تمام عالم فریفتۂ حسنِ او بود بلکہ گرم بازاری ریختہ ازاں شعلہ رو دو بالا شدہ۔ اکثر اشخاص ایں فن را وسیلہ ساختہ دخیلِ صحبتِ او می شدند[۴]"

ہندوستان کے قدیم نظامِ تعلیم کے بارے میں بھی یہ تذکرے خاصی معلومات

---

[۱] تذکرہ شعرائے اردو، طبع ثانی، ص ۱۵۲

[۲] دستور الفصاحت ص ۲۵

[۳] گلشن ہند، طبع ثانی ص ۱۱۵

[۴] تذکرہ شعرائے اردو، طبع ثانی، ص ۳۵

فراہم کرتے ہیں۔ اس نظام میں ایک باشعور اور کارآمد شہری بننے کے لیے صرف چند کتابوں کا پڑھ لینا کافی نہ تھا۔ لوگ علوم درسیہ کے ساتھ علم مجلسی اور فنونِ سپہ گری میں بھی کمال حاصل کرتے تھے۔ اس کے علاوہ موسیقی اور خوش نویسی و خطاطی کے فن سے بھی بالعموم بقدر ضرورت واقفیت بہم پہنچائی جاتی تھی۔ تکمیلِ علم کا یہ ہمہ گیر و ہمہ جہت تصور رزم و بزم اور سیف و قلم کو ایک مرکز پر لے آیا تھا۔ چنانچہ بہت سے شاعر علوم معقول کے رمز آشنا ہی نہیں تلوار کے دھنی اور فنونِ لطیفہ کے ماہر بھی تھے۔ میر سوز کی نسبت مصحفی نے لکھا ہے کہ:

"کمال ہائے ایں بزرگ ماورائے کمالِ شاعری و درویشی بسیار ند چنانچہ در تیراندازی و سواری اسپ و نوشتن خطِ نستعلیق و شفیعا۔۔۔۔۔۔ و آدابِ صحبتِ ملوک و سلاطین۔۔۔۔۔۔ نظیر خود ندارد۔"[1]

خواجہ حسن دہلوی کے متعلق مرزا علی لطف لکھتے ہیں:

"علم موسیقی ہندی سے بخوبی ماہر۔ راستعداد اس علم کی ان (کی) تصانیف سے ظاہر۔ علم نجوم میں بھی دخل بھلا چنگا رکھتے ہیں۔۔۔۔۔۔ علوم متداولہ سے بھی خوب آگاہ ہیں۔ خصوص علم تصوف کے بادشاہ ہیں۔"[2]

مغل تہذیب و سلطنت کے دور انحطاط کی عام اقتصادی کشمکش اور آئے دن کے سیاسی انتشار نے اردو شاعری کی تاریخ پر کیا اثرات مرتب کیے، یہ جاننے کے لیے بھی تذکروں کا مطالعہ از بس ضروری ہے۔ شخصی نظامِ حکومت کے تحت اہل علم اور اربابِ ہنر وجہ معاش کے لیے عام طور پر "نوکری خانۂ بادشاہی" کا سہارا لیتے تھے۔ جب سطوتِ شاہی پر زوال آیا تو رفتہ رفتہ یہ معاشی سہارے بھی ٹوٹنا شروع ہو گئے اور اہلِ کمال تلاشِ روزگار میں قریہ بقریہ اور شہر بشہر آوارہ و سرگرداں پھرنے لگے۔

---

[1] تذکرۂ ہندی ص ۱۱۱

[2] گلشنِ ہند، طبع ثانی، ص ۱۱۵

بعض لوگوں نے اس کشاکش سے تنگ آکر درویشی و خانہ نشینی اور توکل علی اللہ کو اپنا شعار بنایا اور بعض لوگ نئی پناہ گاہوں کی تلاش میں کامیاب ہو گئے۔ یہی وہ پناہ گاہیں تھیں جنھوں نے بعد میں ترقی کر کے حیدر آباد، پٹنہ، کلکتہ اور رام پور جیسے اہم ادبی مراکز کی حیثیت حاصل کر لی۔ تذکرۂ شورش اور گلزارِ ابراہیم میں بکثرت ایسے شعرا کا ذکر ہے جنھوں نے نادر شاہ کی سفاکانہ یورش اور احمد شاہ ابدالی کے مسلسل حملوں میں لٹنے پٹنے کے بعد دہلی کو خیرباد کہا اور عظیم آباد اور مرشد آباد کو اپنا وطنِ ثانی بنالیا۔ قائم چاندپوری نے اپنے تذکرے میں احمد شاہ بادشاہِ دہلی کے دور (۱۱۶۱ھ ۔ ۱۱۶۷ھ) کے آتش بداماں ہندوستان کی تصویر پیش کرتے ہوئے اپنے ہی بارے میں لکھا ہے:

"از بدوِ شعور تا ایں حال بتوسل نوکریٔ بادشاہی بدارالخلافت شاہجہان آباد گذرانیدہ و لیل و نہار ۔۔۔۔۔۔ بصحبتِ سخن سنجان عالی مقدار بسر بردہ (اما) دریں ایام کہ رشتۂ سلکِ انتظامِ مردم بادشاہی بصدمۂ انقلابِ سلطنت از ہم گسیخت و ہر یکے چوں لآلی آبدار بر خاکِ مذلت افتادہ رو بہر سو نہاد، چارو ناچار بلکہ بے اختیار ارادۂ سفر بر رائے اقامت غالب آمد۔"[1]

اردو شاعری کے شانہ بشانہ اردو نثر کے فروغ و ارتقا کے سلسلے میں بھی تذکروں سے بعض مفید و کارآمد باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ تذکرہ نگاروں نے خاص خاص شعرا کے ذکر میں نثر نگاری و انشا پردازی سے ان کے شغف کا بھی ذکر کیا ہے۔ میر حسن، محمد حسین کلیم کے حال میں ان کی نامعلوم الاسم "کتابِ نثرِ ہندی" کے دو جملے بطور نمونہ نقل کرتے ہیں۔ مسرت افزا میں تحسین کی "نوطرز مرصع" کا ایک طویل اقتباس منقول ہے۔ طبقات سخن اور تذکرۂ بے جگر میں بھی نثر کے کئی قابل لحاظ نمونے موجود ہیں۔ ریاض الفصحا سے بہت سے مشاعروں کے پہلو بہ پہلو ایک مجلس مناظرہ کا حال بھی معلوم ہوتا ہے۔ مرزا علی لطف کا تذکرہ گلشنِ ہند اردو نثر کے اس اسلوب یا

---

[1] مخزنِ نکات ص ۷۷

دبستان کی بڑی مکمل اور کامیاب نمائندگی کرتا ہے جسے مغربی اثرات کے تحت فورٹ ولیم کالج کے زیرِ سایہ فروغ حاصل ہوا تھا۔

سوانحی اور تاریخی عناصر کے بعد صنفِ تذکرہ کے اجزائے ترکیبی میں تیسرا اہم مقام تنقیدِ شعر کا ہے لیکن تذکروں کی تنقیدی حیثیت کا جائزہ لیتے وقت یہ خیال رکھنا ضروری ہے کہ تذکرہ نگاروں نے شاعری کے حسن و قبح کی پرکھ کو کبھی مقصود بالذات نہیں سمجھا۔ ان کے حدودِ کار میں نقد و نظر کے اس عمل کی صرف اتنی ہی اہمیت ہے کہ اس کے ذریعے شاعر کے فنکارانہ مقام کا تعین ہو جائے۔ وہ کلام کے بارے میں اپنے تاثرات کے اظہار پر اکتفا کرتے ہیں، اس کے محاسن و معائب کا تجزیہ نہیں کرتے کیونکہ تجزیے کے لیے جس تفصیل اور تشریح کی ضرورت ہے، صنفِ تذکرہ کا روایتی اجمال و اختصار اس کی اجازت نہیں دیتا۔ صنف کے بنیادی تقاضوں کے عین مطابق تذکرہ نویس اشاروں میں بات کرنے کے عادی ہیں لیکن یہ اشارے بڑے بلیغ اور معنی خیز ہوتے ہیں۔ البتہ ان کی بلاغت و معنویت کی گرہ کشائی کے لیے علم معانی اور بدیع و بیان کی اصطلاحات اور دوسرے فنی رموز و علائم کی دلالتوں سے کما حقہٗ واقفیت اشد ضروری ہے۔ مثال کے طور پر جب کوئی تذکرہ نویس کسی شاعر کے بارے میں یہ رائے ظاہر کرتا ہے کہ اس کا کلام فصاحت و بلاغت سے خالی نہیں تو اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ شاعر اپنی زبان کے خزانہ الفاظ پر پوری قدرت رکھتا ہے اور ابلاغ کی تمام تر صلاحیتوں سے متصف ہے جو بحیثیت فن کار اس کے کمال کی دلیل ہے کیونکہ ترسیلِ خیال کی مکمل صلاحیت، الفاظ کی معنوی نزاکتوں سے پوری واقفیت اور اظہار و بیان کے اسالیب پر کامل دسترس کے بغیر فصاحت و بلاغت کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونا کسی طرح ممکن نہیں۔

عربی و فارسی کی تنقیدی روایات اور نقد و نظر کے معیاروں سے عدم واقفیت یا بے اعتنائی بھی تذکروں کے سرمایہ تنقید کے متعلق صحیح رائے قائم کرنے میں سدِ راہ ثابت ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں تذکرہ نویسی کا آغاز فارسی کے زیرِ اثر ہوا

اور فارسی تذکرہ نویس براہ راست عربی تذکرہ نگاروں سے متاثر ہیں۔ چنانچہ اردو تذکروں میں بھی کلام کے متعلق اظہارِ رائے کے پسِ پشت انھی اصولوں کی کارفرمائی نظر آتی ہے، جو عربی و فارسی تذکروں کی تنقید کی بنیاد ہیں۔ عرب شاعر اور نقاد شاعری میں طرزِ بیان کی اہمیت پر سب سے زیادہ زور دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک کسی شاعر کے شیوۂ گفتار کی ندرت ہی اسے دوسرے شعرا سے ممتاز کرتی ہے۔ شعر کی بنیادی خوبیاں ان کی نظر میں کہ تکلف اور آورد سے پاک اور نادر تشبیہات و استعارات سے مرصّع ہونا چاہیے۔ اس کی زبان سادہ اور بندش چست ہو اور کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ معنی ادا کر دیے جائیں۔ بہ الفاظِ دیگر شعر کی اچھائی یا برائی کا انحصار اس کے خارجی حسن اور آرائش پر ہے، معانی اور موضوع کی متانت اور طرفگی پر نہیں۔ فن کا یہی تصور تھا جس پر عربی تذکروں میں تنقید کی بنیاد استوار ہوئی اور یہی تصور فارسی تذکروں کے واسطے سے اردو تذکرہ نگاروں کے ورثے میں آیا۔ چنانچہ انھوں نے اپنی تمام تر توجہات پیرایۂ بیان کی لطافت، فصاحت و بلاغت کے آداب کی نگاہ داری، زبان کی سادگی، محاورات کی صحت اور وزن و قافیہ کے مسلمہ اصولوں کی پابندی کے جائزے تک محدود رکھیں۔ یہی وہ نقطۂ آغاز ہے جہاں سے اردو تنقید کی تاریخ شروع ہوتی ہے۔ آج ہمارے ناقدین کی بصیرت اگرچہ انھیں اس مقام سے بہت آگے لے آئی ہے لیکن ادب کی کسی بھی دوسری صنف کی طرح اردو تنقید کا موجودہ معیار بھی ایک مسلسل ارتقائی عمل کا نتیجہ ہے اور ارتقا کی رو ہرگز اس پر مجبور نہیں کرتی کہ ماضی سے تمام رشتے منقطع کر لیے جائیں، اس لیے ہمیں اپنے سفر کی اس منزلِ اول کو جس کے نقوش تذکروں کی تنقید میں ملتے ہیں، محض گردِ پسِ کارواں سمجھ کر نظر انداز نہ کر دینا چاہیے۔

ان توضیحات کے بعد اس قسم کے خیالات کی خود بخود تردید ہو جاتی ہے کہ ہمارے تذکرہ نگاروں کے پیشِ نظر تنقید کے کوئی واضح اصول اور معیار نہ تھے۔ انھوں نے عام طور پر اپنے زمانہ کے مروجہ تنقیدی اصولوں اور معیاروں کا ذکر کیا

ہو یا نہ کیا ہو لیکن شعرا کے کلام کے متعلق فیصلہ کرتے وقت ان سے بے نیازی یقیناً نہیں برتی ہے۔

بعض تذکرہ نگاروں نے اپنے بیانات میں اس قسم کے مسائل اور موضوعات پر بھی گفتگو کی ہے جن کی روشنی میں ہم ان کے تنقیدی نظریات اور اصولوں کی ایک فہرست مرتب کر سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں ہم یہاں صرف میرؔ اور مصحفیؔ کو بطور مثال پیش کریں گے۔ میرؔ صاحب شاعر کے لیے سلیقہ مندی کو جو زبان کے رموز و نکات اور اظہار و بیان کی نزاکتوں سے پوری طرح واقفیت کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتی، ایک لازمی امر قرار دیتے ہیں۔ فارسی کی مانوس اور شگفتہ تراکیب اور صنائع و بدائع کا بے تکلف استعمال، سادگی بیان و چستی بندش اور فصاحت و بلاغت کے اصولوں کی پیروی ان کے نزدیک اچھی شاعری کے لوازمات ہیں۔ الفاظِ تازہ کی تلاش کے ساتھ ساتھ مضامین و معانی کی ندرت کو بھی انھوں نے کافی اہمیت دی ہے۔ روزمرہ اور محاورات کی صحت کا خیال رکھنا بھی ان کی نظر میں بے حد ضروری ہے۔ شاعر کو ان کے بقول عوام کی زبان اور روزمرہ کی تقلید سے بھی احتراز کرنا چاہیے، کیونکہ اس کے اصل مخاطب خواص ہوتے ہیں۔ وہ برگ گل کی طرح پاکیزہ و رنگین زبان کے دلدادہ ہیں لیکن شاعری کو صرف گل و بلبل کی داستان تک محدود رکھنے کے قائل نہیں۔ گویا شاعری کی عظمت کے بارے میں ان کا تصور یہ ہے کہ اسے وارداتِ عشق کے ساتھ کیفیات زندگی کا بھی ترجمان ہونا چاہیے[1]

مصحفیؔ شاعر کے لیے "موزونی طبع" کی ضرورت پر بہت زیادہ زور دیتے ہیں۔ اس سے ان کی مراد یہ ہے کہ اچھی شاعری محض کوشش سے وجود میں نہیں آتی، اس کے لیے طبعی مناسبت اور فطری رجحان ناگزیر ہے۔ یہ فطری ذوق "فیضِ صحبتِ بزرگان"

---

[1] مزید تفصیلات کے لیے دیکھیے: نکات الشعرا سے متعلق اس مقالے کے گذشتہ اوراق اور "اردو تنقید کی تاریخ" از پروفیسر مسیح الزماں ص ۸۱ تا ۹۵

اور اساتذہ کے یمنِ تربیت سے جلا پاتا ہے۔ استاد کے خامۂ اصلاح کی مشاطگی شاعر کے اندر کلام کے محاسن و معائب کی تمیز اور زبان اور محاورے کی صحت کا شعور پیدا کرتی ہے۔ بہ الفاظِ دیگر وہ لوگ جن کا کلام اساتذہ کے فیضانِ اصلاح سے محروم رہتا ہے، فن کی نزاکتوں اور تحقیق محاورہ و اصطلاح سے نابلد رہتے ہیں اور عام حالات میں شاعری کا حق ادا نہیں کر پاتے۔ شعر کو ان کے نزدیک فصاحتِ بیان، بلاغت کلام، بندش کی چستی، الفاظ کی شیرینی اور زبان و محاورے کی صحت سے متصف ہونا چاہیے۔ شاعری ان کی نظر میں صرف خیال آرائی سے عبارت نہیں، اسی لیے وہ اصولی طور پر اس رنگِ سخن کو جسے ناسخ اور ان کے بعض تلامذہ نے پروان چڑھایا، ناپسند کرتے ہیں اور اس گروہ سے متعلق شعرا کے اشعار خیالی کو زیادہ قابلِ قدر نہیں سمجھتے۔[1]

ان حقائق کی روشنی میں تذکروں پر یہ اعتراض وارد کرنا کہ دنیائے تنقید میں ان کی کوئی اہمیت نہیں یا جہاں تک تنقید کا واسطہ ہے، ان کا ہونا نہ ہونا برابر ہے یا پھر یہ کہہ کر ان کی اہمیت کو گھٹانا کہ ان میں جس قسم کی تنقید ملتی ہے، وہ محض سطحی ہے، کیونکہ اس کا تعلق زبان، محاورے اور عروض سے ہے نیز یہ کہ تذکرہ نویس تنقید کی ماہیت، اس کے مقصد اور اس کے صحیح اسلوب سے واقفیت نہ رکھتے تھے،[2] امورِ واقعہ کی غلط تعبیر اور ارتقا کے قوانین سے روگردانی کے مترادف ہے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی کے بقول یہ صحیح ہے کہ تذکرہ نویسوں نے تنقید کی ماہیت اور اس کے مقصد سے تذکروں میں بحث نہیں کی ہے۔ (کیونکہ) یہ ان کا میدان ہی نہیں تھا لیکن انھوں نے کلام پر جو رائیں دی ہیں ان سے یہ پتا ضرور چلتا ہے کہ وہ تنقید کے

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: ڈاکٹر مسعود حسین خاں کا مضمون "مصحفی ۔ نقاد شاعر" مشمولہ "اردو زبان اور ادب" ص ۹۶ تا ۱۰۸

[2] یہ اعتراضات پروفیسر کلیم الدین احمد نے وارد کیے ہیں۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: "اردو تنقید کا ارتقا ص ۱۱۶، ۱۱۸

مفہوم سے واقف تھے اور اس کا شعور بھی رکھتے تھے۔ (ان کے ہاں) تنقید ہے لیکن اجمال کے ساتھ معیار ہیں لیکن وہ آج کل کے معیاروں سے مختلف ہیں۔ (اس لیے تذکروں میں) صرف تنقیدی روایات اور تنقیدی شعور کو تلاش کرنا چاہیے، تنقید کے مکمل اور بہترین نمونوں کو ڈھونڈنا بے سود ہے۔[1]

مختصر یہ کہ تذکرے اپنی بہت سی خامیوں اور کوتاہیوں کے باوجود ہماری علمی وراثت کے امین، ہمارے ادبی ذوق کے ترجمان، ہماری تہذیبی سرگرمیوں کے عکاس اور ہماری مجلسی زندگی کے آئینہ دار ہیں۔ ان کے اوراق خود شناسی و خود گری کے اس جذبۂ صادق کے گواہ ہیں جس نے اہلِ ہند کے سامنے ایران کی لسانی محکومیت سے آزادی کا تصور پیش کیا، عوام کو باہمی رابطے کے لیے ایک مہذب اور شائستہ زبان عطا کی، ملک کے مختلف طبقوں کے درمیان ذہنی و فکری ہم آہنگی و یک جہتی کے ایک نئے دور کی بنیاد رکھی اور ایک ہمہ گیر و ہمہ رنگ، لالہ کار و سدا بہار تہذیب کو جنم دیا۔ تہذیبی شناخت کی صورت گری کے اس حوالے سے اردو کی توسیع و ترقی کے لیے کی گئی کوششوں کی روداد جب بھی قلم بند کی جائے گی، تذکروں سے دامن بچا کر گزر جانا ممکن نہ ہو گا۔

---

[1] اردو تنقید کا ارتقا ص ۱۱۶، ۱۱۸

فہرستِ مآخذ

(الف) مخطوطات:

بہارِ بے خزاں	احمد حسین سحر کاکوروی	کتب خانہ دارالعلوم ندوۃ العلما، لکھنؤ
تاریخ لطیف	مہدی علی خاں ممتاز رام پوری	رضا لائبریری، رام پور
تذکرۂ آزردہ	مفتی صدرالدین خاں آزردہ	عکس مخطوطۂ کارتس کرسٹی کالج، کیمبرج، مملوکہ پروفیسر مختارالدین احمد علی گڑھ
تذکرۂ بے جگر	خیراتی لال بے جگر	عکس مخطوطہ انڈیا آفس لائبریری لندن، مملوکہ جناب مالک رام، دہلی
تذکرۂ ریختہ گویاں	فتح علی گردیزی	کتب خانہ آصفیہ، حیدرآباد
تذکرۂ ریختہ گویاں	〃 〃	کتب خانہ انجمن ترقیٔ اردو (ہند)، نئی دہلی
تذکرۂ شعرائے اردو	میر حسن	کتب خانۂ دارالعلوم ندوۃ العلما، لکھنؤ
تذکرۂ شورش	میر غلام حسین شورش	کتب خانۂ خانقاہ رشیدیہ، جون پور
تذکرۂ شورش	〃 〃 〃	عکس مخطوطہ بودلین لائبریری، آکسفورڈ، مملوکہ یونیورسٹی لائبریری، پٹنہ
تذکرۂ عشقی	وجیہ الدین عشقی	عکس مخطوطہ بودلین لائبریری، آکسفورڈ، مملوکہ یونیورسٹی لائبریری، پٹنہ
تذکرۂ عشقی	وجیہ الدین عشقی	ٹیگور لائبریری، لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ
تذکرۂ ہندی	غلام ہمدانی مصحفی	کتب خانہ دارالعلوم ندوۃ العلما، لکھنؤ

تذکرۂ ہندی	غلام ہمدانی مصحفی	خدا بخش لائبریری، پٹنہ
خوش معرکۂ زیبا	سعادت خاں ناصر	مولانا آزاد لائبریری، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
خوش معرکۂ زیبا	〃 〃 〃	ٹیگور لائبریری، لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ
دیوانِ مصحفی (ششم)	غلام ہمدانی مصحفی	خدا بخش لائبریری، پٹنہ
دیوانِ ممنون	میر نظام الدین ممنون	مولانا آزاد سینٹرل لائبریری، بھوپال
دیوان میر (سوم)	میر محمد تقی میر	بنارس ہندو یونیورسٹی لائبریری، وارانسی
دیوان میر (چہارم)	〃 〃 〃	کتب خانۂ ریاست محمود آباد
ریاض الفصحا	غلام ہمدانی مصحفی	خدا بخش لائبریری، پٹنہ
ریاضِ حسنی	فتوت اورنگ آبادی	کتب خانہ سینٹرل ریکارڈز آفس، حیدر آباد
شعر العرب	سید اعجاز احمد معجز سہسوانی	مسودۂ مصنف
صحائف شرائف	محمد عسکری بلگرامی	کتب خانۂ آصفیہ، حیدر آباد
طبقات الشعرا	مولوی قدرت اللہ شوق	کتب خانۂ آصفیہ، حیدر آباد
طبقات الشعرا	〃 〃 〃	کتب خانہ سینٹرل ریکارڈز آفس، حیدر آباد
طبقات الشعرا	〃 〃 〃	نقل مخطوطہ کتب خانۂ دار المصنفین، اعظم گڑھ، مملوکۂ راقم
طبقات الشعرا	مولوی قدرت اللہ شوق	نقل مخطوطہ کتب خانہ لالہ سری رام مملوکہ قاضی عبد الودود، پٹنہ
طبقات سخن	غلام محی الدین مبتلا میرٹھی	گاندھی فیض عام کالج لائبریری، شاہجہانپور
طبقات سخن	〃 〃 〃	عکس مخطوطۂ برلن، مملوکہ ڈاکٹر نسیم اقتدار علی، لکھنؤ
عیار الشعرا	خوب چند ذکا دہلوی	کتب خانہ انجمن ترقی اردو (ہند)، نئی دہلی

عیار الشعرا	خوب چند ذکا دہلوی	عکس مخطوطہ لندن، مملوکہ پروفیسر مختار الدین احمد، علی گڑھ
فہرست اردو مخطوطات	مرتبہ نصیر الدین ہاشمی	سینٹرل رکارڈز آفس، حیدر آباد
کشکول متفرقات		مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
گل رعنا	لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی	کتب خانہ آصفیہ، حیدر آباد
گلزار ابراہیم	علی ابراہیم خاں خلیل	پٹنہ یونیورسٹی لائبریری، پٹنہ
گلزار ابراہیم	〃 〃 〃	〃 〃 〃
گلزار ابراہیم	〃 〃 〃	خدا بخش لائبریری، پٹنہ
گلزار ابراہیم	〃 〃 〃	رضا لائبریری، رام پور
گلشن سخن	مرزا کاظم مبتلا لکھنوی	〃 〃 〃
گلشن سخن	〃 〃 〃	کتب خانہ پروفیسر سید مسعود حسن رضوی، لکھنؤ
مجمع الانتخاب	شاہ کمال مانک پوری	کتب خانہ انجمن ترقی اردو (ہند)، نئی دہلی
مجمع النفائس	سراج الدین علی خاں آرزو	رضا لائبریری، رام پور
مجموعۃ الشعرا	رائے ٹیکا رام تسلی	ٹیگور لائبریری، لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ
مخزن نکات	قائم چاند پوری	نقل مخطوطہ لندن، مملوکہ پروفیسر مختار الدین احمد، علی گڑھ
مراۃ الخیال	شیر خاں لودی	رضا لائبریری، رام پور
مسرت افزا	امراللہ الہ آبادی	خدا بخش لائبریری، پٹنہ
نشتر عشق	حسین قلی خاں عاشقی	رضا لائبریری، رام پور
نفائس المآثر	علاؤ الدولہ قزوینی	〃 〃 〃
نکات الشعرا	میر محمد تقی میر	〃 〃 〃
نکات الشعرا	〃 〃 〃	کتب خانہ انجمن ترقی اردو (ہند)، نئی دہلی

(ب) مطبوعات

آب حیات	مولانا محمد حسین آزاد	وکٹوریہ پریس، لاہور، ۱۸۸۰ء
آب حیات کا تنقیدی مطالعہ	پروفیسر مسعود حسن رضوی	کتاب نگر، لکھنؤ، (طبع ثانی) ۱۹۶۴ء
آثار الشعرائے ہنود	منشی دیبی پرشاد بشاش	مطبع رضوی، دہلی، ۱۸۸۵ء
اخبار الصنادید	نجم الغنی رام پوری	مطبع نول کشور، لکھنؤ، ۱۹۱۸ء
ادب العرب	پروفیسر زبید احمد	نور بک ڈپو، بریلی، ۱۹۲۹ء
ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ	ڈاکٹر سید عبداللہ	انجمن ترقی اردو (ہند)، دہلی، ۱۹۴۲ء
اردو تذکروں میں نکات الشعرا کی اہمیت	ایم۔ کے۔ فاطمی	دانش محل، لکھنؤ، ۱۹۶۲ء
اردو تنقید پر ایک نظر	پروفیسر کلیم الدین احمد	ادارۂ فروغ اردو، لکھنؤ ۱۹۵۵ء
اردو تنقید کا ارتقا	ڈاکٹر عبادت بریلوی	انجمن ترقی اردو (پاکستان) کراچی، ۱۹۶۱ء
اردو تنقید کی تاریخ	ڈاکٹر مسیح الزماں	اسرار کریمی پریس، الٰہ آباد، ۱۹۵۴ء
اردو زبان اور ادب	پروفیسر مسعود حسین خاں	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ
اردو شاعری کا تہذیبی اور فکری پس منظر	پروفیسر محمد حسن	شاہی پریس، لکھنؤ ۱۹۶۴ء
اردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری	ڈاکٹر فرمان فتح پوری	مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۷۲ء
اردو شہ پارے (جلد اوّل)	پروفیسر محی الدین قادری زورؔ	مکتبہ ابراہیمیہ، حیدر آباد، ۱۹۲۹ء
اردو کی ادبی تاریخ	پروفیسر عبدالقادر سروری	نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، حیدر آباد، ۱۹۸۵ء
اردو مثنوی شمالی ہند میں	ڈاکٹر گیان چند	انجمن ترقی اردو (ہند)، علی گڑھ، ۱۹۶۹ء
اردو نثر کا آغاز اور ارتقا	ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ	سیاست پریس، حیدر آباد (طبع اول) سنہ ندارد
اردوے قدیم	حکیم شمس اللہ قادری	نول کشور پریس، لکھنؤ، ۱۹۳۰ء

اسلاف میر انیس	پروفیسر مسعود حسن رضوی	کتاب نگر، لکھنؤ، ۱۹۷۰ء
اکمل التاریخ (حصہ اول)	محمد یعقوب، ضیا قادری	مطبع قادری، بدایوں، سنہ ندارد
اقبال نامۂ جہاں گیری	مترجمہ محمد زکریا مائل	دار الطبع جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد، ۱۹۲۸ء
امرائے ہنود	منشی سعید احمد مارہروی	نامی پریس، کان پور، ۱۹۱۰ء
بازیافت	ڈاکٹر محمود الٰہی	دانش محل، لکھنؤ، ۱۹۶۵ء
بنگال کا اردو ادب	ڈاکٹر جاوید نہال	اردو رائٹرس گلڈ، کلکتہ، ۱۹۶۹ء
بہادر شاہ ظفر	امیر احمد علوی	ادارۂ فروغ اردو، لکھنؤ، ۱۹۵۵ء
بہارِ سخن	شیام سندر لال برق سیتاپوری	مطبع ایل۔ بی۔ سیتاپور، ۱۹۲۲ء
بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا	ڈاکٹر اختر اورنیوی	لیبل لیتھو پریس، پٹنہ، ۱۹۵۷ء
بھارت کا اتہاس (ہندی)	ڈاکٹر ایشوری پرشاد	انڈین پریس، الٰہ آباد، ۱۹۵۶ء
پنج آہنگ	مرزا غالب	مطبع دار السلام، دہلی، ۱۸۵۳ء
تاریخِ ادبِ اردو	ڈاکٹر رام بابو سکسینہ	راجہ رام کمار پریس، لکھنؤ، ۱۹۵۲ء
تاریخِ ادبِ اردو (جلد اول)	ڈاکٹر جمیل جالبی	مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۷۵ء
تاریخِ ادبیاتِ ایران (ہر دو جلد)	جلال الدین ہمائی	تہران، ۱۹۶۱ء
تاریخِ ادبیاتِ ایران (ہر دو جلد)	ڈاکٹر سلیم جباری	تہران، ۱۳۳۴ شمسی
تاریخ ادبیات در ایران (جلد اول و دوم)	ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا	کتاب فروشی ابنِ سینا، تہران۔ ۱۹۶۰ء
تاریخ ادبیاتِ عربی	ابو الفضل ایم۔ اے	حیدرآباد
تاریخ اودھ (مکمل)	نجم الغنی رام پوری	نول کشور پریس، لکھنؤ، ۱۹۱۹ء
تاریخ تذکرہ ہائے فارسی (جلد اول)	احمد گلچین معانی	دانش گاہ تہران، ۱۳۴۸ شمسی
تاریخِ فرشتہ (اردو ترجمہ)	حکیم محمد قاسم فرشتہ	نول کشور پریس، لکھنؤ، ۱۹۳۳ء
تاریخ ہندوستان (مکمل)	مولوی ذکار اللہ دہلوی	انسٹی ٹیوٹ پریس، علی گڑھ، ۱۹۱۹ء
تاریخ ہند۔ عہد برطانیہ	جے۔ سی۔ مارشمن	دار الطبع جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد، ۱۹۲۳ء

تجربے اور روایت	ڈاکٹر ابواللیث صدیقی	اردو اکیڈیمی سندھ، کراچی، ۱۹۵۹ء
تحفۃ الشعرا	افضل بیگ قاقشال	ادارۂ ادبیاتِ اردو، حیدرآباد، ۱۹۶۱ء
تحقیق کی روشنی میں	ڈاکٹر عندلیب شادانی	مطبع عالیہ، لاہور، ۱۹۶۳ء
تحقیقی مطالعے	پروفیسر عطا کاکوی	عظیم الشان بک ڈپو، پٹنہ، ۱۹۶۵ء
تذکرۃ الاولیا۔ شیخ فریدالدین عطار	مرتبہ پروفیسر نکلسن	مطبع بریل، لیڈن، ۵-۱۹۰۵ء
تذکرۃ الشعرا۔ دولت شاہ سمرقندی	مرتبہ پروفیسر ایڈورڈ براؤن	مطبع بریل، لیڈن، ۱-۱۹۰۱ء
تذکرۃ الشعرا۔ غلام ہمدانی مصحفی	مرتبہ ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری	محمدی پبلشرز، لکھنؤ، ۱۹۸۰ء
تذکرۃ الفقرا	مرزا محمد اختر کورگانی	مطبع جیون پرکاش، دہلی
تذکرۂ ابن طوفان	مرتبہ قاضی عبدالودود	ادارۂ تحقیقات اردو، پٹنہ، ۱۹۵۴ء
تذکرۂ اہل دہلی	مرتبہ قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی	انجمن ترقی اردو (پاکستان)، کراچی، ۱۹۵۵ء
تذکرۂ حسینی	میر حسین دوست سنبھلی	مطبع نول کشور، لکھنؤ، ۱۲۹۲ھ
تذکرۂ ریختہ گویاں	میر فتح علی گردیزی	انجمن ترقی اردو (ہند)، اورنگ آباد، ۱۹۳۳ء
تذکرۂ شعرائے اردو	میر حسن	انجمن ترقی اردو (ہند)، اورنگ آباد، ۱۹۲۲ء
تذکرۂ شعرائے اردو	〃 〃	انجمن ترقی اردو (ہند)، دہلی، ۱۹۴۰ء
تذکرۂ شعرائے ہندی۔ میر حسن	مرتبہ ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری	اردو پبلشرز، لکھنؤ، ۱۹۷۹ء
تذکرۂ شورش	مرتبہ ڈاکٹر محمود الٰہی	اترپردیش اردو اکاڈمی، لکھنؤ، ۱۹۸۴ء
تذکرۂ طاہر نصرآبادی		چاپخانۂ ارمغان، تہران، ۱۳۷۰ شمسی
تذکرۂ کاملانِ رام پور	احمد علی شوق	ہمدرد پریس، دہلی، ۱۹۲۹ء
تذکرۂ ماہ و سال	مالک رام	مکتبۂ جامعہ، نئی دہلی، ۱۹۹۱ء
تذکرۂ مشاہیر کاکوری	حافظ محمد علی حیدر	اصح المطابع، لکھنؤ، ۱۹۲۷ء
تذکرہ نویسیٔ فارسی در ہند و پاکستان	ڈاکٹر سید علی رضا نقوی	موسسہ مطبوعاتی علمی، تہران، ۱۹۶۴ء
تذکرۂ ہندی	غلام ہمدانی مصحفی	انجمن ترقی اردو (ہند)، اورنگ آباد، ۱۹۳۳ء
تقویم ہجری و عیسوی	ابوالنصر محمد خالدی	انجمن ترقی اردو (ہند)، دہلی، ۱۹۳۹ء

تلامذۂ غالب	مالک رام	مرکزِ تصنیف و تالیف، نکودر (پنجاب)، ۱۹۵۸ء
تنقید کیا ہے	پروفیسر آل احمد سرور	مکتبۂ جامعہ، نئی دہلی، ۱۹۴۷ء
توزک جہاں گیری (اردو ترجمہ)	نورالدین محمد جہاں گیر بادشاہ	مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۰ء
تین تذکرے	مرتبہ پروفیسر نثار احمد فاروقی	مکتبہ برہان، دہلی، ۱۹۶۸ء
جوامع الحکایات و لوامع الروایات۔		
محمد عوفی	مترجمہ اختر شیرانی	انجمن ترقی اردو (ہند)، دہلی، ۱۹۴۳ء
چمنستانِ رحمت الٰہی	حافظ واحد یار خاں	مطبع جماعتِ تجارتِ متفقۂ اسلامیہ میرٹھ، ۱۲۹۷ھ
چمنستانِ شعرا	لچھمی نرائن شفیق	انجمن ترقی اردو (ہند) اورنگ آباد، ۱۹۲۸ء
خزانۂ عامرہ	علامہ غلام علی آزاد بلگرامی	نول کشور پریس، کان پور، ۱۸۷۱ء
خطباتِ گارساں دتاسی	مرتبہ مولوی عبدالحق	انجمن ترقی اردو (ہند)، اورنگ آباد، ۱۹۳۵ء
خم خانۂ جاوید (جلد دوم تا پنجم)	لالہ سری رام	
خواجہ میر درد۔ ذکر اور فکر	قدیر احمد	مکتبۂ شاہراہ، دہلی، ۱۹۶۴ء
خوش معرکۂ زیبا۔ سعادت خاں ناصر	مرتبہ مشفق خواجہ	مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۷۰ء
داستانِ تاریخ اردو	حامد حسن قادری	لکشمی نرائن اگروال اینڈ سنز، آگرہ، ۱۹۴۱ء
دستور الفصاحت۔ احمد علی خاں یکتا	مرتبہ مولانا امتیاز علی عرشی	ہندوستان پریس، رام پور، ۱۹۴۳ء
دکن میں اردو	نصیر الدین ہاشمی	مکتبۂ ابراہیمیہ، حیدرآباد، ۱۹۳۶ء
دکنی ادب کی تاریخ	محی الدین قادری زور	اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ۱۹۶۰ء
دلی کا دبستانِ شاعری	ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی	انجمن ترقی اردو (پاکستان) کراچی، ۱۹۴۹ء
دو تذکرے (ہر دو جلد)	مرتبہ پروفیسر کلیم الدین احمد	لیبل لیتھو پریس، پٹنہ، ۱۹۵۹ء و ۱۹۶۳ء
دیوانِ آبرو	مرتبہ ڈاکٹر محمد حسن	ادارۂ تصنیف، علی گڑھ، سنہ ندارد
دیوانِ تاباں	مرتبہ مولوی عبدالحق	انجمن ترقی اردو (ہند) اورنگ آباد، ۱۹۳۵ء
دیوانِ جوشش	مرتبہ قاضی عبدالودود	انجمن ترقی اردو (ہند)، دہلی، ۱۹۴۱ء

دیوانِ جہاں	رائے بینی نرائن دہلوی	لیبل لیتھو پریس، پٹنہ، ۱۹۵۹ء
دیوانِ ذوق	مرتبہ مولانا محمد حسین آزاد	رفاہِ عام پریس، لاہور، ۱۹۲۲ء
دیوانِ غالب	مرتبہ مولانا امتیاز علی عرشی	انجمن ترقیٔ اردو (ہند)، علی گڑھ، ۱۹۵۱ء
دیوان فغاں	مرتبہ صباح الدین عبدالرحمٰن	انجمن ترقیٔ اردو (پاکستان) کراچی، ۱۹۵۵ء
دیوان قائم	مرتبہ ڈاکٹر خورشید الاسلام	انجمن ترقیٔ اردو (ہند)، علی گڑھ
دیوان تاجی	مرتبہ ڈاکٹر افتخار بیگم صدیقی	انجمن ترقیٔ اردو (ہند)، نئی دہلی، ۱۹۸۹ء
دیوانِ یقین	مرتبہ مرزا فرحت اللہ بیگ	انجمن ترقیٔ اردو (ہند)، اورنگ آباد، ۱۹۳۰ء
ذکرِ غالب	مالک رام	مکتبۂ جامعہ، نئی دہلی، ۱۹۶۴ء
ذوق ۔ سوانح اور انتقاد	ڈاکٹر تنویر احمد علوی	مجلس ترقیٔ ادب، لاہور، ۱۹۶۳ء
راحت الصدور و آیۃ السرور	محمد بن علی بن سلیمان الراوندی	موسسہ مطبوعاتی امیر کبیر، تہران، ۱۳۳۳ شمسی
ریاض الفصحا	غلام ہمدانی مصحفی	انجمن ترقیٔ اردو (ہند)، اورنگ آباد، ۱۹۳۴ء
سبک شناسی (جلد سوم)	ملک الشعرا مرزا محمد تقی بہار	تہران، ۱۹۵۹ء
سحر البیان	میر حسن	مشورہ بک ڈپو، دہلی، ۱۹۶۴ء
سخن شعرا	عبدالغفور نساخ	نول کشور پریس، لکھنؤ، ۱۸۶۰ء
سروِ آزاد	علامہ غلام علی آزاد بلگرامی	رفاہِ عام پریس، لاہور
سراپا سخن	سید محسن علی محسن	نول کشور پریس، لکھنؤ، ۱۸۶۰ء
سفرنامہ مصر و روم و شام	علامہ شبلی نعمانی	رحمانی پریس، دہلی
سفینۂ خوش گو	بندرابن داس خوشگو	ادارۂ تحقیقات عربی و فارسی، پٹنہ، ۱۹۵۹ء
سفینۂ ہندی	بھگوان داس ہندی	ادارۂ تحقیقات عربی و فارسی، پٹنہ، ۱۹۵۸ء
سوانحاتِ سلاطینِ اودھ	سید کمال الدین حیدر	نول کشور پریس، کان پور، ۱۹۰۷ء
سودا	شیخ چاند	انجمن ترقیٔ اردو (ہند)، اورنگ آباد، ۱۹۳۶ء
شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک	مولانا عبیداللہ سندھی	سندھ ساگر اکیڈمی، لاہور، ۱۹۴۵ء
شعرائے اردو کے تذکرے	ڈاکٹر سید عبداللہ	مکتبۂ جدید، لاہور، ۱۹۵۲ء

شمیمِ سخن (حصہ اول)	عبدالحی صفا بدایونی	مطبع امداد الہند، مراد آباد، ۱۸۸۴ء
طبقات الشعرا (عربی)	ابن سلام الجمحی	مطبع بریل، لیڈن، ۱۹۱۳ء
طبقات الشعرا۔ قدرت اللہ شوق	مرتبہ نثار احمد فاروقی	مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۸ء
طبقاتِ سخن۔ مبتلا میرٹھی	مرتبہ ڈاکٹر نسیم اقتدار علی	نظامی آفسیٹ پریس، لکھنؤ، ۱۹۹۱ء
طبقاتِ شعرائے ہند	مولوی کریم الدین	مطبع العلوم، دہلی، ۱۸۴۸ء
عربی ادب	علی احمد رفعت	اردو اکیڈیمی، بہاول پور، ۱۹۶۲ء
عقد ثریا	غلام ہمدانی مصحفی	انجمن ترقی اردو (ہند)، اورنگ آباد، ۱۹۳۴ء
علمی نقوش	ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں	اردو اکیڈیمی سندھ، کراچی، سنہ ندارد
علی گڑھ تاریخ ادب اردو	مرتبہ پروفیسر آل احمد سرور	شعبۂ اردو، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ۱۹۶۲ء
عمدۂ منتخبہ۔ نواب اعظم الدولہ سرور	مرتبہ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی	شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی، ۱۹۶۱ء
عیارستان	قاضی عبدالودود	ادارۂ تحقیقات اردو، پٹنہ، ۱۹۵۷ء
غالب	غلام رسول مہر	شیخ مبارک علی اینڈ سنز، لاہور، طبعِ ثانی
غالب۔ احوال و آثار	حنیف نقوی	نصرت پبلشرز، لکھنؤ، ۱۹۹۰ء
غیاث اللغات	ملا غیاث الدین رام پوری	نول کشور پریس، کان پور، ۱۸۷۰ء
فائز دہلوی اور دیوانِ فائز	مرتبہ پروفیسر مسعود حسن رضوی	انجمن ترقی اردو (ہند)، علی گڑھ، ۱۹۶۵ء
فرہنگِ انند راج (جلد اول)	منشی محمد بادشاہ	مطبع نول کشور، لکھنؤ، ۱۸۸۹ء
فرہنگ نامۂ پارسی (جلد اول)	علامہ سعید نفیسی	وزارتِ فرہنگ، تہران، ۱۳۱۹ شمسی
الفہرست	ابن الندیم	لائپزنگ، ۱۸۷۱ء
فہرست کتب خانۂ آصفیہ		حیدر آباد، ۳۳-۱۳۳۲ھ
قاموس المشاہیر (ہر دو جلد)	نظامی بدایونی	نظامی پریس، بدایوں، ۱۹۲۶ء
قرآن شریف	مترجمہ مولانا شبیر احمد عثمانی	
قرآن شریف	مترجمہ شاہ رفیع الدین	
کتاب الاغانی (جلد ۱ و ۲۱)	ابی الفرج الاصفہانی	مصر، ۱۳۲۳ھ

الکتب والفنون (جلد چہارم)	حاجی خلیفہ	لندن، ۱۸۳۵ء
کلامِ انشا	مرتبہ مرزا محمد عسکری و محمد رفیع	ہندوستانی اکیڈمی، الٰہ آباد، ۱۹۵۲ء
کلمات الشعرا محمد افضل سرخوش	مرتبہ علامہ محوی صدیقی لکھنوی	مدراس یونیورسٹی، مدراس، ۱۹۵۱ء
کلیاتِ انشا	انشاء اللہ خاں انشا	مطبع اردو اخبار، دہلی، ۱۸۵۵ء
کلیاتِ سراج	مرتبہ پروفیسر عبدالقادر سروری	مجلسِ اشاعتِ دکنی مخطوطات، حیدرآباد ۱۹۴۰ء
کلیات سلطان محمد قلی قطب شاہ	مرتبہ ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ	مجلسِ اشاعتِ دکنی مخطوطات، حیدرآباد، ۱۹۴۰ء
کلیاتِ سوداؔ	مرزا محمد رفیع سوداؔ	نول کشور پریس، لکھنؤ، ۱۸۷۲ء
گارساں دتاسی کے تمہیدی خطبے	مصححہ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی	انجمن ترقیٔ اردو (ہند)، دہلی، ۱۹۴۰ء
گلِ رعنا	لچھمی نرائن شفیقؔ	عہد آفریں پریس، حیدرآباد
گلِ رعنا	مولانا عبدالحی	دارالمصنفین اعظم گڑھ ۱۳۴۳ھ
گلزارِ ابراہیم و گلشنِ ہند	مرتبہ ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ	انسٹی ٹیوٹ پریس، علی گڑھ، ۱۹۳۴ء
گلزارِ ابراہیم	مرتبہ پروفیسر کلیم الدین احمد	دائرۂ ادب، پٹنہ، ۱۹۷۴ء
گلستانِ بے خزاں	قطب الدین باطنؔ اکبرآبادی	نول کشور پریس، لکھنؤ، ۱۲۶۱ھ
گلستانِ سخن	قادر بخش صابرؔ	نول کشور پریس، لکھنؤ، ۱۸۸۲ء
گلشنِ بے خار	نواب مصطفیٰ خاں شیفتہؔ	سید الاخبار پریس، دہلی، ۱۸۳۷ء
گلشنِ بے خار	〃 〃 〃	نول کشور پریس، لکھنؤ، ۱۹۱۰ء
گلشنِ سخن۔ میرزا کاظم بتلا	مرتبہ پروفیسر مسعود حسن رضوی	انجمن ترقیٔ اردو (ہند)، علی گڑھ، ۱۹۶۵ء
گلشنِ گفتار	خواجہ خاں حمیدؔ اورنگ آبادی	خورشید پریس، حیدرآباد، ۱۹۳۰ء
گلشنِ ہند	مرزا علی لطفؔ	رفاہِ عام پریس، لاہور، ۱۹۰۶ء
گل عجائب	اسد علی خاں تمناؔ اورنگ آبادی	انجمن ترقیٔ اردو (ہند) اورنگ آباد، ۱۹۳۶ء
گلکرسٹ اور اس کا عہد	عتیق صدیقی	انجمن ترقیٔ اردو (ہند)، علی گڑھ، ۱۹۶۰ء
لباب الالباب۔ محمد عوفی (ہر دو جلد)	مرتبہ ایڈورڈ براؤن و محمد بن عبدالوہاب قزوینی	مطبع بریل، لیڈن، ۱۹۰۳ء و ۱۹۰۶ء

لباب الالباب۔ محمد عوفی (ہر دو جلد)	مرتبہ پروفیسر سعید نفیسی	کتب خانۂ ابن سینا، تہران، ۱۹۵۶ء
مادھوجی سندھیا (اردو ترجمہ)	ایچ۔ جی۔ کین	دار الطبع جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد، ۱۹۲۳ء
مباحث	ڈاکٹر سید عبداللہ	مجلس ترقیٔ ادب، لاہور، ۱۹۶۵ء
مثنویاتِ راسخ	ڈاکٹر ممتاز احمد	لیبل لیتھو پریس، پٹنہ، ۱۹۵۷ء
مجمع الفصحا۔ رضا قلی ہدایت	مرتبہ آقائے مظاہر مصفا	موسسۂ مطبوعاتی امیر کبیر، تہران، ۱۳۳۶ شمسی
مجموعۂ نغز حکیم قدرت اللہ قاسم	مرتبہ پروفیسر محمود شیرانی	پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۳۳ء
محبوب الزمن، تذکرۂ شعرائے دکن	مولوی عبدالجبار خاں ملکاپوری	مطبعِ رحمانی، حیدرآباد، ۱۳۲۹ھ
مختصر سیر ہندوستان	حکیم وحید اللہ بدایونی	مطبع دبدبۂ حیدری، آگرہ، ۱۸۵۶ء
مخزن نکات۔ قائم چاندپوری	مرتبہ مولوی عبدالحق	انجمن ترقیٔ اردو (ہند)، اورنگ آباد، ۱۹۲۹ء
مخزن نکات 〃 〃	مرتبہ ڈاکٹر اقتدا حسن	مجلس ترقیٔ ادب، لاہور، ۱۹۶۶ء
مراۃ السلاطین ترجمہ سیر المتاخرین	گوکل پرشاد	
مرزا محمد رفیع سودا	ڈاکٹر خلیق انجم	انجمن ترقیٔ اردو (ہند)، علی گڑھ، ۱۹۶۶ء
مطالعات	ڈاکٹر نجم الاسلام	ادارۂ اردو، حیدرآباد (سندھ)۔ ۱۹۹۰ء
مطلع العلوم و مجمع الفنون (اردو ترجمہ)	منشی زین العابدین مرادآبادی	نول کشور پریس، لکھنؤ
منتخب الالباب (جلد سوم)	خافی خاں	رائل ایشیاٹک سوسائٹی، بنگال
المنجد فی الادب والعلوم	لوئس معلوف	بیروت (طبعِ جدید)
مومن۔ سوانح اور انتقاد	کلب علی خاں فائق رام پوری	مجلس ترقیٔ ادب، لاہور، ۱۹۶۱ء
میخانہ۔ عزتی قزوینی	مرتبہ احمد گلچیں معانی	تہران، ۱۳۸۱ھ
میر تقی میر۔ حیات اور شاعری	ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی	انجمن ترقیٔ اردو (ہند)، علی گڑھ، ۱۹۵۴ء
میر کی آپ بیتی	مترجمہ نثار احمد فاروقی	مکتبۂ برہان، دہلی، ۱۹۵۷ء
نادراتِ شاہی۔ شاہ عالم آفتاب	مرتبہ مولانا امتیاز علی خاں عرشی	ہندوستان پریس، رام پور، ۱۹۴۴ء
نقوش و افکار	مجنوں گورکھپوری	ادارۂ فروغِ اردو، لکھنؤ، ۱۹۵۵ء
نکات الشعرا۔ میر تقی میر	مرتبہ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی	نظامی پریس، بدایوں، سنہ ندارد

نکات الشعرا۔ میر تقی میر	مرتبہ مولوی عبدالحق	انجمن ترقی اردو (ہند) اورنگ آباد، ۱۹۳۵ء
نکات الشعرا " "	مرتبہ ڈاکٹر محمود الٰہی	ادارۂ تصنیف، ماڈل ٹاؤن، دہلی، ۱۹۷۲ء
وامق و عذرا (مثنوی)	ظہور اللہ خاں نوآبدایونی	افضل المطابع، بدایوں، ۱۸۷۹ء
وفیات الاعیان (جلد اول)	ابی العباس احمد بن خلکان	الطباعۃ الجریہ، ۱۲۷۵ھ
وفیات الاعیان (جلد ثانی)	" " "	مطبعۃ المیمنہ، مصر، ۱۳۱۰ھ
وقائع عالم شاہی		
پریم کشور فراقی	مرتبہ مولانا امتیاز علی عرشی	ہندوستان پریس، رام پور، ۱۹۴۹ء
یادگارِ شعرا	طفیل احمد	اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ، ۱۹۸۵ء
یادگار غالبؔ	مولانا الطاف حسین حالی	شانتی پریس، الٰہ آباد، ۱۹۵۸ء
یتیمۃ الدہر	ثعالبی	مطبع السعادۃ، قاہرہ، ۱۹۵۶ء

(ج) رسائل و جرائد:

اردو (سہ ماہی)، کراچی	جنوری ۱۹۵۰ء، اکتوبر ۱۹۵۹ء، جولائی ۱۹۶۶ء و جولائی ۱۹۶۷ء
اردو ادب (سہ ماہی)، علی گڑھ	مارچ ۱۹۵۵ء و جون ۱۹۵۵ء
اردو نامہ (سہ ماہی)، کراچی	شمارہ نمبر ۱۶ بابت اپریل تا جون ۱۹۶۴ء
اکادمی (دو ماہی)، لکھنؤ	شمارہ جولائی تا اکتوبر ۱۹۹۰ء
انتخاب ماہِ نو، کراچی	۱۹۴۸ء تا ۱۹۵۲ء
اورنٹیل کالج میگزین، لاہور	نومبر ۱۹۲۵ء، فروری ۱۹۲۷ء، فروری ۱۹۳۳ء و اگست ۱۹۴۳ء
پگڈنڈی (ماہنامہ)، امرت سر	سالنامہ ۱۹۵۹ء
تحریر (تماہی)، نئی دہلی	شمارہ اپریل تا جون ۱۹۷۳ء
دلّی کالج میگزین	میر نمبر، ۱۹۶۲ء
قومی زبان، کراچی	یکم و ۱۵ مئی ۱۹۶۳ء و اگست ۱۹۹۱ء
معاصر (سہ ماہی)، پٹنہ	مکمل فائل ۱۹۵۴ء و ۱۹۵۵ء

نقوش، لاہور	جنوری ۱۹۵۵ء، اکتوبر ۱۹۵۸ء و اگست ۱۹۸۳ء
نگار (ماہنامہ)، لکھنؤ	جون ۱۹۵۶ء
نگار (ماہنامہ)، کراچی	ستمبر ۱۹۶۳ء، تذکروں کا تذکرہ نمبر و مصحفی نمبر
نوائے ادب (سہ ماہی)، بمبئی	اپریل ۱۹۵۶ء و اکتوبر ۱۹۶۸ء
نیا دور (ماہنامہ)، لکھنؤ	جولائی ۱۹۶۲ء
ہماری زبان (ہفت روزہ)، علی گڑھ	۱۵ر جنوری تا ۸ر اپریل ۱۹۶۰ء، یکم نومبر ۱۹۶۰ء و ۸ر اپریل ۱۹۶۶ء
ہندوستانی (تماہی)، الہ آباد	اکتوبر ۱۹۳۳ء